سیرۃ النبی ﷺ

جلد چہارم

علامہ سید سلیمان ندویؒ

دار المصنفین شبلی اکیڈمی

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

کتابِ مستطاب

سِیرۃُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی

سوانحِ اقدس حضرت سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جلد چہارم

مشتمل بر منصبِ نبوت

اولاً مقدمہ میں منصبِ نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازم وخصائص پر بحث ہے، پھر قبل از اسلام دنیا کے متمدن ممالک اور خصوصاً ملکِ عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت کی تفصیل ہے اور اس کے بعد نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا اور عرب کے لیے جس عظیم الشان اصلاح کا فرض انجام دیا ہے، اس کا اجمالی ذکر ہے، پھر اسلامی عقائد کا تفصیلی بیان ہے۔

تالیف

علامہ سید سلیمان ندوی رح

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی

سلسلۂ دارالمصنّفین نمبر: ۱۷۴

کتاب	:	سیرۃ النبی ﷺ (حصہ چہارم)
مصنف	:	علامہ سید سلیمان ندویؒ
صفحات	:	۶۹۴
طبع جدید	:	۲۰۱۹ء
مطبع	:	معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند)
ناشر	:	دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند)
قیمت	:	
باہتمام	:	ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی

ISBN: 978-93-80104-54-6

Darul Musannefin Shibli Academy

P.o. Box No - 19, Azamgarh

e - mail : shibli academy@rediffmail.com

Websit : www.shibliacademy.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

سیرۃ النبی ﷺ حصہ چہارم

مضمون	صفحہ
فہرست مضامین	۱۔۱۲
دیباچہ	۱۳۔۱۶
مقدمہ ۱۔۱۵۲	۱۔۱۵۲
منصب نبوت ۱۔۲۰۹	۱۔۲۰۹
کتاب کا موضوع آپ کے پیغمبرانہ کارنامے	۱
نبی اور مصلح اور حکیم	۲
نبوت کی حقیقت اور خصوصیات	۳
نبوت ورسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ	۵
پہلا طریقہ	۶
دوسرا طریقہ	۶
تیسرا طریقہ	۷
نبی کی ضرورت	۹
نبی کی عصمت	۱۰
نبی کی محبوبیت	۱۰

مضمون	صفحہ
مصلحین	۱۱
مصلحین کے اقسام	۱۱
نبی کی دو بعثتیں	۱۲
بعثت کے لئے کسی قوم کا انتخاب	۱۳
بعثت کا زمانہ	۱۴
نبی کی یقینی کامیابی	۱۴
ایک شبہ اور اس کا جواب	۲۴
نبی اور غیر نبی کے امتیازات	۲۹
نبوت کے لوازم اور خصوصیات	۳۵
وہبی استعداد	۳۷
غیبی علم	۴۱
علم انسانی کے ماخذ	۴۱
ذرائع علم کے حصول کے زمانے اور ان کے مراتب	۴۳
غیر مادی علم	۴۵
علم غیب	۵۰
غیب کی حقیقت	۵۱

مضمون	صفحہ
وحی اور ملکۂ نبوت	۵۵
کتاب اور سنت	۵۷
وحی متلو اور وحی غیر متلو	۵۸
احادیث، قرآن کا بیان ہیں	۶۱
الہام واجتہاد وحکمت	۶۱
اجتہاد نبوت	۶۲
ساتواں مبحث	
احادیث نبوی سے شریعت کے اخذ کرنے میں علوم نبوی کے اقسام	
۶۴-۱۵۲	
عصمت اور بے گناہی	۶۸
بعض شبہات کا ازالہ	۷۶
نکتہ	۷۹
نبی کی بشریت	۸۳
اجتہادِ نبوی میں خطا	۹۲
اس خطا کے معنی	۹۳
پانچ اجتہادی امور پر تنبیہ الٰہی	۹۳
پہلا واقعہ	۹۳
دوسرا واقعہ	۹۵
تیسرا واقعہ	۹۹
چوتھا واقعہ	۹۹
پانچواں واقعہ	۱۰۰
ایک غلط استدلال	۱۰۳
عقل بشری	۱۰۵
ملکۂ نبوت یا عقل نبوت کا شرعی ثبوت	۱۰۸

مضمون	صفحہ
حکمت	۱۰۹
کتاب وحکمت کی تعلیم	۱۲۰
علم	۱۲۲
علم وحکم	۱۲۳
شرح صدر	۱۲۶
تبیین کتاب	۱۳۱
اراءت	۱۳۳
رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے	۱۳۶
تزکیہ	۱۳۷
نور	۱۳۸
آیات وملکوت کی رویت	۱۳۸
سماع غیب	۱۳۹
تبلیغ ودعوت	۱۳۹
ایک شبہہ کا ازالہ	۱۴۲
انبیا کی تعلیم کا امتیازی عقیدہ	۱۴۷
نبوت کی غرض وغایت	۱۴۷
تائید ونصرت	۱۵۱
خاتمہ	۱۵۲
شبِ ظلمت	
۱۵۲-۲۱۸	
پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور روحانی حالت	
۱۵۳-۱۷۹	
ظہور اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی حالت کیا تھی؟	۱۵۴

مضمون	صفحہ
مجوس فارس	۱۵۵
عیسائی روم	۱۵۹
ہندوستان	۱۶۷
یہود	۱۷۰

ظہورِ اسلام کے وقت عرب کی مذہبی واخلاقی حالت
۱۸۰_۲۱۸

مضمون	صفحہ
خدا کا اعتقاد	۱۸۰
ملائکہ کی الوہیت	۱۸۲
جنات کی الوہیت	۱۸۳
بت پرستی	۱۸۴
ستارہ پرستی	۱۸۹
جن اور شیاطین اور بھوت پلیت	۱۹۰
کہانت	۱۹۲
اوہام پرستی	۱۹۵
جنگ جوئی	۱۹۵
شراب خواری	۱۹۷
قمار بازی	۲۰۷
سود خواری	۲۰۸
لوٹ مار	۲۱۰
چوری	۲۱۱
سفاکی وبے رحمی ووحشت	۲۱۳
زنا اور فواحش	۲۱۳
بے شرمی وبے حیائی	۲۱۵
عورتوں پر ظلم	۲۱۵
وحشت وجہالت	۲۱۸

عربوں کے خصوصیات اور خیر الامم بننے کی اہلیت
۲۱۹_۲۲۶

مضمون	صفحہ
صحتِ نسب	۲۱۹
کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے	۲۲۱
محکوم نہ تھے	۲۲۱
کتابی فاسد تعلیم سے نا آشنا تھے	۲۲۲
وہ زمین کے وسط میں آباد تھے	۲۲۲
بعض اخلاقی خوبیاں	۲۲۲
شجاع وبہادر تھے	۲۲۳
پرجوش تھے	۲۲۳
حق گو تھے	۲۲۳
عقل ودانش والے تھے	۲۲۳
ذہن اور حافظہ کے تیز تھے	۲۲۳
فیاض تھے	۲۲۴
مساوات پسند تھے	۲۲۴
عملی تھے	۲۲۵
ان اوصاف کی مصلحت	۲۲۵

صبح سعادت
۲۲۷_۲۵۱

مضمون	صفحہ
ایک قوم کا انتخاب	۲۲۷
اصلاح وہدایت کی مشکلات	۲۲۸
جہالت	۲۲۸
آبائی دین ورسوم کی پابندی	۲۳۴
توہم پرستی	۲۳۸
قبائل کی خانہ جنگیاں	۲۴۱
سیاسی مشکلات	۲۴۵
ذریعۂ معاش	۲۴۸
رفع شک	۱۵۰

مضمون	صفحہ
تبلیغ نبوی اور اس کے اصول اور اس کی کامیابی کے اسباب ۲۵۲_۲۹۰	
فریضۂ تبلیغ	۲۵۲
تبلیغ کی اہمیت	۲۵۳
اس کی وسعت	۲۵۴
تبلیغ کے اصول	۲۵۷
قول لین	۲۵۸
اعراض اور قول بلیغ	۲۵۸
تیسیر وتبشیر	۲۵۹
تدریج	۲۵۹
تالیف قلب	۲۶۰
دعوتِ عقل	۲۶۱
مذہب میں زبردستی نہیں	۲۶۲
میدانِ جنگ میں تبلیغ	۲۶۵
مسلح تبلیغی جماعتیں	۲۷۰
تبلیغ ودعوت کی تنظیم	۲۷۰
مبلغوں کی تعلیم وتربیت	۲۷۲
دعوت بالقرآن	۲۷۲
اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب	۲۷۳
قبول اسلام کے لئے کیا چیز درکار تھی؟	۲۷۴
اشاعتِ اسلام کے اسباب وذرائع	۲۷۶
ایک ضروری نکتہ	۲۸۳
موانع کا ازالہ	۲۸۴
اسلام یا محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ کام ۲۹۱_۲۹۵	

مضمون	صفحہ
تعلیمات نبوی کی ہمہ گیری	۲۹۳
اسلام کے چار حصے	۲۹۵
عقائد ۲۹۶_۳۰۳	
عقائد کی حقیقت اور اہمیت	۲۹۶
اللہ تعالیٰ پر ایمان ۳۰۴_۴۱۰	
اصلاح عقائد	۳۰۴
تعدد خدا کا ابطال	۳۰۵
بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا	۳۰۷
درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد	۳۱۰
خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں	۳۱۱
حرام وحلال کرنا خدا کا کام ہے	۳۱۳
غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم	۳۱۴
صفاتِ الٰہی کی توحید	۳۱۵
مخفی قوتوں کا ابطال	۳۱۷
اوہام وخرافات کا ابطال	۳۱۹
کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید	۳۲۱
اجرام سماوی کی قدرت کا انکار	۳۲۸
غیر خدا کی قسم سے روکنا	۳۳۰
خدا کی مشیئت میں کوئی شریک نہیں	۳۳۱
مشتبہات شرک کی ممانعت	۳۳۲
قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا	۳۳۴
ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے	۳۳۴
توحید اور اس کے ایجابی اصول وارکان ۳۳۸_۴۱۰	

مضمون	صفحہ
اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل	۳۳۸
توحید پر عقلی دلیلیں	۳۴۷
توحید کی تکمیل	۳۴۹
خدا کی حقیقی عظمت	۳۵۰
انسان کا مرتبہ	۳۵۳
خدا کا جامع اور مانع تخیل	۳۵۷
اسماوصفات	۳۶۰
صفاتِ جمالی	۳۷۱
صفاتِ جلالی	۳۷۴
نکتہ	۳۷۴
صفاتِ کمالی	۳۷۵
صفاتِ وحدانیت	۳۷۵
صفاتِ وجودی	۳۷۶
علم	۳۷۶
قدرت	۳۷۷
نکتہ	۳۷۸
تنزیہہ	۳۷۹
ان تعلیمات کا اثر اخلاقِ انسانی پر	۳۸۰
خدا کا ڈر اور پیار	۳۸۷
محبت کے ساتھ خوف وخشیت کی تعلیم	۳۸۸
محبت کے جسمانی اصطلاحات کی ممانعت	۳۹۲
تعلیماتِ اسلامی میں محبتِ الٰہی کے مظاہر	۳۹۴

فرشتوں پر ایمان

۴۱۱ـ۴۲۷

مضمون	صفحہ
ملائکہ کے معنی	۴۱۱
ملائکہ کا تخیل مذاہب قدیمہ میں	۴۱۲
ملائکہ کا تخیل فلسفہ میں	۴۱۲
یونانی مصری فلسفہ	۴۱۲
صابئی	۴۱۳
اسلام میں فرشتوں کی حقیقت	۴۱۳
اس عقیدہ کی عقلی حیثیت	۴۱۴
آیات واحادیث میں ملائکہ کا ذکر	۴۱۶
ملائکہ کے فرائض	۴۱۶
فلسفہ ومذاہب کی ملائکہ کے متعلق بے اعتدالی	۴۲۳
فرشتوں پر ایمان لانے کا مقصد	۴۲۷

رسولوں پر ایمان

۴۲۸ـ۴۳۹

مضمون	صفحہ
ایک عام غلط فہمی کا ازالہ	۴۲۸
نبوت کسی ملک یا قوم سے مخصوص نہیں	۴۲۸
تمام دنیا میں پیغمبر آئے	۴۲۹
تمام پیغمبروں کی صداقت کا اعتراف	۴۳۰
پیغمبروں میں تفرق کی ممانعت	۴۳۱
پیغمبروں کی غیر محدود تعداد	۴۳۳
مختلف فیہ پیغمبروں کی رسالت کا اقرار	۴۳۳
پیغمبری کی واضح حقیقت کا اظہار	۴۳۳
پیغمبروں کا منصب اور فرائض	۴۳۴
پیغمبروں کی عصمت	۴۳۵
قرآن میں پیغمبروں کا جامع تذکرہ	۴۳۶
وہ انبیاء جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں ہے	۴۳۷
ایسے انبیاء کی شناخت کا اصول	۴۳۸
انبیاء کی باہمی ترجیح کا مسئلہ	۴۳۸

کتابِ الٰہی پر ایمان

۴۴۰ـ۴۶۷

مضمون	صفحہ
کتابِ الٰہی پر ایمان لانے کا مقصد	۴۴۰

مضمون	صفحہ
اس عقیدہ کا تکمیلی پہلو	۴۴۰
تمام کتب الٰہی پر ایمان لانا ضروری ہے	//
انبیائے قدیم کے غیر معلوم الاسم صحائف	۴۴۲
چار معلوم الاسم آسمانی صحائف	//
اس عقیدہ کا اثر سیاسیاتِ عالم پر	۴۴۳
اقوامِ عالم کی قانونی تقسیم اور ان کے حقوق	۴۴۴
مسلمان	//
اہل کتاب	//
شبہ اہل کتاب	۴۴۵
کفار اور مشرکین	//
وحدۃ الادیان	//
تمام سچے مذاہب ایک ہیں	//
دین اور شرعہ، منسک منہاج کا فرق	۴۴۶
صحیفے وقتاً فوقتاً کیوں نازل ہوئے	//
وحدۃ دین پر قرآن کی شہادت	۴۴۷
وحدۃ دین کی دعوت عامہ	۴۴۸
دین قیم	۴۴۹
اسلام اور مذاہب قدیمہ کا اتحاد	//
دین ہمیشہ ایک رہا	۴۵۱
شرعہ اور منہاج میں تبدیلی ہوئی	//
اس کی مثالیں	//
تبدیل قبلہ	//
خانہ کعبہ کے حج کی تعیین	//
یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنی کتابوں پر عمل کرنے کی ہدایت	۴۵۲
مسلمانوں کو شریعت اسلام پر عمل کرنے کا حکم	//
صحیفہ محمدی نے اگلی کتابوں کی تصدیق کی	۴۵۳
اہل کتاب نے اپنی کتابوں کو چھوڑ کر اہوا کی پیروی کی	۴۵۳

مضمون	صفحہ
حدود میں شریعتوں کا اختلاف غیر اہم ہے	۴۵۳
یہود و نصاریٰ فروعی اختلاف پر ایک دوسرے کو باطل کہتے تھے	۴۵۳
وہ مسلمانوں کو یہودیت و نصرانیت کی دعوت دیتے تھے	۴۵۳
اسلام کی دعوت اصل دین ابراہیمی کی جانب	۴۵۳
اسلام کا تمام اہل مذاہب کو یکساں خطاب	۴۵۴
قبول عمل کے لئے ایمان شرط ہے	۴۵۵
ایمان و عمل کے لئے نبی کی تصدیق ضروری ہے	۴۵۵
اسلام کامل تمام رسولوں کی تصدیق ہے	۴۵۵
یہود و نصاریٰ انبیاء کی تکذیب کرتے رہے، اس لئے اصل اسلام سے ہٹ گئے	۴۵۵
یہود و نصاریٰ کا حسن عمل	۴۵۷
اسلام کا اصل الاصول توحید کامل و رسالت عمومی ہے	۴۵۷
اسلام کا ہدایت نامہ ہونا	۴۵۸
توحید کامل کے بغیر نجات کلی کا کوئی مستحق نہیں	۴۵۹
نبوت محمدیؐ کا دعویٰ	۴۵۹
دعوت محمدیؐ میں ہدایت کی بشارت	۴۵۹
اہل مذاہب اور تمام انسانوں کو دعوت محمدیؐ کیوں پیش کی گئی	۴۶۱
تکمیل دین	۴۶۱
قرآن کے سوا کسی صحیفہ نے دین الٰہی کی تکمیل کا دعویٰ نہیں کیا	۴۶۱
حضرت موسیٰؑ کی بشارت ایک آنے والے نبی کے لئے	۴۶۱
حضرت عیسیٰؑ کی بشارت ایک آنے والے نبی کے لئے	۴۶۲

مضمون	صفحہ
موعود الامم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آمد اور اس کا دعویٰ	۴۶۳
وحی الٰہی کی جانب سے تکمیل دین کا اعلان	۴۶۲
تکمیل دین کے اثرات و مظاہر	۴۶۲
قرآن کا مہیمن ہونا	۴۶۳
قرآن کا تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہونا	۴۶۳
قرآن محفوظ ہے اور رہے گا	۴۶۳
اگلی کتابیں تحریفات و تصرفات سے بری نہیں	۴۶۳
قدیم مذاہب دائمی نہ تھے اس لئے دائمی حفاظت کا وعدہ نہ تھا	۴۶۴
قرآن کی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر	۴۶۴
قرآن کے لفظ و عبارت و معانی کی حفاظت کے لئے وعدۂ الٰہی	۴۶۴
قرآن کا غالب ہونا	۴۶۴
ختم نبوت	۴۶۵
وحدتِ ادیان اور دین اسلام	۴۶۵
وحدت دین کا منشا اسلام ہے	۴۶۵
صحیفۂ محمدیؐ نے اہل کتاب کو وحدت دین کی دعوت دی	۴۶۵
وحدت دین کی حقیقت صحیفۂ محمدی میں	۴۶۶
پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان	
۴۶۸_۴۷۱	
یہ اسلام کے سلسلہ ایمانیات کی آخری کڑی ہے	۴۶۸
آخرت کے لفظی معنی اور مفہوم	۴۶۸
آخرت سے مراد عالم بعد الموت ہے	۴۶۹
قرآن میں ایمان باللہ کے بعد سب سے زیادہ زور ایمان آخرت پر ہے	۴۷۰

مضمون	صفحہ
آئندہ زندگی کے دو دور یعنی برزخ و بعثت	۴۷۰
توراۃ و انجیل میں برزخ و بعثت کی تفصیل نہیں	۴۷۰
اسلام اور یوم آخرت کی تفصیل	۴۷۰
اسلام میں تین دور ہائے حیات	۴۷۱
دنیا، برزخ اور قیامت	۴۷۱
ان تینوں دوروں میں فرق	۴۷۱
ا۔ برزخ	
۴۷۲_۵۰۰	
قرآن مجید میں لفظ برزخ اور اس کے معنی	۴۷۲
قبر، برزخ کا عرف عام ہے	۴۷۲
موت و حیات کی منزلیں	۴۷۳
قرآن میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر	۴۷۳
دونوں موتوں اور حیاتوں کی تشریح	۴۷۳
عالم برزخ کی کیفیت	۴۷۳
نیند اور موت کی مشابہت	۴۷۳
نیند اور موت کا فرق	۴۷۴
قرآن میں موت کی تشبیہ نیند سے	۴۷۴
برزخ کی زندگی کی تعبیر نیند سے	۴۷۴
قرآن میں دوسری زندگی کے لئے بعثت کا لفظ	۴۷۵
خواب میں لذت و الم	۴۷۶
خواب کی خیالی دنیا کا جسم پر اثر انداز ہونا	۴۷۶
عالم خواب کی لذت و الم کا خاتمہ بیداری میں	۴۷۶
اور بیداری کی لذت و الم کا خاتمہ عالم خواب میں	۴۷۶
عالم خواب کے لذائذ و آلام کے فلسفیانہ اسباب و علل	۴۷۶
بھولے ہوئے احساسات و معلومات کا خواب میں متشکل ہو کر نظر آنا	۴۷۶

مضمون	صفحہ
اچھے اور برے اعمال کے نقوش ذہن انسانی کے گوشوں میں	۴۷۷
تمثیلی خواب اور اس کی مثالیں	۴۷۷
جسم انسانی میں مختلف مادوں کی کمی بیشی سے خواب میں ان کے متناسب مجسم شکلیں اور ان کی مثالیں	۴۷۷
اعمال انسانی کا خواب میں اپنے متناسب قالب میں مجسم ہونا اور ان کی مثالیں	۴۷۷
اعمال کی تمثیلات قرآن مجید میں	۴۷۸
اعمال کی تمثیلات احادیث میں	۴۸۰
گناہوں کی تمثیلی سزائیں	۴۸۱
آنحضرت ﷺ کے ایک رویائے صادقہ میں مختلف گناہوں کی مختلف تمثیلی سزاؤں کے مناظر	۴۸۱
ان تمثیلات کی تعبیر وتشریح	۴۸۲
علم النفس سے انسان کی لاعلمی	۴۸۳
تصوری یقین اور خارجی وجود کا باہمی تعلق	۴۸۳
قرآن پاک میں یقین کی دو قسمیں	۴۸۴
علم الیقین وعین الیقین	۴۸۴
علم الیقین کے حصول کا ذریعہ ایمان ہے	۴۸۴
علم الیقین کے ذریعہ دوزخ کا مشاہدہ دنیا میں	۴۸۴
موت کے بعد حجاب مادیت کا اٹھنا اور اعمال کے تمثیلی نتائج کو کسی حد تک دیکھنا	۴۸۵
قیام روز جزا پر تمام رازہائے سربستہ کا فاش ہوجانا	۴۸۵
احوال برزخ کا عین الیقین	۴۸۵
موت کے بعد عالم برزخ کی ابتدا	۴۸۶
عالم برزخ میں جزاوسزا کے پس پردہ مشاہدہ کی شہادتیں قرآن مجید میں	۴۸۶
موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت	۴۸۷

مضمون	صفحہ
موت کے لئے قرآن مجید میں خدا کی طرف بازگشت کی اصطلاح اور اس کا مفہوم	۴۸۷
اس وقت کا سماں	۴۸۹
موت کے سماں کا خاکہ قرآن مجید میں	۴۸۹
جسم سے روح کی علاحدگی کے بعد سزا کا دور	۴۸۹
سزا قانون عمل کے مطابق انسانی اعمال کا نتیجہ ہے	۴۹۰
نیکوکاروں کو بشارتیں	۴۹۰
برزخ کا عذاب وراحت	۴۹۰
برزخ میں عذاب وثواب کے مناظر	۴۹۰
برزخ اور اس کے عذاب وثواب کا تذکرہ قرآن مجید میں	۴۹۱
قبر کی اصطلاح	۴۹۴
احادیث میں برزخ کا اصطلاحی نام قبر ہے	۴۹۴
قبر کا مفہوم	۴۹۵
قبر ارواح ونفوس کی دنیا ہے	۴۹۵
قبر کی روحیں جسم خاکی کے بجائے جسم مثالی میں متشکل ہوتی ہیں	۴۹۶
جسم خاکی کی طرح جسم مثالی میں بھی لذت والم کا احساس ہوتا ہے	۴۹۶
بعض سعید روحیں جسم خاکی کی شکل کی قید سے آزاد کردی جاتی ہیں	۴۹۶
مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات	۴۹۶
سوال وجواب	۴۹۶
قبر میں فرشتوں کا توحید ورسالت کے متعلق سوال	۴۹۷
قبر کے سوال وجواب کا ذکر قرآن مجید میں	۴۹۷
سوال وجواب کا اصل مفہوم	۴۹۸
برزخ میں ارواح کا مسکن	۴۹۹

مضمون	صفحہ

آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل

۵۰۱ ـ ۶۳۳

قیامت اور جزائے اعمال

۵۰۱

مضمون	صفحہ
کیا کبھی دنیائے حیات پر بھی موت طاری ہوگی	۵۰۱
نظام کائنات کی بربادی کی پیشینگوئی اہل سائنس کی طرف سے	۵۰۱
قیامت کا عقیدہ مختلف آسمانی کتابوں میں	۵۰۲

قیامت

۵۰۲ ـ ۵۲۶

مضمون	صفحہ
قیامت کے نام قرآن میں	۵۰۲
قیامت کے اوصاف	۵۰۴
قیامت میں فساد نظام ہوگا	۵۰۵
اس کی شہادتیں قرآن مجید سے	۵۰۵
بعد قیامت ایک نئے آسمان اور نئی زمین کی تعمیر	۵۰۷
پچھلی دنیا کے نتائج پر اس کی بنا	۵۰۷
قیامت کی حقیقت	۵۰۸
صور قیامت	۵۱۱
عربوں کا انکار قیامت سے	۵۱۲
اسی لئے اسلام میں توحید کے بعد سب سے زیادہ زور قیامت کے عقیدہ پر دیا گیا	۵۱۳
عقیدۂ قیامت اصول دین کیوں ہے؟	۵۱۴
قیامت پر قرآنی دلائل	۵۱۴
حشر جسمانی	۵۲۰
روحانی زندگی کا تصور نئی جسمانی زندگی سے زیادہ دشوار ہے	۵۲۱
حشر جسمانی ہوگا	۵۲۲
جسم و جسد	۵۲۲
کیا کوئی نیا جسمانی پیکر ہوگا	۵۲۲
نیا جسمانی پیکر جسم خاکی کی خصوصیات و لوازم سے الگ ہوگا	۵۲۳
''خلق جدید''	۵۲۳
ذمہ داری روح پر ہے	۵۲۴
دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے	۵۲۵
اخروی جسم کیسا ہوگا؟	۵۲۶

جزا اور سزا

۵۲۷ ـ ۵۶۵

مضمون	صفحہ
جزا اور سزا دیگر مذاہب میں	۵۲۷
عالم آخرت کا فہم و ادراک	۵۳۱
عالم آخرت کو مادی دنیا کی زبان و محاورات میں سمجھا گیا ہے	۵۳۱
اس طرز افہام سے فلسفی و عامی دونوں تشفی پاتے ہیں	۵۳۲
اخروی وقائع کے سمجھانے کے لئے مادی الفاظ کا استعمال	۵۳۲
''وجود'' کے موجودہ قوانین فطرت اور ان کے خصوصیات و لوازم	۵۳۳
مادی دنیا کے قوانین فطرت اور سلسلۂ علت و معلول اسی مادی عالم کے ہیں	۵۳۳
ضروری نہیں کہ موجودہ قوانین فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں	۵۳۳
اصول اجزا	۵۳۴
اصول فطرت صرف مادیات تک محدود نہیں	۵۳۴

مضمون	صفحہ
اعمال کے لوازم ونتائج	۵۳۴
عقاب وثواب ردعمل ہے	۵۳۵
حصول راحت کا اصول	۵۳۶
نامۂ عمل	۵۳۸
کوئی چیز پیدا ہونے کے بعد فنا نہیں ہوتی	۵۳۸
اعمال کے ریکارڈ ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں	۵۳۸
قرآن مجید میں اس اصول کی تشریح اور اس پر شہادتیں	۵۳۹
اعضا کی شہادت	۵۴۰
میزان	۵۴۲
حساب	۵۴۳
جنت ودوزخ	۵۴۳
جنت انسان کی وراثت ہے	۵۴۴
حضرت آدمؑ کا زمین پر آنا ان کی پیدائش سے پہلے مقدر ہو چکا تھا	۵۴۴
آدم اور بنو آدم کی اصلی جگہ جنت ہے	۵۴۴
جنت کے دو درخت، نیک وبد کی پہچان کا اور زندگی جاوید کا	۵۴۵
آدمؑ کو نیک وبد کی شناخت کے درخت سے روکا گیا	۵۴۵
شیطان نے حیات جاوداں کا درخت کہہ کر نیک وبد کی شناخت کے درخت کو بتا دیا	۵۴۵
حیات جاوداں سے مقصود کیا ہے	۵۴۶
نیک وبد کی تمیز ہی شرعی تکلیف کا باعث ہے	۵۴۶
آدم کو نیک وبد کی تمیز کا فطری الہام	۵۴۶
انسان کا تکلیف شرعی کی امانت کو قبول کرنا اور حیاتِ جاوداں کا حصول سعی وعمل پر موقوف ہونا	۵۴۶
زمین پر بنو آدم کی چار چیزوں کھانے پینے پہننے اور اوڑھنے کی ضروریات کا پیدا ہونا	۵۴۷
مذہب نے ان ضروریات اربعہ کے جائز طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کی تلقین کی	۵۴۷
جنت کی وراثت کا وعدۂ الٰہی	۵۴۸
انسانی جزا وسزا کے تین گھر	۵۴۸
انسان کا پہلا دار الجزا یعنی دنیا	۵۴۹
مگر یہ دار الجزا فانی ہے	۵۵۲
یہ دار الجزا دار الاصلاح بھی ہے	۵۵۴
انسانوں کی تنبیہ واصلاح کے مراتب	۵۵۴
نیکی سے برائی کا کفارہ	۵۵۴
توبہ کفارہ ہے	۵۵۵
مصائب کی تنبیہ اور کفارہ	۵۵۷
عذاب الٰہی کا مقصد	۵۶۰
عذاب برزخ بھی کفارہ ہے	۵۶۰
عذاب دوزخ کفارۂ گناہ ہے	۵۶۲
عذاب انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے	۵۶۴
انسان کی تخلیق رحمت کے لئے ہوئی	۵۶۵

دوزخ
۵۹۸_۵۶۶

مضمون	صفحہ
دوزخ قید خانہ نہیں شفاخانہ ہے	۵۶۶
گناہ روحانی بیماری کا اور عذاب اس کے نتیجۂ بد کا اصطلاحی نام ہے	۵۶۷
دوزخ کی مثال شفاخانہ ہے	۵۶۷
دوزخ سے بالآخر نجات ہوگی	۵۶۷
گویا دوزخ بھی ایک نعمت ہے	۵۶۸
دوزخ میں رحمت الٰہی کا ظہور اور نجات	۵۷۰

مضمون	صفحہ
اس کی تصریحات احادیث میں	۵۷۰
شرک وکفر کی بخشائش نہیں	۵۷۳
کیادوزخ کی انتہا ہے؟	۵۷۴
دوزخ رحمت الٰہی کی چھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائے گی	۵۷۵
اللہ کے غضب پر رحمت کی سبقت	۵۷۵
دوزخ کی انتہا قرآن مجید میں مشیت پر ہے	۵۷۶
کفار ومشرکین کے عذاب کی انتہا مشیت الٰہی پر موقوف ہے	۵۷۷
قرآن مجید کی کوئی آیت دوزخ کے تسلسلِ وجود پر دلالت نہیں کرتی	۵۷۷
قرآن مجید میں بہشت کے عدم انقطاع کی تصریح کی گئی	۵۷۸
قرآن مجید سے اس کی تصریح	۵۷۸
اس کی شہادت حدیثوں میں	۵۷۹
دفع شبہہ	۵۸۰
قرآن مجید کی بعض آیتوں سے دوزخ کے دوام کا شبہہ	۵۸۰
اس شبہہ کا ازالہ	۵۸۰
چند آیتوں میں کفار کے دوزخ سے الگ نہ ہونے کی تصریح	۵۸۲
ان آیات کا مفہوم	۵۸۳
اللہ تعالیٰ کے وعدۂ عذاب وثواب میں فرق	۵۸۳
مشرکین وکفار کی معافی کی صریح تصریح کیوں نہیں	۵۸۴
عقیدۂ کفارہ اور عقیدۂ کرم اور عقیدۂ مغفرت	۵۸۴
عذاب طویل کا سبب	۵۸۵
مشرک وکافر کا آخر انجام؟	۵۸۵
جمہور کے نزدیک عذاب دوزخ کا دوام	۵۸۸
بہشت ودوزخ کی جزاوسزا بھی تمثیلی ہے	۵۹۱
تمثیلی سزا کے معنی	۵۹۱
اس کی مثالیں قرآن مجید اور احادیث سے	۵۹۳
دوزخ کی جسمانی سزائیں	۵۹۴
جسمانی سزاؤں کی تصریح قرآن مجید سے	//
دوزخ میں روحانی سزائیں	۵۹۶
ان کی تصریح قرآن مجید سے	۵۹۷
جنت	
۵۹۹_۶۳۳	
جنت کے نام	۵۹۹
جنت کا دوام	۵۹۹
اس کی تصریح قرآن مجید میں	۵۹۹
دائمی قیام سے اہل جنت کا جنت میں گھبرانا ان کی جبلت وفطرت کے خلاف ہوگا	۶۰۳
غیر فانی بادشاہی	۶۰۳
جنت کے عیش ومسرت کی تعبیر آسمانی بادشاہی سے	۶۰۳
عیسوی پیغام میں آسمانی بادشاہی	۶۰۳
آسمانی بادشاہی کے اجمال کی اسلامی تفصیل	۶۰۴
جنت کے لئے باغ کا استعارہ کیا عرب کے لئے ہے	۶۰۶
اس استعارہ میں ایک نکتہ	۶۰۶
سامان جنت کے دنیاوی نام	۶۰۶
جنت میں دنیاوی الفاظ کے معانی سے بلند تر حقائق	۶۰۶
اس کی شہادت قرآن مجید واحادیث سے	۶۰۶
جنت کی مسرتیں اعمال کی تمثیل ہیں	۶۰۹
اس کی شہادت قرآن مجید اور احادیث سے	۶۰۹

مضمون	صفحہ
لطف ومسرت کا تصور	۶۱۴
لطف ومسرت کا اعلیٰ ترین تخیل	۶۱۵
جنت میں انسان کی ہر خواہش پوری ہوگی	۶۱۵
جنت، جہاں کوئی جسمانی وروحانی آزار نہیں	۶۱۶
جنت، جہاں رشک وحسد نہیں	۶۱۷
وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی؟	۶۱۸
جنت ارتقائے روحانی ہے	۶۱۹
مسئلۂ ارتقا کے اصول بقائے اصلح کا عمل	
روحانی مدارج کے ارتقا میں	۶۲۰
امن وسلامتی کا گھر	۶۲۱
مقام رحمت	۶۲۲
مقام نور	۶۲۳
مقام رضواں	۶۲۳
مقام طیب وطاہر	۶۲۵
مقام تسبیح وتہلیل	۶۲۶
صبح وشام کی روزی	۶۲۷
مقام قرب	۶۲۸
دیدار الٰہی	۶۲۸
ان تعلیمات کا عملی اثر	۶۲۹
عرب کا ایمان ویقین اور صحابہ کی خشیت الٰہی	۶۳۱
قضا وقدر ۶۳۴-۶۴۸	
کیا عقیدۂ قضا وقدر ایمانیات میں ہے	۶۳۴
عقیدۂ قضا وقدر کا ماحصل	۶۳۴
اس عقیدہ کی تعلیم قدیم مذاہب میں	۶۳۴
خاتم النبیین (ﷺ) کی تعلیم نے اس کی کیا تکمیل کی اور کیا اثرات پیدا ہوئے	۶۳۵
اصطلاح قدر وقضا کی تشریح	۶۳۷
اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت	۶۳۷
عقیدۂ قضا وقدر کی توضیح	۶۳۸
عقیدہ قضا وقدر کا نتیجہ پستی سستی ودون ہمتی نہیں	۶۳۹
اس کا نتیجہ بلندی استقلال اور صبر وثبات ہے	۶۳۹
غلط فہمی کا ازالہ	۶۴۰

مضمون	صفحہ
قضا وقدر اور سعی عمل کی باہمی تطبیق	۶۴۱
پہلے فسق اور نافرمانی ہوتی ہے اس کے نتیجہ میں خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے	۶۴۱
جبر وقدر	۶۴۱
جبر وقدر کا مسئلہ لاینحل	۶۴۱
قدیم مذاہب میں اس کے حل کی دو صورتیں یا تو خاموشی یا جبر کی تلقین	۶۴۲
آنحضرت ﷺ نے اس راز کو ظاہر کیا	۶۴۲
بیک وقت دو صداقتیں	۶۴۲
صحیفۂ محمدی میں ان دونوں صداقتوں کی تفصیل اور ان کی تشریح	۶۴۳
ہدایت وضلالت کے الفاظ سے پیدا شدہ غلط فہمی کا ازالہ	۶۴۵
''خیر وشر'' کا مفہوم اسلام میں	۶۴۶
''اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت دیتا'' کی تفسیر	۶۴۶
بندہ کی مشیت	۶۴۷
اللہ کی گمراہی کن کے لئے ہے؟	۶۴۷
نتیجہ بحث	۶۴۸
ایمان کے نتائج ۶۴۹-۶۵۴	
خلاصہ مباحث	۶۴۹
ایمان کا مقصد دل کی اصلاح ہے	۶۴۹
اسلام میں ایمان وعمل کی جامعیت	۶۴۹
درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے	۶۵۰
اہل ایمان کی عملی شناخت	۶۵۱
تمام نیکیاں صرف ایک جڑ ایمان کی شاخیں ہیں	۶۵۴
ایمان کے بعد عمل کی ضرورت	۶۵۴
ایمان ملزوم اور اعمال اس کے لوازم ہیں	۶۵۴
خاتمہ	۶۵۴
اشاریہ ۶۵۷-۶۷۵	
اشخاص	۶۵۷
کتب	۶۶۵
مقامات	۶۶۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اے باز کنِ درمعانی برما بکلید آسمانی
ہر چہ از توگماں برم بچونی آں من بوم و توزاں برونی

شاہِ رسل وشفیع مرسل خورشید پسین و نورِ اول
سلطانِ ممالک رسالت طغرائے صحیفۂ جلالت (خسرو)

پیش نظر کتاب سیرۃ النبی ﷺ کے سلسلہ کی چوتھی جلد ہے۔ اس کا موضوع ''منصبِ نبوت'' ہے۔ اس تقریب سے سب سے پہلے اس میں ایک مقدمہ ہے۔ جس میں نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازم وخصوصیات کی تشریح ہے۔ اس کے بعد دیباچہ ہے جس میں آنحضرت ﷺ کی ولادت اور ظہور اسلام کے وقت دنیا کی مذہبی واخلاقی وروحانی حالت کا مرقع دکھایا گیا ہے۔ بالخصوص آنحضرت ﷺ سے پہلے ملک عرب کی جو مذہبی واخلاقی حالت تھی اور اس کی اصلاح میں جو دقتیں درپیش تھیں شرح وبسط کے ساتھ ان کی تفصیل کی گئی ہے۔
اسکے بعد آپ ﷺ کے تعلیمات وارشادات کی تفصیل سے اصل کتاب کا آغاز ہوا ہے۔
آنحضرت ﷺ کو پیش گاہ باری سے جو شریعت کاملہ اور قانونِ ابدی عطا ہوا وہ

درحقیقت چار عنوانوں پر منقسم ہے، عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات، خیال تھا کہ عقائد و عبادات کی ایک جلد ہو اور اخلاق و معاملات دوسری جلد میں ہوں، مگر جیوں جیوں مسافر قلم اس دشوار گذار مرحلہ میں آگے بڑھتا گیا، راستہ اسی قدر وسیع اور مسافت اتنی ہی بعید نظر آنے لگی، ناچار اس جلد کو صرف عقائد کے بیان پر محدود رکھا گیا، دوسری جلد میں عبادات اور ان کی حقیقت اور فرائضِ چہارگانہ کے حقائق وفوائد سے بحث ہوگی اور تیسری جلد کا عنوان اخلاق و معاملات ہوگا جس میں ہم انشاء اللہ بہ تفصیل بتائیں گے کہ تمدن و معاشرت بالخصوص قوانینِ نکاح، طلاق، وراثت، حقوقِ نساء، غلامی، جہاد، اصول حکمت اور اقتصادیات وغیرہ کے متعلق تمام دنیا کے مذاہب کے کیا اصول اور تمام سلطنتوں اور قوموں کے کیا قوانین تھے اور آج مغرب نے اس انتہائی تہذیب تک پہنچ کر کس حد تک ان امور میں ترقی کی ہے، پھر موازنہ کرکے ہم دکھائیں گے کہ شریعت اسلام کے مقابلہ میں مغرب کی معراجِ ترقی شریعت اسلام کا پایۂ اولین ہے۔

حضرت الاستاذ مرحوم نے اس جلد کا کام شروع ہی کیا تھا اور مذکورہ بالا مباحث میں سے صرف عرب جاہلیت کے مذہبی واخلاقی حالات کے پچیس تیس صفحے لکھنے پائے کہ وفات پائی، یہ صفحے بھی ان اوراق میں شامل ہیں، مگر چونکہ ان میں بکثرت اضافہ و ترمیم کی ضرورت ہوئی ہے اس لئے ان صفحات کو ان کے اسم گرامی کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرتا ہوں، اس بقیہ پوری کتاب کی ذمہ داری خاکسار ہی کے خطا کار قلم پر ہے۔ وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ (یوسف۔۲۱:۳۵)۔

کوشش کی ہے کہ ان اوراق میں پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام و تعلیم کو پوری تشریح استناد، استدلال اور دلچسپی کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے، قرآن پاک کے استناد کو ہر موقع پر سب سے آگے رکھا گیا ہے اور اسی کے پرتو میں احادیث صحیحہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، مناظرانہ پہلو سے بچ کر ہر پیش نظر مسئلہ میں اسلام کا دوسرے مذاہب سے اس غرض سے موازنہ کیا گیا ہے تاکہ اسلام کی تکمیلی شان نمایاں ہوجائے۔

ان اوراق کے لکھنے والے کے نزدیک نسخ شریعت کے معنی کسی حکم کو اس کے غلط یا غیر مفید ہونے کے سبب سے سرے سے مٹا کر کسی دوسرے حکم کو نافذ کرنے کے نہیں ہیں، بلکہ محرف

احکام کی جگہ پر اصل احکام کے دوبارہ نازل ہونے اور دنیا کے حسب حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلہ کامل تر تعلیمات دیے جانے کے ہیں، اس لئے قرآن پاک کے ناسخ کتب اور اسلام کے ناسخ ادیان ہونے کے معنی ان کے مٹا دینے والے کے نہیں بلکہ ان کی تکمیل کرنے والے کے ہیں۔ مذاہب کی تاریخ جیسے شروع ہوتی ہے، ہر مذہب اور اس کی کتاب انسانی عروج وترقی کی ایک ایک منزل ہے اور اسلام اس عروج وترقی کی وہ انتہائی منزل مقصود ہے جس کے بعد تکمیل دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے جیسا کہ خود اس کا دعویٰ ہے اور اس دعویٰ میں کوئی اور دین اس کا شریک نہیں ہے کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (مائدہ۔۵:۳)۔

ان تکمیلی مباحث میں سے یہ جلد صرف عقائد پر مشتمل ہے اور کون نہیں جانتا کہ مذاہب میں اعتقادات کی حیثیت کتنی اہم اور ان کی بحث کتنی نازک ہے، اس لئے اس خارزار سے کسی آبلہ پا کا بہ سلامت گذر جانا کس قدر مشکل ہے، تاہم میں نے جدوجہد اسی کی کی ہے کہ کسی آبلہ کو ٹھیس لگے بغیر اس راستہ کو طے کرلوں، چلنے والا تو تھک کر چور ہے، اب یہ دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے رہروی کی یہ شرط کہاں تک پوری کی۔

ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقہ کے مطابق اگر عقائد کی کتاب لکھی جاتی تو یہ منزل نہایت آسان تھی کہ ان میں سے ہر ایک کی مدون مرتب کتابیں سامنے ہیں لیکن مجھے اس جلد میں کسی خاص فرقہ کے نہیں اسلام کے وہ عقائد لکھنے تھے جن پر ایمان لانے کا قرآن نے ہم سے مطالبہ کیا ہے اور جن کی تعلیم محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو دی تھی، چنانچہ ان اوراق میں ان ہی چند عقائد کی تشریح ہے اور یہ وہی ہیں جو اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی میں مذکور ہیں، یعنی خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں پر اور آخری دن اور قضا وقدر پر ایمان، چنانچہ اس جلد میں مقدمہ و دیباچہ کے بعد ان ہی چھ باتوں کی تفصیل وتشریح ہے۔

میں نے اپنے جانتے اس کی پوری احتیاط کی ہے کہ کسی مسئلہ کی تشریح میں قلم صراط مستقیم

سے تجاوز نہ کرے، لیکن عالم الغیب جانتا ہے کہ قدم نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے، اس لئے اس کی بارگاہ میں نہایت عجز سے دعا ہے کہ خداوندا میری لغزش کو دوسروں کی لغزش کا سبب نہ بنانا اور ہم سب کو سیدھی راہ دکھانا۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِیْ　　جس کو خدا راہ دکھائے وہ راہ پایا ہوا ہے ۔

(اعراف۔۷:۱۷۸)

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ　　اور جس کو خدا راہ دکھائے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔

(زمر۔ ۳۹:۳۷)

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا　　ہمارے پروردگار ہمارے بھول چوک کی باز پرس ہم سے نہ فرما !

(بقرہ۔۲:۲۸۶)

این نامہ کہ خامہ کرد بنیاد　　توقیعِ قبول، روزیش باد

طالب رحمت

سید سلیمان ندوی

۵۲ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ
دار المصنّفین، اعظم گڑھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

منصبِ نبوت

کتاب کا موضوع آپ کے پیغمبرانہ کارنامے: سیرت کی عام کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے واقعاتِ زندگی کے اندر جو چیز سب سے زیادہ ممتاز ہو کر نظر آتی ہے وہ غزوات اور لڑائیاں ہیں، لیکن یہ غزوات اور لڑائیاں ظاہر ہے کہ مقصود بالذات نہ تھیں بلکہ وہ سلسلۂ دعوت میں اتفاقاً پیش آ گئیں، آنحضرت ﷺ نے عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا اور نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کے مٹانے کی پرزور کوشش کی، اس کے قبول کرنے والوں کو ستایا اور ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا وہ اپنی جان بچا کر دوسرے شہر کو چلے گئے، وہاں ان کی دعوت نے فروغ پایا اور بہت بڑی تعداد نے اس کی سچائی کو قبول کیا، یہ دیکھ کر مخالفوں نے ہر طرف سے یورش کی اور چاہا کہ اس جماعت کو بہ زورِ شمشیر مٹا دیں، اس نے اپنی جان کے بچاؤ کی تدبیریں کیں اور ان کی پرزور سازشوں اور کوششوں کے سیلاب کو پہاڑ بن کر روکا، اس کشمکش نے خوں ریز لڑائیوں کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا جو متصل دس سال تک قائم رہا، رفتہ رفتہ اعجازِ نبوت، حسنِ تدبیر، لطفِ اخلاق سے تمام معرکے سر ہوئے اور پھر ایک پرامن نظام قائم ہو گیا، بے شبہ یہ کارنامہ بھی کچھ کم مستوجبِ منقبت نہیں لیکن ناظرین اس نکتہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوں گے کہ ہم کس (ذاتِ اقدس ﷺ) کے سوانح لکھ رہے ہیں۔

یہ جو کچھ ہوا اور پیش آیا وہ گو نہایت عجیب، حیرت انگیز اور کرشمۂ ربانی کا پورا مظہر ہے تاہم وہ درحقیقت آنحضرت ﷺ کا اصلی براہ راست اور مقصود بالذات کارنامہ نہیں، وہ اتفاقی حوادث ہیں

جو اسلام کی دعوت واشاعت کی راہ میں دشمنوں کی مخالفت سے پیش آ گئے، آپ ﷺ کے اصلی پیغمبرانہ کارنامے وہ ہیں جو اگر یہ اتفاقی واقعات رونما نہ ہوئے ہوتے تب بھی ظاہر ہی ہوتے اور وہی آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ کے اصلی وقائع اور سوانح ہیں، یعنی عرب میں سرتاپا روحانی واخلاقی انقلاب پیدا کر دینا، تمام عالم کے سامنے کامل ترین اور اخیر شریعت کو پیش کرنا، دنیا کے گوشہ گوشہ کو ترانہ توحید اور سرودِ محبت سے معمور کرنا، ظلمت کدۂ عالم کو سراجِ منیر بن کر بقعۂ نور بنا دینا، گمراہوں کو راستہ بتانا، بھولوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا، غلط اوہام کو مٹانا، اخلاقِ فاضلہ سکھانا، گناہوں کے دفتر کو دھونا، انسانوں کو شیطانوں کے دامِ فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا، دنیا کو رفق و محبت، لطف وشفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا، حکمت و دانائی، پند وموعظت اور تہذیب و تمدن کے رموز سکھانا، روحانیت کی برباد شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر اور قلوب وارواح کے ویران گھروں کی ازسرِنو آبادی، الغرض خاتم النبیین ﷺ کا اصلی کام ایک شریعتِ ابدی کی تاسیس، مذاہب عالم کی اصلاح، فنِ اخلاق کی علمی وعملی تکمیل، قانونِ الٰہی کا اظہار وعرض اور تہذیبِ نفوس کی معراجِ اخیر تھی اور یہ سب اسی پرآشوب زمانہ میں ہوتا رہا جس کے لیل ونہار بہ ظاہر صرف حملوں کے تیر باراں کے روکنے میں صرف ہو گئے، پیشِ نظر جلد آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارکہ کے ان ہی واقعات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔

نبی اور مصلح اور حکیم: بہ ظاہر نظر آتا ہے کہ اس قسم کے کچھ کام ایسے لوگوں سے انجام پاتے ہیں جو نبوت اور رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہوتے، وہ اپنی قوم وملک کے سامنے اپنی اصلاح کی دعوت پیش کرتے ہیں اور سعی ومحنت اور متواتر جدوجہد سے ان میں کوئی سیاسی، اجتماعی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرتے ہیں اور ان کو قعرِ مذلت سے نکال کر ترقی کی سطحِ مرتفع تک پہنچا دیتے ہیں ایسے لوگوں کو مصلح اور ریفارمر کہتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے منہ سے اخلاق وحکمت اور پند وموعظت کے موتی جھڑتے ہیں جن کو حکیم کہتے ہیں، اس حالت میں ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کیا فرق ہوگا؟ اس التباس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے کوتہ نظر ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اور اس بنا پر اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں اس فرق وامتیاز کو

نمایاں کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

نبوت کی حقیقت اور خصوصیات: اس فرق کو پوری طرح واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے نبوت کی حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرلی جائے۔ نبوت کی فلسفیانہ حقیقت کی بہترین تشریح امام غزالیؒ نے معارج القدس (۱) اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغۃ میں کی ہے، یہ دونوں بزرگ تصوف، فلسفہ اور نقلیات تینوں کوچوں سے باخبر ہیں اس لئے یہ جو کچھ بتائیں گے اس میں کچھ کچھ ذاتی ذوق ومشاہدہ کا حصہ بھی شامل ہوگا۔

امام صاحب فرماتے ہیں:

''نبوت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے...... وہ عطیۂ الٰہی اور موہبتِ ربانی ہے، سعی ومحنت اور کسب وتلاش سے نہیں ملتی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے''۔(۲)

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ. — اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں وہ اپنی پیام بری کا منصب بنائے۔

(الانعام ۶:۱۲۵)

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (۳) — اور اسی طرح ہم نے تیرے پاس اپنے حکم سے ایک روح بھیجی تو پہلے نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا؟ لیکن اس کو ہم نے ایک نور بنایا ہے جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ بجھائیں۔

(شوریٰ ۴۲:۵۲)

اس موقع کے لئے صریح آیت یہ ہے:

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ. — یہ (نبوت) خدا کا فضل ہے جس کو وہ چاہے دے۔

(جمعہ ۶۲:۴)

گو یہ صحیح ہے کہ وہ عبادات وریاضات جو فکر ومراقبہ پر مشتمل اور ریا اور شہرت طلبی سے پاک ہوں نفس میں آثارِ وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، تاہم نبوت کا منصبِ خاص محض اتفاقی نہیں جو محنت اور کوشش سے کسی کو حاصل ہو جائے بلکہ جس طرح نوع انسانی کا انسان

---

(۱) معارج القدس کا یہ حصہ حضرت الاستاذ مرحوم نے الکلام کے آخر میں بہ طور ضمیمہ شائع کر دیا ہے۔(یہ ضمیمہ عربی عبارت میں الکلام کے قدیم اڈیشن مطبوعہ نامی پریس کان پور ۱۹۰۴ء (ص ۲۵۹ تا ۲۷۸) میں شامل تھا مگر بعد کے اڈیشنوں میں صرف اردو خلاصہ ہی شامل ہے۔''ض'' (۲) معارج القدس بحوالہ ضمیمہ الکلام ص ۲۶۰، ۲۶۱، نامی پریس کان پور (۳) امام صاحب نے آیت پوری نہیں لکھی ہے میں نے اپنی طرف سے آیت پوری لکھ دی ہے۔

اور فرشتوں کا فرشتہ بن جانا ان کے افراد کی سعی ومحنت کا مرہونِ منت نہیں ہے اسی طرح نوعِ انبیا کا نبی بن جانا ان کے افراد کی کوشش اور محنت سے ممکن نہیں، ہر انسان کا بچہ اپنی ذاتی محنت سے نہیں بلکہ فیاضِ عالم کی بخشش سے انسانیت کا مرتبہ حاصل کرتا ہے، مگر انسانیت کے ممکن کمالات کو بالفعل حاصل ہو جانے کے لئے اس کو یقیناً کچھ نہ کچھ جدوجہد کرنی پڑتی ہے، اسی طرح نبوت نوعِ انبیا کے لئے اکتسابی چیز نہیں لیکن منشائے نبوت کے مطابق ریاضت اور عمل، قبولِ وحی کی استعداد اور تیاری کے لئے البتہ ضروری ہیں۔

چنانچہ اسی اصول کے مطابق اکثر پیغمبروں کے آغاز وحی کے حالات میں آپ کو یہ ملے گا کہ انہوں نے ایک زمانہ تک عبادت ومراقبہ میں عمر بسر کی، ایک ایک مہینہ ایک ایک چلہ اس طرح گذارا کہ وہ مادی دنیا کی آلائشوں سے یکسر الگ ہو گئے، توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کی نسبت ہے کہ کتاب ملنے سے پہلے وہ چالیس روز تک کوہِ طور پر روزہ کی حالت میں رہے، اسی طرح انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے کہ وہ ایک سنسان جنگل میں چالیس روز تک روزہ رکھ کر عبادتوں میں مصروف رہے اور وحی سے پہلے آنحضرت ﷺ کا غارِ حرا میں مہینوں عزلت گزیں رہنا اور فکر ومراقبہ اور عبادت اور ریاضت میں مصروف رہنا سب کو معلوم ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ نبوت سے پہلے حرا میں جا کر جب عبادت میں مشغول ہوئے تو رویائے صادقہ دیکھنے لگے جس کی سچائی مثل سپیدۂ صبح کے صاف نمایاں ہوتی تھی، وحی کے بعد بھی آپ ﷺ اس قدر عبادت میں مصروف رہتے تھے کہ آپ کے دونوں پاؤں سوج جاتے تھے اسی لئے قرآن نے آپ کو خطاب کر کے کہا:

طٰہٰ. مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤى.	(اے پیغمبر!) ہم نے یہ قرآن تجھ پر اس لئے نہیں اتارا کہ تو تکلیف اٹھائے۔
(طٰہٰ ۲۰:۱،۲)	

اس عبادت وریاضت کے ساتھ نبوت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے حامل حسنِ صورت، اعتدالِ مزاج، نشوونما کی پاکی، حسنِ تربیت، طہارتِ نسب، کرمِ اخلاق، نیکی طینت، متانت، سنجیدگی، دوستانِ الٰہی کے ساتھ نرم خوئی اور تواضع اور دشمنانِ حق کے ساتھ شدتِ قوت پائی جائے، علاوہ بریں وہ راست

گفتار، امانت دار، تمام برائیوں سے پاک، فضائل ومحاسن سے آراستہ اور ذلیل باتوں سے مبرا ہوتا ہے، وہ ظلم کرنے والوں کو معاف اور اپنے ساتھ برائی کرنے والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہے، قرابت مندوں اور ہم سایوں کے ساتھ احسان، مظلوموں کی اعانت، فریاد خواہوں کی فریاد رسی، اس کی طینت اور نیکی سے محبت اور بدی سے نفرت اس کی فطرت ہوتی ہے، اس کی شان جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے یہ ہوتی ہے کہ:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (نجم ۵۳:۲) تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ گمراہ ہوا اور نہ بہکا۔

اس کی یہ صفت دنیاوی عالم میں ہے کہ وہ ہر گمراہی و بے راہ روی سے پاک ہوتا ہے:

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (نجم ۵۳:۱۷) اس کی نگاہ نہ کج ہوئی اور نہ سرکش ہوئی۔

یہ اس دنیا کے مناظر اور مشاہدات کے متعلق اس کی کیفیت ہوتی ہے۔

تمام دنیا کی قوتیں اس کی قوت کے سامنے بالآخر طوعاً و کرہاً سرنگوں ہو جاتی ہیں، بایں ہمہ وہ مغرور، جابر، جفاپیشہ، بدخو اور درشت مزاج نہیں ہوتا، وہ پیغمبری اور رسالت کے بارِ عظیم کو اٹھاتا ہے اور اس کا پورا حق ادا کرتا ہے اور تمام عالم میں اپنی رحمت کا فیض جاری کرتا ہے۔

نبوت ورسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ: نبوت کے ثبوت کے دو طریقے ہیں، ایک اجمالی اور دوسرا تفصیلی، اجمالی طریقہ یہ ہے کہ جس طرح انسان کو حیوان پر نفسِ ناطقہ کی بنا پر فضیلت حاصل ہے، کہ یہ عقلی و دماغی خصوصیت حیوان میں نہیں پائی جاتی جس کے بل پر انسان حیوان پر حکمرانی کرتا ہے اور اس کا مالک بنا ہوا ہے اور اس کو اپنے کام میں لگائے ہوئے ہے، اسی طرح انبیا علیہم السلام کو اپنے نفوسِ قدسیہ کی بنا پر تمام انسانوں پر برتری حاصل ہے، وہ اپنے ان قدسی نفوس اور پیغمبرانہ قوت سے دوسروں کو راہ راست سوجھاتے اور خود راہ راست پر قائم رہتے ہیں، ان کی پیغمبرانہ عقل وفہم تمام انسانی عقلوں سے بالاتر ہوتی ہے اور ان کو وہ ربانی خصوصیت حاصل ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ تمام انسانی نفوس کی تدبیر کا فرض انجام دیتے اور ان پر قابو پاتے اور ان کو کام میں لگاتے ہیں اور جس طرح انسانوں کے عجیب وغریب کام حیوانوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں اسی طرح پیغمبروں کے عجیب وغریب کام انسانوں کو معجزہ نظر آتے ہیں۔

اور اگر چہ نبی عام انسانوں کے ساتھ بشریت اور انسانیت میں برابر کا شریک ہوتا ہے، مگر عقلیت و معنویت میں وہ ان سے بالکل الگ ہوتا ہے کیوں کہ اس میں وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی، اسی مفہوم کو قرآن نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (کہف ۱۸:۱۱۰) میں تمہاری ہی طرح بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

دیکھو کہ بشریت میں گو پیغمبر کو دوسرے انسانوں کے مثل کہا ہے، مگر ساتھ ہی وحی کے فرق و امتیاز کو دونوں میں حد فاصل قرار دے دیا ہے۔

نبوت کے تفصیلی ثبوت کے تین طریقے ہیں:

پہلا طریقہ: انسان میں تین قسم کے اختیاری حرکات پائے جاتے ہیں، فکری، قولی، عملی، ان تینوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی، فکر یعنی رائے صحیح بھی ہوتی ہے اور غلط بھی، قول سچ بھی ہوتا ہے اور جھوٹ بھی، عمل اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح اور غلط، سچ اور جھوٹ اور اچھے اور برے میں تمیز کیوں کر ہو؟ پھر کیا یہ تمیز ہر شخص کر سکتا ہے یا کوئی نہیں کر سکتا، یا بعض کر سکتے ہیں اور بعض نہیں، پہلے دو احتمال بداہتاً غلط ہیں اب رہ گیا تیسرا احتمال یعنی بعضے انسان ایسے ہوتے ہیں جو ان حدود کو متعین کر سکتے ہیں کہ فلاں رائے و عقیدہ صحیح اور فلاں غلط ہے، فلاں قول سچ فلاں جھوٹ ہے اور فلاں فعل اچھا اور فلاں برا ہے، جس شخص کو خالقِ فطرت اپنے فضل و کرم سے یہ قوت عطا فرماتا ہے وہی پیغمبر اور صاحب شریعت ہوتا ہے۔

دوسرا طریقہ: نوعِ انسان کو اپنے اختیاری اعمال و حرکات اور مصلحتی معاملات میں باہمی اجتماع اور تعاون کی ضرورت ہے، اگر انسانوں میں باہم یہ اجتماع اور تعاون نہ ہو تو نہ تو انسان کا کوئی فرد زندہ رہے نہ جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ہو سکے، اسی بقائے نفس اور جان و مال و آبرو کے تحفظ کے اصول و آئین کا نام شریعت ہے، انسان کو اس کے لئے دو قسم کے کاموں کی ضرورت ہے، ایک یہ کہ اچھے کاموں میں سب مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں اس کو تعاون کہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ برے کاموں سے ایک دوسرے کو باز رکھنے کی کوشش کریں اس کو تمانع کہتے

ہیں، اسی تعاون کے ذریعہ سے انسان، کھانے، پہننے اور رہنے کے سامان و اسباب فراہم کرتا ہے، تعاون کے ذریعہ نکاح و قرابت، اولاد و اعزہ اور احباب و دوست کے حقوق و تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور تمانع کے ذریعہ سے نوع انسانی اور افراد انسانی کی زندگی اور ان کی دولت و جائداد اور عزت و آبرو کے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے، اس تعاون اور تمانع کے اصول ضرور ہے کہ مرتب، محدود اور معلوم ہوں اور وہ اس طرح بنائے جائیں جن میں کسی شخص، خاندان، قبیلہ، قوم اور ملک کے فوائد کی ترجیح نہ ہو بلکہ ان میں سب کا برابر فائدہ ہو، یہ ظاہر ہے کہ ایسا قانون انسانوں کے ذریعہ نہیں بلکہ وحی ربانی اور تعلیم الٰہی سے بن سکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ محض کسی انسان کی عقل سے جو بہرحال کوئی خاص شخص یا کسی خاص خاندان، قبیلہ قوم اور ملک کا ہوگا ایسا غیر جانب دارانہ قانون جس میں تمام مخلوقات کی حیثیت یکساں ہو اور کسی طرف پلہ جھکنے نہ پائے اور تمام عالم کے لئے یکساں واجب العمل ہو محال ہے، اس لئے ضرور ہے کہ یہ اصول اس کی طرف سے وحی ہوں جس کے ہاتھ میں نظام عالم کی باگ ہے اور جو پورے نوع انسانی کے اندرونی و بیرونی احوال و کیفیات کے رموز سے باخبر ہے، یہ اصول خلاق عالم کی طرف سے جس شخص پر وحی ہوتے ہیں وہی پیغمبر اور رسول ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ: یہ وہ طریقہ ہے کہ جس نے اس کو نہیں جانا، اس نے نبوت کی حقیقت نہیں پہنچانی، پہلے یہ جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے دو کام ہیں، خلق (پیدا کرنا نیست سے ہست کرنا) اور امر (جو موجود و ہست ہے، اس کو اپنی مصلحت کے مطابق حکم دینا) کائنات ان ہی دو چیزوں سے عبارت ہے تو جس طرح فرشتے خالق اور مخلوق کے درمیان خلق و ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی میں واسطہ ہیں، اسی طرح پیغمبر خدا اور بندہ کے درمیان احکام پہنچانے میں واسطہ ہیں اور جس طرح خدا پر بہ حیثیت خالق اور آمر (پیدا کرنے والے اور حکم دینے والے) کے ایمان لانا واجب ہے، اسی طرح فرشتوں پر اس حیثیت سے کہ وہ خالق و مخلوق کے درمیان ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی کے واسطہ ہیں ایمان لانا ضروری ہے اور اسی طرح پیغمبروں پر اس حیثیت سے ایمان لانا فرض ہے کہ وہ خدا اور بندہ کے درمیان حکم کے پہنچانے میں واسطہ ہیں۔

اس کے بعد حسب ذیل مقدمات ذہن نشین رکھنے چاہئیں۔

۱-چوں کہ ممکن کا وجود اور عدم برابر ہے اس لئے ممکن ہے کہ وجود میں آنے کے لئے ایک مرجح کا ہونا ضروری ہے جس کی وجہ سے وجود کو عدم پر ترجیح ہو اور وہ شے عدم سے وجود میں آسکے یہی امرِ مرجح ممکن کی علت ہوتا ہے۔

۲-ہر قسم کے حرکات کے لئے ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے، جو دم بہ دم حرکت کی تجدید کرتا ہے، حرکات کی بھی دو قسمیں ہیں، طبعی اور ارادی، ارادی حرکت کے لئے ضرور ہے کہ اس کے محرک میں ارادہ اور اختیار پایا جائے اسی طرح طبعی حرکت کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ اس کا محرک عقل اور تدبیر والا ہو، آفتاب و ماہتاب اور دوسری آسمانی مخلوقات کی حرکات گو طبعی ہیں تاہم ان کو حرکت دینے کے لئے کسی عاقل و مدبر کی ضرورت ہے، اسی لئے قرآن نے ان کے لئے کہا:

وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا (حم السجدہ ۴۱:۱۲) خدا نے ہر آسمان میں اس کا فرض اور کام وحی کیا۔

۳-اب جس طرح انسانی حرکات کو ارادہ اور اختیار کی حاجت ہے یعنی ارادہ اور اختیار کے بغیر وہ وقوع میں نہیں آسکتیں، اسی طرح ان حرکات کو ایک ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو ان اعمال و حرکات کا ٹھیک راستہ اور صحیح طریقہ بتائے اور حق کو باطل سے، سچ کو جھوٹ سے اور خیر کو شر سے ممتاز کردے۔

۴-خدا کے حکم دو قسم کے ہیں، تدبیری اور تکلیفی، پہلا حکم تمام نظامِ عالم میں جاری ہے، جس کی بنا پر تمام عالم میں تدبیر اور انتظام کا سلسلہ نظر آتا ہے، قرآن مجید میں ہے:

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف ۷:۵۴) اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم کے تابع دار ہیں اسی کا کام ہے بنانا اور حکم فرمانا۔

تکلیفی حکم صرف انسانوں کے لئے ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ (البقرہ ۲:۲۱) اے انسانو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا۔

مقدماتِ مذکورہ بالا سے ثابت ہوا کہ انسان کے تمام حرکات ممکن ہیں اس لئے مرجح کی ضرورت ہے، اختیاری ہیں اس لئے عقل کی ضرورت ہے، خیر و شر کے متحمل ہیں اس لئے رہنما کی ضرورت ہے، اسی رہنما کا نام پیغمبر ہے۔

نظامِ عالم میں خدا کا جوتدبیری حکم نافذ ہے وہ ملائکہ کے ذریعہ سے ہے اسی قیاس پر انسانوں میں خدا کا جو تکلیفی حکم نافذ ہے وہ بھی ایسے ہی نفوسِ قدسیہ کے ذریعہ سے ہوگا اور ان ہی کا نام پیغمبر ہے۔

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے چھٹے مبحث کے دو ابتدائی بابوں میں اس پر بحث کی ہے(۱) اور حقیقت یہ ہے کہ کمالِ نکتہ سنجی سے کی ہے، شاہ صاحب کی تقریر کو ہم اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں:

نبی کی ضرورت: انسان میں دو قسم کی قوتیں ہیں، بہیمی اور ملکوتی، کھانا پینا، شہوت، حرص و طمع، استیلا و جبر وغیرہ افعال بہیمی قوت کے آثار ہیں، اور غور وفکر، علم و معرفت، حسنِ اخلاق، صبر و شکر، عبادت وطاعت وغیرہ ملکوتیت کے نتائج ہیں، انسان کی روحانی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بہیمی قوت اس کی ملکوتی قوت کے تابع ہو، اگرچہ عقلِ سلیم ان اصول اور طریقوں کو معلوم کرسکتی ہے جن کے ذریعہ سے بہیمیت کے تابع ملکوتیت ہونے کے فائدے اور گناہ وعصیان کے نقصانات ظاہر ہوں، عقلِ سلیم کے اس علم سے انسان فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کرسکتا ہے، مگر یہ تو امکانِ عقلی ہے، عملی کیفیت یہ ہے کہ انسان کی آنکھوں پر موجودہ دنیاوی لذائذ، حرص وطمع اور بیجا خواہشوں اور غفلتوں کے اتنے توبرتو پردے پڑ جاتے ہیں کہ اس کے اصلی اور فطری وجدان اور قوتِ احساس کا مادہ فاسد ہوجاتا ہے، جیسے بیماری میں انسان کی زبان کا ذائقہ جب بدل جاتا ہے تو میٹھی سی میٹھی چیز اس کو کڑوی معلوم ہوتی ہے، اسی طرح اندرونی وجدان واحساس کے فاسد ہوجانے سے بھی وہ حق وباطل، خیر وشر اور نیک وبد کی تمیز کو بھول جاتا ہے، اس لئے نوعِ انسان کو ایسے صحیح رہنماؤں اور روحانی معلموں کی ضرورت ہے، جن کے احساس ووجدان کا آئینہ گردآلود نہ ہو۔

اگر افراد، جماعات اور اہلِ ملک کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اپنی سیاست کے زور سے ان میں صلح وآشتی اور امن وامان پیدا کردے تو ایک قوم کی قوم بلکہ کل دنیا کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت کیوں نہ ہو جو ہر گروہ کی استعداد کو پیشِ نظر رکھ کر اس کے مطابق اس کے حقوق وفرائض کی تعیین کرے، ایسے لوگ جو ایسے اہم فریضہ کو انجام دے سکیں، اسی طرح کم ہیں جس طرح دوسرے اصناف کے اہلِ کمال، انسانوں کے معمولی پیشوں، نجاری اور لوہاری کو دیکھو کہ کس قدر معمولی ہیں، مگر

(۱) جلد اول ص ۶۵ تا ۶۸

ان کو کرنا بھی ہر شخص کا کام نہیں، یہ پیشے بھی ایسے لوگوں کے بغیر وجود میں نہیں آئے جن کو ان کاموں کا خاص ذوق و وجدان تھا اور ان کو ان کاموں کی خاص فطری استعداد ملی تھی جس کے ذریعہ سے انہوں نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا اور اس کے اصول و قواعد وضع کئے اور بعد کے آنے والوں نے ان کی تقلید کی اور اس تقلید سے مدارجِ علیا تک پہنچے پھر اخلاق اور روحانیات اور ملک و ملت کے مصالح و فوائدِ عامہ کا فن جس قدر اہم اور نازک ہے کیا اس کو سمجھنا اور وضع کرنا ہر کس و ناکس کا کام ہو سکتا ہے۔

نبی کی عصمت: پھر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص اس رہنمائی کے منصب کا مدعی ہو وہ اپنی نسبت یہ بھی ثابت کرے کہ وہ ان اصول و قواعد سے بہ خوبی واقف ہے اور وہ اپنے علم اور تعلیم میں غلطی اور گمراہی سے محفوظ ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے علم اور تعلیم کا ماخذ اور سرچشمہ غلطیوں سے پاک اور محفوظ نہ ہو۔ اس کو ان امور کا علم اسی طرح وجدانی ہو جس طرح انسان کو بھوک اور پیاس کا وجدان ہوتا ہے، کیا کسی کو اس علم میں کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہوتی ہے کوئی غلطی ہو سکتی ہے، اسی طرح اس کو حق و باطل، خیر و شر اور نیک و بد امور کے درمیان فیصلہ اسی طرح قطعی معلوم ہوتا ہے جس میں نہ دلیل کی حاجت ہوتی ہے اور نہ عقلِ معاش کی ضرورت ہوتی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر بھوک اور پیاس ہونے کا علم اس طرح رکھ دیا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی معاند کتنی ہی دلیلیں پیش کرے کہ ہم کو بھوک یا پیاس نہیں ہے، ہم کبھی اپنے اس وجدانی یقین سے جس کو خدا نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے، اس معاند کے ان عقلی دلائل سے متاثر ہو کر دست بردار نہیں ہو سکتے اور اپنے یقین کو غلط نہیں کہہ سکتے، بعینہٖ اسی طرح ان نفوسِ قدسیہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے خاص قسم کا وجدان و ذوقِ سلیم رکھ دیا ہے جس کا عمل ہمیشہ صحیح اور جس کا احساس ہمیشہ درست اور جس کا فیصلہ ہمیشہ ناطق ہوتا ہے۔

نبی کی محبوبیت: ایسا شخص جب لوگوں کے سامنے آتا ہے اور لوگوں کو بار بار کے تجربہ سے اس کی صداقت، سچائی اور راست بازی کا یقین ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ سے جو تصرفات صادر ہوتے ہیں ان سے اس کا مقرب بارگاہِ الٰہی ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے تو ہر طرف سے لوگ اس کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس کی محبت کی راہ میں جان و مال اور اہل و عیال سب کو قربان کر دیتے ہیں۔

شاہ صاحب اس کے بعد دوسری فصل میں اسی ''بحث نبوت'' کو ایک اور انداز سے لکھتے ہیں(۱) جس کا ماحصل یہ ہے:

مصلحین: فضل وکمال اور علم وعمل کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجے ہیں، ان میں سب سے بڑا درجہ مفہمین کا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی قوتِ ملکیہ نہایت بلند ہے اور جن میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ سچے اور صحیح جذبہ سے ایک خاص نظام کو دنیا میں قائم کر دیں اور ان پر بارگاہِ الٰہی سے ایسے علوم اور احوال کا ترشح ہوتا ہے، جن میں ربانی آثار نظر آتے ہیں، ایسے لوگ معتدل مزاج اور اپنی صورت وسیرت میں درست اور عقل وذکاوت میں متوسط ہوتے ہیں، نہ اس قدر بلید کہ جزئیات سے کلیات تک ان کا پہنچنا مشکل ہو، نہ اس قدر تیز کہ جزئیات اور محسوسات سے قطعِ نظر کر کے ہمیشہ ذہنیات اور تخیلات میں مبتلا رہیں، صحیح فطرت پر وہ قائم رہتے ہیں، طور وطریق ان کے پسندیدہ ہوتے ہیں، خدا کے ساتھ ان کا تعلق عبادت وطاعت سے اور بندوں کے ساتھ عدل و انصاف سے قائم رہتا ہے، وہ اپنے فیصلوں میں شخصی اور جزئی بھلائی اور منفعت کا لحاظ نہیں کرتے، بلکہ منفعتِ عامہ اور تدبیرِ کلی کا لحاظ کرتے ہیں، وہ براہ راست کسی کو تکلیف نہیں دیتے الا یہ کہ منفعتِ عامہ کا حصول اور بڑی تعداد کا فائدہ چھوٹے سے نقصان سے حاصل ہو تو وہ اس جزئی تکلیف اور شخصی نقصان کو گوارا کر لیتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے کاروبار میں عالمِ غیب کی طرف مائل رہتے ہیں، جس کا اثر ان کی بات چیت، کام کاج اور معاملات میں نمایاں ہوتا ہے، کارکنانِ عالم ان کی تائید ونصرت میں رہتے ہیں، معمولی ریاضت سے ان کے لئے قرب وسکینت کے وہ دروازے کھل جاتے ہیں جو دوسروں کے لئے نہیں کھلتے۔

مصلحین کے اقسام: مفہمین کے درجہ بہ درجہ مختلف اصناف ہیں اور ان کی مختلف استعدادیں ہیں اور اس بنا پر ان میں سے ہر ایک کے الگ الگ اصطلاحی نام ہیں، جو زیادہ تر عبادات کے ذریعہ سے تہذیبِ نفس کے علوم پاتا ہے وہ کامل ہے اور جو اخلاقِ فاضلہ اور تدبیرِ منزل کے اصول حاصل کرتا ہے وہ حکیم ہے، جو عمومی تدبیر وسیاست کے علوم کا فیض پاتا ہے اور ان کے مطابق اس کو لوگوں میں عدل کے قیام اور ظلم کے دور کرنے کی توفیق ملتی ہے وہ خلیفہ ہے اور جس پر ملأ اعلا کا نزول

(۱) حجۃ اللہ البالغہ حصہ اول ص ٦٦

ہواور وہ اس سے تعلیم پائے اور اس کو مخاطب کرے اور مختلف قسم کے تصرفات اس سے صادر ہوں وہ مؤید بروح القدس کہلاتا ہے اور وہ جس کی زبان اور دل میں نور ہو کہ لوگ اس کی صحبت اور پندو موعظت سے نفع اٹھائیں اور وہ نور اس سے منتقل ہو کر اس کے رفقائے خاص میں منتقل ہو جس سے وہ بھی کمال کے درجہ تک پہنچ جائیں، اس کا نام ہادی اور مزکی (پاک کرنے والا) ہے اور جس کے علم کا بڑا حصہ ملت کے اصول وقواعد اور اس کی مصلحتوں کی واقفیت ہو اور ملت کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کرنے کی طاقت ہو وہ امام کہا جائے گا اور جس کے قلب میں یہ ڈالا جائے کہ وہ لوگوں کو ان کی اس مصیبتِ عظمیٰ سے خبردار کرے جو اس دنیا میں ان کے لئے ان کے اعمال کے نتیجے کے طور پر مقدر ہے اور ان کی بداعمالی کے سبب سے ان سے حق تعالیٰ کی رحمت کو جو دوری ہے یا قبر اور حشر میں ان پر جو مصیبتیں آنے والی ہیں اس کا نام منذر (ڈرانے والا، ہشیار کرنے والا) ہے۔

اور جب حکمتِ الٰہی کا یہ اقتضا ہوتا ہے کہ مخلوق کی ہدایت واصلاح کے لئے ان مفہمین میں سے کسی کو بھیجے تو اس کی آمد مخلوق کے تاریکی سے نکل کر روشنی میں آنے کا سبب ہو جاتی ہے اور وہ بندوں پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ دل وجان سے اس کی اطاعت کریں اور بارگاہِ الٰہی میں تاکید ہوتی ہے کہ جو اس کی اطاعت کرے اس سے خوشنودی اور جو اس سے مخالفت کرے اس سے ناخوشی ظاہر کی جائے یہی شخص نبی ہوتا ہے۔

نبی کی دو بعثتیں: نبیوں میں بڑا درجہ اس کا ہوتا ہے کہ جس کو اس پیغمبرانہ بعثت کے ساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے اور وہ یہ کہ مرادِ الٰہی یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کے ذریعہ سے اس کی قوم اور اس کی قوم کے ذریعہ سے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اس نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثتِ اولیٰ اور اس کی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لئے نامزدگی بعثتِ ثانیہ ہے۔

نبی ﷺ کی پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ ۲:۶۲)

وہی خدا جس نے ان پڑھوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا اور ان کو پاک بناتا اور ان کو کتاب اور دانائی سکھاتا ہے۔

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے وجود میں لائی گئی، نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے باز رکھتے ہو۔

(آل عمران ۳:۱۱۰)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی پیغمبرانہ بعثت ان کی امت کے لئے ہوئی ویسی ہی ان کی امت کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی۔ اور اسی معنی میں قرآن پاک کی یہ آیت بھی ہے:

لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (الحج ۲۲:۷۸)
تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔

اسی لئے احادیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا: فانما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین "(۱) تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو سختی کرنے والے بنا کر نہیں، آنحضرت ﷺ سے پہلے جو انبیا علیہم السلام آئے وہ ان مختلف مذکورہ بالا مناصب میں سے ایک یا دو منصب کے ساتھ مبعوث ہوئے لیکن آنحضرت ﷺ ان تمام منصبوں پر ایک ساتھ سرفراز ہوئے اور یہ تمام فنون آپ ﷺ کی واحد ذات پر جمع کر دیے گئے اور آپ ﷺ کو یہ دونوں بعثتیں بھی بکمال استحقاق عطا ہوئیں۔

بعثت کے لئے کسی قوم کا انتخاب: یہ بھی واضح ہو کہ رسول کی بعثت کے لئے حکمت الٰہی کا اقتضا اس لئے ہوتا ہے کہ عالم کی عمومی تدبیر و نظم و نسق میں جو اضافی خیر معتبر ہے وہ ان دنوں اسی رسول کی بعثت میں منحصر ہوتا ہے اور اس بعثت کے حقیقی سبب کا علم اسی دانائے غیب کو ہے مگر اتنی بات ہم قطعاً جانتے ہیں کہ کچھ اسباب ایسے ہیں جو بعثت کے ساتھ ضرور پائے جاتے ہیں اور امت پر اس رسول کی اطاعت اسی لئے فرض ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی تمام قوموں سے جس قوم کی نسبت یہ جانتا ہے کہ اس میں خدا کی اطاعت و پرستش کی استعداد اور اس میں اللہ تعالیٰ کے فیضان اٹھانے کی

(۱) صحیح بخاری کتاب الوضو باب صب الماء علی البول فی المسجد ج ۱ ص ۳۵ و ج ۲ ص ۹۰۴، کتاب الادب باب قول النبی یسروا ولا تعسروا و مسند احمد ج ۲ ص ۲۳۹ و ۲۸۲۔

صلاحیت زیادہ ہے اس میں وہ رسول مبعوث ہوتا ہے اور چوں کہ اس قوم کی اصلاح اسی پیغمبر کی پیروی اور اتباع میں منحصر ہوتی ہے اس لئے بارگاہِ الٰہی کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت سب پر واجب کی جائے۔

بعثت کا زمانہ: اس موقع پر چند باتیں اور قابل لحاظ ہیں، اگر یہ وقت وہ وقت ہوتا ہے کہ کوئی نئی حکومت اس لئے قائم کی جائے تا کہ اس کے ذریعہ سے ان دوسری حکومتوں کو جو دنیا میں فساد اور شر کا موجب بنی ہوئی ہیں، مٹا دیا جائے تو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھیجتا ہے جو پہلے اس قائم ہونے والی سلطنت کی قوم کی اصلاح کرے اور اس کے دین کو درست کرے تا کہ اس کے ذریعہ سے دوسری قوموں کی اصلاح ہو، جس طرح سے ہمارے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی زندگی کی بقا اور اس کو اپنا برگزیدہ بنانا چاہتا ہے تو اس میں وہ ایک ایسے شخص کو بھیجتا ہے جو اس کی کجی کو دور کر دے اور اس کو کتابِ الٰہی کی تعلیم دے کر اس کو اس کا مستحق بنا دے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بنی اسرائیل میں بعثت ہوئی، یا کسی قوم کے متعلق قضائے الٰہی کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو مزید زندگی ملتی رہے اور اس کا دین وسلطنت برقرار رہے تو مجدّدِ دینِ نبوت پیدا ہوتے ہیں، جیسے بنی اسرائیل کے مختلف زمانوں میں حضرت داؤدؑ ،حضرت سلیمانؑ اور پیغمبروں کے ایک گروہ کی بعثت ہوتی رہی۔

نبی کی یقینی کامیابی: ہر نبی کی بعثت کے دور میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کو اور اس کے دوستوں کو کامیابی اور اس کے دشمنوں کو پے درپے ناکامی ہو (یہاں تک کہ حق استوار اور دعوت مکمل ہو جائے) قرآن پاک میں ہے:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ. اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ. وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ. (الصافات ۳۷: ۱۷۱-۱۷۳)	اور ہماری بات اپنے پیغمبر بندوں کے متعلق پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ ان ہی کی مدد کی جائے گی اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوگا۔

ان دونوں بزرگوں (امام غزالیؒ اور شاہ ولی اللہؒ صاحب) نے اپنے اپنے الفاظ میں جو کچھ کہا ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہے، انبیائے کرام علیہم السلام کے احوالِ مبارکہ اور سوانحِ مقدسہ پر جس

کی نظر عمیق و وسیع ہوگی اس کو ان اصول کے تسلیم کرنے میں ذرہ بھر شک نہیں ہوسکتا اور ان پر استدلال واقعات اور حوادث سے اسی طرح کیا جاسکتا ہے، جس طرح نفسیاتِ اجتماع (سائیکالوجی آف پیپل) یا نفسیاتِ رہنمائی (سائیکالوجی آف لیڈرشپ) پر واقعات کے تسلسل اور تواتر سے کرتے ہیں، اس طرح امام غزالیؒ اور شاہ ولی اللہؒ صاحب نے اوپر کے صفحات میں جو کچھ کہا ہے، ہم مجازاً کہہ سکتے ہیں کہ وہ ''نفسیاتِ نبوت'' کے گویا ابواب ہیں۔

موجودہ زمانہ میں خیالات، طرزِ گفتار، اسلوبِ تحریر اور طریقۂ استدلال، غرض ہر چیز میں فرق ہوگیا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اہلِ زمانہ سے ان کی اصطلاح میں گفتگو کی جائے اور جو اصول قائم کیا جائے اس پر قرآن مجید سے بھی ساتھ ساتھ استدلال کیا جائے کہ عقل ونقل دونوں درباروں میں کہنے والے کی بات کا اعتبار ہو۔

غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ جس غرض و مقصد کے لئے پیدا ہوا ہے وہ اپنے ذاتی ارادہ اور قصد کے بغیر خود بہ خود اس کو پورا کررہا ہے اور اس کے خالق نے اس کے روزِ پیدائش سے اس کو جو حکم دے دیا ہے اس کی تعمیل سے وہ سرِ مو انحراف نہیں کرتا، آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہے، آفتاب دنیا کو گرمی اور روشنی دینے پر مامور ہے اور وہ ہر آن اور ہر لحہ اس میں مصروف ہے، زمین کو سرسبزی اور شادابی کا کام سپرد ہے اور وہ اس کو انجام دے رہی ہے، ابر کو سیرابی اور گوہر باری کا حکم ہے اور وہ اس کی تعمیل کررہا ہے، درخت پھل دینے پر مقرر ہیں اور وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں، حیوانات جن کاموں پر مامور ہیں وہ بہ خوشی ان کو کررہے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان بھی اس دنیا میں کسی کام پر اسی طرح مقرر ہو کر آیا ہے یا نہیں؟ اگر آیا ہے تو کیا اس کو انجام دے رہا ہے؟

آؤ انسان کو غور سے دیکھیں بہ ظاہر وہ بھی کھاتا پیتا، چلتا پھرتا، اٹھتا بیٹھتا زندگی گذارتا ہے اور پھر مر جاتا ہے، کیا اس کی زندگی کا بس اسی قدر مقصد ہے، اگر یہی ہے تو پھر انسان اور حیوان میں کیا پہنچان؟ اور ذی ارادہ اور غیر ذی ارادہ میں کیا امتیاز؟ اور صاحبِ عقل اور بے عقل میں کیا فرق؟ چنانچہ قرآن پاک اسی لئے انسانوں سے سوال کرتا ہے اور بجا سوال کرتا ہے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا. (مومنون:۲۳:۱۱۵) کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے کار پیدا کیا۔

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى. (قیٰمۃ ۷۵:۳۶)
کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ بے کار چھوڑ دیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی غرض و مقصد کے لئے پیدا ہوا ہے لیکن وہ غرض و مقصد کیا ہے؟ انسان کی پوری ہستی اگر کائنات کے صفحہ سے مٹ جائے تو بھی آفتاب اسی طرح چمکتا رہے گا، سمندر اسی طرح ابلتے رہیں گے، ہوائیں اسی طرح چلتی رہیں گی، پانی اسی طرح برستا رہے گا، سبزے اسی طرح اگتے رہیں گے اور درخت اسی طرح پھلتے رہیں گے لیکن اگر درخت نہ پھلیں تو انسان کی ہستی معرضِ خطر میں پڑ جائے، سبزیاں نہ اگیں تو انسان بھوکا مر جائے، پانی نہ برسے تو انسان پیاسا تڑپ جائے، اگر ہوا نہ چلے تو انسان گھٹ کر مر جائے، اگر زمین نہ ہو تو انسان کو کھڑے ہونے کی جگہ نہ ملے، اگر آفتاب نہ چمکے تو انسان کی ہستی کا چراغ فوراً بجھ جائے، سمندر نہ ہو تو نہ پانی برسے، نہ سبزیاں اگیں نہ انسانی غذا میسر آئے، نہ پانی برس کر پھر زمین کو خشک ہونا نصیب ہو، الغرض دنیا کی کوئی ہستی اپنے وجود کے لئے انسان کی محتاج نہیں لیکن انسان اپنے وجود کے لئے کارخانۂ ہستی کے ایک ایک پرزہ کا حاجت مند ہے، تو پھر کیا یہ نتیجہ صحیح نہیں کہ اس کارخانہ کے ہر پرزہ کی غرض و غایت انسان کا وجود اور اس کی بقا ہے لیکن خود انسان کے وجود کی غرض کوئی دوسری ہے جو دیگر موجودات کے وجود کی غرض سے زیادہ اہم ہے۔

قرآن پاک دوسرے موجودات ومخلوقات کی نسبت تو یہ کہتا ہے:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا. (بقرہ ۲:۲۹)
اسی نے تمہارے لئے (اے انسانو!) وہ سب پیدا کیا جو زمین میں ہے۔

پھر یہ بھی بتایا:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ. (حج ۲۲:۶۵)
(اے انسان!) کیا تو غور نہیں کرتا کہ زمین میں جو کچھ ہے اس کو تمہارے کام میں اس نے لگا رکھا ہے۔

زمین کے بعد آسمان کی نسبت بھی اس نے اعلان کیا:

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهٖ (نحل ۱۶:۱۲)
اور (اے انسانو!) اس نے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگایا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔

ہستیاں دو ہی ہیں، خالق کی اور اس کی مخلوقات کی، مخلوقات کے حالات پر غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ ان میں ہر ادنیٰ چیز اپنے سے اعلا چیز کے کام آرہی ہے، جمادات، نباتات کے، نباتات حیوانات کے اور جمادات اور نباتات اور حیوانات تینوں انسان کے کام آرہے ہیں، آخر انسان کو بھی اپنے سے کسی اعلا ہستی کے کام آنا چاہیے، مخلوقات میں تو اب اس سے کوئی اعلا ہستی نہیں تو لامحالہ اس کی تخلیق خود خالق کے لئے ہوئی ہے۔

الغرض دنیا کی ساری چیزوں کی غرض و غایت بہ واسطہ یا بلاواسطہ انسانوں کی بقا، زندگی اور آسائش ہے لیکن خود انسان کی اس کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے ہے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ. اور میں نے جن اور انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری طاعت کریں۔ (ذاریات ۵۱:۵۶)

عقل و فہم اور ارادہ و اختیار کے لحاظ سے مخلوقات کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ ایک وہ جو ان صفات سے یکسر محروم ہیں، آفتاب، ماہتاب، زمین، مٹی، پتھر، پھل، پھول، درخت۔

۲۔ دوسری وہ جو صرف ابتدائی احساس اور علم و فہم رکھتی ہیں لیکن قیاس و استقرا و تمثیل اور حاضر پر غائب کو قیاس کر کے کسی نئے علم کا استخراج کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے ان کا ارادہ و اختیار بھی صرف ظاہری محسوس اشیا تک محدود ہے، جیسے حیوانات۔

۳۔ تیسری وہ مخلوق ہے جو عقل و ادراک رکھتی ہے، قیاس آرائی کرتی ہے، استقرا و تمثیل کے ذریعہ سے استنباط کرتی ہے، جزئیات سے کلیات بناتی اور کلیات سے جزئیات پر حکم لگاتی ہے، بدیہیات سے نظریات تک پہنچتی اور غائب کو حاضر پر قیاس کرتی ہے۔

پہلی قسم کی مخلوقات سے جو حرکات اور آثار پیدا ہوتے ہیں وہ اضطراری اور غیر ارادی ہوتے ہیں اور کبھی ان میں تخلف نہیں ہوتا، اسی لئے ان کو فطری آثار اور طبعی خصائص کہتے ہیں، جن کا صدور ان مخلوقات سے ہمیشہ یکساں اور بلا ارادہ ہوتا رہتا ہے، دوسری قسم کی مخلوقات سے جو آثار و حرکات پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ گو ارادہ اور احساس اور ابتدائی فہم کے ماتحت صادر ہوتے ہیں لیکن ان کے ہر فرد سے صرف ایک ہی قسم کے افعال، حرکات اور آثار یکساں طور سے ظاہر ہوتے ہیں، ان کے خلاف نہیں ہو سکتا اور نہ ایک دوسرے سے کم و بیش ہو سکتا ہے، ان کے ان افعال، حرکات اور آثار

کو جبلت، فطرت اور طبیعت کہتے ہیں، ان کے صدور میں بھی وہ مخلوقات اپنی فطرت اور طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہیں جیسے حیوانات کے افعال اور ان کے مختلف انواع کے الگ الگ نوعی کام کہ وہ ازل سے قیامت تک یکساں، ایک ہی طرح اور وہ بھی کسی غایت اور انجام و مآل کے پہلے سے سوچے بغیر ان سے صادر ہوتے ہیں۔

تیسری مخلوق کے بعض افعال گو طبیعت و جبلت کے مطابق ہوتے ہیں جو دیگر مخلوقات کی طرح ویسے ہی بے ارادہ اور اضطراراً سرزد ہوتے ہیں مگر اس کے اور دوسرے افعال و حرکات تمام تر اس کے ارادہ، اختیار اور فہم سے صادر ہوتے ہیں، صرف یہی آخری قسم کے افعال وہ ہیں جن پر خیر و شر اور نیک و بد کا حکم جاری ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے تمام عاقلانہ کام، عاقبت بینی، انجام اور مآلِ کار کو خیال کر کے اس کے ارادہ سے صادر ہوتے ہیں اور یہیں سے اس کی ''ذمہ داری'' کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔

جن و انس کے علاوہ تمام دوسری مخلوقات، خیر و شر کی ذمہ داری سے بری ہیں، جمادات و نباتات تو اس لئے کہ ان کے افعال و حرکات تمام تر مجبورانہ، بے ارادہ اور فکر انجام کے بغیر صادر ہوتے ہیں یا یوں کہو کہ ان احکام کے بہ موجب ہمیشہ ہوتے ہیں جو خدا نے ان کو اول ہی دن دے دیے ہیں، حیوانات بھی اس لئے اس ذمہ داری سے بری ہیں کہ ان کے افعال و حرکات بھی تمام تر جبلی و طبعی ہیں اور وہ جبلت و طبیعت پر مجبورانہ، بے ارادہ اور انجام کے خیال کے بغیر عامل ہیں یا یوں کہو کہ وہ اپنے خالق کے احکام پر ہمیشہ اضطراراً عمل پیرا ہیں، اسی طرح فرشتے بھی اس تکلیف سے سبک دوش ہیں کیوں کہ وہ بھی اپنی خلقت اور جبلت سے اطاعت پر مجبور ہیں اور اسی لئے ان سے عصیان نہیں سرزد ہوتا، صرف ایک انسان ایسی مخلوق ہے جو بہت سی باتوں میں ارادہ، اختیار اور علم رکھتا ہے، نیکی، بدی اور خیر و شر ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے پر قطعی مجبور نہیں ہے، بلکہ وہ عقل و فہم سے سوچ سمجھ کر، مآلِ کار اور انجام پر غور کر کے یا اپنے جذبات کے ماتحت کوئی کام کرتا ہے اس لئے وہی خیر و شر کے امتیاز اور حق و باطل کے فرق کے لئے پیغامِ الٰہی کا محتاج قرار پایا۔

جمادات و نباتات اور دیگر مخلوقات سے احکامِ الٰہی کی مجبورانہ اطاعت یعنی جبلت یا فطرت یا خاصیت کو قرآن پاک یوں ادا کرتا ہے:

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ. يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ.
(نحل ۱۶: ۴۹-۵۰)

اور خدا ہی کے آگے سر جھکاتے ہیں جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے جانداروں میں سے اور فرشتے وہ سرکشی نہیں کرتے، اپنے پروردگار کا اوپر سے ڈر رکھتے ہیں اور کرتے ہیں جو حکم پاتے ہیں۔

اسی فطری اطاعتِ الٰہی کا دوسرا نام فطری وحی بھی رکھ لو جیسا کہ قرآن میں ہے:

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ. ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا.
(نحل ۱۶: ۶۸-۶۹)

اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں پر وحی بھیجی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور جہاں چھت ڈالتے ہیں اپنے لئے گھر بنالے پھر ہر پھل میں سے کھا پھر اپنے پروردگار کی راہوں پر (مقررہ احکام پر) چل مطیع ہو کر۔

دیکھو اس آیتِ پاک میں طبعی الہام کی مجبورانہ پیروی کو اطاعتِ الٰہی کہا گیا ہے اور دوسری جگہ ان کی اپنے خالق اور پیدا کرنے والے کے حکم کی اسی طبعی اطاعت اور فطری تعمیل کو ان کی زبانِ حال کی نماز اور تسبیح فرمایا گیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ. كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ.
(نور ۲۴: ۴۱)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین میں جو کوئی ہے اور اڑتے جانور پر کھولے اس کی یاد کرتے ہیں ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی نماز اور اس کی پاکی کی یاد اور خدا کو معلوم ہے جو وہ کرتے ہیں۔

لیکن انسان کو دوسرے موجودات ومخلوقات کی طرح مجبورِ محض نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ بتایا جا چکا وہ احساس اور ارادہ جو جمادات میں معدوم، نباتات میں محلِ بحث اور حیوانات میں متحرک ہے وہ انسان میں پوری طرح پیدا اور کارفرما ہے، اسی طرح وہ ارادی قدرت واختیار جو جمادات میں معدوم، نباتات میں مفقود اور حیوانات میں محدود ہے، وہ انسان میں ایک حد تک وسیع ہے، علاوہ ازیں ہر کام میں عاقبت بینی اور مآل اندیشی صرف انسان کا خاصہ ہے، اسی لئے تمام مخلوقات میں وہی ارادی ''تکلیف'' کا مستحق قرار پایا اور غیر ذی ارادہ مخلوقات کی طرح بالاضطرار اور مجبورانہ اطاعتِ الٰہی کے لئے نہیں بلکہ بالارادہ اطاعت کے لئے اس کی تخلیق ہوئی، فرمایا:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ. (الاحزاب ۳۳:۷۲)

ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔

یہ امانت اس کی نیکی و بدی کی تمیز اور خیر و شر کا فرق ہے جس کے نتیجہ کے طور پر شریعتِ الٰہی کا نزول ہوا ہے، انسان کو اپنی اس امانت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بااراده اور بااختیار افعال میں بھی بے ارادہ اور بے اختیارانہ افعال کی طرح احکامِ الٰہی کی اطاعت کرنا ضروری ہے، یعنی جس طرح بے اختیارانہ افعال میں فطرت و جبلت کی مجبورانہ اطاعت کر کے حکمِ الٰہی کی تعمیل کی جاتی ہے، اسی طرح بااراده اور اختیاری افعال میں بھی شریعت کی بالارادہ اطاعت کر کے حکمِ الٰہی کی تعمیل ضروری ہے۔

اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ غیر ارادی افعال و حرکات میں جس طرح ہم اپنے فطری الہام و وحی کی مجبورانہ پیروی کرتے ہیں اسی طرح ارادی افعال میں بھی شرعی الہام و وحی کی بالارادہ پیروی کریں۔

لیکن کسی کی اطاعت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے احکام و اوامر سے ہم کو واقفیت نہ ہو، انبیا اور رسول وہی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اپنے ان احکام اور اوامر کی شریعت کو وحی کرتا ہے، اور وہ ان ذی ارادہ بندوں کو اس سے آگاہ و باخبر کرتے اور اس کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں۔

یہ نکتہ کہ انسان کے علاوہ تمام دیگر بے ارادہ مخلوقات خدا کی اطاعت پر مجبور اور مجبول ہیں اور کسی قدر بااختیار انسان کے افراد اپنے اسی تھوڑے سے اختیار اور ارادہ کے بل پر اپنے خالق سے سرکشی کرنے پر آمادہ ہیں خود قرآن پاک کے الفاظ میں موجود ہے فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ. (حج ۲۲:۱۸)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی کے آگے سر جھکاتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان اور بہت انسان ہیں جن پر عذاب ٹھہر چکا۔

دیکھو کہ انسان کے علاوہ تمام دوسری بے ارادہ اور بے عقل مخلوقات کی کلی اطاعت اور

سرافگندگی کا اعلان ہے لیکن خاص باارادہ اور باعقل اورانجام بیں انسانوں کی دو قسمیں کردی گئیں۔

کائنات کے صحیفہ کا تدریجی مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان میں سے جس صنفِ مخلوقات میں احساس، ارادہ اور اختیار کی جتنی کمی ہے اسی قدر فطرت اس کی دایہ گری کی خدمات زیادہ انجام دیتی ہے اور جس حد تک احساس اور اختیار کا دائرہ اصنافِ ہستی میں بڑھتا جاتا ہے اسی قدر معلمِ فطرت اپنے فرائض سے کنارہ کش ہوتا جاتا ہے اور وہ صنفِ کائنات اپنی ذمہ داری آپ قبول کرتی جاتی ہے، جمادات اپنی نشوونما کے لئے بیرونی غذا کے محتاج نہیں، نباتات جن میں ان اوصاف کی ہستی صرف اپنی آنکھیں کھولتی ہے، ان کی غذا خود ان کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے اور وہ خود اڑ کر اور چل کر ان تک پہنچ جاتی ہے، حیوانات جن میں یہ اوصاف جاگ کر کروٹیں بدلتے ہیں ان کی غذا بے جوتے بوئے، بے چنے نکھارے، بن پکے پکائے ہر قدم پر ہر وقت تیار ملتی ہے لیکن انسان جس میں یہ تینوں اوصاف بیٹھ کر حکمراں اور کارفرما ہوتے ہیں اس کے منہ تک غذا کا ایک دانہ بھی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کی جدوجہد، محنت اور جاں فشانی کے پسینہ کا گرم قطرہ پیشانی سے چل کر اس کے پاؤں تک نہیں پہنچتا۔

جہاں احساس، ارادہ اور اختیار جیسے جیسے کم ہے اسی قدر طبیعت، فطرت اور جبلت کی اضطراری حکومت زیادہ قائم ہے لیکن جیسے جیسے ان تینوں اوصاف کی ترقی وتکمیل ہوتی جاتی ہے، طبیعت، فطرت اور جبلت کی حکومت کا دائرہ تنگ ہو کر احساس، ارادہ اور اختیار کی شہنشاہی قائم ہوتی جاتی ہے اور حرکات واعمال کی باگ فطرت وجبلت کے مضبوط اور ناممکن التغیر ہاتھوں سے نکل کر اختیار وارادہ کے کمزور اور ہر آن بدل جانے والے ہاتھوں میں آجاتی ہے، جمادات ہمیشہ وہی کریں گے جو ان کو کرنا چاہیے، نباتات عموماً وہی بنیں گے جو ان کو بننا چاہیے، حیوانات وہی کام انجام دیں گے جو ان کے سپرد کردیا گیا ہے لیکن انسان کسی قدر اختیار اور ارادہ پاکر اکثر اپنی راہ سے ہٹ جاتا ہے اور حدودِ اعتدال سے قدم باہر نکال دیتا ہے اور اپنے اس اختیار وارادہ کی ذمہ داری کی امانت کو بھول جاتا ہے، انبیا اور رسول وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ذی ارادہ اور بااختیار مخلوق کو اس کی اس ذمہ داری کے فرائض سمجھانے کے لئے آتے ہیں۔

اس اختیار اور ارادہ کے مرکز کا نام مذاہب کی زبان میں ”دل“ ہے جو انسان کے سر سے

لے کر پاؤں تک کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ کی ایک ایک جنبش و حرکت پر حکمراں ہے اور اسی کے حکم سے اس جسم کے اندرونی عالم میں سب کچھ ہوتا اور سرانجام پاتا ہے، انبیا علیہم السلام اسی دل کے نظام کو درست کرنے کے لئے آتے ہیں۔

انسان کو اپنے وجود، بقا، ترقی اور تکمیل کی ہر منزل میں قدم قدم پر ہزاروں چیزوں کی احتیاج ہوتی ہے، ان چیزوں کے مہیا اور تیار کرنے کے لئے ہر انسان میں استعداد و قوت الگ الگ ہوتی ہے اور یہ استعداد و قوت فیاضِ قدرت کی طرف سے پیدائش بلکہ پیدائش سے پہلے ہی آب و گل کے عالم میں اس میں ودیعت رکھی جاتی ہے، یہی سبب ہے کہ ہر انسان میں جس قسم کا میلان ہوتا ہے، اسی کی استعداد اس میں پائی جاتی ہے اور پھر بعد کو خاص خاص فنی الہامات کے ذریعہ سے جن کو تم ایجادات اور اختراعات کہتے ہو، ہر پیشہ ور اپنے متعلقہ کام کو بڑھاتا اور ترقی دیتا ہے اور تمہاری ضرورت کے مطابق تمہارے لئے سامان فراہم کرتا ہے۔

ان مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسبِ استعداد اور حسبِ حیثیت مختلف درجے اور مرتبے ہیں، بعض ان میں سے محض مقلد ہوتے ہیں جو وہی بنا سکتے ہیں جو بنانا سیکھا ہے، بعض چابک دست اور ذہین ہوتے ہیں جو اچھے کاریگروں کے صرف نمونوں کو دیکھ کر اچھی چیزیں تیار کرسکتے ہیں، بعض ایسے ذہین اور فطین ہوتے ہیں کہ وہ نئی نئی چیزیں بناتے، دریافت کرتے اور ایجاد کرتے ہیں اور بعد کے آنے والے مدت تک ان ہی کی تقلید کرتے رہتے ہیں، کاشت کاری کے اصول، ازالۂ مرض کی تدبیریں، کھانے پکانے کے طریقے، سواری کے ضروریات، رہنے سہنے کے سامان، پہننے کے کپڑے، لڑنے کے آلات، ان میں سے ہر شے کی ضرورت ہے اور ان میں ہر ضرورت کے لئے خالقِ فطرت نے ایک ایک گروہ کو پیدا کردیا ہے اور وہ اپنے اپنے کام انجام دیتا رہتا ہے، ان ضرورتوں کے فراہم ہوجانے سے انسان کی مادی زندگی کی تکمیل ہوجاتی ہے اب اس کے بعد اس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کے ضروریات کا جن کو تم اصولِ تمدن، طریقۂ معاشرت، آئینِ عدل و انصاف، اخلاقِ حسنہ اور دین و تقویٰ کے نام سے موسوم کرتے ہو، دور شروع ہوتا ہے، اگر یہ اصول اور تعلیمات انسانوں کے سامنے نہ ہوں تو آدم کے بیٹوں کی یہ جنت دوزخ ہوجائے اور اشرف المخلوقات کی یہ جماعت جانوروں کا گلہ اور درندوں کا غول بن جائے۔

جوتمہارے لئے غلہ پیدا کرتا ہے وہ کاشت کار ہے اور جو اوزار بناتا ہے وہ لوہار ہے، جو زیور گھڑتا ہے وہ سونار ہے، جوتمہارے لئے کپڑے بنتا ہے وہ بنکر ہے، جوتمہارے مکان بناتا ہے وہ معمار ہے، جوتمہاری حفاظت کرتا ہے وہ سپاہی ہے، جوتمہاری نگہ بانی کرتا ہے وہ حاکم ہے، جو تمہارے آپس کے جھگڑے چکاتا ہے وہ قاضی ہے، جوتمہارے ملک کے اندر امن وامان کا ضامن ہے وہ بادشاہ ہے، جوتمہاری جسمانی بیماریوں کا معالج ہے وہ طبیب ہے، جو اپنی صناعیوں سے تمہاری ضرورتوں کے لئے کاریگری کی چیزیں بناتا ہے وہ صناع ہے اور جوتمہارے لئے مادی کائنات کے چہرے سے اسرار کا پردہ ہٹا کر تم کو ہر چیز سے باخبر کرتا ہے وہ حکیم ہے۔

اسی طرح جو برگزیدہ افراد تمہارے روحانی واخلاقی واجتماعی حالات کے معلم ونگراں ہیں ان کی بھی ایک جماعت ہے لیکن جس طرح تمہارے مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسب استعداد اور حسب حیثیت درجے ہیں اسی طرح ان روحانی ضروریات کے فراہم کرنے والوں میں بھی مرتبے اور درجے ہیں، بعض وہ ہیں جو صرف اگلے روحانی معلمین کی نقل وتقلید کرتے ہیں یہ عام علما ہیں، بعض وہ ہیں جو اچھے روحانی نمونوں کو دیکھ کر خود بھی ان کی عمدہ نقل اتارتے ہیں اور دوسروں کو بھی بتاتے ہیں یہ مجدد دین ہیں، بعض ایسے ہیں جو الہامِ ربانی سے فیض پا کر روحانیت کے نئے نئے اصول وضع کرتے اور دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، یہ انبیا ہیں، ان کے مقدس ہاتھ تمہارے لئے غلہ پیدا کرنے، مکان بنانے، کپڑا بننے، اوزار بنانے اور صناعی کرنے کے لئے نہیں بلکہ ان سے بدرجہا بلند تر اور بہتر کام کے لئے ہیں، ان کی مبارک انگلیاں تمہارے ان تاروں پر پڑتی ہیں جن سے یہ صدہا قسم کے نغمے نکل رہے ہیں، یعنی تمہارے دل کی رگوں پر، غور کرو کہ یہ اصل مرکز جس پر تمہارے تمام اعمال وافعال اور ہر قسم کے حرکات وسکنات اور ہر طرح کی جدوجہد کا مدار ہے یعنی ''دل'' کیا انبیا علیہم السلام اور ان کے متبعین کے سوا کوئی طبقہ اس کی نشوونما، حفاظت، ترقی، تکمیل اور اصلاح کے لئے بھی کام کر رہا ہے؟ اور کیا خالق فطرت کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ تمہاری مادی ترقی اور اصلاح کی طرح تمہاری روحانی ترقی واصلاح کی بھی فکر کرتا اور ایسا سمجھنا کہ اس نے اس کی ترقی وتکمیل واصلاح کی خدمت نوعِ انسانی کے کسی کارکن طبقہ سے متعلق نہیں کی ہے، کیا اس کی شانِ ربوبیت کے ساتھ سوءِ ظن نہیں ہے؟

یہی وہ طبقہ ہے جو تمام متفرق اور مختلف انسانی طبقوں کو باہم جوڑ کر ایک عام انسانی تمدنی سطح پر لایا ہے، وہ ان سب کو جو تمہارے لئے روٹی تیار کرتے ہیں، کپڑے بنتے ہیں، جھونپڑے بناتے ہیں اور سامان اور اوزار درست کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مشارکت اور معاونت اور نیکی پر آمادہ کر کے ان میں روحانی برادری پیدا کرتے ہیں اور مٹی سے پیدا ہونے والے ایک آدم کے بیٹوں کو جن کو دولت و غربت، سوسائٹی اور مجلس، حکومت اور اقلیم اور جغرافی و قومی تقسیم نے پارہ پارہ کر رکھا ہے، باہم جوڑ دیتے ہیں اور ان تمام مصنوعی امتیازات کو مٹا کر پوری زمین کو ایک ملک، تمام اقوامِ عالم کو اولاد آدم اور کل بلند و پست طبقوں کو ایک انسانی طبقہ قرار دیتے ہیں اور ان کے اخلاقی روحانی عالم میں اصلاح و ترقی اور امن و امان پیدا کرتے ہیں، ان کے دلوں سے بغض و کینہ کو نکال کر اخوت و محبت کا نور بھرتے ہیں، ان کے احساس، ارادہ اور اختیار کی باگ پر ان کے دل کو قابو حاصل کرنے کی تدبیر بتاتے ہیں اور ان کو اعتدال کی حد بتا کر صحیح و غلط کی تمیز عطا کرتے ہیں۔

یہی وہ انسانی طبقہ ہے جس کو ہم نبی، رسول اور پیغمبر کہتے ہیں ان کو گو براہ راست جسم و جسمانیات سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف دل اور قلب و روح کے عالم سے سروکار ہوتا ہے، تاہم اس دل اور قلب و روح کی اصلاح کے لئے جسم و جسمانیات کی کسی قدر اصلاح بھی اس حد تک ان کے فرائض میں داخل ہے جہاں تک ان کو دل اور قلب و روح کے کاموں کی اصلاح میں اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب: اس مقام پر ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ افرادِ انسانی کے درمیان امن و امان اور اطمینان پیدا کرنے کا کام تو بادشاہ بھی کرتے ہیں، اخلاق کا ایک معلم بھی کرتا ہے، ایک فلفی اور اجتماعیات کا ایک حکیم بھی کرتا ہے، مگر ان کے کاموں کے درمیان جو عظیم الشان فرق ہے اس کو سمجھ لینا ہی اس شبہ کا ازالہ ہے، علمی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ مختلف فنون کے ماہر ایک ہی چیز پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں اور اسی اختلافِ نظر سے ان کا فن بھی علاحدہ علاحدہ ہو جاتا ہے، کسی جسم کے اجزائے ترکیبی سے اگر بحث کی جائے تو کیمسٹری ہے، اگر اس کی زندگی اور اسبابِ زندگی پر غور کیا جائے تو بیالوجی (علم الحیات) ہے، اگر اس کے دماغی قوی اور ان کے آثار کی تحقیق کی جائے تو

سائیکالوجی (علم النفس) ہے، اگر اس کے جذبات اور جذبات کے مطابق اس کے شخصی افعال واعمال کے حدود اور ان کے اسباب وعلل اور غرض و غایت پر نظر ڈالی جائے تو یہ اتھیکس (فلسفۂ اخلاق) ہے، اگر اس کے جماعتی خصائص اور لوازم کی تفتیش کی جائے تو یہ سوشیالوجی (علم اجتماع ومعاشرت) ہے، اگر جسم کی صحت و مرض کے اسباب کی جستجو کی جائے تو یہ طب ہے، دیکھو کہ ایک ہی جسم یا متعلقِ جسم پر کتنی حیثیتوں سے بحثیں کی گئی ہیں اور ان سے کتنے مختلف علوم پیدا ہو گئے ہیں، تاہم وہ سب کے سب جسم اور جسمانیات ہی سے متعلق اور وابستہ ہیں اور باایں ہمہ ان میں سے ہر ایک علم وفن علاحدہ اور ہر ایک علم وفن کے جاننے والے علاحدہ ہیں۔

اسی طرح ایک نبی اور ایک رسول کا کام بھی بادشاہوں، فلاسفروں اور حکیموں کی طرح انسانوں ہی کی اصلاح ہے، مگر ان میں سے کسی ایک کا کام بھی دوسرے سے ملتا جلتا نہیں ہے، بادشاہ صرف اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ اپنے زور وقوت سے بازاروں، گلیوں، آبادیوں اور میدانوں میں امن و امان اور انصاف کو قائم رکھے، فلاسفر انسانوں کے تمام اعمال وخیالات کے اسباب وعلل کی تفتیش اور ان میں نظم وتسلسل اور علت ومعلول کا ربط پیدا کرنے کا کفیل ہے، فلسفۂ اخلاق کے معلم تمہارے اخلاق وعادات کے اسباب وعلل تم کو بتاتے اور ناقابلِ فہم جذبات کی تشریح کرتے ہیں، اس سے آگے ان کا کوئی کام نہیں، حکیم اور واعظ تمہارے اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لئے نہایت شیریں، خوش گوار اور ڈھلے ہوئے فقرے سناتے ہیں، مگر ان میں سے کوئی نہیں جو تمہارے دلوں کا رہنما ہو، جو تمہارے احساس، ارادہ اور اختیار کے قدم کو غلط روی سے روک سکے، وہ نہ صرف تمہارے اخلاق وعادات اور جذبات کے اسباب وعلل بتائے، بلکہ تمہارے اخلاق وعادات اور جذبات میں خیر وشر کی تمیز کرے اور خیر کے حصول اور شر سے حفاظت کی تدبیر بتائے، بلکہ اس کے ہاتھ اور زبان میں یہ قوت ہو کہ اپنی تعلیم وتلقین وفیضِ صحبت سے تمہارے اخلاق و عادات و جذبات بلکہ احساس، ارادہ اور اختیار کی غرض وغایت بلکہ پورے دل کی قوتوں میں انقلاب پیدا کردے اور شر کے تخم کو دلوں کی سرزمین سے نکال کر خیر کا برگ وبار پیدا کردے، البتہ نبی یہ تمام کام سرانجام دیتا ہے، وہ انسانوں کو ان کے احساس، ارادہ اور اختیار کی بھولی ہوئی ذمہ داری یاد دلاتا ہے اور ان کے قویٰ کے مرکز یعنی دل کو خدا کے حکم سے درست کردیتا ہے۔

وہ بادشاہوں کی طرح صرف بازاروں، مجمعوں، آبادیوں کا امن واطمینان نہیں چاہتا بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کے اندر کا امن واطمینان چاہتا ہے، وہ معلمینِ اخلاق کی طرح اسباب وعلل کی تلاش وجستجو وتشریح کی پروانہیں کرتا، بلکہ اخلاقِ سیۂ خواہ کسی سبب سے ہوں وہ ان کی بیخ کنی کرتا ہے اوراخلاقِ حسنہ خواہ وہ کسی علت کے معلول ہوں وہ ان کو انسانوں کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انسانی اوہام کے طلسم کو توڑ دیتا ہے اور غلط رسم ورواج کی بندشوں کو کھولتا ہے اور انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کر کے صرف خدا کی غلامی میں دیتا ہے:

يَامُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ. (اعراف ۷:۱۵۷)	وہ ان کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور اچھائیوں کو ان کے لئے حلال اور خبیث چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے اور ان کے اس بندھن اور زنجیروں کو جو ان پر ہوتی ہیں ان سے اتارتا ہے۔
رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (نساء ۴:۱۶۵)	ایسے رسول بھیجے جو نیکوں کو خوش خبری دیتے اور بدکاروں کو ہشیار کرتے ہیں تاکہ رسولوں کے اس وعظ و تذکیر کے بعد پھر انسانوں کو خدا پر الزام دینے کا موقع نہ ملے کہ ہم بھولے تھے تو خدا نے ہم کو کیوں نہ یاد دلایا۔
لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (حدید ۵۷:۲۵)	ہم نے رسولوں کو کھلی ہدایتیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم رہیں (اور دنیا امن واطمینان کی زندگی بسر کرے)۔

نوعِ انسانی کے دوسرے تمام خدام اور کارکن اپنے فرائض کو جن اغراض سے انجام دیتے ہیں ان کا دائرہ موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی سے آگے نہیں بڑھتا مگر انبیا اور رسول نوعِ انسانی کی خدمت کے یہ کام بھی اس کی موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی کو اس لحاظ سے سامنے رکھ کر کرتے ہیں کہ ان کا اثر اس کی دوسری دائمی و پائدار زندگی پر کیا پڑے گا، وہ جسم کی خدمت جسم کے لئے نہیں بلکہ روح کے لئے کرتے ہیں اور مخلوق کی خدمت خالق کے منشا کے مطابق بجالاتے ہیں، وہ صرف ایک مخلوق کو دوسری مخلوق سے ہی نہیں بلکہ مخلوق کو خالق سے اور خالق ہی کے لئے ایک مخلوق کو

دوسری مخلوق سے جوڑتے ہیں۔

وہ صرف اچھی اچھی اور میٹھی میٹھی باتیں لوگوں کو نہیں سناتے بلکہ خود بہتر سے بہتر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کا عامل بناتے ہیں، وہ خیال آرا شاعروں اور جھوٹے حکیموں کی طرح نہیں ہوتے جو کہتے ہیں اور کرتے نہیں، دماغ ہوتے ہیں مگر دل نہیں ہوتے، زبانیں ہوتی ہیں مگر ہاتھ نہیں ہوتے:

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ. اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ کُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ. وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ. (شعراء۲۶: ۲۲۴-۲۲۶)	اور شاعروں کے پیرو کار گم کردہ راہ ہوتے ہیں تم دیکھتے نہیں کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور وہ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔

وہ اس دعویٰ کے ساتھ انسانوں میں آتے ہیں کہ ان کے خالق نے جس نے ان کے ذرہ ذرہ کا سامانِ راحت فراہم کیا ہے اور جو ان کے قلب و روح کا سامانِ راحت بھی بہم پہنچاتا ہے ان کو اس لئے بھیجا ہے کہ انسانوں کے قلب و روح کو اس سامان کا برتنا سکھائیں اور ان کے رب کا پیغام ان کو سنائیں اور بتائیں کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اپنے احساس، اپنے ارادہ اور اپنے اختیار کو اس طرح اس عالم میں صرف کریں کہ وہ پریشانی و بے اطمینانی کی تاریکی سے نکل کر سکون و اطمینان اور امن و سعادت کی روشنی میں داخل ہوں:

هُوَ الَّذِیْ يُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. (حدید۵۷:۹)	وہی خدا ہے جو اپنے (رسول) بندے پر کھلی آیتیں اتارتا ہے کہ تم کو (اے انسانو!) وہ تاریکی سے روشنی میں لائے، (اور اللہ نے ایسا اس لئے کیا) کہ تم پر شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

انبیا بھی ایک بادشاہ کی طرح جماعتوں کا انتظام کرتے ہیں، مگر ملک کے خراج اور زمین کی آبادی کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے وہ بھی جان و مال کی حفاظت کے لئے مقنن کی طرح قانون بناتے ہیں اور قاضی کی طرح سزا و جزا کا حکم سناتے ہیں، مگر انعامِ شاہی اور تنخواہ ماہانہ پا کر کسی دنیاوی بادشاہ کے فرمان کی تعمیل کے لئے نہیں بلکہ جسم و جان کے شہنشاہ اور کائنات کے مالک کے فرمان کی تعمیل میں وہ بھی فلاسفر کی طرح رموز و اسرار کا پردہ فاش کرتے ہیں، مگر تجربہ، استقرا اور قیاس سے نہیں

بلکہ عالم اسرار کے مبدءِ علم سے فیض پا کر وہ بھی حکیم و واعظ کی طرح پر تاثیر کلام کرتے ہیں، مگر ان کے مانند اپنے دل سے جوڑ کر نہیں بلکہ خدا سے سن کر اور وہ صرف کہتے نہیں بلکہ جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں، اور جو کرتے ہیں وہ دوسروں سے کراتے ہیں، وہ خدا سے ہیں، خدا سے پاتے ہیں اور اسی سے سنتے ہیں اور وہی اوروں کو سناتے ہیں، غرض اوپر آسمان سے ان کو جو کچھ ملتا ہے وہی نیچے زمین پر سب کو بانٹتے ہیں:

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى. مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَ مَا غَوٰى. وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى. اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى. عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى. ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى. وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى........ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى. مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى. اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى......مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى. لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى.

(والنجم ۵۳: ۱-۱۸)

قسم ہے اس ستارہ کی جب وہ نیچے گرے کہ تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ بھولا نہ بھٹکا اور نہ وہ نفس کی خواہش ہی سے بات کرتا ہے وہ تو وہ ہے جو اس کو وحی کے ذریعہ کہا جاتا ہے اس کو بڑی بڑی قوتوں والے نے سکھایا، طاقت والا، تو وہ سیدھا ہوا درآں حالیکہ وہ آسمان کے سب کے اوپر کناروں میں تھا......تو اس نے اپنے بندہ پر وحی کی جو وحی کی، نہ اس کے دل نے جو اس نے دیکھا، اس کو جھوٹ کہا، کیا وہ جو دیکھتا ہے تم اس پر اس سے جھگڑتے ہو، نہ بینائی نے کجی کی اور نہ سرکشی کی، اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے دیکھا۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰۤى اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ. (اعراف ۷: ۲۰۳)

کہہ دے (اے پیغمبر) کہ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، یہ (اے انسانو!) تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں اور ان کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت اور رحمت ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ. عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ. بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِيْنٍ.

(شعراء ۲۶: ۱۹۲-۱۹۵)

یہ تو عالم کے پرورش کرنے والے کی طرف سے اتارا گیا ہے اس کو امانت والی روح نے تیرے دل پر اتارا تا کہ تو ہشیار کرنے والوں میں سے ایک ہو فصیح عربی زبان میں۔

نکتہ، یہ بالکل ممکن، بلکہ واقعہ ہے کہ ایک ہی قسم کا کام مختلف لوگ مختلف غرض و نیت سے

کرتے ہیں، کسی قوم کی اصلاح ہی کا کام ہے کہ اس کو مختلف لوگ مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں، خودغرضی کے غیر مخلصانہ اغراض سے قطعِ نظر کر کے صرف مخلصانہ اغراض کو لو، کوئی یہ سمجھتا ہے کہ قوم کی مالی حالت کی درستی سے قوم بن سکتی ہے، کوئی اصلاح کی جڑ تعلیم کو قرار دیتا ہے، کوئی رسم و رواج و معاشرت پر زور دیتا ہے، کوئی ظاہری تمدن پر مدار رکھتا ہے، کوئی جسمانی قوت پر بھروسہ رکھتا ہے، کوئی سیاسی کامیابی کو قومی اصلاح کا مرکز ٹھہراتا ہے لیکن انبیا علیہم السلام کے نزدیک یہ سب ثانوی درجہ کی باتیں ہیں وہ اپنی بنیاد صرف قلب کی اصلاح پر رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی اصلی چیز ہے اور اسی کے بدلنے سے سب کچھ بدل سکتا ہے، ان کی غرض خدا کی اطاعت، خدا کی محبت اور خدا کی معرفت ہوتی ہے اور تمام دوسری ترقیوں اور اصلاحوں کو وہ یک سر اسی ایک اصل کی فروع اور اسی ایک جڑ کی شاخیں جانتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ ان کی دعوت کی کامیابی سے قوموں کو سلطنت بھی ملتی ہے، دولت بھی ہاتھ آتی ہے، علم بھی حاصل ہوتا ہے، زور اور قوت بھی پیدا ہوتی ہے اور دنیاوی عظمت و جلال کا ہر منظر خادمانہ اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھتا ہے، مگر یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ سیاسی مصلحین کی طرح سلطنت، مالی مصلحین کی طرح دولت، تعلیمی مصلحین کی طرح تعلیمِ علم وفن، جسمانی مصلحین کی طرح قوت وطاقت ان کا مطمحِ نظر نہیں ہوتی، بلکہ جو کچھ ان کے سامنے ہوتا ہے وہ صرف خدا کی اطاعت، خدا کی محبت، خدا کی خوش نودی ہوتی ہے اور باقی تمام چیزیں ان کی نگاہ میں فرعی، ثانوی اور ضمنی ہوتی ہیں۔

نبی اور غیرِ نبی کے امتیازات: سطور بالا سے ہویدا ہے کہ انبیا علیہم السلام اور ان کے مشابہ اشخاص میں کتنا عظیم الشان فرق ہے، یہ فرق چار حیثیتوں سے نمایاں ہے، مبدء اور منبع کا فرق، غرض و غایت کا فرق، طریقِ دعوت کا فرق اور علم وعمل کا فرق، نبی کے علم کا مبدء، منبع، ماخذ اور سرچشمہ جو کچھ کہو وہ تعلیمِ ربانی، شرحِ صدر اور وحی و الہام ہوتا ہے اور حکیم کے علم کا ماخذ و منبع تعلیمِ انسانی، گذشتہ تجربہ، استقرا اور قیاس ہوتا ہے، یعنی حکیم عقل سے جانتا ہے اور نبی خالقِ عقل سے اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال اور جدوجہد کا منشا اپنی شہرت طلبی، علم کا اظہار، قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اس کی اصلاح ہوتا ہے، مگر ایک نبی کا مقصد خدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضامندی کے لئے مخلوق کی بھلائی

ہوتا ہے، طریقِ دعوت کا فرق یہ ہوتا ہے کہ حکیم اپنی دعوت کی عمارت کو تمام تر حکمتوں، مصلحتوں اور علل واسباب کے ستونوں پر کھڑا کرتا ہے مگر نبی اپنی دعوت کو زیادہ تر خالق کی اطاعت، محبت اور رضا جوئی پر قائم کرتا ہے، حکیم کہتا ہے لیکن اس کا کرنا اس کے لئے ضروری نہیں، نبی جو کہتا ہے وہ کرتا ہے اور اس کا کر کے دکھانا اس کے لئے ضروری ہے، وہ صرف جلوت کے منبر پر آراستہ نہیں ہوتا بلکہ وہ جلوت و خلوت اور ظاہر و باطن میں یکساں حسنات سے آراستہ اور برائیوں سے پاک ہوتا ہے، دنیا میں سقراط، افلاطون، ارسطو، دیو جانیس وغیرہ ایک طرف اور ابراہیمؑ، موسیٰؑ ور محمد ﷺ دوسری طرف ہیں اور دونوں کے سوانح اور سیرتیں اور کارنامے بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں کہ ان میں ذرا التباس نہیں۔

بادشاہ اپنی تلوار کے زور اور اپنی فوج و لشکر کی قوت سے رعایا کو اپنے قانون کا پابند بناتے ہیں تاکہ فتنہ و فساد رک جائے، فلاسفر اپنے دعووں کو صرف استدلال کی قوت اور عقل کے خطاب سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی بات لوگ تسلیم کریں لیکن پیغمبر اپنے پیرووں کے قلب کو اس طرح بدل دینا چاہتے ہیں کہ وہ از خود برائی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کرلیں، وہ اگر کبھی قانون و حدو سزا کو اختیار کرتے ہیں یا ساتھ ساتھ عقل کو بھی مخاطب کرتے ہیں تو ان کا یہ ضمنی یا ثانوی کام ہوتا ہے، اولین نہیں، ان کی اولین غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کے پیرووں کو خدا کی قدرت اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اتنا محکم اور پختہ یقین ہو جائے کہ وہ اس کے حکموں اور نصیحتوں کو جو ان کے ذریعہ آتی ہیں بے چون و چرا تسلیم کرلیں۔

دنیا کے بادشاہ اور فاتح اور کشور کشا اپنے زورِ بازو اور تلوار کی قوت سے دنیا کے طبقے الٹ دیتے ہیں، انھوں نے کبھی کبھی چار دانگِ عالم پر حکمرانی کی، قوموں کی جان و مال پر اپنا قبضۂ اقتدار جمایا، ان کی تلواروں کی دھاک نے آبادیوں اور مجمعوں کے مجرموں کو روپوش کر دیا اور بازاروں اور راستوں میں امن و امان پیدا کر دیا لیکن کیا انہوں نے دلوں کے طبقے بھی الٹے؟ اپنی سلطنت کے دائرہ سے باہر کسی کمزور سے کمزور انسان سے اپنے حکم کو منوا سکے؟ وہ لوگوں کے دلوں کو بھی اپنے قبضۂ اقتدار میں لاسکے؟ وہ آبادیوں اور مجمعوں کے روپوش مجرموں کو بھی فنا کرسکے؟ وہ دلوں کی بستیوں میں

بھی امن وامان پیدا کر سکے؟ وہ روحوں کی مملکتوں کا بھی نظم ونسق قائم کر سکے؟

حکما اور فلاسفر جو اپنی عقلِ رسا کے ذریعہ سے عجائباتِ عالم کی طلسم کشائی اور کائنات کے مخفی اسرار کے فاش کرنے کے مدعی ہیں کیا وہ قلب وروح کے عجائبات کو بھی دریافت کر سکے؟ وہ ماورائے مادہ اسرار ورموز کو بھی حل کر سکے؟ وہ انسانوں کی اصلاح وہدایت کا بھی کوئی سامان اپنی تحقیق وتفتیش سے فراہم کر سکے؟ ان کی دقیق نکتہ سنجیوں اور خیال آرائیوں کے پیچھے ان کے ذاتی حسن عمل کا بھی کوئی نمونہ ہے؟ ارسطو نے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد ڈالی، دوسرے حکما نے اخلاق کے اسباب وعلل کے حدود، ظہور، اثر اور نتیجہ کے ایک ایک حرف کی تحقیق کی، مگر کیا اس سے کسی انسان کے دل سے برائی کا تخم دور ہوا؟ اچھائی کے بیج نے نشو ونما پائی؟ ان کے اخلاق وتعلیمات کے فلسفیانہ رموز واسرار کا دائرہ ان کی درس گاہوں کی چہار دیواریوں سے کبھی آگے بڑھ سکا؟ کیوں کہ وہ اپنے درس کے کمروں سے نکل کر جب انسانی صحبتوں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی اخلاقی زندگی اور قلبی صفائی عام انسانی افراد سے ایک انچ بھی بلند نہیں ہوتی، حکمائے یونان میں سقراط سے بڑھ کر کوئی نہیں مگر کیا یہ وہی نہیں ہے جو بازار کی فاحشہ عورتوں سے ارتباط رکھتا تھا اور ان میں ایک پیشہ ور کے فروغ اور کامیابی کے لئے کوشاں رہتا تھا، یہی یونان کے دوسرے حکما کا حال تھا اور توحید اور خدا پرستی کا درجہ تو اس سے بدرجہا بلند ہے، جس کی ان کو ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

ان سطروں سے اندازہ ہوگا کہ ہر شیریں نوا واعظ، ہر مؤثر البیان خطیب، ہر دقیقہ رس مقنن، ہر کشور کشا فاتح اور ہر نکتہ داں حکیم اس لائق نہیں کہ نبوت ورسالت کا اہم اور بلند اور مقدس منصب اس سے منسوب کیا جائے، اس منصب کے ساتھ کچھ ایسے شروط، لوازم اور خصوصیات بھی وابستہ ہیں جو اس کے ضروری اجزا اور عناصر ہیں۔

۱-سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق پر اسرار عالمِ غیب سے ہو، وہ غیب کی آوازیں سنتا ہو، غیب کی چیزیں دیکھتا ہو، غیب سے علم پاتا ہو، عالمِ ملکوت کی تائید اس کے ساتھ ہو، روح القدس اس کا ہم صفیر وہم نوا ہو۔

۲-اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام بندوں میں سے اس کے لئے چنا ہو کہ وہ اس بلند منصب پر سرفراز ہو۔

۳-اس سے خدا کے حکم سے عجیب و غریب اور حیرت انگیز تصرفات صادر ہوں، جن سے اس کا مقبولِ بارگاہ ہونا ثابت ہو۔

۴-فضائلِ اخلاق کے پھولوں سے اس کا دامن بھرا ہو اور ہر قسم کے گناہ کے خس و خاشاک سے پاک وصاف ہو کہ گندے ہاتھوں سے میلے کپڑے پاک وصاف نہیں ہو سکتے۔

۵-وہ لوگوں کو خدا اور علم غیب پر یقین کی دعوت اور فضائل و اخلاق کی تعلیم دے اور روزِ الست کا بھولا ہوا عہد ان کو یاد دلائے۔

۶-نہ صرف تعلیم، بلکہ اس میں یہ قوت ہو کہ وہ شریروں کو نیک اور گمراہوں کو راست رو بنادے اور جو خدا سے بھاگتے ہوں ان کو پھیر کر پھر اس کے آستانہ پر لے آئے۔

۷-اپنے سے پہلے خدا کی طرف سے آئے ہوئے صحیح اصول کو انسانی تصرفات سے پاک و صاف کر کے پیش کرے۔

۸-اس کی اس دعوت، جدوجہد اور تعلیم و تلقین سے مقصود کوئی دنیاوی معاوضہ، شہرت، جاہ طلبی، دولت مندی، قیام سلطنت وغیرہ نہ ہو بلکہ صرف خدا کے حکم کی بجا آوری اور خلقِ خدا کی ہدایت۔

یہ نبوت ورسالت کے وہ اوصاف اور لوازم ہیں جو دنیا کے تمام پیغمبروں میں یکساں پائے جاتے ہیں، مذاہبِ عالم کے صحیفوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف اور آشکارا ہو جاتی ہے، خصوصاً قرآن پاک نے جو دنیا کی نبوت کا سب سے آخری اور سب سے مکمل صحیفہ ہے اور جس نے نبوت ورسالت کی حقیقت اور شرائط ولوازم کی سب سے بہتر تشریح کی ہے، سورۂ انعام میں اکثر پیغمبروں کا ذکر کر کے یہ حقائق ان الفاظ میں بیان کئے ہیں:

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ. وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ وَ	اور یہ تھی ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی ہم جس کو چاہتے ہیں کئی درجے بلند کرتے ہیں، بے شبہ تیرا پروردگار تدبیر والا خبردار ہے اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب بخشے ہر ایک کو ہدایت دی اور نوح کو اس سے پہلے ہدایت دی تھی اور اس کی اولاد میں داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو اور اسی طرح ہم

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ. وَزَكَرِيَّا وَ	نیکو کاروں کو بدلہ دیتے ہیں اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور
يَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ.	الیاس کو، ہر ایک نیکو کاروں میں سے ہے اور اسماعیل اور
وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَ يُوْنُسَ وَلُوْطًا وَكُلًّا	الیسع اور یونس اور لوط کو، ہر ایک کو بزرگی بخشی دنیا والوں پر
فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ. وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَ	ان کے باپ دادوں اور بھائیوں میں سے اور ہم نے ان کو
اِخْوَانِهِمْ .وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ	چن کر پسند کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا یہ اللہ کی ہدایت
مُّسْتَقِيْمٍ. ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ	ہے اس پر وہ جس کو چاہے چلاتا ہے اگر وہ شرک کرتے تو
يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا	ان کا سارا کیا برباد ہو جاتا، یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ	کتاب اور حق و باطل میں فیصلہ کرنا (حکم) اور نبوت دی تو
الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا	اگر کوئی ان باتوں کا انکار کرے تو ہم نے ان باتوں پر ایسے
هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا	دوسرے لوگوں کو مقرر کیا ہے جو ان کا انکار نہیں کرتے، یہی
بِكٰفِرِيْنَ. اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ	وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی، اے محمدؐ تو بھی ان ہی
اقْتَدِهْ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِنْ هُوَ اِلَّا	کی رہنمائی کی پیروی کر اور کہہ میں اپنے کام کی تم سے
ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ. (انعام ۶: ۸۴-۹۱)	مزدوری نہیں چاہتا یہ قرآن تو دنیا والوں کو یاد دہانی ہے۔

ان آیتوں میں اکثر پیغمبروں کے نام لے کر ان کے پیغمبرانہ اوصاف گنائے ہیں، اگر ہم ان کو یک جا کر دیں تو نبوت ورسالت کے عام اوصاف، خصوصیات اور لوازم واضح ہو جائیں۔

۱- فرمایا ''ہم نے ابراہیم کو دلیل دی'' اور ''ہم نے ان کو ہدایت بخشی'' جس سے معلوم ہوا کہ ان کے علم اور ہدایت کا سرچشمہ عالمِ ملکوت سے ہوتا ہے۔

۲- ارشاد ہوا کہ ''ہم نے ان کو سیدھی راہ پر چلایا'' اور ''یہ سب نیکو کار تھے'' اس سے ثابت ہوا کہ وہ معصوم اور گناہوں سے بے داغ ہوتے ہیں۔

۳- یہ بھی کہا کہ ''ہم نے ان کو چن کر پسند کیا'' اور ''اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں یہ ہدایت عطا کریں'' جس سے یہ مقصود ہے کہ یہ منصب سعی ومحنت سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور انتخاب سے ملتا ہے۔

۴-فرمایا کہ ''ہم نے ان کو کتاب، حق و باطل کے فیصلہ کی طاقت (حکم) اور احکامِ غیب کی تعلیم (نبوت) دی'' اس سے معلوم ہوا کہ اس منصب والوں کو کیا کیا چیزیں عطا ہوتی ہیں۔

۵-حکم ہوا کہ ''ان کی رہ نمائی کی پیروی کر'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی اور دعوت پر مامور ہوتے ہیں اور لوگ ان کی پیروی سے نیکوکار اور صالح بنتے ہیں۔

۶-فرمایا کہ ''اے پیغمبر! یہ کہہ دے کہ میں اپنے کام کا کوئی معاوضہ یا بدلہ تم سے نہیں چاہتا، یہ تو اہلِ دنیا کے لئے نصیحت اور یاد دلانا ہے'' اس سے ثابت ہوا کہ خالق کی خوش نودی اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی خیر خواہی کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا مقصد اور مطمح نظر نہیں ہوتا۔

دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کے علاوہ خاص محمد رسول اللہ ﷺ کے تعلق و نسبت سے ان حقیقتوں کو قرآن پاک نے کئی دفعہ بہ تصریح بیان کیا ہے جن میں سے چار باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

۱-اشیائے غیب، امورِ خیر اور فلاح و سعادت کے اسباب پر اس کا علم خدا کی تعلیم سے کامل ہو۔

۲-وہ اپنے علم کے مطابق اپنے عمل میں کامل اور راست باز ہو۔

۳-وہ دوسروں کو ان امور کی تعلیم دیتا ہو۔

۴-اور ان کو بھی اپنی تعلیم اور صحبت کے فیض سے حسبِ استعداد کامل بناتا ہو۔

قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر آپ ﷺ کی نسبت یہ فرمایا گیا:

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ.	وہ رسول اَن پڑھوں کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو پاک و صاف بناتا اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

(آل عمران ۳:۱۶۴ و جمعہ ۶۲:۲)

اس مختصر سی آیت میں ان چاروں مذکورہ بالا امور کا یک جا ذکر کیا ہے، جاہلوں کو آیاتِ الٰہی پڑھانے اور کتاب و حکمت سکھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود اس کو آیاتِ الٰہی پڑھائی اور کتاب و حکمت سکھائی گئی ہوں اور دوسروں کو پاک و صاف بنانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود پاک و صاف ہو کہ ایک جاہل اپنے ہی جیسے دوسرے جاہل کو عالم اور ایک ناپاک اپنے ہی جیسے دوسرے ناپاک کو پاک نہیں بنا سکتا، ایک دوسری آیت میں ہے:

سَنُقْرِءُ کَ فَلَا تَنْسٰی. اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّـهٗ یَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا یَخْفٰی. وَنُیَسِّرُکَ لِلْیُسْرٰی. فَذَکِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّکْرٰی. سَیَذَّکَّرُ مَنْ یَّخْشٰی. وَیَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقٰی.

(الاعلیٰ ۸۷: ۶-۱۱)

ہم تجھے پڑھائیں گے تو تو نہیں بھولے گا مگر جو اللہ چاہے وہ جانتا ہے پکار اور چھپا اور ہم تجھے آہستہ آہستہ آسانی تک پہنچائیں گے اور تو سمجھا اگر تیرا سمجھانا فائدہ دے جس کو خدا کا لحاظ ہوگا وہ سمجھے گا اور جو بدبخت ہوگا وہ اس سے پرہیز کرے گا۔

''ایسا پڑھانا جس میں بھول نہ ہو'' پیغمبر کی روحانی تعلیم ہے، اور ''آسانی کی منزل کی طرف اس کو آہستہ آہستہ لے چلنا اور اس کے لئے اس کٹھن منزل کو آسان کر دینا'' اس کے ذاتی عمل کو کمال کے درجہ تک اس طرح پہنچا دینا ہے کہ تمام امورِ خیر اس سے بہ سہولت از خود صادر ہونے لگیں، پھر اس کو دنیا کے ''سمجھانے'' پر مامور کرنا اس رمز کو آشکارا کرنا ہے کہ دوسروں کی تعلیم و تذکیر کا منصب اس کو ملا ہے، اس کے بعد یہ فرمانا کہ ''متقی اس نصیحت سے فیض پائیں گے اور بدبخت محروم رہیں گے'' اس کی تشریح یہ ہے کہ ناقصوں کی تکمیل اور ذی استعداد لوگوں کو ان کی استعداد کے مطابق پہنچانا بھی اس کا فرض ہے۔(۱)

نبوت کے لوازم اور خصوصیات: نبوت کی شرحِ حقیقت اور اس کے لوازم اور خصوصیات کے اجمالی بیان کے بعد ضرورت ہے کہ نبوت کے چند اہم خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کی جائے، تا کہ وقت کی بہت سی غلط فہمیوں کا سدِ باب ہو لیکن ان خصوصیات کے ذکر سے پہلے خود ہم کو خصوصیت کو سمجھنا ہے کہ اس سے مقصود کیا ہے۔

دنیا میں ہر نوع اور ہر نوع کے ماتحت ہر صنف میں کچھ نہ کچھ مخصوص صفات ہوتی ہیں یہ مخصوص صفات اس نوع اور صنف کے ہر فرد میں یکساں پائی جاتی ہیں ان ہی کو ہم لوازم اور خصوصیات کہتے ہیں، پھل، پھول، چوپائے، پرندے، انسان، تمام انواع میں کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور ان ہی خصوصیات کی بنا پر ہر نوع دوسری نوع سے ممتاز اور ہر صنف دوسری صنف سے علاحدہ ہے، گلاب میں خاص قسم کا رنگ، خاص قسم کی خوشبو اور خاص قسم کے پتے

(۱) یہ تشریح اور طریقۂ استدلال امام رازی نے اپنی تفسیر اور بعض کتب کلامیہ میں اختیار کیا ہے، تفسیر کبیر سورۃ الاعلیٰ ج ۶ ص ۵۲۸ مطبعۃ المصر یہ ۱۲۷۸ھ ہجری

ہوتے ہیں، یہ ناممکن ہے کہ کوئی گلاب ہو اور اس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں لیکن گلاب کی بھی مختلف صنفیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسی لازمی صفات ہوتی ہیں جن سے گلاب کی ہر صنف (قسم) دوسری صنف (قسم) سے علانیہ الگ نظر آتی ہے۔

اسی طرح انسانیت کے کچھ خاص لوازم ہیں، دو ہاتھ، دو پاؤں، سیدھا قد، بولنے کی طاقت، سمجھ بوجھ اور غور وفکر کی اہلیت، ایجاد واختراع کی قوت، انجام بینی، اور مآل اندیشی کی صلاحیت وغیرہ اس کے خواص ہیں اور جس طرح شہد میں مٹھاس، حنظل میں کڑواپن، آگ میں گرمی اور برف میں ٹھنڈک، نوعی خواص کی حیثیت سے خود بہ خود پیدا ہوگئی ہیں، اسی طرح انسان میں انسانیت کی مذکورہ بالا خاصیتیں فطرتاً ودیعت ہیں لیکن اس وصفِ انسانیت میں اشتراک کے ساتھ گلاب کے اصناف کی طرح نوعِ انسانی کے بھی مختلف اصناف ہیں، جیسے ہندی، چینی، حبشی، رومی، ایشیائی، یورپین، دیکھو کہ ان میں سے ہر ایک صنف میں انسانیت کے اشتراک کے باوجود قد وقامت، چہرہ مہرہ، رنگ وروغن، صورت وشکل، اخلاق وعادات وغیرہ بیسیوں چیزوں کا نمایاں امتیاز ہوتا ہے اور یہ تمام انسانی اصناف جو مختلف آب وہوا، مختلف مرز وبوم، مختلف نسل اور مختلف ماحول سے تعلق رکھتے ہیں، انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے صریحاً ممتاز ہیں۔

اسی طرح ہر صنفِ انسانی کے اندر مختلف افراد ہیں، خلاقِ فطرت نے ان میں سے ہر ایک کو مختلف قابلیتیں عطا کی ہیں، شاعری، زبان دانی، فلسفہ، ریاضی، صناعی، باغبانی، معماری، پہلوانی، سیکڑوں مختلف قسم کی انسانی استعدادیں اور قابلیتیں ہیں، ان میں سے ہر صنف کی اور ہر صنف میں سے ہر ایک فرد کی قابلیت واستعداد کی خصوصیتیں دوسرے سے الگ ہیں، ایک تخیل پسند شاعر اور ایک حقیقت شناس ریاضی داں میں عظیم الشان فرق ہوتا ہے، ادب وانشا کے خیالی بلند پرواز عموماً ریاضیات جیسے ٹھوس اور واقعی علوم سے کورے ہوتے ہیں اور واقعات سے لبریز ریاضیات کے جاننے والے ادب وشاعری سے بیگانہ، پہلوانی کے جوہر باغبانی سے الگ ہیں اور ایک صناع کی طبیعت ایک فلسفی سے متضاد ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ صنفِ شعرا میں خاص دماغی قابلیت کا اتحاد ہوتا ہے، نظم کی قوت، تخیل کی بلندی، محاکات کی قدرت، الفاظ کا زور، معانی کا جوش، یہ تمام شعرا کی مخصوص صفات ہیں، اسی طرح

تمام فلسفیوں کی ایک خاص دماغی کیفیت ہوتی ہے، خاموشی، غور وفکر، دقتِ نظر، خارجی عالم سے بے پروائی، تصور میں انہماک، خلوت گزینی، اخلاق کی خشکی، الغرض مرز وبوم اور آب وہوا کے اختلاف کی بنا پر جو اصنافِ انسانی پیدا ہوتے ہیں اور ان میں جو اختلاف و امتیاز ہوتا ہے اسی طرح دماغی وذہنی اور روحانی اختلاف استعداد کی بنا پر جو اصناف انسانی پیدا ہوتے ہیں ان میں بھی یہ اختلاف و امتیاز نظر آتا ہے، ہنیبال و نپولین، تیمور و چنگیز، دم کے دم میں آبادی کو ویرانہ اور ویرانہ کو آبادی، پہاڑ کو میدان اور میدان کو پہاڑ بنا سکتے تھے، مگر وہ بیٹھ کر فلسفۂ اخلاق پر چند صفحے نہیں لکھ سکتے تھے۔ افلاطون تنہائی میں بیٹھ کر جمہوریت کا فلسفیانہ خاکہ تیار کر سکتا تھا مگر ایتھنز کے تخت پر بیٹھ کر ایک لمحہ حکمرانی کا فرض انجام نہیں دے سکتا تھا، سلطان محمود کے درباری شاعر فردوسی نے اپنی طبیعت کے زور سے سینکڑوں خیالی سومنات کے معرکے فتح کیے لیکن پتھر کی ایک چٹان پر بھی کلہاڑی نہ مار سکا، اس کے برخلاف سلطان محمود فوجوں کے دل بادل کے ساتھ پہاڑوں کو چیرتا، دریاؤں کو پھاڑتا اور ریگستانوں میں پانی بہاتا ہوا غزنی سے چل کر گجرات کے کنارے تک پہنچ گیا اور سومنات کے سنگی قلعہ اور مجسمہ کو چکنا چور کر ڈالا، مگر فردوسی کی طرح تنہا بیٹھ کر وہ خیالی شاہنامہ کا ایک معرکہ بھی فتح نہیں کر سکتا تھا۔

ان مثالوں سے یہ ثابت ہے کہ نوعِ انسانی میں اشتراک ہونے کے باوجود اصنافِ انسانی کی ہزاروں قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر قسم وصنف کے الگ الگ خصوصیات، صفات اور لوازم ہیں ان ہی مختلف اصنافِ انسانی میں انبیا علیہم السلام کی بھی ایک صنف ہے اور نوعِ انسانی کی اس مقدس صنف کے بھی چند خاص اوصاف، خصوصیات اور لوازم ہیں، جو ان کو دوسرے اصنافِ انسانی سے علانیہ ممتاز بناتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب ہم کو اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ نبوت ورسالت کے اہم لوازم اور خصوصیات کیا ہیں؟۔

وہبی استعداد: ان میں سے سب سے پہلی چیز وہبی استعداد ہے، اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی فطری استعدادیں پائی جاتی ہیں اور ان ہی کی طرف ان کا طبعی میلان ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں ان کی استعداد اور میلانِ طبع کا جوہر برگ وبار

پیدا کرنے لگتا ہے، یہاں تک کہ ایک خاص مقررہ مدت میں جا کر وہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے. جس طرح ہر درخت سے آم کا پھل پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ اسی سے ہوگا جس کو خدا نے آم کا درخت بنایا ہے، پھر آم کے درخت کے آثار، خواص، پھل، اس کا مزہ، اس کا رنگ و بو غرض جملہ خصوصیات خود اس درخت میں اسی وقت موجود ہوتے ہیں جب وہ ہنوز تخم کی صورت میں ہوتا ہے، وہی تخم پودا بنتا ہے، پودا بڑھتا ہے کونپل اور شاخیں پیدا کرتا ہے اور چند سال میں پھل دینے لگتا ہے لیکن اپنی ترقی کے ہر دور میں وہ اپنے مخفی خصوصیات وہی رکھتا ہے جو ایک دن اس سے آخر میں ظاہر ہونے والے ہیں اور اس پھل کی صفت ہمیشہ اس میں بالقوۃ موجود تھی۔

اسی تمثیل کے مطابق یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر انسان کوشش سے نبی نہیں ہو سکتا بلکہ وہی ہو سکتا ہے جس کو خدا نے نبی بنایا ہے اور نبوت کے یہ آثار، خواص اور کیفیات اس میں بالقوۃ اور استعداد کی صورت میں اسی وقت سے موجود رہتے ہیں جب وہ ہنوز آب و گل کے عالم میں ہوتا ہے، شاید آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا کہ ”میں اسی وقت نبی تھا جب آدم علیہ السلام ہنوز آب و گل میں تھے“ (۱) اسی قسم کا مطلب ہوگا۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب سے عرصۂ وجود میں قدم رکھتے ہیں اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں، وہ حسب و نسب اور سیرت و صورت میں ممتاز ہوتے ہیں، شرک و کفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود اس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں، اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں، ان کی دیانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلم ہوتی ہے اور یہ تمہیدیں اس لئے ہوتی ہیں تا کہ منصب ملنے کے بعد ان کے دعوائے نبوت کی تصدیق اور لوگوں کے میلانِ خاطر کا سامان پہلے ہی سے موجود رہے، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد رسول اللہ صلوٰت اللہ علیہم کے حالات و واقعات قبلِ نبوت پڑھو تو ہمارے اس دعویٰ کی سچائی تم کو نظر آئے گی، حضرت ابراہیمؑ کا نبوت پانے کے پہلے ہی

(۱) جامع ترمذی مناقب نبویؐ الفاظ یہ ہیں: و آدم بین الروح والجسد ص ۵۹۹ ”ض“ و مستدرک حاکم مناقب محمدیؐ ج ۲ ص ۶۰۰ حیدر آباد و مسند احمد ج ۴ ص ۱۲۷ و ۱۲۸۔

سے آسمان و زمین کے خالق کی تلاش، سورج، چاند اور ستاروں پر متفکرانہ نظر، اور بت پرستی کے خلاف نفرت کا شدید جذبہ کس بات کی شہادت ہے؟ حضرت اسماعیلؑ کا بے آب وگیاہ میدان میں پرورش پانا، چاہ زمزم کا ظہور، آنے جانے والے قافلوں کا اس کی آبادی کی طرف میلان، چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو مقدس باپ کے ساتھ مقدس سفر کے لئے تیاری اور اس کم سنی میں باپ کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پوری آمادگی اور صبر وشکر اور تسلیم ورضا کا اظہار کس مستقبل کی خبر دیتا ہے؟ حضرت اسحٰق علیہ السلام کا فرشتوں کی بشارت سے پیدا ہونا اور پیدائش سے پہلے ہی غُلَامٍ عَلِیْمٍ (حجر۱۵: ۵۳) کا خطاب پانا، پھر مقدس باپ کی جانشینی اوراور شلیم کی مسجد کی پاسبانی کے لئے انتخاب کس مقصود کا دیباچہ ہے؟

حضرت یوسفؑ کا بچپن میں رویائے صادقہ اور صبر وشکر اور پاک دامنی کس بات کی گواہی دیتی ہے؟ حضرت موسیٰؑ کی عین خطرہ میں پیدائش، حفاظت، پرورش اور نبوت سے پہلے ہی فرعونیوں سے تنِ تنہا مجاہدانہ آویزش کس مبتدا کی خبر ہے؟ حضرت سلیمانؑ کا آغازِ عمر میں علم وفہم، فصلِ مقدمات کی قوت کس نتیجہ کے آثار ہیں؟ حضرت یحییٰؑ کی دعائیہ پیدائش، بچپن ہی میں ان کی نیکی، سعادت مندی، نرم خوئی، پاکی، کس مقصد کی تمہید ہے؟ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور بچپن ہی میں نیکی، سلامت روی، توراۃ کی حقیقت رسی کس روزِ روشن کی صبح ہے اور خود محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے دعائے خلیل، نوید مسیحا، رویائے آمنہ اور احوالِ ولادت وتربیت، مراسم شرک سے اجتناب، اخلاقِ حسنہ، دیانت، امانت، آثارِ خیر وبرکت، نبوت سے پہلے ہی تنہائی پسندی، خلوت گزینی، حقیقت کی تلاش اور غور وفکر کس خورشیدِ جہاں تاب کا مطلعِ انوار ہے؟

حضرت اسماعیلؑ کا یہ حال ہے:

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ. فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ	تو ہم نے ابراہیم کو ایک بردبار لڑکے کی خوش خبری دی تو جب وہ
السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ	اس کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا تو اس نے کہا کہ اے میرے
اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَا ذَا تَرٰى قَالَ	بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھ کو میں ذبح کررہا ہوں،

يَآ اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ. (صٰفّٰت ۳۷: ۱۰۱، ۱۰۲)

اس نے جواب دیا اے میرے باپ کر ڈال جو تجھ سے کہا گیا تو مجھے خدا نے چاہا تو صبر کرنے والوں میں پائے گا۔

حضرت موسیٰ کو یہ خطاب ہے:

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰى. اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰى. (طٰہٰ ۲۰: ۳۷و۳۸)

اور ہم نے تجھ پر دوسری دفعہ احسان کیا جب (تیری حفاظت اور پرورش کے متعلق) تیری ماں کے دل میں وہ بات ڈال دی جو ڈالی گئی۔

حضرت یحییٰ کی نسبت یہ ارشاد ہے:

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا. وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً وَكَانَ تَقِيًّا. وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا. وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ (مریم ۱۹: ۱۲ تا ۱۵)

اے یحییٰ کتاب (توراۃ کو مضبوطی سے پکڑ اور ہم نے اس کو فیصلہ کرنے کی قوت بچپن ہی میں دے دی اور اپنے پاس سے رحم و مہر اور ستھرائی اور تھا پرہیزگار اور اپنے ماں باپ کا فرماں بردار تھا، زبردستی کرنے والا نافرمان نہ تھا سلامتی ہو اس پر جس دن پیدا ہوا۔

نیز حضرت عیسیٰ کے متعلق ہے:

كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِى الْمَهْدِ صَبِيًّا. قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِىَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِىْ نَبِيًّا. وَّجَعَلَنِىْ مُبٰرَكًا اَيْنَمَا كُنْتُ (مریم ۱۹: ۲۹ تا ۳۱)

ہم کیسے اس سے بات کریں جو ہنوز گہوارہ میں بچہ ہے، عیسیٰ نے کہا میں خدا کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب الٰہی دی اور مجھے نبی ٹھہرایا اور مبارک بنایا میں جہاں ہوں۔

اور مکہ کا ''الامین'' نبوت کے پہلے کی اپنی پوری زندگی، موقعِ شہادت میں بے خطر پیش کر دیتا ہے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ. اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝ (یونس ۱۰: ۱۶)

تو اس (پیغمبری کے دعویٰ) سے پہلے میں تم میں ایک عمر گذار چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے۔

انبیا علیہم السلام کے احوالِ مبارکہ کے یہ جزئیات باہم مل کر اپنی نسبت خود کلیہ بنا کر پیش

کرتے ہیں۔

غیبی علم: نبوت کا دوسرا سب سے اہم خاصہ اس کا غیبی علم ہے یعنی وہ علم جو عام انسانوں کی طرح وجدان، احساس یا عقل وقیاس سے نہیں بلکہ براہِ راست صدائے غیب یا رویائے صادقہ یا فرشتوں کے ذریعہ سے خدائے پاک سے حاصل ہوتا ہے، اسی کے آغاز سے نبوت کی استعداد بالقوۃ کا عملی ظہور شروع ہو جاتا ہے، اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

علم انسانی کے ماخذ: علم انسانی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو بلاواسطہ ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو کسی واسطہ سے حاصل ہوتا ہے، بے واسطہ علم کی بھی تین قسمیں ہیں۔

۱-وجدان: انسان کو اپنے جسمانی وجود اور اس جسمانی وجود کے اندرونی کیفیات کا علم سب سے زیادہ یقینی طور سے ہوتا ہے ہر شخص کو اپنے وجود کا یقین ہے اور اس کے اندر بھوک، پیاس، بیماری، صحت، غم، خوشی، خوف وغیرہ اندرونی تغیرات کا علم اس کو بلاواسطہ از خود ہو جاتا ہے۔

۲-فطرت: اس میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے کہ ہر نوعِ مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسی نوعی خصوصیتیں عطا ہوتی ہیں جو دوسری نوعوں میں نہیں پائی جاتیں اور ان ہی سے باہم نوعوں کا اختلاف اور امتیاز ظاہر ہوتا ہے، ان نوعی خصوصیتوں کا علم ہر نوع کے افراد کو بلا کسی ذریعہ اور واسطہ کے از خود ہوتا ہے اور اسی کو بعض علما کی اصطلاح میں فطری یا نوعی الہام اور اہلِ فلسفہ کی اصطلاح میں "جبلت" کہتے ہیں، حیوانات کو اپنے متعلق بہت سی باتوں کا علم از خود فطرتاً ہوتا ہے، پرندوں کے بچوں کو دانہ چگنا اور اڑنا کون سکھاتا ہے، آبی جانوروں کو تیرنے کی تعلیم کون دیتا ہے، شیر کے بچہ کو درندگی کا سبق کس معلم نے پڑھایا، انسان کے بچہ کو پیدا ہوتے ہی رونا، سونا، دودھ پینا کون سکھا دیتا ہے۔

۳-بداہت اولیہ: انسان کو کچھ ہوش وتمیز آنے کے بعد بلا دلیل بعض ایسی باتیں از خود یا بہ ادنیٰ تامل اس طرح معلوم ہو جاتی ہیں کہ ان میں پھر کسی قسم کا شک وشبہہ راہ نہیں پاتا، دو اور دو چار ہوتے ہیں، برابر کا برابر برابر ہوتا ہے، ایک ہی وقت میں ایک ہی چیز سیاہ وسپید دونوں نہیں ہو سکتی، ہر بنی ہوئی چیز کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے وغیرہ بہت سے ایسے ضروری مقدمات اور کلیات جن پر انسان کے استدلال کا تمام تر مدار ہے، اس کو بداہتاً معلوم ہو جاتے ہیں۔

یہ تو بلاواسطہ علم کی تین قسمیں تھیں۔ اس کے بعد علم انسانی کی وہ قسمیں ہیں جن کا علم اس کو کسی واسطہ سے ہوتا ہے، انسان کے پاس اس قسم کے دو واسطے ہیں ایک احساس اور دوسرا عقل، پہلے سے وہ گرد و پیش کی مادی چیزوں کا اور دوسرے سے ان مادی چیزوں کا جو سامنے موجود نہیں یا سرے سے خارج میں موجود نہیں بلکہ عالم غیب میں ہیں یا صرف ذہن میں ہیں علم حاصل کرتا ہے۔

۴- انسان کے جسم کے اندر پانچ قسم کی جسمانی قوتیں ہیں، باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ، باصرہ دیکھتی، سامعہ سنتی، شامہ سونگھتی، ذائقہ چکھتی اور لامسہ چھوتی ہے، ان ہی کا نام حواسِ خمسہ ہے، انسان کے پاس یہی پانچ آلات ہیں جن کے ذریعہ سے وہ ان مادی چیزوں کے متعلق علم حاصل کرتا ہے جو اس کے ان آلات سے آکر ٹکراتی ہیں، اسی کا نام **احساس** ہے، ہم چکھ کر مزہ پاتے، سن کر آواز پہچانتے، دیکھ کر صورت جانتے، چھو کر سختی و نرمی دریافت کرتے اور سونگھ کر بو معلوم کرتے ہیں، ان حواس کے ذریعہ سے بھی جو علم ہم کو ہوتا ہے وہ اکثر یقینی اور شاذ و نادر غلط بھی ہوتا ہے، کیوں کہ وہ کبھی کبھی کسی سبب سے دھوکا بھی کھاتے ہیں اور دریافت میں غلطی بھی کرتے ہیں اور دلائل سے ان کا یہ دھوکا اور ان کی غلطی ثابت ہوتی ہے، بیماری میں قوتِ ذائقہ بدل گئی ہے اور اس نے میٹھے کو کڑوا بتایا ہے، تیز حرکت میں قوت باصرہ نے ہم کو دھوکا دیا ہے، ریل میں ہم کو ساکن اور ٹھہری ہوئی چیز چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، چلتے ہوئے جہاز میں جہاز ہم کو ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے، متحرک چنگاری کا نقطہ تیز سیدھی حرکت میں ہم کو آتشیں خط اور گول حرکت میں آتشیں دائرہ معلوم ہوتا ہے، آسمان کے چمکتے ہوئے بڑے بڑے ستارے کتنے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں لیکن کیا درحقیقت وہ ایسے ہی چھوٹے ہیں۔

۵- علم بالواسطہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کو ہم اپنی عقل و قیاس، غور و فکر اور استدلال کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں اس کی بنیاد درحقیقت ان ہی معلومات پر ہوتی ہے جن کا علم ہم کو اپنے وجدان، الہامِ فطری (یا جبلت) بداہتِ اولیہ اور احساس سے پہلے ہو چکا ہے اور ان ہی معلوم شدہ اموز پر غیر معلوم امور کو تمثیل یا استقرا کے ذریعہ سے قیاس کر کے ان معلوم شدہ امور کے خصوصیات اور آثار کا حکم ان غیر معلوم لیکن مشابہ و مماثل امور پر لگا کر نیا نتیجہ حاصل کرتے ہیں، وہ غیر معلوم امر جس پر معلوم امور کے ذریعہ ہم کوئی حکم لگاتے ہیں اگر مادی ہوتا ہے تو نتیجہ چنداں غیر مشکوک نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ جزئیات کا استقرا پورا نہ کیا گیا ہو، یا تمثیلِ تام نہ ہو، یا تجربہ و مشاہدہ نے

دھوکا دیا ہو، یا کوئی اور اصولی غلطی ہوگئی ہو، طبعیات اور سائنس کے مسائل اکثر اسی طرح معلوم کئے گئے ہیں لیکن اگر وہ امر مجہول غیر مادی ہے تو مادی امور پر اس غیر مادی کو قیاس کر کے اس کی نسبت جو کچھ کہا جائے گا اس کا مرتبہ ظن وتخمین سے آگے نہیں بڑھتا مگر یہ کہ وہ تمام تر فطریات و بدیہیات و محسوسات پر علانیہ منتہی ہو، مابعد الطبیعہ اور فلسفۂ الٰہیات کے مسائل اسی طریقۂ استدلال سے حاصل ہوتے ہیں اور اسی لئے ان میں اختلافات کی بڑی گنجائش نکلتی ہے کہ ان کے آخری نتیجہ اور ابتدائی بنیادی وجدانی یا بدیہی یا حسّی مقدمات کے درمیان قیاسات کی کئی منزلیں ہیں اور ان میں سے ہر منزل خطروں سے لبریز ہے، مشابہت ومماثلت میں دھوکا ہوسکتا ہے، عقلی اور وجدانی اور حسّی اشیا کے خواص کے درمیان اختلاف اور فرق ہوسکتا ہے، غور وفکر، بحث ونظر، تحقیق وجستجو اور ترتیبِ مقدمات جو اس قیاس عقلی کے کارکن اور فاعل ہیں وہ اپنے کام میں دھوکا کھاسکتے ہیں، اسی لئے یہ علوم شکوک و شبہات سے لبریز ہیں۔

ذرائعِ علم کے حصول کے زمانے اور ان کے مراتب: سطورِ بالا سے ہویدا ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ یقینی علوم ہمارے **وجدانیات** اور **فطریات** ہیں جو ہم کو قدرت کی طرف سے سب سے پہلے عنایت ہوتے ہیں کہ ہمارے وجود کی بقا اس علم پر موقوف ہے جیسے بھوک اور پیاس کا احساس اور اس علم کا غیبی ہونا بھی ضروری ہے، ورنہ ہم اپنا وجود قائم نہ رکھ سکیں گے، ہم کو جو بھوک یا پیاس لگتی ہے کیا اس کے یقینی اور قطعی علم میں ہم سے غلطی ہوسکتی ہے اور کیا کسی کے شک دلانے سے ممکن ہے کہ تم کو بھوک نہ ہو، ممکن ہے کہ تم کو پیاس نہ ہو، کبھی بھوکے یا پیاسے کو اپنی بھوک اور پیاس کے متعلق شک ہوسکتا ہے اور یہ احساس اور علم وجود کے ساتھ ساتھ انسان کو ملتا ہے، یہاں تک کہ آج کا پیدا شدہ بچہ بھی اس کا احساس کرتا اور علم رکھتا ہے ورنہ وہ اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

وجدانیات وفطریات کے بعد محسوسات کا علم انسان کو ملتا ہے، دیکھنا، سننا، چکھنا، سونگھنا، چھونا یہ ہمارے پانچ حواس ہیں جو ہمارے مادی علم کے آلات ہیں اور جن کے بغیر کوئی باہر کا علم ہمارے اندر نہیں آسکتا، یہ احساسات بھی ایک ہی دفعہ نہیں کمال پاجاتے، بلکہ ضرورت کے مطابق حسب استعداد ملتے اور ترقی پاتے ہیں اور پیدائش کے چند ماہ بعد یہ تکمیل کو پہنچتے ہیں کیوں کہ وجود کی بقا اور ضروریات کی تکمیل ابھی سے ان پر رفتہ رفتہ موقوف ہوتی جاتی ہے۔

محسوسات کے بعد بدیہیات اولیہ کا درجہ آتا ہے، انسان کو اپنے اس علم میں بھی وہی اذعان وقطعیت ہوتی ہے، دودو چار ہوتے ہیں، دس پانچ کا دونا ہے، ایک چیز ایک ہی وقت میں دوجگہ نہیں ہوسکتی، ایک چیز ایک ہی وقت میں سیاہ وسپید نہیں ہوسکتی، ان بدیہی علوم کو ہر شخص مانتا اور تسلیم کرتا ہے مگر اس کا علم انسان کو بچپن میں نہیں ہوتا بلکہ تمیز ورشد کے بعد ہوتا ہے کیوں کہ اسی وقت اس کی ضرورت پیش آتی ہے اگر یہ علوم اس سن میں اس کو عطا نہ ہوں تو وہ دنیا کے ضروری کاروبار چلانے کے لائق نہ ہو اور نہ دوسرے علوم کی دریافت کی اس میں استعداد پیدا ہو، فطری احمق اور بے وقوف ان ہی کو کہتے ہیں جن میں ان بدیہیات کا علم کم یا بالکل نہیں ہوتا۔

سب سے اخیر میں اس علم کا درجہ آتا ہے جو وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات پر قیاس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور جس کو علم معقولات کہتے ہیں، اسی علم اور اسی کی قوت کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے کہ انسانی عقلیں درجہ اور مرتبہ میں متفاوت ہوتی ہیں ایک طرف تو (کمی کی سمت میں) وہ حماقت تک پہنچ جاتی ہیں اور دوسری طرف (سمتِ کمال میں) عاقل، عاقل تر اور عاقل ترین طبقہ تک اونچی ہوجاتی ہیں، یہاں تک کہ وہ درجہ بھی آتا ہے کہ کسی کی عقل اس مرتبہ تک جا پہنچتی ہے جہاں اس کا دوسرا حریف اور ہم سر نہیں ہوتا، ایک جاہل حبشی سے لے کر ارسطو اور بوعلی سینا تک سب ان ہی عقلی مدارج کے مختلف انسانی نظائر ہیں، باایں ہمہ یہ ظاہر ہے کہ اس علم کا طریقہ نہایت پرخطر اور منزلِ مقصود ہمیشہ مشکوک رہتی ہے۔

عام طور سے انسانی علم کے یہ پانچ ذریعے اور طریقے سمجھے جاتے ہیں لیکن درحقیقت ایک اور ذریعہ بھی ہے جس کا تعلق تمام تر ماورائے مادہ سے ہے، غور کیجئے کہ آپ کا سب سے پہلا علم یعنی وجدانیات آپ کے اندرونی حواس کا نتیجہ ہے، دوسرا یعنی فطریات کا علم خالقِ فطرت خود آپ کے اندر ودیعت رکھتا ہے، تیسرا علم یعنی محسوسات کا علم آپ کے ان ظاہری حواس کا نتیجہ ہے جو گو باہر ہیں مگر آپ کے جسم کے اندر ہیں، آپ کا چوتھا ذریعۂ علم یعنی بدیہیات اولیہ آپ کے حواس اور ذہن کا ایک مشترک فیصلہ ہیں، پانچواں ذریعۂ علم جو آپ کی عقل و ذہن کی قیاس آرائی ہے، وہ آپ ہی کے اندر کے دماغی قویٰ کا عمل ہے، تھوڑے تامل سے معلوم ہوگا کہ آپ کا علم وجدان سے لے کر ذہن تک بہ تدریج مادیت سے ترقی کر کے ماورائے مادہ کے قریب تک پہنچتا ہے، وجدان تمام تر ہماری اندرونی

جسمانی مادیت ہے جس میں کوئی شک نہیں، محسوسات بھی ہمارے ہی جسم کے مادی آلاتِ علم کے نتائج ہیں، بدیہیات ہمارے حواس سے جو مادی ہیں اور ہمارے ذہن سے جو غیر مادی ہے مشترک تعلق رکھتے ہیں یعنی بدیہیات، مادی اور غیر مادی ذرائع علم کے بین بین ہیں اور معقولات تمام تر ذہنی اور غیر مادی ہیں، تاہم اس غیر مادی قوت کا مرکز ہمارا مادی جسم ہی ہے اور اس حد تک اس غیر مادی قوت کا مادہ سے تعلق بہر حال ہوتا ہے۔

غیر مادی علم: اب اس کے بعد اس علم کا درجہ آتا ہے جس کی سرحد اس کے بعد آتی ہے اور جس کا تعلق مادہ سے اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا معقولات اور ذہنیات کا ہے، وہ تمام تر مادہ اور مادیات سے پاک ہوتا ہے، اس کو مادہ سے اسی قدر لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ علم مادی دل و دماغ کے آئینہ پر اوپر سے آکر اپنا عکس ڈالتا ہے۔

اس غیر مادی علم کے بھی بہ ترتیب مختلف درجے ہیں، جن کو فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی کہتے ہیں اور جس طرح انسانی علم کے مذکورہ بالا پانچوں ذریعے انسان کے جسمانی قویٰ سے متعلق تھے، اسی طرح یہ غیر مادی ذرائع انسان کے روحانی قویٰ سے وابستگی رکھتے ہیں اور جس طرح آپ نے دیکھا ہے کہ وجدانیات سے لے کر عقلیات تک بہ ترتیب ہمارا ذریعۂ علم خالص مادی، کامل مادی، کم مادی اور برائے نام مادی تک ترقی کرتا چلا گیا ہے، اسی طرح فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی بھی برائے نام مادی و روحانی سے لے کر پھر روحانی، کامل روحانی اور خالص روحانی کے ذریعہ تک ترقی کرتے چلے گئے ہیں۔

۱۔فراست کے لفظی معنی ''تاڑ جانے'' کے ہیں، تاڑ لینے کی قوت ہر شخص میں نمایاں نہیں ہوتی، مگر جس میں نمایاں ہوتی ہے اس کی یہ کیفیت ایک ملکہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے، جو تجربہ کی کثرت اور عمل کی مہارت اور کمال کے بعد انسان کو حاصل ہو جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے دیکھنے، سننے، چکھنے یا چھونے کے ساتھ ہی صرف بعض علامتوں کے جان لینے سے دوسری متعدد ضروری علامتوں پر تفصیلی نظر ڈالے بغیر اتنی جلدی انسان صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ غیب کی بات بیان کر رہا ہے، حالاں کہ اس کا علم تمام تر ظاہری علامتوں اور نشانوں پر مبنی ہوتا ہے جن کو ہر شخص دیکھ سکتا تھا مگر دیکھتا نہ تھا، ایسے ماہرِ فن اور

ذی فراست اشخاص برابر ہر شخص کے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں، جس کو جس چیز یا فن میں یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے اس کی فراست اس کو حاصل ہو جاتی ہے، جرائم کے پتہ لگانے والے ماہرین اور جاسوس اپنے فن کی فراست میں یہ کمال رکھتے ہیں کہ صورت دیکھی اور تاڑ گئے، اسی طرح ہر علم وفن کے ماہروں کو اپنے اپنے فن کے اندر یہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے، اخیار اور نیکو کاروں کو اپنی جماعت کے افراد کے پہچان لینے اور جان لینے کی طاقت بھی اسی طرح حاصل ہوتی ہے اور اسی کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

اتقوا فراسة المومن فانه ینظر بنور الله. (ترمذی، کتاب التفسیر سورۃ الحجر ص ۵۱۳)

مومن کے تاڑ لینے سے ڈرو کہ وہ خدا کی روشنی سے دیکھتا ہے۔

۲-فراست کے بعد حدس کا درجہ ہے، فراست کے ابتدائی مقدمات، حواس پر مبنی ہوتے ہیں لیکن حدس کے ابتدائی مقدمات ذہنی اور عقلی ہوتے ہیں اور ان ہی ذہنی اور عقلی مقدمات کے غور و فکر، تلاش اور ترتیب سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے، مگر فطری کمال یا فن کی حاصل کردہ مہارت کے سبب سے غور ونظر، فکر و تلاش اور ترتیبِ مقدمات کے منطقیانہ مرحلوں کو ذہنِ رسا اس تیزی اور سرعت کے ساتھ طے کر کے آخری نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ خود اس کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ اس نتیجہ کے حاصل کرنے میں اس نے کوئی دماغی عمل بھی کیا ہے، یہ چیز بھی اکثر کامل العقل اور صائب الرائے انسانوں کو فطرتاً عطا ہوتی ہے اور دنیا کے مشہور عقلا اور دانایانِ روزگار کے واقعات میں اس کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں۔

۳-کشف کے لفظی معنی تو کھولنے اور پردہ اٹھانے کے ہیں، مگر اس سے مقصود یہ ہے کہ مادیت کے ظلمانی پردہ کو چاک کر کے مادی چیز روحانی عالم میں مشاہدہ کے سامنے آجاتی ہے، وہ کبھی اصلی صورت میں اور کبھی اپنی مثالی صورت میں نظر آتی ہے، عام لوگوں کے سمجھنے کے لئے اس کی بہترین مثال خواب کی ہے، فرق اتنا ہے کہ خواب عالمِ خواب کی بات ہے اور کشف عالم بیداری کی، جس طرح عام لوگوں کو خواب میں جب ظاہری حواس بے کار ہو جاتے ہیں ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو کبھی کبھی عین واقعہ ثابت ہوتی ہیں، اسی طرح خاص لوگوں پر بیداری ہی میں ظاہری حواس کے تعطل سے ایسا سماں پیش

آتا ہے، ہر شخص کے تجربے میں ایسے متعدد حیرت انگیز واقعات گذرتے رہتے ہیں۔

۴- الہام کے لفظی معنی ''دل میں ڈالنے'' کے ہیں اور اس سے مراد وہ علم ہے جو محنت، تلاش، تحقیق، غور اور ترتیبِ مقدمات کے بغیر دل میں آجاتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی صحت بعد کو حسی تجربوں اور عقلی دلیلوں سے بھی ثابت ہو جائے مگر خود وہ علم پہلے پہل ذہن میں کسی حسی تجربہ یا عقلی دلیل کے نتیجہ کے طور پر نہیں آتا، بلکہ خود بہ خود دل میں آجاتا ہے، کیوں آتا ہے؟ اور کہاں سے آتا ہے؟ اس کے جوابات مختلف ہوسکتے ہیں، مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ آتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، اس کی ابتدائی اور معمولی مثالیں وہ خیالات ہیں جو محققین، علما، شعرا اور موجدین کے ذہن میں پردۂ عدم سے پہلے پہل آتے ہیں اور وہ ان کو دنیا کے سامنے اپنی ایجادات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

۵- وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دلی منشا کو لبوں کو جنبش دیے بغیر اخفا اور آہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کردینا ہیں اور اصطلاحاً اس کے معنی خدا کا اپنے دلی منشا سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطلع کرنا ہے، یہ علم واطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔

جس طرح علم کی تین جسمانی قسمیں یعنی وجدانیات، حسیات اور بدیہیات عام انسانوں کے لئے یقینی ہیں اسی طرح روحانی ذرائعِ علم کے یہ تین ذریعے کشف، الہام اور وحی انبیا علیہم السلام کے لئے یقینی ہیں اور جس طرح علم کے مادی ذریعوں میں سے یقین کا سب سے پہلا ذریعہ وہ ہے جو تمام تر مادی ہے یعنی وجدان، پھر حسِ ظاہر اور پھر بدیہیات، اسی طرح علم کے روحانی واسطوں میں سب سے زیادہ یقینی وہ ہے جو تمام تر روحانی ہے یعنی وحی پھر الہام پھر کشف۔

ہم نے علم کے روحانی ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں یعنی وحی، الہام اور کشف، یہ قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں اس کی اصطلاح میں روحانی ذریعۂ علم کا نام مکالمۂ الٰہی (خدا سے بات کرنا) اور اس کی حسب ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں:

۱- وحی (اشارہ) سے بات کرنا یعنی دل میں کسی معنی کا بغیر آواز اور الفاظ کے آجانا یہ اگر حالتِ بیداری میں ہے تو کشف ہے اور اگر خواب میں ہے تو رویا ہے۔

۲- خدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا، یعنی متکلم نظر نہیں آتا مگر غیب سے آواز آتی ہے اور

الفاظ سنائی دیتے ہیں اس کو الہام کہہ لو۔

۳-فرشتے کے ذریعہ سے بات کرنا یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے نظر آتا ہے اور اس کے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں جن کو نبی سن کر محفوظ کر لیتا ہے، اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں، کیوں کہ قرآن پاک کا نزول اسی آخری طریقہ سے ہوا ہے لیکن اس شہرتِ عام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دو اور دوسرے طریقے وحی کی قسمیں نہیں ہیں، وحی کی ان اقسام کا ذکر سورۂ شوریٰ میں ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ۔ (شوریٰ ۴۲:۵۱)

اور کسی آدمی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے، لیکن وحی (اشارہ) سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے تو وہ خدا کے حکم سے، خدا جو چاہے اس کو وہ وحی کر دیتا ہے، بے شک اللہ بلند اور حکمت والا ہے۔

مکالمۂ الٰہی کے یہ تینوں طریقے یعنی وحی (اشارہ) سے بات کرنا، پردہ کے پیچھے سے بات کرنا اور فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا، وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں اور پھر ان تینوں کا اجمالی مشترک نام بھی وحی ہے، یعنی یہ مقسم بھی ہے اور اپنی تین قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، اسی آیت میں دیکھو کہ فرشتہ کے ذریعہ سے کلام کو بھی وحی فرمایا گیا اور تینوں مذکورہ بالا طریقوں میں جس طریقے سے بھی آنحضرت ﷺ کو غیبی تعلیم و اطلاع دی گئی ہے اس کو بھی وحی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ عام مکالمۂ الٰہی کے مرادف بھی مستعمل ہوا ہے:

مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى. اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى. (نجم ۵۳:۳،۴)

نبی خواہشِ نفس سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔

الغرض اسی امتیاز کے لئے علمی اصطلاحات میں ان تینوں طریقوں کے لئے کشف، الہام اور وحی کے تین علاحدہ علاحدہ الفاظ وضع کر دیے گئے ہیں تا کہ بول چال میں ہر روحانی طریقۂ گفتگو دوسرے سے ممتاز ہو جائے، بیداری میں اشارہ سے بات کرنا کشف ہے اور خواب کے عالم میں رویا ہے، پردہ کے پیچھے سے آواز کا آنا الہام ہے اور فرشتہ کی درمیانگی سے بات کرنا وحی ہے۔ (۱)

(۱) ان اصطلاحات کی بحث کے لئے اصولِ فقہ کی اہم کتابوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے، کم از کم اس موقع پر تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ کی شرح التقریر والتحبیر لابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ ہجری جلد سوم ص ۲۹۵ مطبوعہ امیریہ بولاق مصر ۱۳۱۷ھ دیکھنی چاہیے۔

نکتہ: اوپر کی آیت میں جہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے بات کرے لیکن ان تین طریقوں سے، اس کے آخر میں فرمایا ہے کہ وہ سب سے بلند اور حکیم ہے، یعنی اس کی بلندی و برتری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے مکالمہ کے شرف کا مستحق نہ سمجھے مگر اس کی حکمت کا اقتضایہ ہے کہ وہ اپنے بندگان خاص سے عام بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ان تین غیر معمولی طریقوں میں سے کسی طریقہ سے گفتگو فرمالے۔

بہرحال غیبی ذریعۂ اطلاع کی یہ سب سے بلند قسم جس کو اصطلاح میں وحی کہتے ہیں اس کا تجربہ عام لوگوں کو نہیں لیکن اس سے نیچے درجہ کے غیبی ذرائعِ اطلاع کا تجربہ ہر شخص کو تھوڑا بہت ہے اور ہر انسان کی زندگی میں جو بعض پراسرار اور ناقابل فہم واقعات پیش آتے ہیں ان پر غور کرنے سے غیب کے اس اعلاترین ذریعۂ علم کا دھندلا سا خاکہ ذہن میں آسکتا ہے، جس سے غیر جسمانی اور غیر حسی مادی ذرائعِ علم کے سمجھنے اور باور کرنے میں جو استبعاد معلوم ہوتا ہے وہ دور ہوسکتا ہے، خصوصاً اس عہد میں جب سائیکالوجی کی تحقیقات سے نفس کی بہت سی نامعلوم طاقتوں کا پتہ چل رہا ہے اور اسپیچولزم کے ذریعہ ارواح سے خطاب وکلام کی سلسلہ جنبانی ہورہی ہے اور جدید روحانیات کا فن ایک مستقل سائنس کی صورت اختیار کررہا ہے۔

انبیا علیہم السلام کو اپنے کشف، الہام اور وحی پر اتنا ہی یقین ہوتا ہے جس قدر عام انسانوں کو اپنے وجدانیات، محسوسات، فطریات اور بدیہیات پر، انبیا کا یہ روحانی علم ایسا ہی اندرونی ہوتا ہے جیسا عام انسانوں میں وجدانیات، فطریات اور بدیہیات و محسوسات کا علم ہوتا ہے جس طرح کسی شخص کو اس علم میں دھوکا نہیں ہوسکتا کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہورہی ہے یا اس کو غم یا خوشی ہے، اسی طرح نبی کو بھی اپنے روحانی وجدانیات میں دھوکا نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے فطریات میں یہ مغالطہ نہیں ہوتا کہ دو اور دو چار نہیں ہوتے، اسی طرح اس کو بھی پیغمبرانہ فطریات میں مغالطہ واقع نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے محسوسات میں اگر کسی کو سامنے دیکھ رہے ہو یا کسی کی آواز سن رہے ہو شبہہ نہیں ہوا کرتا اس کو بھی اپنے روحانی محسوسات میں شبہہ نہیں ہوا کرتا، غرض وہ اپنے ان جملہ غیبی اور روحانی ذرائعِ علم میں ہر لغزش، فریب، خطا اور غلطی سے اسی طرح پاک ہوتا ہے، جس طرح تم اپنے

وجدانیات، فطریات، محسوسات اور بدیہیات میں غلطی اور خطا سے پاک ہوتے ہو۔

علم غیب: اسلام کے عقیدہ میں غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، قرآن میں بار بار آنحضرت ﷺ کو اس اعلان کی ہدایت ہوئی ہے:

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ. (یونس۱۰:۲۰) — تو کہہ دے اے پیغمبر کہ غیب خدا کے لئے ہے۔

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ. (نمل۲۷:۶۵) — کہہ دے کہ آسمانوں میں اور زمین میں خدا کے سوا کوئی نہیں جس کو غیب کا علم ہو۔

رسول کہتے ہیں:

وَلَا اَعْلَمُ الْغَیْبَ. (انعام۶:۵۰) — اور میں غیب نہیں جانتا۔

لیکن اسی کے ساتھ دو موقعوں پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ بااین ہمہ خدا اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی اطلاع دیتا ہے۔

سورۂ جن میں ہے:

فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ. (جن۷۲:۲۶،۲۷) — تو اللہ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن اس پیغمبر پر جس کو پسند کرے۔

دوسری جگہ سورۂ آل عمران میں ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ. (آل عمران۳:۱۷۹) — اور نہ تھا اللہ کہ غیب کی باتوں پر تم کو مطلع کرتا لیکن یہ کہ اللہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہے چن لیتا ہے۔

ان دو آیتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی باتوں کی اطلاع دیتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں غیب دانی کی کلیتاً اور قطعاً نفی کی گئی ہے ان سے مراد ذاتی اور حقیقی علم ہے، یعنی خدا کے سوا بالذات کسی کو غیب کا علم نہیں، البتہ خدا کے واسطہ اور ذریعہ سے اور اس کی تعلیم و اطلاع سے پیغمبروں کو اس کا علم حاصل ہوتا ہے، ساتھ ہی آیت الکرسی میں فرمادیا گیا:

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا — اور وہ خدا کے ایک ذرہ علم کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے

شَآءَ.　　(بقرہ۲:۲۵۵)　　لیکن اتنے کا جتنے کا وہ چاہے۔

یعنی اپنے علوم غیب سے جتنا اور جس قدر وہ پسند کرتا ہے اور مصلحت سمجھتا ہے وہ ان کو بذریعہ وحی ان سے واقف کرتا رہتا ہے، بایں ہمہ بعض باتوں کی نسبت جیسا کہ سورہ ہود اور لقمان میں ہے اللہ تعالیٰ نے قطعی طور سے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ان کا علم کسی کو نہیں، مثلاً قیامت، بارش، موت، شکمِ مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی، کل کیا ہوگا، ان باتوں کو خدائے تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اسی طرح بعض آیتوں میں آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اس کا تم کو علم نہ تھا، جیسا کہ غزوۂ تبوک میں عدمِ شرکت کے بعض عذرخواہ لوگوں کے متعلق سورۂ توبہ میں ہے کہ انہوں نے جھوٹی قسمیں کھا کر اجازت حاصل کر لی، خدا نے فرمایا:

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ.　(توبہ۹:۴۳)	خدا نے تجھ سے درگذر کیا کیوں تو نے ان کو اجازت دی تا آں کہ تجھے معلوم ہو جاتے جو سچ بولے اور جھوٹوں کو جان لیتا۔
لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ.　(توبہ۹: ۴۸)	انہوں نے پہلے فتنہ پیدا کرنا چاہا اور تیرے سامنے واقعات الٹ دیے یہاں تک کہ حق بات آگئی اور خدا کی بات کھل گئی اور وہ ایسا نہیں چاہتے۔

آگے چل کر ہے:

مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ.　(توبہ۹: ۱۰۱)	یہ نفاق پر اڑے ہیں تو ان کو نہیں جانتا ہم جانتے ہیں۔

ان آیتوں سے یہ واضح ہے کہ پیغمبروں کو غیب کا کلی علم نہیں ملتا بلکہ ان کو غیب کی اطلاع دیے جانے کے موقع کی دونوں آیتوں میں رسول ہی کا لفظ استعمال کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جن امورِ غیب کی اطلاع پیغمبروں کو دی جاتی ہے ان کا تعلق فریضۂ رسالت اور اس کی مصلحتوں اور شریعتوں سے ہے۔

غیب کی حقیقت: علمِ غیب کے اس نادیدہ راستہ میں اتنی منزل طے کر لینے کے بعد یہ سوال

سامنے آتا ہے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں غیب کس کو کہتے ہیں؟ قرآن مجید کے اس لفظ کے استعمال کے تمام مواقع پر غور کرنے سے اس کے اجمالی اور تفصیلی دونوں معنی واضح ہوتے ہیں، اجمالاً اس کا اطلاق ان امور پر ہوتا ہے جن کا علم انسان اپنے علم کے عام اور طبعی وفطری ذریعوں سے حاصل نہیں کرسکتا، گذر چکا ہے کہ انسانی علم کے طبعی ذریعے، وجدان، حواس اور عقل واستدلال وغیرہ ہیں، ان طبعی ذریعوں سے جو ہر انسان کو ملے ہیں جو علم حاصل نہیں ہوتا، اس کو علم غیب کہتے ہیں یعنی اس شے یا ان اشیا کا علم جو انسان کے ظاہری وباطنی حواس اور دماغی قویٰ کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہیں، اور اس کا مقابل لفظ شہادت ہے، جس کے معنی حاضر ہونے کے ہیں، یعنی وہ اشیا جو ہر انسان کے حواس اور قوائے دماغی کے سامنے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے کو بار بار عالم الغیب والشھادۃ کہا ہے۔ (انعام ۶: ۷۳، رعد ۱۳: ۹، حشر ۵۹: ۲۲، تغابن ۶۴: ۱۸) یعنی انسانوں کے طبعی ذرائع علم کے سامنے جو حاضر ہے اور جو غائب ہے ان سب کا عالم اور واقفِ کل وہی ہے، الغرض اجمالاً علمِ غیب اس غیبی طریقۂ علم کا نام ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملا ہے۔

تفصیلی حیثیت سے قرآن پاک میں غیب کا اطلاق چار چیزوں پر ہوا ہے۔

۱- زمانۂ ماضی کے واقعات جن کا علم بعد کو نہ تو حواس کے ذریعہ ہوسکتا ہے، کہ حواس سے صرف شاہد (سامنے موجود) کا علم ہوتا ہے اور نہ عقل وفکر کے ذریعہ ہوسکتا ہے اگر ہوسکتا ہے تو تحریر و روایت کے ذریعہ لیکن جس کے لئے تحریر وروایت کا ذریعہ یقینی طور سے مسدود ہو، اس کے لئے ان کا علم اگر ہوسکتا ہے تو غیبی ہی ذریعہ سے ہوسکتا ہے۔

حضرت نوحؑ کے مختصر قصہ کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تِلْکَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَآ اِلَیْکَ مَا کُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُکَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا	یہ غیب کی بعض خبریں ہیں ہم ان کو وحی کرتے ہیں تیری طرف، تو تو ان کو پہلے جانتا ہی نہ تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی

(ھود ۱۱: ۴۹)

حضرت مریمؑ کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے:

ذٰلِکَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْکَ وَمَا	یہ غیب کی خبروں میں سے ہے اس کو ہم تیری طرف وحی

كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ	کرتے ہیں اور نہ تو ان کے پاس موجود تھا جب وہ اپنے قلم
يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ	(قرعہ کے طور پر) ڈال رہے تھے کہ کون مریم کو پالے اور
يَخْتَصِمُوْنَ. (آل عمران ۳:۴۴)	نہ تو ان کے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے۔

دیکھو کہ محسوس واقعات کے علم کا طبعی طریقہ اس وقت موجود رہ کر دیکھنا اور سننا تھا، اس کی آنحضرت ﷺ سے نفی کی گئی کہ آپ ﷺ وہاں یقیناً اس وقت موجود نہ تھے، اب رہ گیا کسی دوسرے انسانی ذریعہ سے سننا اس کی بھی نفی پہلے ہی سے ہے کہ تیری قوم میں سے بھی کسی کو معلوم نہ تھا اور نہ دوسروں سے معلوم کیا، اب اس کا علم جس غیر طبعی طریقہ سے رسول کو دیا گیا وہ وحی کا ذریعہ ہے۔

اسی طرح حضرت یوسفؑ کے پورے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا:

ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ إِلَيْكَ وَمَا	یہ غیب کی خبروں سے ہے ہم اس کو تیری طرف وحی
كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوْا أَمْرَهُمْ وَهُمْ	کرتے ہیں اور تو اس وقت ان کے پاس نہ تھا جب وہ
يَمْكُرُوْنَ. (یوسف ۱۲: ۱۰۲)	اپنا کام طے کرنے لگے اور چال چل رہے تھے۔

اس میں بھی علمِ شاہد کی نفی کر کے علم غائب کو ثابت کیا گیا، بہر حال ان آیتوں سے واضح ہے کہ ماضی کے واقعات کے غیر طبعی طریقۂ علم کو بھی علمِ غیب کہا گیا ہے۔

۲-اسی طرح آئندہ مستقبل میں جو واقعات ہونے والے ہیں ان کو بھی غیب کہا گیا ہے ان کا علم دلائل وقیاس کے طبعی ذرائع کے علاوہ غیر طبعی ذریعہ سے ہوا ہو، تو اس کو بھی علم غیب کہیں گے، قرآن پاک میں ایک موقع پر ان کفار کے جواب میں جو نشانیوں کے طالب تھے یہ کہا گیا:

فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا إِنِّيْ	تو کہہ دے کہ غیب کا علم خدا ہی کے لئے ہے، انتظار کرو
مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ. (یونس ۱۰: ۲۰)	میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔

مستقبل کے منتظرہ واقعات کو اس آیت میں ''غیب'' کہا گیا ہے، اسی طرح قیامت کو بار بار غیب کہہ کر غیر خدا سے اس کے علم کی نفی کی گئی ہے:

إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ. (لقمان ۳۱:۳۴)	خدا ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔
يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسٰهَا	وہ قیامت کو پوچھتے ہیں کہہ دے کہ اس کا علم میرے پروردگار

قُلْ اِنَّمَآ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ. (اعراف ۷: ۱۸۷) کے پاس ہے۔

اسی طرح مستقبل کے دوسرے واقعات کے علم کی بھی انسانوں سے نفی کی گئی ہے:

وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ. (لقمان ۳۱: ۳۴) کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا اور نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔

۳- ان چیزوں پر بھی غیب کا اطلاق کیا گیا ہے جو گو ماضی اور مستقبل نہیں بلکہ زمانۂ حال میں موجود ہیں تاہم انسان کے حواسِ خمسہ اور عقل کی محدود طاقت سے ان کا علم نہیں ہوسکتا، ہم کو دیکھنے اور سننے کی طاقت دی گئی ہے، مگر اس کے لئے کسی نہ کسی مسافت، عدم حجاب اور دیگر چند شرائط کی قید لگا دی گئی ہے، جن کے بغیر ہماری یہ طاقت بالکل بے کار ہے، ہم دلی میں بیٹھ کر، بمبئی کے پیشِ نظر مناظر کو نہیں دیکھ سکتے نہ بغیر آلات کے ہم یہاں سے وہاں کی آواز آج بھی سن سکتے ہیں، اس لئے زمانۂ حال کے علم کے لئے بھی جو طبعی شرائط اور قیود ہیں ان کے بغیر جو علم حاصل ہوگا وہ غیب ہوگا۔

حاملہ عورت سامنے موجود ہے مگر اس کے بطن کے پے درپے حجابات کے اندر جن کو آنکھیں چاک نہیں کرسکتیں کیا ہے؟ کس کو معلوم ہے:

وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ. (لقمان ۳۱: ۳۴) اور اللہ جانتا ہے رحموں کے اندر جو ہے۔

آسمان و زمین میں اس وقت جو کچھ ہے وہ سب زمانۂ حال میں سب کے سامنے موجود ہے، تاہم اس کا علم ہمارے حواس اور عقل کی محدود دست رس سے اس وقت تک باہر ہے جب تک ہمارے دیکھنے اور سننے اور جاننے کے لئے خدا نے جو طبعی شرائط بنا دیے ہیں وہ پورے نہ ہوں:

وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (ہود ۱۱: ۱۲۳) اور خدا ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔

اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (حجرات ۴۹: ۱۸) بے شک خدا جانتا ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔

۴- عالمِ غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے حواس اور عقل کے تنگ دائرۂ عمل سے قطعاً باہر ہیں، ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے، خدا کی رویت کی صلاحیت نہیں رکھتے، جنت و دوزخ ہم کو یہاں نظر نہیں آسکتی، یہ تمام امور بھی غیب ہیں:

اَلَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ (انبیا ۲۱: ۴۹) وہ لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، غیب میں۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (بقرہ۲:۲) وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں غیب میں۔

اَلَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَیْبِ. (مریم۱۹: ۶۱) وہ جنت جس کا وعدہ اس مہربان خدا نے اپنے بندوں سے کیا ہے غیب میں۔

''غیب میں'' کے معنی ہیں بے جانے، بن دیکھے، حواس سے علم حاصل کئے بغیر اور باوجود اس کے کہ وہ چیزیں اس عالم میں دیکھی نہیں جاسکتی ہیں۔

پیغمبر کو اللہ تعالیٰ غیب کی جن باتوں سے آگاہ کرتا ہے وہ ان چاروں قسم کے امورِ غیب ہوتے ہیں بعض گذشتہ قوموں اور پیغمبروں کے عبرت انگیز اور نصیحت آمیز حالات سے بھی روایت اور تحریر کے ذریعہ کے بغیر وحی کے واسطہ سے ان کو مطلع کرتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید کے حوالوں سے اوپر گذر چکا، آئندہ مستقبل میں دنیا کے فتنوں، امتِ محمدیہ کے انقلابات، قیامت کے مناظر اور اس کے بعد کے پیش آنے والے واقعات کا علم آپ ﷺ کو دیا گیا جیسا کہ ان دنیاوی پیشین گوئیوں اور قیامت و محشر کے ان احوال و مناظر سے ظاہر ہے جو قرآن پاک اور احادیثِ صحیحہ میں بہ تصریح مذکور ہیں، اسی طرح حال کے ان احوال و مناظر کا علم بھی ثابت ہے جو باوجود سامنے موجود ہونے کے احساس و تعقل کے طبعی شرائط نہ پائے جانے کے سبب سے عام انسانوں کو نظر نہیں آتے، قبروں کا انکشاف، پسِ پردہ رویت اور دوسروں کے موجودہ احوال سے واقفیت وغیرہ اس علم غیب میں سے بھی پیغمبر کو عطا ہوتا ہے اور سب سے آخر میں وہ مغیبات ہیں جن کا احساس و تصور ہمارے مادی ذرائعِ علم سے قطعاً خارج ہے، تاہم وہ بھی اس کو دکھائے اور بتائے جاتے ہیں، خود خدا کا دیدار، فرشتوں کی رویت، جنت و دوزخ کا مشاہدہ وغیرہ ان تمام امورِ غیب میں سے اللہ تعالیٰ جس رسول کے لئے جس قدر مناسب اور سزاوار سمجھتا ہے اس کا علم وحی کے مختلف اقسام کے ذریعہ سے اس کو عطا فرماتا ہے۔

وحی اور ملکۂ نبوت: حکمائے اسلام نے وحی کی حقیقت ''ملکۂ نبوت'' کے لفظ سے ظاہر کی ہے، اس کی تشریح یہ ہے کہ ترتیبِ کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں علم اور تعقل نے پستی سے بلندی کی طرف رفتہ رفتہ ترقی کی ہے، جمادات بے حس ہیں، ان کے اوپر نباتات ہیں جن میں صرف محدود احساس ہوتا ہے اور دماغی قویٰ، حافظہ، تذکر اور غور و فکر کی قوت سے وہ محروم ہیں ان سے اونچے حیوانات ہیں جن میں یہ تمام قویٰ ناقص طریقے سے نمودار ہوتے ہیں اور آخر میں ان سے

بالاتر ہستی یعنی انسان میں جا کر یہ قویٰ پورے کمال میں ظاہر ہوتے ہیں، ان قویٰ کی ترقی یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ جس طرح نباتات میں قوتِ احساس ہے جس سے جمادات محروم ہیں اور حیوانات میں حافظہ، تصور، تعقل وغیرہ کی وہ قوتیں ہیں جو نباتات میں نہیں، انسان میں وہ دماغی وذہنی قویٰ ہیں جو حیوانات میں نہیں، اسی طرح انبیا میں علم وتعلق کی ایک ایسی قوت موجود ہوتی ہے جو عام انسانوں میں نہیں ہوتی اور اسی کا نام ملکۂ نبوت ہے۔

حواس صرف مادیات کو دریافت کرتے ہیں، دماغی قویٰ مادیات سے بلند ذہنیات اور عقلیات کو اور ملکۂ نبوت اس سے بھی اونچا جاتا ہے، وہ ذہنیات وعقلیات سے بلند تر حقائق یعنی غیبیات کو دریافت کرتا ہے، اس ذریعۂ علم میں غور وبحث اور منطقیانہ فکر ونظر اور ترتیب مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جس طرح وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات سامنے آتے ہیں اور ان ہی کی طرح وہ یقینی بھی ہوتے ہیں اور چوں کہ اس ذریعہ میں علم انسانی کے عام ذریعے اور طریقے یعنی وجدان، فطرتِ نوعی، بداہیتِ اولیہ، احساس اور غور وفکر سے معلومات حاصل نہیں کیے جاتے، بلکہ خود علام الغیوب وہ علم ان انسانی وسائط کے بغیر ان کو عطا کرتا ہے، شرع کی زبان میں اسی کو وحی والہام کہتے ہیں، علمِ کلام کی اصطلاح میں ملکۂ نبوت اور عام محاورہ میں اس کو غیبی علم کہہ لیجیے۔

لیکن اہل نقل کی اصطلاح میں وحی کی یہ صورت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو وقتاً فوقتاً احکام اور ارادوں سے براہِ راست فرشتوں کے ذریعہ سے مطلع کرتا رہتا ہے، یہی وحی ہے۔

امعانِ نظر سے معلوم ہوگا کہ اہلِ عقل ونقل کے اختلاف کا منشا یہ ہے کہ آیا یہ وحی خود پیغمبر کے مافوق اور غیر معمولی وہبی علم وفہم کا نتیجہ ہوتی ہے یا خود براہ راست وقتاً فوقتاً تعلیمِ ربانی کا، دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ جس طرح عام انسانوں میں علم وفہم کی قوت آغازِ پیدائش ہی میں فطرتاً ودیعت کردی جاتی ہے، اسی طرح انبیا میں منشائے الٰہی جاننے کی قوت بھی شروع ہی میں فطرتاً ودیعت کردی جاتی ہے، یا یہ کہ وہ فطرتاً تو ویسے ہی عام انسانی طریقہ کا طبعی علم وفہم رکھتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نبوت کے بعد اپنے منشائے الٰہی سے ان کو کسی غیبی ذریعہ سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتا رہتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت، عقل کی نقل سے اور نقل کی عقل سے علاحدگی میں نہیں بلکہ اتحاد

میں ہے وہ لوگ جو عقل و نقل دونوں کے جامع ہیں وہ ان دونوں کو مجتمع کرتے ہیں۔

ع یار ما ایں وارد و آن نیز ہم

انبیا علیہم السلام میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بدءِ فطرت اور آغاز پیدائش سے ان امور کے متعلق جن کا ان کی رسالت و نبوت سے تعلق ہے اور جن کو دین کہتے ہیں وہ کلی استعداد اور عمومی فہم ہوتی ہے جس سے غیر انبیا محروم ہیں اور اس پوشیدہ قوت کا عملی ظہور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ نبوت کے منصب پر عملاً سرفراز ہوتے ہیں، اسی کا نام ''ملکۂ نبوت'' ہے اور اہم امورِ دین کے متعلق ان کو وقتاً فوقتاً جو غیبی اطلاع ملتی رہتی ہے اس کا نام وحی ہے۔

آج کل قرآن فہمی اور عقل کے مدعیوں اور نقل کے لفظی پابندوں میں جو اختلاف ہے وہ دراصل ان ہی دو قوتوں کے درمیان تمیز نہ کرنے کا نتیجہ ہے، نقل کے لفظی پابند یہ سمجھتے ہیں کہ ہر لفظ جو نبی کے منہ سے نکلتا ہے وہ اسی معنی میں وحی ہے جس معنی میں قرآن ہے کہ وہ براہ راست خدا کی غیب کی اطلاع ہے اور عقل کے مدعی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن بے شک خدا کی براہ راست وحی ہے، مگر اس کے ماسوا رسول جو کچھ کہتا ہے وہ اس کے پیغمبرانہ نہیں بلکہ انسانی و بشری علم وفہم کا نتیجہ ہے لیکن حقیقت ان دونوں کے ماورا ہے، جیسے وحیِ قرآنی وحیِ براہ راست ہے اسی طرح نبی کے دوسرے احکام اس کے عام انسانی و بشری علم وفہم کا نہیں بلکہ اس کی پیغمبرانہ وہبی قوتِ علم وفہم کا نتیجہ ہیں، جو وحی کی ایک دوسری قسم اس لئے کہی جاسکتی ہے کہ اس کا منشا ملکۂ نبوت کے ذریعہ وحیِ ربانی کی ترجمانی ہے، اس لئے پیغمبر کی وحی اور ملکۂ نبوت دونوں کے احکام واجب الاتباع ہیں۔

کتاب اور سنت: اس تقریر کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر کو جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک وحیِ حقیقی یعنی وہ علم جس کو اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے خاص الفاظ میں پیغمبر پر نازل کرتا رہتا ہے اور جس کے مجموعہ کو کتابِ الٰہی، صحیفۂ ربانی، توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن کا نام دیا گیا ہے، دوسرا وہ علم جو پیغمبر کے ملکۂ نبوت یا نورِ نبوت یا فہمِ نبوت کا نتیجہ ہوتا ہے، پہلا علم اصلی اور دوسرا ضمنی ہے، یا یوں کہو کہ پہلا اصولی اور دوسرا فروعی ہے، یعنی علمِ اول پیغمبر پر شریعت کے غیر متبدل اور ازلی احکامِ کلیہ اور مہمات کو واضح کرتا ہے اور دوسرا علم پہلے علم کے غیر متبدل کلی اصول کے ماتحت اس کے مقصود کی صحیح تشریح

اوراس کے جزئیات کی ضروری تفصیل کرتا ہے اور غیر اہم اور متبدل امور کے متعلق ہنگامی اوقات میں مصلحتی احکام بتاتا ہے اوراسی دوسری قسم کا علم ہے جو روایات اور احادیث کی صورت میں ہے اور جس کو اہل اصول اصطلاحاً سنت کہتے ہیں، کتاب اصولی احکام ہیں اور سنت ان اصولی احکام کی عملی تشریح اور بیان ہے، کتاب براہ راست وحیِ الٰہی کا نتیجہ ہے اور سنت ملکۂ نبوت اور فہمِ نبویؐ کا، کتاب بلفظہٖ وحی ہے اور سنت بالمعنی۔

وحی متلو اور وحیِ غیر متلو: بعض علمائے اصول نے کتاب اور سنت دونوں کو وحی مانا ہے اور ان دونوں کے درمیان تفریق یہ کی ہے کہ کتاب اس وحی کا نام ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور سنت اس وحی کو کہتے ہیں جس کی تلاوت نہیں کی جاتی، اس تشریح کا مقصود حقیقتاً تلاوت وعدم تلاوت کا فرق نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ کتاب میں معنی کے ساتھ الفاظ بھی وحی کئے گئے ہیں اور وہ الفاظ بھی محفوظ ہیں ان کا حرف حرف اور نقطہ نقطہ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ. (حجر ۱۵:۹) کی پیشین گوئی میں داخل ہے اور اس لئے اس میں الفاظ کی کمی بیشی اور حذف واضافہ محال ہے اور سنت میں الفاظ کی نہیں صرف معانی کی حفاظت ہے، اس لئے کتاب کی وحی مدون، مکتوب اور محفوظ کی گئی اور نماز میں اس کی قرأت کا حکم ہے اور یوں بھی عام طور سے اس کی تلاوت مسنون ہے اور سنت کی وحی بالفاظہا مقصود نہیں، اس لئے اس کی لفظی حفاظت کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی اور نہ نماز میں اس کے الفاظ قرأت کئے جاسکتے ہیں اور نہ ان کی تلاوت کی جاتی ہے اور نہ ان کو کتابِ الٰہی کہا جاسکتا ہے، مگر معناً اصولی حیثیت سے ان کی حفاظت خود قرآن نے اپنے اندر کرلی ہے اور جزئیات کی حیثیت سے گو الفاظ میں نہیں مگر عمل میں خود رسول اور اس کے پیروؤں اور پھر ان کے پیروؤں کے مسلسل تعامل سے یہاں تک کہ آج بھی تمام مسلمانوں کے عمل درآمد سے عملی تواتر کی صورت میں محفوظ ہے اور بعد کے اماموں نے اچھی طرح تحقیق کرکے الفاظ اور کتبِ حدیث کے اوراق میں بھی ان کو محفوظ کردیا ہے۔

سنت کو وحی کہنا اس لحاظ سے ہے کہ جزئیات اصولاً وحیِ حقیقی یعنی کتاب کے اندر داخل ہیں اور اس کی کلیت میں سنت کے تمام احکام مندرج ہیں، بنابریں چوں کہ سنت وحی کے کلی منشا کے اندر داخل ہے وہ بھی ضمنی حیثیت سے وحی کہی جاسکتی ہے، لیکن چوں کہ اس میں الفاظ کی تعیین خدا کی طرف سے نہیں، اس لئے وہ غیر متلو ہے۔

اس فرق کا راز یہ ہے کہ کتاب کی حیثیت کلی قانون کی ہے، قانون کے اصل منشا کی حفاظت اور وضاحت کے لئے نہ صرف اس کے ایک ایک لفظ کے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ اس کے ایک ایک نقطہ، شوشہ، وقف، وصل، فصل، عطف، قطع، تقدم، تاخر یعنی آج کل کی اصطلاح میں ایک ایک ڈیش اور کومے کی بعینہٖ حفاظت کی ضرورت ہے، ورنہ ذرا سے تغیر میں قانون کا مطلب کچھ کا کچھ ہوسکتا ہے اور سنت کی یہ کلی قانونی حیثیت نہیں ہے بلکہ وہ اس کلی قانون کی تشریحات، تفصیلات اور جزئیات ہیں، جو درحقیقت اس کلی قانون کے اندر مندرج تھے، مگر چوں کہ عام لوگوں کی فہم میں نہیں آتے تھے یا عام لوگ ان کو نہیں سمجھتے تھے اس لئے صحابہؓ کے دریافت پر یا خود حضور ﷺ نے اس کی ضرورت محسوس فرما کر اس کو کھول کر بیان فرمادیا کہ پھر اشتباہ نہ رہ جائے۔

اسی مقام پر ایک اور نکتہ بھی ہے کہ کتابِ الٰہی میں جو حکم جن الفاظ میں ادا ہوا ہے وہ اگر بعض کم فہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا اور انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس کی تشریح چاہی یا انہیں نہیں معلوم ہوا کہ اس خاص جزئی واقعہ کا کیا حکم ہے اور قرآن پاک کی کس اصل سے ماخوذ و مستنبط ہوگا اور اس لئے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا تو اس کے جواب میں اگر آنحضرت ﷺ قرآن پاک کے بعینہٖ ان ہی الفاظ کو بے کم و بیش دہرادیتے تو یہ بے کار ہوتا کہ ان ہی الفاظ کے نہ سمجھ سکنے کے سبب سے تو سوال کی نوبت آئی، اس لئے ضرور تھا کہ آنحضرت ﷺ الفاظ کو بدل کر اور طریقۂ تعبیر کو تغیر دے کر ان الفاظ کی تشریح فرمائیں اور یہی احادیث ہیں۔

درحقیقت احادیث میں قانونِ الٰہی اور کتاب ربانی ہی کے مفہوم و منشا کو رسول اللہ ﷺ نے سمجھنے والوں کی سہولت، گمراہوں کی تکمیلِ ہدایت اور اصل منشائے الٰہی کی پوری توضیح اور کہیں پوری تاکید کی خاطر مختلف لفظوں، مختلف عبارتوں اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا ہے، اس لئے اصل مفہوم و منشا کے لحاظ سے احادیث کے معانی ضمناً وحی ہیں لیکن الفاظِ عبارت اور تعبیر کی حیثیت سے یعنی لفظاً وحی نہیں ہیں بلکہ فہمِ نبوی، اجتہادِ نبوی اور ملکۂ نبوت کے غیر خطا پذیر نتائج ہیں، اسی لئے ان کو اصطلاح میں وحیِ غیر متلو کہتے ہیں۔

ہم اس فرق کی ایک مثال دے کر اپنے مطلب کو زیادہ واضح کردینا چاہتے ہیں، قرآن

پاک میں والدین کی خدمت اور اطاعت کا حکم ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہے کہ والدین کی رضامندی گناہوں کی مغفرت کا سبب ہے(۱)، یہ وحیِ الٰہی کا حقیقی منشا ہے، آنحضرت ﷺ نے اس منشائے الٰہی کو ان الفاظ اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا ''ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے''، کبھی ارشاد ہوا ''رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے'' (۲)، ایک صحابی نے دریافت کیا کہ ''یارسول اللہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے'' فرمایا ''تیری ماں، تیری ماں، تیری ماں'' (۳)۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے صحابہؓ حضوری کے شرف سے ممتاز تھے کہ زبانِ مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے ''وہ ذلیل ہوا، وہ ذلیل ہوا، وہ ذلیل ہوا'' حاضرین نے عرض کی ''یارسول اللہ کون؟'' ارشاد ہوا ''وہ جس نے اپنی ماں یا باپ کی ضعیفی پائی اور پھر ان کی خدمت گزاری کر کے جنت نہ حاصل کر لی'' (۴)۔ ایک اور مجلس میں صحابہؓ نے پوچھا کہ ''یارسول اللہ ﷺ نیکی کے کاموں میں خدا کو سب سے زیادہ کون کام پسند ہے'' فرمایا ''وقت پر نماز ادا کرنا'' دریافت کیا اس کے بعد فرمایا ''ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا'' (۵)۔

ان تمام احادیث پر معمولی سی غور و فکر کی نظر بھی یہ راز ظاہر کر دے گی کہ یہ کل حدیثیں ذیل کی آیتوں کی تشریح و بیان ہیں:

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا	(بقرہ ۲: ۸۳ و نساء ۴: ۳۶)	ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔
وَلَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ	(بنی اسرائیل ۱۷: ۲۳)	وہ بوڑھے ہو جائیں تو ان کو اف نہ کہو۔
وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ	(احقاف ۴۶: ۱۶)	یہ (ماں باپ کے خدمت گذار) وہ ہیں جن کی بدیوں سے ہم درگذر کرتے ہیں۔

یہی حال دوسرے قرآنی احکام کے بیانات و تشریحات کا ہے۔ (۶)

(۱) سورۂ احقاف ۴۶: ۱۶ (۲) ترمذی ابواب البر والصلۃ باب من الفضل فی رضا الوالدین ج ۲ ص ۱۲ مطبوعہ دیوبند۔ (۳) صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ والادب، باب بر الوالدین ج ۲ ص ۳۷۶ مطبعہ دار الکتب العربیہ (۴) ایضاً باب رغم انف من ادرک ابویہ ج ۲ ص ۳۷۸ (۵) بخاری کتاب الادب باب قولہ ووصینا الانسان الخ ج ۲ ص ۸۸۲ مطبوعہ دیوبند۔ (۶) مجھے پہلے شبہ تھا کہ میں اس رائے میں منفرد ہوں مگر بحمد اللہ کہ تلاش و تفحص سے ثابت ہوا کہ دیگر متعدد علمائے اصول کا یہی مسلک ہے، چنانچہ یہ خیال اجمالاً سب سے پہلے امام شافعی کی کتاب الرسالہ (ص ۲۸، ۲۹ و ۶۲) مطبعہ علمیہ مصر ۱۳۱۲ھ میں اور یہ نظریہ سب سے زیادہ مفصل امام شاطبی اندلسی المتوفی ۷۹۰ھ کی اہم تصنیف الموافقات فی اصول الاحکام (جلد اول ص ۱۷۵، ۲۲۱) مطبعہ سلفیہ مصر ۱۳۴۱ھ میں موجود ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ میں بھی اس کا ایک باب ہے۔

احادیث قرآن کا بیان ہیں: قرآن پاک اور احادیث دونوں پر جن کی عمیق و وسیع نظر ہے ان کو یہ برملا معلوم ہوتا ہے کہ احادیثِ صحیحہ کے تمام فرعی اور ثانوی احکام قرآن پاک کے عمومی اور کلی احکام کے تحت میں مندرج ہیں، آنحضرت ﷺ نے اپنے الفاظ میں صرف ان کی تشریح فرمائی ہے، اس قسم کی حدیثوں کی عموماً تین شکلیں ہیں، ایک وہ جن میں آنحضرت ﷺ نے اپنے الفاظ میں حکم بیان فرمانے کے بعد خود قرآن پاک کی کوئی آیت اس کے ساتھ پڑھ دی، اس قسم کی حدیثوں کے بیان ہونے میں کس کو شبہہ ہوسکتا ہے؟ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے آیت نہیں پڑھی مگر خود اس حکم میں ایک دو لفظ ایسے فرمادیے ہیں جو کسی آیت کا جز ہیں، جس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ حکم فلاں آیت کی تشریح ہے، اس صورت میں بھی اصل و فرع کی تمیز اہلِ علم کے لئے آسان ہے، تیسری شکل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے کسی آیت یا اشارہ کے بغیر صرف حکم بیان فرمادیا، اس قسم کی حدیثوں کے ماخذ کی تلاش دقتِ نظر کا کام ہے، ان کا پتہ زبانِ نبوت اور فہمِ رسالت کے طرز و اسلوب کے سمجھنے والے راسخین فی العلم ہی پاسکتے ہیں۔

الہام و اجتہاد و حکمت: امام شافعیؒ نے کتاب الرسالہ میں احادیث و سنن کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

ایک وہ جو بعینہٖ قرآن پاک میں مذکور ہیں، دوسری وہ جو قرآن پاک کے مجمل حکم کی تشریح ہیں، تیسری وہ جن کا ذکر (بہ ظاہر) قرآن پاک میں نہ تفصیلاً ہے نہ اجمالاً، یہی تیسری قسم قابلِ بحث ہے، امام صاحب نے اس کے متعلق ائمہ سلف کے چار نظریے نقل کئے ہیں۔(۱)

۱- اللہ تعالیٰ نے رسول کی کلی اطاعت فرض کی ہے اور اس کے علم میں پہلے ہی سے یہ ہے کہ رسول جو کچھ کہے اور کرے گا اس میں رضائے الٰہی کی توفیق اس کے ساتھ شامل ہوگی، (حاصل یہ ہے کہ پہلے ہی سے رسول کو یہ توفیقِ ربانی عنایت کی گئی ہے کہ وہ رضائے الٰہی کو دریافت کرلے)۔

۲- رسول نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو (مقصود یہ ہوا کہ

(۱) کتاب الرسالۃ امام شافعیؒ ص ۳۸

اس قسم کے احکام بھی دراصل کتاب اللہ ہی سے ماخوذ ہیں گو بہ ظاہر کم بینوں کو ایسا نظر نہ آئے)

۳۔تمام احادیثِ نبویؐ، القائی الروع ہیں،(یعنی رسول کے دل میں خدا نے ڈال دیے ہیں)اور یہ اس حکمت کا نتیجہ ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ڈالی گئی۔

۴۔اس قسم کے تمام امور جو احادیث میں ہیں کتاب الٰہی سے جداگانہ مستقل پیغامِ ربانی کے ذریعہ رسول کو معلوم ہوئے ہیں۔

چوتھے نظریہ کو چھوڑ کر بقیہ تین رائیں میرے خیال میں تقریباً ایک ہی ہیں، پہلے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ صریح وحی کے علاوہ جو وقتاً فوقتاً نبی پر آتی رہتی ہے، اس کو ابتدا ہی سے ایک توفیقِ ازلی بھی عنایت ہوتی ہے، جس سے وہ پیش آمدہ امور میں رضائے الٰہی کو دریافت کر کے فیصلہ کرتا ہے، تیسرے نظریہ میں اسی ''توفیقِ علم'' کو الہام، القائی الروع اور دل میں ڈال دینے سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ رسول کے جو احکام بہ ظاہر کتاب اللہ میں نہ ہوں، ان کی اصل بھی درحقیقت کتاب اللہ میں ہے اور رسول اسی اصل سے اپنے احکام کو مستنبط کرتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ استنباط عام انسانی و بشری فہم سے نہیں ہوتا ورنہ اس کا غلطی سے پاک ہونا مشتبہ رہے گا، بلکہ وہ پیغمبرانہ قوتِ فہم کا نتیجہ ہوگا اور جب ایسا ہے تو اس پیغمبرانہ قوتِ فہم کی تعبیر خواہ الہام سے کرو، القا سے کرو یا اس کو حکمتِ نبویؐ کا نتیجہ کہو یا توفیقِ الٰہی کہو، بات ایک ہی ہوئی۔

میرے نزدیک صحیح مسلک یہ ہے کہ رسول کے تمام صحیح زبانی احکام بھی عموماً اس کے صحیفۂ ربانی سے ماخوذ و مستنبط ہیں اور ان کے جزئیات کتابِ الٰہی کے کلیات کے تحت میں مندرج ہیں اور رسول کا یہ اخذ، استنباط اور فہم اس کی اس پیغمبرانہ قوتِ علم کا نتیجہ ہیں جس کو حکما ملکۂ نبوت اور اہلِ شرع حکمت، الہام اور شرح صدر وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور جو خطا اور غلطی سے یکسر پاک ہے۔

اجتہادِ نبوت: اس موقع پر علمائے اصول کی ایک اور اصطلاح اجتہاد نبوی کی تشریح ضروری ہے، علمائے اصول لکھتے ہیں کہ جب کوئی نیا واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش آتا اور وحی نازل نہ ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد فرماتے، یعنی گذشتہ وحی شدہ احکام کے تطابق سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دے دیتے تھے۔(یہ فقہاء کا طریقۂ تعبیر ہے، ورنہ یوں کہنا چاہیے کہ رسول اپنی اس حکمتِ ربانی کے فیض

سے مدد لے کر جو خدا نے اس کے سینہ میں ودیعت رکھی تھی، گذشتہ وحی کے کلیات کی روشنی میں اس کا فیصلہ فرماتے تھے) بہر حال خواہ فقہا کے طریق پر اجتہادِ نبویؐ کو نصوص قرآنی سے مستنبط سمجھیے یا شاہ ولی اللہؒ صاحب کے نظریہ کے مطابق رسول کے علمِ سینہ اور وحی شدہ اصولِ کلی کے جزئیات تسلیم کیجیے، ہر حال میں وہ نتیجہ امت کے لئے واجب العمل اور خطا سے پاک ہے، کیوں کہ یہ مقدمہ اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ انبیا گناہوں سے معصوم، ضلالت و گمراہی سے پاک اور ہوائے نفسانی سے مبرا ہوتے ہیں، اس لئے امورِ رسالت اور امورِ دین میں ان کی کوئی رائے غلط نہیں ہوسکتی کہ ان کی غلطی سے پوری امت کا غلطی پر قائم ہو جانا مسلم ہے، حالاں کہ ان کی بعثت کی غرض ہدایت ہے، ضلالت نہیں ان وجوہ سے ان کا اجتہاد اگر کبھی کسی ایسے نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے جو مصلحتِ الٰہی کے مطابق نہیں ہوتا تو ہمیشہ اللہ تعالیٰ اس پر تنبیہ فرما کر ان کو اپنی مرضی سے مطلع فرما دیتا ہے، (اس کی مثالیں آیندہ آئیں گی) الغرض بعض امور میں خیر کے کسی خاص پہلو کو پیشِ نظر رکھ کر اس سے بہتر پہلو سے تغافل ہونے یا غیب اور مستقبل سے عدمِ واقفیت کے سبب سے نبی کا اجتہادی خطا کرنا ممکن ہے، مگر اس خطا پر نبی کا قائم رکھا جانا ناممکن ہے، ایسی صورت میں نبی کا ہر ایسا اجتہادی حکم جس پر وحیِ الٰہی نے فوراً کوئی تنبیہ نہیں کی یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ حکم علم الٰہی کے منشا کے مطابق اور خطا و غلطی سے مبرا ہے اور اس کے دوسرے معنی وحیِ خفی یا باطنی وحی کے ہیں۔(۱)

میری رائے میں یہ اصطلاح بھی معناً گذشتہ اصطلاحوں کے قریب قریب ہے، اس لئے اس اجتہادِ نبوی کے معنی، الہام، حکمت، ملکۂ نبوت، فہم نبوی وغیرہ گذشتہ اصطلاحات سے عملاً الگ نہیں کہ اس کی حیثیت بھی وحیِ ثانوی کی قرار پا جاتی ہے۔

اس مبحث پر شاہ ولی اللہؒ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں جو خیال ظاہر فرمایا ہے اس کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

(۱) سطورِ بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کے حوالہ کے لئے دیکھو شرح تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ مسمیٰ بہ التقریر والتحبیر للعلامہ ابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ھ جلد ۳ ص ۲۹۴، ۲۹۹، مطبعہ امیریہ مصر ۱۳۱۷ھ اور التلویح فی کشف حقائق التنقیح والتوضیح فی حل غوامض التنقیح جلد ۲ ص ۴۵۲، مطبع مکتبہ صنائع قسطنطنیہ ۱۳۱۰ھ بحث الرکن الثانی فی السنۃ۔

ساتواں مبحث

احادیث نبوی ﷺ سے شریعت کے اخذ کرنے میں

علومِ نبوی کے اقسام

رسول اللہ ﷺ کی جو روایتیں حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایک وہ، جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے اور یہ آیت:

مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَھُوْا. (حشر ۵۹:۷) پیغمبر تم کو جو کچھ دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز آؤ۔

اسی قسم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

علومِ معاد یعنی قیامت اور آخرت کے احوال، جزا و سزا اور عجائب الملکوت (یعنی دوسرے عالم کے احوال و کیفیات) اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سب کا دارومدار صرف وحی پر ہے اور ان اصول کے مطابق جن کا ذکر اوپر گذر چکا، قوانینِ شریعت اور عبادات و معاملات کی جزئیات کا ضبط بھی اسی قسم میں داخل ہے لیکن ان میں سے بعض چیزوں کا دارومدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کا اجتہاد بھی وحی کی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو غلط رائے قائم کرنے سے محفوظ رکھا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ ﷺ کا ہر اجتہاد کسی خاص نص و آیت سے استنباط کا نتیجہ ہو جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے، بلکہ آپ ﷺ کے اجتہاد کی زیادہ تر صورت یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شریعت اور وضعِ قانون کے مقاصد، انسانوں کی آسانی اور بھلائی اور اصولی مقاصد کا قانون آپ ﷺ کو تعلیم کر دیا تھا وہ مقاصد جن کا ماخذ وحی تھا آپ ﷺ اسی کلی و اصولی قانون کے ذریعہ سے جو آپ ﷺ کو سکھایا گیا تھا ان کی تشریح فرما دیا کرتے تھے، حکمت کی متفرق باتیں اور عام مصلحتیں جن کے لئے آپ ﷺ نے نہ کوئی وقت مقرر کیا نہ ان کے حدود بتائے مثلاً اخلاقِ صالحہ اور اخلاقِ غیر صالحہ کا بیان بھی تبلیغِ رسالت سے تعلق رکھتا ہے لیکن ان میں اکثر کا دارومدار اجتہاد پر ہے

جس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے آپ ﷺ کو باہمی معاملات واجتماع کا کلی قانون تعلیم کردیا تھا اور آپ نے حکمت کی باتیں اسی کلی قانون سے جو آپ ﷺ کو تعلیم کردیا گیا تھا مستنبط کیں اوران کے متعلق ایک کلیہ بنایا، فضائلِ اعمال اوران پرعمل کرنے والوں کے مناقب بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے خیال میں ان میں بعض کا دارومدار وحی پراور بعض کا اجتہاد پر ہے ان قوانین کا بیان اوپر گذر چکا ہے اور ہم اسی قسم کی شرح کرنا اوران کے معانی کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

۲-دوسری وہ روایتیں ہیں جو تبلیغِ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ ''میں صرف ایک آدمی ہوں جب میں تمہارے دین کے متعلق تم کو کوئی حکم دوں تو اس پرعمل کرو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو یہ سمجھو کہ میں صرف ایک آدمی ہوں'' اور چھوہاروں کے جوڑ لگانے کے واقعہ میں آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ ''میں نے ایک خیال قائم کیا تھا میرے خیال پر تم لوگ عمل نہ کرو، البتہ جب خدا کی کوئی بات بیان کروں تو اس پرعمل کرو کیوں کہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا'' اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے، طب کے متعلق حدیثیں اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد کہ تم سیاہ رنگ اور ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس کی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو، اسی قسم میں داخل ہے اور اس کا دارو مدار تجربہ پر ہے۔

آپ ﷺ نے جو کچھ عادتاً کیا عبادتاً نہیں، اتفاقاً کیا قصداً نہیں وہ بھی اسی قسم میں داخل ہے، آپ ﷺ نے جو واقعات ایسے بیان کئے جن کا تمام قوم میں چرچا تھا مثلاً ام زرع اور خرافہ کے قصے وہ بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی بات کو حضرت زید بن ثابتؓ نے جب ان سے چند لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی اس طرح بیان کیا ہے کہ ''میں آپ ﷺ کا پڑوسی تھا اور جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ ﷺ مجھ کو بلا بھیجتے تھے اور میں آپ ﷺ کے حکم سے اس کو لکھا کرتا تھا لیکن جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے تو آپ ﷺ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر فرماتے تھے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے تو آپ ﷺ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو آپ ﷺ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے تو کیا میں ان تمام چیزوں کو بہ طور حدیث بیان کروں''۔

اسی میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں جن کو آپ ﷺ نے اپنے زمانہ کی جزئی وعارضی مصلحت کے طور پر کیا ہے اور وہ تمام امت کے لئے ضروری نہیں ہیں، مثلاً فوجوں کی آراستگی اور جنگی علامت کی تعین کے وہ احکام جن کو خلیفہ دیتا ہے اور حضرت عمرؓ کے اس قول کے کہ ''اب ہم کو حج میں اکڑ کر چلنے کی کیا ضرورت؟ ہم ایک قوم (کفار قریش) کے سامنے اس کی نمائش کرتے تھے لیکن اب خدا نے اس کو ہلاک کر دیا'' بھی یہ معنی ہیں کہ وہ اس کو ایک جزئی وعارضی مصلحت سمجھتے تھے لیکن چوں کہ آپ کو اس اجتہاد پر پورا اطمینان نہ تھا اس لئے ان کو یہ خوف ہوا کہ شاید اس کا کوئی اور سبب ہو، اس لئے اس میں دست اندازی نہیں کی، اسی طرح دوسرے احکام بھی اسی پہ محمول کئے گئے ہیں، مثلاً آپ ﷺ کا ارشاد کہ ''جو شخص جس کو قتل کرے اس کا ہتھیار اسی کا حق ہے''۔ نیز آپ ﷺ کے مخصوص فیصلے بھی اسی قسم میں داخل ہیں، کہ آپ مقدمات کے ان فیصلوں میں گواہوں اور قسموں کے مطابق فیصلے کرتے تھے، آپ ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو یہ فرمایا تھا کہ ''واقعہ میں حاضر جو کچھ دیکھتا ہے اس کو غائب نہیں دیکھتا''۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں۔(۱) (انتھی کلامہ)

شاہ صاحب کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کا تعلق پیغمبرانہ فرائض، تبلیغِ رسالت اور مہماتِ امورِ دین سے ہے یہ تمام باتیں براہِ راست وحی وتعلیم سے ماخوذ ہیں، دوسری وہ جو عام انسانی باتیں ہیں ان کی متعدد صورتیں ہیں:

۱- کسی جزئی عارضی مصلحت کی بنا پر کوئی حکم، جیسے حج میں آپ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ قریش کے سامنے اکڑ کر سعی کریں تا کہ قریش یہ نہ سمجھیں کہ مدینہ کی آب وہوا نے ان کو کم زور کر دیا ہے۔

۲- وہ امور جن کو دین ورسالت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں، بلکہ زمانہ کے حالات کے ساتھ وہ بدلتے رہتے ہیں مثلاً جنگ کا طریق، ہتھیار کے اقسام، حکومت کے صیغوں کی ترتیب وغیرہ۔

۳- وہ امور جن کو آپ ﷺ اپنی شخصی، قومی یا ملکی عادت کے مطابق کرتے تھے، جن کو دین ورسالت سے کوئی واسطہ نہیں مثلاً وضع ولباس، فرش پر نشست، کمل اوڑھنا، دستر خوان اور چمچوں کا عدمِ استعمال، عمامہ باندھنا، تہ بند پہننا، اونٹ پر سوار ہونا وغیرہ۔

۴- وہ امور جو عرب میں بہ طور قصہ کے مشہور تھے اور آپ نے بھی ان کو اسی طرح تفننِ طبع

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۰۲

کے لئے یا کسی اخلاقی نتیجہ کی خاطر بیان فرمایا، مثلاً ام زرع اور اس کی نو سہیلیوں کی کہانی، خرافہ کی داستان، بنی اسرائیل کی بعض حکایتیں۔

۵-عربوں کے بعض تجربی مسلمات اور علاج و معالجہ کی بعض باتیں۔

٦-زراعت وغیرہ کے متعلق بعض ذاتی رائیں، مثلاً مدینہ میں قاعدہ تھا کہ فصل کے موقع پر نر چھوہاروں کے پھول مادہ چھوہاروں کے درختوں میں ڈالے جاتے تھے، آپ ﷺ نے یہ طریقہ دیکھا تو اس کو محض رسمی بات سمجھ کر فرمایا کہ اگر ایسا نہ کیا کرو تو کیا ہو، مدینہ والوں نے آپ ﷺ کے اس ہلکے سے اشارہ کو حکم کے طور پر مانا اور اس سال یہ ترکیب چھوڑ دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال پیداوار کم ہوگئی، لوگوں نے آ کر عرض کی، فرمایا میں نے ایسا خیال کیا تھا "انتم اعلم بامور دنیاکم" (۱) تم اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات سے زیادہ واقف ہو، یہ امور تغیر اور ردوبدل کے قابل ہو سکتے ہیں۔

الغرض یہ وہ امور ہیں جن میں رسول کے ارشادات کی حیثیت، انسانی باتوں کی ہے لیکن ان کے علاوہ دوسرے امور جن کا تعلق دین ورسالت ونبوت سے ہے مثلاً عقائد، عبادات، اخلاق اور اخبارِ معاد اور معاملات کے بعض ضروری حصے یہ سب کے سب وحی اور تعلیمِ ربانی سے ہیں جو دائمی اور ناقابل تغیر ہیں۔

ان ناقابل تغیر امور کی تعلیم و اطلاع کی دو صورتیں ہیں ایک براہ راست وحیِ الٰہی جو وقتاً فوقتاً پیغمبر کی تعلیم و اطلاع کے لئے خدا کی طرف سے آیا کرتی تھی اور دوسری اجتہادِ نبویؐ، یہاں بحث اسی دوسری چیز سے ہے، شاہ صاحبؒ اس کے متعلق دو باتیں فرماتے ہیں:

۱-ایک یہ کہ اجتہادِ نبوی کی صورت وحقیقت مجتہدین کے اجتہاد کی طرح نہیں ہے، مجتہدین کا اجتہاد کسی خاص نص سے استنباط کا نام ہے اور پیغمبروں کے اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اجمالی طور سے شریعت کے کلی اصول وقواعد کا علم، منصبِ نبوت کے ساتھ ساتھ عطا فرما دیا ہے، اسی علم کے مطابق آپ ﷺ وحی کی توضیح، احکامِ منصوصہ کی تفصیل، کسی کلی کے جزئیاتِ مسائل کی تشریح اپنے الفاظ میں فرما دیا کرتے تھے۔

۲-پیغمبروں کا یہ اجتہاد دوسرے عام انسان مجتہدین کے اجتہادات کے برخلاف خطا و غلطی سے یک سر پاک ومنزہ ہوتا ہے، کیوں کہ ان کی رائے خطا و غلطی پر باقی رکھے جانے سے محفوظ بنائی گئی ہے،

(۱) مسلم کتاب الفضائل باب وجوب امتثال الخ ج ۲ ص ۳۰۵ مسند احمد ج ۳ ص ۱۵۲ و سنن ابن ماجہ ابواب الرھون باب تلقیح النخل ص ۱۸۰

اسی لئے ان کا پیغمبرانہ اجتہاد بھی بہ منزلۂ وحی کے ہے۔

پیغمبرانہ اجتہاد کی جو تشریح شاہ صاحبؒ نے فرمائی ہے اس کو پیشِ نظر رکھ کر یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ دوسرے لوگ ملکۂ نبوت، الہام، القا، حکمتِ ربانی، فہمِ نبویؐ سے جو کچھ مراد لیتے ہیں اس میں اور اجتہادِ نبویؐ میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے کہ اس اجتہاد سے مقصود وہ قوتِ علمیہ یا الہامیہ یا نبویہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ خاص پیغمبر کے سینہ میں ودیعت رکھتا ہے، اس لئے مجتہدانہ اجتہاد اور پیغمبرانہ اجتہاد کے درمیان صرف لفظ کی مشارکت ہے معنی کی نہیں، مزید بحث آگے آئے گی۔

ایک نکتہ کی طرف یہاں اور اشارہ کر دینا ہے، آنحضرت ﷺ کے سوا اور جتنے صاحب کتاب انبیا آئے ان کی وحی، کتاب اور نتائجِ حکمتِ نبویؐ میں فرق و امتیاز باقی نہیں رہا، چنانچہ توراۃ و انجیل و زبور میں یہ سب باتیں ملی جلی ہیں، جیسا کہ ان کے پڑھنے سے ہر شخص کو نظر آ سکتا ہے، مگر محمد رسول اللہ ﷺ چوں کہ آخری اور غیر منسوخ کتاب لے کر آئے تھے، اس لئے آپ ﷺ کی کتاب کی ہر طرح حفاظت کی گئی اور ہر تخلیط اور آمیزش سے محفوظ رکھی گئی، بلکہ اسی لئے آغازِ اسلام میں آپ ﷺ نے نتائجِ حکمتِ نبوی کی تحریر سے لوگوں کو باز رکھا، تاکہ کتاب کے ساتھ ان کی آمیزش نہ ہو، بعد کو جب یہ خطرہ باقی نہیں رہا تو اکثروں کے نزدیک یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان کی تحریر کی اجازت دے دی اور بعض متشدد صحابہؓ اور علما کے نزدیک یہ اجازت مخصوص لوگوں کے لئے تھی عام نہیں لیکن یہ اختلاف تحریر و کتابت میں ہے، ان کی صحیح طور سے حفاظت و روایت و تبلیغ میں نہیں، اس لئے اس خدمت کو تمام صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ اور علمائے صالحین نے ہمیشہ ادا کیا۔

عصمت اور بے گناہی: نبی کی تیسری اہم خصوصیت اس کی معصومی اور بے گناہی ہے، یہود میں چوں کہ پیشین گو ہونے کے علاوہ نبی کا کوئی صحیح تخیل نہیں، اس لئے ان کی کتابوں میں انبیائے کرام علیہم السلام کی طرف ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں، جو ان کی شانِ نبوت کے سراسر منافی ہیں، عیسائیوں میں صرف ایک مسیحؑ کی ذات معصوم مانی جاتی ہے لیکن اسلام مین یہ عقیدہ ہر نبی اور رسول کی نسبت عام ہے، اس کے نزدیک تمام انبیا اور رسول گناہوں سے پاک اور معصوم تھے،

ان سے بہ تقاضائے بشریت بھول چوک ہوسکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی وحی سے ان کی ان غلطیوں کی بھی اصلاح کرتا رہتا ہے، نبوت کے متعلق عقلی حیثیت سے بھی جب تک عصمت کا اصول مان نہ لیا جائے، نبی اور عام حکیم و مصلح میں فرق نمایاں نہیں ہوسکتا اور نہ نبیوں اور رسولوں کی کامل صداقت اور صحت پر اعتبار کیا جاسکتا، اسی لئے اسلام نے اس عقیدہ کا بھی بڑا اہتمام کیا ہے، ایک ایک کر کے تمام پیغمبروں کے مقدس احوال کا تذکرہ کیا ہے اور ان واقعات کی تردید کی ہے جو شانِ عصمت کے خلاف ہیں اور جن کو لوگوں نے ان کے سوانح میں شامل کر دیا ہے۔

عرب کے مشرکوں کا یہ عقیدہ تھا کہ کاہن جو غیب کا حال بتاتے ہیں اور شاعر جو پرجوش اور پرتاثیر کلام نظم کرتے ہیں یہ شیطانوں سے سیکھ کر بتاتے اور کرتے ہیں اور یہی بات وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نسبت بھی (نعوذ باللہ) کہتے تھے، قرآن نے ان کے جواب میں کہا درخت پھل سے اور شے اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہے:

اِنَّہٗ لَیۡسَ لَہٗ سُلۡطٰنٌ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ. اِنَّمَا سُلۡطٰنُہٗ عَلَی الَّذِیۡنَ یَتَوَلَّوۡنَہٗ وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ بِہٖ مُشۡرِکُوۡنَ. (نحل ۱۶: ۹۹، ۱۰۰)	شیطان کا زور ایمان والوں پر نہیں چلتا اور نہ ان پر جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں، اس کا زور ان ہی پر چلتا ہے جو اس سے دوستی کرتے ہیں اور اپنے رب کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

اس کے بعد آخر تک اس خیال کی تردید کی ہے اور پھر خاتمہ اس پر ہے:

وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡہِمۡ وَلَا تَکُ فِیۡ ضَیۡقٍ مِّمَّا یَمۡکُرُوۡنَ. اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّالَّذِیۡنَ ہُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ. (نحل ۱۶: ۱۲۷، ۱۲۸)	اور صبر کر اور تیرا صبر کرنا بھی خدا ہی کی مدد سے ہے اور نہ تو ان پر غمگین ہو اور نہ ان کے فریب سے تنگ دل ہو بے شک خدا ان کے ساتھ ہے جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکوکار ہیں۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ انبیائے کرام شیطانوں کے فریب سے آزاد، متقی، پرہیزگار اور نیکوکار ہوتے ہیں۔

سورۂ شعراء میں اسی شبہہ کا جواب تمام پیغمبروں کے حالات کو سنا کر آخر میں یہ کہہ کر دیا ہے:

ہَلۡ اُنَبِّئُکُمۡ عَلٰی مَنۡ تَنَزَّلُ الشَّیٰطِیۡنُ.	کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں ان پر

تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیۡمٍ یُّلۡقُوۡنَ السَّمۡعَ وَ اَکۡثَرُہُمۡ کٰذِبُوۡنَ (شعراء،۲۶: ۲۲۱-۲۲۳)

اترتے ہیں جو جھوٹ گھڑتے ہیں، گنہ گار ہوتے ہیں (لوگوں کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ وہ غیب کی باتیں سن رہے ہیں) کان ڈالتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

سورہ جاثیہ میں مخالفین کے جواب میں کہا گیا:

وَیۡلٌ لِّکُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیۡمٍ. یَّسۡمَعُ اٰیٰتِ اللّٰہِ تُتۡلٰی عَلَیۡہِ ثُمَّ یُصِرُّ مُسۡتَکۡبِرًا کَاَنۡ لَّمۡ یَسۡمَعۡہَا......فَبَشِّرۡہُ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ. (جاثیہ۴۵: ۷،۸)

پھٹکار ہو اس پر جو جھوٹ گھڑنے والا گنہ گار ہے، خدا کی آیتوں کو جو اس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں وہ سنتا ہے اور پھر اپنے غرور پر اڑا رہتا ہے گویا اس نے سنا نہیں تو اس کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیا علیہم السلام جھوٹ گھڑنے والے اور گنہ گار نہیں ہوتے، کہ اگر ایسے ہوں تو فرشتوں کے بجائے وہ شیطانوں کے قرین و رفیق ثابت ہوں اور ان کی سچائی اور صداقت مشتبہ ہو جائے اور نیز یہ کہ نبوت کی حقیقت کذب و گنہ گاری کے صریح منافی ہے۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا:

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّؤۡتِیَہُ اللّٰہُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحُکۡمَ وَ النُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوۡلَ لِلنَّاسِ کُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّیۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ (آل عمران۳: ۷۹)

اس آدمی کے جس کو اللہ کتاب اور فیصلہ اور نبوت دے یہ شایان نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔

یعنی پیغمبروں کی دعوت کا منشا خدا کی بندگی کا اعلان ہے، نہ کہ لوگوں کو اپنا بندہ اور پرستار بنانا اور یہ گناہ ان سے سرزد نہیں ہوتا۔

اور ایک آیت میں فرمایا:

وَ مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنۡ یَّغُلَّ ؕ وَ مَنۡ یَّغۡلُلۡ یَاۡتِ بِمَا غَلَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ. اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَ اللّٰہِ کَمَنۡۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ مَاۡوٰىہُ جَہَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ. ہُمۡ

کسی پیغمبر کا یہ کام نہیں کہ وہ کچھ چوری سے چھپالے اور جو کوئی چھپالے گا قیامت کے دن لے کر اس کو حاضر ہوگا، پھر اس وقت ہر شخص کو اس کے کام کا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا، کیا جو خدا کی خوش نودی کی پیروی کرے وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو خدا کا غضب کمائے اور اس کا ٹھکانا

دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ. لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ. (آل عمران۳: ۱۶۱ تا ۱۶۴)

جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے، انسانوں کے خدا کے نزدیک کئی درجے ہیں، اور خدا ان کے کام سے خبردار ہے، بے شبہہ اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں ان ہی میں سے ایک ایسے رسول کو بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے ان کو پاک وصاف بناتا اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور بے شبہہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

ان آیتوں میں گو ہر نبی سے غلول (مال چھپانے) کی نفی کی ہے اور فرمایا ہے کہ نبی جو خدا کی خوش نودی کی ہمیشہ پیروی کرتے ہیں وہ ان کے مانند نہیں ہوسکتے جو خدا کی خفگی کماتے ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اس سے ایسا جرم سرزد ہوسکے کیوں کہ اللہ کی رضامندی کا طالب اس کی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہوسکتا اور جو دوسروں کو احکامِ الٰہی سنائے خود اس سے ان احکام کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور جو دوسروں کو پاک وصاف کرنے پر مامور ہے وہ خود گنہ گار و ناپاک نہیں ہوسکتا۔

انبیا علیہم السلام کے لئے بار بار قرآن نے چن کر پسند کرنے کا لفظ استعمال کیا ہے، جو سرتاسر ان کی عصمت اور گناہوں سے محفوظ و پاک رہنے پر دلالت کرتا ہے، عام پیغمبروں کے متعلق یہ آیت ہے:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ. (حج۲۲: ۷۵)

خدا فرشتوں میں سے اپنے پیغمبر چن کر پسند کرتا ہے اور آدمیوں میں سے۔

چند مخصوص پیغمبروں کی شان میں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ. (آل عمران۳: ۳۳)

اللہ نے آدم نوح آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام اہل دنیا سے چن کر پسند کیا۔

خاص حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ارشاد ہوا:

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا. (بقرہ۲: ۱۳۰)

ہم نے اس کو دنیا میں چن کر پسند کیا۔

حضرت موسیٰ کی نسبت فرمایا:

اِنِّی اصْطَفَیْتُکَ عَلَی النَّاسِ بِرِسَالٰتِیْ وَبِکَلَامِیْ. (اعراف ۷:۱۴۴)	میں نے تجھ کو اپنے کلام اور پیغاموں کے لئے لوگوں میں سے چن کر پسند کیا۔

ایک آیت میں پیغمبروں کے لئے اصطفا کے ساتھ خیر (بہتر اور نیکوکار) کی صفت ظاہر کی گئی ہے:

وَاذْکُرْ عِبَادَنَآ اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ. اِنَّآ اَخْلَصْنَاھُمْ بِخَالِصَةٍ ذِکْرَی الدَّارِ. وَاِنَّھُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَیْنَ الْاَخْیَارِ. (ص ۳۸:۴۵ تا ۴۷)	ہمارے خاص بندوں ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کو یاد کرو جو ہاتھوں (قوتِ عمل) والے اور آنکھوں (قوتِ علم) والے تھے، ہم نے ان کو آخرت کی خالص نصیحت کے لئے خالص کیا اور وہ ہماری بارگاہ میں چنے ہوئے نیکوکاروں میں تھے۔

سورہ انبیا میں اکثر پیغمبروں کے تذکرہ کے بعد فرمایا:

وَکُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِیْنَ. وَجَعَلْنَاھُمْ اَئِمَّةً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْھِمْ فِعْلَ الْخَیْرَاتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءَ الزَّکٰوةِ وَکَانُوْا لَنَا عَابِدِیْنَ. (انبیاء ۲۱:۷۲، ۷۳)	ان میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا اور ہم نے ان کو وہ پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو راہ دکھاتے تھے، اور ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے کی اور نماز کھڑی کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی اور وہ ہمارے پرستار تھے۔

کیا اس سے زیادہ ان کی عصمت اور بے گناہی کی شہادت ہوسکتی ہے کہ وہ امام و پیشوا اور صالح اور خدا کے پرستار بنائے گئے۔

سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر سب کو صالح فرمایا گیا:

کُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ. (انعام ۶:۸۶)	یہ سب صالحوں میں سے تھے۔

پھر آگے چل کر فرمایا: کُلًّا فَضَّلْنَا عَلَی الْعٰلَمِیْنَ. (انعام ۶:۸۷) ہر ایک کو دنیا والوں پر فضیلت دی، پھر ان کا ذکر کر کے فرمایا: وَاجْتَبَیْنَاھُمْ وَھَدَیْنَاھُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (انعام ۶:۸۸) اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کو سیدھی راہ چلایا، صالح ہونا، برگزیدہ ہونا اور راہِ راست پر ہونا سراسر عصمت اور بے گناہی ہے۔

شقی و سعید اور گنہ گار و نیکوکار دونوں کی سیرتوں اور زندگیوں کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ ان میں التباس اور اشتباہ ممکن نہیں تاریخ و سیر کی خاموش اور خلق کی گویا زبانیں چیخ چیخ کر اس فرق و امتیاز کی

منادی کرتی رہتی ہیں، اس اصول کو قرآن پاک نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ. (جاثیہ ۴۵: ۲۱)	کیا وہ جو گناہوں کے مرتکب ہیں یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان کی طرح جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے بنائیں گے، ان دونوں کی زندگی اور موت یکساں ہو، یہ ان کا فیصلہ کتنا برا ہے۔

اس آیتِ پاک سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی زندگی اور موت دونوں ممتاز ہوتی ہیں، انبیا علیہم السلام کے وصف میں فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسَالَاتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ. (احزاب ۳۳: ۳۹)	جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

آنحضرت ﷺ کے اہل بیت اور بیویوں کو جو عزت اور شرف حاصل ہے، وہ نبوت و رسالت ہی کی نسبت سے ہے، ازواجِ مطہرات کی شان میں ہے:

يَا نِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ. (احزاب ۳۳: ۳۲)	اے پیغمبر کی بیویو! تم عام عورتوں میں سے کسی ایک کی طرح نہیں ہو اگر تم متقی ہو۔

پھر اہل بیتِ نبوی ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا کہ ارادۂ ربانی یہ ہے کہ تم کو برائی سے پاک اور صاف اور ستھرا بنائے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا. (احزاب ۳۳: ۳۳)	اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر دے اے نبی کے گھر والو! اور تم کو بالکل صاف ستھرا بنا دے۔

ظاہر ہے کہ اگر انبیا علیہم السلام کے ازواج و اولاد کی شرافت کے لئے گناہ اور بدی کی نجاست مخل ہے، تو خود انبیا علیہم السلام کا کیا ذکر ہے، ایک دوسری آیت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تہمت سے بری کر کے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اَلْخَبِيْثَاتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ	گندیاں گندوں کے لئے اور گندے گندیوں کے لئے اور ستھریاں ستھروں کے واسطے اور ستھرے ستھریوں کے

وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ اُولٰئِکَ مُبَرَّؤُوْنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ۔ (نور۲۴:۲۶)

واسطے، یہ ان کی تہمت سے پاک ہیں۔

یہاں طیب، پاک اور ستھرے سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور اسی ستھرے پن، پاکی اور طہارت سے ازواج مطہرات کے اخلاق، ستھرے پن، پاکی اور طہارت پر استدلال کیا گیا ہے۔

انبیادر حقیقت مقتدا اور پیشوا اور نمونہ بن کر اس دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اسی لئے فرمایا:

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ۔ (احزاب۳۳: ۲۱)

تمہارے لئے خدا کے رسول میں اچھی پیروی ہے۔

نیز ان کی اطاعت واجب ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ۔ (نساء۴:۶۴)

ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن اس لئے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اور خاص آنحضرت ﷺ کی نسبت تصریح ہے کہ آپ کی پیروی خدا کا محبوب بننے کا مستحق ٹھہراتی ہے:

اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔ (آل عمران۳:۳۱)

اگر تم خدا کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم کو چاہے گا۔

کیا کسی گنہ گار اور عصیان کار کی زندگی، پیروی، اتباع اور نمونہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، تاریکی سے روشنی کبھی نکلی اور گندگی سے پاکی کبھی پیدا ہوئی اور گنہ گاروں کی دعوت سے کبھی نیکوکاری پھیلی ہے؟ برائیوں اور گنہ گاریوں کا اصلی سرچشمہ اور منبع شیطان یا انسان کی خود قوتِ شر ہے لیکن خدا کے خاص بندے اس کے دامِ فریب سے آزاد ہیں:

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ، وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا۔ (بنی اسرائیل۱۷:۶۵)

یقیناً میرے بندوں پر تیرا (اے شیطان) کوئی زور نہیں، تیرا پروردگار (اپنے بندوں کی طرف سے) سب کچھ کر دینے کو بس ہے۔

کیا انبیائے کرام علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی بندۂ رب ہو سکتا ہے۔

انسانوں کی گمراہی اور عصیان کاری، وسوسۂ شیطانی کا نتیجہ ہوتی ہے، خواہ یہ شیطان خود

اپنے دل کے اندر (خناس) چھپا ہو، یا انسان اور جن کی صورت میں ہو، ہر ایک کے فتنہ سے ان کی ذات پاک اور بلند ہے۔

آنحضرت ﷺ کو بعض خود غرض لوگوں نے بعض مشوروں میں پھسلانا چاہا، مگر خدا نے پھسلنے نہ دیا اور فرمایا کہ میری جو رحمت اور مہربانی تجھ پر مبذول ہے، وہ ہر وقت تیری دست گیر ہے اور گمراہی سے تیری نگہ بان ہے اور کتابِ الٰہی اور حکمت و دانائی جو تجھے عطا ہوئی وہ تیری پاسبان ہے:

وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ	اور اگر تجھ پر اللہ فضل اور مہربانی نہ ہوتی تو ایک گروہ نے
طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ	تیرے گمراہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور وہ گمراہ نہیں کریں گے
اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ وَّاَنْزَلَ اللّٰهُ	لیکن خود اپنے آپ کو اور تجھے کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے
عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ	اور خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور اس نے وہ
تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا	سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔

(نساء ۴: ۱۱۳)

اور یقیناً موقع و محل کی شہادت سے اس سب سے بڑے فضل سے یہاں مراد عصمت ہے۔

خود نفسِ انسانی بھی اپنی جھوٹی تمناؤں، خود غرضانہ آرزوؤں اور خوش نما خیالوں سے لوگوں کو دھوکا دیتا ہے لیکن انبیا علیہم السلام اس فریبِ تمنا سے بھی پاک ہیں، بشریت کے اقتضا سے یہ تو ممکن نہیں کہ خود اپنے مشن اور جس دعوتِ حق کو لے کر وہ آئے ہیں اس کی جلد از جلد کامیابی اور لوگوں کے بہ سرعت قبولِ ایمان کے متعلق ان کے دل میں تمنائیں اور آرزوئیں نہ پیدا ہوتی ہوں لیکن وہ مصلحتِ الٰہی کے مطابق نہیں ہوتیں، اس لئے اللہ تعالیٰ ان خیالات اور تمناؤں کو ان کے دلوں سے نکال دیتا ہے اور اپنے فیصلہ کو برجا رکھتا ہے، فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ	اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا لیکن یہ کہ
اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ	جب وہ خیال باندھتا ہے تو شیطان اس کے خیال میں کچھ
فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ	ملا دیتا ہے، تو خدا شیطانوں کی ملاوٹ کو مٹا دیتا ہے اور اپنے
اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ . (حج ۲۲: ۵۲)	حکموں کو مضبوط کر دیتا ہے اور خدا دانا اور حکمت والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام غلط خیال آرائی کے گناہ سے بھی محفوظ رکھے جاتے ہیں،

آنحضرت ﷺ کے متعلق فرمایا گیا:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى. (نجم ۵۳: ۲) (اے مسلمانو!) تمہارا صاحب نہ گمراہ ہوا نہ بھٹکا۔

اس عدمِ گمراہی اور عدمِ ضلالت کا تعلق کسی خاص عہد اور وقت سے نہیں ہے، بلکہ اس آیت میں آنحضرت ﷺ کے ہر عہدِ سابق اور زمانۂ ماضی سے ضلالت اور غوایت کی پوری نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کا دامن سدا ان کانٹوں سے پاک رہا۔

بعض شبہات کا ازالہ: قرآن پاک میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے ایک ظاہر بیں کو یہ دھوکہ ہوسکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کے دامن پر عدمِ معصومیت کے بھی داغ ہیں، مگر علمائے محققین نے ان میں سے ہر ایک شبہہ کا تشفی بخش جواب دے دیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ علامہ بن حزم اندلسی نے الفصل فی الملل والنحل (جلد چہارم) میں اور قاضی عیاض مالکی نے شفاء (قسم ثالث، باب اول) میں، خفاجی نے شرح شفاء (جلد چہارم) میں اور متاخرین میں ملا دوست محمد کابلی نے (تحفة الاخلاء فی عصمة الانبیاء) میں ایک ایک شبہہ کو پوری طرح رد کیا ہے، جس سے ظاہر بینی کا پردہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور اصل حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے، ان میں سے ہر شبہہ کا ذکر کرنا اور اس کا رد کرنا ایک طولِ عمل ہے، مختصراً اصولی طور سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مسئلہ میں جو غلط فہمیاں کسی کو پیش آتی ہین ان کے دو اسباب ہیں اور ان اسباب کی تشریح کر دینا ہی ان غلط فہمیوں کو دور کر دینا ہے۔

۱- سب سے پہلی بات یہ ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ انبیا علیہم السلام کا پایہ بندوں میں بلکہ تمام مخلوقات میں خواہ کسی قدر بلند ہو اور ان کا دامن گناہ وعصیاں کے گرد وغبار سے کتنا ہی پاک ہو، تاہم اس ذوالجلال والاکرام کے سامنے ان کی حیثیت ایک عبد، ایک بندہ اور ایک عاجز مخلوق ہی کی ہے، ایک عبد وغلام خواہ کسی قدر اطاعت کیش، کتنا ہی وفا شعار اور مطیع وفرماں بردار ہو، تاہم اپنے آقا کے سامنے اس کو اپنے قصور کا معترف، اپنی تقصیر کا مقر، اپنی کوتاہیوں پر خجل اور اپنی فروگذاشتوں پر نادم ہی ہونا چاہیے، اسی لئے حضرت ابراہیم جن کی نیکی اور پاکی کی شہادت سے قرآن بھرا ہوا

ہے وہ خدا کی عظمت وجلال اور اس کی رحمت وشفقت کے ذکر میں فرماتے ہیں:

وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ. (شعراء ۲۶: ۸۲)	اور وہ خدا جس سے جزا کے دن اپنی بھول چوک کی معافی کی پوری امید رکھتا ہوں۔

نبی کا یہ اعتراف واقرار اور خجالت وندامت اس کا نقص نہیں، بلکہ اس کی بندگی اور عبودیت کا کمال ہے اور آقا کو حق پہنچتا ہے کہ اس کے غلام اطاعت وفرماں برداری کے جس حیرت انگیز رتبہ تک بھی پہنچے ہیں، وہ ان سے اطاعت کیشی اور وفا شعاری کے اس سے بھی بلندرتبہ کا مطالبہ کرے کہ اس کے دربار میں ان کے عروج وترقی کی کرسی اور بھی اونچی ہوتی جائے، بعض آیتوں میں اگر کسی پیغمبر کو خدا سے مغفرت مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے تو اس کا سبب گناہ کا وجود نہیں، بلکہ ہر قدم پر گذشتہ رتبۂ اطاعت پر قناعت کر لینے پر تنبیہ اور مزید اطاعت کا مطالبہ ہے، تاکہ وہ اس کے مزید تقرب کا ذریعہ بن سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا ہے:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ. وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا. فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ کَانَ تَوَّابًا. (نصر ۱۱۰: ۱-۳)	جب اللہ کی مدد آچکی اور (مکہ) فتح ہو چکا اور اللہ کے دین میں گروہ در گروہ جاتے دیکھ چکا، تو اپنے پروردگار کی پاکی بیان کر اور اس سے معافی چاہ کہ وہ بندہ کے حال پر رجوع ہونے والا ہے۔

غور کرو کہ خدائی مدد آنا، مکہ فتح ہونا، بت پرستی کی بیخ کنی اور لوگوں کا مسلمان ہو جانا کوئی جرم ہے جس سے کوئی معافی چاہے، اسی طرح سورۂ فتح میں فرمایا:

اِنَّا فَتَحْنَا فَتْحًا مُّبِیْنًا. لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ وَیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْکَ وَیَهْدِیَکَ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا. وَّیَنْصُرَکَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِیْزًا. (فتح ۴۸: ۱-۳)	ہم نے تجھ کو کھلی فتح دی تاکہ اللہ تیری اگلی پچھلی خطا کو معاف کرے اور اپنا احسان تجھ پر پورا کرے اور تجھ کو سیدھی راہ چلائے اور تجھ کو مضبوط مدد دے۔
مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا. (حشر ۵۹: ۷)	پیغمبر تم کو جو کچھ دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز آؤ۔

دوبارہ غور کرو کہ مکہ کی فتح کامل نصیب ہونے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معافی سے بجز اس کے کیا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے حسنِ خدمت کو قبول فرما کر اپنی خوشنودی کا اظہار فرماتا ہے۔

اس استغفار سے مقصود نعوذ باللہ پیغمبر کی گنہ گاری کا ثبوت نہیں بلکہ اس کی عبدیتِ کاملہ کا

اظہار ہے۔

حضرت عیسیٰؑ جن کے خدا کے بیٹے ہونے کے عیسائی اور فرشتے جن کے خدا کی بیٹیاں ہونے کے اہلِ عرب قائل تھے اوران کو خدا کا درجہ دیتے تھے ان کے متعلق قرآن نے کہا:

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۔	مسیح کو ہرگز اس سے عار نہ آئے گا کہ وہ خدا کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتوں کو اور جو اس کی بندگی سے عار کرے گا اور بڑائی چاہے گا تو خدا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔

(نساء۴: ۱۷۲)

اس سے مقصود نعوذ باللہ حضرت عیسیٰؑ کی توہین نہیں بلکہ ان کی عبدیت اور بندگی کا اعلان ہے۔

الغرض انبیا علیہم السلام کا خدا کے حضور میں اپنی کوتاہی کا اعتراف، ان کی گنہ گاری کا ثبوت نہیں، بلکہ ان کی عبدیتِ کاملہ کا اظہار ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی پیغمبر کی نسبت یہ فرمانا کہ میں نے تجھے معاف کیا اس کی گنہ گاری کا اعلان نہیں، بلکہ اپنی پسندیدگی، رضا اور قبولِ تام کی بشارت ہے، سورۂ فتح کی جو آیتیں اوپر گذریں ان کو پڑھو تو ظاہر ہوگا کہ چوں کہ بت پرستی کی آلائش سے مکہ کی تطہیر اور کل جزیرۂ عرب میں حق و باطل کی تمیز، مکہ کی فیصلہ کن فتح پر موقوف تھی، اس لئے جب وہ پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کی مسلسل کوششوں اور جاں فروشیوں سے حاصل ہوئی تو خدا نے اعلان فرمایا کہ آج اس فتح سے نبوت کے فرض کی اور تجھ پر میرے سلسلۂ احسانات کی تکمیل ہوئی، پھر خدا آپ ﷺ سے صراط مستقیم کی طرف سے ہدایت کا اور اپنی زبردست مدد کا وعدہ کرتا ہے، حالاں کہ ان میں سے ہر چیز آپ ﷺ کو پہلے ہی عنایت ہو چکی تھی، کیا فتحِ مکہ سے پہلے آپ ﷺ صراط مستقیم یعنی اسلام پر نہ تھے یا آپ ﷺ کو زبردست مدد نہیں مل چکی تھی یہ سب مرتبے حاصل تھے مگر ان باتوں کے یہاں ذکر سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اس موقع پر اس طرح اپنی مزید رضامندی کا اظہار فرمائے اور رسول کی اگلی پچھلی تمام فروگذاشتوں پر (اگر ہوں) خطِ عفو پھیرنے کا اعلان کر کے ان کو نیا خلعتِ فاخرہ عطا اور نئے مراتب جلیلہ عنایت کرے۔

عبدیتِ کاملہ کا یہی راز و نیاز ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے اس فقرہ میں نمایاں ہے ایک سرداران کو ''اے نیک استاذ'' کہہ کر خطاب کرتا ہے اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں:

''تو کیوں مجھ کو نیک کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا'' (لوقا ۱۸:۱۹)

حضرت مسیحؑ کے اس فقرہ سے کسی کا یہ قیاس کرنا کہ وہ نیک نہ تھے کس قدر غلط ہوگا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کا اپنی مشہور دعا میں یہ کہنا کہ:

''اور جس طرح ہم اپنے قرض داروں کو بخشتے ہیں تو اپنے دین ہم کو بخش دے۔''

(متی ۶۔۱۲)

ان کی گنہ گاری کی دلیل نہیں بلکہ عبدیتِ کاملہ کے اظہار کا ثبوت ہے۔

نکتہ: عربی زبان میں گناہ کے لئے مختلف الفاظ ہیں مثلاً ذنب، اثم، حنث، جرم وغیرہ، ان میں سے ذنب کے سوا دوسرے الفاظ کا اطلاق اس حقیقی گناہ پر کیا جاتا ہے جو بالقصد اور جان بوجھ کر کیا جائے لیکن ذنب کا اطلاق ہر غلط فعل پر ہوتا ہے خواہ وہ جان بوجھ کر کیا جائے یا بن جانے غلط فہمی سے ہو یا سوچ سمجھ کر، بھول چوک سے ہو یا قصداً، اور ان کاموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو در حقیقت عام امت کے لئے گناہ نہیں لیکن انبیا کے حق میں اتنی غفلت بھی مواخذہ کے قابل ہے، اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ حسنات الابرار سیئات المقربین (نیکوں کی نیکیاں، مقربین کی برائیاں ہیں)

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل بھی ہے

انبیا علیہم السلام کے استغفار کے موقع پر ہمیشہ 'ذنب' کا لفظ استعمال ہوا ہے جرم، اثم یا حنث کا نہیں، ذنب کا لفظ بھول چوک اور غفلت سے لے کر عصیان تک کو شامل ہے (۱) اس لئے کسی نبی کو

(۱) اس فرق کو عام لغت نویسوں نے ملحوظ نہیں رکھا ہے مگر جن علمائے لغت نے ان الفاظ کے فروق پر کتابیں لکھی ہیں انہوں نے اس کی تصریح کی ہے ہم یہاں پر بیروت کے مشہور عیسائی لغت نویس وادیب الاب ہنریکوس لامنس کی کتاب فرائد اللغة فی الفروق کی عبارت نقل کرتے ہیں: الاثم الذنب الذی یستحق العقوبة علیه ولایصح ان یوصف به اِلّا المجرم وبین الاثم والذنب فرق من حیث ان الذنب مطلق الجرم عمدا کان او سهوا بخلاف الاثم فانه مایستحق فاعله العقاب فیختص بما یکون عمدا و الحنث ابلغ من الذنب لان الذنب یطلق علی الصغیرة والحنث علی الکبیرة والجرم لا یطلق الا علی الذنب الغلیظ (ص ۹۶۔۹۷) (مطبع کاثولیکیہ ۱۸۸۹ء)

اگر خدا کی طرف سے استغفار ذنب کی ہدایت کی گئی تو اس کے معنی صریحاً عصیان و گناہ کے نہیں بلکہ یہی انسانی بھول چوک اور فروگذاشت ہے جس کی اصلاح و تنبیہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم اور لطف و عنایت سے فرماتا رہتا ہے اور اسی کے لئے استغفار کا حکم ان کو ہوتا رہتا ہے۔

اسی سے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بھول چوک اور بلا ارادہ غفلت گو امت کے حق میں قابلِ مواخذہ نہیں، مگر انبیا علیہم السلام کے بلند مرتبہ کے لحاظ سے یہ چیزیں بھی گرفت میں آتی ہیں کیوں کہ ان کا قول و فعل شریعت بن جاتا ہے، اس لئے شریعت کی حفاظت کے لئے ان کے ہر قول و فعل کی حفاظت بھی ضروری ہے، اس بنا پر اگر ان سے احیاناً کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے تو فوراً اس پر تنبیہ کی جاتی ہے اور ان کو ہشیار کر دیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ان کی یہ چیز معاف کر کے ان کو بشارت سنا دی جاتی ہے اور اس طرح ہر چھوٹے بڑے، دانستہ اور نادانستہ تمام گناہوں سے ان کا دامن پاک و صاف رکھا جاتا ہے:

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ . (بقرہ ۲:۳۷)	تو آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں تو وہ اس کی طرف رجوع ہوا۔
ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ . (طٰہٰ ۲۰:۱۲۲)	پھر خدا نے اس (آدم) کو برگزیدہ کیا پھر اس کی طرف رجوع ہوا۔
لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ . (توبہ ۹:۱۱۷)	یقیناً اللہ نبی کی طرف رجوع ہوا۔
فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ (انبیا ۲۱:۸۸)	پھر ہم نے اس (یونس) کی دعا قبول کی اور اس کو غم سے رہائی دی۔
لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (فتح ۴۸: ۲)	تا کہ اللہ تیری اگلی پچھلی فروگذاشت معاف کرے۔

کامل اور عام عفو و مغفرت کا یہ مرتبۂ بلند خود بندہ کی زندگی میں انبیا کے سوا کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔

۲- انبیا کی معصومیت کے مسئلہ میں غلط فہمی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ انبیا کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور عمل کا جو فرق ہے اس کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، علم اور جہل، ضلالت اور

ہدایت اضافی الفاظ میں سے ہیں، علم کی ہر حد کو علم کے مافوق درجہ کے لحاظ سے جہل اور ہدایت کے بلند سے بلند رتبہ کو اس سے بھی اوپر کے مرتبہ کے لحاظ سے ضلالت کہہ سکتے ہیں۔

انبیا علیہم السلام کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعلیت کا فرق ہے، جس طرح تخم میں تمام برگ و بار پوشیدہ ہوتا ہے لیکن وہ اس وقت درخت نہیں ہوتا اور نہ اس میں تنہ، شاخیں، پتے، پھول اور پھل ہوتے ہیں اور نہ اس کا عالم پناہ سایہ ہوتا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے جب وہی تخم بڑھ کر ایک نیا درخت بن جاتا ہے، اس کے پتے آنکھوں میں ہریالی پیدا کرتے ہیں، اس کے پھول مشامِ جان کو معطر کرتے ہیں، اس کے پھول کام و دہن میں شہد ٹپکاتے ہیں، اس کے سایہ میں تھکے ماندے مسافر آرام پاتے ہیں، اسی طرح نبوت کی سابقہ اور لاحقہ زندگیوں میں عظیم الشان فرق ہے اور اسی فرق کی بنا پر اس کی قبل از نبوت زندگی، ظہورِ نبوت کے بغیر تاریکی اور ضلالت اور بعد کی زندگی نور اور ہدایت معلوم ہوتی ہے، جس طرح عام افراد کی زندگی اسلام و ایمان کے بغیر ضلالت اور اسلام و ایمان کے بعد ہدایت بن جاتی ہے، اسی طرح انبیا کی زندگی ان کی نظر میں نبوت کے بغیر ضلالت اور نبوت کے بعد ہدایت ہوتی ہے، غرض یہ ہے کہ ظہورِ نبوت سے پہلے کا زمانہ ان کی ضلالت کا اور بعد کا زمانہ ان کی ہدایت کا عہد کہلاتا ہے لیکن ضلالت اور ہدایت کا یہ مفہوم اس مفہوم سے بالکل مختلف ہے جو غیر انبیا کے حق میں مستعمل ہے، اللہ تعالیٰ جہاں آنحضرت ﷺ پر اپنے احسانات گناتا ہے، فرماتا ہے:

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَاٰوٰى. وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى. وَ وَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى .	کیا اللہ نے تجھ کو یتیم نہ پایا پھر پناہ دی اور اس نے تجھ کو بھولا پایا تو رہنمائی کی اور تجھ کو محتاج پایا تو بے نیاز کیا۔

(ضحیٰ ۹۳: ۶ تا ۸)

سطورِ بالا سے ظاہر ہے کہ یہاں ہدایت سے نبوت اور ضلالت سے قبلِ نبوت کی زندگی مراد ہے جو نبوت کے بعد کی زندگی کے مقابلہ میں نسبتاً ضلالت ہی ہے۔

''ضلالت'' کے معنی عربی میں صرف صریح گمراہی ہی کے نہیں ہیں، بلکہ نادانستہ بھولنے بھٹکنے اور غفلت کرنے کے بھی ہیں، عورتوں کی شہادت کے موقع پر ہے:

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى . (بقرہ۲: ۲۸۲)	کہ بھول جائے ایک عورت تو یاد دلادے اس کو دوسری

ایک اور آیت میں علمِ الٰہی کی تعریف میں ہے:

لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی. (طٰہٰ ۲۰:۵۲) نہ چوکتا ہے میرا رب نہ بھولتا ہے۔

ان آیتوں میں لفظ ضلالت کا استعمال بتاتا ہے کہ "ضال" کے معنی عربی زبان اور محاورۂ قرآن میں صرف گمراہ کے نہیں، بلکہ بھول چوک کے بھی ہیں، اسی طرح اس حالت کے بھی ہیں جس میں گمراہی گو گمراہی معلوم ہوتی ہے لیکن ہنوز ہدایتِ الٰہی کا نور اس کے سامنے نہیں چمکا، غلطی کا احساس ہوتا ہے، مگر اس غلطی کی جگہ ہنوز صحت نظر نہیں آتی ہے، جہل کی برائی تو معلوم ہوگئی ہے مگر ہنوز علم کا دروازہ نہیں کھلا ہے اور یہی قبلِ نبوت کی کیفیت ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی نبوت سے پہلے ایک ستم شعار قبطی کو گھونسا مارا تھا، جس کے صدمہ سے وہ اتفاقیہ مر گیا تھا، نبوت پا کر جب وہ لوٹے تو فرعون نے ان کو طعنہ دیا کہ تم تو میرے فراری مجرم ہو، حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا:

فَعَلْتُهَا إِذًا وَّ أَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ. (شعراء ۲۶:۲۰) میں نے اس حالت میں کیا تھا کہ میں چوکنے والوں میں سے تھا۔

اس چوک اور ضلالت سے مقصد صرف یہی ہے کہ اس وقت میں نبوت کی عزت سے سرفراز نہ تھا ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے نبوت سے پہلے کوئی گمراہی کی بات نہیں کی تھی نہ بت کو پوجا تھا، نہ فرعون کو سجدہ کیا تھا، نہ کوئی اور شرک کیا تھا، کسی کے طمانچے مارنے سے اتفاقیہ کسی کمزور کا مرجانا، مارنے والے کا کوئی بامقصد گناہ نہیں جس کو ضلالت کہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا اپنے کو اس وقت ضال کہنے سے مراد نبوت سے سابقہ زندگی ہے، اس قبلِ نبوت کی زندگی کو بعدِ نبوت زندگی کے لحاظ سے جسے یہاں "ضلالت" کہا گیا ہے، دوسری جگہ اس کو "غفلت" (بے خبری) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، حضرت یوسفؑ کے قصہ میں آپ کو خطاب ہے:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغَافِلِيْنَ. (یوسف ۱۲: ۳)

ہم تجھے بہترین قصہ سناتے ہیں کیوں کہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن اتارا، اگرچہ اس قرآن کی وحی سے پہلے تو بے خبروں میں تھا۔

اس بے خبری کے عالم کی تفسیر دوسری آیت میں ہے، جس میں پیغمبر کی قبل از نبوت اور

بعد از نبوت کی زندگی کا فرق ظاہر فرمادیا ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ. (شوریٰ ۴۲: ۵۲)	اور اسی طرح ہم نے اپنے (خلوت خانہ) راز سے ایک روح تیری طرف وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان لیکن ہم نے اس کو نور بنادیا جس سے جس کی چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے رہنمائی کرتے ہیں اور بے شک تو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

''کتاب وایمان'' کے نور وہدایت ملنے سے پہلے کی یہی وہ کیفیت وحالت ہے جس کو کہیں ضلالت اور کہیں غفلت کہا گیا، اس سے مقصود حقیقی گنہ گاری، عصیان کاری اور باطنی گمراہی نہیں ہے، بلکہ طلبِ حق، تلاشِ معرفت اور انتظارِ حقیقت ہے کہ وہی ان کے حق میں ضلالت اور غفلت کا حکم رکھتا ہے، آخر وہ وقت آتا ہے جب روشنی چمکتی ہے، روحانی سکون کا چشمہ بہتا ہے اور منزل رسی کے بعد دوسروں کی رہنمائی کا منصب عطا ہوتا ہے یہ ہدایت کا دور ہے، چنانچہ ایک موقع پر انبیا کے نبوت ملنے کو ہدایت کے لفظ سے ادا فرمایا گیا ہے:

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ. (انعام ۶: ۸۵)	اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب بخشے اور ان میں ہر ایک کو ہدایت دی اور ان سے پہلے نوح کو ہدایت دی۔

اس ہدایت دینے سے اگر نبوت عطا کرنا مراد ہے تو ظاہر ہے کہ عدمِ نبوت کا عہد ''ضلالت'' ہی کہلائے گا، مگر اس سے مقصد صرف وہ حالت ہوئی جس میں ان کو ہنوز نبوت نہیں ملی تھی اور اس مرتبۂ بلند کا انتظار تھا۔

اس تشریح سے یہ واضح ہوگیا کہ انبیا کے حق میں ضلالت سے مقصود گنہ گاری، عصیان کاری، اور گمراہی نہیں بلکہ عدمِ نبوت کا دور اور رسالت کی زندگی سے پہلے کا عہد ہے جو نبوت و رسالت کی ہدایت کے مقابلہ میں نسبتاً ضلالت ہے۔

نبی کی بشریت: نبی کی معصومیت اور اس کے دوسرے مقدس خصوصیات کے باوجود اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ نبی خدا کا مخلوق، خدا کا بندہ اور آدمی ہی ہوتا ہے، وہ خدا، خدا کا اوتار، دیوتا یا فرشتہ نہیں ہوتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کی اصل حقیقت محمد رسول اللہ ﷺ

سے پہلے افراط وتفریط کی تاریکی میں گم تھی اور آپ ﷺ کے فیض تعلیم سے وہ روشن ہوئی، اسلام سے پہلے یہودیوں کی طرح ایسے اہلِ مذہب بھی تھے جو پیغمبروں کو ایک پیشین گوئی کی صفت کے علاوہ ہر حیثیت سے معمولی انسانی سمجھتے تھے، وہ ہر قسم کے گناہ بھی کرتے تھے، وہ بداخلاقیوں کے بھی مرتکب ہوتے تھے، وہ کفر بھی کرتے تھے تاہم پیغمبر سمجھے جاتے تھے، دوسری طرف عیسائی بھی تھے جو اپنے نجات دہندہ کو انسانیت سے پاک، خود خدا یا خدا کا جز یا ناسوت ولاہوت کا ایک مجموعہ سمجھتے تھے اور ہندو بھی تھے جو اپنے رہنماؤں کو دیوتا اور اوتار یعنی مجسم خدا یا انسان کے بھیس میں خدا سمجھتے تھے اور جن کو ہر قسم کی خدائی طاقتیں حاصل تھیں۔

اسلام نے اپنی تعلیم ان دونوں کے وسط میں پیش کی وہ ایک طرف رسولوں کو مخلوقِ محض، صرف انسان اور پورا بندہ اور خدا کے حکم کے سامنے عاجز و درماندہ تسلیم کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ ان کو خدا کا برگزیدہ، معصوم، نیک اور خدا کی قدرت سے فیض پاکر برکتوں، سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز اور اس کی اجازت سے عجیب وغریب امور صادر کرنے والا بتاتا ہے اور بے اعتدالی کے ان دونوں خیالات کی جو غلط فہمی پر مبنی ہیں علانیہ تردید کرتا ہے، اہل عرب بھی ہندوؤں، یونانیوں اور عیسائیوں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی رہنمائی کے لئے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافوق ہستی ہونی چاہیے اور وہ ہستی صرف فرشتوں کی ہے، قرآن نے ان کے اس خیال کی بار بار تکذیب کی ہے اور کہا ہے کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو فرشتہ کو ان کے پاس رسول بنا کر بھیجا جاتا اور انسانوں میں فرشتہ آتا بھی تو انسانیت ہی کے پیکر میں آتا تو ایسی حالت میں تم اس فرشتہ کو فرشتہ کب مانتے۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے دو رخ ہوتے ہیں، ایک طرف تو وہ بشریت کے جامہ میں ہوتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے اور مرتے ہیں، دوسری طرف وہ اپنی روحانیت، بے گناہی، پاک دامنی اور اختصاصِ نبوت میں انسانوں سے بلندتر ہیں، یہودیوں کی طرح جن کی نظر ان کے انسانی رخ پر پڑتی ہے وہ ان کو ہر طرح معمولی انسان سمجھتے ہیں اور عیسائیوں کی طرح جن کی نظر ان کے مافوق انسانی خصائص پر پڑتی ہے وہ ان میں الوہیت کے اوصاف ثابت کرنے لگتے ہیں، حالاں کہ حق ان دونوں کے بیچ میں ہے، وہ اپنے بشری اوصاف کے لحاظ سے بلاشبہ انسان ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مافوق

بشری خصوصیات کی بنا پر فوق البشر ہوتے ہیں، یہی مغالطہ اپنے اپنے پیغمبروں کے متعلق کفار کو ہوتا تھا، پیغمبران کے سامنے جب اپنی نبوت اور خدا کی طرف سے آنے کا دعویٰ پیش کرتے تھے تو وہ ان کی بشری خصوصیتوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو، تم خدا کے قاصد اور پیام بر کیسے ہو سکتے ہو، چنانچہ کفار نے بار بار پیغمبروں سے کہا:

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۹۴) کیا خدا نے بشر کو قاصد (رسول) بنا کر بھیجا۔

وہ بشریت کو رسالت کے منافی سمجھتے تھے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا:

هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۹۳) میں تو نہیں ہوں مگر انسان رسول۔

ان کو شبہہ تھا کہ کیا گمراہ انسانوں کی رہنمائی انسان ہی کر سکتا ہے۔

اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا. (تغابن ۶۴: ۶) کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے۔

یہ وہی شبہہ تھا جس میں پھنس کر عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی انسانیت سے منکر ہوئے کہ موروثی گنہ گار انسان کو انسان کا بیٹا کیوں کر نجات دے سکتا ہے اور یہ نہیں سمجھے کہ انسان موروثی گنہ گار نہیں، بلکہ وہ گنہ گار بھی ہو سکتا ہے اور بے گناہ بھی، بے گناہی اور معصومیت کے لئے انسانیت سے پاک ہونا ضرور نہیں، یہی بات اور کفار کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی اور انبیا کو ظاہری اور جسمانی طور سے اپنی ہی طرح انسان سمجھ کر ان کو نبوت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے:

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا. (ابراہیم ۱۴: ۱۰) تم تو نہیں ہو لیکن ہماری ہی طرح ایک بشر۔

دوسروں کو نبی کے انکار کرنے پر اس طرح آمادہ کرتے تھے کہ:

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ. (انبیاء ۲۱: ۳) نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ. (مومنون ۲۳: ۲۴) نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔

انبیا کے سامنے وہ یہی دلیل پیش کرتے تھے:

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا. (شعراء ۲۶: ۱۵۴) تم تو ہماری طرح بشر ہو۔

مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا. (یٰسین ۳۶: ۱۵) تم لوگ تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔

اور وہ اپنے اس دعویٰ کی صداقت کو بداہت اور مشاہدہ سے ثابت کرتے تھے:

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا. (ھود ۱۱: ۲۷) ہم تو تم کو اپنی ہی طرح بشر دیکھتے ہیں۔

انبیا علیہم السلام نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ ہاں تمہاری ہی طرح ہم بشر ہیں لیکن خدا کے فضل وکرم سے سرفراز ہیں اور یہی تم میں اور ہم میں فرق ہے، فرمایا:

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۔ (ابراہیم ۱۴: ۱۱)	ان کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم تمہاری ہی طرح بشر ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے۔

ان کفار کی نظر صرف ان کے ایک رخ یعنی عام انسانی پہلو پر پڑتی تھی، انبیا نے جواب میں اس پہلو کے ساتھ اپنے دوسرے رخ کو بھی ان کے سامنے پیش کر دیا اور کہا کہ ہاں ہم انسان ہیں لیکن ایسے انسان جن پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بارش ہے، یعنی نبوت سے سرفراز اور اس کی خصوصیتوں سے ممتاز ہیں۔

دوسرے نبیوں کی طرح ختم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ بار بار ارشاد فرمایا بلکہ وحیِ الٰہی نے آپ ﷺ کی زبان سے یہ اعلان کر دیا کہہ دو کہ میں تمہاری ہی طرح ایک آدمی اور بشر ہوں، اس اعلان نے جو درحقیقت اس غلط عقیدہ کے مٹانے کے لئے تھا جو انبیا کی شانِ الوہیت کے متعلق عیسائیوں کے اثر سے لوگوں میں پھیل گیا تھا اور افسوس ہے کہ اس قسم کا غلط خیال اسی نبی کی امت کے ایک گروہ میں بھی پایا جاتا ہے جو دنیا میں خدا کی توحیدِ کامل کا مبلغ بن کر آیا تھا، دوسری طرف اس اعلان سے ایک تفریط پسند گروہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ پیغمبر اور عام انسانوں میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں اور نہ پیغمبروں کو عام انسانوں پر کوئی بلندی و برتری حاصل ہے، الا یہ کہ پیغمبروں پر وحی آتی رہتی ہے اور عام انسان اس سے محروم ہیں، گویا اس کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر صرف اس لمحہ اور آن میں منصبِ نبوت کا امتیاز پاتا ہے جب اس پر کسی قسم کی وحی نازل ہوتی ہے اور اس کے پہلے اور اس کے بعد وہ عام انسان ہوتا ہے، اس سے آگے بڑھ کر اسی لئے ایک اور مختصر سے فرقہ نے یہ دعویٰ کیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ حکم صرف وہی ہے جو وحیِ قرآنی کی صورت میں آیا اس کے علاوہ آپ کے ﷺ تمام

احکام جو قرآن سے باہر ہیں وہ صرف حاکمانہ اور انتظامی امور ہیں، جن کی پیروی کرنا نہ اسلامی شریعت ہے نہ اسلام کا جز ہے، یہ خیالات حقیقت میں دوسرے مفرطانہ فرقہ کے مقابلہ میں تفریطانہ ہیں اور دونوں اعتدال کی حد سے باہر اور حقیقت ان کے بیچ میں ہے۔

قرآن پاک میں تین جگہ وہ آیتیں ہیں جن میں خاص آنحضرت ﷺ کی بشریت کا اعلان ہے مگر ہر جگہ توحید کامل کے بیان اور خدا کے مقابلہ میں رسولوں کی عبدیت کی تشریح اور اس عقیدۂ باطل کی تردید میں ہیں کہ رسولوں کے ہاتھوں میں یہ قوت ہونی چاہیے کہ وہ خدا سے زبردستی کسی بات کو منوالیں اور سعی وسفارش کر کے قصور معاف کرادیں، قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ان کو جو کچھ حاصل ہے وہ خدائے تعالیٰ کی اجازت، اذن اور عطا سے ہے۔

سورۂ کہف میں ان مشرکوں کا ذکر ہے جو خدا کے بندوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں:

اَفَحَسِبَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنْ یَّتَّخِذُوْا عِبَادِیْ مِنْ دُوْنِیْٓ اَوْلِیَآءَ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْکٰفِرِیْنَ نُزُلًا. (کہف ۱۸:۱۰۲)	کیا وہ جنہوں نے کفر کیا یہ سمجھے ہیں کہ وہ میرے بندوں (رسول اور فرشتوں) کو میرے سوا اپنا حمایتی بنائیں گے، ہم نے ان کافروں کے لئے جہنم تیار کی ہے۔

قرآن اس خیال کو کفر قرار دیتا ہے، یہ رکوع کا شروع ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے غیر محدود اوصاف وکمالات کا ذکر ہے پھر ارشاد ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰهُکُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ. (کہف ۱۸:۱۱۰)	کہہ دے کہ میں تو تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔

دوسری جگہ یہی تعلیم بعینہٖ سورۂ حم السجدہ (فصلت) میں ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰهُکُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِیْمُوْٓا اِلَیْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ وَوَیْلٌ لِّلْمُشْرِکِیْنَ. (حم السجدہ ۴۱: ۶)	کہہ دے کہ میں تو تمہاری طرح بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے، اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو، خرابی ہے شریک کرنے والوں کے لئے۔

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں رسول اسی طرح ایک بندہ ہے جس طرح خدا کے دوسرے بندے، دعائیں خدا ہی سے مانگنی چاہئیں اور اسی سے اپنے گناہوں کی معافی

کی درخواست کرنی چاہیے، یہ اختیارات خاص خدا کے ہیں، بندوں کے نہیں، اس تعلیم سے مقصود حقیقت میں عیسائیوں کے مسئلۂ کفارہ اور ان کے اس عقیدہ کی تردید ہے کہ گناہوں کا معاف کرنا حضرت عیسیٰؑ کے اختیار میں ہوگا اور مسلمانوں کو اپنے رسول کی نسبت اس قسم کی باطل عقیدت مندیوں سے بچانا ہے، چنانچہ تیسری جگہ قرآن پاک میں جہاں آنحضرت ﷺ سے کفار کا یہ مطالبہ مذکور ہے کہ تم خدا کے پیغمبر ہو تو ہمارے لئے سونے کی چھت بنا دو، جہاں نہریں نہیں وہاں نہریں جاری کردو، ہمارے سنسان جنگلوں کو باغ و بہار بنادو، اپنے ساتھ جلو میں فرشتوں کے پرے لے کر چلو، ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے ہاتھ میں کتاب لے کر سامنے اترو:

وَقَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا. اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا. اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا. اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ. (بنی اسرائیل ۱۷: ۹۰ تا ۹۳)	اور انہوں نے کہا کہ ہم تم پر ایمان اس وقت تک نہیں لائیں گے جب تک تم ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ نہ بہادو یا تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ نہ ہو جائے یا جیسا تم کہتے ہو آسمان کے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گراؤ یا خدا کو اور فرشتوں کو ضامن بنا کر نہ لے آؤ یا تمہارے لئے سونے کا ایک گھر نہ ہو جائے، یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہاں تمہارے آسمان پر چڑھنے کا ہم کو اس وقت تک یقین نہ آئے گا جب تک تم وہاں سے ایک نوشتہ نہ ہم پر اتار لاؤ جس کو ہم پڑھ لیں۔

یہ امور مشکل و محال نہ تھے لیکن نبوت کے اوصاف کو ان بازی گرانہ تماشوں سے تعلق نہ تھا، اور اس سے زیادہ یہ کہ اس غلط عقیدہ کا ابطال کرنا تھا کہ پیغمبر میں براہ راست کچھ خدائی اختیارات ہوتے ہیں اس لئے آپ ﷺ کو یہ جواب سکھایا گیا کہ آپ ﷺ فرمائیں:

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا. وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا.	کہہ دے اے پیغمبر! سبحان اللہ میں تو ایک بشر ہوں رسول اور لوگوں کو جب ان کے پاس ہدایت آئی ایمان لانے سے باز نہیں رکھا مگر اس خیال نے کہ کیا خدا نے بشر کو

قُلۡ لَّوۡ کَانَ فِی الۡاَرۡضِ مَلٰٓئِکَۃٌ یَّمۡشُوۡنَ مُطۡمَئِنِّیۡنَ لَنَزَّلۡنَا عَلَیۡہِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَکًا رَّسُوۡلًا. (اسراء ۱۷: ۹۳-۹۵)

رسول بنا کر بھیجا ہے کہہ دے کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے تو ہم آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر ان پر اتارتے۔

آنحضرت ﷺ سے بہ حکم خدا معجزات بھی صادر ہوئے اور ان کی حیرت انگیزی کو انہوں نے تسلیم بھی کیا پھر بھی یہ خیال کہ ایک بشر رسول کیوں کر ہو سکتا ہے قائم رہا۔

کفار نے معجزات دیکھنے کے بعد بھی یہی کہا:

ہَلۡ ہٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ اَفَتَاۡتُوۡنَ السِّحۡرَ وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ. (انبیاء ۲۱: ۳)

یہ تو تمہاری ہی طرح بشر ہے کیا تم دیکھ بھال کر بھی جادو کے پاس آتے ہو۔

معجزات کی حیرت انگیزی کو جادو کہہ کر تسلیم کیا مگر پھر بھی ان کو بشریت رسالت کے منافی ہی معلوم ہوئی، ان سے کہا گیا کہ نبوت و رسالت کے اوصاف و خصائص تم سے زیادہ ان کو معلوم ہیں جن کو تم سے پہلے آسمانی کتابیں عطا ہوئیں یعنی یہود، ان سے پوچھ لو کہ رسول اور نبی بشر ہی ہوتے آئے ہیں:

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ فَسۡئَلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ. (انبیاء ۲۱: ۷)

اور ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر تم سے پہلے لیکن انسانوں ہی کو جن کو ہم وحی کرتے تھے، جاننے والوں سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے۔

یہی جواب سورہ یوسف میں دیا گیا:

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ مِّنۡ اَہۡلِ الۡقُرٰی. (یوسف ۱۲: ۱۰۹)

اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے وہ بشر ہی تھے، آبادیوں کے رہنے والے، ہم ان پر وحی کرتے تھے۔

اس سے زیادہ تفصیل سورہ نحل میں ہے:

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ فَسۡئَلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ. بِالۡبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ؕ وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ

اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے لیکن انسانوں کو جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے تو پوچھ لو کتاب والوں سے اگر تم نہیں جانتے، کھلی نشانیاں اور کتابیں دے کر اور ہم نے تم پر کتاب (ذکر) اتاری تاکہ تم کھول کر لوگوں سے

اِلَیۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ ۔ (نحل ۱۶: ۴۳و۴۴) بیان کرو جو ان کی طرف اتارا گیا اور تا کہ وہ سوچیں۔

ہر شخص جو مثلیت اور بشریت کی ان آیتوں پر ایک نگاہ ڈالے گا وہ یہی سمجھے گا کہ ان آیتوں میں جس قسم کی مثلیت اور بشریت کا ذکر ہے، اس کا تعلق ظاہری جسمانیت اور جسمانی قویٰ اور مخلوقیت سے ہے، ورنہ اخلاقی، روحانی، دماغی، قلبی، علمی اور عملی حیثیت سے ایک پیغمبر انسان رہ کر بھی غیر نبی انسانوں سے بلندتر اور علانیہ ممتاز ہوتا ہے، نبی اور غیر نبی میں صرف وحی کے امر فارق ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی القائے ربانی سے متصف ہونے کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف و کمالات یا عیوب و نقائص میں عام انسانوں کے برابر ہوتا ہے، یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ عالم و جاہل میں صرف علم کا فرق ہے ورنہ دونوں برابر کے انسان ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ علم و جہل کے علاوہ ممتاز و متضاد اوصاف میں بھی وہ دونوں برابر ہیں اور ان میں عقل، اخلاق، تہذیب، سلیقہ، رائے اور حکمت و دانائی کا کوئی فرق نہیں، حالاں کہ ان میں علم و جہل کا فرق کہہ کر در حقیقت ان دونوں کے درمیان علم اور جہل کے سینکڑوں اوصاف، لوازم اور خصائص کا فرق و امتیاز تسلیم کرنا ہے۔

اسی طرح نبی اور غیر نبی میں وحی کا فرق مان کر وحی والے اور بے وحی والے انسانوں میں خود وحی اور عدمِ وحی کے سینکڑوں لوازم، خصائص اور اوصاف کا فرق تسلیم کرنا پڑے گا، وحی و رسالت کو چھوڑ دو، دوسرے انسانی کمالات کو مثالاً لو تو بھی یہی ماننا پڑے گا، انسان کے لئے جتنے اوصاف و کمالات ممکن ہیں ان سب کی اعلیٰ سے اعلیٰ جانب کمال تک پہنچنا ممکن ہے اور جو وہاں تک پہنچ جاتے ہیں، وہ اپنے جسمانی اوصاف و خصائص کے لحاظ سے انسان ہونے کے باوجود اپنے دوسرے قویٰ میں عام انسانوں سے یقیناً بلند اور ممتاز ہوتے ہیں کوئی کہہ سکتا ہے کہ جسمانی قوت کا ایرانی ہیرو رستم انسان نہ تھا، علم و عقل کا یونانی مجسمہ ارسطو انسانیت سے پاک تھا اور موجودہ دنیا کی بہت سی حیرت انگیز ایجادوں کا مخترع ایڈیشن بشر نہیں، لیکن اس انسانیت اور بشریت کے اشتراک کے باوجود اپنے اپنے دائرہ میں وہ عام انسانوں سے بلند تر اور ممتاز تر ہیں، اور باایں ہمہ وہ اپنے جسمانی خصائص، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، دیکھنے بھالنے، صورت شکل، ہاتھ پاؤں ہر ایک چیز میں وہ ویسے ہی انسان ہیں اور مخلوق انسان بلکہ مجبور انسان ہیں جیسے دوسرے کمزور، جاہل اور بلید الذہن انسان، یہی مثال ایک معنی میں انبیائے کرام علیہم السلام کی بھی ہے کہ وہ

غیر نبی انسانوں کے ساتھ بہت سے انسانی اوصاف میں شریک ہونے کے باوجود وحی اور اس کے خصائص اور لوازم میں ان سے صریحاً الگ، بلند اور اعلیٰ بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی ان سے ممتاز ہیں، آنحضرت ﷺ کو صومِ وصال رکھتے دیکھ کر جب صحابہؓ بھی آپ کی پیروی میں کئی کئی دن تک کا متصل روزہ رکھتے ہیں تو آپ ان کو منع کرتے ہیں اور اپنی نسبت فرماتے ہیں ایکم مثلی ابیت یطعمنی ربی و یسقینی (۱) تم میں کون میرے مثل ہے میں رات گذارتا ہوں تو میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے، کیا عام انسانوں کو بھی یہ روحانی غذا اور روحانی سیرابی میسر آتی ہے اور وحی کے علاوہ بعض دوسرے حیثیتوں سے بھی مثلیت کی اس میں نفی نہیں ہے۔

اسی طرح نیند کی حالت میں بھی نبی کے قلب اور اس کے احساسات کا غافل نہ ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے آپ ﷺ نے فرمایا ''میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا۔ وکذلک الانبیاء تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم (۲) اور اسی طرح سب انبیا ہیں کہ ان کی آنکھیں سوتی ہیں مگر ان کے دل نہیں سوتے۔ کیا یہی کیفیت عام انسانوں کی نیند کی بھی ہے؟ آنحضرت ﷺ لوگوں کو نماز میں صفوں کو درست رکھنے کی تاکید کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ ''میں تم کو اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی ویسے ہی دیکھتا ہوں جیسے سامنے سے'' (۳) کیا عام انسانوں کی قوتِ بصارت کا یہی عالم ہوتا ہے؟ قرآن پاک میں ہے اَفَتُمَارُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى. (نجم ۵۳: ۱۲) کیا پیغمبر جو دیکھتا ہے تم اس میں اس سے جھگڑتے ہو، وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ. (التکویر ۸۱: ۲۳) اور اس نے اس (فرشتہ) کو آسمان کے کناروں میں دیکھا۔ کیا عام انسان بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں آنحضرت ﷺ کے انتساب سے امہات المومنین کو جو شرف حاصل ہوا اس کا اقتضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے امہات المومنین کو خطاب کر کے فرمایا يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ (احزاب ۳۳: ۳۲) اے پیغمبر کی بیویو! تم ایسی نہیں ہو جیسی ہر عورت اگر خدا کا ڈر رکھو، تو اگر پیغمبر کی بیویاں تقویٰ کے بعد عام عورتوں کے مثل نہیں ہیں تو خود پیغمبر تو بہ درجہا اس کا سزاوار ہے کہ وہ

(۱) صحیح بخاری کتاب الصوم، باب التنکیل لمن اکثر الوصال، ج ۱ص ۲۶۳ (۲) صحیح بخاری، کتاب التوحید باب قول اللہ کلم اللہ موسی تکلیما، ج ۲ص ۱۱۲۰ و باب المناقب باب کان النبی تنام عینہ ولا ینام قلبہ ج ۱ص ۵۰۴ (۳) صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ باب عظۃ الامام الناس فی اتمام الصلوۃ ج ۱ص ۵۹

کَاَحَدٍ مِنَ الرِّجَالِ نہ ہو، اور اپنے خصائص میں عام انسانوں سے بہ درجہا بلند تر اور ممتاز ہو۔

الغرض نبی اور غیرِ نبی میں صرف وحی و نبوت کا جو فرق ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ان دونوں میں وحی و رسالت کے تمام لوازم، خصوصیات اور ضروری اوصاف میں فرق اور امتیاز ہے، اس لئے کسی انسان کو صاحبِ وحی ماننے کے ساتھ ہی اس کو ان تمام اوصاف ولوازم اور خصوصیات کا مالک بھی ضرور ہی ماننا پڑے گا۔

اجتہادِ نبوی میں خطا: شبہ کا ایک اور سبب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بعض جگہ آنحضرت ﷺ کو آپ ﷺ کی چند فروگذاشتوں پر متنبہ کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاص وحیِ الٰہی کے علاوہ آپ ﷺ اپنی عقل اور مصلحت سے جو حکم دیتے تھے وہ غلطیوں سے پاک نہیں ہوتا تھا، اس سلسلہ میں یہ بات تمام مسلمانوں کو تسلیم ہے کہ جن بعض امور میں آپ ﷺ پر وحیِ قرآن نازل نہیں ہوتی تھی ان میں آپ ﷺ اپنے پیغمبرانہ علم وحکم اور فہمِ نبوی سے فیصلہ فرماتے تھے لیکن غور کے قابل یہ بات ہے کہ اگر آپ کو آپ کے اس فیصلے پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی تنبیہ ہوئی ہوتی تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ آپ کے تمام فیصلے صحیح اور منشائے الٰہی کے مطابق ہوتے تھے، مگر یہ بھی کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ آپ کے تمام فیصلے صحیح اور منشائے الٰہی کے مطابق ہوتے تھے، مگر یہ بھی کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ اجتہادِ نبوی کے فیصلوں کی صحت وخطا کی ذمہ داری خدا نے نہیں لی تھی، اس لئے تنبیہ نہ فرمائی گئی مگر واقعہ ان دونوں کے خلاف ہے، صورت یہ ہے کہ بعض فیصلوں پر تنبیہ کی گئی ہے اور بعض پر نہیں، اس سے بداہتاً ثابت ہوتا ہے کہ اجتہادِ نبوی میں غلطی ہو جانا ممکن ہے، مگر اس غلطی پر چند لمحوں کا قرار بھی ممکن نہیں ادھر لغزش ہوئی اور ادھر علام الغیوب کی بے خطا وحی نے اس کی تنبیہ اور اصلاح کی، اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام امور واحکام جن کو آپ ﷺ نے اپنے پیغمبرانہ اجتہاد و علم وحکمت سے ارشاد فرمایا یا ان پر عمل کیا اور وحیِ الٰہی نے ان پر خاموشی برتی، تو منشائے الٰہی نے گویا ان کی صحت وصداقت پر اپنی خاموشی سے مہر کر دی اور ان کی حیثیت بہ منزلۂ وحی کے ہو گئی۔

آنحضرت ﷺ کی نبوت کی عمر ۲۳ سال ہے، ان پورے ۲۳ سالوں میں ہزاروں واقعات اور امور پیش آئے جن پر آپ ﷺ نے اپنے اجتہاد اور شرحِ صدر سے فیصلے صادر کئے، مگر ان میں سے کل پانچ باتیں ایسی ہیں جن پر وحیِ الٰہی نے تنبیہ کی اور عجیب تر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کا تعلق حکمِ دینی، شریعتِ ابدی، اعتقاد، عبادات یا شرعی معاملات سے ہو، بلکہ وہ کل کے کل ایسے امور ہیں جن کی حیثیت تمام تر شخصی یا جنگی ہے، اس سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دین اور

شریعت میں آپ ﷺ کے یہ پیغمبرانہ اجتہادی فیصلے خطاو غلطی سے تمام تر پاک تھے۔

اس خطا کے معنی: عام انسانوں کے اجتہادات میں جن اسباب سے غلطیاں واقع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ جن مقدمات پر ان کا اجتہاد مبنی ہوتا ہے وہ غلط ہوتے ہیں، یا ان کا علم ان کو قطعی طور سے نہیں ہوتا یا استقرائے تام نہیں ہوتا، تمثیل پوری نہیں ہوتی، علتِ مشترکہ صحیح نہیں معلوم ہوتی، مگر یہ تمام صورتیں اجتہادِ نبوی میں منفی ہیں، کیوں کہ اجتہادنبوی نہ ان طریقوں پر مبنی ہوتا، نہ وہ غوروفکر، نظرو استدلال اور استقراو تمثیل کے منطقی واصولی ذرائع پر قائم ہوتا ہے، بلکہ وہ نورِ رسالت، فہمِ نبوت، حکمتِ ربانی اور شرحِ صدر پر مبنی وقائم ہوتا ہے، جن میں یہ بیچ کی منزلیں سرے سے نہیں ہوتی ہیں، اسی لئے لفظِ اجتہاد جو عام طور پر پہلے معنی میں مستعمل اور مشہور ہے، اس سے اس مقام پر التباس سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا بہتر ہے۔

ایک اور نکتہ بھی پیشِ نظر رہے، آنحضرت ﷺ کے پیغمبرانہ اجتہاد میں اگر غلطی ہوئی ہے تو اس غلطی کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے جو پہلو اختیار فرمایا وہ کوئی گناہ یا بدی یا بداخلاقی کا پہلو تھا بلکہ یہ ہے کہ دو بہتر راستوں میں سے آپ ﷺ نے بہترین راستے کو چھوڑ کر بہتر راستے کو اختیار کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور بہتر کی جگہ بہترین کی تلقین کی۔

اس قسم کے جو چند واقعات پیش آئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہوجاتی ہے کہ بہترین کو چھوڑ کر جس بہتر کو آپ ﷺ نے اختیار فرمایا اس کا منشا ہمیشہ امت پر رحم وکرم اور شفقت کی نگاہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری یا عارضی رحم وکرم وشفقت کی جگہ ان احکام کی تلقین فرمائی جن میں گو بہ ظاہر سختی معلوم ہوتی ہے، مگر علام الغیوب کی دائمی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہی سخت پہلو اختیار کیا جائے۔

ذیل میں ہم ان اجتہادی امور کی تشریح کرتے ہیں جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی ہے۔

پانچ اجتہادی امور پر تنبیہِ الٰہی: جن اجتہادی امور پر وحیِ الٰہی نے تنبیہ کی ہے، ان میں:

پہلا واقعہ: پہلا واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے قبل مکہ معظمہ میں جب آنحضرت ﷺ اپنی دعوت کی تبلیغ فرمارہے تھے، تو ایک دن قریش کے بڑے بڑے رؤسا آپ ﷺ کی مجلس میں آکر بیٹھے آپ ان کو سمجھا

بجھا رہے تھے، بت پرستی کی برائیاں اور توحید کی خوبیاں ان پر ظاہر فرما رہے تھے، اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ اس دعوت کو قبول کر لیں کہ اتنے میں ایک مخلص لیکن غریب اور نابینا مسلمان عبداللہ بن ام مکتومؓ بھی آ کر بیٹھ گئے اور کچھ دریافت کرنا چاہا، قریش کے یہ رؤسا بے حد مغرور اور خود پسند تھے وہ آپ ﷺ کے جلسوں میں صرف اس لئے آنا پسند نہیں کرتے تھے کہ آپ ﷺ کی مجلس میں بدحال، بے حیثیت اور ادنیٰ درجہ کے لوگ آیا کرتے ہیں، اس لئے اس موقع پر جب آنحضرت ﷺ کو ان رئیسوں کی اثر پذیری کے کچھ امکانات نظر آ رہے تھے عبداللہ بن ام مکتومؓ کا آجانا اور پوچھنا ناگوار ہوا، کہ ان کے آنے سے ان رئیسوں کی خود پسندی اور بڑائی کے جذبہ کو اشتعال ہوا اور راستہ سے بدک گئے۔

عبداللہ بن ام مکتومؓ کی آمد اور دریافت پر یہ ناگواری جو بالکل نیک نیتی سے تھی، یعنی اس لئے تھی کہ آپ جانتے تھے کہ عبداللہ بن ام مکتومؓ تو مسلمان ہی ہیں، اس وقت ان کی بات کا جواب نہ دینے میں چنداں حرج نہیں، لیکن ان رئیسوں کی ناگواری پورے باشندگانِ مکہ پر اثر انداز ہوگی، اگر یہ مسلمان ہوگئے تو مکہ میں اسلام کی اشاعت کی راہ میں پھر کوئی روک باقی نہیں رہے گی، یہ سمجھ کر آنحضرت ﷺ عبداللہ بن ام مکتومؓ کی طرف سے بے التفات ہو کر ان رئیسوں کی تبلیغ و موعظت کی طرف سرتاپا متوجہ رہے اس پر وحی الٰہی نے حسب ذیل الفاظ میں تنبیہ کی:

عَبَسَ وَتَوَلّٰی. اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی. وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰی. اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی. اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی. فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی. وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰی. وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰی. وَهُوَ يَخْشٰی. فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی. كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ. فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ. (عبس ۸۰:۱-۱۲)	تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ وہ اندھا آیا اور تجھے کیا خبر کہ شاید وہ سنورتا یا سوچتا تو (تیرا) سمجھانا کام آتا، وہ جو پروا نہیں کرتا سو تو اس کی فکر میں ہے اور اس کے نہ سنورنے کا تجھ پر کوئی الزام نہیں اور جو تیرے پاس دوڑا آیا اور وہ (خدا سے) ڈرتا ہے تو اس سے تغافل کرتا ہے، یوں نہیں یہ تو نصیحت ہے جو چاہے اس کو یاد کرے۔

ان آیتوں میں آنحضرت ﷺ کے اس اجتہاد پر کہ ایک پرانے لیکن غریب مسلمان کی مزید ہدایت سے قریش کے رئیسوں کو سمجھانا زیادہ بہتر ہے، تنبیہ کی گئی اور اس نکتہ کو ذہن نشین کیا گیا کہ اسلام کی اصولی بنیادوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے نزدیک امیر و غریب، آقا اور غلام، اونچ

اور نیچ کی کوئی تمیز نہیں، اس کی نگاہ میں بینا اور نابینا دونوں برابر ہیں، یہ نکتہ تو اس وقت کے فیصلے میں آپ ﷺ کے پیش نظر رہا کہ ایک مسلمان اندھے کی دل جوئی سے ان رئیسوں کی جائز دل جوئی کر کے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنا زیادہ بہتر ہے، مگر یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ اس طرزِ عمل سے خود اسلام کی بنیادی تعلیم پر کیا اثر پڑے گا اس لئے وحیِ الٰہی نے تنبیہ کی کہ اسلام کا یہ پیغام دنیا کے لئے صلائے عام ہے جو چاہے قبول کرے، اس میں کوئی تمیز و تخصیص نہیں علاوہ ازیں اس کا بھی اشارہ کیا کہ یہ رؤسائے قریش جن کے مسلمان ہونے کی آپ اس قدر کوشش فرما رہے ہیں وہ ایمان سے محروم ہی رہیں گے، اس لئے ان کی طرف مزید توجہ بے سود ہے اور ظاہر ہے کہ آپ ﷺ ان کے حق میں دانائے غیب کے اس فیصلہ سے پہلے آگاہ نہ تھے، اس لئے آپ اپنے موجودہ علم کے مطابق اپنے فعل کو صحیح سمجھ رہے تھے۔

دوسرا واقعہ: سب سے پہلی لڑائی میں مسلمانوں کے مال غنیمت حاصل کرنے اور بدر کے قیدیوں سے زرفدیہ قبول کرنے کا ہے، اس وقت تک ظاہر ہے کہ مالِ غنیمت اور فدیہ کا قانون نازل نہیں ہوا تھا کہ ابھی اس کا موقع ہی نہیں آیا تھا، مسلمانوں کو مدینہ منورہ آکر سب سے پہلے سریۂ نخلہ میں مال غنیمت ہاتھ آیا، اس کے بعد ہی بدر کے معرکہ میں پھر مالِ غنیمت ملا اور ساتھ ہی قریش کے ستر قیدی بھی ہاتھ آئے جن میں اکثر مکہ کے دولت مند اور شرفا تھے، ان قیدیوں کی نسبت مسلمانوں کی مختلف رائیں تھیں، بعضے ان کو آگ میں زندہ جلا دینا چاہتے تھے، کچھ لوگ فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینا چاہتے تھے، جس سے ان کو چالیس ہزار درہم ملنے والے تھے، نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ جو قوم مدت سے ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف اٹھاتی رہتی ہے وہ بے کسی، مظلومیت، مغلوبیت اور غربت کے دور سے نکل کر جب پہلے پہل غالب اور دولت مند ہوتی ہے، اور اس کو ملکی اور مالی قوت پر دسترس حاصل ہوتی ہے تو وہ لمحہ اس کی زندگی میں اخلاقی حیثیت سے بڑا ہی نازک ہوتا ہے، غلبہ، قوت اور دولت پا کر بھی اس کے نشہ میں وہ سرشار نہ ہو اور اپنے دل و دماغ پر قابو رکھے، یہ بڑا ہی مشکل کام ہے، جو مظلوم تھا وہ غالب ہو جائے اور جو ظالم تھا وہ مغلوب ہو جائے اور اس وقت ردعمل اپنا کام کر کے مظلوم غالب میں اپنے ظالم مغلوب سے شدید انتقام لینے کا جذبہ نہ پیدا کرے، یہ کوئی آسان کام نہیں، سیاسی و مذہبی تاریخوں میں اس کی متعدد مثالیں موجود

ہیں کہ ایسا نہ ہوسکا، خود عیسائی قوم کو دیکھئے جس نے یہودیوں اور بت پرست رومیوں کے ہاتھوں سے تین صدیوں تک برابر سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں لیکن قسطنطین کے زمانہ میں جب دفعتاً جو مظلوم تھے وہ غالب اور جو ظالم تھے وہ مغلوب ہوگئے، تو عیسوی قوم کا پچھلا جوہر ایک ایک کر کے رخصت ہوگیا اور ان لوگوں نے جو پہلے مظلوم تھے اس نشہ میں چور ہوکر یہودیوں اور رومی بت پرستوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جس سے اخلاق انسانی کی تاریخ آج بھی شرماتی ہے۔

غزوۂ بدر کی غیر متوقع فتح نے مظلوم و بے کس مسلمانوں کے لئے تاریخی دور کا وہی نازک موقع پیدا کردیا، غریب و تنگ دست مسلمانوں کو جو سالہاسال سے کسبِ معاش سے محروم اور معمولی ضروریات کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے ان کو غنیمت اور فدیہ کی دولت ہاتھ آئی اور وہی قریش جن کے ظلم و ستم سے ان کے بدن زخمی اور ان کے سینے داغ دار تھے، وہ دفعتاً مغلوب ہوگئے، ان کے بڑے بڑے سرداران کے ہاتھوں سے لڑائی میں مارے گئے، اور ان کے ہاتھوں میں قید ہوکر ستر سردار صرف ان کے رحم و کرم پر زندہ تھے۔

اب تک مسلمان نہایت یک دلی یک جہتی اور خلوص سے اپنی راہ طے کر رہے تھے، اور یہ اخلاقی جوہر مظلوموں کی برادری میں اکثر پیدا ہوجاتے ہیں لیکن دولت آکر ان کے بجائے ان میں اختلاف تفریق اور حرص و طمع اور رذاتی اغراض کے جذبات پیدا کردیتی ہے اس اتفاقی دولت، اور غیر متوقع فتح و غلبہ نے صحابۂ کرامؓ کے لئے امتحان کا وہی نازک موقع پیش کردیا اور دنیا کے سب سے بڑے رہنما کی قوتِ رہنمائی کے اظہار کا بھی یہی موقع تھا، چنانچہ اس وقت مالِ غنیمت، زرِ فدیہ اور قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق غالب و فاتح مسلمانوں میں اختلاف رائے رونما ہوگیا، آنحضرت ﷺ کے سامنے اس وقت اہم ترین کام تھا، آپ ﷺ نے امر اول کی طرف توجہ فرمائی کہ مظلوم فاتح قوت پاکر اپنا جوہر نہ کھو بیٹھیں، چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے ان قیدیوں کے قتل کی جو تجویز پیش کی تھی آپ ﷺ نے رد فرمادی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تجویز کی فدیہ لے کر ان کو رہا کردیا جائے قبول فرمائی اور ان سے فرمایا کہ اے ابوبکر تمہاری مثال ابراہیمؑ اور عیسیٰؑ کی ہے اور اے عمر تمہاری مثال نوحؑ اور موسیٰؑ کی ہے(۱)، آپ نے حضرت ابراہیمؑ کی نیک دلی اور حضرت عیسیٰؑ کی رحم دلی کی مثال کی پیروی کی اور بدر کے ان قیدیوں کی جان بخشی

(۱) مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۱، کتاب المغازی حیدر آباد دکن۔

فرمائی اور قتل کے بہ جائے زرِفدیہ ادا کردینے پر رہائی کا حکم دے دیا اور جو ان میں نادار تھے ان کو چند مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادینے پر آزادی کا فرمان عطا کردیا اور صحابہؓ کو تاکید کی کہ ان کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کریں، چنانچہ بعضوں کا یہ حال تھا کہ وہ خود کھجور پر قناعت کرتے تھے اور اپنے قیدیوں کو روٹی کھلاتے تھے۔

لیکن وحیِ الٰہی کی نگاہ میں اس سے زیادہ اہم پہلو، ان غریبوں کا دفعتاً مال و دولت کی حرص و طمع میں مبتلا ہوجانا تھا، چنانچہ یہی صورت پیش آئی، مال غنیمت کے فراہم کرنے والوں نے دعویٰ کیا کہ اس پر ہم نے لڑائی میں قبضہ کیا ہے اس لئے ہمارا ہے، لڑنے والے نوجوانوں نے دعویٰ کیا کہ ہماری تلواروں سے فتح حاصل ہوئی ہے اس لئے اس کے اصلی حق دار ہم ہیں، جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کررہے تھے وہ کہتے تھے کہ سب سے نازک اور خطرناک فرض ہمارا تھا اس لئے ہم کو ملنا چاہیے۔(۱) یہی اختلاف زرِفدیہ کی ملکیت کی نسبت بھی ہوا ہوگا جیسا کہ سورۂ انفال کی ابتدائی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ. قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. (انفال ۸:۱)	(اے پیغمبر!) تجھ سے (تیرے ساتھی) غنیمت کا حکم پوچھتے ہیں، تو کہہ دے کہ مال غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا ہے، تو اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو، اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے پوچھا گیا کہ سورۂ انفال کے نزول کی کیا وجہ ہے تو کہا:

فينا اصحاب بدر نزلت حين اختلفنا في النفل وساءت فيه اخلاقنا فنزعه الله من ايدينا فجعله الى رسول الله ﷺ فقسمه رسول الله ﷺ بين المسلمين (۲) عن بواء يقول على السواء.	یہ سورہ ہم بدر والوں کے متعلق نازل ہوئی جب مال غنیمت میں ہم نے باہم اختلاف کیا اور اس میں ہمارے اخلاق برے ہوگئے، تو خدا نے اس کو ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا اور رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں دے دیا تو آپ نے تمام مسلمانوں کے مابین برابر برابر تقسیم فرمادیا۔

(۱) سیرت ابن ہشام، ذکر الفیء ببدر والاساری ج ۱ص ۳۹۱ مطبوعہ محمد علی مصر۔ (۲) سیرت ابن ہشام، ذکر الفیء ببدر والاساری ج ۱ص ۳۹۱و۳۹۲

یہی وہ تنبیہ ہے جو وحی الٰہی نے آنحضرت ﷺ کے اس فیصلہ (۱) پر کی اور آیت اتری:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ. تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ. فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (انفال۸: ۶۷ تا ۶۹)	کسی پیغمبر کو زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں تاکہ زمین میں فساد کرے، تم لوگ دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور دانا ہے، اگر خدا کی طرف سے یوں ہونا مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو تمہارے اس لینے پر تم کو بڑی سزا ملتی تو اب جو تم نے لوٹ میں پایا، حلال و پاک کر کے کھاؤ اور اللہ کا ادب کرو، اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اسی قدر نہیں بلکہ ان قیدیوں کو جن سے زرِ فدیہ وصول ہوا یا وصول کیا جا رہا تھا اس کے بعد ہی یہ تسلی دی گئی:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (انفال۸: ۷۰)	اے پیغمبر! تمہارے ہاتھوں میں جو قیدی ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں نیکی جانے گا تو تم کو اس سے بہتر چیز دے گا جو تم سے لی گئی اور تم کو معاف کرے گا اور اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

بعضوں کو یہ شبہہ ہوا ہے کہ یہ تنبیہ قیدیوں کے زرِ فدیہ لے کر رہا کرنے اور قتل نہ کیے جانے پر ہوئی (۲) حالاں کہ ظاہر ہے کہ جن قیدیوں سے زرِ فدیہ لئے جانے پر اللہ تعالیٰ نے ان سے ہمدردی فرمائی اور اگر وہ حسنِ نیت سے ظاہر کریں تو ان کی مغفرت کا وعدہ اور اس دنیاوی خزف ریزہ سے جو ان سے بہ طور زرِ فدیہ لیا گیا، ان کو بہتر دولت دیے جانے کی امید دلائی، کیا ان کا قتل زرِ فدیہ لینے سے کم سزا ہوتی اور جن سے فدیہ لیا گیا ان کے قتل کیے جانے پر ان کے قاتلوں پر اس سے زیادہ سرزنش اور ان مقتولوں سے اس سے زیادہ ہمدردی نہ کی جاتی۔

بہرحال وہی مالِ غنیمت اور زرِ فدیہ جس کو اس وقت آنحضرت ﷺ نے صاف صریح وحی

---

(۱) سیرت ابن ہشام، ذکر الفیء ببدر والاساری ج ۱ ص ۳۹۱ (۲) مزید تفصیل کے لئے دیکھو سیرۃ النبی جلد اول میں غزوۂ بدر کا بیان ص ۲۲۶ و ۲۲۷ طبع جدید۔

آنے سے پیشتر قبول فرمالیا تھا اور جس پر تنبیہ ہوئی وہ آخر کار ''اجتہاد نبوی'' کے مطابق مناسب موقع پر جائز اور حلال وطیب ہی ٹھہرایا گیا اور غلطی غلطی باقی نہیں رہی، مال غنیمت لینے کے متعلق فَکُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ (انفال ۸: ۶۹) کا حکم اسی وقت آگیا اور فدیہ لینے کی اجازت اِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (محمد ۴۷: ۴) کے الفاظ میں بعد کو مناسب زمانہ میں آگئی اور اس مال ودولت کی حرص وطمع سے اس وقت جو بداخلاقی پیدا ہونے والی تھی اس کا ازالہ ہمیشہ کے لئے اس طرح کر دیا کہ اس کی تقسیم کا ابدی قانون بنا دیا گیا اور اس میں تمام ضروری مستحقین کے حصے لگا دئے گئے۔

تیسرا واقعہ: تیسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ غزوۂ تبوک کے لئے جا رہے تھے جس میں بہ کثرت مسلمانوں کی شرکت کی ضرورت تھی کہ مقابلہ رومیوں کی دل بادل فوج سے تھا اور کسی منظم سلطنت سے ٹکر کھانے کا یہ پہلا موقع مسلمانوں کو پیش آیا تھا اور موسم بھی نہایت گرم اور سخت تھا، تیس ہزار مسلمانوں کی جمعیت روانہ ہوگئی، مگر کچھ مخلص مسلمان مجبوراً چھوٹ گئے اور اکثر منافقین نے جان بوجھ کر اس کی شرکت سے جی چرایا، آپ ﷺ واپس آئے تو عدمِ شرکت کے قصوروار منافقین آ آ کر جھوٹی جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے عذرات بیان کرنے لگے، آپ ﷺ نے ان کا اعتبار کر کے رحم فرما کر ان کے قصور سے درگذر کیا اس پر تنبیہ ہوئی:

سَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا	وہ خدا کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم مقدور رکھتے تو ضرور
مَعَکُمْ یُھْلِکُوْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ	تمہارے ساتھ نکلتے، وہ اپنی جانوں کو برباد کرتے ہیں اور
اِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ. عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ	اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں، اللہ تجھ کو بخشے تو نے ان کو
حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ	رخصت کیوں دی، جب تک تجھ پر وہ کھل نہ جاتے جوان
الْکٰذِبِیْنَ. (توبہ ۹: ۴۲-۴۳)	میں سچ بولے، اور تو جان لیتا جھوٹ بولنے والوں کو۔

ظاہر ہے کہ آپ ﷺ علمِ غیب سے آگاہ نہ تھے اور ان کے واقعی حالات سے بے خبر تھے اس لئے بہ ظاہر ان کے قول پر اعتبار ہی کرنا تھا اور وہی آپ ﷺ نے کیا مگر علام الغیوب نے حقیقتِ حال سے باخبر فرما کر ان کے جھوٹ کا پردہ چاک کیا بہر حال یہاں بھی منشائے خطا اگر خطا سمجھی جائے تو وہی ترحم کی شان تھی۔

چوتھا واقعہ: منافقین کی نسبت آپ ﷺ کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ ان کے حق میں

آپ ﷺ کی دعائے مغفرت قبول نہ ہوگی اور فرما دیا گیا تھا کہ:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (توبہ۹:۸۰)	تو ان کی مغفرت کی دعا مانگے یا نہ مانگے اگر ستر دفعہ بھی ان کی مغفرت کی دعا مانگے تو ہرگز ان کو خدا نہ بخشے گا یہ اس لئے کہ انہوں نے خدا کا اور اس کے رسول کا انکار کیا۔

اس حکم کے آنے کے بعد عبداللہ بن ابی بن سلول کا انتقال ہوا، یہ منافقوں کا سردار تھا اس کا لڑکا مخلص مسلمان تھا، اس نے آکر آپ ﷺ سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی، جس کو آپ فرطِ کرم سے رد نہ فرما سکے، حضرت عمرؓ نے عرض بھی کی کہ یا رسول اللہ! اس کے عدمِ مغفرت کے متعلق تو حکم ہو چکا ہے، فرمایا میں ستر دفعہ سے بھی زیادہ اس کی مغفرت کی دعا مانگوں گا، بہر حال آیتِ بالا میں گو آپ ﷺ کے مغفرت مانگنے اور نہ مانگنے دونوں کو بیکار و بے سود بتایا گیا تھا، مگر ان کے حق میں سرے سے دعائے مغفرت نہ مانگنے کی کوئی ممانعت نہ تھی، اس لئے آنحضرت ﷺ نے غایت شفقت سے اس بے کار فرض کو انجام دیا تا کہ اس کے مخلص مسلمان فرزند کی دل شکنی نہ ہو اور اس سے تغافل فرمایا کہ ایک مسلمان کی دل جوئی تو ہوگی مگر بیسیوں منافقین کو اپنے چھپانے میں کامیابی ہو جائے گی اور وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر فتنوں کا باعث بنیں گے، اس لئے حکم ہوا:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ (توبہ۹: ۸۴)	اور نہ کبھی ان میں سے کسی کے جنازہ کی نماز پڑھ اور نہ اس کی قبر پر کھڑا ہو، بے شک انہوں نے خدا اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اسی گنہ گاری کی حالت میں مرے۔

پانچواں واقعہ: اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی بعض بیویوں کی خوشنودی اور رضا مندی کے لئے کسی مباح چیز کو جو آپ ﷺ کو بہت مرغوب تھی اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، یعنی اس کے کبھی نہ استعمال کرنے کا عہد فرما لیا تھا، ظاہر ہے کہ ہر شخص پر مباح چیز کا کھانا فرض نہیں، اس کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خوشی سے یا کسی دوسرے کی رضا مندی کے لئے اس کے نہ کھانے کا عہد کر لے، اس لئے اگر آنحضرت ﷺ نے اپنی بعض بیویوں کی خاطر جن کو وہ شے پسند نہ تھی اس کو اپنے اوپر حرام کر لیا تو ظاہر ہے کہ آپ کا اپنی بعض بیویوں کی خاطر داری کے لئے ایسا کرنا الزام کے قابل نہیں کہ آپ ﷺ نے بہ حیثیت شوہر کے ان کی اتنی دل جوئی کو بھی عورتوں کے ساتھ عدل و انصاف

کے مناسب سمجھا، مگراس مسئلہ کی ایک دوسری حیثیت بھی تھی، اور وہ یہ کہ بہ حیثیت ایک پیغمبر کے ایک حلال و جائز چیز کو اپنے اوپر حرام کرلیا، اوراس کے نہ کھانے کا عہد کرنے سے آپ ﷺ کی اقتدا میں امت کے عام افراد بھی اس کو ناجائز نہیں تو ناپسند ضرور ہی کرتے، اور یہ ایک طرح سے شریعتِ الٰہی میں تبدیل وتحریف کا مرادف ہوجاتا، اس لئے حکم آیا کہ ان امور میں پیغمبر کو کسی کی دل جوئی اور خاطر داری کی پروانہ کرنی چاہیے، فرمایا:

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِکَ وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (تحریم ۶۶:۱)	اے پیغمبر! جس کو اللہ نے تیرے لئے حلال کیا ہے اس کو حرام کیوں کرتا ہے، اپنی بیویوں کی مرضی چاہتا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا آپ ﷺ کو نبی کہہ کر خطاب کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ بہ حیثیت ایک انسان اور شوہر ہونے کے آپ ﷺ ایسا کرسکتے تھے مگر پیغمبر کی حیثیت سے آپ ﷺ کو یہ اختیار نہیں۔

الغرض یہی وہ پانچ واقعے ہیں جن میں آپ ﷺ کی اجتہادی خطا ثابت کی گئی ہے، مگر تفصیلات سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ان کو خطا کہنا درحقیقت مجاز ہے کہ پیغمبر کی بلندی اور معصومی کو پیشِ نظر رکھ کر اس کو اس مجازی خطا کی بھی اجازت نہیں اور اسی وحیِ الٰہی نے ان میں سے ہر موقع پر تنبیہ کی اور اپنے صحیح فیصلہ سے رہنمائی فرمائی، اب کیا کسی کا شبہہ یہ بھی ہے کہ جس طرح آنحضرت ﷺ کو یہ معمولی مسامحات پیش آئے جن کی تنبیہ واصلاح بروقت وحیِ الٰہی نے کی، ایسے ہی ممکن ہے کہ آپ ﷺ کو اور بھی ایسے مسامحات پیش آئے ہوں جن کی تنبیہ وتصحیح کی حکمتِ الٰہی نے پروانہ کی اور خاموشی برتی، اگر کسی کو یہ شبہہ ہے تو درحقیقت رسالت ونبوت کی مرتبہ شناسی اور دین الٰہی وشریعتِ ربانی کی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کے طرقِ رشد وہدایت کی معرفت سے کوسوں دور ہے، رسولوں کی بعثت اس لئے ہے کہ وہ غلط کار انسانوں کو ان کی غلطی سے نکال کر حق وصواب کی تعلیم دیں، نہ اس لئے کہ ان کے ذریعہ الٹے ہدایت کے بہ جائے مزید ضلالت کا اضافہ ہو، استغفر اللہ ثم استغفر اللہ، اس لئے ناممکن ہے کہ رسولوں کے ہاتھوں اور زبانوں سے کوئی ایسا کام صادر ہو جو حکمتِ الٰہی کے مطابق نہ ہو اور پھر وہ اس کی تصحیح اور رہنمائی سے تغافل برتے اور انسانوں کو اپنے رسولوں کے ذریعہ گمراہ ہونے دے۔

پیغمبرانہ اجتہاد ورائے، علم کا وہ کوثر ہے جس کی دھاریں دماغ سے نہیں بلکہ دل کے سرچشمہ سے بہتی ہیں جو انسانی رائے و تجربہ سے نہیں بلکہ الہامِ الٰہی، القائے ربانی، حکمتِ یزدانی، فہمِ رسالت، ملکۂ نبوت سے ماخوذ ہے اور جس کی نسبت محرمِ اسرارِ شریعت عمر فاروقؓ برسرِ منبر فرماتے ہیں:

یا ایھا الناس ان الرای انما کان من رسول اللہ ﷺ مصیبا لان اللہ کان یریہ وانما ھو منا الظن و التکلف.

(ابوداؤد کتاب الاقضیۃ، باب فی قضاء القاضی اذا اخطا ج۲ص۵۷)

اے لوگو! آنحضرت ﷺ کی رائے غلطی سے پاک تھی کیوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو وہ رائے دکھاتا تھا اور ہماری رائے ہمارا گمان اور از خود کہنا ہے۔

وہ رائے نبوی ﷺ جو خدا کے بتانے اور دکھانے سے قائم ہوئی ہو، ظاہر ہے کہ بہ منزلہ وحی کے ہے اور اس کا نام بشری اجتہاد اور انسانی رائے نہیں، بلکہ نبوی اجتہاد اور پیغمبرانہ رائے ہے، جو عملاً وحیِ الٰہی کی ہم مرتبہ اور کلام ربانی کی ہم پایہ ہے، حضرت عمرؓ نے اس خطبہ میں جو کچھ کہا ہے، درحقیقت وہ خود کلام پاک سے مستنبط ہے، قرآن پاک میں ہے:

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰکَ اللّٰہُ وَلَا تَکُنۡ لِّلۡخَآئِنِیۡنَ خَصِیۡمًا. (نساء۴: ۵۱)

ہم نے تجھ پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری تاکہ لوگوں کے درمیان جو اللہ تجھ کو سوجھائے فیصلہ کرے اور تو نہ ہو دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو جو دکھایا، سوجھایا اور رائے پیدا کرائی جاتی تھی وہ خدا کی طرف سے ہوتی تھی، یہی پیغمبرانہ رائے ہے جس کی نسبت خود آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

انی انما اقضی بینکم برائی فیما لم ینزل علیّ فیہ (ایضا حوالہ سابق)

میں تم لوگوں کے درمیان اس مسئلہ میں جس کی نسبت مجھ پر وحی نہیں ہوئی اپنی رائے سے فیصلہ کرتا ہوں۔

یہ فیصلہ اگر غلط ہوتا تو فوراً وحی الٰہی دست گیری کرتی اور صحیح راستہ پر لے آتی جیسا کہ گذشتہ پانچوں واقعات سے ظاہر ہے۔

ایک غلط استدلال: اس آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقدمات کے فیصلوں میں آپ ﷺ کو ''ارائتِ الٰہی'' ہوتی تھی یعنی خدا کی طرف سے آپ کو رائے سوجھائی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ ارائتِ الٰہی (خدا کی طرف سے سمجھایا جانا) تا کہ آپ کتابِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں غلط نہیں ہوسکتی، لیکن ابوداؤد وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اہلِ مقدمہ سے فرمایا:

''میں ایک بشر ہوں تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو اور شاید تم میں سے بعض زیادہ زبان آور ہوں جو اپنی دلیل کو خوبی سے بیان کر سکتے ہوں، تو میں جیسا سنتا ہوں ویسا فیصلہ کر دیتا ہوں، تو میں اگر کسی کو وہ حق دلا دوں جو اس کا نہیں بلکہ اس کے بھائی کا ہے تو وہ نہ لے کہ میں اس کو آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔'' (کتاب الاقضیہ، باب فی قضاء القاضی ج ۲ ص ۵۷)

اس سے ایک غلط فہم یہ استدلال کرسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے فیصلے ہمیشہ غلطی سے پاک نہیں ہوتے تھے اس لئے امت آپ ﷺ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی پر مجبور نہیں، لیکن ایسا خیال کرنا سراسر مغالطہ ہے، اصل یہ ہے کہ مقدمات میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک واقعہ کی اصلی روداد جس کو ہر مدعی اور مدعا علیہ اپنے دعویٰ کے مطابق بنا کر اپنے اپنے رنگ میں بیان کرتا ہے، اس کے بعد دوسری چیز اس بیان کردہ روداد کے مطابق صحیح اور عادلانہ حکم اور فیصلہ ہے جو تمام تر مقدمہ کی اس روداد پر مبنی ہوتا ہے جو حاکم وقاضی کے سامنے بیانات اور شہادتوں کے ساتھ پیش ہوتی ہے، یہ بات کہ واقعہ کی اصلی روداد کیا ہے، اور ان میں سے کون صحیح کہہ رہا ہے، علمِ غیب سے تعلق رکھتی ہے جس کا دعویٰ کسی نبی کو نہیں اور اگر ہو بھی تو یہ دعویٰ بہ جائے خود مسلم ہے کہ قاضی کا ذاتی علم دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کا مبنیٰ نہیں قرار پاسکتا، اس کے لئے فریقین کے بیانات، شہادتیں اور دلائل ہی بہ کار آمد ہیں، آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امرِ اول کے متعلق عموماً آپ ﷺ کو غیب کا علم عطا نہیں ہوا لیکن دوسری چیز یعنی جس روداد کو آنحضرت ﷺ نے صحیح باور کیا اس کے مطابق آپ ﷺ کا فیصلہ کبھی کبھی صحیح وصواب اور عادلانہ نہیں ہوتا تھا، یہ کہنا رسول ونبی کی شان کی توہین وتحقیر ہے اور اس ''ارائتِ الٰہی'' کے خلاف ہے، جس کا شرف مقدمات کے فیصلہ میں آپ ﷺ کو بخشا جاتا تھا اس لئے جو غلطی فیصلوں میں آپ ﷺ سے ہوسکتی تھی، وہ فریقین میں سے کسی ایک کی دلیل وشہادت کو سن کر اس کے صحیح یا غلط مطابقِ واقعہ یا مخالفِ واقعہ سمجھنے میں لیکن جس کو آپ ﷺ نے صحیح باور فرمالیا اس کے

مطابق مناسب و صحیح حکم و فیصلہ کرنے میں آپ ﷺ سے کبھی غلطی نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی، اور امت آپ ﷺ کی پیروی آپ ﷺ کے ان قضایا اور فیصلوں میں کرتی ہے نہ کہ نزاع مذکور کے گذشتہ واقعات اور گذشتہ مقدمات کے صحیح یا غلط باور کرنے میں فشتان بینهما.

آنحضرت ﷺ کے اس اعلان میں یہ نکتہ ہے کہ شاید فریقین میں سے کوئی غلط بیان یا بر باطل جو اپنے مقدمہ کی روداد زیادہ خوبی سے بنا کر، آپ ﷺ کی عدالت سے موافق فیصلہ حاصل کرلے، یہ سمجھے کہ گو حقیقت میں میرا حق نہ تھا لیکن جب عدالتِ نبوی ﷺ نے میرے حق میں فیصلہ کردیا تو میری ملکیت ثابت ہوگئی، اور غصب حق کے گناہ سے برأت ہوگئی تو اس کا ایسا سمجھنا صحیح نہ ہوگا، گو قانوناً حکم نافذ ہوجائے گا مگر عند اللہ جو برسرِ حق تھا وہ حق ہی رہے گا، اور جو برسرِ باطل تھا وہ باطل ہی رہے گا، اور جو اصل مالک تھا وہی مالک رہے گا اور جو غاصب ہے وہ غاصب ہی ٹھہرے گا، اسی اعلان کا اثر تھا کہ جب آنحضرت ﷺ نے ایک مقدمہ میں فریقین کو اس حقیقت سے مطلع فرمایا تو دونوں رو پڑے اور دونوں ایک دوسرے کے حق میں دست بردار ہونے پر آمادہ ہوگئے۔(۱)

آنحضرت ﷺ رودادِ مقدمہ کو سامنے رکھ کر جو فیصلے فرماتے تھے وہ تمام تر حق، منصفانہ اور صحیح ہوتے تھے اور ان کی اطاعت سے انحراف، کفر و نفاق تھا، اسی لئے ارشاد ہوا کہ:

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا. (نساء۴: ۶۵)	سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے جب تک وہ تجھ کو حکم نہ مانیں، پھر اپنے دلوں میں تیرے فیصلے سے تنگی نہ پائیں اور مان کر قبول کریں۔
وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا. (احزاب ۳۳: ۳۶)	اور کسی ایمان دار مرد یا عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کردے تو بھی اس کو اپنے کام کا اختیار رہے اور جو خدا اور اس کے رسول کے بے حکم چلا وہ صریح گمراہ ہوا۔

کیا امت کو رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلہ کے بے چون و چرا قبول کرلینے کا خدا کی طرف سے تاکیدی حکم، برسرِ باطل پہلو پر ہوسکتا ہے؟ چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تصریح کردی گئی ہے کہ آپ ﷺ کا کوئی فیصلہ کبھی ظالمانہ اور غلط نہیں ہوسکتا:

(۱) ابوداؤد، کتاب الاقضیة، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ ج ۲ ص ۵۷

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ. وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ. اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ رَسُوْلُهٗ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. (نور۲۴: ۴۸-۵۰)

اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تا کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کردے تو ان میں کا ایک گروہ منہ پھیر لیتے ہیں اور اگر ان کو کوئی حق پہنچتا ہو تو قبول کر کے چلے آئیں کیا ان کے دلوں میں روگ ہے یا یہ شک میں پڑے ہیں یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کرے گا بلکہ وہ ہی بے انصاف ہیں۔

عقلِ بشری: اس میں بھی شک نہیں کہ وحی اور ملکۂ نبوت کے علاوہ نبی میں نبوت و رسالت کے فرائض سے باہر کی چیزوں میں اس کی عقل وہی ہوتی ہے جو عام انسانوں کی ہوتی ہے اور جس میں اجتہادی غلطی کا ہر وقت امکان ہے، شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک اجتہاد کی یہی وہ دوسری قسم ہے جس میں نبی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے کہ اس کا مدار وحی و الہام اور ملکۂ نبوت پر نہیں بلکہ انسانی علم و تجربہ پر ہوتا ہے اور یہی وہ قسم ہے جس کا اتباع پیرووں پر واجب نہیں اور اس کی بہترین مثال کھجور کی کاشت کا واقعہ ہے۔(۱)

صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ کے بعض باغوں میں گذرے تو دیکھا کہ کچھ لوگ کھجوروں کے درختوں پر چڑھ کر کچھ کر رہے ہیں، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا کر رہے ہیں، ایک ہم راہی نے کہا کہ یہ مادہ کھجوروں میں نر کھجوروں کے پھول ڈالتے ہیں کہ پھل زیادہ آئیں فرمایا میں تو نہیں سمجھتا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوگا؟ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اگر ایسا نہ کرتے تو بہتر ہوتا، اس نے جا کر باغ والوں سے آپ ﷺ کا یہ فقرہ بیان کر دیا، صحابہؓ نے جو سرتاپا اطاعت تھے اس پر عمل کیا اور ایسا کرنا چھوڑ دیا، پھل اس سال کم آئے یا کم ٹھہرے آپ ﷺ کا پھر گذر ہوا تو ان لوگوں نے صورت حال عرض کی، آپ ﷺ نے فرمایا میں نے تو یوں ہی ایک بات سمجھ سے کہہ دی تھی، اگر ان کو اس عمل سے فائدہ ہوتا ہے تو کریں، پھر فرمایا:

انما انا بشر اذا امرتکم بشیء من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشیء من رائی فانما انا بشر.

میں تو ایک آدمی ہی ہوں جب تمہارے دین کا کوئی حکم دوں تو اس کو قبول کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک آدمی ہوں۔

---

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ باب بیان اقسام علوم النبی ج ۱ ص ۲۰۱ پر اس کی تشریح موجود ہے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

انتم اعلم بامر دنیاکم. تم اپنے دنیا کے کام کو زیادہ جانتے ہو۔

تیسری روایت کے یہ الفاظ ہیں: (۱)

انما ظننت ظنا فلا تاخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئا فخذوہ بہ فانی لن اکذب علی اللہ.

میں نے ایک گمان سا کیا تھا گمان پر مجھ کو نہ پکڑو، ہاں جب خدا کی طرف سے کوئی بات کہوں تو اس کو لو کہ میں خدا پر جھوٹ نہ کہوں گا۔

ان تینوں روایتوں میں آپ ﷺ نے اپنے اس ارشاد کو ظن (گمان) رائے اور امر دنیا سے تعبیر فرمایا ہے، اس سے یہ کلیہ سمجھ میں آتا ہے کہ امورِ دین و شریعت میں آپ ﷺ کا ہر حکم واجب اور من جانب اللہ ہے لیکن کھیتی باڑی، علاج و معالجہ وغیرہ خالص دنیاوی امور میں اگر آپ ﷺ نے کچھ کہا ہے تو اس کی حیثیت فقط مشورہ اور رائے کی ہے، یہی سبب ہے کہ صحابہ کرامؓ جن باتوں میں اپنا مشورہ آپ ﷺ کو دینا چاہتے تھے، پوچھ لیتے تھے کہ یارسول اللہ! یہ وحی سے ہے یا رائے ہے، آپ ﷺ جب فرمادیتے تھے کہ رائے سے ہے تو وہ اپنا مشورہ پیش کرتے اور آپ ﷺ پسند فرماتے تو قبول فرماتے، غزوہ بدر میں آپ ﷺ نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہا ایک صحابیؓ نے آکر عرض کی یارسول اللہ ﷺ! اس مقام کا انتخاب وحی سے ہے یا رائے سے ہے، فرمایا محض رائے ہے تو عرض کی کہ جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام بہتر نہیں، فلاں مقام بہتر ہے، آپ ﷺ نے ان کی رائے پسند کی اور اس پر عمل فرمایا، اسی طرح صلح و جنگ اور حکومت کے دوسرے معاملات میں بھی صحابہؓ سے مشورہ لیا اور عمل فرمایا ہے اور اسی میں خود حضور ﷺ کو وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران ۳:۱۵۹) یعنی امور حکومت یا عام امور میں صحابہ سے مشورہ لے لو،" کا حکم خدا کی طرف سے ہے، چنانچہ غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے میں سلمان فارسیؓ کی رائے پر عمل کیا، (۲) لیکن امورِ جنگ و سیاست میں بھی جس بات کا حکم عقلِ بشری سے نہیں بلکہ وحیِ الٰہی یا فہمِ نبوی سے ہوا تھا اس میں آپ ﷺ نے نہ کسی سے مشورہ لیا اور نہ کسی کے مشورے کو قبول فرمایا، صلحِ حدیبیہ کے شرائط اور دفعات جو سراسر مصلحتِ الٰہی اور حکمتِ ربانی پر مبنی تھے ان کے بدلنے پر حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ نے کیا کیا زور نہیں لگایا

(۱) یہ تینوں روایتیں صحیح مسلم کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قالہ شرعا دون ما ذکرہ (ﷺ) من معائش الدنیا علی سبیل الرای، ج ۲ ص ۵۰۳ مصر۔ (۲) سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۶۱، کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۷۶، والبدایۃ والنھایۃ ج ۴ ص ۹۵۔

مگر آنحضرت ﷺ نے کچھ التفات نہ فرمایا اور آخر مستقبل نے بتادیا کہ فہمِ نبوت سراسر صحیح تھی، اسی طرح غزوۂ اُحد جیسے نازک موقع پر عبداللہ بن ابی کا تین سو آدمیوں کے ساتھ پھر جانا گوارا کیا مگر مدینہ سے باہر جا کر صف آرا ہونے سے باز نہ آئے اور پھر مستقبل نے مصلحتِ الٰہی کے راز کو فاش کیا۔

ایک ادنیٰ سا تامل عقلی حیثیت سے بھی یہ راز بتادے گا کہ دنیا میں ہر صاحبِ فن کی ایک نہیں دو عقلیں ہوتی ہیں، ایک اس فن کے متعلق جس کی استعداد اس کے اندر رکھی جاتی ہے، اور پھر تعلیم و تربیت، مشق اور کثرتِ عمل سے وہ اتنی بلند اور پختہ ہوجاتی ہے کہ وہ اس فن کے بڑے بڑے عمیق اور مشکل دقائق کو ایک نظر میں معلوم کرلیتی ہے اور اس کے لاینحل عقدوں کو اشاروں میں حل کردیتی ہے، لیکن اس دائرہ کے باہر اس کی دوسری عقل عام انسانوں ہی کی طرح معمولی ہوتی ہے، ایک شخص جو فنِ تعمیر کی مہارت اور ہندسہ اور انجینیرنگ کی صناعی میں غیر معمولی عقل و ذہانت رکھتا ہے، بالکل ممکن ہے کہ کھجور کی کاشت میں اس کی عقل معمولی انسانوں سے بھی کم درجہ ہو، ایک فلسفی جو اپنے زورِ فکر سے افلاطون و ارسطو کی غلطیاں نکالتا ہو وہ تعمیر کے فن میں ایک معمولی مزدور سے بھی زیادہ کم عقل ہو، یہ روزمرہ کی پیش آنے والی مثالیں ہیں، اسی طرح وہ برگزیدہ انسان جو روحانیات کے اسرار، معرفتِ ربانی کے حقائق، تزکیۂ نفس کے رموز، اخلاق و معاشرت کے آداب اور حقوق و شریعت کے مسائل میں دقیقہ رس فہم اور نکتہ داں عقل رکھتا ہو، اس کو تعمیر و کاشت کاری کے مسائل میں محض معمولی درک ہو بلکہ بالکل نہ ہو۔

اسی طرح انبیا علیہم السلام امورِ دین و شریعت میں وحی اور ملکۂ نبوت سے جو کچھ فرماتے ہیں وہ عین مصلحت، عین حکمت، خطا اور غلطی سے سرتاپا مبرا اور پاک ہوتا ہے، لیکن دوسرے امور مثلاً پہننے اوڑھنے، کھانے پینے، رہنے سہنے، سلطنت و سیاست، نظم و نسق، صلح و جنگ، سامان و اسلحہ، مرکب و سواری، صنعت و حرفت، طب و علاج وغیرہ دنیاوی امور کی نسبت کلی مصلحتیں بتا کر جزئیات کی تفصیل سے انہوں نے احتراز فرمایا اور کسی قطعی فیصلہ کا مسلمانوں کو پابند نہیں کیا، پہننے اوڑھنے کے متعلق صرف تین باتیں فرمائیں، پہلی یہ کہ وہ لباس اور طرزِ لباس نہ اختیار کیا جائے جس سے سترِ عورت نہ ہو، دوسری یہ کہ مرد وہ لباس اختیار نہ کریں جو عورتوں کے لئے زیبا ہے، نہ عورتیں وہ لباس اختیار کریں جو مردوں کے لئے مناسب ہے، تیسری بات یہ ہے کہ وہ لباس پسندیدہ نہیں جس سے غرور و نخوت نمایاں ہو، کھانے پینے میں چند حرام چیزوں کے سوا کسی کی ممانعت نہیں، نظم و نسق اور نظامِ حکومت و

سلطنت میں چند کلی اصول تعلیم فرمائے، شہنشاہانہ اور جابرانہ حکومت نہ ہو، لوگوں میں مساوات ہو اور اہم امور میں اہلِ حل وعقد کا باہمی مشورہ ہو، وعلیٰ ہذا القیاس۔

الغرض یہی وہ امور ہیں جن میں زمانہ اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تغیر وانقلاب ہوتا ہے اس لئے ان کو ہمیشہ کے لئے محدود کر دینا مصلحتِ الٰہی کے خلاف تھا۔

ملکۂ نبوت یا عقلِ نبوت کا شرعی ثبوت: گزشتہ مباحث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ نبی میں علم وفہم کے تین ذریعے ہیں، وحی، ملکۂ نبوت اور عام عقلِ بشری، ان میں سے اول وآخر کے ثبوت کے لئے اب کسی استدلال کی ضرورت نہیں کہ اول تو یہ مسلمات سے ہیں اور دوسرے اوپر کی تشریحات میں مستقل طور سے ان پر بحثیں ہو چکی ہیں لیکن اب تک ہم نے دوسری چیز یعنی ملکۂ نبوت کے لئے کوئی شرعی دلیل پیش نہیں کی ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ کہنی ہے کہ جن علما نے اس کی حقیقت ظاہر کی ہے انہوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کے لئے الگ الگ اصطلاحیں قائم کی ہیں، مگر مفہوم ومعنی کے لحاظ سے وہ دراصل ایک ہیں، سلفِ صالحین میں سے بعض نے اس کو القاقی الروع (دل میں ڈالنا) نبی کی حکمتِ قلبیہ، توفیقِ ازلی اور قوتِ تبیین سے تعبیر کیا ہے، (۱) امام غزالی وامام رازی اور دوسرے متکلمین نے اس کو ملکۂ نبوت سے ادا کیا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب اور علمائے اصول نے اس کو پیغمبرانہ قوتِ اجتہاد کہا ہے اور صوفیہ کی عام پسند اصطلاح میں اس کو علمِ لدنی کہا جاتا ہے مگر ان سب کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں، یعنی نبی کے اندر کی وہ پیغمبرانہ عقلی قوت جو بشری عقل سے فوق ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ وحی کی تشریح، اسرار شریعت کا بیان اور دقائق حکمت کی اپنی زبان سے توضیح کرتا ہے۔

انبیائے کرام کے ان ربانی انعامات کی فہرست پڑھیے جن کا تذکرہ قرآن نے جابجا کیا ہے تو وحی کی مخصوص نعمت کے بعد فہرست میں جو چیز نظر آئے گی وہ علمِ نبوت ہے، جس کو کہیں ذکر (یادداشت) کہیں حکم (حق وباطل میں تمیز کا ملکہ) کہیں حکمت (دانائی) کہیں شرح صدر (سینہ کا کھول دینا) کہیں تفہیم (سوجھ بوجھ دینا) کہیں تعلیم (سکھادینا) کہیں ارائت (دکھادینا، سوجھادینا) کہا گیا ہے۔ ان سب مختلف الفاظ کا مفہوم وحی سے نیچے اور عقل بشری سے اوپر عقل نبوی کے سوا اور کیا ہے، ان سے مراد وحی ہے، اس لئے نہیں کہ ان کا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے، اور عقلِ بشری اس لئے

(۱) یہ تمام الفاظ امام شافعی کی کتاب الرسالہ میں مذکور ہیں۔

نہیں کہ عقلِ بشری خاص نبی پر کوئی انعام نہیں کہ یہ نعمت تو ہر انسان کو کچھ نہ کچھ ملی ہے اس بنا پر اس سے مراد عقلِ نبوی اور حکمت نبوی کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔

حکمت: انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں ان میں ایک خاص نعمت کا ذکر قرآن پاک میں بار بار آتا ہے اور وہ حکمت ہے، آل ابراہیمؑ پر اللہ تعالیٰ نے جو احسانات کیے ان کا ذکر وہ ان الفاظ میں فرماتا ہے:

۱۔ فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَاٰتَیْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِیْمًا۔ (نساء۴: ۵۴)	۱۔ تو بے شبہ ہم نے ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو بڑی سلطنت بخشی۔

حضرت لقمانؑ کی نسبت ہے:

۲۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ (لقمان۳۱: ۱۲)	۲۔ اور یقیناً ہم نے لقمان کو حکمت دی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی شان میں ہے:

۳۔ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَیْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَ فَصْلَ الْخِطَابِ۔ (ص ۳۸: ۲۰)	۳۔ اور ہم نے داؤد کی سلطنت مضبوط کی اور اس کو حکمت اور قول فیصل عطا کیا۔
۴۔ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا یَشَآءُ (بقرہ۲: ۲۵۱)	۴۔ اور داؤد نے جالوت کو مارا اور خدا نے داؤد کو سلطنت اور حکمت بخشی اور جو چاہتا ہے اس میں سے کچھ سکھایا۔

حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں:

۵۔ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَیِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ (زخرف۴۳: ۶۳)	۵۔ میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔

خود اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ پر اپنا احسان جتاتا ہے تو فرماتا ہے:

۶۔ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ (مائدہ۵: ۱۱۰)	۶۔ اور (یاد کر) جب میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل کی تعلیم دی۔

عام انبیاء کے متعلق ہے:

۷۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ (آل عمران۳: ۸۱)	۷۔ اور جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لیا کہ جو میں تم کو کوئی کتاب اور حکمت دوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کے ظہور کی یہ دعا مانگی:

۸۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ. إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ. (بقرہ۲:۱۲۹)

۸۔ ہمارے پروردگار! اور ان میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیج جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور کتاب و حکمت سکھائے اور ان کو سنوارے بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی:

۹۔ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ. (بقرہ۲: ۱۵۱)

۹۔ جس طرح ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں سناتا اور تم کو سنوارتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

اس دعائے ابراہیمی کے مطابق آنحضرت ﷺ کے ظہور کا احسان اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں ہم پر جتایا ہے:

۱۰۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ. (آل عمران۳: ۱۶۴)

۱۰۔ یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہی احسان ان ہی الفاظ میں سورہ جمعہ میں دہرایا ہے:

۱۱۔ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ. (جمعہ۶۲:۲)

۱۱۔ وہی اللہ جس نے ان پڑھ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو پاک وصاف کرتا ہے اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

خود آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے اپنا یہ احسان ان پر ظاہر فرمایا ہے:

۱۲۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ أَنْ يُّضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّونَكَ مِنْ شَيْءٍ وَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا. (نساء۴:۱۱۳)

۱۲۔ اور اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک جماعت ارادہ کر چکی تھی کہ وہ تجھے گمراہ کر دے اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے، خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے:

۱۳۔ ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰیٓ اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَۃِ (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۹)

۱۳۔ یہ وہ ہے جو خدا نے حکمت کی باتوں میں سے تم پر وحی کی ہے۔

عام مسلمانوں سے ارشاد ہے:

۱۴۔ وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنَ الْکِتٰبِ وَ الْحِکْمَۃِ یَعِظُکُمْ بِہٖ (بقرہ ۲: ۲۳۱)

۱۴۔ اور اللہ کا جو احسان تم پر ہے اور اس نے تم پر جو کتاب اور حکمت اتاری ہے ان کو یاد کرو خدا تم کو اس سے سمجھاتا ہے۔

خاص طور پر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو خطاب ہے:

۱۵۔ وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَ الْحِکْمَۃِ (احزاب ۳۳: ۳۴)

۱۵۔ اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں ان کو یاد رکھو۔

یہ نعمت حسبِ استعداد عام مسلمانوں کو بھی ملا کرتی ہے:

۱۶۔ یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا (بقرہ ۲: ۲۶۹)

۱۶۔ اور خدا جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جس کو حکمت بخشی گئی اس کو بڑی دولت (بھلائی) دی گئی۔

اسی کے ذریعہ تبلیغ و دعوت کا حکم بھی ہوتا ہے:

۱۷۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (نحل ۱۶: ۱۲۵)

۱۷۔ اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف تو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے عمدہ طریقہ سے مناظرہ کر۔

ایک جگہ قیامت اور عبرت کے واقعات پر حکمت کا اطلاق ہوا ہے:

۱۸۔ وَلَقَدْ جَآءَھُمْ مِّنَ الْاَنْبَآءِ مَافِیْہِ مُزْدَجَرٌ. حِکْمَۃٌ بَالِغَۃٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ. (قمر ۵۴: ۴، ۵)

۱۸۔ اور ان کو اتنے احوال جتنے میں ڈانٹ ہوسکتی ہے پہنچ چکے ہیں، موثر حکمت، تو ان کو ڈر سنانے والے فائدہ نہیں پہنچا سکے۔

اوپر کی سطروں میں وہ تمام آیتیں لکھ دی گئی ہیں جن میں حکمت کا لفظ آیا ہے، ان میں کہیں "حکمت" کا لفظ تنہا آیا ہے اور کہیں کتاب کے بعد آیا ہے، کتاب کے دو معنی قرآن میں ہیں ایک

صحیفۂ ربانی اور یہ اکثر آیا ہے اور دوسرے نوشتۂ الٰہی اور علمِ الٰہی جیسے لَوْلَا کِتَابٌ مِّنَ اللّٰہِ سَبَقَ (انفال ۸: ۶۸) (اگر خدا کا نوشتہ یا علم پہلے نہ ہوتا) مذکورہ بالا آیتوں میں تو کتاب سے بے شبہہ آسمانی کتاب اور صحیفۂ ربانی یا یوں کہو کہ وحیِ کتابی مراد ہے، جیسے تورات و قرآن وغیرہ، لیکن حکمت کا مفہوم ان آیتوں میں کیا ہے؟

حکمت کے لغوی معنی دانائی کی بات اور کام کے ہیں مگر یہاں اس سے کیا مقصود ہے اس تحقیق کے لئے ضرورت ہے کہ مستند اہلِ لغت اور ماہرین قرآن کے اقوال نقل کر کے تبصرہ کیا جائے، سب سے قدیم لغت نویس ابن درید المتوفی ۳۲۱ ہجری اپنی کتاب جمہرۃ اللغۃ میں حکمت کے حسب ذیل معنی لکھتا ہے:

فکل کلمة وعظتک او زجرتک او دعتک الی مکرمة او نهتک من قبیح فهی حکمة وحکم. (جلد۲ص۱۸۶حیدرآباد۱۳۴۵ھ)

ہر وہ بات جو تجھ کو سمجھائے یا تجھ کو تنبیہ کرے یا کسی اچھی خصلت کی طرف بلائے یا کسی بری چیز سے روکے وہ حکمت اور حکم ہے۔

لغت کا امام جوہری، اپنی صحاح اللغۃ میں لکھتا ہے:

الحکمة من العلم و الحکیم العالم و صاحب الحکمة و الحکیم المتقن للامور، (جلد۲ص۶۲۷مصر)

حکمت یعنی علم اور حکیم یعنی عالم اور حکمت والا، اور حکیم کاموں کو بخوبی کرنے والا۔

عربی لغت کی مبسوط و مستند کتاب لسان العرب میں ہے:

و الحکمة عبارة عن معرفة افضل الاشیاء بافضل العلوم. (ج۱۵ص۳۰مصر)

اور حکمت بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعہ سے جاننے کو کہتے ہیں۔

لغات قرآن کے مشہور امام راغب اصفہانی، مفردات القرآن میں کہتے ہیں:

والحکمة اصابة الحق بالعلم و العقل فالحکمة من اللّٰه تعالیٰ معرفة الاشیاء و ایجادها علی غایة الاحکام و من الانسان معرفة الموجودات وفعل الخیرات. (ص۱۲۶ مطبوعہ میمنیہ مصر ۱۳۲۴ھ)

اور حکمت، علم اور عقل کے ذریعہ سے سچی اور صحیح بات کو پہنچنا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی حکمت، چیزوں کو جاننا، اور ان کو بہ کمال خوبی پیدا کرنا ہے اور انسان کی حکمت موجودات کو جاننا اور اچھی باتوں کا کرنا ہے۔

یہ تو عربی لغت کے اماموں کی تصریحات تھیں اب ان بزرگوں کے اقوال پر غور کرنا ہے جو زبان دانی کے ساتھ قرآن اور شریعت کے استدلالات اور محاوروں سے بھی کامل طور سے آگاہ تھے، ابن حبان اندلسی نے اپنی تفسیر بحرالمحیط میں ان کے اکثر اقوال کو یک جا کر دیا ہے۔(۱)

۱۔قال مالک و ابو رزین: الحکمة الفقه فی الدین و الفهم الذی هو سجیة و نور من الله تعالیٰ.	۱۔امام مالک اور ابو رزین کا قول ہے حکمت دین میں سمجھ اور اس فہم کو کہتے ہیں جو ایک فطری ملکہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہے۔
۲۔وقال مجاهد: الحکمة فهم القرآن.	۲۔مجاہد کا قول ہے: حکمت یعنی قرآن کا فہم۔
۳۔وقال مقاتل: العلم و العمل به لا یکون الرجل حکیما حتی یجمعهما.	۳۔مقاتل کا قول ہے: حکمت علم اور اس کے مطابق عمل کو کہتے ہیں کسی شخص کو حکیم اس وقت تک نہیں کہا جاتا جب تک وہ علم اور عمل دونوں کا جامع نہ ہو۔
۴۔وقیل: الحکم و القضاء.	۴۔بعضوں کا قول ہے: حکمت فیصلہ کرنا ہے۔
۵۔وقیل: ما لا یعلم الا من جهة الرسول	۵۔کسی کا قول ہے: حکمت وہ ہے جو رسول کے سوا کسی اور ذریعہ سے معلوم نہ ہو سکے۔
۶۔وقال ابو جعفر محمد بن یعقوب: کل صواب من القول ورث فعلا صحیحا فهو حکمة.	۶۔ابو جعفر کا قول ہے: ہر وہ صحیح بات جو صحیح عمل پیدا کرے حکمت ہے۔
۷۔وقیل: وضع الاشیاء مواضعها.	۷۔کسی کا قول ہے کہ چیزوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنا حکمت ہے۔
۸۔وقیل: کل قول وجب فعله.	۸۔ایک اور شخص کا قول ہے: ہر وہ بات جس کا کرنا ضروری ہو حکمت ہے۔

امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں حسب ذیل اقوال لکھے ہیں:

(۱) زیر آیت وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ الآیة ج ۱ ص ۳۹۳ مطبوعہ سعادت مصر طبع اول ۱۳۲۸ھ ہجری

۱۔قال(مالک):المعرفة بالدین و الفقه فی الدین و الاتباع له.

۱۔مالک کا قول ہے: دین کی معرفت اور دین میں سمجھ اوراس کی پیروی حکمت ہے۔

۲۔قال ابن زید:الحکمة الدین الذی لا یعرفونه الا به ﷺ یعلمهم ایاها قال والحکمة العقل فی الدین وقرأ مَنْ یُؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْراً،وقال لعیسیٰ وَ یُعَلِّمُهُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَةَ وَ التَّوْرٰاةَ وَ الْاِنْجِیْلِ وقرأ ابن زید وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا.قال لم ینتفع بالأیات حین لم تکن معها حکمة قال الحمة شیٔ یجعله اللّٰه فی القلب ینور له به.

۲۔ابن زید کا قول ہے: حکمت دین کا وہ حصہ ہے جو صرف رسول سے معلوم ہوتا ہے وہی اس کو سکھاتا ہے نیز ان ہی کا قول ہے کہ حکمت دینی عقل کا نام ہے اور اس پر یہ آیت پڑھی کہ ’’جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی دولت دی گئی‘‘ اور خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا کہ ’’خدا ان کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل سکھاتا ہے‘‘، ابن زید نے یہ آیت بھی پڑھی کہ ’’ان کو اس کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں تو وہ ان سے الگ ہو گیا‘‘، یعنی ان آیتوں سے نفع نہیں اٹھایا کیوں کہ ان کے ساتھ حکمت نہ تھی، ان ہی کا قول ہے کہ حکمت وہ چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ بندہ کے قلب میں رکھتا ہے اور اس سے اس کو روشن کرتا ہے۔

۳۔عن قتادة: و الحکمة ای السنة.

۳۔قتادہ سے مروی ہے: حکمت یعنی سنت نبوی ﷺ۔

آخر میں امام طبری اپنا فیصلہ سناتے ہیں:

۴۔قال ابن جریر الطبری: و الصواب من القول عندنا فی الحکمة انها العلم باحکام اللّٰه التی لایدرک علمها الا ببیان الرسول ﷺ و المعرفة بها وما دل علیه ذلک من نظائره وهو عندی ماخوذ من الحکم الذی بمعنی الفصل بین الحق و الباطل (۱)

۴۔ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت ان احکامِ الٰہی کے علم کا نام ہے جو صرف رسول کے بیان (تشریح) سے معلوم ہوتے ہیں اور ان کی اور جو ان کی مثالیں اور نظیریں ہیں ان کی معرفت کو کہتے ہیں اور حکمت کا لفظ میرے نزدیک حکم سے ماخوذ ہے، جس کے معنی حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔

(۱) الجزء الاول ص ۴۱۵ مطبعہ میمنیہ مصر۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کتاب الرسالہ میں قتادہ کے مسلک کو پسند کیا

ہے، لکھتے ہیں:

۵۔وسمعت من ارضی من اھل العلم بالقرآن یقول: الحکمۃ سنۃ رسول اللہ ﷺ. (ص۲۴)۔

۵۔میں نے قرآن کے ان اہل علم سے جن کو پسند کرتا ہوں یہ سنا کہ حکمت آنحضرت ﷺ کی سنت کا نام ہے۔

امام شافعی اسی کتاب میں آگے چل کر بعضوں کا قول نقل کرتے ہیں:

وسنتہ الحکمۃ التی القی فی روعہ عن اللہ عز و جل. (ص۔۲۸)

اور آپ ﷺ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ ﷺ کے دل میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔

ائمہ لغت اور علمائے قرآن کے ان تمام اقوال پر ایک غائر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ یہ کل کے کل ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی حقیقت کی متعدد تفسیریں ہیں، حکمت عقل وفہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے جس سے صحیح وغلط، صواب وخطا، حق وباطل اور خیر وشر کے درمیان تمیز وفیصلہ، بذریعہ غور وفکر، دلیل وبرہان اور تجربہ واستقرا کے نہیں بلکہ منکشفانہ طور سے ہوجاتا ہے اور اسی کے مطابق اس صاحبِ حکمت کا قول بھی ہوتا ہے۔

ہر فن کے واقف کار دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو کسی فن کو باقاعدہ حاصل کرتے ہیں اس کی مشق کرتے اور اس میں مہارت اور کمال بہم پہنچاتے ہیں، دوسرے وہ جو اس فن کی فطری استعداد اور قابلیت رکھتے ہیں اور تجربہ ودلیل کے بغیر خود اپنی فطری صلاحیت، صحیح وجدان اور سلیم ذوق سے اس فن کی کسی شے کو دیکھنے کے ساتھ ہی اس کے متعلق جچی تلی رائے دیتے ہیں اور حرف حرف صحیح دیتے ہیں، اسی کا نام آپ صحتِ وجدان اور سلامتِ ذوق رکھتے ہیں، شاعری، انشا پردازی اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں اس کی مثالیں بہ کثرت دیکھی اور سنی جاتی ہیں، اسی طرح بعض لوگوں میں اشیا کے حق وباطل اور افعال کے خیر وشر کی تمیز کا صحیح وجدان اور صحیح ذوق ہوتا ہے، وہ ان امور کے دقیق سے دقیق مسئلہ کے متعلق اپنے ربانی ذوق ووجدان سے ایسی صحیح رائے دیتے ہیں جو دوسرے لوگ وسیع مطالعہ اور غور وفکر کے بعد بھی نہیں دے سکتے، یہی وہ معرفت اور نورِ الٰہی ہے جو جد وجہد اور سعی ومحنت سے نہیں بلکہ عطا وبخشش سے حاصل ہوتی ہے اور اسی کا نام حکمت ہے۔

دوسری ربانی استعدادوں اور فطری بخششوں کی طرح حکمت کا عطیہ بھی سب کو یکساں نہیں ملتا، بلکہ حسب استعداد معمولی حکمت سے لے کر اعلاترین اور کامل ترین حکمت تک لوگوں کو عطا ہوتی ہے، اس کے مختلف درجے اور مرتبے عام انسانوں کو مل سکتے ہیں اور ملتے ہیں، لیکن اس کا اعلاترین اور کامل ترین درجہ اور مرتبہ صرف انبیا علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے۔

مگر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح اس ربانی عطیہ، آسمانی فہم، دینی عقل اور نورانی قوت پر حکمت کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح اس قوت (حکمت) کے آثار ونتائج اور اس کی تعلیمات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، چنانچہ دوسری آیت جس میں حضرت لقمانؑ کو حکمت دیے جانے کا بیان ہے اس کے بعد اس حکمتِ لقمانی کی حسب ذیل تعلیمات کا ذکر بھی آ گیا ہے، اللہ کا شکرادا کرنا، شرک کی ممانعت، والدین کی خدمت، اچھوں کی پیروی، خدا کا ہمہ گیر علم، نماز کا حکم، صبر، فخر وغرور کی ممانعت، میانہ روی، آہستہ بولنا، اسی طرح تیرہویں آیت میں حکمتِ محمدی ﷺ کی حسب ذیل تعلیمات کی تفصیل بھی کی گئی ہے، شرک کی ممانعت، والدین کے ساتھ احسان، قرابت داروں اور بے کسوں سے نیک سلوک، اسراف کی برائی، نرمی کی بات کرنا، میانہ روی، اولاد کے قتل کی مذمت، کسی کی جان نہ لینا، مقتول کا بدلہ لینا، یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ، عہد پورا کرنا، ناپ تول ٹھیک رکھنا، بے جانی چیز کی پیروی نہ کرنا، فخر وغرور کی مذمت، ان تمام باتوں کو بیان فرما کر اللہ کہتا ہے:

ذٰلِکَ مِمَّآ اَوۡحٰۤی اِلَیۡکَ رَبُّکَ مِنَ الۡحِکۡمَۃِ (اسراء۔۱۷: ۳۹) — یہ ہیں حکمت کی وہ بعض باتیں جو خدا نے تجھ پر وحی کی ہیں۔

حکمت کی ان بعض باتوں کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمت کے مظاہر اور نتائج کس قسم کی باتیں ہوتی ہیں، یہ عموماً وہی باتیں ہوتی ہیں جن کی عالم گیر صداقت اور سچائی کو خود فطرتِ انسانی اور حسِ اخلاقی تسلیم کرتی ہے، یہی سبب ہے کہ تیسری اور چوتھی آیت میں حکمت کا اطلاق زبور پر اور پانچویں اور چھٹی آیت میں انجیل پر ہوا ہے کہ ان میں اسی قسم کی دل آویز نصیحتوں اور عالم گیر صداقتوں کی تعلیم ہے اور خود قرآن پاک نے بھی اپنی صفت حکمت والا قرآن ظاہر کی ہے، تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡحَکِیۡمِ (لقمان ۳۱: ۲، یونس ۱۰: ۱) وَالۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ (یٰسٓ ۳۶: ۲) وَ الذِّکۡرِ الۡحَکِیۡمِ (آل عمران ۳: ۵۸) ان آیتوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حکمت کی بعض اہم تعلیموں کو وحیِ الٰہی خود اپنے اندر بھی شامل کر کے ان کو آبِ مقطر بنا دیتی ہے، یہ چیز انبیا کو کتاب کی وحی کے ساتھ ساتھ عام طور پر ملتی ہے، فرمایا:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ (آل عمران ۳:۸۱)

اور یاد کرو جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ البتہ جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں۔

بہرحال یہ حکمت کی قوت انبیاعلیہم السلام کو بدرجۂ اتم حاصل تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر بات دانائی اور ان کا ہر کام دانش مندی پر مبنی ہوتا تھا اور چوں کہ یہ قوت ان کو حاصل تھی اس لئے اس کے آثار اور نتائج بھی اقوال واعمال کی صورت میں ظاہر ہوئے جن کا نہ صرف اقرار واعتراف بلکہ ان پر عمل بھی نبوت کی تصدیق میں داخل ہوا، پندرہویں آیت میں ہے:

وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی (۱) فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَۃِ (احزاب ۳۳:۳۴)

(اور اے محمد رسول اللہ کی بیویو!) تمہارے گھروں میں خدا کی جو آیتیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں ان کو یاد رکھو۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کو آیاتِ الٰہی کے علاوہ کس حکمت کے یاد رکھنے کا حکم دیا گیا، ظاہر ہے کہ وہ خود محمد رسول اللہ ﷺ کی حکمت ودانائی کی باتیں تھیں، اب اگر وہ باتیں امورِ دین سے متعلق نہ ہوتیں تو ان کے لئے ان کا یاد رکھنا کیوں ضروری قرار دیا جاتا، اسی طرح آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں آیت میں آنحضرت ﷺ کی صفت میں ہے:

یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (جمعہ ۶۲:۲)

وہ مسلمانوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کتاب کے بعد کس حکمت کی تعلیم دیتے تھے؟ ظاہر ہے کہ خود اپنی حکمت کی تو جس حکمت کی تعلیم وہ دیتے تھے وہ خود ان کے اندر بھی تھی کہ جو چیز ان کے پاس نہ تھی دوسروں کو کیا بخش سکتے تھے، اور جب یہ قوت آپ ﷺ کے پاس تھی تو اس کے آثار ونتائج بھی اقوال وافعال کی صورت میں نمایاں ہوں گے جن کی آپ ﷺ تعلیم فرماتے تھے اور اپنے ان امور حکمت کی تعلیم سے آپ ﷺ کا مقصد بھی یہی ہوسکتا تھا کہ مسلمان ان پر عمل کریں۔

پانچویں آیت میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں:

قَدْ جِئْتُکُمْ بِالْحِکْمَۃِ وَ (۲) لِاُبَیِّنَ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْہِ. (زخرف ۴۳:۶۳)

میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔

۱۔لفظ یتلیٰ سے کسی کو شبہ نہ ہو کہ وہ کتاب کے لئے خاص ہو کہ آنحضرت ﷺ کتاب کا کوئی صفحہ پڑھ کر انہیں سناتے تھے بلکہ الفاظ الٰہی کو زبانی ادا فرماتے تھے۔ (۲) قرآن پاک میں حرف علت سے قبل واؤ آیا کرتا ہے، جیسے وَلِیَکُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ (انعام ۶:۷۵) یہ حرف عطف نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکمت کا ایک فریضہ تبیین بھی ہے یعنی کسی مجمل، ذومعنین اور مختلف فیہ مسئلہ کی تشریح وتفصیل جس سے وہ اجمال اور اختلاف جاتا رہے اور اصل مقصود کی تشریح ہوجائے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تورات کے بعض احکام کی جن میں یہود مختلف الرائے تھے تفصیل فرمائی اوران کی غلطی دور کی۔

بارہویں آیت میں ہے:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا۔ (نساء۴: ۱۱۳)

اگر خدا کا فضل وکرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک گروہ نے چاہا تھا کہ تجھ کو گمراہ کرے اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچائیں گے، اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور اللہ کا فضل تجھ پر بڑا ہے۔

ان آیتوں میں بیان ہے کہ منافقین کا ایک گروہ آپ ﷺ کو غلط رائے دے کر بہکانا چاہتا تھا مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ’’ان کی یہ چال کارگر نہ ہوئی اور وہ تجھ کو بہکا نہ سکے، اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کا تجھ پر فضل وکرم ہے اور وہ فضل وکرم یہ ہے کہ اس نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھے وہ علم بخشا جو پہلے نہ تھا‘‘ اس سے ظاہر ہوا کہ گمراہی سے آپ ﷺ کی یہ حفاظت، خطا سے یہ عصمت اور علم کی یہ بخشش آپ ﷺ کو کتاب اور حکمت دونوں کے ملنے کے سبب سے حاصل ہوئی ہے، الغرض اس حفاظت وعصمت کے حصول میں کتابِ الٰہی کے ساتھ حکمتِ ربانی کے انعام کو بھی دخلِ کامل ہے۔

یہ تو وہ نبوی حکمت تھی جس کا سرچشمہ صرف سینۂ نبوت تھا لیکن یہ فیض حسبِ استعداد پیغمبر کی اتباع میں دوسروں کو بھی ملتا ہے جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ سچی اور صحیح بات کو بہت آسانی سے سمجھ لیتے، قبول کر لیتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

تبلیغِ اسلام کے تین ذریعوں، حکمت، موعظت اور خوش خلقی سے مناظرہ کرنے میں سب سے اول حکمت کو جگہ دی گئی ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ

تو اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے

اَلْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (نحل ۱۶: ۱۲۵) — ساتھ دعوت دے اور ان سے مناظرہ بہ طریق احسن کر۔

سچی، صحیح اور صاف بات دل تک پہنچ جاتی اور بہت جلد اپنا اثر دکھاتی ہے، فرمایا:

حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ (قمر ۵۴: ۵) — دل تک پہنچ جانے والی حکمت۔

یہ حکمت ہر نیکی کی جڑ اور ہر بھلائی کی اصل ہے پھر اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا دولت ہوسکتی ہے، اسی لئے ارشاد ہوا:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (بقرہ ۲: ۲۶۹) — جس کو حکمت دی گئی اس کو بہت نیکی (دولت) دی گئی۔

اس سلسلہ میں دو مشہور اور مستند حدیثوں کا حوالہ بھی مناسب ہے جن سے حکمت کی حقیقت واضح ہوگی اور کم از کم قرنِ اول میں اس لفظ کا مفہوم ظاہر ہوگا، آنحضرت ﷺ نے وفد کے ایک خطیب کا بیان سن کر فرمایا:

ان من الشعر لحكمة وان من البيان لسحرا (۱) — بعض شعر حکمت ہوتے ہیں اور بعض تقریریں جادو ہوتی ہیں۔

اس حدیث میں بعض اشعار کو حکمت اور بعض تقریروں کو جادو کہا گیا ہے، اس تقابل سے ظاہر ہے کہ حکمت کا عربی مفہوم اس کے اردو مفہوم سے بلند تر ہے، یعنی سحر و جادو کے مافوق انسانی تصور کی طرح حکمت کے عربی مفہوم میں کوئی مافوق بشری تخیل ضرور ہے، اسی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی میں حکمت کے معنی عقل و فہم وغیرہ کے معمولی الفاظ سے کوئی بلند اور غیر معمولی حقیقت ہے اور اردو میں اس حقیقت کو حکمت کے ساتھ لفظ الہامی بڑھا کر ادا کیا جاسکتا ہے یعنی الہامی حکمت۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا، رشک و حسد اگر جائز ہے تو صرف دو شخصوں پر ایک اس پر جس کو مال کی دولت ملی تو وہ اس کو صحیح مصرف میں لٹاتا ہے دوسرے رجل اتاه الله الحكمة فهو يقضى بها و يعلمها (صحیح بخاری کتاب

(۱) بخاری کتاب الادب باب ما یجوز من الشعر و الرجز الخ ج ۲ ص ۹۰۸ میں پہلا فقرہ اور کتاب النکاح باب الخطبة ج ۲ ص ۷۷۳ و کتاب الطب باب من البیان سحر ج ۲ ص ۸۵۸ پر دوسرا فقرہ ہے۔

العلم، باب الاغتباط فی العلم و الحکمۃ ج ۱ ص ۱۷ و کتاب الزکوٰۃ باب انفاق المال فی حقہ ج ۱ ص ۱۸۹)

''اس شخص پر جس کو حکمت ملی ہے تو وہ اس کے ذریعہ سے فیصلہ کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے اور اس میں معلم ہونے کی شان پیدا ہوتی ہے''، جب عام انسانوں کا یہ درجہ ہے تو انبیا علیہم السلام کو یہ دولت کس بہتات سے ملی ہوگی۔ اور وہ یقیناً آنحضرت ﷺ کے حصہ میں بھی آئی، اب اس حصولِ دولت یعنی عطائے حکمت کا نتیجہ بھی آپ ﷺ سے ظاہر ہونا چاہیے اور وہ فیصلہ اور تعلیم ہے، آپ ﷺ کے یہ ملہمانہ فیصلے اور حکیمانہ تعلیمات تمام تر وحیِ ربانی کی عملی اور زبانی شرح اور بیان ہیں۔

کتاب وحکمت کی تعلیم: اوپر کی چار آیتوں ۸، ۹، ۱۰، ۱۱ میں خفیف سے تغیر کے ساتھ حسب ذیل آیت ہے:

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (جمعہ ۶۲: ۲)

وہ رسول اُن (اَن پڑھوں) کو خدا کی آیتیں سناتا اور ان کو سنوارتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

ان آیتوں میں آنحضرت ﷺ کے تین کاموں کا ذکر ہے۔

۱۔ خدا کی آیتوں کو پڑھنا اور دوسروں کو سنانا۔

۲۔ ان کو شرک اور بداخلاقی کی نجاستوں سے پاک وصاف کرنا اور سنوارنا۔

۳۔ ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا۔

سوال یہ ہے کہ پہلی اور تیسری آیتیں ایک ہی معنی رکھتی ہیں یا دو، اگر ایک معنی رکھتی ہیں تو اس بے سود تکرار کا فائدہ کیا؟ کیوں نہ دوسری جگہ بھی یَتْلُوْا (یعنی تلاوت کرتا ہے) ہی کا لفظ رکھ دیا گیا اور اگر دو الگ الگ معنی رکھتی ہیں، جیسا کہ ہر صاحبِ نظر سمجھ سکتا ہے تو ان دونوں معنوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا، اگر رسول کا فرق محض وحی کی زبان سے سنی ہوئی آیتیں پڑھ کر دوسروں کو سنا دینا ہے اور اسی پر اس کی تبلیغ کا فریضہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کا تیسرا فرض الفاظ کی تلاوت سے آگے بڑھ کر کتاب اور حکمت کے سبق کی تعلیم کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہے، بالکل ظاہر ہے کہ تعلیم کا مفہوم تلاوت سے بہت کچھ زیادہ ہے، خصوصاً جب کہ تعلیم کا لفظ تلاوت کے بعد آیا ہو، وحی کے الفاظ سنا دینے سے تلاوت کا فرض ادا ہو جاتا ہے، مگر تعلیم کا فرض ہنوز باقی رہتا ہے، کتاب کی تعلیم کے معنی تلاوت کی طرح کتاب کے الفاظ کا سنا دینا اور پڑھا دینا یا دوسروں کو یاد کرا دینا نہیں، بلکہ الفاظ قرآنی کی تلاوت

کے بعد جو آپ ﷺ کا پہلا کام تھا اس کے مشکل مطالب کو حل کرنے، مجمل معانی کو سمجھانے اور اپنی زبان اور عمل سے ان کی شرح وتفصیل کر دینے کا نام کتاب وحکمت کی تعلیم ہے اور یہ آپ ﷺ کا دوسرا یا تیسرا فریضہ تھا اور یہی وہ تعلیم تھی جس کا ان آیتوں میں بار بار ذکر ہے، اب جب ان مطالب ومعانی کی شرح وتفسیر بھی آپ ﷺ کے فرائضِ نبوت میں داخل تھی تو اس پیغمبرانہ شرح وتفصیل کی حیثیت بھی دینی ہوگی اور اس کی تعمیل بھی امت کے لئے ضروری ہوگی، آپ ﷺ کی اسی زبانی وعملی شرح وتفصیل کو صحابہ اور تابعین نے اپنی روایت وعمل کے ذریعہ سے محفوظ رکھا اور وہ احادیث وسنن کے نام سے موسوم ہے۔

اس تفصیل کے بعد حکمت کے ان معنوں پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیجئے جو ائمۂ لغت اور علمائے قرآن نے بیان کئے ہیں تو آپ کو یقین آجائے گا کہ وہ کل ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی معنی کی متعدد تفسیریں ہیں، آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال جن کے اصطلاحی نام احادیث وسنن ہیں، کتابِ الٰہی کی عملی وزبانی تشریحات ہیں کتابِ الٰہی، وحیِ ربانی کا نتیجہ ہے اور احادیث وسنن سینۂ نبوی کی ملہمانہ حکمت کا، اس مقام پر امام شافعیؒ کی یہ تحقیق پیش نظر رہے:

وسنته الحكمة التى القى فى روعه عن الله عز وجل (کتاب الرسالہ ص ۲۸ مصر)	اور آپ ﷺ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے قلب میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔

اور اسی مفہوم کو مجاہد اس طرح ادا کرتے ہیں کہ "الحكمة فهم القرآن" "حکمت فہمِ قرآن کا نام ہے، دوسری عبارت میں یوں کہو کہ قرآن کے معانی ومطالب کی تشریح حکمت ہے اور اس تشریح کا نام جو رسول کے قول وعمل سے ادا ہوئی سنت ہے اور اس معنی کو امام مالک اور ابو رزین اور ابن زید وغیرہ دوسری صدی کے علمائے قرآن ان عبارتوں میں ادا کرتے ہیں کہ حکمت معرفتِ دین، فقہ دین اور اس علمِ دین کو کہتے ہیں جس کو رسول نے بیان کیا اور حکمت اس نور کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کسی قلب میں پیدا کر کے اس کو منور کر دیتا ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اصل حکمتِ نبوی وہ نورِ نبوت اور الہامی معرفت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب وسینہ میں ودیعت کیا تھا اور چوں کہ آپ کے سنن واقوال آپ ﷺ کی

اسی ودیعت شدہ حکمتِ نبوی کی پیداوار اور آثار و نتائج ہیں، اسی لئے ان پر بھی حکمت کا اطلاق جائز ہے، اس تفصیل کے بعد ظاہر ہوگا کہ بعض اماموں اور عالموں نے حکمت کی تشریح میں اصل معنی کی طرف توجہ کی ہے اور بعض نے ثانوی معنی کو بیان کیا ہے اور دونوں حق پر ہیں۔

علم: علم کے لغوی معنی جاننے کے ہیں، مگر ہر فن کے تعلق سے جاننے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت مختلف ہوگی، انبیا علیہم السلام کے تعلق سے جب اس کا استعمال ہوگا تو اس سے طبعاً خدا کی توحید، ذات و صفات، دین و شریعت کے احکام اور اخلاقی تعلیمات مراد ہوں گی، حضرت ابراہیمؑ توحید پر استدلال کر کے اپنے باپ سے فرماتے ہیں:

یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡ قَدۡ جَآءَنِیۡ مِنَ الۡعِلۡمِ مَا لَمۡ یَاۡتِکَ (مریم۱۹: ۴۳)	اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا۔

حضرت خضرؑ کے متعلق ہے:

وَعَلَّمۡنٰہُ مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا (کہف۱۸: ۶۵)	اور ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا۔

خدا کے پاس سے تو ہر چیز ہے پھر اپنے پاس سے علم سکھانے کا مفہوم کیا ہے، ہر وہ شے جو انسان کی ذاتی محنت، کوشش اور جدوجہد وغیرہ معمولی ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی ہے وہ من جانب اللہ کہی جاتی ہے، اسی طرح خدا کے پاس سے علم عطا ہونے کے معنی اس علم کے ملنے کے ہیں جو انسان کے طبعی ذرائع علم و استدلال اور تلاش و تحقیق کے بغیر خود بہ خود عطا ہو، یہی علم خداداد ہے اور اسی لئے صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو علم لدنی (پاس والا علم) کہتے ہیں۔

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی نسبت ہے:

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ وَسُلَیۡمٰنَ عِلۡمًا ۚ (نمل۲۷: ۱۵)	اور بے شبہ ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا۔

حضرت یوسفؑ کے آغازِ نبوت کے موقع پر ہے:

وَکَذٰلِکَ یَجۡتَبِیۡکَ رَبُّکَ وَیُعَلِّمُکَ مِنۡ تَاۡوِیۡلِ الۡاَحَادِیۡثِ وَیُتِمُّ نِعۡمَتَہٗ عَلَیۡکَ (یوسف۱۲: ۶)	اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو نوازے گا اور تجھ کو باتوں کی حقیقت رسی (تاویل) سکھائے گا اور تجھ پر اپنا انعام پورا کرے گا۔

ان آیتوں میں اس علم کا ذکر نہیں جس کا منشا وحی موقت ہے، کیوں کہ ان میں سیاقِ کلام سے علم کے یک بارگی دئے جانے کا ذکر ہے جو وحیِ موقت کی شان نہیں، خصوصاً آخری آیت میں تو تاویلِ احادیث کا علم بہ یک دفعہ دئے جانے کی تصریح ہے، اسی لئے حضرت یوسفؑ ایک خواب کی تعبیر بیان کر کے دوسرے موقع پر کہتے ہیں:

ذٰلِکُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ (یوسف ۱۲:۳۷) یہ وہ ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھایا ہے۔

یہ کہیں بیان نہیں کیا گیا کہ خواب کی تعبیر بتلاتے وقت ان پر وحی آ کر حقیقت سے ان کو مطلع کرتی تھی، بلکہ خود ان کے اندر یہ علمی قوت ہمیشہ کے لئے ودیعت کر دی گئی تھی، اسی قسم کا وہ علم ہے جس کی نسبت سے بعض انبیا کو بچپن ہی میں علیم (جاننے والا) کا خطاب ملا:

وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ (ذاریات ۵۱:۲۸) اور فرشتوں نے اس کو ایک بڑے صاحبِ علم فرزند کی خوش خبری دی۔

اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ (حجر ۱۵:۵۳) ہم تجھے ایک بڑے صاحبِ علم فرزند کی خوش خبری دیتے ہیں۔

یہاں لفظ علیم اختیار کیا گیا ہے عالم نہیں اور یہ لفظ عالم سے زیادہ علم پر دلالت کرتا ہے، ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ وحیِ موقت جو گاہ گاہ آتی ہے اس کے علاوہ علم کا ایک دائمی عطیہ بھی نبی کی شان ہے۔

علم و حکم: بہت سے انبیا کے متعلق علم کے ساتھ حکم کا عطا ہونا بھی بیان ہوا ہے، حکم کے معنی لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں، جس کا ترجمہ اردو میں سمجھ اور بوجھ کا نتیجہ (یعنی فیصلہ) کر سکتے ہیں، امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:

والحکم بالشیء ان تقضی بالشیء بانہ کذا او لیس کذا سواء الزمت ذلک غیرہ او لم تلزمہ. (ص ۱۲۶ مصر) کسی شے پر حکم کرنا یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ شے ایسی ہے یا ایسی نہیں ہے، عام اس سے کہ اس فیصلہ کا تم دوسرے کو پابند کر سکو یا نہ کر سکو۔

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے:

الحکم العلم و الفقہ و القضاء بالعدل. (ج ۱۵ ص ۳۰) حکم کے معنی علم، سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنا۔

ان انبیا علیہم السلام کو جن پر کسی کتاب کا نازل ہونا ثابت نہیں، اس علم اور حکم کا عطا ہونا ثابت ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ وحیِ کتاب کے علاوہ کسی اور عطیۂ علم و حکم کی طرف اشارہ ہے چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کی شان میں ہے:

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا. (یوسف ۱۲:۲۲) — اور جب یوسف جوانی کی قوت کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکم اور علم دیا۔

حضرت لوطؑ کے متعلق ہے۔

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا. (انبیاء ۲۱:۷۴) — اور لوط کو ہم نے حکم اور علم دیا۔

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے ذکر میں ہے:

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا. (انبیاء ۲۱:۷۹) — تو ہم نے سلیمان کو وہ فیصلہ سمجھا دیا اور ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا۔

حضرت یحییٰؑ کی نسبت ہے:

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا. (مریم ۱۹:۱۲) — اے یحییٰ کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ اور ہم نے اس کو حکم بچپن میں عطا کر دیا۔

ایک جگہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتیں ان الفاظ میں شمار کرتا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ. (جاثیہ ۴۵:۱۶) — اور بلاشک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوت دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اور حکم اور نبوت تین چیزیں ہیں، یہاں کسی کو یہ شبہہ نہ ہو کہ ان آیتوں میں حکم سے مراد دنیاوی حکومت اور سلطنت ہے کہ اس معنی میں یہ لفظ خالص اور قدیم عربی میں نہیں آیا ہے۔ یہ اہلِ عجم کا محاورہ ہے، قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوتِ فیصلہ کے معنی میں استعمال کیا ہے جیسے:

فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ (ص ۳۸:۲۲) — ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر۔

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص ۳۸:۲۶) — تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ (مائدہ ۵:۴۲) — اور اگر تو ان کے درمیان فیصلہ کرے تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کر۔

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں:

وَدَاوُدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ (انبیاء ۲۱:۷۸) — اور داؤد اور سلیمان کو جب وہ دونوں کھیت کا فیصلہ کر رہے تھے۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ (شوریٰ ۴۲:۱۰) — اور جس کسی چیز میں تم نے اختلاف کیا تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ یہی تین باتیں سورہ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر کہی گئی ہیں:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ (انعام ۶:۸۹) — یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت بخشی۔

جن پیغمبروں کے نام اوپر گنائے گئے ہیں اور جن کی طرف وہ لوگ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے یہ ہیں ابراہیم، اسحاق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، الیسع، یونس، لوط علیہم السلام، ان اٹھارہ ناموں میں ''حکم'' بہ معنی حکومت وسلطنت اگر ہو تو اس کے مستحق صرف دو ہیں، سلیمان اور داؤد اور چاہے کسی طرح کسی تاویل سے یوسف اور موسیٰ علیہما السلام کو بھی شامل کر لیجیے، باقی چودہ نام ان پیغمبروں کے ہیں جن کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا، اس لئے لامحالہ حکم کا لفظ قرآن میں عربیت کے اصلی اور صریح معنی میں مستعمل ہے اور اس لفظ سے خدا کا جو مقصود ہے وہ کتاب کے ساتھ ساتھ ان پیغمبروں کو برابر حیثیت میں ملا تھا، غلط فہمی کا پورا پردہ چاک کرنے کے لئے ایک اور آیت کریمہ پر نظر ڈالئے:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ. (آل عمران ۳:۷۹)

کسی بشر کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، حکم اور نبوت دے پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بنو بلکہ جو تم کتاب (توراۃ) سکھاتے تھے اور جو تم پڑھتے تھے اس کے ذریعہ سے تم خداوالے بنو۔

ان آیتوں میں مخاطب اہلِ کتاب ہیں اور جس مقدس بشر کا ان میں ذکر ہے بہ ظاہر اس سے

مراد حضرت عیسیٰؑ ہیں وہ نہ ہوں تو خود محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور یہ اس وقت کی بات ہے جب یہود کی پوری قوت مدینہ کے اطراف اور حجاز میں موجود تھی اور اسلام ہنوز ان کے مقابلہ میں کمزور وناتواں تھا، ایسی صورت میں جس حکم کے ملنے کا ذکر ان آیتوں میں ہے وہ کتاب اور نبوت ہی کی جنس کی کوئی چیز ہوسکتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو تو حکومت وسلطنت کا ادنا شائبہ بھی عطا نہیں ہوا تھا اور آنحضرت ﷺ کو اس وقت تک جب تک بنی اسرائیل اپنی ممتاز قوت کے ساتھ مدینہ اور حجاز میں موجود تھے یہ رتبہ نہیں ملا تھا، آیت اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف۱۲: ۴۰) میں بھی حکم سے مراد وہی فیصلہ اور قضائے ربانی ہے، حکومت وسلطنت نہیں، تسکین کے لئے اس آیت کے آگے پیچھے کے الفاظ پر نظر ڈالو:

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْنَ۔ (انعام۶: ۵۷)	کہہ دے (اے پیغمبر) کہ میں اپنے پروردگار کی کھلی دلیل پر ہوں اور تم اس کو جھٹلاتے ہو میرے پاس وہ نہیں جس کی تم جلدی کرتے ہو، فیصلہ کسی کا نہیں لیکن اللہ کا وہ حق بیان کرتا ہے اور سب فیصلہ والوں سے وہ بہتر ہے۔

ان وجوہ سے اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ انبیا علیہم السلام کو منصبِ نبوت اور وحیِ کتاب کے ساتھ حکم کی سند بھی ملتی ہے، جس کے صاف وصریح معنی کلامِ عرب اور لغت اور قرآن کے قرینوں سے علم، فہم، فیصلہ اور حق وباطل میں تمیز ہے اور اس لئے رسول کی اس قوت وطاقت کے نتائج بھی ہمارے لئے واجب العمل ہیں۔

شرحِ صدر: ربانی علم ومعرفت کا ایک اور مقام شرحِ صدر ہے، شرحِ صدر کے معنی سینہ کھولنے کے ہیں، عام خیال یہ ہے کہ سینہ کی تنگی اور ضیق، جہل ونادانی کی علامت ہے اور سینہ کی کشادگی اور فراخی علم کی وسعت اور معرفت کی فراوانی پر دلالت کرتی ہے اسی لئے شرح صدر کے اصطلاحی اور مجازی معنی علم کی کثرت اور آگاہی کی وسعت کے ہیں اور خاص طور سے اس علم ومعرفت اور اطلاع وآگاہی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کسی دقیق اور مشکل مسئلہ کے متعلق دفعتاً اور یک بہ یک قلب میں وارد ہوجاتی ہے اور اس حل سے اس کی تسلی وتسکین ہوجاتی ہے اور اس کے شکوک وشبہات دور ہوکر اس کو یقین کی راحت ومسرت حاصل ہوجاتی ہے، جمہرۃ ابن درید میں ہے:

و الشرح من قولهم شرحت لك الامر	شرح اہل عرب کے اس محاورہ سے ہے کہ میں نے تیرے لئے

ای اوضحته و کشفته و شرح .... — بات کی شرح کردی یعنی اس کو واضح کردیا اور کھول دیا اور
اللّٰه صدره فانشرح اذا اتسع لقبول — اللہ نے اس کے سینہ کو کھول دیا، تو وہ کھل گیا یعنی جب نیکی
الخیر. (۲۔۱۳۴) — کے قبول کرنے کے لئے وسیع ہو گیا۔

صحاحِ جوہری میں ہے:

الشرح الکشف تقول شرحت الغامض — شرح یعنی کشف (کھولنا) تم کہتے ہو، میں نے اس پوشیدہ
اذا فسرته. — مسئلہ کی شرح کردی یعنی اس کی تفسیر کردی۔

لسان العرب میں ہے۔(۱)

الشرح الکشف یقال شرح فلان امره ای اوضحه و شرح مسئلة مشکلة بینها و شرح الشیء یشرحه شرحا و شرحه فتحه وبینه و کشفه و کل ما فتح من الجواهر فقد شرح ایضا تقول شرحت الغامض اذافسرته.........وشرح الله صدره لقبول الخیر یشرحه شرحا فانشرح وسعه لقبول الحق فاتسع. قال ابن الاعرابی: الشرح الحفظ والشرح الفتح و الشرح البیان والشرح الفهم.

شرح یعنی کشف، کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اس کی بات کی شرح کردی یعنی اس کو واضح کردیا اور مشکل مسئلہ کی شرح کردی یعنی اس کو بیان کردیا اور کسی چیز کی شرح کردی یعنی تفصیل کردی اور کھول دیا اور جواہر میں سے جو کھولا جائے تو اس کی شرح کی گئی، تم بولتے ہو پوشیدہ مسئلہ کی شرح کردی یعنی تفسیر کردی...... اور خدا نے اس کے سینہ کو کھول دیا کسی نیک بات کے قبول کرنے کے لئے تو وہ کھل گیا یعنی اس کو قبول حق کے لئے وسیع کردیا تو وہ وسیع ہو گیا، ابن الاعرابی نے کہا: شرح کے معنی ہیں یاد رکھنا، کھولنا بیان کرنا، سمجھنا۔

قرآن مجید میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے نبوت کا منصب ملتے وقت دعا مانگی:

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْۤ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ.
(طٰہٰ۔۲۰:۲۵ تا ۲۸)

اے میرے رب! میرے سینہ کو میرے لئے کھول دے اور میرے کام کو میرے لئے آسان کردے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات کو پوری طرح سمجھیں۔

دعا کے پہلے جملہ میں حضرت موسیٰ نے اپنے لئے شرح صدر کی استدعا کی ہے اور

(۱) لسان العرب ج۲ص۲۹۲ بیروت

آخر میں فصاحت بیان کی، یعنی اول میں صحیح معانی کے القا اور آخر میں ان کے لئے صحیح الفاظ کے انتخاب کی ہے تاکہ ان کی دعوت و تبلیغ کو مخاطب سمجھ سکیں لیکن یہ دولت محمد رسول اللہ ﷺ کو بن مانگے ملی، خدا نے فرمایا:

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ. وَوَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ. (انشراح ۹۴: ۱،۲) کیا ہم نے (اے محمد) تیرے لئے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا اور تیرے بوجھ کو تجھ سے اتار نہیں لیا۔

شرحِ صدر اور ''سینہ کھولنے'' کی جو تشریح احادیثِ صحیحہ میں مذکور ہے اس کے لئے عام اصطلاح شقِ صدر ہے یعنی عالمِ رویا یا بیداری میں فرشتوں نے آکر سینۂ مبارک کو واشگاف کیا اس کو آبِ زمزم سے دھویا اور سونے کے طشت میں ایمان اور حکمت بھر کر لائے اور ان سے سینۂ مبارک کو معمور کر کے شگاف کو برابر کر دیا، (۱) اگر یہ واقعہ اپنی ظاہری حقیقت پر محمول کیا جائے تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ سینۂ مبارک کو واقعتاً چاک کر کے اور زمزم کے پانی سے پاک و صاف کر کے ایمان اور حکمت اس میں بھری گئی اور اگر تمثیل کے رنگ میں لیا جائے تو بھی یہ حقیقت ماننی پڑے گی کہ سینہ صافی ایمان و حکمت سے معمور کیا گیا بہر حال شرحِ صدر کی حقیقت ایمان اور حکمت کی ربانی بخشش ہے۔

شرح صدر کے اس مذکورہ بالا معنی کو جو شقِ صدر کے واقعہ کی تفصیل سے واضح ہے اگر کوئی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو تو بھی بحمد اللہ کہ اس کی تسکین کا سرمایہ قرآن پاک میں موجود ہے، سورۂ زمر میں ہے:

اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰہُ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ فَہُوَ عَلٰی نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ (زمر ۳۹: ۲۲) بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشنی میں ہے۔

اسلام کے لئے سینہ کے کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت موثر طریقہ سے اس طرح کھل گئی کہ اس کو اسلام کی سچائی کا پوری طرح یقین آگیا اور اس کو اپنے اس یقین پر کامل تسکین حاصل ہوگئی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو اپنی منزلِ مقصود کے ہر قدم پر اللہ کی روشنی حاصل ہے...... یہی

(۱) صحیح بخاری، باب المعراج، ج ۱ ص ۵۴۸ و کتاب الصلوٰۃ باب کیف فرضت الصلوۃ ج ۱ ص ۵۰، صحیح مسلم باب الاسراء برسول اللہ الی السمٰوٰت و الارض وفرض الصلوٰت ج ۱ ص ۷۸، ونسائی، کتاب الصلوۃ فرض الصلوۃ ج ۱ ص ۵۰، ۵۱ و مسند احمد بروایت انس بن مالک ج ۳ ص ۱۲۱ و سنن ترمذی تفسیر سورۂ انشراح ص ۵۵۷۔

شرحِ صدر کی حقیقت ہے اور اس روشنی کی کمی و بیشی درجوں اور منصبوں کے مطابق ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں حدیث کے دو ایسے موقعوں کا ذکر کرنا ہے جن سے لفظ شرحِ صدر کے معنی کی پوری تشریح ہو جاتی ہے یہاں یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ ان حدیثوں سے معنوی احتجاج یہاں مقصود نہیں بلکہ صدرِ اول کے کلامِ عرب سے شرحِ صدر کے محاورہ کی تشریح مقصود ہے۔

۱۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد عرب کے بعض قبیلے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں، حضرت ابو بکر صدیقؓ ان پر فوج کشی کا ارادہ کرتے ہیں، حضرت عمر فاروقؓ آ کر عرض کرتے ہیں کہ یا خلیفۂ رسول اللہ ان سے جہاد کیوں کر ممکن ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اس نے اپنی جان و مال کو مجھ سے بچا لیا، حضرت صدیقؓ جواب دیتے ہیں خدا کی قسم میں اس سے لڑوں گا جو زکوٰۃ اور نماز میں فرق کرتا ہے، نماز خدا کا حق ہے اور زکوٰۃ بندوں کا حق ہے، اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی جس کو وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دیتے تھے اب نہ دیں گے تو میں ان سے لڑوں گا اس کے بعد حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

فو اللہ ماھو الا ان قد شرح اللہ صدرا بی بکر فعرفت انہ الحق. (بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب وجوب الزکوٰۃ ج اص ۱۸۸)	تو خدا کی قسم نہ تھا یہ، لیکن یہ کہ کھول دیا تھا اللہ نے ابو بکر کے سینہ کو تو میں نے جان لیا، وہی حق ہے۔

۲۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جنگ یمامہ میں قرآن کے بہت سے حافظ شہید ہوئے، اس وقت حضرت عمرؓ نے آکر حضرت ابو بکر صدیقؓ کو مشورہ دیا کہ قرآن پاک کو ایک ترتیب سے کاغذ پر لکھ لیا جائے، حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا کہ میں وہ کام کیوں کر کروں جس کو خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا لیکن حضرت عمرؓ اپنے مشورہ کے بہتر ہونے پر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت ابو بکرؓ کی سمجھ میں بھی بات آ گئی اس موقع پر حضرت ابو بکرؓ کہتے ہیں:

فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح اللہ صدری لذلک ورایت فی ذلک الذی رای عمر (صحیح بخاری۔ کتاب ابواب فضائل القران باب جمع القران، ج ۲ ص ۷۴۵)	تو عمر بار بار مجھ سے کہتے رہے یہاں تک کہ خدا نے اس کے لئے میرے سینہ کو کھول دیا اور میں نے بھی وہی دیکھا جو عمرؓ دیکھتے تھے۔

ان دونوں موقعوں پر لفظ شرحِ صدر اپنے استعمال کا محل اور اپنی حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے، یہی شرحِ صدر ہے جس کو قرآن نے جیسا کہ اوپر سورۂ زمر کے حوالہ سے گذرا، نورِ ربانی یا نورِ بصیرت کہا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو شرحِ صدر کی جو وسعت عطا ہوئی تھی اس کے سمجھنے سے پہلے بلاغت کا ایک مسئلہ سمجھ لینا چاہئے، جب کوئی لفظ متعلقات کے صلہ اور مفعول کے ساتھ مقید ہو کر بولا جاتا ہے تو اس سے معنی کی تخصیص و تحدید ہو جاتی ہے لیکن وہی لفظ جب متعلقات کے صلہ اور مفعول کی قید کے بغیر بولا جائے گا تو وہ عموم کے ساتھ فعل کے ثبوت کا فائدہ دے گا مثلاً علم (جاننا) مفعول کو چاہتا ہے، جس چیز کا علم ہوتا ہے اس کو عبارت میں مفعول بناتے ہیں اور اس عبارت میں اس علم سے مقصود اسی خاص شے کا علم ہوتا ہے، جس کو مفعول بنایا ہے لیکن اگر مفعول کو حذف کر دیں تو اس کا مقصد کسی خاص چیز کے علم کے بجائے مطلق اور عام علم کا ثبوت ہوگا، ایک جگہ قرآن میں ہے، یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (روم ۳۰:۷) ''وہ حیات دنیا کا ظاہری پہلو جانتے ہیں''، ظاہر ہے کہ اس علم کا تعلق صرف ایک چیز کے علم سے ہے یعنی دنیا کی ظاہری زندگی کے علم سے، عام علم سے نہیں لیکن دوسری جگہ ہے: هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ. (زمر ۳۹:۹) ''کیا جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے (یعنی جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے) دونوں برابر ہو سکتے ہیں''، یہاں یہ ذکر نہیں کہ کس خاص بات کو جانتے ہیں بلکہ مقصود عام علم ہے تو یہاں معنی یہ ہوں گے کہ ''جو ہر طرح کے علم والے ہیں اور جو مطلق بے علم ہیں دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔'' بلاغت کی کتابوں میں ھو یامر وینھیٰ، ھو یعطی ویمنع ھو اضحک و ابکی کی مثالوں سے اس مفہوم کی توضیح کی گئی ہے۔

اس تمہید کے بعد شرحِ صدر کے گذشتہ استعمالوں اور مثالوں پر نظر ڈالئے ہر جگہ آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ جس بات کے سمجھنے کے لئے سینہ کھولا جاتا ہے اس پر لام آتا ہے یا قرینہ سے سمجھا جاتا ہے، مثلاً اسلام کے لئے سینہ کھول دیا، جمعِ قرآن کے لئے سینہ کھول دیا، مانعینِ زکوٰۃ کے قتال کے لئے سینہ کھول دیا، مگر حضرت موسیٰؑ اور آنحضرت ﷺ کے لئے قرآن میں جس شرحِ صدر کا ذکر ہے اس میں اس بات کا ذکر نہیں ہے جس کے لئے ان انبیا علیہم السلام کے سینے کھولے گئے، اس سے یہ مقصود ہے کہ ان انبیا کو امورِ دین میں مطلق اور عمومی شرحِ صدر عنایت ہوا اور یہیں سے عام امت اور انبیا کے فرقِ مراتب کا اظہار ہوتا ہے کہ امت کے عام افراد کو خاص خاص امور کے سمجھنے

کے لئے شرحِ صدر ملتا ہے اور انبیا کو اپنے دائرہ میں کلی اور عمومی حیثیت سے یہ چیز عنایت ہوتی ہے۔

ایک اور لطیف پہلو بھی یہاں ذکر کے قابل ہے حضرت موسیٰؑ کی دعا اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر احسان دونوں موقعوں پر لسی اور لک ہے، حضرت موسیٰؑ کہتے ہیں "میرے لئے میرے سینہ کو کھول دے" اور آنحضرت ﷺ کے لئے خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ "کیا میں نے تیرے لئے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا۔" سوال یہ ہے کہ "میرے لئے" اور "تیرے لئے" کے اضافہ کی ضرورت اور اس لام کی حاجت کیا تھی؟ مفسرین میں امام زمخشری نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ صرف تاکید کے لئے ہے، حالانکہ یہ لامِ تملیک کے بجائے لامِ افادہ ہے۔(۱) جیسا کہ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (بقرہ۲:۲۹) میں ہے، مقصد یہ ہے کہ یہ شرحِ صدر کی دولت تجھ کو تیرے لئے ملی ہے یعنی تیرے کشفِ علم کے لئے یا تائید کے لئے یا فائدہ کے لئے اور یہ کشفِ علم اور شرحِ صدر خود تیری ذات کے لئے ہے کہ وہ کامل سے کامل تر ہو کر ظاہر ہو۔

اب آخری سوال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو دین کا جو یہ عمومی شرحِ صدر عنایت ہوا اس کا کوئی اثر و نتیجہ بھی تو رہا ہوگا، تو دراصل اسی کے یہ آثار و نتائج ہیں "جو افعال و اقوال" اور "احادیث و سنن" کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

تبیینِ کتاب: آنحضرت ﷺ دنیا میں جس شریعت کو لے کر آئے وہ آخری اور ابدی تھی اور ایسی آخری اور ابدی شریعت کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ زیادہ تر زور شریعت کے کلی اور ابدی اصول و مبادی پر دے چنانچہ اس آخری وحیِ الٰہی نے اپنی کتاب کو صرف اصول و کلیات تک محدود رکھا اور جزئیات کے لئے اپنی آیتوں میں ایسے اشارے رکھے جن کے سہارے سے وہ دل جو علم و معرفت سے پرنور اور حکم و حکمت سے معمور اور شرحِ صدر اور تائیدِ ربانی سے فیض یاب ہوں وہ علیٰ قدرِ مراتب جزئیات کو صحیح طور سے جان لیں، چنانچہ یہ رتبہ سب سے پہلے خود نبی ﷺ کو ملا اور چونکہ وہ خطا سے معصوم ہے اس لئے اس کے اس منصب کے نتائج بھی خطا سے محفوظ ہیں پھر رسول ﷺ کے وسیلہ سے یہ منصب خلفائے راشدین، اکابر صحابہ، ائمہ تابعین و تبع تابعین و مجتہدین عظام اور علمائے اعلام کو ہمیشہ ملتا رہا، اسی کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے جس کو ہر زمانہ کے فیض یابِ علوم نبوت اور حاملینِ اسرارِ

(۱) تفسیر کشاف ج ۲ تفسیر سورۃ الانشراح ص ۸۱۶۱ مطبوعہ ۱۳۰۷ھ میں علامہ زمخشری کی یہ تشریح موجود ہے، "ک،ص"

شریعت، خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق اس کی وحی کی روشنی میں ہمیشہ انجام دیتے رہے ہیں اور دیتے رہیں گے، یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی توضیح وتفسیر کی ذمہ داری بھی خود اپنے اوپر لی ہے فرمایا:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ. اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ. فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ. ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ.

(قیامہ ۷۵:۱۶تا۱۹)

تو قرآن کی وحی کے ساتھ اپنی زبان کو اس غرض سے حرکت نہ دے تا کہ تو اس کی (تلاوت واشاعت میں) جلدی کرے، بے شک ہم پر ہے قرآن کو جمع کرنا اور اس کا پڑھانا اور جب ہم نے اس کو پڑھادیا تو اس کی پڑھائی کی پیروی کر پھر ہم پر ہے اس کی شرح کرنا۔

اس بیان اور شرح کی ذمہ داری کبھی بذریعہ وحی ادا ہوئی ہے جو قرآن میں مذکور ہے اور کبھی رسول کی تقریر وعمل سے پوری ہوئی ہے جو عملی تواتر سے منقول اور احادیث وسنن کے مستند دفتر میں موجود ہے۔

یہ امر کہ اس بیان وشرح کی طاقت اور اس شرح وبیان کا اختیار رسول کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا حسب ذیل آیت سے ثابت ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ. (نحل ۱۶:۴۴)

اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت (کی کتاب) اتاری تا کہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے تو اس کو کھول کر بتادے شاید یہ سوچیں۔

"بیان اور تبیین" کے لفظی معنی کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں اور ان کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے ایک اعلان اور اظہار کے معنی میں یعنی اخفا کے مقابل، دوسرے توضیح وتفسیر کے معنی میں، قرآن پاک میں یہ لفظ تبیین اپنے دونوں معنوں میں آیا ہے، اب یہ تمیز کہ کس آیت میں کیا معنی مراد ہیں، سیاق وسباق اور موقع ومحل سے ہوسکتی ہے مثلاً ایک جگہ قرآن پاک میں ہے:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (مائدہ ۵:۱۵)

اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا کہ کتاب کی جو باتیں تم چھپاتے تھے وہ ان کو تمہارے لئے ظاہر کردے اور بہت سی باتوں سے درگذر کرے۔

یہاں تبیین صریح طور سے اخفا کے مقابلہ میں ہے اس لئے یہاں تبیین کے معنی یقینی طور پر

اظہار واعلان کے ہیں لیکن یہی لفظ دوسری جگہ سورۂ نحل میں اس طرح آیا ہے:

وَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡکَ الۡکِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ‌ۙ وَهُدًى وَّرَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ. (نحل ۱۶:۶۴)	اور ہم نے تجھ پر کتاب نہیں اتاری لیکن اس لئے تاکہ تو واضح کردے اس کو جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور ایمان والوں کے لئے رہنمائی اور رحمت بنا کر اس کو اتارا۔

اختلاف کے مقابلہ میں اظہار اور اعلان کی نہیں بلکہ توضیح وتشریح کی ضرورت ہے کہ جس امر میں اختلاف ہو، وہ اس توضیح وتفسیر کے بعد دور ہو جائے، اب پہلی آیت پر غور کرنا چاہئے جو اسی سورہ میں ایک اور مقام پر ہے:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ. (نحل ۱۶:۴۴)	اور ہم نے (اے پیغمبر!) تیری طرف نصیحت کی کتاب (قرآن) کو اتارا تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا تو اس کو ان کے لئے کھول کر بتادے شاید کہ وہ سوچیں۔

سوال یہ ہے کہ اس آیتِ پاک میں بیان کرنے کے معنی ظاہر کرنے کے ہیں یا تشریح وتفصیل کرنے کے؟ ہمارا دعویٰ ہے کہ ظاہر کرنے کے معنی سے یہاں غور وفکر کی مناسبت اور قرینہ کے سبب سے تشریح وتفصیل کے معنی لینا صحیح ہے، امرِ مخفی کا اظہار سننے اور ماننے کے تو مناسب ہو سکتا ہے مگر سوچنے کے نہیں، سوچنے اور غور وفکر کرنے کے لئے یہاں تشریح وتفصیل کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار واعلان کی، اب جب کہ آنحضرت ﷺ کے لئے تفصیل وتبیین کا منصب خدا کی طرف سے ثابت ہے تو اس تفصیل وتبیین کی پیروی اور اتباع بھی خدا ہی کے احکام کی پیروی ہوگی اور آپ ﷺ کی یہ تبیین وتشریح آپ ﷺ کے نورِ حکمت کا فیضان ہوگا جس کے اشارے خود کتابِ الٰہی کے اندر آپ کو موجود نظر آتے تھے۔

ارائت: انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جاسکے جو ایک طرف اختلافِ فہم سے محفوظ رہے اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کے جزئیات کی کوئی حد نہیں پوری طرح حاوی ہو سکے لیکن فہمِ انسانی کے اختلاف کے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں گو ان کو تمام تر دور نہیں کیا جاسکتا تاہم ان کو کم کیا جاسکتا ہے، اسلام نے اپنے قانونِ الٰہی سے جو بہر حال انسانی بول چال کے الفاظ میں ہے، اس اختلافِ فہم کے نقص کو کم کرنے کے لئے یہ کیا کہ اپنے رسول کی معرفت زبانی اور عملی طور سے اس کی تشریح وتبیین

کرادی، گو انسانی ذرائع حفظ و روایت کی فطری کمزوریوں کے سبب سے اس تشریح و تبیین میں اختلاف فہم پیدا ہو گیا، مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تشریح و تبیین نہ ہوتی تو اختلافات کی خلیج اس سے بھی زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی۔

روزمرہ کے پیش آتے رہنے والے جزئیات کے فیصلہ کی یہ صورت رکھی گئی کہ آنحضرت ﷺ کی عدالت میں روزانہ اس قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہوتے رہتے اور آپ ﷺ وحیِ کتاب کے اصول و کلیات کے ماتحت اپنے نورِ بصیرت اور فہمِ حکمت سے ان کے فیصلے فرماتے رہتے، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنے اپنے عہد میں ان نو بہ نو اور تازہ بہ تازہ واقعات کے فیصلوں کے لئے اولاً وحیِ کتابی کو اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے ان قضایا اور فیصلوں کو جو فہمِ نبوت، نورِ بصیرت اور ارائتِ الٰہی کے ذریعہ فیصل ہوئے تھے، اپنا ماخذ قرار دیا اور یہی اصول بعد کے فقہا اور مجتہدین نے اختیار کیا اور ہر نئے واقعہ کو وحیِ کتاب اور فیصلۂ نبویؐ کے معصوم و مسلم معیار پر جانچ ان میں سے کسی نہ کسی مماثل اور مشابہ فیصلہ پر قیاس کر کے اپنے فیصلے دئے اور جو چیزیں ان میں نہ ملیں ان کو معمولی عدل و انصاف، رسم و رواج، عقل و فکر و استحسان وغیرہ کے اصول پر سمجھ کر ان کا فیصلہ کیا، یہی مجموعہ آج فقہِ اسلامی کہلاتا ہے۔

وحیِ الٰہی: قرآن پاک میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے قضایا اور فیصلے احادیث و سنن کی صحیح روایتوں میں محفوظ ہیں، وحیِ الٰہی کی صداقت میں تو کلام نہیں ہوسکتا اب رہ گئی آنحضرت ﷺ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی تو اس کے متعلق بھی وحیِ الٰہی ناطق ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىکَ اللّٰہُ (نساء۴:۱۰۵)	ہم نے (اے پیغمبر!) تیری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری تا کہ لوگوں کے درمیان جو تجھ کو اللہ سوجھائے اس کے ذریعہ فیصلہ کرے۔

اس کتابِ الٰہی کے نزول کی غرض ہی یہ بتائی گئی ہے کہ تو اے پیغمبر! اس کے احکام اور قوانین کو لے کر اس فہم کے ذریعہ جو کچھ اللہ تعالیٰ تجھ کو سوجھائے اور دکھائے تو لوگوں کے درمیان فیصلہ اور انصاف کرے، اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبر کو یہی سوجھانا اور دکھانا جو کچھ تھا، وہ آپ ﷺ کے عمل اور قضایا اور فیصلوں کی صورتوں میں محفوظ ہے اور اسلام کے قانون کا وحیِ الٰہی کے بعد دوسرا ماخذ ہے۔

آنحضرت ﷺ کے عدل و انصاف پر خود منافقین تک کو بھروسہ تھا، چنانچہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب ان کا حق کسی پر ہوتا تو وہ دوڑے ہوئے عدالتِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوتے کیوں کہ سمجھتے تھے کہ یہ حق آپ ﷺ ہی کی عدالت سے ہم کو ملے گا، لیکن جب ان پر کسی کا حق نکلتا تو وہ ٹال جاتے اور دوسرے طریقہ سے فیصلہ چاہتے اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی سرزنش کی:

وَإِذَا دُعُوٓا إِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ. وَإِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا إِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ. أَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ أَمِ ارْتَابُوْٓا أَمْ يَخَافُوْنَ أَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ رَسُوْلُهٗ بَلْ أُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا دُعُوٓا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَ يَتَّقْهِ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ. (نور۲۴: ۴۸تا۵۲)	اور جب وہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف بلائے جائیں کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کردے تو ان میں سے کچھ لوگ منہ موڑتے ہیں اور اگر ان کو کچھ حق پہنچتا ہو تو فرماں بردار بن کر رسول کے پاس چلے آئیں کیا ان کے دل میں بیماری ہے یا وہ شک میں ہیں یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کرے گا، بلکہ وہی لوگ بے انصاف ہیں، ایمان والوں کی بات یہ تھی کہ جب ان کو خدا اور رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کردے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا، ان ہی لوگوں کا بھلا ہے اور جو کوئی اللہ کے اور اس کے رسول کے حکم پر چلے اور اللہ سے ڈرتا رہے اور اللہ سے بچ کر نکلے وہی لوگ ہیں مراد کو پہنچے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ رسول کے تمام فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور رسول کے فیصلوں کی اطاعت خود خدا کے حکم کی اطاعت ہے بلکہ ایمان کی دلیل اور نشانی ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا. (نساء۴: ۶۵)	تو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے جب تک وہ تجھے اپنے جھگڑوں کا منصف نہ بنائیں اور پھر جو تو فیصلہ کرے اس سے اپنے دل میں خفگی نہ پائیں اور پوری طرح تسلیم کریں۔
وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ	اور مومن مرد یا مومن عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کردے تو ان کو اپنے کام کا اختیار رہے اور

اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا. (احزاب ۳۳:۳۶)

جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلا گمراہ ہوا۔

یہ اطاعت اور مطلقاً سرافگندگی اور تمام فیصلوں کے قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربانی ذمہ داری ہر حاکمِ وقت اور سلطانِ زمانہ کے لئے نہیں، یہ انبیا علیہم السلام کے لئے خاص ہے، دو شخصوں کے باہمی جزئی و شخصی مقدمات کا فیصلہ ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ وحیِ قرآنی کے ذریعہ نہیں کرتا تھا، بلکہ رسول کے فہمِ نبوت، نورِ نبوت، فیضِ حکمت، شرحِ صدر، تبیینِ حقیقت اور ارائت (دکھانا اور سوجھانا) کے ذریعہ فرماتا تھا، لیکن کلیات کی حیثیت سے وہ یقیناً وحیِ قرآنی کے مطابق ہوتا تھا اور ان کلیات کے مطابق ان جزئیات کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو سوجھاتا تھا۔

آپ ﷺ کے ان قضایا اور فیصلوں کی رضامندانہ اطاعت ہر مسلمان پر قیامت تک ضروری ہے، آپ ﷺ کی زندگی کے بعد ان فیصلوں کی اطاعت یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات اور معاملات میں ہم وہی فیصلے جاری کریں جو آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں ان کے متعلق کئے کہ آپ ﷺ کے فیصلے بہ حکم خدا غلطی سے پاک، ظلم سے بری اور بے انصافی سے منزہ تھے اور دنیا میں رسول کے سوا کسی انسان کو اس بے گناہی اور عصمت کا درجہ اور رتبہ حاصل نہیں۔

رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے: اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی و رہنما فرمایا ہے، یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لئے خاص ہوجاتی ہے، ان کی بعثت اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی فرمائیں اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں، جس امت میں مبعوث ہوتے ہیں اس کے سامنے ہدایت و رہنمائی کے دو چراغ روشن ہوتے ہیں، ان دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جنہیں یہود اپنی شرارت اور سازش سے گمراہ بنانا چاہتے تھے خطاب کرکے فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ. وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ (آل عمران ۳:۱۰۰، ۱۰۱)

اے مومنو! اگر تم اہلِ کتاب کے کسی گروہ کا کہا مانو گے تو وہ ایمان لاچکنے کے بعد تمہیں مرتد کرکے کافر بنادیں گے اور تم کو کیوں کر کفر کرنا چاہیے درآنحالیکہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔

آیت کے آخری ٹکڑے سے ثابت ہوا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں کے پاس تھیں، ایک تو آیاتِ الٰہی جو ان کو سنائی جاتی تھیں اور دوسری خود رسول کا مستقل وجود جو اپنی تعلیم و تلقین، فیضِ صحبت اور اثر سے ان کو بھٹکنے نہ دیتا اور ضلالت سے مانع آتا تھا، اگر صرف کتابِ الٰہی اس کام کو انجام دے سکتی تو رسول کے ذکر کی حاجت بلکہ خود بعثت کی ضرورت کیا تھی، اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی کتابِ صامت (قرآن) اس کی کتابِ ناطق (رسول) سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی ہے اور غالباً اس حدیثِ صحیح کے بھی یہی معنی ہیں جس کا اعلان آپ ﷺ نے حجۃ الوداع سے واپسی میں اپنی وفات سے کچھ مہینوں پہلے فرمایا:

انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ و سنتی۔(۱)

مسلمانو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ جاتا ہوں اللہ کی کتاب اور اپنی سنت۔ (یعنی اپنی عملی زندگی)

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کا ظاہری وجود مٹ گیا، مگر آپ ﷺ کی عملی زندگی جس کو سنت کہتے ہیں، قائم و باقی ہے اور وہ بھی قرآن کے بعد ہماری ہدایت کا دوسرا سرچشمہ ہے۔

تزکیہ: انبیا علیہم السلام کا عموماً اور آنحضرت ﷺ کا خصوصاً ایک اور امتیازی وصف تزکیہ ہے، تزکیہ کے معنی پاک و صاف کرنے کے ہیں، نبوت محمدیہ ﷺ کے اس وصف کا ذکر ان آیتوں میں ہے جن میں آپ ﷺ کی یہ توصیف کی گئی ہے ''ایک رسول جو لوگوں پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے'' ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کا یہ تیسرا وصف دو پہلے اوصاف سے الگ ہے، یہ پاک و صاف کرنا، آیاتِ الٰہی کی تلاوت اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے بعد نبی کی عملی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ ﷺ کی تعلیم و تربیت، فیضانِ صحبت، حسنِ اخلاق، پند و موعظت اور تبلیغ و دعوت کی تاثیر سے برے اچھے، بد نیک اور اشرار اخیار بن جاتے ہیں۔

انبیا علیہم السلام کی ہر تاریخ اس واقعہ کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ گمراہ اور بدکار قوموں میں مبعوث ہوئے، ہر طرح کی اذیتیں اٹھائیں، تکلیفیں سہیں، مصیبتیں جھیلیں اور آخر تاریکی کو روشنی سے، جہالت کو،

(۱) یہ روایت مختلف الفاظ میں حدیث کی کئی کتابوں میں ہے صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابۃ باب من فضائل علیؓ ج ۲ ص ۳۲۵، مسند احمد ج ۳ صفحات ۱۴، ۱۷، ۲۶، ۵۹، وجلد ۴ صفحات ۳۶۷ و ۳۷۱ و سنن دارمی کتاب فضائل القرآن ص ۴۲۴۔

علم سے اور کفر کو توحید سے بدل کر رہے اور مدت تک ان کی تاثیر کا فیض جاری رہا، ان کا یہ وصفِ تزکیہ، وحی والہام کے علاوہ ان کے جسم وجان اور زبان ودل کی کیمیا اثری کا نام ہے، خواہ ان کی زبان اس وقت وحیِ الٰہی سے مترنم ہو یا خاموش، ہر آن آفتابِ حق کی کرنیں مطلعِ نبوت سے نکل نکل کر دلوں کی سرزمین کو روشن کرتی رہتی تھیں۔

نور: اسی لئے نبوت کا سینہ صدق وصفا کا آئینہ ہوتا ہے، نبی کا مجسم پیکر ظلمت کدۂ عالم کا چراغ اور علم وہدایت کا مطلع النور ہوتا ہے، جس طرح اس کا صحیفۂ الہامی اور وحیِ ربانی نور ہوتی ہے وہ خود بھی سراپا نور ہوتا ہے جس سے اندھے دیکھتے، گمراہ راہ پاتے اور حق کے طالب روشنی حاصل کرتے ہیں، خود آپ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا:

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا وَّ	اے نبی! ہم تجھ کو بتانے والا خوش خبری سنانے والا، چوکنا
مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ	کرنے والا، خدا کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور
وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. (احزاب ۳۳: ۴۵،۴۶)	روشن کرنے والا چراغ بنا بھیجا۔

یہ آس پاس کی چیزوں کو روشن کرنے والا چراغ خود رسول کی ذات ہے، سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے جسم وجان زبان ودل، خلق وعمل، علم وفہم میں روشنی نہیں تو آپ کی ذات جو ان ہی چیزوں کا مجموعہ ہے، روشن چراغ کیوں کر ثابت ہوگی اور جب آپ ﷺ کی ذاتِ مبارک کی یہ تمام چیزیں انوارِ الٰہی ہیں تو ان انوار میں سے ہر نور کی روشنی میں چلنا ہدایت ہے اور ان میں سے کسی سے قطعِ نظر کرنا بھی ظلمت کے ایک گوشہ میں قدم دھرنا ہے۔

آیات وملکوت کی رویت: جس طرح انبیاء علیہم السلام اپنی قوتِ سامعہ سے ندائے غیب کو سنتے اور صدائے وحی کی سماعت کرتے ہیں اسی طرح ان کی آنکھیں بہت کچھ دیکھتی ہیں جو عام انسان نہیں دیکھتے، حضرت ابراہیمؑ کے ذکر میں ہے:

وَکَذٰلِکَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ	اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی مملکت
وَالْاَرْضِ وَلِیَکُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ. (انعام ۶:۷۶)	دکھاتے تھے تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں ہو۔

استعدادِ نبوت کی تربیت اور نشوونما کے لئے یہ رویت وبصیرت کی مافوق قوت ان کو عطا ہوئی۔

حضرت موسیٰ کو کوہِ طور پر جو کچھ نظر آیا وہ جلوہ گریِ حسن وعشق کی مشہور کہانی ہے، آنحضرت ﷺ کے مشاہداتِ روحانی کا تذکرہ معراج کے تعلق سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيٰتِنَا (اسرائیل ۱:۱۷) تاکہ ہم اس (رسول بندہ) کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔

دوسری جگہ ہے:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى. اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى. وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى. (نجم ۵۳:۱۱-۱۳) دل جھوٹ نہیں بولا جو اس نے دیکھا، کیا اس پر اس سے جھگڑتے ہو؟ اور دوسری بار اس کو اترتے دیکھا۔

مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى. لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى. (نجم ۵۳:۱۷، ۱۸) نگاہ نہ بہکی اور نہ سرکش ہوئی، اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

ایک اور مقام پر ہے:

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ. (تکویر ۸۱:۲۳) اور اس نے یقیناً اس کو آسمان کے کھلے کنارے میں دیکھا۔

یہ مشاہدہ وحی والہام کے علاوہ نبوت کے دوسرے حاسۂ بصارت کے امتیاز کو ظاہر کرتا ہے۔

سماعِ غیب: جس طرح آیات وملکوت کا مشاہدہ انبیا کے حاسۂ بصارت کا امتیازی وصف ہے، اسی طرح غیب کی آواز اور وحی کی صدا کو سننا بھی ان کے حاسۂ سماعت کا خصوصی امتیاز ہے، قرآن پاک میں اس کی تصریحات موجود ہیں کہ انبیا خدا سے ہم کلام ہوتے تھے اور وحی کو پاتے تھے، وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا. (نساء ۴:۱۶۴) اور خدا نے موسیٰ سے بات کی۔

حضور ﷺ کو حکم ہوا:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ (طٰہٰ ۲۰:۱۱۴) اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی تجھ پر پوری ہو قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کر۔

خدا نے پیغمبروں کو پکارا اور انہوں نے اس کی آوازیں سنیں، نَادَیْنَا ''ہم نے پکارا بار بار'' یہ الفاظ قرآن میں پیغمبروں کے متعلق آئے ہیں۔

تبلیغ ودعوت: نبی ﷺ کا سب سے پہلا اور اہم فرض تبلیغ اور دعوت ہے یعنی جو سچائی اس کو خدا سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا، خدا کا

جو پیغام اس تک پہنچا ہے، وہ لوگوں کو سنا دینا، اس نے اس کو جس صداقت سے آگاہ کیا ہے اس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا، جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں ان کو اس راہ میں صرف کرنا اور اس سمجھانے بجھانے اور راہِ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا، اس اعلان اور دعوت میں جو تکلیف بھی پیش آئے اس کو راحت جاننا، جو مصیبت بھی درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا، جو کانٹے بھی اس وادی میں اس کے تلووں میں چبھیں ان کو رگِ گل سمجھنا، اس حق کی آواز کو دبانے کے لئے جو قوت بھی سر اٹھائے اس کو کچل دینا اور مال ومنال، اہل وعیال، غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگِ راہ ہو کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا اور اس کی اس ساری کوشش وکاوش کا مقصد خدا کی رضامندی، مخلوق کی خیرخواہی اور اپنے فرضِ رسالت کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ ہے انبیا علیہم السلام کی تبلیغ ودعوت کا مفہوم، دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے انہوں نے اپنے فرض کو اسی ایثار اور قربانی کے ساتھ انجام دیا اور ایک لمحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی اور آج دنیا میں جو کچھ خدا کی محبت، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی، بےکسوں کی مدد، غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس سطحِ زمین پر وجود ہے وہ سب بواسطہ یا بلاواسطہ دانستہ یا نادانستہ ان ہی کی دعوت تبلیغ اور جدوجہد کا اثر اور نتیجہ ہے۔

دنیا کے بڑے سے بڑے مفکر، بڑے سے بڑے شاعر، بڑے سے بڑے حکیم اپنا فرض خود سمجھ لینا یا زیادہ سے زیادہ دوسروں کو سمجھا دینا سمجھتے ہیں لیکن انبیا علیہم السلام جس صداقت کو پاتے ہیں اس کو دوسروں کے سمجھانے اور ہر ممکن طریق سے اس کے پھیلانے اور اہلِ دنیا کو اس کے باور کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں، وہ ہر مشکل کو جھیل کر، نافہموں کو حقیقت سمجھاتے اور اندھوں کو راہِ راست دکھاتے ہیں۔

انبیا علیہم السلام کی تعریف میں خدا فرماتا ہے:

اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَیَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا۔ (احزاب ۳۳:۳۹)	جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور اللہ بس ہے، حساب (اعمال) کے لئے۔

حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے:

اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى. (طٰہٰ ۲۰:۲۴)　　فرعون کے پاس جا کہ اس نے سرکشی کی۔

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ پیغامِ ربانی کی بے محابا تبلیغ کریں اور دشمنوں سے نہ ڈریں کہ ان کی حفاظت کا خود شہنشاہِ عالم ذمہ دار ہے:

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ‌ؕ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسٰلَـتَهٗ‌ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ ۵:۶۷)　　اے پیغمبر! تیرے رب کے پاس سے جو تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچادے اور اگر تو نے نہ کیا تو اس کے پیغام کے پہنچانے کا فرض ادا نہیں کیا اور اللہ تجھ کو لوگوں سے بچائے گا۔

انبیا علیہم السلام کی تبلیغ و دعوت میں تبشیر اور انذار دونوں ہوتے ہیں، تبشیر یعنی بشارت دینا اور خوش خبری سنانا اور انذار یعنی خدا کے جلال سے ڈرانا، عذابِ الٰہی کا خوف دلانا اور لوگوں کو ان کے انجامِ بد سے آگاہ کرنا اور انبیا علیہم السلام کی آمد اس شان سے اس لئے ہوتی ہے کہ خدا کی حجت بندوں پر تمام ہوجائے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ‌ (نساء ۴:۱۶۵)　　یہ سب پیغمبر خوش خبری سناتے اور ہشیار و بیدار کرتے ہوئے آئے تا کہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کے لئے خدا پر کوئی حجت نہ رہے۔

ان سب نے پیغامِ الٰہی پہنچانے کے ساتھ اپنی خیر خواہی، دل سوزی و اخلاص مندی کا اعلان کیا:

اُبَلِّغُكُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّىۡ وَاَنَا لَـكُمۡ نَاصِحٌ اَمِيۡنٌ‏. (اعراف ۷:۶۸)　　میں تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا امانت دار خیر خواہ ہوں۔

يٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسَالَةَ رَبِّىۡ وَنَصَحۡتُ لَـكُمۡ وَلٰـكِنۡ لَّا تُحِبُّوۡنَ النّٰصِحِيۡنَ‏. (اعراف ۷:۷۹)　　اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کا پیام تم کو پہنچادیا اور تمہاری خیر خواہی کر چکا لیکن تم خیر خواہوں کو پیار نہیں کرتے۔

يٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّىۡ وَنَصَحۡتُ لَـكُمۡ‌ۚ فَكَيۡفَ اٰسٰى عَلٰى قَوۡمٍ كٰفِرِيۡنَ. (اعراف ۷:۹۳)　　اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کے پیام تم کو پہنچادیے اور تمہاری خیر خواہی کر چکا تو پھر کیسے نہ ماننے والے لوگوں پر میں غم کھاؤں۔

یہ بھی فرمایا کہ:

لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ (ہود ۱۱:۵۱)

میں اپنی نصیحت کی تم سے مزدوری نہیں مانگتا میری مزدوری تو اس پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔

لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ (ہود ۱۱:۲۹)

میں اپنی تبلیغ کے بدلہ تم سے مال و دولت کا خواہاں نہیں ہوں میری مزدوری تو خدا پر ہے۔

ایک شبہہ کا ازالہ: اس سلسلہ میں ہم کو ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو بعضوں کو حضور ﷺ کی صفتِ تبلیغ کے سمجھنے میں پیش آئی ہے، قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں کہ رسول کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا (البلاغ) ہے، اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا کہ رسول کا فرض صرف وحیِ الٰہی کی تبلیغ ہے، یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو انسانوں تک بعینہٖ پہنچا دینا اس کا کام ہے، اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح نہ اس کا منصب ہے اور نہ اس کا اس کو حق ہے، ان کے نزدیک مبلغ رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ خط تو پہنچا دیتا ہے مگر اس خط کے مفہوم و معنی کی تشریح کا اس کو حق نہیں ہوتا بلکہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بند لفافہ میں کیا ہے۔

شاید ان کو یہ دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظِ رسول سے بھی ہوا ہے، جس کے لفظی معنی پیغام بر اور قاصد کے ہیں لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ جہاں اس کو رسول کہا گیا ہے نبی (خبر پانے والا) بھی تو کہا گیا ہے، مبشر (خوش خبری سنانے ولا) نذیر (ڈرانے والا) سراجِ منیر (روشن کرنے والا چراغ) صاحبِ حکمت، صاحبِ خلقِ عظیم، صاحبِ مقامِ محمود، مجتبیٰ (مقبول) مصطفیٰ (برگزیدہ) مبین (بیان اور شرح کرنے والا) معلم (سکھانے والا) مزکی (پاک وصاف کرنے والا) داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانے والا) حاکم (فیصلہ کرنے والا) مطاع (واجب الاطاعت) آمر (حکم دینے والا) اور ناہی (روکنے والا) بھی تو کہا گیا ہے، کیا یہ اوصاف والقاب اس کی اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والا قاصد ہے، جس کو اصل پیغام کے مفہوم و معنی سے ایک معمولی قاصد اور نامہ بر کی طرح کوئی سروکار نہیں؟ اس کے پیغام کے مفہوم و معنی کی تشریح و تفسیر کا آج تو ہر عربی داں کو حق

حاصل ہے اور اس کی اصل حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر مدعی کو دعویٰ ہے مگر خود صاحب پیغام کو اپنی پیغام بری کے وقت نہ مفہوم و معنی کا علم تھا اور نہ اس کی تشریح کا اس کو حق تھا، اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (ص ۳۸:۵)

ہم نے پچھلے صفحات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس غلط خیال کی پوری تردید ہو جاتی ہے۔

ان کے اشتباہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اسلام میں شرع اور وضعِ قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لئے تسلیم کیا گیا ہے کہ وہی اصلی شارع ہے، اب اگر رسول کے لئے بھی وحیِ کتابی سے الگ شرع بنانے کا حق تسلیم کیا جائے تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا ہوگا، اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہم رسول کو شارع نہیں شارح قرار دیتے ہیں، کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج جب حکومت کے قانون کی توضیح و تشریح کرتا ہے تو وہ اپنے اس عمل سے سلطانِ وقت بن کر واضعِ قانون کا منصب حاصل کرتا ہے یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے؟ یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے جس کو ہم نبی اور رسول اور معلم اور مبین کہتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر پیام اور مقصد اور مفہوم اور فیصلہ سے صرف وحی کے اسی طریقۂ خاص کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو مطلع نہیں فرماتا جس طریقِ خاص سے قرآن مجید نازل ہوا ہے بلکہ وہ اپنی تینوں قسموں کے ذریعہ سے اپنے اغراض اس رسول پر واضح کرتا ہے اور ان میں سے ہر طریق کی وحی کی اطاعت تمام امت پر فرض ہے خواہ وہ وحی ہو جو الفاظِ الٰہی کی قید کے ساتھ آئی ہو جس کو قرآن کہتے ہیں، یا ربانی مفہوم و معنی رسول کے الفاظ میں ادا ہوں جس کو حدیث و سنت کہتے ہیں، الغرض خواہ وہ کتابِ الٰہی کے ذریعہ سے ہو یا حکمتِ ربانی کے فیض سے ہو۔

قرآن مجید کی وہ آیتیں جن کے معنی یہ ہیں کہ ''ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچانا ہے، ان کا یہ منشا نہیں کہ وہ صرف پیغام پہنچانے والا ہے، خوش خبری سنانے والا نہیں، ہشیار و بیدار کرنے والا نہیں، پیغامِ الٰہی کے الفاظ سنانے کے بعد ان کی تعلیم دینے والا نہیں، آیاتِ الٰہی کی تبیین و تشریح کرنے والا نہیں، رہنما اور ہادی نہیں، نجاستوں سے پاک و صاف کرنے والا نہیں، ایسا کہنا قرآن کا انکار اور عقل و فہم کا ماتم ہے، قرآن مجید میں کئی جگہ ہے:

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ (رعد ۱۳:۷، نازعات ۷۹:۴۵) تو تو صرف ڈر سنانے والا ہے۔

ایک جگہ ہے:

اِنَّمَآ اَنَا مُنۡذِرٌ (ص۳۸:۶۵) میں تو صرف ڈرسنانے والا ہوں۔

کیا ان آیتوں کا مفہوم یہی ہے کہ ڈرسنانے کے سوا رسول کا کام بشارت اور خوش خبری سنانا نہیں اور وہ صرف منذر ہے مبشر نہیں، اصل یہ ہے کہ اس قسم کی آیتوں:

اَنَّمَا عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ. (مائدہ۵:۹۲) ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچادینا ہے۔

کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ صرف پیغام رساں اور قاصد ہے، مبین اور شارح نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اس کا کام صرف خدا کا پیغام پہنچادینا ہے، زبردستی لوگوں کے دلوں میں اس پیغام کا اتار دینا نہیں، بزور لوگوں کو مسلمان بنادینا نہیں، جبراً منوالینا نہیں اور نہ پیغام پہنچادینے کے بعد لوگوں کے کفروانکار اور عدم ایمان کی ذمہ داری اس پر ہے، قرآن میں جہاں جہاں اس معنی کی آیتیں آئی ہیں ان کا منشا یہی اور صرف یہی ہے، قرآن پاک کی تیرہ مختلف آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے اور ہر جگہ یہی ایک مفہوم ہے:

۱۔وَقُلۡ لِّلَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ وَ الۡاُمِّیّٖنَ ءَاَسۡلَمۡتُمۡ فَاِنۡ اَسۡلَمُوۡا فَقَدِ اهۡتَدَوۡا وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ اللّٰهُ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ. (آل عمران۳:۲۰)

کتاب والوں اور ان پڑھوں سے کہہ دے کیا تم نے اسلام قبول کیا اگر کیا تو ہدایت پائی اور اگر منہ پھیرا تو تجھ پر (اے رسول) صرف پیغام پہنچانا ہے اور اللہ بندوں کا دیکھنے والا ہے۔

مفہوم بالکل ظاہر ہے کہ اسلام کی ہدایت قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں اگر لوگ قبول کریں تو انہوں نے حق کی راہ پائی اور اگر انکار کریں تو رسول کا کام صرف پیغام پہنچادینا تھا وہ اس نے پہنچادیا، اس کا فرض ادا ہو چکا اب خدا جانے اور اس کے بندے جانیں:

۲۔فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَعَلَیۡنَا الۡحِسَابُ. (رعد۱۳:۴۰)

تو تیرا فرض صرف پیغام پہنچادینا ہے اور ہمارا فرض ان سے حساب لینا ہے۔

اس کی مزید تفصیل سورۂ غاشیہ میں ہے:

۳۔فَذَکِّرۡ اِنَّمَآ اَنۡتَ مُذَکِّرٌ. لَسۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِمُصَیۡطِرٍ اِلَّا مَنۡ تَوَلّٰی وَکَفَرَ. فَیُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الۡعَذَابَ الۡاَکۡبَرَ. اِنَّ اِلَیۡنَآ اِیَابَهُمۡ. ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا حِسَابَهُمۡ. (غاشیہ۸۸:۲۱تا۲۶)

تو (اے پیغمبر) تو نصیحت کر، تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، ان پر داروغہ نہیں لیکن جس نے منہ پھیرا اور انکار کیا تو خدا اس کو بڑی سزا دے گا، بے شک پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے اور ہمیں پر ان کا حساب لینا ہے۔

یہی مفہوم سورۂ شوریٰ میں ہے کہ رسول کا کام صرف سمجھانا اور تبلیغ کرنا ہے، وہ سلطان، کارفرما، داروغہ اور فرماں روا بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ لوگوں سے بہ زور اپنی بات منوالے:

۴۔ فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ؕ اِنۡ عَلَیۡکَ اِلَّا الۡبَلٰغُ ؕ (شوریٰ ۴۲: ۴۸)	تو اگر وہ انکار کریں تو ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا تیرا کام صرف پہنچا دینا ہے۔

کافروں نے جب کبھی رسولوں کو جھٹلایا، انہوں نے یہی کہا کہ ہمارا کام پہنچا دینا ہے، ماننے نہ ماننے کا تمہیں اختیار ہے:

۵۔ قَالُوۡا مَاۤ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ۙ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ الرَّحۡمٰنُ مِنۡ شَیۡءٍ ۙ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا تَکۡذِبُوۡنَ ۔ قَالُوۡا رَبُّنَا یَعۡلَمُ اِنَّاۤ اِلَیۡکُمۡ لَمُرۡسَلُوۡنَ ۔ وَ مَا عَلَیۡنَاۤ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ۔ (یٰسین ۳۶: ۱۵-۱۷)	کافروں نے کہا تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو، خدا نے کچھ نہیں اتارا، تم جھوٹ کہتے ہو، رسولوں نے جواب دیا ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم بے شبہ تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں اور ہمارا فرض صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

خود اللہ تعالیٰ نے بھی رسولوں کو تسلی دی ہے کہ ان منکروں کے انکار سے دل شکستہ نہ ہوں، اگلے پیغمبروں کے منکروں نے بھی یہی کیا تھا، پیغمبروں کا فرض لوگوں سے منوانا نہیں بلکہ ان تک خدا کا پیام پہنچانا ہے:

۶۔ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَا عَبَدۡنَا مِنۡ دُوۡنِہٖ مِنۡ شَیۡءٍ نَّحۡنُ وَ لَاۤ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمۡنَا مِنۡ دُوۡنِہٖ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ کَذٰلِکَ فَعَلَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۚ فَہَلۡ عَلَی الرُّسُلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ۔ (نحل ۱۶: ۳۵)	اور مشرکوں نے کہا اگر خدا چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی اور کو نہ پوجتے نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے (خدا کہتا ہے کہ) ایسا ہی کیا تھا، ان کے پہلوں نے تو کیا ہمارے پیغمبروں پر کھول کر پہنچا دینے کے سوا کچھ ہے۔
۷۔ وَ اِنۡ تُکَذِّبُوۡا فَقَدۡ کَذَّبَ اُمَمٌ مِّنۡ قَبۡلِکُمۡ ؕ وَ مَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ۔ (عنکبوت ۲۹: ۱۸)	اگر تم جھٹلاؤ تو (کیا ہے) تم سے پہلے بھی تو میں جھٹلا چکی ہیں اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔

رسول کا کام پہنچا دینا ہے، باقی علام الغیوب جو چاہے سو کرے:

۸۔ مَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ	رسول پر نہیں ہے لیکن پہنچا دینا اور اللہ جانتا ہے جو تم

مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ. (مائدہ۵:۹۹) ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔

بقیہ آیتیں حسب ذیل ہیں جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتی ہیں:

۹۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ. (مائدہ۵:۹۲)

اور اللہ کا فرمان اور رسول کی بات مانو اور بچو اور اگر تم نے منہ پھیرا تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

۱۰۔ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ. (نور۲۴:۵۴)

کہہ دے اے پیغمبر! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ منہ پھیریں تو رسول پر وہ ہے جس کا بوجھ اس پر ہے اور تم پر وہ ہے جس کا بوجھ تم پر ہے اور اگر اس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔

۱۱۔ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ، فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ. (نحل۱۶:۸۱،۸۲)

اسی طرح اللہ تم پر اپنا احسان پورا کرے گا تا کہ تم مسلمان ہو جاؤ اور اگر انہوں نے منہ پھیرا تو تجھ پر کچھ نہیں ہے مگر کھول کر پہنچا دینا۔

۱۲۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ. (تغابن۶۴:۱۲)

اور خدا کا کہا مانو اور رسول کی فرماں برداری کرو اگر تم نے منہ پھیرا تو ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

پیغمبر کا قول ہے:

۱۳۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ (ہود۱۱:۵۷)

تو اگر تم منہ پھیرو تو میں جو پیام دے کر تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں نے تم کو پہنچا دیا (یعنی میرا فرض ختم ہو چکا)۔

ان تمام آیتوں کا تعلق نبوت کے منکروں سے ہے، یہاں پر یہ نکتہ بھی لحاظ کے قابل ہے کہ جو لوگ ہنوز نبوت کے منکر ہوں ان سے رسول کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت، پند و موعظت اور سمجھانے کا ہے لیکن جو خوش قسمت اقرارِ نبوت کی سعادت حاصل کر لیں تو پھر ان کا تعلق رسول سے اتباع و پیروی اور اطاعت کا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد رسول ان کو تبلیغ ہی نہیں بلکہ امر و نہی بھی کرتا ہے، کوئی حکومت

دوسرے ملک کے کسی باشندے کو زبردستی اپنی رعایا نہیں بناتی لیکن اگر کوئی شخص از خود اس حکومت کی رعایا بن جائے تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی بزور مجبور کیا جائے گا کہ رعایا بننے کے معنی ہی اس کے قانون کے قبول کرنے کے ہیں۔

انبیا کی تعلیم کا امتیازی عقیدہ: دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے وہ ایک ہی دین اور ایک ہی عقیدہ لے کر آئے، وہی توحید، وہی نبوت، وہی عبادت، وہی اخلاق، وہی جزا و سزا اور عمل کی پرسش، اس لحاظ سے انبیا کی تعلیم میں کوئی اصولی فرق نہیں، اس لئے فرمایا کہ شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوۡحًا (شوریٰ ۴۲:۱۳) یعنی خدا نے تمہارے لئے وہی دین مشروع کیا جو نوح وغیرہ دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا اور اسی کا نام اسلام ہے لیکن انبیا کی تعلیم کا اہم الاصول اور سب سے ضروری جز توحید ہے اور وہی نبوت کے ساز کا اصلی اور ازلی ترانہ ہے۔

ممکن ہے کہ دنیا میں اسلام سے پہلے بہت سے اچھے لوگ گذرے ہوں اور ان کی دعوت بھی مفید ہو، ان کے اخلاقی وعظ بھی دل پسند ہوں، وہ یونان کے حکیم ہوں یا ہندوستان کے اوتار لیکن ان کی تعلیم میں اگر توحید کی دعوت شامل نہیں تو وہ نبوت کے رتبہ کے قابل نہیں کہ پیغمبرانہ تعلیم کی پہچان ہی توحید کی دعوت ہے، اگر یہ نہیں تو نبوت بھی نہیں، فرمایا:

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ۔ (انبیاء ۲۱:۲۵)	اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن اس کو یہ وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں میری ہی پرستش کرو۔
وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِیۡ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوۡلًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ اجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ (نحل ۱۶:۳۶)	اور ہر قوم میں ہم نے ایک رسول بھیجا کہ خدا کی عبادت کرو اور بتوں سے پرہیز کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیمی حیثیت سے نبوت کی شناخت اسی سے ہو سکتی ہے، اسلام سے پہلے جس مدعیِ نبوت کی تبلیغ کا اہم ترین جز توحید نہیں اس کو دعوائے نبوت کا کوئی حق نہیں۔

نبوت کی غرض و غایت: انبیا علیہم السلام کی آمد کی غرض و غایت کو شاعرانہ زبان اور خطیبانہ جوشِ بیان میں بہت کچھ بتایا جا سکتا ہے لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ ان اغراض کو گنایا جائے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی وحیِ مبارک کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، اصل دعویٰ وہی ہے جس کو مدعی ظاہر کرتا ہو نہ کہ گواہ۔

انبیا کی بعثت کی سب سے پہلی غرض اس روزِ الست کے بھولے ہوئے ازلی عہد و پیمانِ

بندگی کی یاددہانی ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی شَھِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنْ ھٰذَا غٰفِلِیْنَ

(اعراف ۷:۱۷۲)

اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی نسلوں سے عہد لیا اور ان کو خود اپنے اوپر آپ گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں، انہوں نے کہا کیوں نہیں تو ہے، ہم نے گواہی دی کہ قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم اس کو بھول گئے تھے۔

اس لئے ضرور ہوا کہ ان کو موقع بہ موقع ان کا یہ وعدہ یاد دلایا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول کی بعثت کی ایک غرض یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس کا وجود بنی آدم پر اتمامِ حجت ہے، ممکن ہے کہ آدم کے فرزند یہ بجا عذر کریں کہ ہمارے پاس کوئی یاد دلانے والا نہیں آیا اس لئے فرمایا:

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ...

(نساء ۴:۱۶۵)

رسول خوش خبری سنانے اور ڈرانے والے تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے لئے خدا پر کوئی حجت باقی نہیں رہے۔

تذکیر کے بعد نبی ﷺ کا فرضِ اولین ہدایت اور رہنمائی ہے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفتِ ہادی کا مظہر اور مورد ہے اسی لئے ایک آیت میں نبی اور رسول کے لئے ہادی کا لفظ آیا ہے، فرمایا:

وَلِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ۔ (رعد ۱۳:۷)

اور ہر قوم کے لئے ایک راہ دکھانے والا آیا۔

سورہ شوریٰ میں فرمایا:

وَاِنَّکَ لَتَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔

(شوریٰ ۴۲:۵۲)

اور تو اے پیغمبر سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

سورۂ انبیا میں بہت سے پیغمبروں کے ذکر کے بعد ہے:

وَجَعَلْنٰھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا

(انبیاء ۲۱:۷۳)

اور ہم نے ان پیغمبروں کو ایسا پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے۔

اسی طرح ان آسمانی کتابوں کو جو ان کو دی گئی تھیں، بار بار ھدی (ہدایت) کہا گیا ہے، اور کہیں ان کو ضیا اور نور (روشنی) کے الفاظ سے ادا کیا گیا ہے۔

اس ہدایت اور رہنمائی کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ بندگانِ الٰہی کو باطل کے اندھیرے سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتے ہیں، لوگ جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں، انبیا ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے انوار میں لاتے ہیں، ان کو شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حق اور ظلمت کے بجائے نور عطا کرتے ہیں:

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ (حدید ۵۷:۹)	وہی اللہ جو اپنے بندہ پر کھلی آیتیں اتارتا ہے تا کہ وہ تم کو تاریکیوں سے نور میں لائے۔

اس دنیا کی نجات صرف اعتدال میں ہے جب کبھی مزاجِ انسانی کی طرح اس کے ان عناصر میں جن سے اس کی ترکیب ہوئی ہے، افراط و تفریط پیدا ہوگی، روئے زمین پر فساد رونما ہوگا، انسانی جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہوگی، کبھی دونوں پلے برابر نہ ہوں گے، آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو میں تلا ہوا ہے، کیمسٹری اور علم الفلک کا واقف کار اس ترازو کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور حیرت کرتا ہے کہ کہیں ایک ذرہ کی کمی بیشی نہیں ہے۔ جس طرح اس مادی دنیا میں یہ حیرت انگیز توازن ہے، ٹھیک اسی طرح روحانی اور اخلاقی دنیا میں بھی اس توازن کی ضرورت ہے، عقائد ہوں کہ عبادات، اخلاق ہوں کہ معاملات، اسی توازن کا نام حق اور عدل ہے، فرمایا:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (رحمٰن ۵۵:۷-۹)	اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی کہ اس ترازو میں کمی بیشی نہ کرو اور تول کو ٹھیک رکھو اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں۔

یہ توازن اور برابر تول جو بے ارادہ اور بے اختیار دنیا کے ذرہ ذرہ اور اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں خالقِ فطرت کے اندازہ اور تقدیر سے قائم ہے، یہی توازن اور برابری کی

تول رسولوں کے ذریعہ آئی ہوئی میزانِ شریعت کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک جنبش میں ہونی چاہیے، بے ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانونِ فطرت ہے اور باارادہ دنیا کی میزان کا نام قانونِ شریعت ہے، بے ارادہ دنیا کا نظام عدل اسی خدائی میزان فطرت سے چل رہا ہے، اگر اس میزان میں ایک ذرہ بھی کمی بیشی ہوجائے تو عالم کا نظام درہم برہم ہوجائے، اسی طرح انسانی دنیا کی سکینت، طمانیت اور امن و امان کا نظام اسی میزانِ شریعت کے ذریعہ قائم ہوسکتا ہے، اگر یہ نہ ہوتو اس کے نظام کا درہم برہم ہونا بھی لازمی ہے، فرمایا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا	ہم نے بے شبہ اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور
مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ	ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل کو
بِالْقِسْطِ (حدید ۵۷:۲۵)	قائم کریں۔

انبیا کی بعثت کی یہ غرض وغایت کہ لوگ شریعت کی میزان کے مطابق عدل اور توازن کو قائم رکھیں، اس موجودہ دنیا ہی کے نظام کی امن وسلامتی کے لئے ہے، آج یورپ کے الحاد کی گونج نے دنیا کے گوشہ گوشہ کو پرشور بنادیا ہے، آج رسولوں کی اہمیت اور ان کی تعلیمات کی ضرورت پر شکوک وشبہات کی ژالہ باری ہورہی ہے لیکن وہمی وخیالی مباحث سے قطعِ نظر کر کے عملی حیثیت سے دنیا کی ایک ایک اقلیم اور ایک ایک آبادی کا جائزہ لو آج جہاں کہیں بھی سچائی کی کوئی روشنی اور حقیقت کی کوئی کرن چمکتی ہے، وہ اسی مطلعِ خورشید سے چھن کر نکلی ہے، کوئی دین دار ہو یا ملحد، خوش عقیدہ ہو یا بے عقیدہ، یونان کا حکیم ہو یا افریقہ کا جاہل، یورپ کا متمدن ہو یا صحارئ کا وحشی، رومی ہو یا زنگی، عیسوی ہو یا موسوی، بت پرست ہو یا موحد، مجوسی ہو یا ہندو، مسلم ہو یا غیر مسلم، شہری ہو یا دیہاتی، ہمالیہ کی چوٹی پر آباد ہو یا زمین کی گہرائی میں، کہیں بھی ہو، کوئی بھی ہو، اگر وہ اللہ کے نام کی عظمت سے واقف ہے اور نیکی اور بدی کی تمیز سے آشنا ہے تو وہ خدائی رسولوں اور ربانی پیغمبروں کے علاوہ کس معلم کی کوششوں کا ممنون ہے، آج جہاں بھی عدل و میزان کا وجود ہے وہ کسی یونانی حکیم یا یورپین فلاسفر کی تعلیم وتصنیف اور تقریر وخطبہ کا اثر نہیں ہے، بلکہ طبقۂ انبیا ہی کی بے واسطہ یا بہ واسطہ تعلیمات کا نتیجہ ہے، آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں کیسے ہی بدترین مبلغ سہی، مگر نیکی، عدل، احسان، ہمدردی، نکوکاری، حسنِ خلق کی تعلیم تبلیغ اور دعوت ان ہی کی زبانوں سے ہورہی ہے جو رسولوں کے پیرو اور پیغمبروں کے تابع ہیں جو عقیدہ کے ملحد ہیں، ان کی بھی نکوکاری ان ہی پیغمبروں کے نادانستہ فیضانِ تعلیم کا نتیجہ ہے، اس بنا پر جو لوگ ذہنی طور

کے منکر ہیں وہ بھی عملی طور سے ان کی تعلیم کے مقر اور معترف ہیں اس لیے انبیا کا وجود تمام دنیا کے لیے رحمت بن کر ظاہر ہوا ہے اور قرآن نے آسمانی کتابوں کو بار بار رحمةً وھدًی رحمت اور رہنمائی کی غرض سے بھیجنے کا جو اعلان کیا ہے وہ تمام تر اسی غرض و غایت کی تشریح ہے اور اسی لئے خاتم نبوت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ والا صفات تمام عالم کے لئے رحمت بن کر آئی، خدا نے فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ. (انبیاء۲۱:۱۰۷)	اور ہم نے تجھ کو (اے محمدؐ) تمام دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

تائید و نصرت: انبیا علیہم السلام جو مقصد لے کر آتے ہیں خواہ کسی قدر مشکلات پیش آئیں، کتنی ہی رکاوٹیں ہوں، کتنی ہی تکلیفوں اور زحمتوں کا سامنا ہو، بالآخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا ہے، پیغمبروں کی سیرت اور ان کی دعوت کی تاریخ خود اس دعویٰ پر گواہِ صادق ہے، قرآن نے کہا:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ. اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ. وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ. (الصّفّت ۳۷: ۱۷۱-۱۷۳)	اور ہماری بات اپنے رسول بندوں کے لئے پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ یقیناً ان ہی کی مدد ہوتی ہے اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوتا ہے۔

نہ صرف اس دنیا میں بلکہ حشر کے دن بھی ان ہی کو اور ان کے ذریعہ اہل ایمان کو کامیابی ہوگی:

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ. يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ. (مومن ۴۰: ۵۱-۵۲)	بے شبہ ہم نے اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد اس دنیا میں کرتے ہیں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے جس دن گنہ گاروں کو ان کے بہانے کام نہ دیں گے ان پر پھٹکار ہوگی اور ان کے لئے برا گھر ہوگا۔

پیغمبروں پر ایسے بھی سخت وقت آتے ہیں جب ان کو اپنی قوم کے قبولِ ہدایت کی طرف سے پوری مایوسی ہو جاتی ہے اور امید کی روشنی کسی طرف سے دکھائی نہیں دیتی اور عذاب میں دیر ہونے کے سبب سے ان کے منکر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کو عذاب کی دھمکی جھوٹ دی گئی تو دفعتاً امید کا دروازہ کھلتا ہے اور خدا کی تائید و نصرت کے پرے اس طرح آتے دکھائی دیتے ہیں کہ صالح لوگوں کے دل قبول کے لئے کھول دئے جاتے ہیں اور معاندوں پر کسی نہ کسی طرح عذاب آکر ان کا استیصال ہو جاتا ہے، فرمایا:

حَتّٰىٓ اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا	یہاں تک کہ جب پیغمبروں کو (اپنی قوم کے ایمان سے) مایوسی

اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا (یوسف ۱۲: ۱۱۰)
ہونے لگی اور ان کے منکروں کو یہ خیال ہونے لگا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تو ہماری مدد آگئی۔

اللہ تعالیٰ کی اسی تائید ونصرت اور حفاظتِ دعوت کا یہ یقین ان کو ہوتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو اس راہ میں جھیل لیتے ہیں اور اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لئے پھرتے ہیں، مخالفتوں کی فوج ولشکر، تیغ وخنجر اور خوف وخطر کے باوجود اپنی دعوت وتبلیغ کے فریضہ سے باز نہیں آتے اور کسی دام پر بھی مخالفوں سے صلح پر آمادہ نہیں ہوتے، منکروں کو شروع شروع میں ان کی ظاہری بے چارگی اور تنہائی کو دیکھ کر ان کی ناکامی کا گمان ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ ان کے سوءِ ظن کی تردید کر کے فرماتا ہے:

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ (ابراہیم ۱۴: ۴۷)
سو مت خیال کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا۔

ازل کے دن ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ سچائی کے ان پکارنے والوں ہی کی آخر جیت ہوگی:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِىْ (مجادلہ ۵۸: ۲۱)
اللہ لکھ چکا کہ میں ہی غالب ہوں گا اور میرے رسول۔

خاتمہ: اس تفصیل اور تشریح سے مقصود ناظرین کو نبوت کے اصلی کمالات کا ایک جلوہ دکھانا تھا۔

فلسفی را از پیمبر وا شناس — آبگینہ را ز گوہر واشناس
آبگینہ را نہ پنداری بدست — جزدے کہ گوہرے آری بدست
چون گہر آمد بدستت شب چراغ — آبگینہ شد سیہ چوں پر زاغ
فلسفی اندر بن چاہ نژند — نرد باں دارد بخورشید بلند
نرد بانش می برد تاچند ارش — پس بخاک افتد نگوں گشتہ سرش
واں پیمبر خود زبام آسماں — رشتۂ افگندہ سوئے خاکیاں
رشتہ جاں را بدیں رشتہ بتاب — پس برآ تا بارگاہِ آفتاب
زآسمان پیغمبر آوازت دہد — فلسفی از خاک پروازت دہد

ایں زدورت رہ نماید سوئے جاں
واں بخواند خود ترا از کوئے جاں(۱)

---

(۱) از دیوانِ فارسی مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۹ / جمادی الثانیہ ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء ونوائے پہلوی ص ۴۸، ۴۹۔

شبِ ظلمت

پیمبرِ اسلام ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت

اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کی ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے، بارش کی خنکی سخت امس کے بعد ہی زیادہ خوش گوار معلوم ہوتی ہے، روشنی کی پوری قدر شبِ تارہی میں ہوتی ہے اور فضا جس قدر تاریک ہو، بجلی کی چمک اتنی ہی زیادہ درخشاں نظر آتی ہے، تو اس میں شبہ نہیں کہ ہر اصلاحی تحریک کی وقعت اور عظمت کے جانچنے میں یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ دنیا اس وقت کتنی گمراہی میں مبتلا اور اصلاح کی محتاج تھی اور ایسی اصلاح کی محتاج تھی جس کے لئے پیغمبرانہ دست و بازو کی حاجت تھی اور وہ بھی ایک ایسے پیغمبر کے دست و بازو کی جس کے متعلق خود خدا یہ فرما سکے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ... (فتح ۴۸: ۱۰)	جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، وہ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور ان کے ہاتھوں کے اوپر خدا کا ہاتھ ہے۔

اسلام یا محمد رسول اللہ ﷺ کے پیغام اور تعلیم کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کی ایک عظیم الشان روحانی و اخلاقی و معاشرتی دعوت تھی، اس بنا پر ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی کیا حالت تھی؟ اس وقت کی دنیا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا کرۂ ارضی تھا جس پر آفتاب نہیں چمکتا تھا تو بالکل سچ ہوگا، تمام دنیا میں سچے اور صحیح عقیدہ کا کہیں وجود نہ تھا، توحید کی روشنی سے دنیا کا ذرہ ذرہ محروم تھا، مصر و یونان و روم میں سورج چاند اور مختلف سیاروں اور ستاروں کی خدائی تھی ان ہی کے معبد تھے اور ان ہی کے ناموں پر بے گناہ انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں، ہر جگہ پتھر کی مورتوں اور مٹی کی صورتوں اور سونے چاندی اور جواہرات کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

اس وقت کی دنیا میں اخلاق کے تین معلم تھے، رواقی، عیسائی اور بودھ مت کے پیرو اور یہ تینوں کے تینوں تجرد، رہبانیت اور جوگی پن میں مبتلا ہو کر اس طرح عضوِ معطل ہو گئے تھے کہ دنیا کا دستِ ترقی شل ہو کر رہ گیا تھا اور ایسی سخت سنگ دلانہ ریاضتوں کو نیکی اور عبادت کا مرادف سمجھ رکھا تھا

کہ آج ان کی تفصیلات سننے سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مسیحؑ نے چھ صدی قبل تزکیۂ نفس کے کچھ درس دئے تھے لیکن مدت ہوئی دنیا اس سبق کو بھلا چکی تھی، یہ بھی سچ ہے کہ موسیٰؑ نے اس سے بھی پیش تر ہدایت و نجات کی ایک شمع جلائی تھی لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آندھی میں یہ چراغِ طور بھی جل کر گل ہو گیا تھا اور پھر یہ بھی سچ ہے کہ مدتِ مدید ہوئی کہ زرتشت نے روحانیت کی آگ سلگائی تھی لیکن یہ شعلہ بھی انسانی خون کے چھینٹوں سے سرد ہو چکا تھا، یہ بھی سچ ہے کہ اس سے پہلے بھی بودھ نے آریہ ورت کے پہاڑوں اور غاروں میں روح کا دار الامن ڈھونڈ نکالا تھا، مگر حوادث کے طوفان نے ان پہاڑوں کو بے نام ونشان صحرا اور ان غاروں کو درندوں کا بھٹ بنا دیا تھا، ہر قوم دوسری قوم سے برسرِ پیکار اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا، حرص وطمع اور کشت وخون کی گرم بازاری تھی، نفسِ انسانی کی ملکوتی طاقت جذباتِ خبیثہ کے دیوتا کے سامنے پامال ہو چکی تھی، عدل وراستی اور پاک بازی وپارسائی کے عطرِ معنبر کی خوشبو انسان کے جامۂ خاکی سے اڑ چکی تھی، توحید اور خدا پرستی کا نور دیوتاؤں، دیبیوں، ستاروں، شہیدوں، ولیوں اور مجسموں کی پرستش کی عالم گیر تاریکی میں چھپ گیا تھا، غرض دنیا کے حالات ہر طرح سے اس ضرورت کے متقاضی تھے کہ کوئی عالم کا مصلح، اخلاق کا معلم، حق کا داعی، بنی نوع کا نجات دہندہ، آخری بار وجود میں آئے اور انسانیت کے شیرازہ میں جو عرصۂ دراز سے پراگندہ ومنتشر ہو رہا تھا پھر نظم وانتظام پیدا کردے اور روحانیت وخدا پرستی کے خزاں رسیدہ باغ کو ازسرِ نو پر بہار بلکہ سدا بہار اور دنیا کے ظلمت کدہ کو پھر مطلعِ انوار بنادے۔

یہ اس عہد کی دنیا کی حالت کا ایک اجمالی خاکہ تھا، تفصیل کے لئے ہمیں مختلف قوموں اور ان کے مذہبوں کی تاریخ پر ایک ایک کر کے نظر کرنی چاہیے۔

ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی حالت کیا تھی؟: محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت مصر، یونان، کلدانیا، اسیریا اور بابل کی عظمت افسانۂ پارینہ بن چکی تھی، خود عرب ومضافاتِ عرب میں جو نام ور حکومتیں کبھی تھیں مثلاً نابتی، حمیری، سبائی وغیرہ مدت گذری کہ ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

اس موقع پر صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ صبح سعادت کے طلوع کے وقت کون کون قومیں دنیا میں حکم راں تھیں اور ان کی مذہبی واخلاقی حالت کیا تھی اور دنیا کے مذاہب اس وقت کی روحانی حالت کے سنبھالنے کی کہاں تک استطاعت رکھتے تھے، اس وقت روئے زمین کی اہم طاقتیں دو ہی تھیں، فارس اور روم، فارس کا مذہب مجوسیت تھا جس کا دائرہ عراق سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک محیط تھا اور روم کا مذہب عیسوی تھا جو یورپ، ایشیا اور افریقہ کے تینوں براعظموں کو گھیرے تھا لیکن مذہبی حیثیت سے دو اور قومیں بھی ذکر کے قابل ہیں جن میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ قدامت کا دعویٰ ہے اور وہ یہود اور ہندو ہیں۔

مجوس فارس: عرب کی پہلی ہم سایہ سلطنت فارس تھی، جس کے تمدن کا ستارہ ایک زمانہ میں اوجِ کمال پر تھا، مگر عہدِ بعثت سے سو ڈیڑھ سو برس پہلے سے ساسانی شان وشوکت اور کیانی جاہ وجلال مٹتے مٹتے سایہ سارہ گیا تھا، مسلسل بغاوتوں، سفا کانہ خوں ریزیوں اور سیاسی بدامنیوں نے اس کو تہ وبالا کر دیا تھا، بادشاہوں کے ظلم وستم اور امرا کی عیاشیوں اور خود غرضیوں نے صداقت، اخلاص اور ہر قسم کے اخلاقی جوہر کو جس کے خمیر سے قوم کی زندگی تعمیر ہوتی ہے فنا کر دیا تھا۔

ایران میں بابل کے اثر سے ستارہ پرستی بہت عام تھی، اسی کا اثر ہے کہ فارسی لٹریچر میں افلاک اور ستاروں کی کارفرمائی آج تک نمایاں ہے، زردشت نے اس تاریکی میں اپنی آگ روشن کی اور نور وظلمت یا خیر وشر کے دو خالق یزدان واہرمن اس کے دو خدا اور آگ اس کی مسجود بنی، اسلام سے کچھ صدیاں پیشتر مانی نے مسیحیت اور مجوسیت کی آمیزش سے مذہب کا ایک مرقع تیار کیا تھا جس میں نور وظلمت کے فلسفہ کا ایسا گورکھ دھندا بنایا تھا جس سے اخیر اخیر تک اس قوم کو نکلنا نصیب نہ ہوا (۱)، اس کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا سے گوشہ گیری کر کے اس کو ویران و برباد اور ترکِ ازدواج سے نسل انسانی کو منقطع کر دیا جائے تاکہ بدی کا خاتمہ ہو جائے (۲)، اخلاقی حیثیت سے محرکات کا وجود ہمیشہ ان کے ہاں مختلف فیہ رہا، باپ کا بیٹی کو اور بھائی کا بہن کو اپنی زوجیت میں لینا وہاں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی (۳)، یہ سن کر کس قدر حیرت ہوگی کہ یزدگرد ثانی جو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں وہاں کا

---

(۱) کتاب الفہرست ابن ندیم ذکر مانی ص ۴۵۸ ومابعد وکتاب البدء والتاریخ مقدسی ج ۴ ص ۲۴۔ (۲) تاریخ غرر اخبار الفرس ثعالبی مطبوعہ پیرس ص ۵۰۲۔ (۳) تاریخ غرر اخبار الفرس ثعالبی مطبوعہ پیرس صفحہ ۲۷، ابوداؤد میں ہے حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں حکم دیا کہ مجوسیوں کو اس فعل شنیع سے باز رکھا جائے (کتاب الخراج والامارہ والفئ باب فی اخذ الجزیۃ من المجوس ج ۲ ص ۱۳۰، ۱۲۸۰ھ)

بادشاہ تھا، اس نے اپنی بیٹی سے اپنا عقد کیا اور پھر اس کو قتل کر ڈالا (۱)، عورتوں کو اس قوم اور اس مذہب میں جو حیثیت حاصل تھی وہ ان افسانوں اور مقولوں سے ظاہر ہے جو ایرانی ادبیات کا اب بھی جز ہیں اور جو شاہنامہ کے اوراق میں اب بھی ہر شخص کو نظر آسکتی ہے، عورتوں کی بے وفائی، بداخلاقی اور ان پر عدمِ اعتماد پرانے ایرانی تمدن کا سب سے بڑا جز تھا۔

سلاطین اور امرا درجہ بہ درجہ رعایا کے خدا اور دیوتا تھے جن کو سجدے کئے جاتے تھے، (۲) ان کی الوہیت کے گیت گائے جاتے تھے، ان کے دربار میں کوئی بیٹھ نہیں سکتا تھا، ان کے خلاف کوئی لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، ان کے جرائم پر ان کو سزا نہیں دی جاسکتی تھی، رعایا ان کے مظالم کے سامنے دم نہیں مار سکتی تھی۔

ملک کا بڑا حصہ رومی عیسائیوں کی دائمی جنگ سے پریشان حال تھا اور گرجاؤں اور آتش کدوں کی باہمی آویزش کا غیر مختتم سلسلہ قائم تھا، جب رومی فاتح ہوتے تو آتش خانے ٹوٹ کر کلیسے بن جاتے اور جب ایرانی غالب آتے تو کلیسے ٹوٹ کر آفتاب دیوتا کے معبد اور آتش خانے تعمیر ہو جاتے، یہودیوں پر جو مظالم توڑے جاتے تھے اس کا ایک مختصر سا نقشہ تورات کے قصہ ایسر میں نظر آتا ہے اور بعد کو مفتوح عیسائیوں پر وہ جس جس طرح ظلم کرتے تھے اس کی تفصیل گبن کے اوراق میں منتشر طور پر ملے گی۔

بعثت سے پہلے جہاں بانی کا قرعہ قباد اول بن فیروز کے نام پڑا، بیرونی حملوں اور اندرونی بدنظمیوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا، آخر رعایا نے قباد کو قید کر دیا (۳)، قباد نے قید خانہ سے بھاگ کر تاتاریوں کے پاس پناہ لی اور ان کی اعانت سے دوبارہ تاج حاصل کیا لیکن ملک پر اس سے بھی زیادہ مصیبت یہ نازل ہوئی کہ اس کے عہد میں مزدک نام ایک شخص پیدا ہوا جو اس امر کی تعلیم دیتا تھا کہ دولت اور عورت کسی خاص شخص کی ملک نہیں، بلکہ ان کو تمام جماعت میں مشترک ہونا چاہیے، چنانچہ ایک شخص کی بیوی مزدک کے عقائد کی رو سے ہر شخص کے ساتھ ہم بستر ہوسکتی تھی، عیش پرست اور ہوس راں امرا اور عوام دونوں نے اس کو خوشی خوشی قبول کیا (۴)، اس مذہب نے بہت جلد شاہی سایہ میں

(۱) مورخوں کی تاریخ عالم ج ۸ ص ۸۴ (۲) غرر اخبار الفرس ثعالبی ص ۵۰۰، پیرس (۳) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم جلد ۲۱ ص ۲۲۳، (۴) غرر اخبار الفرس ثعالبی ص ۵۹۸ تا ۶۰۰، پیرس۔

ترقی حاصل کی اور خود قباد نے اس دین کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا، قوم کی اخلاقی حالت پر اس تعلیم کا جو اثر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ سارا ملک عیش پرستی اور ہوس رانی کے نشہ میں سرشار ہو گیا۔

۵۳۱ء میں قباد کی جگہ خسرو نوشیرواں نے لی، ایرانیوں میں اس کی عدل پروری، اب تک مشہور ہے مگر اس کو یہ مبارک لقب اپنے عزیزوں اور افسروں اور ہزاروں بے گناہوں کے قتل کے بہ دولت ملا، مزدکی فتنہ کو اس نے تلوار کے زور سے دبانا اور کیشِ زردشتی کو دوبارہ فروغ دینا چاہا، مگر خود اس کا بیٹا نوشزاد تثلیث پرستی کی طرف مائل تھا، اس کے پاداش میں قید ہوا اور قید سے بھاگ کر ایک عیسائی فوج لے کر زردشتیوں سے صف آرا ہوا اور مارا گیا۔

۵۷۹ء میں نوشیرواں نے وفات پائی اور ایران کا پایۂ تخت ہرمز چہارم کے حصہ میں آیا، اغیار کی دست اندازیوں کے ساتھ اندرونی بدنظمی اور باہمی خانہ جنگی، بادشاہوں کی تغافل شعاری، امرا کی عیش پرستی اور عوام کے اخلاقی انحطاط میں برابر ترقی ہی ہوتی گئی، یہاں تک کہ ۶۳۶ء میں مجاہدینِ اسلام کی فتح مندی کے طوفانی صرصر کے سامنے ملک فارس کی یہ ٹمٹماتی ہوئی شمع ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔

اوپر کے بیانات سے معلوم ہوا ہوگا کہ ایران کی سرزمین نغمۂ توحید سے کبھی گوش آشنا نہیں ہوئی، اخلاق کے متعدد ابواب ہیں جو ان کے آئین میں کبھی داخل نہیں ہوئے، یزدان و اہرمن، نور و ظلمت اور خیر و شر کی بھول بھلیوں نے ان کو ہمیشہ سرگرداں رکھا، حکومت اور شاہی کے متعلق ان کا تخیل خدائی کا ہم رتبہ تھا، اسلام و فارس کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہؓ مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر جب سپہ سالارِ ایران کی بارگاہ میں گئے اور آزادی کے ساتھ جا کر اس کے برابر بیٹھ گئے تو ایرانی امیروں کو اس میں اپنے نائب السلطنت کی توہین نظر آئی اور مغیرہؓ کو سامنے سے ذلت کے ساتھ اٹھا دیا، انہوں نے جواب میں کہا ہم عربوں کا یہ دستور نہیں کہ ایک خدا بن کر بیٹھے اور دوسرے اس کے سامنے غلامی اور بندگی کریں۔ (۱)

آنحضرت ﷺ کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ صدی پیش تر سے ایران میں جس قسم کا سیاسی

(۱) تاریخ طبری واقعات ۱۴ھ ج ۵ ص ۲۲۷۴، مطبع بریل۔

انحطاط شروع ہو گیا تھا وہ روز بہ روز بڑھتا ہی گیا اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ فارس کے روحانی آتش کدہ میں اب زندگی کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہ گئی تھی، اسی لئے جب اسلام کا نور طلوع ہوا تو اس کے شیوع کے لئے کوئی دوسرا پردہ بیچ میں حائل نہ ہوا، سرجان ملکم جن کا مسیحی تعصب عساکرِ اسلامی کو ان کی زبان سے قزاقانِ عرب کا لقب دلواتا ہے، فتح فارس کے متعلق حسب ذیل رائے دیتے ہیں:

"یزدجرد ثالث کا عہد حکومت اس لئے یادگار ہے کہ اسی زمانہ میں فارس کی قدیم شہنشاہی کا تختہ برہنہ تن "سوسمار خاروں" کے ایک دستہ نے الٹ دیا کہ اسی تحقیر آمیز لقب کے ساتھ عرب قبائل کے یہ مغرور ہمسایہ ان کا ذکر کرتے تھے، اس انقلابِ عظیم کی علت کوئی معمولی سبب نہیں ہوسکتا (مسلمان) فارسی مورخین کچھ تو اپنے حبِ وطن اور کچھ اپنی وہم پرستی کی بنا پر اس واقعہ کو ایک معجزۂ عظیم خیال کرتے ہیں، جس کے ذریعہ سے خدا نے محمد کی صداقت کو ظاہر کر دیا لیکن جو لوگ دنیاوی حیثیت سے اس واقعہ پر غور کرتے ہیں انہیں فوراً نظر آجاتا ہے کہ فارس کی ایسی سلطنت جو عیش پرستی کے ہاتھوں لاغر و نحیف ہو چکی ہو جس میں اندرونی مناقشات کے باعث بدنظمیاں پھیلی ہوئی ہوں جو بیرونی محاربات سے یک سرخستہ و ناتواں ہو اور جو اپنی کبرسنی اور نقاہت سے قعرِ زوال کی جانب خمیدہ پشت ہو، اس کے لئے پرجوش قزاقانِ عرب کی مدافعت کرنا سخت دشوار تھا۔ (۱)"

مگر سوال یہ ہے کہ پاک نژاد ساسانیوں کی خستگی و ناتوانی، نقاہت و کمزوری "قزاقانِ عرب" ہی کی ترقی کی کیوں تمہید بنی؟ کیا نہتے عربوں کے پاس اس سے زیادہ سامانِ جنگ اور سپاہی تھے جو عراق و ایران کے اخیر اخیر معرکوں میں بھی ایرانی عربوں کے مقابلہ میں لاتے رہے، واقعہ یہ ہے کہ زرتشت کی آگ میں اب گرمی نہیں باقی رہی تھی، نور و ظلمت، خیر و شر، نیکی و بدی کے فلسفہ نے ایران کی ہر قسم کی عملی طاقت فنا کر دی تھی، یزدان اور اہرمن کی دو عملی حکومت نے روحانی امن و امان کی سلطنت برباد کر دی تھی، بیسیوں چھوٹے بڑے فلسفیانہ مذہبی فرقے پیدا ہو گئے تھے جن میں سب سے اہم مانوی فرقہ تھا جو عیسائیت اور مجوسیت کا معجونِ مرکب تھا، آخر میں مزدکی فرقہ کی بہیمانہ تعلیم نے

(۱) ملکم صاحب کی تاریخِ ایران جلد اول ص ۱۳۳

ایران کی اخلاقی روح کو اور بھی موت کے قریب کر دیا(۱)۔ نوشیرواں نے تلوار کی نوک سے اس فتنہ کو دبایا اور اس کے صلہ میں ''بادشاہ عادل ودادگر'' کا خطاب بھی پایا تاہم ایران کی روحانی زندگی ان خون کے چھینٹوں کے بعد بھی اسی طرح تشنہ لب رہی جس طرح پہلے تھی اور منتظر تھی کہ دنیا کے خشک صحرائے عرب سے چشمہ ابل کر ادھر آئے تو وہ اپنی پیاس بجھائے۔

عیسائی روم: آغازِ اسلام کے وقت جس قدر ایران کے جسمانی و روحانی شہنشاہی کے اوراق منتشر و پراگندہ تھے، روم کی قبائے سلطنت اس سے کچھ کم کرم خوردہ نہ تھی، حالاں کہ یہ وہی رومۃ الکبریٰ ہے جو یونان کے زوال کے بعد دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سمجھی جاتی تھی اور جس کے ایک تاج دار جولیس سیزر کا نام ہمیشہ کے لئے قیصر کی صورت میں بادشاہ و شہنشاہ کے مرادف بن گیا، حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی سلطنت میں مبعوث ہوکر دنیا کو امن و سلامتی کا پیام سنا کر رخصت ہوئے، ان کے رفع و صعود کے بعد ہی ان کے شاگردوں میں فرقہ آرائیاں شروع ہوئیں، اور بالآخر پال نے جو ایک نو عیسائی یہودی تھا اس طرح عیسائیوں پر غلبہ پایا کہ اس کے بدعات کی خاک میں اصلی عیسویت ہمیشہ کے لئے دفن ہوگئی اور باپ بیٹے روح القدس کا مشرکانہ عقیدہ اس میں داخل ہوگیا اور تورات جس کا کوئی نقطہ خود حضرت عیسیٰ بھی مٹا نہیں سکتے تھے۔(۲) وہ ان کی روحانی شاگردی کے مدعی (پال) کے ہاتھوں ہمیشہ کے لئے لعنت قرار پائی، (۳) ۳۲۵ء میں رومی سلطنت کے مشرقی و مغربی دو حصے ہوگئے، مشرقی حصہ کے تاج دار قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب اختیار کیا اور رفتہ رفتہ پوری رومی حکومت میں یہ مذہب پھیل گیا مگر درحقیقت اس مشرقی تاج دار روم کے اس قبول مذہب کا جذبہ اخلاص و صداقت سے زیادہ سیاست اور سلطنت کی مصلحت پر مبنی تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اب باپ بیٹے اور روح القدس کی تثلیثی الوہیت میں ہر نیا ملک جو فتح ہوتا اس کا دیوتا کسی نہ کسی نام اور رسم سے اس مذہب میں شامل ہو جاتا، تختِ سلطنت کے غیر متوقع حصول نے مذہبی خاکساروں میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ کلیساؤں نے مذہبی شہنشاہی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا، اس کے لئے عقائد کی وہ لڑائیاں کھڑی کی گئیں کہ شاہانہ سایہ میں بیٹھ کر کونسلوں نے خدا کے دین کا خاکہ تیار کیا، اتحاد اور اجتماع کی ہر نئی کوشش

---

(۱) تفصیل کے لئے فہرست ابن ندیم دیکھو صفحہ ۴۷۹ و ۴۸۰ مصر (۲) انجیل متی ۵، ۱۷، ۱۸ (۳) یہ مضامین عیسائیوں کی انجیل کے حصہ اعمال اور خطوط میں جا بجا بہ تصریح مذکور ہیں۔

نئی مذہبی تفریق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور ایک عیسوی مذہب ایک صدی کے اندر اندر بیسیوں فرقوں میں تقسیم ہوگیا۔

۳۳۷ء میں قسطنطین کی وفات پر مذہبی خانہ جنگیوں کے ساتھ ساتھ رومیوں کی سیاسی خانہ جنگیوں کی زیرِ خاکستر آگ بھی زور شور سے شعلہ زن ہوئی ، اعیانِ سلطنت میں مختلف گروہ بندیاں ہوگئیں اور باہمی نفاق اور فتنہ وفساد کا بازار گرم ہوگیا بالآخر سلطنتِ روم مختلف صوبوں میں تقسیم ہوکر مختلف دعوے دارانِ حکومت کے حصہ میں آئی (۱)، ناقابل فرماں رواؤں کی کمزوری کو دیکھ کر ایک طرف گوتھ، ونڈال وغیرہ بعض وحشی قوموں نے حملے شروع کئے اور دوسری طرف خود دور افتادہ صوبوں کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہوگئی ،نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطنت روم کا مغربی بازو، جو برطانیہ، فرانس وغیرہ پر مشتمل تھا بالکل کٹ گیا اور خود روم کا دار الحکومت دشمنوں کے حملوں سے محفوظ نہ رہ سکا (۲)۔ اس وقت یعنی پانچویں صدی کے بیچ میں لوگوں کو صاف نظر آرہا تھا کہ ان کے مورثِ اعلا نے جو بارہ کرگسوں کو خواب میں دیکھا تھا اور جس کی بنا پر اس زمانہ کے کاہنوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ سلطنت بارہ صدیوں تک قائم رہے گی ،اب اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت آگیا، مورخ گبن اس زمانہ کی تصویر ان لفظوں میں کھینچتا ہے:

> ”اس پیشین گوئی نے جس پر اس قوم نے اپنے عروج واقبال کے زمانہ میں کبھی اعتنا بھی نہ کی تھی، اب بارہ صدیوں کے خاتمہ پر جب کہ ہر طرف سے ذلت اور بد قسمتی کا سامنا تھا، اہلِ روم کو یاس آمیز جذبات سے پر کردیا......... لیکن ان کے زوال کی علامتیں کرگسوں کے خواب سے زیادہ واضح ونمایاں موجود تھیں، رومن حکومت مخالفین کی نظروں میں روز بہ روز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں زیادہ ظالمانہ اور ناقابلِ برداشت ہوتی جاتی تھی، کفایت شعاری جتنی زیادہ ضروری ہوتی جاتی تھی ، اسی نسبت سے اس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹیکس میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔(۳)“

---

(۱) گبن کی تاریخ زوال وانحطاط سلطنت روم جلد اول ص ۴۸۴، ۴۹۱۔ (۲) ایضاً جلد دوم باب ۳۶ و باب ۳۸۔
(۳) ایضاً ۴۶۱۔

امرانے اپنے مصارف کا بار بھی عام رعایا پر ڈالنا شروع کیا جس کے باعث وہ اپنی قلیل آمدنی سے بھی محروم ہوگئی، محصول کی عدمِ ادائیگی کی صورت میں رعایا پر اس قدر جبر کیا جاتا تھا کہ اس کے دل میں حکومت کی طرف سے نفرت وعداوت پیدا ہوگئی، یہاں تک کہ وہی رومن قوم جو کبھی اپنے اس لقب پر فخر کرتی تھی، اب اپنے کو اس قوم کی طرف منسوب کرتے شرمانے لگی اور رومن حکومت پر ہر وحشی سلطنت کی محکومیت کو ترجیح دینے لگی، امرا، وزرا اور سلاطین خود اپنی ناعاقبت اندیشیوں سے رعایا کو اپنا دشمن بناتے اور جب بغاوت ہوتی تو فوج کشی کرتے اور ناکام رہتے، غرض اندرونی بدنظمیوں سے ملک کی یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ گبن کے الفاظ میں:

> ''اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین فنا بھی ہو جاتے تو ان کی مجموعی معدومیت بھی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال و بربادی سے نہیں بچا سکتی تھی۔(۱)''

پانچویں صدی کے خاتمہ پر مغربی حصہ کے نکل جانے کے بعد مشرقی صوبوں تک یعنی ڈینوب سے لے کر دجلہ و نیل تک کی سرزمین روم کے ماتحت رہ گئی تھی لیکن اس کی حالت بھی روز بہ روز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی، مورخین کا بیان ہے کہ رومن فوج کی مجموعی تعداد جو ایک زمانہ میں ۶۴۵۰۰۰ تھی، اب شاہ جسٹنین کے زمانہ میں (یعنی ۵۲۷ء) گھٹ کر ایک چوتھائی سے بھی کم یعنی کل ۱۵۰۰۰۰ رہ گئی تھی اور وہ بھی نہایت متفرق و ابتر حالت میں، رعایا کی جیبیں خالی تھیں، فوج کی تنخواہیں چڑھی ہوئی تھیں اور امرا و اعیانِ سلطنت اپنے ذاتی مصارف کے لئے ہر طرح کے جعل و فریب، رشوت ستانی اور لوٹ مار کو جائز رکھتے تھے، فوج میں یوں تو بہت سے سپاہیوں کے نام لکھے ہوئے تھے لیکن میدانِ جنگ میں جانے کے وقت بہت تھوڑے سے لوگ تیار ہوتے، فوجی افسر فنِ جنگ کے بجائے اپنا وقت باہمی حسد و رقابت میں صرف کرتے اور ہر افسر کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے افسر کی بدنامی وذلت سے فائدہ اٹھا کر خود ترقی و منصب حاصل کرے۔(۲)

اندرونی بدنظمیوں پر مستزاد یہ تھا کہ بیرونی غنیم اہلِ روم کو ایک دم کے لئے چین سے بیٹھنے نہیں دیتے تھے، روم و فارس کے درمیان مدت سے لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا، پھر

(۱) گبن کی تاریخ زوال وانحطاط سلطنت روم جلد دوم ص ۴۶۱ (۲) حوالہ مذکور جلد ۳ ص ۱۱۳۔

لومبارڈس، گوتھس، ونڈالس وغیرہ کے پیہم حملے، روم کی رہی سہی قوت کو اور بھی پامال کر رہے تھے۔

الغرض چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر یعنی خاتم النبیین ﷺ کی ولادت سے دو چار سال بعد روم بقول گبن کے اپنے زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گیا تھا اور (گبن کی زبان میں) اس کی مثال بعینہٖ اس عظیم الشان درخت کی ہوگئی تھی جس کے سایہ میں ایک وقت تمام اقوامِ عالم آباد تھیں، مگر اس پر ایسی خزاں آئی کہ برگ وبار کے ساتھ اس کی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہوگئی تھیں اور اب خالی تنہ خشک ہو رہا تھا، خود پایہ تخت کے اندر غنیم کے گھس آنے کا ایسا خوف تمام آبادی پر چھایا ہوا تھا کہ تقریباً کل کاروبار بند ہوگئے تھے وہ بازار اور تماشا گاہیں جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی اب ویران اور سنسان پڑی تھیں، عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک عرصہ سے تاہل کے بجائے تجرد کی زندگی زیادہ پسند کرتے تھے تاکہ زیادہ آسانی اور آزادی کے ساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تشفی کر سکیں۔(۱)

ملک کی عام سیاسی واخلاقی حالت سے قطعِ نظر کر کے جب ہم مذہبی پہلو پر نظر کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ دل خراش تصویر نظر آتی ہے، بت پرست رعایا کو چھوڑ کر جو ستاروں، دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا میں بہ دستور مصروف تھی اور لوگ جنہوں نے عیسائیت قبول بھی کر لی تھی وہ بھی باپ، بیٹا، روح القدس اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے، حضرت عیسیٰ اور مریم علیہما السلام و روح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کی تعیین نے بیسیوں فرقے پیدا کر دئے تھے جن میں زبانی مناظروں سے گذر کر جنگ وجدل کی نوبت آگئی تھی یہاں تک کہ ۵۱۴ء میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں کے درمیان ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑی، جس میں ۶۵۰۰۰ ہزار عیسائیوں کو خارج البلد ہونا پڑا(۲)، اس جنگِ عظیم کے علاوہ ہمہ وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا اور بارہا چھوٹی باتوں پر کشت وخون کی نوبت آجاتی، پادریوں نے اپنے منصبِ مذہبی کو حصولِ جاہ کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا، اس بنا پر محض حب جاہ کی خاطر وہ ہر طرح کی ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے، پادریوں کے ایک اسقفِ اعظم سینٹ سرل نے جو جو سفاکیاں کی ہیں ان کی تفصیل لکھنے کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہے، ایک مرتبہ اس نے اپنے مریدوں کو ہم راہ لے کر غیر مسلح یہودیوں پر دھاوا کیا اور ان سب کو جلاوطن کر دیا، ان کا مال واسباب سرل کے مریدوں کے ہاتھ لگا اور ان کے معابد زمین

(۱) گبن جلد ۳ ص ۳۷۲ (۲) گبن جلد ۳ ص ۳۴۴۔

کے برابر کردیئے گئے، سرل کا حریف ارسٹس نامی پادری تھا ایک روز جب ارسٹس راستہ سے گذر رہا تھا تو ۵۰۰ راہبوں کی جماعت اس پر ٹوٹ پڑی اور اپنی سنگ باری سے اس کو خون میں نہلا دیا (۱)، سرل کی ایک خاتون دوست بلیشیا نامی تھی، ایک روز وہ اپنی درس گاہ سے واپس آرہی تھی کہ راہبوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پر حملہ کردیا، گاڑی سے اتار کر برہنہ کی گئی اور اس حالت میں تمام شہر کی سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے اسے کلیسا میں لائے جہاں پہنچ کر پادری پیٹر کے گرز سے اس کا خاتمہ کردیا گیا، قتل کے بعد اس کا گوشت ہڈیوں سے جدا کیا گیا، نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور آلائشِ جسم کو آگ میں ڈال دیا گیا (۲)، یہ واقعات ایسے ہیں جن کے ذکر سے آج قلم لرزتا ہے مگر عیسائی مذہب کے علم برداروں کا سب سے روشن کارنامہ ہے، یہی حالت ان تمام ملکوں کی تھی جہاں رومیوں کے زیرِ سایہ عیسوی مذہب پھیلا ہوا تھا، یعقوبی، نسطوری اور دوسرے فرقے جو سرکاری عیسوی مذہب سے الگ تھے، وہ دور دراز صوبوں اور ملکوں میں اپنی پناہ ڈھونڈتے تھے، نائیس کی کونسل کے بعد آریوس اور اس کے حریفوں میں جو معرکہ آرائیاں ہوئیں، انہوں نے اس حقیقت کو واضح کردیا کہ شہزادۂ امن کا مذہب ان جنگ جویوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے سے بچ نہیں سکتا۔

مسٹر مارس جو پیغمبر اسلام کو نعوذ باللہ بہت بڑا مکار قرار دیتے ہیں، اپنی ''تاریخِ ہندوستان'' میں ضمناً ایک موقع پر تحریر کرتے ہیں:

> ''اس نازک موقع پر (یعنی ظہور اسلام کے وقت) ان بے باکانہ بدعات کے درمیان جو چرچ کو نجس کررہے تھے اور اختلافات کے اس غیر منقطع سلسلہ کے درمیان جو چرچ میں ایک ہلچل ڈالے ہوئے تھے، اگرچہ مشرق میں اصلی مسیحیت کی شعاع نظر آتی تھی لیکن بہت ہی مدھم، روم کے قیصروں کی قوت کچھ تو اندرونی نزاعوں اور کچھ بیرونی حملوں کے باعث اپنی بنیاد سے اکھڑ کر قعرِ فنا کی طرف تیزی کے ساتھ جارہی تھی، یہود بے صبری کے ساتھ گلیلی کے اس حقیر شخص کے مذہب پر نظر کررہے تھے جس کے دین کو اب شاہ قسطنطین کے مسیحی ہوجانے کے بعد پوری شان و شوکت اور شاہی عظمت حاصل ہوگئی تھی اور ہر اس تحریک کی مدد کے

---

(۱) گبن ج ۳ ص ۳۲۷ (۲) ایضاً ص ۳۲۷ و ۳۲۸، نیز ڈریپر تاریخ معرکہ آرائی مذہب و سائنس ص ۵۵۔

لئے تیار تھے جو ایسے قابل نفرت مذہب کا خاتمہ کرنا چاہے ہے......اہلِ فارس نہایت غیظ وغضب کے ساتھ ان پرجوش و نادار فتح مند عیسائیوں کو دیکھ رہے تھے جنہوں نے ان کے معبود ''آتشِ شمسی'' کی بے حرمتی کی تھی اور شرک کی ساری دنیا اپنے برباد شدہ معبودوں اور ڈھئے ہوئے معبدوں پر ماتم کر رہی تھی، ان کے انتقام کے لئے آمادہ اور مستعد تھی۔(۱)''

مارس صاحب واقعات کی نقشہ کشی میں خواہ کتنا ہی مسیحی رنگ بھریں لیکن نفسِ واقعات کی صحت ان کو شاید ہم سے بھی زیادہ مسلم ہے۔

بہر حال مورخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی تک مسیحیت کی جو حالت رہی ہے وہ اس کے لئے باعثِ ننگ ہے، مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی، اصل رومی بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا، حضرت مسیحؑ کے ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں کی تحلیل، مصر کو قابو میں کرنے کے لئے کی گئی، جس سے حضرت مسیح کی ''وہی ایک ہے'' کی تعلیم ہمیشہ کے لئے ان کے مذہب سے مٹ گئی، ضعیف الاعتقادی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ قبر پرستی عام ہوگئی تھی اور ہر بڑے پادری سے اس کی وفات کے بعد دعا مانگی جاتی تھی، ملک شام میں جو بڑے پادری اور بطریق تھے ان کے معتقدان کو سجدے کرتے تھے(۲)، مسیح و مریم، روح القدس اور حواریین اور مسیحیت کے دیگر اساطین کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش اس کثرت سے ہونے لگی کہ اس کی نظیر زمانہ مابعد کے رومن کیتھولک فرقہ کی بت پرستی میں بھی نہیں ملتی۔(۳)

سیل صاحب ترجمۂ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''گرجا کے پادریوں Clergy نے مذہب کے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن، محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا، اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے، اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کے لئے باعثِ ننگ ہیں، مذہبی صورت میں قائم کئے گئے، خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی۔''

---

(۱) مارس کی تاریخ ہندوستان جلد اول ۱۸۳۔ (۲) سنن ابن ماجہ کتاب النکاح باب حق الزوج علی المرأۃ ص ۱۳۴ (۳) سیل صاحب کا انگریزی ترجمۂ قرآن، مقدمہ ص ۲۵، ۲۶۔

نیس کی کاؤنسل کے بعد مشرقی چرچ روزانہ کے مناظرات میں مشغول ہوگیا اور ایرنس، سبلینس، نسطورنیس اور یوٹیکنیس کے جھگڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں۔

مغربی چرچ میں ڈمیسس اور ارسیسی نس نے بشپ کی جگہ حاصل کرنے کے لئے قتل تک نوبت پہنچادی اور آخر ڈمیسس کی فتح ہوئی، اس موقع پر کہا جاتا ہے کہ سی نینس (Sicininus) کے گرجا میں ایک روز میں ۱۳۷ آدمی قتل کئے ہوئے پائے گئے اور کوئی حیرت نہیں کہ یہ لوگ ان جگہوں کے اس قدر خواہاں ہوتے تھے اس لئے اس ذریعہ سے ان کو گراں بہا تحفے ملتے تھے، اپنی گاڑیوں پر نہایت تزک واحتشام سے نکلتے تھے اور ان کے دستر خوان پر بادشاہوں سے زیادہ شان وشوکت ہوتی تھی۔"

ان مناقشات کا سبب زیادہ تر شہنشاہ ہوا کرتے تھے، جسٹینین کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب ہوگئی، اس کے نزدیک اپنے عقیدہ کے مخالفوں کو مار ڈالنا کوئی جرم ہی نہ تھا۔

پادشاہوں اور پادریوں میں عقائد اور اخلاق کی جو خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عوام کی حالت بھی مبتذل ہوگئی، ان کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا رہ گیا، خواہ کسی ذریعہ سے ہو اور اس روپیہ کو وہ نفاست اور عیاشی میں اڑاتے تھے۔

عقائد کی خرابی کے علاوہ روم اور فارس کی سلطنتیں بھی کمزور ہوگئی تھیں، شہنشاہ قسطنطین کے بعد روم کی سلطنت روز بہ روز کمزور ہوتی گئی، عام طور سے اس کے جانشین بزدلی اور مظالم کے لئے مشہور تھے، آنحضرت ﷺ کے وقت تک ملک کا مغربی حصہ گاتھ لوگوں (Goths) نے روند ڈالا تھا .... یونانیوں کی عیش پسندی اور اخلاقی خرابیوں نے ان کی قوت کو زائل کر دیا تھا۔"

رومیوں نے عیسوی مذہب کو جس صورت میں قبول کیا تھا اس کی تصویر ڈریپر کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

"دونوں (عیسائیت اور بت پرستی) کی باہمی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر وشکر ہوگئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہوگیا جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں۔(۱) .... جوں جوں زمانہ

(۱) معرکہ مذہب وسائنس، ڈریپر ص ۶۲۔

گذرتا گیا وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ٹرٹلین نے بیان کی ہیں، متغیر ہو کر ایک عام پسند مگر پایۂ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے، ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا.... عقیدہ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچہ میں ڈھال لیا گیا....... مریم عذرا کو تو خدا کی ماں کا لقب دیا گیا۔'' (۱)

اسی زمانہ میں ایک گروہ ''مریمی'' کے نام سے پیدا ہوا جو حضرت مریم علیہا السلام کو بھی شریکِ الوہیت کر کے بجائے اقانیمِ ثلاثہ کے اقانیمِ اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا، جس کی تردید قرآن پاک نے سورۂ آل عمران میں فرمائی ہے، اسی کے ساتھ اور بہت سے معتقدات رومی بت پرستوں سے لے کر عیسائیت میں داخل کیے گئے اور نام بدل بدل کر رومی بت پرستوں کے دیوتاؤں کے رسوم، مقدس عیسائی کلیساؤں میں جگہ پانے لگے اور ان مسائل میں فرقوں کے اختلافاتِ باہمی نہایت شدومد سے پیدا ہوئے، یہاں تک کہ ان مذہبی مناقشات کے تصفیہ کے لئے حکومت کو بارہا دست اندازی کرنا پڑتی تھی، رفتہ رفتہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہو گیا اور یہ حالت ہو گئی کہ جو شخص کسی بڑے دنیاوی عہدہ دار کے پاس جتنا رسوخ و تقرب حاصل کر سکتا، اسی نسبت سے اس کو بڑی دینی خدمت مل جاتی۔ (۲)

یہ تو مسیحی دنیا کے مشرقی حصہ کا حال تھا، مغربی حصہ کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی، یہاں رومن امپائر کی ماتحتی میں مذہبی مناصب کے لئے کشت و خون ایک عام و معمولی واقعہ تھا، یہاں تک کہ بعض دفعہ مقتولین کی تعداد کسی سخت خوں ریز جنگ کے مقتولوں کے مساوی پہنچ جاتی، چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک اعلا مذہبی عہدہ کے لئے دو پادریوں کے درمیان مقاتلہ ہوا تو صرف ایک دن میں ۱۳۷ آدمی کام آئے (۳)، اس سفاکانہ جدوجہد کا باعث صرف یہ تھا کہ اس زمانہ کے مذہبی عہدے، اکتسابِ زر، حصولِ لذائذ اور کسبِ جاہ کے بہت بڑے ذرائع تھے، چنانچہ جتنی نفیس غذائیں پادریوں کے دسترخوان پر رہتی تھیں، اتنی بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی تھیں۔ (۴)

سلاطین اور مذہب کے حاملین کے اخلاق کا پرتو عام رعایا اور پیرووں پر لازمی طور پر پڑتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ بداخلاقی، اسراف اور ہوس پرستی، مسیحی دنیا کی آب و ہوا میں سرایت کر گئی، لوگ ہر طرح کے ناجائز وسائل سے روپیہ کماتے اور کمالِ بے دردی کے ساتھ اپنے مسرفانہ لہو و

(۱) معرکہ مذہب و سائنس ڈریپر ص ۶۵، ۶۶ (۲) سیل صاحب کا انگریزی ترجمۂ قرآن، مقدمہ ص ۲۶ (۳) ایضاً (۴) ایضاً۔

لعب اور عیاشی میں اڑا ڈالتے۔(۱)

پوپوں نے اور ان کے بعد درجہ بہ درجہ مذہبی عہدہ داروں نے اپنی اپنی جگہ پر شہنشاہانہ بلکہ خدائی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے، جو وہ زمین پر کھولتے تھے، وہ آسمان پر کھولا جاتا تھا اور جو یہاں بند کرتے تھے وہ وہاں بھی بند ہو جاتا تھا، قرآن مجید نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے کہ اِتَّخَذُوٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ ۹:۳۱) انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو اپنا خدا بنا لیا تھا۔

دین داری کا سب سے اہم جز تجرد کی زندگی اور رہبانیت تھی، ہر قسم کے آرام و آسائش سے جسم کو محروم کر کے ہر قسم کی تکلیف و عذاب میں اپنے کو تمام عمر مبتلا رکھنا بہترین عبادت تھی، کسی نے تمام عمر غسل نہ کرنے کی قسم کھائی تھی، کسی نے اپنے کو دلدل میں ڈال دیا تھا، کوئی اپنے کو بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا، کسی نے سایہ میں بیٹھنے کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، کسی نے اپنے کو اندھیری کوٹھری میں بند کر لیا تھا، ماں باپ، عزیز و قریب، اہل و عیال، دین داری و تقویٰ شعاری کی راہ کے کانٹے تھے، ان سے پرہیز بلکہ ان سے نفرت کمالِ تقویٰ سمجھا جاتا تھا اور اسی پر فخر کیا جاتا تھا۔(۲)

ہندوستان: دنیا کے ان متمدن ملکوں میں جہاں کوئی با اثر مذہب قائم تھا، ایک ہندوستان بھی ہے، ہندوستان کے تمدن کے پانچ مختلف دور گذرے ہیں، ایک اصلی ہندو ویدک عہد جو دو ہزار سال ق م سے لے کر تقریباً چودہ سو سال ق م تک رہا، دوسرا دور جنگ یعنی جس میں کوروں اور پانڈوؤں وغیرہ کے مناقشات رہے اور جو چودہ سو ق م سے لے کر تقریباً ایک ہزار قبل مسیح تک رہا، تیسرا دور عقلیت جس میں حکما و عقلیین کا دور دورہ تھا اور جو ایک ہزار قبل مسیح سے لے کر تقریباً تیسری صدی قبل مسیح کے نصف تک رہا، چوتھا دور بودھ جس میں اس مذہب کا عروج تقریباً دو سو پچاس قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک رہا، پانچواں دور پرانک جس میں بجائے ویدیا گوتم بودھ کی تعلیمات کے پرانوں کی تلقین پر عمل درآمد تھا اور یہ عہد تقریباً پانچویں صدی عیسوی کے اواخر سے لے کر مسلمانوں کے داخلۂ ہند تک قائم رہا۔

مورخین کا اجماع ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک اور نقائص

(۱) سیل صاحب کا ترجمۂ قرآن مجید ص ۲۶ و ۶۸ (۲) تاریخ اخلاق یورپ، لیکی کی دوسری جلد میں یہ واقعات مفصل لکھے ہیں۔

سے معمور آخری دور ہے جو تقریبا ۵۰۰ء سے شروع ہوتا ہے، اس دور کے نمایاں خصوصیات حسب ذیل تھے:

۱۔شرک جوابتداہی سے ہندوستان کے خمیر میں داخل تھا اب وہ حدِ اعتدال سے باہر ہوگیا، چنانچہ وید میں جو ۳۳ دیوتاؤں کی تعداد تھی وہ اب بڑھتے بڑھتے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں تک پہنچ گئی۔(۱)

۲۔ویدک عہد میں اصنام کی پرستش کا رواج نہ تھا لیکن اس زمانہ میں مندروں کے اندر بت پرستی علی العموم رائج ہوگئی۔(۲)

۳۔مندروں کے محافظین، بداخلاقی کے سرچشمے تھے جو لاکھوں کروڑوں ناواقف پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام سے خوب لوٹتے، (۳)

۴۔ویدک عہد میں ساری ہندو قوم میں یگانگی تھی لیکن اب ذات پات کی تفریق شروع ہوگئی جو نظامِ معاشرت کی تباہ کن تھی۔(۴)

۵۔عورتوں کو محکومیت وغلامی کا درجہ دیا گیا۔(۵)

۶۔قوانین اس قدر غیر معقول و نامنصفانہ وضع کئے گئے جن سے علانیہ بعض ذاتوں کی پاس داری وحمایت اور بعض پر جبر وستم مقصود تھا، مثال کے لئے چند قوانین درج ذیل ہیں:

(الف) برہمن کو کسی حالت میں خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرم کا مرتکب رہ چکا ہو، سزائے موت نہیں دی جاسکتی۔

(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا کسی نیچی ذات کی عورت کے ساتھ زنا کرنا کوئی جرم نہیں۔

(ج) کسی بودھ راہبہ تک کی عصمت دری کی سزامیں کچھ جرمانہ کافی تھا۔

(د) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلاذات والے کو چھولے تو اس کی سزا موت ہے۔

(ہ) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضا قطع کرڈالنا چاہیے، اگر اسے گالی دی، تو اس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہیے اور اگر اسے تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منہ میں ڈالنا چاہیے۔(۶)

---

(۱) آر سی دت کی "ہندوستانِ قدیم" جلد۳ص ۲۷۶ (۲) ایضاًص ۲۸۱ (۳) ایضاًص ۲۸۳ (۴) ایضاًص ۳۰۷
(۵) ایضاًص ۳۳۱ (۶) ایضاًص ۳۴۲، ۳۴۳۔

۷۔ راجاؤں کے محل میں بادہ نوشی کثرت سے رائج تھی اور رانیاں اسی حالتِ خمار میں جامۂ عصمت اتار ڈالتی تھیں۔(۱)

۸۔ شاہ راہوں پر آوارہ گرد و جرائم پیشہ افراد کا مجمع لگا رہتا تھا۔(۲)

۹۔ خدا کی تلاش آبادیوں اور بازاروں میں کرنے کے بجائے جنگلوں اور پہاڑوں میں کی جاتی تھی، جسم کو سخت سے سخت ایذا اور تکلیف ان کی بہترین عبادت تھی۔

۱۰۔ اوہام و خیالاتِ فاسدہ، بھوتوں، پلیتوں اور سینکڑوں قسم کے ظنون و اوہام ان کا مذہب تھا اور آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز ان کا خدا تھی اور ہر ایک کے سامنے سر بہ سجود ہونا ان کا دھرم تھا، بتوں، دیوتاؤں، دیبیوں کا شمار اندازہ و قیاس سے باہر تھا اور ان کے افسانوں کا گیت ان کا ترانہ حمد تھا، ظہورِ اسلام کے بعد بھی جو عرب سیاح یہاں آتے رہے انہوں نے تپسیا کرنے والے جوگیوں کے وہ دردناک حالات لکھے ہیں جن کو پڑھ کر ان کی حالت پر رحم و افسوس آتا ہے (۳) اور اسی طرح وہ عرب سیاح جو سندھ اور دکن کے شہروں اور ساحلوں سے گزرے ہیں انہوں نے معبدوں میں پجاری عورتوں اور دیوداسیوں کی جو اخلاقی کیفیتیں لکھی ہیں (۴) وہ حد درجہ شرم ناک ہیں اور اس سے زیادہ شرم ناک یہ ہے کہ یہ سب خدا کی خوشنودی اور مذہبی عقیدہ کے رو سے انجام دیا جاتا تھا۔

عورتیں جوؤں میں ہاری جاتی تھیں (۵)، ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے تھے، وہ بیوہ ہو کر زندگی کی ہر لذت سے عمر بھر کے لئے قانوناً محروم کر دی جاتی تھیں اور اسی لئے شوہر کے مرنے پر بعض عورتیں زندہ در آتش ہونا پسند کرتی تھیں، لڑائی میں شکست کے خوف کی صورت میں ان کو خود ان کے باپ بھائی اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالتے تھے، یہاں کے بعض فرقوں میں عورتیں مرد کو اور مرد عورتوں کو ننگا کر کے ان کی پوجا کرتے تھے (۶) اور مذہبی تیوہاروں میں شراب پی پی کر ایسے بدمست ہوتے تھے کہ پھر انہیں ماں، بہن، بیٹی اور اپنی پرائی کی تمیز باقی نہیں رہتی تھی اور اس کو وہ نیکی کا کام سمجھتے تھے، شودروں کے نام سے ایک پوری قوم کی قوم ایسی غلامی میں مبتلا تھی کہ تعلیم و تربیت، تہذیب و اخلاق اور دین و ایمان ہر چیز سے محروم رہنا اس کا فرض تھا، وید کی آواز بھی اس کے کان میں پڑ جائے

(۱و۲) آر سی دت کی ہندوستان قدیم ص ۴۶۹ (۳) دیکھو ابوزید سیرافی کا سفرنامہ ص ۱۱۵ و ۱۱۸ پیرس و آثار البلاد قزوینی ص ۸۱ (۴) سفرنامہ ابوزید ص ۱۳۰ و احسن التقاسیم مقدسی ص ۴۸۳ (۵) مہابھارت کے قصہ کا آغاز پڑھو (۶) ستیارتھ پرکاش گیارہواں سمولاس (باب) ص ۳۷۸، ۳۷۹ مطبوعہ سیوک سٹیم پریس لاہور ۱۹۱۲ء۔

تو اس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینے کا حکم تھا۔

راجاؤں کی بیویوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی، قانون کی بنیاد مساواتِ انسانی پر نہیں بلکہ ذاتوں پر تھی، عورتیں فروخت کی جاتی تھیں۔

اس مختصر خاکہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ بدءِ اسلام سے ایک صدی پیش تر سے دیوتاؤں کی یہ جنم بھومی بھی شیطانوں کے اس جال میں گرفتار تھی جس کے شکار فارس و روم ہو رہے تھے۔

یہود: دنیا کی آبادی اور اصلاح کی سب سے زیادہ امید اس قوم سے ہوسکتی ہے جو سام کی اولاد میں سے پہلے وحیِ الٰہی کی امانت دار بنی، اسی لئے قرآن نے ان سے کہا وَلَا تَکُوْنُوْٓا اَوَّلَ کَافِرٍۭ بِہٖ (البقرہ۲:۴۱) اور سب سے پہلے تم ہی پیغامِ الٰہی کے منکر نہ بنو، مگر یہ قوم سخت جانی کے ساتھ سنگ دل بھی ثابت ہوئی، اس نے پتھروں کے سینوں کو پھٹتے اور ان کی چھاتیوں سے میٹھے پانی کا دودھ بہتے دیکھا اور پیا مگر پھر بھی اس کے سینہ کا دل پتھر ہی رہا، قرآن نے اپنے زمانہ میں اس کو طعنہ دیا:

فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً — ان کے دل پتھروں کے مانند بلکہ ان سے بھی بڑھ کر سخت ہیں۔ (بقرہ۲:۷۴)

اس نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا، ان کو تکلیفیں دیں بلکہ ان کو قتل تک کر ڈالا، حضرت موسیٰؑ اور ان کے بعد کوئی پیغمبر ان میں ایسا نہ آیا جس نے ان کی سنگ دلی کا ماتم نہ کیا ہو اور ان کی سرکشی پر ان کے حق میں بددعا نہ کی ہو، چنانچہ قرآن مجید نے کہا:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ	بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور
عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ	مریم کے بیٹے عیسیٰ کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس لئے کہ
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ.	انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھتے تھے اور
كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ	ایک دوسرے کو اس برائی سے جو وہ کرتے تھے منع نہیں
لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ. (مائدہ۵:۷۸،۷۹)	کرتے ان کا کام کتنا برا ہے۔

حضرت داؤدؑ نے زبور میں کئی دفعہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا ماتم اپنے سوز وگداز کی لے میں کیا ہے، زبور ۷۸ میں ہے:

''اے میرے گروہ! میری تعلیم پر کان رکھ، میرے منہ کی باتیں کان دھر کے سنو...... تا کہ آنے والی پشت سے وہ فرزند پیدا ہوں جو سیکھیں اور وہ خدا پر توکل کریں اور خدا کے کاموں کو بھلا نہ دیں، بلکہ اس کے حکموں کو حفظ کریں اور اپنے باپ دادوں کی طرح ایک شریر اور سرکش نسل نہ ہوں، نہ ایسی نسل کہ جس نے اپنا دل مستعد نہ کیا اور ان کے جی خدا سے لگے نہ رہے، .... باوجود اس سب کے پھر انہوں نے گناہ کئے اور اس کے عجائب قدرتوں کے سبب اعتقاد نہ کیا...... لیکن انہوں نے اپنے منہ سے اس کے (خدا کے) ساتھ ریاکاری کی اور اپنی زبانوں سے اس سے جھوٹ بولے اور وہ اس کے عہد میں وفادار نہ رہے، کیوں کہ ان کے دل ان کے ساتھ قائم نہ رہے .... کتنی بار انہوں نے بیابان میں اس (خدا) سے بغاوت کی اور ویرانہ میں اسے بےزار کیا.......... تس پر بھی انہوں نے خدا تعالیٰ کو آزمایا اور اسے بےزار کیا اور اس کی شہادتوں کو حفظ نہ کیا بلکہ برگشتہ ہوئے اور اپنے باپ دادوں کے مانند بے وفائی کی، وہ ٹیڑھی کمان کے مانند ایک طرف پھر گئے۔''

زبور ۱۸ میں ہے:

''اے میرے لوگو! سنو کہ میں تجھ پر گواہی دوں گا، اے اسرائیل اگر تو میری سنے گا تو تیرے درمیان کوئی دوسرا معبود نہ ہو، تو کسی اجنبی معبود کو سجدہ نہ کرنا، خداوند تیرا خدا میں ہوں جو تجھے مصر کی سرزمین سے باہر لایا، اپنا منہ کھول کہ اسے بھر دوں گا، پر میرے لوگوں نے میری آواز پر کان نہ دھرا اور اسرائیل نے مجھے نہ چاہا تب میں نے انہیں ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا۔''

بہت سے بنی اسرائیل جو حضرت داؤدؑ سے باغی ہو کر لڑنے پر آمادہ تھے حضرت داؤدؑ نے ان کے متعلق یہ بددعا کی:

''تو وہ خدا نہیں جو شرارت سے خوش ہو، شریر تیرے ساتھ رہ نہیں سکتا، وہ شیخی باز ہیں، تیری آنکھوں کے سامنے کھڑے نہیں رک سکتے، تو سب بدکرداروں سے عداوت رکھتا ہے، تو ان کو جو جھوٹ بولتے ہیں نابود کردے گا........ اے خداوندا اپنی صداقت میں میرا رہبر ہو، میرے دشمنوں کے سبب سے

میرے سامنے اپنی راہ کو سیدھا کر۔............ ان کے باطن میں سراسر کھوٹا پن ہے،......اے خدا تو انہیں ملزم جان، ایسا ہو کہ وہ اپنی مشورتوں سے آپ ہی گر جائیں، ان کو ان کے گناہوں کی کثرت کے سبب نکال پھینک کہ انہوں نے تجھ سے سرکشی کی ہے۔" (زبور:۵)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی انجیل میں بنی اسرائیل کو لعنت کی اور فرمایا:

"اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھیری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو باہر سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں، پر بھیتر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی ناپاکی سے بھری ہیں، اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے پر باطن میں ریا کار اور شرارت سے بھرے ہو۔

اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس، کیوں کہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راست بازوں کی گوریں سنوارتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے دنوں میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے، اس طرح تم اپنے اوپر گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو، پس اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھرو، اے سانپو! اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیوں کر بھاگو گے۔" (متی ۲۳، ۳۳، ۳۷)

بعینہ یہی الزام قرآن نے بھی ان کو دیا ہے:

وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ. (بقرہ۲:۶۱)

اور وہ ناحق پیغمبروں کو مار ڈالتے ہیں، اس لئے کہ وہ نافرمان اور حد سے بڑھنے والے ہیں۔

قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنبِيَاءَ اللَّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ. (بقرہ۲:۹۱)

کہہ کہ پھر کیوں اللہ کے نبیوں کو پہلے تم قتل کرتے رہے اگر تم مومن تھے۔

آل عمران میں اس سے بھی بڑھ کر ہر حق کے داعی اور خیر کے مبلغ کے قتل کر دینے کا ان پر بجا الزام ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَ

بے شک وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور

يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَأْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ. (آل عمران ۳:۲۱)

پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے اور ہر اس شخص کی زندگی کے دشمن بن جاتے ہیں جو ان کو عدل و نیکی کی بات سمجھائے تو ان کو دردناک سزا کی خوش خبری سنا دے۔

سورۂ بقرہ و آل عمران میں یہودیوں کے ایک ایک عیب کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دین و ملت کا قوام کتنا بگڑ گیا تھا، ان کی مذہبی سنگ دلی اور تعصب کا سب سے دردناک سانحہ وہ ہے جو اسلام سے ۵۰-۶۰ برس پہلے یمن میں پیش آیا کہ یہودی حمیریوں نے نجران کے عیسائیوں کو گڈھوں میں آگ جلا کر ان میں جھونک دیا اور وہ کنارے بیٹھے اس حسرت ناک منظر کا تماشا دیکھتے رہے، چنانچہ قرآن مجید نے اس پر درد داستان کو ان لفظوں میں انہیں یاد دلایا:

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ. النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ. اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ. وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ. وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ. (بروج ۸۵:۴ تا ۸)

گڈھے والے لوگ مارے گئے، بھڑکتی آگ کے گڈھے، جب وہ ظالم ان کے کنارے بیٹھے ایمان والوں کے ساتھ جو کر رہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے، ان کا گناہ یہی تھا کہ وہ غالب اور خوبیوں والے خدا پر ایمان رکھتے تھے۔

جزئیات کو چھوڑ کر کلی طریقہ سے ان میں حسب ذیل نقائص تھے۔

۱۔ ان کو اپنے محبوبِ خدا اور خاص خدا کے کنبہ ہونے پر بے انتہا غرور تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ہم کچھ کریں ہم سے قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا:

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ ۵:۱۸)

ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (بقرہ ۲:۸۰)

اور کہا کہ ہم کو دوزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی لیکن چند روز۔

وہ سمجھتے تھے کہ جنت کی نعمتیں صرف ان ہی کے لئے خاص ہیں، قرآن نے کہا:

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. (بقرہ ۲:۹۴)

کہہ دے کہ اگر آخرت کا گھر تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لئے ہے تو موت کی آرزو کیوں نہیں کرتے اگر تم سچے ہو۔

وہ سمجھتے تھے کہ نبوت اور رسالت صرف ان کے گھر کی چیز ہے کسی دوسرے کا اس میں حق نہیں، قرآن نے ان کے جواب میں کہا:

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (جمعہ ۶۲:۴)

یہ خدا کی مہربانی ہے وہ جس کو چاہے دے۔

جو ان میں پڑھے لکھے عالم تھے، وہ خدا کے احکام کو اپنے منشا اور دولت مندوں کی خوش نودی کے لئے اپنی باطل تاویلوں سے ادلتے بدلتے رہتے تھے اور اپنی تصنیفات اور اجتہادات کو کتاب الٰہی کا درجہ دیتے تھے:

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ (مائدہ ۵:۴۱)

وہ لفظوں کو اپنی مناسب جگہ سے ہٹا دیتے ہیں۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ. (بقرہ ۲:۷۹)

تو پھٹکار ہو ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں، یہ خدا کی طرف سے ہے، تا کہ وہ اس سے دنیا کا معمولی فائدہ اٹھائیں، تو پھٹکار ہے ان پر جو وہ لکھتے ہیں، اور پھٹکار ہو ان پر جو وہ کماتے ہیں۔

جو ان میں ان پڑھ تھے، جاہل تھے، وہ اپنے سنے سنائے قصوں پر ایمان رکھتے تھے:

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ. (بقرہ ۲:۷۸)

اور ان میں بعض ان پڑھ ہیں جن کو تورات کا علم نہیں، لیکن بناوٹی باتیں معلوم ہیں وہ صرف ان کے خیالات ہیں۔

احکام الٰہی میں سے جو آسان اور ضرورت کے مطابق ہوتا اس کو قبول کرتے اور دوسرے حکموں کو پس پشت ڈالتے:

نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ. (بقرہ ۲:۱۰۱)

جن کو خدا کی کتاب دی گئی تھی ان میں سے ایک فریق اللہ کی کتاب پس پشت ڈالتا ہے گویا کہ وہ جانتا ہی نہیں۔

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ. (بقرہ ۲:۸۷)

کیا جب جب کوئی رسول تمہارے پاس وہ لے کر آیا جو تمہاری نفسانی خواہش کے موافق نہ ہوا، تم نے غرور کیا، تو کچھ کو جھٹلایا اور کچھ کو مار ڈالتے ہو۔

ایک دفعہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ تشریف لا چکے تھے اور یہود نے بھی آپ کی ملکی سرداری کو یک گونہ قبول کر لیا تھا تو ایک زنا کا مقدمہ آپ ﷺ کی عدالت میں لائے، آپ نے پوچھا کہ تمہارے مذہب میں اس جرم کی سزا کیا ہے، بولے ہم مجرم کو کوڑے مارتے ہیں اور اس کی تشہیر کرتے ہیں، آپ نے ان سے توراۃ طلب فرمائی، جب وہ لائے اور اس جرم کے متعلقہ حکم کی آیتوں کو پڑھ کر سنانے لگے تو بیچ سے سنگساری کا حکم چھپا دیا، مگر ایک نومسلم یہودی عالم نے اس کو پڑھ کر بتا دیا، آپ ﷺ نے فرمایا، خداوندا میں پہلا شخص ہوں گا جو تیرے مردہ حکم کو زندہ کرے گا۔(۱)

آپس میں قتل وخوں ریزی کا بازار ان میں گرم تھا، ایک طاقت ور قبیلہ دوسرے کم زور قبیلہ کو گھر سے بے گھر کر دیتا تھا، اور پھر کوئی گرفتار ہو جاتا تو فدیہ دے کر اس کو چھڑا بھی لیتے تھے، قرآن نے کہا:

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ	پھر تم ہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے اور ایک
فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ	گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو، ان کے برخلاف
بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى	گناہ اور ظلم سے مدد کرتے ہو اور اگر وہ تمہارے پاس
تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ	قیدی بن کر آتے تو تم فدیہ دے کر چھڑاتے ہو حالاں کہ
اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ	ان کا نکالنا تم پر حرام تھا، کیا تم کتاب کے کچھ حکموں کو
بِبَعْضٍ (بقرہ ۲:۸۵)	مانتے اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔

۲۔ دوسری چیز مال و دولت کی حرص وطمع تھی، اس کی وجہ سے ان میں ہر قسم کا لالچ اور اخلاقی کم زوری پیدا ہو گئی تھی، کسی بڑے کام کی خاطر وہ اپنی راحت و آرام اور جسم و جان کو قربان نہیں کر سکتے تھے:

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى	ان کو سب لوگوں سے زیادہ زندگی کا لالچی پاؤ گے، مشرکوں
حَيٰوةٍ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ	سے بھی زیادہ، ان میں ایک ایک چاہتا ہے کہ اس کو ہزار
لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ (بقرہ ۲:۹۶)	برس کی زندگی ملے۔

(۱) صحیح بخاری کتاب المحاربین باب احکام اھل الذمۃ و احصانھم اذا زنوا ج۲ ص۱۰۱۱، و مسلم کتاب الحدود باب رجم الیھود ج۲ ص۴۹ و ابوداؤد باب فی رجم الیھودیین ج۲ ص۱۵۲)۔

عربوں کے ساتھ ان کے لین دین کے تجارتی تعلقات قائم تھے، مگر وہ سخت نادہند تھے اور سمجھتے کہ عربوں کے ساتھ جس قدر سختی اور بددیانتی کا برتاؤ کیا جائے وہ مذہباً منع نہیں، قرآن نے اس معاملہ میں عیسائی اہلِ کتاب کی تعریف کے بعد اسرائیلی اہلِ کتاب کی نسبت فرمایا:

وَمِنْهُم مَّنْ إِن تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَّا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ. (آل عمران ۳:۷۵)

کتاب والوں میں بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کو ایک دینار بھی امانت رکھنے کے لئے دو، وہ تم کو اس وقت تک واپس نہ دیں جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ رہو یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان جاہل عربوں کا ہم پر حق نہیں اور وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔

توراۃ میں ''اپنے بھائی'' کے علاوہ ''اجنبی'' سے سود لینے کی اجازت کا مطلب وہ یہ لیتے تھے کہ یہود یہود سے نہ لیں، اور اہلِ عرب جو یہود نہ تھے، ان سے بھاری بھاری شرح سود وصول کرنا جائز سمجھتے تھے اور تعجب پر تعجب یہ تھا کہ ان کے علما ان کو اس سے باز نہیں رکھتے تھے، اس حرام خوری اور ان کے علما کی اس خاموشی پر ان کو قرآن نے بار بار ٹوکا:

وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ. لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَن قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ. (المائدہ ۵:۶۲)

اور ان میں سے بہتوں کو تو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور ظلم کرنے اور حرام کھانے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے کرتوت کتنے برے ہیں، ان کے درویش اور عالم گناہ کی بات بولنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں باز رکھتے ان کے کام درحقیقت کتنے خراب ہیں۔

سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَّالُونَ لِلسُّحْتِ (مائدہ ۵:۴۲)

جھوٹ کو سننے والے اور حرام کھانے والے ہیں۔

وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (نساء ۴:۱۶۱)

اور ان کے سود لینے کے سبب سے حالاں کہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھا جانے کی وجہ سے۔

اسی لئے وہ تورات کی آیتوں میں تحریف اور ان کے معنوں میں تاویل کر کے ایسے فقہی

حیلے تراشتے تھے کہ ان سے ہر حکم کو اپنے مطلب کے مطابق بنا لیتے تھے، خدا نے فرمایا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ (مائدہ۵:۴۴)

ہم نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے اسی کے مطابق نبی، جو تابع دار تھے، یہودیوں کا فیصلہ کرتے تھے اور ان کے درویش و عالم بھی خدا کی کتاب کے جن حصوں کو انہوں نے بچا رکھا تھا، ان میں سے فیصلہ کرتے۔

اس کے بعد اس کے احکام کے اجرا اور خاص کر قصاص کا ذکر کیا اور فرمایا:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ . (مائدہ۵:۴۴)

اور جو خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہی لوگ کافر ہیں۔

ان میں مشرکانہ بت پرستی کے بعض اثرات پیدا ہو گئے، وہ جبت اور طاغوت کی پرستش میں مبتلا تھے، قرآن ان کو خطاب کر کے کہتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ...... اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (نساء۴:۴۷، ۴۸)

اے کتاب والو! ہم نے جو اتارا جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرتا ہے، اس پر ایمان لاؤ، ...... خدا شرک کو معاف نہیں کرتا اور اس کے سوا جس کو چاہے معاف کر دے۔

...... اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا . (نساء۴:۵۱)

...... کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ بتوں اور شیطانوں پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کافر مسلمانوں سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔

اوہام و خرافات پر ان کا ایمان تھا، تعویذ، گنڈا، جادو اور عملیات پر فریفتہ تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ حضرت سلیمانؑ کی تعلیم ہے۔ (بقرہ۲:۱۰۲) لبید اعصم وغیرہ مدینہ میں بہت سے عامل تھے جو کنگھیوں اور بالوں میں منتر پڑھ کر پھونکتے تھے۔(۱)

عرب سے باہر یہودی، یونانی اور رومیوں کی حکومتوں میں یورپ، افریقہ اور ایشیا کے

(۱) صحیح بخاری جلد دوم کتاب الطب باب السحر ص ۸۵۷۔

مختلف ملکوں اور شہروں میں اس طرح پراگندہ اور منتشر تھے کہ عرب سے باہر دنیا کی قوموں میں ان کا کوئی شمار نہ تھا، عرب کے اندر جو یہود زمانۂ دراز سے آباد تھے، ان کا بڑا شغل زراعت اور تجارت تھا، سودی کاروبار کرتے تھے، غریب عربوں کو اپنے گراں شرحِ سود اور قرضوں کے بار میں اس طرح دبائے تھے کہ ان کی حالت ان کے سامنے غلاموں کی سی تھی، اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ کا ذکر پوری حالت کے اندازہ کے لئے کافی ہوگا۔

محمد بن مسلمہ انصاری اور ان کے رفقا جو مدینہ کے یہودی سردار کعب بن اشرف کے قتل پر مامور ہوئے تھے وہ اس سے ملنے اور بات چیت کرنے گئے، انہوں نے اس سے کہا اے کعب! اس شخص (محمد رسول اللہ ﷺ) نے تو صدقہ وصول کر کر کے ہم کو دق کر ڈالا، اب میں تم سے کچھ قرض لینے آیا ہوں، اس نے کہا خدا کی قسم مجھے معلوم تھا کہ تم اس سے آخر بیزار ہو جاؤ گے، انہوں نے کہا میں نے اس کی پیروی اختیار کی ہے لیکن میں اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا، انتظار ہے کہ معاملہ کی صورت کس رخ پلٹتی ہے؟ میں تم سے کچھ غلہ قرض لینے آیا ہوں، اس نے کہا مگر تم کفالت میں کیا چیز رہن رکھو گے، انہوں نے کہا تم بتاؤ کہ کیا چاہتے ہو، اس نے کہا اپنی بیویاں گرو رکھو، انہوں نے جواب دیا ہم اپنی بیویاں کیسے گرو رکھ سکتے ہیں کہ تمام عرب میں تمہارے حسن کا جواب نہیں، بولا اچھا تو اپنے لڑکوں کو گرو رکھو، کہا ہم اپنے لڑکوں کو کیسے گرو رکھیں، ان کی کوئی بے عزتی نہ کرے، یہ ہمارے لئے بڑی شرم کی بات ہے، ہاں ہم اپنے ہتھیار گرو رکھ سکتے ہیں۔(۱)

اس سوال و جواب سے اندازہ ہوگا کہ یہود کی اخلاقی حالت کتنی پست اور ذلیل ہو چکی تھی، کوئی غیر عورت اگر ان کے بازار کی طرف جا نکلتی تو اس کی عزت بچنی مشکل ہو جاتی (۲)، کسی بچہ کو ذرا سے زیور کی لالچ میں موقع پاتے تو بے دردی سے قتل کر کے زیور اتار لیتے، (۳) علما اور پیشوایانِ دین کی وہی کیفیت تھی جس کا ماتم اس وقت سے چھ سو برس پیشتر حضرت عیسیٰؑ نے کیا تھا،

(۱) صحیح بخاری جلد دوم قتل کعب بن اشرف ص ۵۷۶۔ (۲) دیکھو کتب سیر میں غزوہ بنی نضیر کے اسباب، علامہ شبلی نے سیرۃ النبی حصہ اول ص ۲۷۹ پر (طبع جدید) غزوۂ بنو قینقاع کے اتفاقیہ سبب کے پیش آنے کا ایک واقعہ یہ نقل کیا ہے کہ ایک انصاری کی بیوی نقاب پوش یہودی کی دکان میں آئیں، تو یہودیوں نے ان کی بے حرمتی کی ایک مسلمان نے غیرت سے بے تاب ہو کر یہودی کو قتل کر ڈالا ممکن ہے کہ سید صاحب نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہو، "ک، ص"۔ (۳) صحیح بخاری جلد دوم باب من اقاد بحجر ص ۱۰۱۶۔

لفظی موشگافیوں اور ظاہری دین داری کے سوا روح و اخلاق کا جوہر ان سے کھوگیا تھا، اسلام جو ابراہیم حنیف کے ترانہ توحید اور موسیٰ کی صدائے طور کی آوازِ بازگشت تھا، وہ ان کے نزدیک عرب کے بت پرستوں کے جاہلانہ مذہب سے زیادہ برا تھا، وہ کہتے تھے کہ ''ان مسلمانوں سے یہ مشرک زیادہ راہ راست پر ہیں،'' (نساء۴:۵۱) اسلام کی اس مصالحانہ دعوت:

يَاَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا	اے کتاب والو! آؤ اس ایک بات پر ہم سب متحد ہو جائیں
وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ	جو ہم میں تم میں مشترک ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کو اپنا
شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا	معبود نہ بنائیں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران۳:۶۴)	اور نہ ہم خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا رب بنائیں۔

میں بھی عداوت اور دشمنی ہی کی جھلک دکھائی دیتی تھی، اسی لئے مدینہ میں اسلام کی صلح کی ہر کوشش کو وہ ٹھکراتے رہے کیوں کہ روحانی عظمت کے مقابلہ میں اس دعوت کے قبول میں ان کو اپنی قومی و مالی و تجارتی عظمت کی بربادی نظر آتی تھی۔

عیسائیوں کی نقل میں وہ بھی عزیر (عزرا) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ (توبہ۹:۳۰) اپنی دولت وثروت کے غرور میں وہ کہتے تھے کہ "يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ" (مائدہ۵:۶۴) خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ قرآن کی دعوت کے جواب میں کہتے تھے کہ ''ہم پر اس دعوت کا اثر نہیں ہوسکتا کہ ہمارے دل نامختون ہیں، وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ (بقرہ۲:۸۸) ان فقروں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ اب دنیا میں نیابتِ الٰہی کے منصب کے قابل نہیں رہے تھے۔

عرب کے باہر یہودیوں کی پراگندہ ٹولیاں مختلف سلطنتوں کے سایہ میں پناہ گزیں تھیں، ان کا مذہبی مرکز ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، سیاسی اہمیت وہ مدت ہوئی کہ کھو چکے تھے، ابراہیم و یعقوب کے خدا کے بجائے ہر جگہ وہ سونے چاندی کے ڈھیر ہی کو خدا بنائے تھے، ان کے مذہبی فرقوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی جن میں باہم عداوت قائم تھی اور اس وقت سے چھ سو برس پہلے کی طرح بنی اسرائیل اب پھر ایک نبیٔ اعظم کی بعثت کا بے تابانہ انتظار کررہے تھے، (بقرہ۲:۸۹) خود عرب میں یہود اس وقت اس نبی کے جلد پیدا ہونے کی بشارت کا اپنی مجلسوں میں تذکرہ کرتے رہتے تھے، جس کی پیشین گوئیوں سے توراۃ کے صحیفے بھرے تھے، اور ان ہی سے سن سن کر یثرب کے اوس وخزرج ایک نبی کی آمد کی پیشین گوئی سے باخبر تھے۔(۱)

دنیا کی ان مختلف قوموں کے حالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کے بعد ضرورت ہے کہ اس قوم کے حالات پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائے جس کے افقِ نبوت سے صبحِ سعادت طلوع ہونے والی تھی۔

(۱) سیرت ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ جز اول ص ۲۵۹۔

ظہورِ اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت

یمن میں جب وہ مشہور سیلاب آیا جس کی بلندی سطحِ زمین سے ایک سو بیس فیٹ تھی، تو پائے تخت یعنی مآرب اور اس کے اضلاع دفعتاً برباد ہو گئے، یہ دوسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔(۱) قرآن مجید نے اسی سیلاب کو سیلِ عرم کہا ہے، اس سیلاب کا ایک یہ نتیجہ ہوا کہ آٹھ بڑے بڑے خاندان جلا وطن ہو کر ادھر ادھر نکل گئے، جس سے نظامِ سلطنت میں ضعف آ گیا، چھٹی صدی عیسوی میں یہاں کے فرماں روا ذونواس سے جو مذہباً یہودی تھا رعایا نے بغاوت کی اور شاہِ حبش سے اعانت چاہی، اس نے ۵۲۹ء میں ایک فوج بھیجی جس نے ذونواس کو معزول کر دیا اور اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، ۶۰۳ء میں قبیلہ حمیر کے ایک باحوصلہ شخص ذویزن نے فارس کی مدد سے اپنا ملک واپس لیا، لیکن چند روز کے بعد وہ قتل کر دیا گیا اور یمن شاہنشاہیِ فارس کا ایک معمولی صوبہ رہ گیا۔

جو قبیلے یمن سے نکلے ان میں سے ایک نے دوسری صدی عیسوی میں حیرہ میں جہاں اب کوفہ آباد ہے ایک سلطنت قائم کی لیکن وہ فارس کے زیر اثر اور مذہبی خیالات میں مجوس سے متاثر تھی، دوسرا قبیلہ شام میں جا کر آباد ہوا جو غسانی خاندان کہلاتا ہے، (۲) چوں کہ یہ خاندان رومیوں کے زیر اثر تھا اس لئے رفتہ رفتہ عیسائی ہو گیا اور اسلام کے زمانہ تک عیسائی رہا۔

غرض عرب کے اصلی تمدن پر بیرونی اثر جو کچھ پڑا تھا وہ مجوسیت یا نصرانیت کا تھا، یہودی معتقدات اور خیالات کا اثر بھی بہت کچھ تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب کا ایک بڑا حصہ یعنی وادی القری اور خیبر و فدک تمام تر یہودی آبادی تھی اور خود مدینہ میں یہودی ہی صاحبِ اقتدار اور صاحبِ حکومت تھے باقی تمام ملک میں مشرکانہ رسوم جاری اور جاہلانہ مذاہب پھیلے تھے۔ لوگ بتوں، پتھروں،

---

(۱) اس بند کے انہدام کی تاریخ کی تعیین مشکل ہے اور اسی لئے اس کی تعیین میں کئی نظریے ہیں ایک اس کو دوسری صدی عیسوی کا واقعہ بتاتا ہے تو دوسرا پانچویں صدی عیسوی کا، اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس بند کے مختلف حصے مختلف زمانوں میں منہدم ہوتے رہے اور بنتے رہے، آخری دفعہ پانچویں صدی عیسوی میں بالکل برباد ہو گیا۔ (سلیمان)

(۲) اکثر علمائے انساب کا بیان ہے کہ یہ قبائل یمن سے آئے تھے لیکن میں نے ارض القرآن میں بہ دلائل اس سے اختلاف کیا ہے۔ (سلیمان)، دیکھئے حصہ اول زیر عنوان سبا و حمیر "ض"۔

درختوں، ستاروں، فرشتوں اور جنوں کی پرستش کرتے تھے۔

خدا کا اعتقاد: تاہم اس میں شبہہ نہیں کہ عرب زمانۂ دراز سے ایک خدائے برتر پر اعتقاد رکھتے تھے، آج کل عرب کے جو قدیم کتبات دست یاب ہوئے ہیں ان پر اللہ کا لفظ خدا کے معنی میں لکھا ہوا ہے، البتہ اس کا املا اللہ نہیں بلکہ ھلہ ہے، عرب شمال کے عرب جو نابتی کہلاتے ہیں ان کے ناموں کے ساتھ اللہ کا لفظ بھی شامل ہوتا تھا، مثلاً زید اللھی، عبد اللھی (۱)، خود قرآن مجید میں خدا کفار کی نسبت کہتا ہے:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ (لقمان ۳۱:۲۵)	اور جو تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو بول اٹھیں گے کہ خدا نے، تم کہو کہ خدا کا شکر ہے۔

یہ اصل میں حضرت ابراہیمؑ کی تعلیم تھی لیکن رفتہ رفتہ شرک کا اعتقاد پیدا ہوا یعنی یہ کہ خدائے اعظم کے سوا اور بھی چھوٹے چھوٹے خدا ہیں، گو اللہ ان سب میں بڑا ہے، یہ اعتقاد اس قدر راسخ ہو گیا کہ اور معبودوں کے انکار سے ان کو اسی قدر رنج ہوتا تھا جس قدر خود خدا کے انکار سے ہو سکتا تھا، بلکہ چوں کہ ان کے نزدیک دنیا کا کاروبار اور روز مرہ کی ضرورتیں ان ہی چھوٹے خداؤں سے انجام پاتی تھیں اور کام اکثر ان ہی خداؤں سے پڑتا تھا، اس لئے اللہ کا خیال کچھ یوں ہی سا رہ گیا تھا، ان ہی خداؤں کی پرستش کرتے تھے، ان ہی پر قربانی چڑھاتے تھے، ان ہی سے حاجتیں مانگتے تھے، اللہ تو زمین آسمان بنا کر بے کار سا ہو چکا تھا، جو کچھ کرتے تھے یہی خدایانِ اصغر کرتے تھے، یہی سبب تھا کہ کوئی شخص اللہ کا خالی نام لیتا تھا تو لوگ بہت کبیدہ ہوتے تھے:

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ. (زمر ۳۹:۴۵)	اور جب خالی اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو یہ لوگ جو کہ قیامت کے معتقد نہیں ہیں، ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن خدا کے سوا اوروں (معبودوں) کا بھی ذکر کیا جائے تو دفعتاً وہ کھل جاتے ہیں۔

اور سمجھتے تھے کہ ان چھوٹے معبودوں کی نذر و نیاز و قربانی سے خدا خوش ہوگا اور وہ اس کے دربار میں سفارش کریں گے، چنانچہ وہ کہتے تھے:

(۱) مذاہب واخلاق کی انسائیکلوپیڈیا جلد اول ص ۴۶۶ بحوالہ پروفیسر نولدیکی۔

مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰى (زمر۳۹:۳)

اور ہم ان بتوں کو اس لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں۔

ملائکہ کی الوہیت: شرک کے علاوہ خدائے اعظم کی نسبت یہ مانتے تھے کہ اس کے بال بچے بھی ہیں چنانچہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوۡنَ الۡمَلٰٓئِكَةَ تَسۡمِيَةَ الۡاُنۡثٰى. (نجم۵۳:۲۷)

جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں۔

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الۡاُنۡثٰى. تِلۡكَ اِذًا قِسۡمَةٌ ضِيۡزٰى. (نجم۵۳:۲۱،۲۲)

تمہارے تو لڑکے ہوں اور خدا کے لئے لڑکیاں یہ تو کچھ اچھی تقسیم نہیں۔

اس لئے جس طرح بعض یہود عزیر کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کو خدائی کا مستحق سمجھتے تھے وہ فرشتوں کو خدا کی اولاد سمجھ کر ان کی الوہیت کے بھی قائل تھے:

وَلَا يَاۡمُرَكُمۡ اَنۡ تَتَّخِذُوا الۡمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرۡبَابًا (آل عمران۳:۸۰)

اور نہ خدا تم کو اس کا حکم دیتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہراؤ۔

وَجَعَلُوۡا لَهٗ مِنۡ عِبَادِهٖ جُزۡءًا ؕ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَكَفُوۡرٌ مُّبِيۡنٌ . اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخۡلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصۡفٰٮكُمۡ بِالۡبَنِيۡنَ ....وَجَعَلُوا الۡمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيۡنَ هُمۡ عِبٰدُ الرَّحۡمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوۡا خَلۡقَهُمۡ ؕ سَتُكۡتَبُ شَهَادَتُهُمۡ وَيُسۡـَٔلُوۡنَ . وَقَالُوۡا لَوۡ شَآءَ الرَّحۡمٰنُ مَا عَبَدۡنٰهُمۡ.

(زخرف۴۳:۱۵،۱۶،۱۹،۲۰)

اور ان مشرکوں نے خدا کے بندوں میں سے خدا کا ایک حصہ بنالیا، بے شک انسان کھلا نافرمان ہے، کیا خدا جو پیدا کرتا ہے وہ اپنے لئے لڑکیاں لے اور تم کو لڑکے دے کر عزت دے........ اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں لڑکیاں قرار دیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے، ان کی گواہی لکھی اور باز پرس کی جائے گی اور کہتے ہیں کہ اگر خدا نہ چاہتا تو ہم ان کی پرستش نہ کرتے۔

فَاسۡتَفۡتِهِمۡ اَلِرَبِّكَ الۡبَنَاتُ وَلَهُمُ الۡبَنُوۡنَ اَمۡ خَلَقۡنَا الۡمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمۡ شٰهِدُوۡنَ. اَلَاۤ اِنَّهُمۡ مِّنۡ اِفۡكِهِمۡ لَيَقُوۡلُوۡنَ . وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ . (صٰفٰت۳۷:۱۴۹-۱۵۲)

تو ان سے پوچھ کہ کیا تیرے رب کی لڑکیاں ہوں اور ان کے لڑکے ہوں کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں پیدا کیا اور وہ حاضر تھے، ہاں یہ ان مشرکوں کی بناوٹ ہے، وہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہوئی اور وہ جھوٹے ہیں۔

ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ یہ فرشتے خدا کے ہاں اپنے پرستاروں کے سفارشی بنیں گے، خدا نے اس کی تردید میں کہا:

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا.....الاٰية (نجم ۵۳:۲۶)	اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش خدا کی اجازت کے بغیر کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

قیامت میں فرشتوں سے پرسش ہوگی کہ یہ مشرک تمہاری پوجا کرتے تھے:

ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ. (سبا ۳۴:۴۰)	پھر خدا فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ انسان تمہیں کو پوجتے تھے۔

جنات کی الوہیت: فرشتوں کی طرح وہ جنات کو بھی خدا کا عزیز وقریب سمجھتے تھے اور خدا کے ان سے رشتے لگاتے تھے:

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (صٰفٰت ۳۷:۱۵۸)	اور مشرکوں نے خدا اور جنوں کے درمیان رشتہ داری بنائی۔

اسی لئے وہ جنات کو خدا کی خدائی میں شریک کرتے تھے:

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام ۶:۱۰۱)	انہوں نے جنوں کو خدا کا شریک بنایا اور وہ خدا کی مخلوق ہیں اور بن جانے خدا کے لئے بیٹے اور بیٹیاں گھڑیں۔

اور جب وہ خدا کے رشتہ دار اور خدائی کے شریک ٹھہرے تو ان کی عبادت اور پرستش بھی ضروری ہوئی، چنانچہ جاہلیت میں اہلِ عرب ان جنوں کی بھی پوجا کرتے تھے۔(۱) بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ. (سبا ۳۴:۴۱) بلکہ یہ جن کو پوجتے تھے اور ان میں سے اکثر ان ہی پر ایمان رکھتے تھے۔ مسافر جب راستہ میں کہیں قیام کرتے تھے تو پہلے وہاں کے جنوں کی دہائی پکار لیتے تھے، قرآن میں ہے وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا. (جن ۷۲:۶) اور بات یہ تھی کہ کچھ انسان بعض کی دہائی پکارا کرتے تھے اور انہوں نے ان کو اور مغرور بنا دیا، چنانچہ بعض خوف ناک مقامات میں خاص طور سے ان کے نام کی قربانی کی جاتی تھی، ان میں سے ایک مشہور

(۱) صحیح مسلم کتاب التفسیر باب فی قولہ تعالیٰ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ ج۲ ص ۵۴۹، ۵۵۰۔

مقام دار تھا جہاں کے رہنے والے جنوں (سکان الدار) پر جانور ذبح کرکے چڑھائے جاتے تھے تاکہ قربانی کرنے والے ان کی شرارت سے محفوظ رہیں (۱)، قبیلۂ خزاعہ کی شاخ بنو ملیح خاص طور سے جنوں کی پوجا کرتی تھی اور کلبی کا بیان ہے کہ ان ہی کے متعلق یہ آیت اتری ہے (۲):

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ (اعراف ۷: ۱۹۴)

خدا کو چھوڑ کر تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری ہی طرح بندے ہیں۔

بت پرستی: جن خداؤں کو یہ لوگ مانتے تھے ان کے بت بنالئے تھے اور جابجا عظیم الشان بت کدے قائم ہو گئے تھے، یہ رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ جہاں کوئی خوبصورت پتھر مل گیا اٹھالیا، اور اس کی پرستش شروع کردی، اس سے زیادہ خوبصورت مل گیا تو اس کو پھینک دیا ور اس کی پرستش کرنے لگے، جہاں کوئی پتھر نہ ہاتھ آیا خاک کا ایک تودہ بنالیا، ایک بکری لاکر اس کا دودھ اس پر دوہا پھر اس کے گرد طواف کیا، اور اب وہ ایک معبود بن جاتا تھا، چنانچہ صحیح بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنفیۃ ج ۲ ص ۸۲۶ میں یہ پوری تفصیل مذکور ہے۔

اس بت پرستی کی ابتدا یوں ہوئی کہ قبیلۂ خزاعہ کا ایک شخص جس کا نام عمرو بن لحی تھا اور جو قبیلۂ جرہم کو شکست دے کر کعبہ کا متولی بن گیا تھا، ایک دفعہ بلقا گیا، وہاں لوگوں کو بت پرست دیکھ کر بت پرستی کی طرف مائل ہوا اور وہیں سے ایک بت لاکر کعبہ میں نصب کیا، چوں کہ اس کا اثر تمام عرب پر تھا اس لئے تمام عرب نے بت پرستی قبول کرلی، اور گھر گھر بت خانے بن گئے، ان میں **ہبل** سب سے بڑا تھا، اس سے اتر کر منات، لات اور عزیٰ تھے۔

منات مدینہ منورہ سے سات میل پر تھا، انصار کے قبیلے یعنی اوس وخزرج اور آس پاس کے قبائل اسی کا حج کرتے تھے، کعبہ کا حج بھی جب یہ لوگ کرتے تھے تو احرام یہیں آکر اتارتے تھے، حلفیہ معاہدے بھی یہیں ہوتے تھے، عبد العزیٰ مزنی کہتا ہے۔ (۳)

انی حلفت یمین صدق برة
بمناة عند محل آل الخزرج

میں نے منات کی سچی قسم کھائی اہل خزرج کے احرام اتارنے کی جگہ کے پاس۔

---

(۱) لسان العرب میں لفظ "سکن" ج ۲ ص ۱۷۴، بیروت (۲) کتاب الاصنام ہشام الکلبی مطبعۃ دار الکتب المصریہ قاہرہ ص ۳۴ ۱۹۲۴ء/۱۳۴۳ھ (۳) یہ پوری تفصیل معجم البلدان ج ۸ ص ۱۶۷، ۱۶۸ الفظ مناۃ میں ہے۔

لات قبیلۂ ثقیف کا معبود تھا جو مقام طائف میں نصب تھا، اہل طائف اس کو کعبہ کے برابر تسلیم کرتے تھے۔

عزیٰ ایک درخت تھا اس کے پاس ایک بت تھا یہ قبیلۂ غطفان کا بت تھا، لیکن قریش بھی اس کی نہایت عزت کرتے تھے، اور اس کی زیارت کو جاتے تھے، قریش جب کعبہ کا طواف کرتے تھے تو یہ پڑھتے تھے۔(۱)

واللات و العزی ومناۃ الثالثۃ الاخری	لات ،عزی اور تیسرا مناۃ ،یہ بڑے برگزیدہ ہیں اور
انھن الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجی.	ان کی سفارش کی خدا کے ہاں امید ہے۔

بت پرستی نے رفتہ رفتہ اور بہت سی برائیاں پیدا کردیں ،جانوروں سے گذر کر انسانی قربانیاں ان پر چڑھائی جانے لگیں، آنحضرت ﷺ کے جدامجد عبدالمطلب نے جو اپنے صاحب زادہ (عبداللہ) کی قربانی کرنی چاہی تھی، اسی رسم کی تقلید تھی۔

بحیرہ، سائبہ، حام کے نام سے بتوں کے نام پر سانڈ چھوڑتے تھے، کعبہ کے سامنے جو قربانی کرتے تھے اس کا خون کعبہ کی دیواروں پر ملتے تھے(۲)، بتوں کے سامنے شگون کے تیر رہتے تھے، ان میں سے ایک پر ہاں ،ایک پر ناں لکھا رہتا تھا، جو کام کرنا چاہتے تھے، پجاری سے کہتے فال نکالے ہاں کا تیر نکلتا تو اس کام کو کرتے ورنہ باز رہتے۔

جاہلیت میں جن چیزوں کی پرستش کی جاتی تھی وہ مختلف قسموں کی تھیں، اصنام و اوثان، انصاب اور بیوت، اصنام واوثان جن کا واحد صنم اور وثن ہے، یہ انسانی شکل وصورت کے بت تھے، اگر وہ لکڑی کے ہوتے تو بعیم کہلاتے اور اگر رنگ اور مسالہ سے بنتے تو ان کو دمیہ کہتے، انصاب اور نصب بن گھڑے پتھر ہوتے تھے جن کو کھڑا کرکے ان پر چڑھاوے چڑھاتے، اور جانور ذبح کرتے تھے، بیوت جس کا واحد بیت ہے چند گھر تھے جیسے رضا، رئام، قلیس وغیرہ جن میں بت پرستانہ رسوم ادا کئے جاتے تھے، جن بتوں کے اردگرد چکر لگاتے تھے ان کو دوار کہتے تھے، اور ان پر جو قربانی کی جاتی تھی اس کو عتیرہ کہتے تھے، پتھروں کا ڈھیر لگا کر اس کے چاروں طرف چکر لگاتے تھے، اس ڈھیر کو رجمہ کہتے تھے، جاہلی شاعر کہتا ہے:

(۱) معجم البلدان ج ۶ ص ۱۶۶ الفظ لات وکتاب الاصنام للکلبی ص ۱۹ (۲) نیل المرام فی تفسیر ایات الاحکام ص ۱۱۰، ۱۱۱۔

کما طاف بالرجمۃ المرتجم

جیسے پتھروں کے ڈھیر کا طواف لگانے والا طواف کرے۔(۱)

جن بتوں کی پرستش کی جاتی تھی ان کی کوئی انتہا نہ تھی ع

قبیلہ قبیلہ کا اک بت جدا تھا۔

خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو ساٹھ بت تھے(۲)، ان میں سے قرآن پاک میں جن کے نام بتائے گئے ہیں وہ یہ ہیں، لات، عزیٰ، مناۃ، یغوث، یعوق، نسر، ود، سواع، بعل، لیکن جاہلیات کے پرانے مورخوں اور لغت نویسوں نے جاہلیت کے شخصی ناموں اور شعرا کے اشعار سے بہت سے نام ذکر کیے ہیں، ہشام کلبی کی کتاب الاصنام میں جو اس موضوع پر پہلی کتاب ہے اور جواب مصر میں چھپ بھی گئی ہے تقریباً تیس بتوں کے نام ہیں، علامہ زکی پاشا جنہوں نے کلبی کی اس کتاب کو ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء میں تحشیہ اور تکملہ کے بعد شائع کیا ہے، اپنے تکملہ میں چھیالیس نام اور بڑھائے ہیں، یمن اور حجاز میں آثار قدیمہ کے محققوں نے عہد جاہلیت کے جو کتبے پڑھے ہیں، ان میں المقہ، عشتار، نکرہ، قینان وغیرہ بہت سے اور ناموں کا پتہ لگایا ہے، میں نے ارض القرآن کی دوسری جلد میں جو ۱۳۳۶ ہجری/۱۹۱۸ء میں چھپی ہے، ان معلومات کو یک جا کر دیا ہے، (ذکر اہل معین کا مذہب ص ۱۵۷)۔

ذیل میں ہم ان بتوں کی فہرست درج کرتے ہیں جن کے نام اب تک معلوم ہو چکے ہیں۔

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جو ان کو خاص طور سے پوجتے تھے
لات	ثقیف
عزی	قریش، و بنوشیبان بن جابر
مناۃ	اوس وخزرج اور عام عرب
یغوث	بنومذحج واہل جرش
یعوق	بنوہمدان واہل خیوان
نسر	حمیر

(۱) ان الفاظ کے لیے دیکھو لسان العرب۔ (۲) صحیح بخاری باب فتح مکہ باب این رکز النبی ﷺ الرایۃ ج ۲ ص ۶۱۴ و کتاب التفسیر سورہ بنی اسرائیل باب قولہ وقل جاء الحق ج ۲ ص ۶۸۶

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جو ان کو خاص طور سے پوجتے تھے
وڈ	بنوکلب
سواع	بنولحیان
اساف	بت، جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی
نائلہ	بت، جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی
اُقیصر	قضاعہ ولخم وجذام وعاملہ وغطفان
باجر	ازدوطی وقضاعہ
ذوالخلصۃ	بنوامامہ، خثعم، بجالہ، ازدالسراۃ
رضایارضی	بنوربیعہ کا بت خانہ
رئام	حمیر کا بت خانہ
سجہ	
سعد	بنی ملکان بن کنانہ
سُعیر	عنزہ
ذوالشریٰ	بنوحارث
عائم	ازدالسراۃ
عم انس (یا) عمیانس	خولان
قلس	طی
ذوالکفین	بنودوس
مناف	قریش
نہم	مزینہ
ہبل	قریش
بعل	قبائلِ بنی عدنان
یعبوب	جدیلہ بن بنی طی
اشہل	بنوعبدالاشہل
اوال	بکروتغلب

قبیلوں کے نام جو ان کو خاص طور سے پوجتے تھے	بتوں کے نام
غطفان کا بت خانہ	بس
ایک لکڑی کا بت	بعیم
ایک بت	بلج
ایضاً	جبہہ
ایک بت جس کی طرف عبد جریش کی نسبت ہے	جُریش یا جُریش
ایک بت کا نام	جلسد
ہوازن کا معبود	جہار
بنو عبد الدار	دار
ایک بت کا نام	دوار
حجاز کا ایک بت	ذوالرجل
ایک بت کا نام جس کی طرف عبد الشارق کی نسبت ہے	شارق
بنو عبد شمس	شمس
عاد کا بت	صدا
ایضا	صمودا
عباس بن مرداس سلمی کا قبیلہ	ضمار
منذر اکبر	ضیزن
قضاعہ	عبعب
بکر بن وائل	عوض
ایک بت کا نام	عوف
اس پر جانور ذبح کئے جاتے تھے	غبغب
سعد العشیرہ	فرّاض
جدیس وطسم	کثریٰ

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جو ان کو خاص طور سے پوجتے تھے
کسعہ	ایک بت کا نام
محرق	بکر بن وائل
مدان	عبد المدان
مرحب	حضرموت
منہب	ایک بت کا نام
ہبا	عاد
ذات الودع	ایک بت کا نام
یالیل	عبد یالیل

ستارہ پرستی: عرب میں ستارہ پرستوں کا بھی ایک گروہ تھا، مختلف قبیلے مختلف ستاروں کی پوجا کرتے تھے ان میں سب سے اہم سورج اور چاند تھے اسی لئے قرآن پاک نے خصوصیت کے ساتھ کہا:

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ — نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو۔

(حم السجدہ ۴۱:۳۷)

یمن میں سبا کی قوم سورج ہی کو دیوی مانتی تھی (نمل ۲۷:۲۴) یمن کے بادشاہ شمر یرعش نے سورج دیوی کا مندر بنوایا تھا (۱)، سورج اور چاند کے بعد ستاروں میں شعریٰ کی بڑی قدر و منزلت تھی اسی لئے قرآن پاک نے کہا:

وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى . (نجم ۵۳:۴۹) — اور وہی خدا شعری کا مالک ہے۔

صاعد اندلسی المتوفی ۴۶۲ ہجری نے اپنی کتاب طبقات الامم میں عرب کے حسب ذیل قبیلوں کو مختلف ستاروں کا پرستار بتایا ہے۔

قبیلۂ حمیر سورج کو پوجتا تھا، کنانہ چاند کو، تمیم دبران کو، لخم اور جذام مشتری کو، طی سہیل کو، قیس شعریٰ العبور کو اور اسد عطارد کو۔ (۲)

(۱) تاریخ ملوک الارض حمزہ اصفہانی ص ۱۱۱ کلکتہ، ۱۸۶۶ء (۲) طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی ص ۴۳، بیروت ۱۹۱۲ء۔

جن اور شیاطین اور بھوت پلیت: جن اور شیطان کی نسبت عرب کے عجیب عجیب اعتقادتھے، وہ جن و شیطان اور بھوت پلیت، سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے گو اختلافِ صورت اور اشغال کی وجہ سے ان کے الگ الگ نام پڑ گئے تھے، جو اجنہ جنگلوں اور میدانوں میں رہتے تھے اور مسافروں کو اپنی صورتیں یا لباس بدل بدل کر دھوکا دیتے تھے ان کا نام غول تھا، یہ مذکر بھی ہوتے تھے اور مونث بھی۔

عبید بن ایوب الغیری:

وغولا قفرة ذكر و انثىٰ كان عليهما قطع البجاد

اور بیابان کے دو غول، مرد بھی اور عورت بھی گویا کہ ان دونوں پر کمل کے ٹکڑے پڑے ہیں۔

مونث کو سعلاۃ کہتے تھے:

ازل وسعلاة وغول بقفرة اذا الليل وارى الجن فيه ادنت

میں پھسلتا ہوں اور چڑیل اور غول بیابان میں جب رات پردہ پوش ہوتی تھی تو اس میں آواز دیتے تھے۔

عمر بن یربوع ایک ممتاز شخص تھا، اس نے سعلاۃ سے نکاح بھی کیا تھا اور اس سے اولاد بھی ہوئی تھی، راجز کہتا ہے:

يا قاتل الله بنى سعلاة

خدا سعلاۃ کے فرزندوں کو مارے۔

بلقیس ملکۂ یمن (ان کے زعم میں) سعلاۃ ہی کے پیٹ سے تھی:

یہ اکثر گاتے بجاتے تھے اور اہل عرب ان کے نغموں سے محظوظ ہوتے تھے:

كم حبت دونك من بهماء مظلمة تيه اذا ما مغنى جنه سمرا

کتنی اندھیری گھپ راتوں میں میں نے صحرا کو قطع کیا جب وہاں کے جنات کا مغنی افسانہ گوئی کر رہا تھا۔

یہ صحرا نشین بدوؤں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے، جاڑوں میں جب بدو آگ جلا کر بیٹھتے تھے تو یہ بھی آگ تاپنے کو آجاتے تھے لیکن جب ان کو کھانے پر بلاتے تھے تو وہ عذر کرتے تھے کہ ہم آدمیوں کی غذا نہیں کھا سکتے:

اتوا نارى فقلت منون انتم فقالوا الجن قلت عموا ظلاما

وہ لوگ رات کو میرے پاس آئے تو میں نے کہا تم کون ہو، انہوں نے کہا ہم جن ہیں، میں نے کہا اس تاریکی میں خوش رہو،

دعوت الى الطعام فقال منهم زعيم نحسد الانس الطعاما

میں نے ان کو کھانے کے لئے بلایا تو ان میں سے ایک سردار نے کہا ہم انسانوں کے کھانے پر حسد کرتے ہیں۔

یہ زیادہ تر جہاں آباد تھے ان موضعوں کے نام بدی، بقار اور عبقر تھے:

جن البدی رواسیا اقدامھا	بدی کے جن، جن کے قدم جمے تھے۔
تحت السنور جنة البقار	زرہوں کے نیچے بقار کے بھوت تھے۔
علیھن فتیان کجنة عبقر	اور ان پر شہ سوار جوان عبقر کے بھوت معلوم ہوتے تھے۔

ان کے اقسام حسب ذیل تھے۔

جو آدمیوں کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے، ان کو عامر کہتے تھے۔

جو بچوں کو ستاتے تھے ان کا نام روح تھا۔

جو زیادہ شریر تھے ان کو شیطان کہتے تھے۔

اس درجہ سے بڑھ کے جو شریر ہوتا تھا اس کو عفریت کہتے تھے۔

یہ اکثر بچوں اور جوانوں کو اٹھا لے جاتے تھے، حضرت علیؓ کے ایک بھائی طالب تھے، یہ ان کو اٹھا لے گئے اور پھر ان کا پتا نہ لگا، عمرو بن عدی لخمی جو عرب کا بادشاہ تھا اس کو بھی اٹھا لے گئے تھے لیکن کئی برس کے بعد جذیمہ ابرش کو لا کر دے گئے۔

اسی طرح خرافہ کا قصہ ہے جس کو جن اٹھا لے گئے تھے، مدت کے بعد وہ واپس آیا تو عجیب عجیب باتیں بیان کرتا تھا۔(۱)

ان اجنہ یا شیاطین سے جن لوگوں کے تعلقات زیادہ بڑھ گئے تھے، ان میں سے تابط شرا اور ابو البلاد طہوی زیادہ مشہور ہیں، طہوی نے ایک دفعہ ایک بھوت کو مار ڈالا تھا اس کے واقعات ایک نظم میں لکھے ہیں:

لقیت الغول تسری فی ظلام	میں غول بیابانی سے ملا جو رات کو اندھیرے میں چلتے ہیں
فصدت و انتحیت لھا بعضب	حسام غیر موتشب یمانی

تو اس نے روکا اور میں یمن کی بنی ہوئی اصیل تلوار لے کر اس کی طرف بڑھا

فقد سراتھا و البرد منھا	فخرت للیدین وللجران (۲)

تو اس نے اس کے سر کو اور اس کی زرہوں کو کاٹ ڈالا۔ اور وہ دونوں ہاتھوں اور سینہ کے بل زمین پر گر پڑا۔

---

(۱) شمائل ترمذی باب السمر ص ۲۰۳۔(۲) یہ تمام تفصیل کتاب الحیوان جاحظ سے ماخوذ ہے، اس نے کئی ورق میں نہایت تفصیل سے یہ واقعات لکھے ہیں، دیکھو کتاب مذکور از ص ۴۸ تا ۸۰ جز ششم مطبوعہ سعادت مصر۔

ان ہی اجنہ اور شیاطین کا زور توڑنے کے لئے قرآن نے قیامت کے اس سوال وجواب کا انداز اختیار کیا ہے کہ ان کے دوست انسان وہاں بھی ان کی دوستی کا دم بھرتے جائیں گے، اس سے اندازہ ہوگا کہ جاہل عربوں پر ان کا کس قدر استیلا تھا:

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُم مِّنَ الْاِنْسِ وَ	اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں سے بہت کچھ وصول
قَالَ اَوْلِیٰٓؤُهُم مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ	کیا اور ان کے دوست دار انسان بولے اے ہمارے رب!
بَعْضُنَا بِبَعْضٍ (انعام ۶:۱۲۹)	ہم میں سے ایک نے دوسرے کا کام نکالا۔

کہانت: کہانت ایک سخت بلا تھی جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی، ہر جگہ ایک یا کئی کاہن ہوتے تھے جو آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کرتے اور آسمانی خبریں بتاتے تھے، اہلِ عرب کا اعتقاد اور خود کاہنوں کا دعویٰ تھا کہ ان کے ساتھ ایک ایک جن رہتا ہے(۱) اور وہی ان کو القا کرتا ہے، وہ اپنی شکل وصورت ایسی بناتے تھے کہ پہچان لئے جاتے تھے، چنانچہ ایک بار حضرت عمرؓ کے پاس سے ایک آدمی گزرا انہوں نے قیافہ سے پہچان لیا کہ وہ کاہن ہے اس کو بلا کر پوچھا کہ ''تیرے جن نے تجھ سے سب سے عجیب تر بات کیا بیان کی''، اس نے کہا میں ایک روز بازار میں پھر رہا تھا کہ میرا جن گھبرایا ہوا آیا اور کہا:

الم تر الجن و ابلاسها، و یاسها من بعد	کیا تم جنوں کی سراسیمگی، ان کی ناامیدی اور ان کے
انکاسها ولحوقها بالقلاص واحلاسها.	کاروبار کی ابتری نہیں دیکھتے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا سچ کہتا ہے میں ایک روز زمانۂ جاہلیت میں بتوں کے پاس سویا ہوا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی نے ایک گوسالہ لا کر ذبح کیا، اس کے بعد ایک شخص زور سے چلایا:

یا جلیح امر نجیح رجل فصیح	اے جلیح، کامیاب امر، ایک فصیح شخص لا الہ الا اللہ
یقول لا الہ الا اللہ.	کہتا ہے۔

اس کے چند ہی دنوں کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔(۲) صحیح بخاری (تفسیر سورہ والضحیٰ ج۲ص۷۳۹) میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ علیل ہوگئے اور دو تین رات کو عبادت

---

(۱) کتاب البیان و التبیین للجاحظ جلد اول ص۱۱۳ مطبوعہ مطبع علمیہ مصر۔ (۲) صحیح بخاری جلد اول ص۵۴۶۔

کے لئے نہیں اٹھے، اس پر ایک عورت (یہ ابولہب کی زوجہ تھی) نے آ کر آنحضرت ﷺ سے کہا:

انی لارجو ان یکون شیطانک قد ترکک.

میرا خیال ہے کہ تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا۔

یہ وہی خیال تھا چوں کہ کفار آپ ﷺ کو کاہن خیال کرتے تھے اس لئے ان کا خیال تھا کہ آپ ﷺ کے ساتھ کوئی جن یا شیطان رہتا ہے، قرآن پاک نے اسی کی تردید اس آیت میں کی ہے:

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ. تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ. يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ. (شعراء ۲۶:۲۲۱ تا ۲۲۳)

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں، شیطان ہر جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں، وہ سنی سنائی بات القا کرتے ہیں اور اکثر وہ جھوٹے ہوتے ہیں۔

یہ کاہن تمام مقدمات اور نزاعات کا فیصلہ بھی کرتے تھے اور اس بنا پر تمام ملک پر ان کا اثر چھایا ہوا تھا، ان میں سے حازی، شق، سطیح، عزیٰ بہت مشہور تھے، جاحظ نے ان کے کاہنانہ فقرے کتاب البیان جزء اول ص ۱۱۳ میں نقل کئے ہیں:

و الارض و السماء و العقاب و الصقعاء واقعة ببقعاء لقد نفر المجد بنی العشراء للمجد و السناء.

قسم ہے زمین اور آسمان کی اور عقاب اور آفتاب کی، ایک واقعہ میدان میں واقع ہوا کہ بزرگی بنو عشراء پر غالب آگئی بوجہ بڑائی اور بلندی کے۔

یہ کاہن جو خبریں بتاتے یا تلقین کرتے وہ بڑے تکلف کے مقفیٰ اور مسجع فقرے ہوتے، اس لئے جب ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کے سامنے ایک ساقط الحمل بچہ کا مقدمہ پیش ہوا اور آپ ﷺ نے اس کی دیت کا فیصلہ کیا تو ایک شخص نے عرب کے دستور کے مطابق اعتراضاً کہا:

ارایت من لا شرب ولا اکل ولا صاح فاستهل ،الیس دمه یطل

غور فرمائیے، جس بچہ نے نہ کھایا نہ پیا، نہ چیخا، نہ رویا، کیا اس کا خون معاف نہ ہوگا۔

آپ ﷺ نے فرمایا یہ کاہنوں کے بھائیوں میں سے ہے۔ (صحیح مسلم کتاب القسامہ والمحاربین باب دیۃ الجنین ج ۲ ص ۶۰، ۶۱ و صحیح بخاری کتاب الطب باب الکہانۃ ج ۲ ص ۸۵۷)

یہ کاہن بت خانوں میں رہتے تھے اور کسی خاص بت کے پجاری ہوتے تھے، جب لوگ ان سے غیب کی بات پوچھتے، یا وہ خود آیندہ کے متعلق پیشین گوئی کرنے لگتے تو ایک خاص کیفیت

اپنے اوپر طاری کرتے، مرد بھی کاہن ہوتے تھے اور بعض عورتیں بھی ہوتی تھیں جو کاہنہ کہلاتی تھیں، یہ مصیبتوں اور بلاؤں کے دور کرنے کے لئے بت پرستانہ علاج اور تدبیر بتاتے تھے، یہ اپنی کہانت کی اجرت میں بڑی بڑی رقمیں اور نذرانے وصول کرتے تھے، اسلام کے بعد ان میں جو مسلمان ہوگئے تھے وہ علانیہ اپنے خدع وفریب کا اعتراف کرتے تھے (۱)، ان کو نذر و نیاز اور اجرت کی جو رقم یا تحفہ ملتا، اس کا نام حلوان الکاہن تھا یعنی کاہن کے منہ میٹھا کرنے کے لئے تحفہ، اسلام نے آکر اس کو روک دیا۔ (۲)

غرض ان کاہنوں نے عوام فریبی کا بڑا جال پھیلا رکھا تھا، اور یہ ان ہی کا اثر تھا کہ ملک کا ملک سیکڑوں قسم کی وہم پرستیوں میں مبتلا ہوگیا تھا۔

شعرا کی نسبت بھی عرب کا خیال تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان رہتا ہے اور وہی اس کو اشعار القا کرتا ہے، چنانچہ مخبل شاعر کی شیطانہ، عمرو کی بیٹی تھی اور اعشیٰ جو عرب کا مشہور شاعر تھا اس کے شیطان کا نام مسحل تھا، اعشیٰ خود کہتا ہے:

دعوت خليلى مسحلا و دعوا له   بجهنام يدعى للهجين المذمم

میں نے اپنے دوست مسحل کو پکارا اور انہوں نے اس کے لئے جہنام کو پکارا اور یہ کمینہ بد اطوار کے لئے بلایا جاتا ہے۔

حبانى اخى الجنى نفسى فداءه   باقبح جياش العشيات مرجم. (۳)

مجھ کو میری جن دوست نے میری جان اس پر فدا ہو شاموں کے وقت سب سے بڑے جوش مارنے والے اور سخت پتھراؤ کرنے والے کو دیا۔

جو اعلا درجہ کا شاعر ہوتا تھا، اس کا شیطان یا جن مذکر ہوتا تھا، ابوالنجم کہتا ہے:

انى وكل شاعر من البشر   شيطانه انثىٰ و شيطانى ذكر

ہر شاعر کا شیطان تو مونث ہے مگر میرا شیطان مذکر ہے۔

شنقنان اور شیصبان روسائے شیاطین تھے جو شاعری سکھلاتے تھے، ایک شاعر کو اس پر فخر تھا کہ اس کا معلم اسی شیصبان کی اولاد سے ہے۔

---

(۱) بخاری جلد اول باب ایام الجاهلية ص ۵۴۲، و جلد دوم کتاب الطب باب الكهانة ص ۸۵۷۔ (۲) صحیح بخاری جلد اول باب ایام الجاهلية ص ۵۴۲، و جلد دوم کتاب الطب باب الكهانة ص ۸۵۷۔ (۳) اعشیٰ کے دیوان مطبوعہ ویانا ص ۶۵ (اور شعراء النصرانية القسم الثالث۔ ص ۳۷۷۔ ض) میں صرف پہلا شعر ہے اور اس کا بھی دوسرا مصرعہ اس طرح ہے، جهنام جدعا للهجين المذمم۔

ولی صاحب من بنی الشیصبان　　فطورا اقول و طورا ھوہ

میرا ساتھی شیصبان کی اولاد ہے، تو کبھی میں شعر کہتا ہوں کبھی وہ۔

اوہام پرستی: سانپ کو قتل نہیں کرتے تھے، یہ اعتقاد تھا کہ سانپ مارا جائے تو اس کا جوڑا آ کر بدلہ لیتا ہے،(۱) یہ اعتقاد تھا کہ مرنے کے بعد روح ایک پرند بن کر اڑتی رہتی ہے اس کو ہامہ کہتے تھے، یہ اعتقاد تھا کہ پیٹ میں ایک سانپ رہتا ہے جو بھوک کے وقت کاٹتا ہے، جو کام کرنا چاہتے تھے پہلے شگون لے لیتے تھے، مثلاً اس وقت کوئی پرند داہنی جانب سے اڑا تو مبارک سمجھتے تھے اور بائیں جانب سے اڑا تو اس وقت اس کام سے باز رہتے تھے، بکری کے جب بچہ پیدا ہوتا تو اگر نر ہوتا تو بت پر چڑھا دیتے، اونٹنی جب دس بچے جن لیتی، اس کو چھوڑ دیتے وہ سانڈ کی طرح چھوٹی پھرتی۔

کسی شخص کے پاس جب اونٹوں کی تعداد ہزار تک پہنچ جاتی تو ایک اونٹ کی ایک آنکھ پھوڑ دیتے کہ نظر نہ لگ جائے، جب کبھی قحط پڑتا تو بھیڑ یا دنبہ کی دم میں گھانس پھونس باندھ کر آگ لگا دیتے اور سمجھتے کہ اس سے پانی برسے گا، سفر میں جاتے تو کسی درخت میں ڈورا وغیرہ باندھ کر گرہ لگا دیتے واپس آ کر دیکھتے اگر گرہ کھل گئی ہے تو سمجھتے کہ ان کی بیوی نے بدکاری کی، سفر میں راستہ بھول جاتے تو کپڑے الٹ کر پہن لیتے اور سمجھتے کہ اس سے راستہ مل جاتا ہے۔(۲) یہ خیال تھا کہ جو شخص لات وعزیٰ کو گالی دیتا ہے اس کو برص یا جذام ہو جاتا ہے،(۳) ہاتھوں میں پیتل کی انگوٹھی پہنتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے ضعف جاتا رہتا ہے۔(۴)

اس قسم کے سیکڑوں اوہام پھیلے ہوئے تھے، جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

یہ تو ان کے مذہبی حالات وخیالات تھے، ان کی اخلاقی کیفیت بھی ایسی ہی پست تھی، ان کے اخلاقی معائب میں سب سے نمایاں چیز ان کی جنگ جوئی تھی جس نے ان کو حد درجہ خوں خوار سنگ دل اور سفاک بنا دیا تھا۔

جنگ جوئی　ذرا ذرا سی بات پر لڑ مرنا اور ایک دوسرے کا سر کاٹ لینا ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی، ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے اور ہر خاندان دوسرے خاندان سے برسر پیکار تھا، ہر بچہ اپنے باپ

---

(۱) ابوداؤد مطبع قادری ۱۲۷۲ھ جلد ۲ ص ۳۵۸ کتاب الادب باب فی قتل الحیات (۲) یہ باتیں بلوغ الارب اور اطوار العرب وغیرہ کتابوں میں مذکور ہیں۔ (۳) مسند دارمی ص ۸۹ کتاب الصلوٰۃ باب فرض الوضوء والصلاۃ۔ (۴) ابن ماجہ ص ۲۶۰ باب تعلیق التمائم ابواب الطب۔

اورعزیزوں کے قاتل سے انتقام لینے کے جذبہ میں پرورش پاتا تھا اور جوان ہو کر اس مقدس فرض کوانجام دیتا تھا اور اس طرح ایک ایک لڑائی کا سلسلہ برسوں تک قائم رہتا تھا، ان ہی لڑائیوں کو مورخین اور اہل ادب ایام العرب کہتے ہیں جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے، میدانی نیشاپوری المتوفی ۵۱۸ھ ہجری نے کتاب الامثال میں ان میں سے ۱۳۲ لڑائیوں کے نام بتانے کے بعد یہ لکھا ہے:

هذا الفن لا يتقصاه الا حصاء فاقتصرت علی ما ذکرت. (جلد ۲ ص ۳۷۱ خیریہ مصر)

یہ فن شمار کا استقصا نہیں کرسکتا، اس لئے جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اسی پر میں نے قناعت کی۔

یہ تمام لڑائیاں وہ ہیں جو اسلام سے چالیس پچاس برس پیش تر سے اسلام تک ہوئیں، ان میں سب سے مشہور لڑائی عبس وذبیان کی ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ ان دو قبیلوں کے دو گھوڑے داحس اور غبرا کا باہمی مقابلہ تھا، ان میں سے ایک فریق نے گھوڑ دوڑ کے قواعد کی خلاف ورزی کی اور لڑائی ہو پڑی، یہ لڑائی ان دونوں قبیلوں میں پورے چالیس برس تک قائم رہی، دوسری مشہور لڑائی حربِ بسوس ہے، اس کا واقعہ یہ ہے کہ بسوس نامی ایک قبیلہ کی عورت کی اونٹنی کلیب بن وائل کے چراگاہ میں جا پڑی، کلیب نے اپنے تیر سے اس کے تھن کو زخمی کیا، اس بات نے قبیلہ میں آگ لگادی، کلیب جان سے مارا گیا اور بکر وتغلب میں خوں ریز جنگ ہوئی، عکاظ کے میلہ میں سلیم اور غطفان کے سرداروں میں کچھ مناقشہ ہوا، چند روز کے بعد موقع پاکر ایک قتل کر دیا گیا، اس کے انتقام میں خون کی ندیاں بہہ گئیں، بکر وتمیم میں ایک چراگاہ کے معاملہ میں خوں ریز لڑائی ہوئی، اوس وخزرج مدینہ کے دونوں قبیلوں میں جو ہولناک لڑائیاں ہوتی رہیں ان میں سب سے مشہور یوم بعاث ہے جس میں دونوں قبیلوں کے اکثر سردار کام آئے، اس لڑائی کا خاتمہ انصارِ مدینہ کی بیعت پر ہوا، قریش کی مشہور لڑائیوں کا نام ایامِ فجار ہے، ایک اور مشہور لڑائی کا نام ذی قار ہے۔

الغرض معمولی سے اشتعال سے قتل تک نوبت پہنچتی تھی، قتل سے انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا (۱)، ان میں لڑنا اور مرنا اور مارنا جاہلیت کا شرف اور قبیلہ کی آن سمجھی جاتی تھی اور اس خون آشامی کا ذوق ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی، ان لڑائیوں میں سفاکی، بے رحمی اور قتل وغارت کی بدترین مثالیں پیش آتی رہتی تھیں۔

(۱) ان لڑائیوں کے مفصل حالات کے لئے دیکھو عقد الفرید ابن عبدربہ ج ۳ ص ۴۴ وما بعد مصر ۱۳۱۶ھ اور امثال میدانی الجزء الثانی الباب التاسع والعشرون فی اسماء العرب ص ۲۶۰ وما بعد مطبع خیریہ ۱۳۱۰ھ۔

شراب خواری: شراب جو ہر قسم کے فسق و فجور اور مظالم اور بدکاری کا سرچشمہ ہے، عربوں میں اس کا اس قدر رواج تھا کہ ہر گھر ایک مے کدہ بن گیا تھا، اس کا نہ پینا اس قدر نامانوس بات تھی کہ جن چند آدمیوں نے اسلام سے پہلے اس کے پینے سے پرہیز کیا تھا، ان کے نام یاد رکھے گئے ہیں، دوست واحباب کسی گھر میں جمع ہوتے، شراب کا دور چلتا، ساتھ ہی جوا کھیلتے، اس میں اونٹوں کی ہار جیت ہوتی، جو جیتتا وہ جیتے ہوئے اونٹوں کو اسی وقت ذبح کر کے لوگوں کو کھلا دیتا، کبھی نشہ میں سرشار ہو کر خود صاحب خانہ اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے اونٹوں کو کاٹ کاٹ کر ڈھیر کر دیتا، لوگ گوشت بھونتے، کباب لگاتے اور کھاتے کھلاتے اور اپنی اسی بے جا فیاضی پر فخر کرتے رہتے، فاحشہ مغنیہ عورتیں گاتی بجاتی اور اسی مخموری کے عالم میں بے شرمی کی باتیں کرتے، جاہلیت کا مشہور شاعر طرفہ کہتا ہے:

فان تبغنی فی حلقة القوم تلقنی　　وان تلتمسنی فی الحوانیت تصطد

پس اگر تم مجھے لوگوں کے حلقہ میں ڈھونڈے تو پائے گا اور اگر شراب خانوں میں مجھے شکار کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

متی تاتنی اصبحک کاسا رویة　　وان کنت عنها غانیا فاغن وازدد

جب بھی تو میرے پاس آئے میں تجھے شراب کا سیراب پیالہ پلاؤں گا اور اگر تو اس سے بے نیاز ہو کر آئے تو جا اور بے نیازی کر۔

ندامای بیض کالنجوم و قینة　　تروح الینا بین برد و مجسد

میری محفل شراب کے ہم نشیں ستاروں کی طرح گورے چٹے ہیں اور ایک مغنیہ ہے جو شام کو ہمارے پاس یمنی چادر اور زعفرانی کپڑوں میں آتی ہے۔

رحیب قطاب الجیب منها رفیقة　　بجسّ الندامی بضة المتجرد

اس کے گریبان کا شگاف بڑا ہے، شرابی رفیقوں کی دست درازی سے مانوس اور اس کے بدن کے برہنہ حصے لطیف ہیں۔

اذا نحن قلنا اسمعینا انبرت لنا　　علی رسلها مطروفة لم تشدد

جب ہم کہتے ہیں ہمیں سناؤ تو آہستہ آہستہ نزاکت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔

وما زال تشرابی الخمور و لذتی　　وبیعی و انفاقی طریفی ومتلدی

اور میری شراب نوشی اور لذت اندوزی اور اپنی حاصل کردہ اور موروثی دولت کو خرچ کرنا میرا شعار رہا۔

ولو لا ثلث هن من عیشة الفتیٰ　　وجدک لم احفل متی قام عودی

اور اگر تین باتیں نہ ہوتیں جو ایک شریف کا لطف ذوق ہیں تو تیری قسم میں اپنی موت کی پروا نہ کرتا۔

فمنهن سبقی العاذلات بشربة　　کمیت متی ما تعل بالماء تزبد

ان میں سے ایک تو نصیحت کرنے والوں کی بات کا خیال کیے بغیر سرخ و سیاہ رنگ کا پیالہ پی لینا جس میں پانی ملانے سے جوش آئے۔

وتقصیر یوم الدجن والدجن معجب　　ببهکنة تحت الخباء المعمد

اور دوسری بات گھنگھور گھٹا کے دن کو اور وہ کیسا پر لطف دن ہوتا ہے، کسی بلند خیمہ کے نیچے حسین معشوقہ سے لطف اندوزی میں چھوٹا کرنا ہے۔

کریم یروی نفسہ فی حیاتہ ستعلم ان متنا غدا اینا الصدی

میں وہ فیاض ہوں جو اپنی زندگی میں اپنے آپ کو شراب پلا کر سیراب کرتا ہے، موت کے بعد معلوم ہوگا کہ ہم میں پیاسا کون ہے۔

وبرک ھجود قد اثارت مخافتی بوادیھا امشی بعضب مجرد

اور کتنے بیٹھے ہوئے سوئے اونٹ تھے کہ میرے خوف نے ان کے اگلوں کو بھڑکا دیا جب میں ننگی تلوار لے کر چلا۔

فمرت کھاۃ ذات خیف جلالۃ عقیلۃ شیخ کالوبیل یلندد

تو ایک موٹی اونٹنی جو ایک بڈھے کی، جو ایک لٹھ کی طرح جھگڑالو تھا قیمتی چیز تھی، سامنے آگئی۔

وقال الا ماذا ترون بشارب شدید علینا بغیہ متعمد

(جب میں نے تلوار سے کونچیں کاٹ کر اونٹنی کو گرادیا) تو اس بڈھے نے کہا کہ اس بدمست کو دیکھو جو جان بوجھ کر ہم پر ظلم کر رہا ہے۔

فظل الاماء یمتللن حوارھا ویسعی علینا بالسدیف المسرھد (۱)

تو لونڈیاں اونٹنی کے بچہ کو (جو اس کے پیٹ سے نکلا تھا) بھونے لگیں اور چربی دار کوہان کا گوشت لے کر ہمارے پاس دوڑا جانے لگا۔

لبید بن ربیعہ جو عرب کا مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی محفل کا چوتھا ممبر ہے، کہتا ہے:

بل انت لا تدرین کم من لیلۃ طلق لذید لھوھا و ندامھا

بلکہ تو نہیں جانتی کہ کتنی کھلی ہوئی راتیں جن کی دلچسپی اور ہم نوشی پر لطف تھی۔

قد بت سامرھا و غایۃ تاجر وافیت اذ رفعت وعز مدامھا

میں ان کا قصہ گو تھا اور شراب فروش کی منزل میں آتا جاتا رہا، جب اس کا جھنڈا بلند ہوا اور اس کی شراب گراں ہوگئی۔

اغلی السباء بکل ادکن عاتق او جونۃ قدحت و فض ختامھا

میں اس کی قیمت کو اور گراں کر رہا تھا، پرانی خاکی رنگ کی مشک یا خم کو خرید کر جو پیالوں میں بھری جاتی اور اس کی مہر توڑی جاتی۔

وصبوح صافیۃ وجذب کرینۃ بموتر تاتالہ ابھامھا

اور کتنی صبح کی صاف شراب اور مغنیہ کا عود کھینچ کر اپنے انگوٹھے سے دبانا۔

بادرت حاجتھا الدجاج بسحرۃ لاعل منھا حین ھب نیامھا (۲)

میں نے شراب کی ضرورت مرغ سحر کی آواز سے پہلے پوری کی تاکہ میں اس کے سونے والوں کے جاگنے سے پہلے دہرالوں۔

تغلب ان قبیلوں میں تھا جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا لیکن اس مذہب نے بھی عربوں کو اس بری عادت سے باز نہیں رکھا تھا، بلکہ شراب کی درآمد زیادہ تر ان ہی عیسائیوں کے ملکِ شام سے ہوتی تھی، تغلب کا سب سے بڑا شاعر اپنے فخریہ میں کہتا ہے:

الا ھبی بصحنک فاصبحینا ولا تبقی خمور الاندرینا

ہاں اپنا پیالہ لے کر اٹھ جا اور مجھے صبح کی شراب پلا اور اندرین (شامی گاؤں) کی کوئی شراب چھوٹنے نہ پائے۔

(۱) شرح المعلقات السبع للزوزنی ص ۵۷ و مابعد، مطبع دار الکتب العربیہ مصر (۲) شرح المعلقات ص ۱۰۹ و مابعد

مشعشعة كان الحص فيها اذا ما الماء خالطها سخينا

پانی میں ملی ہوئی گویا اس میں کسم کے پھول پڑے ہیں جب گرم پانی اس میں ملاؤ۔

تجور بذی اللبانة عن هواه اذا ما ذاقها حتی یلینا

غرض مند کو اس کی غرض بھلا دے، اگر اس کو چکھ لے یہاں تک کہ اس کو نرم کردے۔

تری اللحز الشحیح اذا امرت علیه لماله فیها مهینا

تنگ دل بخیل پر بھی اگر اس کا ایک دور گذار دیا جائے تو وہ اپنی دولت کو لٹادے۔

صبنت الكأس عنا ام عمرو وكان الكاس مجراها الیمینا

اے عمرو کی ماں تو نے ہم سے پیالہ ہٹالیا حالاں کہ پیالہ کا دور داہنی طرف تھا۔

وما شر الثلثة ام عمرو بصاحبک الذی لا تصبحینا

حالاں کہ تیرا وہ ہم نشیں جس کو تو نہیں پلاتی تین میں سب سے بدتر نہیں۔

وكاس قد شربت ببعلبک واخریٰ فی دمشق و قاصرینا (۱)

اور کتنے پیالے بعلبک میں پئے اور کتنے دمشق اور قاصرین میں۔

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ جاہلیت میں شراب نوشی کا کیا عالم تھا، شراب فروشوں کی دوکانیں کسی ممتاز مقام پر ہمیشہ کھلی رہتی تھیں اور نشان کے لئے وہاں جھنڈا اڑا کرتا تھا جس کو غاية کہتے تھے (دیکھو اوپر لبید کا دوسرا شعر) انتہا یہ ہے کہ تجارت کا لفظ ''شراب فروشی'' کا مرادف بن گیا تھا، ایک جاہلی شاعر عمرو بن قمیئہ کہتا ہے:

اذ اسحب الریط والمروط الی ادنی تجاری وانفض اللمما (۲)

یاد ہے وہ دن جب میں اپنی چادر گھسیٹتا ہوا قریب ترین شراب خانہ میں جاتا تھا اور اپنے گیسوؤں کو جھاڑتا تھا۔

بدر میں قریش کے دولت مند رؤسا مارے گئے تھے، ان کے مرثیہ میں قریش کا ایک شاعر خاص طور سے ان کی بزم شراب اور مجلسِ رقص وسرود کی بربادی کا ماتم کرتا ہے:

وماذا بالقلیب قلیب بدر من القینات والشرب الکرام (۳)

بدر کے گڈھے میں (جس میں مقتولین کی لاشیں ڈالی گئی تھیں) ناچنے والیوں اور فیاض شرابیوں کا ماتم ہے۔

شراب کے رواجِ عام کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ عربی زبان میں شراب کے ڈھائی سو نام ہیں اور علامہ مجدالدین فیروزآبادی نے خاص ان ناموں پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے، تمام گھروں میں شراب کی مجلسیں قائم ہوتیں، گھر کی عورتیں اور چھوٹے بچے ساقی بنتے تھے، یہ شعراوپر

(۱) شرح المعلقات السبع ص ۱۱۷-۱۱۸ (۲) دیوان الحماسہ الجزء الثانی باب الادب ۱۰ طبع ثانی مطبع سعادت مصر ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء (۳) صحیح بخاری باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدینة جلد اول ص ۵۵۸

گذر چکا ہے، جس میں شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے:

صبنت الکاس عنا ام عمرو وکان الکاس مجراھا الیمینا

اے ام عمرو! تو نے شراب کا پیالہ ہم سے ہٹالیا حالاں کہ پیالہ کی گردش داہنی طرف سے تھی۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے میں اپنے باپ (عباسؓ) کی زبان سے کم سنی میں یہ سنا کرتا تھا، اسقنا کاسا دھاقا، شراب کا ایک لبریز پیالہ ہم کو پلا۔(۱)

صحیح بخاری کتاب الاشربة باب نزول تحریم الخمر ج ۲ ص ۸۳۶ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب شراب حرام ہوئی ہے تو اس وقت ایک مجلس قائم تھی جس میں حضرت ابو دجانہؓ، ابوطلحہؓ، سہیلؓ بن بیضاء شریک تھے اور میں جو کہ سب سے کم سن تھا ساقی گری کی خدمت انجام دے رہا تھا۔

شراب کس بے تکلفی سے پی جاتی تھی، کس درجہ کے لوگ پیتے تھے، کس قسم کے افعال اس حالت میں سرزد ہوتے تھے، اس کا اندازہ صحیح بخاری کی ایک روایت (۲) سے ہوگا جو حرمتِ شراب سے قبل کا واقعہ ہے۔

غزوۂ بدر میں حضرت علیؓ کو مال غنیمت میں سے ایک اونٹنی ملی تھی، خمس میں سے ایک اور اونٹنی آنحضرت ﷺ نے عطا فرمائی، حضرت علیؓ کا نکاح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ہو چکا تھا اور وہ دعوت ولیمہ کی تیاری کر رہے تھے، ارادہ تھا کہ جنگل میں جا کر اذخر (ایک گھاس کا نام ہے) لائیں اور زرگروں کے ہاتھ فروخت کریں، اس ارادہ سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ان کی اونٹنیوں کے کوہان کسی نے کاٹ لئے ہیں اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکال لیا ہے، لوگوں سے پوچھا کہ یہ کس کا کام ہے؟ معلوم ہوا کہ پاس ہی ایک گھر میں حضرت حمزہؓ چند انصاری کے ساتھ شراب پی رہے تھے، ایک مغنیہ نے گاتے گاتے یہ مصرعہ لگایا:

الا یا حمزة للشرف النواء

اے حمزہ! موٹی اونٹنیوں کے لئے۔

حضرت حمزہؓ تلوار لے کر اٹھے اور اونٹیوں کے پیٹ چاک کر کے ان کے کلیجے نکال لئے، حضرت علیؓ نے جا کر آنحضرت ﷺ کو خبر کی اور یہ ماجرا بیان کیا، آنحضرت ﷺ نے چادر اوڑھی

(۱) صحیح بخاری باب ایام الجاہلیة جلد اول ص ۵۴۱ (۲) صحیح بخاری کتاب الغزوات، غزوۂ بدر ص ۵۷۱۔

اور حضرت علیؓ اور زیدؓ کو لے کر حضرت حمزہؓ کے پاس گئے، حضرت حمزہؓ مخمور تھے، آنحضرت ﷺ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا تم سب میرے باپ کے غلام ہو، آنحضرت ﷺ یہ حالت دیکھ کر چلے آئے۔

حضرت حمزہؓ نے ۳ ہجری میں شہادت پائی اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔

شراب کی حرمت جس تدریج سے نازل ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ تمام ملک کس طرح اس میں مبتلا تھا، کس طرح وہ مقبولِ عام ہو چکی تھی کہ اس کی حرمت کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا اور کنایہ اور اشارہ سے گذر کر جب تک صاف صاف ممانعت نہیں کر دی گئی لوگ سمجھ نہیں سکے۔

ابوداؤد کتاب الاشربة باب فی تحریم الخمر ج ۲ ص ۸۳ میں روایت ہے کہ جب شراب کی ممانعت نازل ہوئی تو حضرت عمر نے کہا اے خدا! شراب کے بارہ میں ہم کو صاف صاف بتادے، ان کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

اللھم بین لنا فی الخمر بیانا شفاء	اے خدا! شراب کے بارے میں ہمارے لئے شافی بیان کردے

اس پر سورہ بقرہ کی یہ آیت اتری:

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز وَ اِثْمُهُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ط (بقرہ ۲: ۲۱۹)	لوگ تم سے شراب اور قمار بازی کی نسبت سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں لیکن فائدے سے گناہ بڑھ کر ہے۔

اس آیت کے اترنے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے پلاتے رہے یہاں تک کہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف وغیرہ کی دعوت کی، شراب کا دور چل رہا تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت آ گیا، ایک صاحب (۱) نے امامت کی مگر نشہ کے خمار میں قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ کی سورہ کو کچھ کا کچھ پڑھ گئے۔ اس پر یہ آیت اتری:

---

(۱) شراب کی حرمت کی یہ تدریجی صورت حضرت عمرؓ (ترمذی تفسیر مائدہ ص ۴۹۷ و ۴۹۸ و ابوداؤد، کتاب الاشربہ باب فی تحریم الخمر ج ۲ ص ۸۳) حضرت ابوہریرہؓ (مسند احمد ج ۲ ص ۳۵۱) اور حضرت علیؓ (ابوداؤد کتاب الاشربہ باب تحریم الخمر ج ۲ ص ۸۳) سے مروی ہے، یہ بات کہ وہ کون صحابی تھے جنہوں نے نشہ کی حالت میں غلط سلط سورہ پڑھ دی تھی، روایات سے صاف طور سے ظاہر نہیں ہوتی، ایک روایت میں حضرت علیؓ کا نام ہے اور دوسری میں عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا نام اور تیسری میں کوئی مہاجر مذکور ہے، حضرت الاستاذ نے سیرت جلد دوم ص ۱۵۰ (تاریخ احکام ذکر حرمت شراب) میں ابوداؤد کتاب الاشربہ باب فی تحریم الخمر ج ۲ ص ۸۳ کے حوالہ سے حضرت علیؓ کا نام لکھ دیا تھا مگر مزید تحقیق سے یہ نسبت مشکوک معلوم ہوتی ہے، اس خاص روایت کا مرکزی راوی عطا بن السائب عن ابی عبدالرحمٰن سلمی ہے، ابو عبدالرحمٰن سلمی حضرت علیؓ سے روایت کرتا ہے، اس سے یہ روایت مختلف طریقوں سے آتی ہے اور ہر ایک میں شراب پینے والوں اور حالتِ نشہ میں نماز پڑھانے والے کے نام کا اختلاف ہے، چنانچہ ہر روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں:

(باقی اگلے صفحہ پر)

حصہ چہارم

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ (نساء۴:۴۳)

نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو یہاں تک کہ تم جو کہو اس کو سمجھ بھی سکو۔

اس کے بعد جب نماز کا وقت آتا تو منادی اعلان کرتا کہ کوئی مخمور نماز میں شامل نہ ہونے

پچھلے صفحہ کا بقیہ

وہ روایتیں جن میں حضرت علی کا نام ہے:

۱-عن ابی جعفر الرازی عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علی بن ابی طالب قال صنع لنا عبدالرحمن بن عوف طعاما فدعانا وسقانا من الخمر فاخذت الخمر منا و حضرت الصلوٰة فقدمونی فقرأت قل يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ونحن نعبد ما تعبدون فانزل الله يٰايها الذين اٰمنوا لا تقربوا الصلوٰة وانتم سكارىٰ.
(ترمذی تفسير سورة النساء ص۴۹۲)

۱-ابوجعفر رازی نے عطا بن سائب سے، عطا نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ عبدالرحمٰن بن عوف نے ہمارے لئے کھانا تیار کرایا اور ہم کو مدعو کیا اور شراب پلائی جب ہم شراب کے نشہ میں چور ہو گئے اور نماز کا وقت آیا تو لوگوں نے مجھ کو امام بنایا اور میں نے قل يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ونحن نعبد ما تعبدون پڑھی اس پر خدا نے یہ آیت اتاری يٰۤاَيُّهَا الذين اٰمنوا لا تقربوا الصلوٰة وانتم سكارىٰ یعنی مسلمانو! نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔

۲-عن سفيان حدثنا عطا بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علی عليه السلام ان رجلا من الانصار دعاه وعبدالرحمن بن عوف فسقاهما قبل ان تحرم الخمر فامهم علی فی المغرب فقرء قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ فخلط فيها فنزلت لاتقربوا الصلوٰة وانتم سكارىٰ حتى تعلموا ما تقولون. (ابوداؤد كتاب الاشربة باب فی تحريم الخمر ج۲ ص۸۳)

۲-سفیان نے عطا بن سائب سے، عطا نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے، ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علی علیہ السلام سے یہ روایت کی ہے کہ انصار کے ایک شخص نے ان کو اور عبدالرحمٰن بن عوف کو مدعو کیا اور تحریم شراب سے پہلے ان دونوں کو شراب پلائی، پھر علی نے نماز مغرب کی امامت کی اور قل يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھی لیکن اس میں گڈمڈ کر دیا، اس پر یہ آیت اتری لاتقربوا الصلوٰة وانتم سكارىٰ حتى تعلموا ما تقولون (نشے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ جو کچھ کہتے ہو اس کو جان لو۔

وہ روایتیں جن میں عبدالرحمٰن بن عوف کا نام ہے:

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لیکن چونکہ اب بھی ممانعت کا کوئی عام حکم نہ تھا اس لئے نماز کے علاوہ اور اوقات میں لوگ پیتے پلاتے رہتے تھے، حضرت عمرؓ نے پھر دعا کی، اتفاق سے اسی زمانہ میں بعض انصار نے حضرت سعد ابن وقاصؓ کی دعوت کی، اس میں شراب کا دور بھی چلا، یہ پی کر بدمستی میں کہنے لگے کہ مہاجر انصار سے بہتر ہیں، اس پر بات بڑھی اور مار پیٹ تک نوبت پہنچی اس پر یہ حکم آیا (صحیح مسلم فضائل سعد بن وقاصؓ ج ۲ ص ۳۲۸)

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

۳-عن سفیان عن عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمن السلمی عن علی رضی الله عنه قال دعانا رجل من الانصار قبل ان تحرم الخمر فتقدم عبدالرحمن بن عوف و صلی بهم المغرب فقرء قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ فالتبس علیه فنزلت لاتقربوا الصلٰوة وانتم سکاریٰ (مستدرک حاکم، کتاب الاشربة ج ٤ ص ١٤٢)

۳-سفیان نے عطا بن سائب سے عطا نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے، ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ تحریم شراب سے پہلے انصار کے ایک شخص نے ہم کو مدعو کیا تو عبدالرحمٰن بن عوف نے امامت کی اور ان کو مغرب کی نماز پڑھائی اور قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھی لیکن اس میں خلط ہو گیا اس پر یہ آیت اتری لاتقربوا الصلٰوةَ وانتم سکاریٰ. الآیہ (نشے کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔)

٤-سفیان عن عطا بن السائب عن ابن(؟) عبد الرحمن عن علی رضی الله عنه انه کان هو و عبدالرحمن و رجل اخر یشربون الخمر فصلی بهم عبدالرحمن بن عوف فقرء قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ فخلط فیها فنزلت لاتقربوا الصلٰوة. (مستدرک حاکم کتاب الاشربة ج٤ ص١٤٢)

۴-سفیان نے عطا ابن السائب سے، عطا نے ابن عبدالرحمٰن سے، ابن عبدالرحمٰن نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ وہ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور ایک دوسرے آدمی شراب پی رہے تھے اور ان کو عبدالرحمٰن بن عوف نے نماز پڑھائی اور قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھی جس میں خلط ملط کر دیا اس پر یہ آیت اتری لاتقربو الصلٰوة.

٥-خالد بن عبدالله عن عطا ابن السائب عن ابی عبد الرحمن ان عبدالرحمن صنع طعاما فدعا ناسا من اصحاب النبی ﷺ فیهم علی بن ابی طالب رضی الله عنه فقرء قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ونحن عابدون ما عبدتم، فانزل الله عز وجل لاتقربوا الصلٰوة الأية. (مستدرک حاکم کتاب الاشربة ج٤ ص١٤٢)

۵-خالد بن عبداللہ، عطا بن سائب سے، عطا ابی عبدالرحمٰن سے روایت کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن نے کھانا تیار کرایا اور صحابہ میں سے چند لوگوں کو جن میں علی بن ابی طالب بھی تھے بلایا پھر انہوں نے قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ و نحن عابدون ما عبدتم پڑھی اس پر یہ آیت اتری لاتقربوا الصلٰوة الأية.

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَالۡمَيۡسِرُ وَالۡاَنۡصَابُ وَالۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡهُ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ.

اے ایمان والو! بے شک شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک اور شیطان کے کام ہیں، تو ان سے بچوتا کہ فلاح پاؤ۔

(مائدہ ۵:۹۰)

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

وہ روایت جس میں نام کی تعیین نہیں:

سفيان عن عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمن عن علی رضی الله عنه قال دعانا رجل من الانصار قبل تحريم الخمر فحضرت صلٰوة المغرب فتقدم رجل فقرء قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ فالتبس عليه فنزلت لا تقربوا الصلٰوة الأية. (مستدرک حاکم تفسير نساء ج ۲ ص ۳۰۷)

سفیان عطا بن سائب سے، عطا ابوعبدالرحمٰن سے، وہ حضرت علی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا تحریم شراب سے پہلے ہم کو انصار کے ایک شخص نے مدعو کیا، نمازِ مغرب کا وقت آیا تو ایک آدمی نے امامت کی اور قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھی لیکن اس میں خلط ملط کر دیا، اس پر یہ آیت اتری لاتقربوا الصلوۃ۔الآیہ

ان چھ روایتوں میں مختلف قسم کے اختلافات ہیں۔

۱- پہلی اور پانچویں روایت میں ہے کہ داعی عبدالرحمٰنؓ بن عوف تھے دوسری اور تیسری اور چھٹی میں ہے کہ داعی کوئی انصاری تھے، چوتھی میں دعوت کے بغیر مجلسِ شراب کا ذکر ہے۔

۲- پہلی اور دوسری میں ہے کہ امام حضرت علیؓ تھے جنہوں نے نشہ میں کچھ کا کچھ پڑھ دیا، تیسری، چوتھی اور پانچویں میں ہے کہ وہ امام عبدالرحمٰنؓ بن عوف تھے اور چھٹی میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ کوئی آدمی امام تھا۔

۳- اور روایتوں میں ہے کہ اس دعوت کی مجلس میں شراب تھی، چھٹی میں شراب کا مطلق ذکر نہیں ہے بلکہ وہ شخص جو امام بنا تھا، وہی شاید کہیں سے پی کر آیا ہو، گو کہ حرمتِ شراب سے پہلے پینا کوئی شرعی جرم نہیں تاہم حضرت علیؓ کا پینا جو بچپن سے آنحضرت ﷺ کی صحبت و تربیت میں پل کر جوان ہوئے قیاس کے خلاف ہے۔ خصوصاً اس آیت کے بعد قُلْ فِيۡهِمَاۤ اِثۡمٌ كَبِيۡرٌ (کہہ دے کہ شراب اور جوے میں بڑا گناہ ہے) حضرت علیؓ کا پینا اور بھی زیادہ واقعہ کی صحت میں شک پیدا کرتا ہے، پھر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس روایت میں مختلف قسم کے ایسے اختلافات ہیں جو ناقابل تطبیق ہیں، ان اختلافات کا راز اس وقت کھل جاتا ہے جب ان کے راویوں پر نظر ڈالی جاتی ہے، سب سے پہلا راوی ابوعبدالرحمٰن سلمی جس کا نام عبداللہ بن حبیب ہے وہ پہلے حضرت علیؓ کا طرف دار و حامی (شیعہ) تھا بعد کو عثمانی (بنی امیہ کا طرف دار) اور حضرت علیؓ کا مخالف ہو گیا، پھر اس کا یہ دعوی کہ اس نے حضرت علیؓ سے سنا ہے محدثین میں مسلم نہیں، بخاری نے اس کو مانا ہے لیکن ابن ابی حاتم نے اس سے انکار کیا ہے۔ (تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۱۸۴)

روایت کے دوسرے راوی عطا بن سائب کا حافظہ خراب ہو گیا تھا، اس لئے لوگوں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد شراب قطعاً حرام ہوگئی، حرمت شراب کی یہ آخری آیت جس وقت اتری ہے حضرت ابو عبیدہؓ امین اور ابی بن کعبؓ جو سید القراء تھے ابو طلحہؓ کے گھر میں مہمان تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا، ساقی گری کی خدمت حضرت انسؓ سے متعلق تھی، چنانچہ صحیح بخاری کتاب الاشربہ باب نزول تحریم الخمر ج ۲ ص ۸۳۶ میں خود حضرت انسؓ کی زبانی روایت ہے:

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۴) نے اس کو چھوڑ دیا تھا، گو سفیان کی اس سے روایتیں حافظہ کی خرابی سے پہلے کی بھی جاتی تھیں مگر اوپر کی روایتوں میں دیکھو کہ خود سفیان کی روایتوں میں بھی وہی نا قابلِ تطبیق اختلاف موجود ہے، ان وجوہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف فیہ جزئیات غیر مسلم ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۰۵) اور واقعہ کی اصلی صورت وہی ہے جو چھٹی روایت میں ہے کہ وہ مجلس محض دعوت کی تھی جس میں حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ موجود تھے کہ نماز کا وقت آگیا اور ایک صاحب جو مخمور تھے نماز پڑھانے کھڑے ہو گئے اور آیتیں غلط سلط پڑھ دیں، چوں کہ اس واقعہ کے راوی حضرت علیؓ تھے اور وہ دعوت میں بھی شریک تھے اس لئے یا تو ابو عبد الرحمٰن سلمی عثمانی نے فرقہ واری کے جذبہ میں یا عطا نے ذرا سی بھول میں واقعہ کی نسبت ادھر سے ادھر کر دی۔

اس آخری چھٹی روایت کی تائید حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے ہوتی ہے جس کی سند اس پورے سلسلہ سے الگ اور مستقل ہے:

۷۔ عن ابی هريرة قال حرمت الخمر ثلاث مرات قدم رسول الله ﷺ المدينة وهم يشربون الخمر ويأكلون الميسر فسئلوا رسول الله ﷺ عنهما فانزل الله على نبيه ﷺ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا الى اخر الآية فقال الناس ما حرم علينا انما قال فيهما اثم كبير وكانوا يشربون الخمر حتى اذا كان يوم من الايام صلى رجل من المهاجرين ام اصحابه فى المغرب خلط فى قرأته فانزل الله فيها اية اغلظ منها يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ. وكان الناس يشربون حتى ياتى احدهم الصلوة وهو مفيق ثم انزلت اية اغلظ من ذلك يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. فقالوا

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ شراب تین بار میں حرام کی گئی، رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو لوگ شراب پیتے تھے اور جوئے کا مال کھاتے تھے، لوگوں نے آپ سے ان دونوں کے متعلق سوال کیا تو خدا نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا الآیہ، لیکن لوگوں نے کہا خدا نے ہم پر حرام نہیں کی صرف یہ کہا کہ ''ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے'' اب بھی لوگ شراب پیتے رہے یہاں تک کہ ایک دن ایک مہاجر نے نماز مغرب پڑھائی اور اپنی قرأت میں خلط کر دیا اس لئے خدا نے شراب کے متعلق اس سے زیادہ سخت آیت اتاری یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ اب بھی لوگ شراب پیتے رہے البتہ جب کوئی نماز پڑھنے جاتا تھا تو ہوش کی حالت میں جاتا تھا پھر اس سے زیادہ سخت آیت نازل ہوئی یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

كنت اسقى ابا عبيدة وابا طلحة و ابى بن كعب فجاء هم آت فقال ان الخمر حرمت.

میں ابوعبیدہ اور ابی بن کعب اور ابوطلحہ کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آ کر کہا کہ شراب حرام ہوگئی۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس جلسہ میں گیارہ بزرگ شریک تھے جن میں حضرت معاذ بن جبلؓ بھی تھے، اس موقع پر لحاظ کے قابل یہ بات ہے کہ اگرچہ یہ مدتوں کی عادت تھی اور اس وقت بھی سب خمار میں جھوم رہے تھے (۱)، تاہم جوں ہی یہ آواز آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی ممانعت کردی کسی نے پوچھا گچھا تک نہیں اور دفعتاً جام وسبو توڑ ڈالے، یہ صرف ابوطلحہ کے گھر کا حال نہ تھا بلکہ تمام مدینہ کے گلی کوچوں میں شراب کی ندیاں بہہ گئیں، بخاری ابواب المظالم باب صب الخمر فی الطریق ج ۱ ص ۳۳۳ میں ہے۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ)

انتهينا ربنا. (مسند احمد ج ۲ ص ۳۵۱)

اب لوگوں نے کہا خداوندا ہم باز آئے۔

اس میں حضرت علیؓ کا کہیں ذکر بھی نہیں، حضرت علیؓ جیسے قرآن کے صاحبِ فہم کی نسبت یہ خیال کرنا کہ پہلی آیت کے اشارہ سے وہ شراب کی حرمت کو نہ سمجھ سکے تھے، قبول کے قابل نہیں، محدثین میں حاکم نے مستدرک میں چھٹی روایت کو لکھ کر بیان کیا ہے کہ اس واقعہ میں حضرت علیؓ کا نام شامل کرنا خوارج کی کارستانی ہے جس کی تردید اس روایت سے ہو جاتی ہے، جس کو خود حضرت علیؓ روایت فرماتے ہیں، حاکم کہتے ہیں:

وفى هذا الحديث فائدة كثيرة وهى ان الخوارج تنسب هذا السكر وهذه القراة الى امير المومنين على بن ابى طالب دون غيره وقد براه الله منها فانه راوى هذا الحديث

(مستدرک تفسیر نساء ج ۲ ص ۳۰۷)

اور اس حدیث میں بہت بڑا نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ خوارج نے اس نشہ اور اس غلط قرأت کو امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ ہی کی طرف منسوب کیا تھا تو خدا نے ان کو اس الزام سے بری کردیا کہ وہی اس حدیث کے راوی ہیں۔

درحقیقت وہ واقعہ کے صرف راوی تھے لیکن عثمانی اور خارجی راوی نے خود حضرت علیؓ کو صاحب واقعہ بنادیا۔

---

(۱) فتح الباری جلد ۱۰ مطبوعہ مصر طبع اول ص ۳۱ بحوالہ روایت ابی عاصم۔

فجرت فی سکک المدینۃ. مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی پھرتی تھی۔

ان ندیوں کی روانی سے اندازہ ہوگا کہ عرب میں شراب نوشی کی کثرت کا کیا عالم تھا۔

قمار بازی: شراب خوری کے ساتھ ساتھ ان میں قمار بازی کا بھی عام رواج ہوگیا تھا، عرب کے مال ودولت کا تمام تر سرمایہ اونٹوں کے چند گلوں تک محدود تھا، اس لئے جوا بھی ان ہی کے ذریعہ سے کھیلا جاتا تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنے حریف سے کہتا ہے:

اعیرتنا البانھا ولحومھا وذلک عار یا ابن ریطۃ ظاھر

کیا تو ہم پر عیب لگاتا ہے کہ ہم اونٹ کا دودھ اور گوشت کھاتے ہیں، اے ابن ریطہ ہم پر یہ عیب نہیں لگ سکتا۔

نحابی بھا اکفاءنا ونھینھا ونشرب فی اثمانھا ونقامر

ہم ان کو اپنے ہمسروں کو بطور عطیہ کے دیتے ہیں اور ان کو مہمانی میں صرف کرتے ہیں اور ان کی قیمت سے شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں۔

اس غرض سے اونٹوں کو ذبح کر کے ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کردیتے تھے اور ان ہی ٹکڑوں پر پانسے ڈالتے تھے، ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر کر لئے تھے جن کے نام یہ ہیں: فذ، توام، رقیب، حلس، مسبل، معلیٰ، منافس، منیح، سفیح، وغد، ان میں ہر تیر کے مختلف حصے معین کر لئے تھے اور جب جوا کھیلتے تھے تو ان کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دیتے تھے، وہ ان کو گڈمڈ کر کے ایک ایک تیر کو ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا جاتا تھا، جن کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے، جن جن کے حصے مقرر تھے وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تین تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا، وہ جن کے نام پر نکلتے ان کو ناکامیابی ہوتی تھی، اس طرح گوشت کے جو ٹکڑے جمع ہوجاتے تھے ان کو فقیروں اور محتاجوں اور دوستوں میں تقسیم کردیتے تھے، چوں کہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا اس لئے قمار بازی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار تھا اور اس قسم کے لوگوں کو نہایت بخیل خیال کرتے تھے اور ان کو ''برم'' کا خطاب دے رکھا تھا(۱)۔ جو لوگ یہ خطاب حاصل کر لیتے تھے ان سے شادی بیاہ کرنا ننگ وعار خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنی بی بی کو وصیت کرتا ہے:

واذا ھلکت فلا تریدی عاجزا عنسا ولا برما ولا معزالا

اور اگر میں ہلاک ہوجاؤں تو عاجز، کمزور اور جوئے میں نہ شریک ہونے والے اور سفر میں قوم سے علاحدہ رہنے والے سے نکاح نہ کرنا۔

جوئے کی ایک صورت جس کو ''رہان'' کہتے تھے یہ تھی کہ کسی شرط پر بازی لگاتے تھے اور

(۱) یہ پوری تفصیل تفسیر کبیر جلد ۲ ص ۳۳۱ دار الطباعۃ العامرہ میں ہے۔

جب وہ شرط پوری نہیں ہوتی تھی تو جس چیز پر بازی لگائی جاتی تھی اس کو لے لیتے تھے، چنانچہ جب رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی اور باوجود رومیوں کی شکست کے قرآن مجید نے پیشین گوئی کی کہ ان کو چند سال میں ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا تو کفار نے حضرت ابوبکر سے اسی قسم کی شرط لگائی اور اس فتح کے لئے چھ برس کی مدت مقرر کی، چنانچہ جب یہ مدت گذر چکی اور رومیوں کو فتح وظفر نصیب نہیں ہوئی تو حضرت ابوبکر کو بازی ہار جانا پڑی (۱) رفتہ رفتہ اس قمار بازی کا مذاق ان میں اس قدر عام ہوگیا تھا کہ لوگ مال و دولت کھو چکنے کے بعد بی بی اور بال بچوں پر بازی لگا دیتے تھے (۲) یہ قمار بازی اور وہ بھی شراب کی بدمستی کے عالم میں اکثر مار پیٹ اور لڑائی پر ختم ہوتی تھی، عبس وذبیان کی چہل سالہ جنگ گھوڑ دوڑ ہی کی قمار بازی کا نتیجہ تھی، حصولِ دولت اور کسب شہرت کے اس غلط طریقہ سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے تھے۔

سودخواری: عرب میں سودخواری کا عام رواج تھا، تمام دولت مند سود پر لین دین کرتے تھے، حضرت عباس ﷺ بن عبدالمطلب نے جو قریش کے سردار اور آنحضرت ﷺ کے چچا تھے، تجارت کا کاروبار نہایت وسیع پیمانے پر پھیلا رکھا تھا اور اس تعلق سے سودخواری میں نہایت شہرت رکھتے تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے جب حجۃ الوداع میں سود کی حرمت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے ان ہی کے سود کو باطل قرار دیا، حضرت عثمانؓ اور خالدؓ بن ولید سود پر قرض دیتے تھے، مسعود ثقفی طائف کا مشہور رئیس تھا اور اس کے بھائی عبد یالیل، حبیب بن ربیعہ نہایت دولت مند تھے، بنو مغیرہ ان ہی لوگوں میں سود پر دادوستد کرتے تھے، چنانچہ جب طائف فتح ہوا اور یہ چاروں بھائی اسلام لائے تو انہوں نے مغیرہ سے سود کا تقاضا کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی (۳):

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ.	مسلمانو! خدا سے ڈرو اور بقیہ سود کو اگر تم مسلمان ہو تو چھوڑ دو۔

(بقرہ ۲: ۲۷۸)

(۱) ترمذی ابواب التفسیر سورۃ الروم ص ۵۲۸ جوئے کہ اس صورت کو رہان کہتے تھے اور اب تک وہ حرام نہیں ہوئی تھی۔ (۲) تفسیر کبیر ج ۲ ص ۳۳۱۔ (۳) تفسیر کبیر ج ۲ ص ۵۴۰۔

ان کے علاوہ طائف ایک سرسبز اور دولت مند شہر تھا اس لئے وہاں کے لوگ عموماً سود پر بیوپار کرتے تھے، چنانچہ آنحضرت نے ان سے جن شرائط پر مصالحت کی ان میں ایک ضروری شرط یہ بھی تھی کہ وہ لوگ سود خواری نہ کریں گے (۱)، اسی طرح یمن کے نجرانی سوداگر بھی سودی کاروبار کرتے تھے ،ان سے بھی یہی شرط کی گئی۔ (۲)

سود کا عام اور متداول طریقہ تو یہ تھا کہ ایک معین شرح پر قرض دیتے تھے اور راس المال کے ادا کرنے کے لئے میعاد مقرر کردیتے تھے، جب میعاد گذر جاتی تھی تو اس کا تقاضا کرتے تھے، اگر مدیون اس کو ادا نہیں کرسکتا تھا تو میعاد میں اور اضافہ کردیتے تھے اور اس کے عوض میں شرحِ سود بڑھا لیتے تھے لیکن اس نے ترقی کر کے ایک نہایت ظالمانہ صورت اختیار کرلی تھی، جو سود در سود سے بھی زیادہ خطرناک تھی، یعنی ایک میعادِ متعینہ کے لئے کسی کو مثلاً سو روپے دیتے تھے، جب مدت گذر چکتی اور تقاضا کرنے پر مدیون اس رقم کو ادا نہیں کرسکتا تھا تو میعاد اور بڑھا دیتے تھے لیکن اس کے معاوضہ میں راس المال میں بھی اضافہ کروالیتے تھے، یہاں تک کہ کبھی کبھی یہ اضافہ دوگنی چوگنی مقدار تک پہنچ جاتا تھا اس طرح اضافہ ہوتے ہوتے مدیون کی کل جائداد مستغرق ہوجاتی تھی، یہ معاملہ زیادہ تر غریبوں اور کاشت کاروں کے ساتھ پیش آتا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں اور کاشت کاروں کا تمام طبقہ چند دولت مندوں اور خصوصاً یہودیوں کے ہاتھ میں گرو تھا، قرآن مجید کی یہ آیت اسی طریقہ سود کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (آل عمران ۳:۱۳۰)	مسلمانو! دونا، چارگنا سود نہ کھاؤ اور خدا سے ڈرو، یقین ہے کہ تم کامیاب ہوجاؤ۔

سود کے علاوہ قرض کے متعلق اور بھی مختلف قسم کی ناجائز سختیاں پیدا ہوگئی تھیں، مثلاً اگر راہن میعاد متعینہ پر مالِ مرہونہ کو چھڑا نہ سکتا تھا تو مرتہن اس کا مالک ہوجاتا تھا (۳)، مال و دولت سے گذر کر عورتوں اور بال بچوں تک کو رہن رکھواتے۔ (۴)

(۱) فتوح البلدان بلاذری فتح طائف ص ۶۳ (۲) ابوداؤد کتاب الامارۃ باب فی اخذ الجزیہ ج ۲ ص ۳۰
(۳) موطا امام مالک ص ۳۰۴ مطبع احمدی ۱۲۶۶ھ (۴) بخاری باب قتل کعب بن اشرف ج ۲ ص ۵۷۶۔

لوٹ مار: عرب میں روز کی لوٹ مار نے اگر چہ ہر قبیلہ کو غارت گر اور راہ زن بنا دیا تھا، تاہم بعض قبائل میں اس قسم کے خاص خاص جتھے قائم ہو گئے تھے، جنہوں نے راہ زنی کو اپنا ذریعۂ معاش اور عام مشغلہ بنا لیا تھا، اس قسم کے لوگوں کو لصوص کہتے تھے اور قبیلۂ طے کو عرب میں عام طور پر جو شہرت حاصل تھی وہ اسی گروہ کی بدولت تھی۔

یہ گروہ شہر سے باہر میدانوں میں، جنگلوں میں، پہاڑ کے کھوؤں میں رہتا تھا اور ادھر سے جو مسافر یا قافلے گذرتے تھے ان کو لوٹ لیتا تھا، اس کا استیصال صرف ایک پر زور نظامِ حکومت ہی سے ہو سکتا تھا جو عرب میں مفقود تھا، چنانچہ قبیلۂ طے کے عیسائی سردار عدی بن حاتم مسلمان ہو کر جب آپ ﷺ سے ملنے آئے اور آپ ﷺ نے ان سے یہ پیشین گوئی کی کہ وہ دن آئے گا جب حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت بے خوف و خطر حضر موت کا سفر کرے گی، تو چوں کہ وہ قبیلہ طے کے ایک رئیس تھے اور ان کو اس قبیلہ کے ڈاکوؤں کا حال معلوم تھا اس لئے ان کو تعجب ہوا کہ ہیں! طے کے لصوص کیا ہو جائیں گے؟(۱)

ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت، مویشی بلکہ اہل و عیال تک پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے تیار رہتا تھا، تاجروں اور سوداگروں کے قافلے بغیر کسی بھاری انعام کے کسی میدان سے بہ سلامت گذر نہیں سکتے تھے، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا اور مویشیوں کو ہانک لے جاتا تھا، صبح کا وقت جب کہ رات بھر چلنے کے بعد مسافر آرام کرتے تھے اس کام کے لئے مخصوص ہو گیا تھا، چنانچہ صبح کا لفظ عربی میں لوٹنے کے معنی میں جاہلیت میں عام طور سے بولا جاتا تھا، کامیاب ڈاکو اپنے کارناموں کو نظم کرتے تھے اور فخریہ پڑھتے تھے، ایک قبیلہ کا شاعر حارث نامی ڈاکو کے سلامت نکل جانے پر کہتا ہے:

یا لهف زیابة للحارث　　　　الصابح فالغانم فالآئب

اے زیابہ کا افسوس حارث کے لئے جو صبح کو ڈاکہ ڈالنے والا، پھر لوٹنے والا، پھر بہ سلامت واپس جانے والا ہے۔

حج کے تین مہینوں میں البتہ وہ اس پیشہ سے باز رہتے تھے لیکن اس سے زیادہ مدت پر وہ صبر نہیں کرتے تھے اور چوں کہ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت اور مویشی پر موقع پا کر اسی طرح تصرف کرتا تھا، اس لئے وہ اس کو عیب نہیں بلکہ بہادری کا کام سمجھتے تھے اور اس طرح ملک میں مسلسل

(۱) صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام جلد اول ص ۵۰۷-۵۰۸

قتل وغارت اور لوٹ مار کا طریقہ جاری تھا۔

چوری: ڈاکہ کے علاوہ اقتصادی حالات کی مجبوری سے بدوؤں میں چوری کا رواج بھی تھا، مختلف قبیلوں کے ایسے بہادر جو قبیلہ میں کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ اس پیشہ کو اختیار کرتے تھے، وہ تنہا بڑے بڑے خطرناک موقعوں پر جا کر اس کام کو انجام دیتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، ان میں سے سلیک بن السلکہ اور تابط شرا شہرتِ عام رکھتے تھے، تابط شرا کا ایک قطعہ حماسہ ص ۱۷ میں ہے۔ جس میں اپنی چوری اور حیلہ گری کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے۔

قریش میں تجارت کے سبب سے دولت بھی تھی اور خود خانۂ کعبہ میں تحفوں اور نذرانوں کا خزانہ جمع رہتا تھا، اس لئے ان میں چوری کے مواقع بھی زیادہ تھے، چنانچہ کلبی نے متعدد ممتاز قریشیوں کے نام بتائے ہیں جنہوں نے اس خزانہ سے سونے کا ہرن چرا لیا تھا (۱)، بلکہ اس کے لئے خاص طور سے ابولہب کا نام لیا جاتا ہے۔ (۲)

عام بدو عربوں میں یہ برائی جتنی عام ہوگئی تھی اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ آنحضرت ﷺ ان مردوں اور عورتوں سے جو اسلام قبول کرنے آتے تھے، دوسری باتوں کے ساتھ یہ معاہدہ بھی لیتے تھے کہ وہ آئندہ چوری نہ کریں گے (۳)، بلکہ خود قرآن پاک نے آپ ﷺ کو اس کا معاہدہ لینے کا حکم دیا تھا۔ (۴)

چوری کرنے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کر لیے تھے، ایک شخص نے اپنی چھڑی کے کنارے ایک ٹیڑھا لوہا (محجن) لگا رکھا تھا، حج کے زمانہ میں آتا اور جب حاجیوں کو غافل پاتا تو اس لوہے کے سہارے سے ان کے اسباب کو کھینچ لیتا۔ (۵)

جس طرح عرب میں طے کے ڈاکو لوٹ مار میں مشہور تھے، اسی طرح بعض قبائل چوری میں شہرتِ عام رکھتے تھے، چنانچہ اسلم، غفار، مزینہ اور جہینہ کے قبیلے تمام عرب میں اس بنا پر بدنام تھے کہ وہ خاص طور پر حاجیوں کے مال واسباب کی چوری کیا کرتے تھے۔ (۶)

---

(۱) فتح الباری ج ۱۲ ص ۷۷ (۲) کتاب المعارف لابن قتیبہ المطبعۃ الاسلامیہ مصر، ازہر ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء ص ۵۵ (۳) صحیح بخاری کتاب الحدود ج ۲ ص ۱۰۰۳-۱۰۰۴ (۴) سورہ ممتحنہ ۶۰:۱۲ (۵) مسلم باب صلوٰۃ الکسوف باب ما عرض علی النبی ﷺ فی صلاۃ الکسوف ج ۱ ص ۳۳۵ (۶) مسلم باب من فضائل غفار واسلم الخ ج ۲ ص ۳۶۷ و بخاری کتاب المناقب باب ذکر اسلم و غفار و مزینۃ و جھینۃ و اشجع ج ۱ ص ۴۹۸

چوں کہ یہ چوری عربوں کی اقتصادی کمزوری کا نتیجہ تھی، اس لئے اس کے لئے غیر و بے گانہ کی تخصیص نہ تھی بلکہ اس کا اثر اعزہ و اقارب، ہم سایہ دوست و آشنا، خاندان، غرض سب پر پڑتا تھا، چنانچہ مدینہ میں بشر، بشیر، مبشر تین آدمی تھے، جن کو بنو ابیرق کہا جاتا تھا، ان میں بشر منافق تھا اور آنحضرت ﷺ کی ہجو میں شعر کہہ کر دوسروں کی طرف منسوب کر دیتا تھا، یہ لوگ نہایت تنگ دست اور فاقہ مست تھے، انہوں نے رفاعہ نامی ایک شخص کے بالا خانہ سے جس میں ہتھیار تلوار اور زرہ وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھی، نقب لگا کر چوری کی، آپ ﷺ نے رفاعہ کے ہتھیار واپس دلائے لیکن رفاعہ نے ان کو خدا کی راہ میں وقف کر دیا اور بشیر بھاگ کر مشرکین سے جاملا۔(۱)

مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس مرض میں گرفتار تھیں، اسی لئے قرآن پاک نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ عہد لینے کی بھی تاکید کی کہ وَلَا يَسْرِقْنَ (ممتحنہ ۶۰:۱۲) یعنی وہ چوری نہ کریں گی، شرفا اگر اس الزام میں پکڑ جاتے تو وہ چھوڑ دیے جاتے تھے اس لئے یہ برائی رکنے نہیں پاتی تھی، چنانچہ اسلام کے بعد بھی جب قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو اس پر قریش کو سخت تردد ہوا اور لوگوں نے کہا، اس کے متعلق آنحضرت ﷺ کی خدمت میں کون سفارش کرے گا؟ لوگوں نے اسامہ بن زیدؓ کو منتخب کیا جن کو آپ ﷺ بہت پیار کرتے تھے، انہوں نے سفارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا ''تم حدود اللہ کے متعلق سفارش کرتے ہو؟'' پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور اس میں فرمایا: کہ گذشتہ قومیں صرف اسی لئے ہلاک ہوگئیں کہ جب شریف آدمی چوری کرتا تھا کہ اس کو چھوڑ دیتے تھے اور ضعیف چوری کرتا تھا تو اس کو سزا دیتے تھے، خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا'' (۲)

خود شہر کے اندر اس قسم کی وارداتوں کی یہ حالت تھی کہ صفوان بن امیہ ایک روز ایک بیش قیمت چادر اوڑھ کر سو رہے تھے، ایک شخص نے موقع پا کر اس کو اڑا لیا، وہ گرفتار کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تو آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، صفوان کو اس پر رحم آیا اور آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ایک چادر کے لئے ایک عرب کا ہاتھ کاٹا جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا میرے پاس لانے سے پہلے ہی اس کا خیال رکھنا تھا، حاکم تک معاملہ پہنچنے کے بعد کسی کو سفارش کا حق

(۱) ترمذی ص ۴۹۴ کتاب التفسیر سورہ نساء (۲) بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۳ کتاب الحدود

حاصل نہیں۔(۱)

سفاکی و بے رحمی و وحشت: رات دن کی لوٹ مار اور کشت و خون سے ان میں درندوں کے تمام اوصاف پیدا ہو گئے تھے، زندہ اونٹ اور دنبہ کے کوہان اور چکتیاں کاٹ کر کباب لگاتے اور یہ ان کی بڑی مرغوب غذا تھی۔

زندہ جانوروں کو درخت وغیرہ سے باندھ دیتے تھے اور ان پر تیر اندازی کی مشق کرتے، لڑائیوں میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالتے، مقتولوں کے ناک کان کاٹ لیتے اور عورتیں ان کے ہار بنا کر پہنتیں، منت مانتے کہ دشمن کو قتل کریں گے تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔

سزا دینے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ مجرم کو دو درختوں کی ٹہنیاں جھکا کر اس کے اعضا ان میں باندھ دیتے اور پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے، مجرم کا بدن چر کر ٹہنیوں کے ساتھ رہ جاتا۔

کبھی کبھی عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو سرپٹ ڈال دیتے، ان کے بدن کے ٹکڑے اڑ جاتے، اس قسم کی سزائیں اکثر عرب کے سلاطین اور رؤسا دیا کرتے تھے۔

کبھی آدمی کو کسی کوٹھری میں قید کر کے اس کا کھانا پانی بند کر دیتے تھے، یہاں تک کہ وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا، اس طریقۂ سزا کا نام ان کے ہاں صبر تھا، مردوں کی قبر پر اونٹ باندھ دیتے تھے اور اس کو کھانے کو نہیں دیتے تھے وہ چند روز میں مر جاتا تھا، سمجھتے تھے کہ یہ مردے کی سواری بنے گا، اس اونٹ کو بلیہ کہتے تھے۔

زنا اور فواحش: زنا اور فسق و فجور عام تھا اور یہ واقعات فخریہ اشعار میں بیان کئے جاتے تھے، امرؤالقیس عرب کا سب سے بڑا شاعر تھا، اس کے ساتھ شاہ زادہ اور والی ملک بھی تھا، اس نے اپنی پھوپی زاد بہن عنیزہ اور عورتوں کے ساتھ جو افعالِ شنیعہ اور بے حیائیاں کیں، قصیدہ لامیہ میں فخر کے ساتھ تفصیل سے لکھی ہیں، باوجود اس کے اس قصیدہ کے اشعار عرب میں بچہ بچہ کی زبان پر تھے۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اہل جاہلیت گو بالاعلان زنا کو جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن چھپے چوری کرنے کو جائز سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کھلم کھلا کرنا تو کمینہ پن ہے لیکن چھپ کر کرنے میں

(۱) سنن دارقطنی ج ۲ ص ۳۴۷، کتاب الحدود والدیات مطبع انصاری دہلی ۱۳۱۰ھ۔

مضائقہ نہیں (۱)، فاحشہ عورتیں گھروں کے سامنے جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں (۲) اور صاحب الرایات کہلاتی تھیں، ان کی اولاد اصلی اور حلالی اولاد کے برابر سمجھی جاتی تھی، اسلام سے پہلے ایک عورتیں خود مکہ معظمہ میں تھیں، ان میں سے ایک کا نام عناق تھا، مرثد غنویؓ نے آنحضرت ﷺ سے اجازت مانگی کہ میں عناق سے نکاح کرلوں؟ اس پر یہ آیت اتری (۳):

وَالزَّانِيَةُ لَا يَنكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ — اور زانیہ عورت سے زانی یا مشرک ہی نکاح کرتے ہیں۔

(نور ۲۴:۳)

بڑے بڑے رؤسا گھر کی لونڈیوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ بدکاری کے ذریعہ سے جا کر کچھ کما لائیں اور ان کی نذر کریں، عبداللہ بن ابی مدینہ کا رئیس تھا اور اس درجہ کا شخص تھا کہ ہجرت سے پہلے تمام انصار نے تاج بنوالیا تھا کہ اس کو بادشاہ بنا کر پہنائیں گے، چنانچہ صحیح بخاری میں یہ واقعہ منقول ہے، عبداللہ بن ابی کی دو لونڈیاں تھیں ایک کا نام مسیکہ اور دوسرے کا نام امیمہ تھا، وہ ان دونوں کو زنا کاری کرانے پر مجبور کرتا تھا، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری (۴):

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ. — اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔

(نور ۲۴:۳۳)

موجودہ طریقہ کے علاوہ نکاح کی اور چند قسمیں جاری تھیں جو حقیقت میں بدکاری ہی کی قسمیں تھیں، مثلاً ایک یہ کہ کوئی شجاع اور بہادر شخص ہوتا تو اپنی عورت کو اس کے پاس بھیج دیتے کہ اس سے ہم بستر ہو، بچہ پیدا ہوتا تھا تو سمجھتے تھے کہ اس میں بھی وہی اوصاف آجائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ چند آدمی جن کی تعداد ایک وقت میں دس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی کسی عورت کے پاس جاتے اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے، جب وہ حاملہ ہو جاتی اور بچہ جنتی تو سب کو بلوا بھیجتی اور کسی ایک سے کہتی کہ یہ بچہ تمہارا ہے اس کو قبول کرنا پڑتا اور پھر وہ اس کا بیٹا سمجھا جاتا۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ فاحشہ عورتیں جو سر بازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں ان کے لڑکا پیدا ہوتا

---

(۱) تفسیر طبری آیت مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ، ج ۵ ص ۱۳ مصر۔ (۲) صحیح بخاری کتاب النکاح باب من قال لا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ، ج ۲ ص ۷۶۹ (۳) ابوداؤد کتاب النکاح باب قوله الزَّانِي لَا يَنكِحُ إِلَّا زَانِيَةً ج ۱ ص ۲۰۳ (۴) صحیح مسلم کتاب التفسیر باب فی قولہ تعالیٰ وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ. ج ۲ ص ۵۴۹۔

تو قیافہ شناس کو بلوا بھیجتیں، وہ صورت شکل دیکھ کر بتا تا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے، عورت اس کو بلا کر کہتی کہ تمہارا بچہ ہے، صحیح بخاری کتاب النکاح (۱) میں یہ تینوں طریقے تفصیل سے مذکور ہیں۔

ایک اور قسم عارضی نکاح کی جاری تھی اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مدتِ متعینہ کے لئے نکاح کر لیتے، اس مدت کے گذرنے کے بعد اس کی اجرت دے کر اس کو الگ کر دیتے تھے، اس کو متعہ کہتے تھے، اسلام نے شروع میں اس کو ضرورتاً چندے باقی رکھا پھر ہمیشہ کے لئے اس کو حرام کر دیا۔

بے شرمی و بے حیائی: شرم وحیا کا وجود نہ تھا، حجِ کعبہ میں ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہوتے لیکن (قریش کے سوا) باقی سب مادرزاد ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے، عورتیں جب ننگی ہو کر طواف کرتیں تو لوگوں سے کہتی کہ کوئی ہم کو اتنا کپڑا دیتا کہ سترِ عورت ہو جاتا، پھر یہ شعر پڑھتیں:

الیوم یبدو بعضہ او کلہ فما بدا منہ فلا احلہ

آج بدن کا کچھ حصہ کھلے گا یا سارا اور جو کھلا ہے اس سے لطف اٹھانے کی میں اجازت نہیں دیتی۔

صحیح مسلم کتاب التفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے۔(۲)

نہاتے وقت اوٹ نہیں کرتے تھے، کھلے میدان میں بے ستر ہو کر نہاتے تھے۔(۳)

پاخانہ و پیشاب کے وقت پردہ نہیں کرتے تھے (۴)، جلسوں میں بیٹھتے تو بیویوں سے ہم صحبتی کے تمام واقعات بیان کرتے۔(۵)

سوتیلی ماؤں پر وراثتاً قبضہ کر کے ان کو بیوی بناتے۔

عورتوں پر ظلم: عورتوں کی حالت نہایت خراب تھی، مورث کے متروکہ میں سے ان کو کچھ نہیں ملتا تھا، عرب کا قول تھا کہ میراث اس کا حق ہے جو تلوار پکڑ سکتا ہو، اسی بنا پر چھوٹے بچے بھی وراثت سے محروم رہتے تھے۔

لڑائیوں میں مفتوحہ قبیلہ کی عورتیں عین میدانِ جنگ میں فاتحین کے تصرف میں آجاتیں، اگر صلح ہو جاتی اور عورتیں واپس دے دی جاتیں تو باوجود اس کے کہ سب کے ناموس برباد ہو چکے ہوتے، بہ دستور گھروں میں لے جائی جاتیں اور یہ کوئی عیب نہیں خیال کیا جاتا تھا، فاتحین اس تصرف

---

(۱) باب من قال لا نکاح الا بولی ج۲ ص۷۶۹ (۲) باب فی قولہ تعالیٰ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ج۲ ص۵۴۹ (۳) نسائی کتاب الغسل باب الاستتار عند الغسل ج۱ ص۴۶ دار الکتاب دیوبند (۴) ابوداؤد کتاب الطہارۃ باب الاستبراء من البول ج۱ ص۴ (۵) ابوداؤد کتاب النکاح باب مایکرہ من ذکر الرجل ما یکون من اصابۃ اہلہ ج۱ ص۲۱۵

پر فخر کرتے اور اس کو اشعار میں ظاہر کرتے، بنوضبہ نے جب بنوعامر پر فتح پائی تو ان کی عورتوں کو عین میدانِ جنگ میں رسوا کیا، فرزدق نے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

فظلت وظلت یرکبون ھبیرھا ولیس لھم الا عوالبھا ستر

تو لوگ عورتوں پر متصرف ہو گئے اور اگر کوئی پردہ بیچ میں تھا تو صرف نیزے تھے۔

قبیلۂ قیس اور بنودارم میں جو معرکہ ہوا جو رحرحان کے نام سے مشہور ہے اس کی نسبت جریر کہتا ہے:

نکحت نساء ھم بغیر مھور ان کی عورتوں سے بغیر مہر کے نکاح کیا۔

عمرو بن معدی کرب، عرب کے مشہور بہادر اور شاعر تھے، ان کی بہن ریحانہ کی عصمت اسی طرح جب برباد ہوئی تو عمرو نے کہا:

امن ریحانۃ الداعی السمیع یورقنی واصحابی ھجوع

کیا ریحانہ کی طرف سے کوئی پکارنے والا سننے والا ہے، جس نے گو مجھے بے خواب رکھا ہے لیکن میرے احباب سوتے ہیں۔

اذا لم تستطع امرا فدعہ وجاوزہ الی ما تستطیع (۱)

اور اگر تم کسی کام کو نہ کر سکو تو اس کو چھوڑ کر وہ کرو جو کر سکتے ہو۔

طلاق کے لئے کوئی مدت اور عدت نہ تھی یعنی جب تک شوہر چاہے، عورت نہ شوہر کے پاس رہ سکتی تھی نہ کسی اور سے شادی کر سکتی تھی۔

نکاح کی کوئی حد نہ تھی، غیلان بن سلمہ ثقفی جب اسلام لائے تو ان کی دس بیویاں تھیں، وہب اسدی نے اسلام قبول کیا تو آٹھ بیویاں ان کے عقدِ نکاح میں تھیں۔ (۲)

دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرتے تھے، باپ مر جاتا تو اس کی کل بیویاں (بجز حقیقی ماں کے) بیٹے کے تصرف میں آتیں اور اس کی جائز بیویاں سمجھی جاتیں۔

ایام کے زمانہ میں عورتوں کو الگ کر دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے۔

عورت جب بیوہ ہو جاتی تو گھر سے باہر ایک نہایت تنگ کوٹھری رہنے کو اور خراب سے خراب کپڑے پہننے کو دیے جاتے، خوشبو وغیرہ کی قسم کی کوئی چیز استعمال نہ کر سکتی، اس حالت کے

(۱) کتاب الاغانی جز تاسع ص ۲، اخبار درید بن الصمہ (۲) ابوداؤد کتاب النکاح باب فی من اسلم وعندہ نساء اکثر من اربع ج ۱ ص ۲۲۔

ساتھ جب پورا سال گذر جاتا تو ایک بکری یا گدہا لاتے، اس سے وہ اپنے جسم یا..........کومس کرتی، پھر کوٹھری سے باہر نکلتی اور اس کے ہاتھ میں مینگنی دی جاتی، وہ مینگنی کو پھینک دیتی، اس وقت سوگ سے نکل آتی اور قدیمی حالت قائم ہوتی (۱)، عورت کا جو مہر مقرر رہتا وہ باپ کو ملتا، عورت کو اس سے سروکار نہ ہوتا۔

غرض مجموعی حیثیت سے عورت بدترین مخلوق اور ہر قسم کی جبر وتعدی کا تختہ گاہِ مشق تھی، رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی اس کو سخت رنج ہوتا اور شرم کے مارے لوگوں سے چھپتا پھرتا:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ. يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ (نحل ۱۶:۵۸-۵۹)	اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوش خبری سنائی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، اس خوش خبری کے رنج سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کہ ذلت کے ساتھ اس کو قبول کرلے یا زندہ زمین میں دفن کردے۔

ابوحمزہ ایک رئیس تھا، اس کے لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے گھر میں رہنا چھوڑ دیا، اس پر اس کی بیوی یہ اشعار پڑھ پڑھ کر بچی کو لوریاں دیتی تھی:

ما لأبی حمزة لا یتینا　　　یبیت فی بیت التی تلینا

ابوحمزہ کو کیا ہوگیا ہے کہ ہمارے پاس نہیں آتا اور ہمسایہ کے گھر میں رات بسر کرتا ہے۔

غضبانَ اَلّاَ نلدَ البنینا　　　تاللّٰہ ما ذاک بایدینا

اس پر ناراض ہے کہ ہم بیٹے نہیں جنتے، خدا کی قسم یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں۔

ونحن کالزرعِ لِزَارِعِینا　　　نُنبِتُ ما قد زَرَعُوہ فینا

ہم بہ طور کھیت کے ہیں، ہم میں جو بویا جائے گا وہی اگے گا۔

رفتہ رفتہ دختر کشی کی رسم جاری ہوگئی، لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو میدان میں لے جاکر زمین کھودتے اور زندہ گاڑ دیتے اس کو عربی میں واد کہتے ہیں۔

ایک صاحب نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آکر ظاہر کیا تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ

---

(۱) ابوداؤد کتاب النکاح باب احداد المتوفی عنها زوجها ج ۱ ص ۲۳۰۔

سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کیں۔ (۱)

حصہ چہارم

عورت کو وراثت کا کوئی حصہ نہیں ملتا تھا، ان کا قانون تھا کہ وراثت کا حق اسی کو ہے جو کوار چلائے (۲)، عورت بیوہ ہونے کے بعد اپنے شوہر کے وارثوں کی ملک سمجھی جاتی تھی وہ اگر آ کر بیوہ پر چادر ڈال دیتا تو وہ اس کی جائز مدخولہ بن جاتی۔ (۳)

وحشت و جہالت: حرام و حلال کی کوئی تمیز نہ تھی، ہر چیز اور ہر جانور جو کھا سکتے تھے کھاتے تھے، حشرات الارض عام غذا تھی، چھپکلی تک کھا جاتے تھے، خون کو جما لیتے اور قاشیں تراش تراش کر کھاتے، مردہ جانور کھانا عام بات تھی (۴)، چمڑے کو آگ میں بھون کر کھاتے، زندہ جانور کا گوشت کاٹ کر کھا لیتے تھے، گردن مروڑ کر، ڈنڈے سے مار کر، درندوں کا مارا ہوا سب کھاتے (۵)، گدھے کا گوشت بھی کھاتے تھے۔ (۶)

عرب کا مشہور جاہلی شاعر اعشیٰ میمون جس نے آغاز اسلام کا زمانہ پایا ہے اور اہلِ ادب نے آنحضرت ﷺ کی مدح میں اس کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے، اس میں وہ اسلام کی تائید میں اہلِ عرب کو جن باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے وہ یہ ہیں:

وایاک والمیتات لا تاکلنها (۷)
ولا تاخذن سهما حدیدا لتفصدا

مرداروں سے پرہیز کر اور ان کو نہ کھا اور نہ تیز تیر سے جانوروں کو فصد دے کر مار کر کھا۔

و ذا النصب المنصوب لا تنسكنّه
ولا تعبد الاوثان واللّٰه فاعبدا

اور نہ کھڑے کئے ہوئے بتوں پر قربانی کر اور نہ بتوں کی پوجا کر بلکہ اللہ کی عبادت کر۔

ولا السائل المحروم لا تتركنّه
لعاقبة ولا الاسير المقيدا

اور محروم بھیک مانگنے والے کو کسی اور انجام کے لئے مت چھوڑ اور نہ زنجیر میں بندھے قیدی کو۔

ولا تسخرن من بائس ذی ضرارة
ولا تحسبن المال للمرء مخلدا

اور نہ کسی مصیبت زدہ مفلس سے ٹھٹھا کر اور نہ کبھی یہ سمجھ کہ مال آدمی کے لئے ہمیشہ رہنے والا ہے۔

ولا تقربن جارة ان سرها
عليك حرام فانكحن او تابدا

اور نہ اپنی ہم سایہ خاتون سے بدکاری کر وہ تجھ پر حرام ہے تو یا نکاح کر یا کنوارا رہ جا۔

---

(۱) تفسیر ابن جریر تفسیر سورہ اذا الشمس جز ۳۰ ص ۴۰ و تفسیر ابن کثیر تفسیر سورہ اذا الشمس الجزء الرابع ص ۴۷۸ (۲) تفسیر ابن جریر الجزء الرابع ۱۷۱ تفسیر يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ (۳) والیضاً ص ۱۹۲ تفسیر لَا تَعْضُلُوْهُنَّ (۴) اسباب النزول سیوطی آیت حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ برحاشیہ تفسیر القرآن العظیم ج ۱ ص ۹۸ مطبوعہ مصر (۵) تفسیر طبری سورہ مائدہ بیان ماکولات (۶) صحیح نسائی کتاب الصید والذبائح تحریم اکل لحوم الحمر الاهلية ج ۲ ص ۱۷۷، دار الکتاب دیوبند (۷) دیوان اعشیٰ مطبوعہ ویانا ۱۹۲۷ء ص ۱۰۳ و شعراء النصرانیۃ قسم ثالث ص ۳۶۵۔

عربوں کے خصوصیات

اور

خیر الامم بننے کی اہلیت

لیکن ان تمام مفاسد اور برائیوں کے باوجود اہلِ عرب میں کچھ ایسی خصوصیات بھی تھیں جو دنیا کی تمام قوموں میں ان ہی کے ساتھ مخصوص تھیں اور ان کی ان ہی فطری اور طبعی خصوصیات و امتیازات کا اثر تھا کہ خلاقِ فطرت نے ان کو اپنی نبوت و رسالت اور تعلیم و شریعت کا اہل سمجھا اور ان کو اپنے اس خلعتِ خاص سے سرفراز کیا۔

صحتِ نسب: ان خصوصیات میں سب سے پہلی چیز ان کی صحیح النسبی ہے، شمالی عرب کے تمام قبیلے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد اور ان کی نسل سے تھے اور یہ بات ایسی مشہور اور متواتر روایتوں سے ثابت تھی کہ کسی نے اس کی تردید کی ہمت نہیں کی، توراۃ نے حضرات ابراہیمؑ کی جن اولادوں کے نام بتائے ہیں ان میں سے ایک ایک نام کا سراغ عرب کی پرانی آبادیوں میں ملتا ہے چنانچہ ریورنڈ فارسٹر نے ۱۵۴۴ء میں عرب کا جو تاریخی جغرافیہ لکھا ہے اس میں پوری دلیل اور تفصیل اور شہادتوں کے ساتھ ان آبادیوں کا پتہ لگایا ہے اور ان کی جگہیں متعین کی ہیں، قدیم یہودی مورخ یوسیفوس نے بھی یہی لکھا ہے(۱) اور آج کل ایک یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون نے تاریخ الیہود فی بلاد العرب ایک کتاب لکھی ہے اس میں بھی اس نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے اور اس کی صحت پر دلیلیں پیش کی ہیں (۲) اور بعض حال کے مناظر عیسائیوں کے علاوہ اس واقعہ کے تواتر میں کسی نے شک نہیں کیا ہے اور غالباً اسی لئے سینٹ پال نے اپنے خطوط میں عرب کی ہاجرہ کی تمثیل استعمال کی ہے (۳) اور قرآن پاک نے اہلِ عرب اور قریش کو خطاب کر کے صاف کہا ہے:

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۔ (حج ۲۲:۷۸) تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب۔

---

(۱) ترجمہ انگریزی ۱۸۲۲ء جلد اول ص ۲۵ (۲) تاریخ الیہود فی بلاد العرب لاسرائیل ولفنسون مطبوعہ مطبعۃ الاعتماد مصر ص ۷۵-۷۶ (۳) سینٹ پال گلیتون کے نام باب ۴-۲۵، کتاب العہد الجدید ص ۵۸۱ بیروت مطبع ادبیہ ۱۸۸۶ء و ۳۰۹ مطبعہ مدرسہ آکسفورڈ ۱۸۹۰ء۔

حضرت ابراہیمؑ تک نام بنام سلسلہ نسب کے پہنچنے میں پشتوں کی کمی بیشی، یا ناموں کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے، مگر مجموعی حیثیت سے یہ دعویٰ کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد تھے کسی حیثیت سے مشکوک نہیں ہے، خصوصاً جب اس کے ساتھ خارجی قرائن پر بھی نظر کرلی جائے کہ وہی تمدن اور طرز معاشرت جو تورات میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کے اہل وعیال کا نظر آتا ہے، اسلام کے عہد تک بلکہ آج تک وہ اسی طرح عربوں میں قائم وباقی ہے، وہی خیمے ہیں، وہی صحرا ہیں، وہی مویشی ہیں، وہی بدویانہ زندگی ہے، وہی رسوم ورواج ہیں جن کو اسلام نے آکر اور زیادہ نکھار دیا، وہی بیت اللہ، حج اور قربانی کی عادتیں ہیں اور یہ ایسا کھلا قرینہ ہے جو آج بھی یورپ کے محققوں کی نگاہوں کے سامنے ہے، مشہور جرمن محقق نولڈیک کہتا ہے:

"اور نیز عربوں میں قدیم سامی کیرکٹر اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبان اصل زبان کے بہت قریب ہے۔" (۱)

اہلِ عرب کو اپنے حسب ونسب کی حفاظت کا جو خیال ولحاظ تھا، اس کے ذکر سے عرب کی تاریخیں معمور ہیں، چنانچہ نسب پر فخر کرنا ان کی شاعری کا اور نسبی مفاخرت ان کی تقریر کا سب سے بڑا موضوع تھا، اپنے باپ دادوں کے مسلسل ناموں کو یاد رکھنا ان کا خاندانی فرض سمجھا جاتا تھا، یہاں تک کہ انسانوں سے ہٹ کر جانوروں (گھوڑوں) تک کے نسب نامے وہ محفوظ رکھتے تھے، قبائل کے نسبی تعلقات کو یاد رکھنے والے خاص خاص لوگ ہر قبیلہ میں موجود رہتے تھے اور یہی سبب ہے کہ آج بھی ان کے اکابر اور مشاہیر کا سلسلۂ نسب آپ کو معلوم ہوسکتا ہے اور اس پر بہت سی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا میں صرف اہلِ عرب کے ساتھ مخصوص ہے، یہود اور بنی اسرائیل بھی گو حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے تھے، مگر وہ بھی اس خصوصیت میں ان کی برابری نہیں کرسکتے تھے کہ دوسری قوموں کے اختلاط اور میل جول اور کسی خاص وطن نہ ہونے کے سبب سے ان کی اکثر خاندانی خصوصیتیں مٹ گئیں۔

نسب بجائے خود کوئی فخر کی چیز نہیں، اسی لئے محمد رسول اللہ ﷺ نے عمل کے مقابلہ میں نسبی فخر کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی ہدایت کے لئے

(۱) انسائکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم، مضمون السنہ سامیہ، میں نے ارض القرآن جلد اول ص ۱۰۷ سے ۱۱۶ تک اس پر مدلل بحث کی ہے اور علمائے یورپ کے حوالے یک جا کردئے ہیں۔ (طبع جدید ص ۹۱ تا ۱۰۴)

جودعا کی تھی اوران کو جس بیت اللہ کی پاسبانی سپرد کی تھی اوران میں ایک نبی کی بعثت کی جو دعا مانگی تھی اور خدا نے ان کی نسل کو دینی اور دنیاوی برکات کے عطا کرنے کا ان سے جو عہد کیا تھا ان سب کے پورا ہونے اوران کے حقیقی مصداق بننے کے لئے نسل ابراہیمؑ کی صحیح النسبی کی ضرورت تھی اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس شرف کے ساتھ مخصوص کیا۔

کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے: اسی طرح ان کو ان تمام اثرات سے محفوظ رکھا جو قوموں کے عادات واخلاق اور استعدادات کو بدل دیتے ہیں مثلاً وہ باوجود اس کے کہ ہر چہار طرف سے مختلف بڑے بڑے مذہبوں سے ٹکرا رہے تھے، مگر کوئی مذہب ان کو فتح نہیں کر سکا تھا، مجوسیت خلیجِ فارس سے لے کر یمن تک حکم راں تھی، یہودیت یمن اور حجاز کے تجارت گاہوں پر قابض تھی، عیسائیت اپنی فوج و لشکر اور راہبوں اور قسیسیوں کے دل بادل کے ساتھ یمن سے لے کر شام کے حدود تک پھیلی تھی اور بعض افراد اور بعض قبیلوں کو وہ برائے نام عیسائی بنا بھی چکی تھی، مگر پورا عرب بہ دستور اپنی خالص حالت پر باقی تھا، عرب میں جو نیک طبع اور دین دار لوگ ہوتے تھے وہ مجوسی یا یہودی یا عیسائی ہونے کے بجائے اپنے کو دین ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے اور اسی لئے اپنے مذہب کا نام دینِ حنفی رکھتے تھے، یہ سب اس لئے ہو رہا تھا کہ خاتم الانبیا ﷺ کے ذریعہ دین ابراہیمی کی دعوت وتجدید کا راستہ کھلا رہے۔

محکوم نہ تھے: عرب کا ملک تخلیقِ عالم کے آغاز سے اسلام تک ہر غیر قوم کی حکومت سے ہمیشہ آزاد رہا، شمالی عرب نے کبھی کسی قوم کی غلامی نہیں کی، بابل کے بخت نصر نے بنی اسرائیل کو زیروزبر کر دیا مگر عرب کی طرف آنکھ نہ اٹھا سکا، یونانیوں اور رومیوں نے مصر سے لے کر عراق کی سرحد تک صدیوں تک حکومت کی، مگر خاص عرب کے اندر قدم نہ رکھ سکے، سکندر نے اور اس کے بعد کے رومی سپہ سالاروں نے جب ادھر نظر اٹھائی تو فطرت نے ہمیشہ ان کو شکست دی، عرب کا ملک دنیا کی دو عظیم الشان حکومتوں یعنی ایران اور روم کی سرحد پر واقع تھا، مگر وہ دونوں اپنی حرص وآز کا ہاتھ اس کی طرف بڑھانے سے قاصر رہیں، گستاخ عیسائی حبشیوں نے یمن فتح کرنے کے بعد ہاتھیوں کے ریلے کے ساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کی، مگر قدرتِ الٰہی نے ان کو تباہ کر دیا، یہ تمام اہتمام وانتظام اس لئے تھا کہ کوئی جابرانہ قوت ان کے دل ودماغ کی استعداد کو برباد نہ کر سکے، ان کی آزادی کی روح برقرار اور

ان کی فاتحانہ طاقت بہ دستور قائم رہے تا کہ یہ مخفی خزانہ خدا کے آخری مذہب کی حکومت کے قیام و بقامیں کارآمد ہو۔

کتابی فاسد تعلیم سے نا آشنا تھے: جس طرح وہ خارجی اثرات سے پاک تھے، اسی طرح صحیفۂ فطرت کے سوا ہر قسم کے کتابی علم سے وہ نا آشنا تھے، یعنی اس ذریعہ سے بھی وہ دوسری قوموں کے دماغی اثرات سے محفوظ تھے اور علم کی جاہلانہ اور کج بحثانہ ذہنیت سے پاک تھے، وہ امی تھے تا کہ ایک امی معلم کی ربانی تعلیم کے قبول کرنے کے لئے ہر طرح تیار رہیں۔

وہ زمین کے وسط میں آباد تھے: عرب کا ملک پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے، ایک طرف ایشیا دوسری طرف افریقہ اور تیسری طرف یورپ کا راستہ اس سے قریب ہے، پھر بحری جائے وقوع نے اس کو جزائر اور دور دراز ملکوں سے قریب کر دیا تھا، اس لئے عرب سے نکل کر وہ ایک طرف عراق ہو کر ایران، ترکستان، خراسان، سیستان، کابل، ہندوستان تک پہنچ گئے اور دوسری طرف شام ہو کر مصر، افریقہ، الجزائر، ٹیونس، مراکش اور اسپین تک جا پہنچے اور بحری راستوں سے ایک طرف تمام جزائر افریقہ، حبشہ، زنجبار، پھر ادھر جزائرِ ہند، جاوہ، سماترا اور چین تک ان کا گذر ہوا اور دوسری طرف سائپرس، کریٹ اور سسلی تک ان کا پرچم لہرایا، یہ تمام مواقع اس لئے میسر آئے کہ عرب کا جائے وقوع اس دعوت کے لئے مناسب مرکز تھا، فرض کرو کہ اگر اس دعوت کی جگہ ہندوستان یا چین ہوتی تو اسپین اور سسلی تک پہنچنے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوتا، پھر یہ کہ اس وقت تک دنیا جن دو مشرقی اور مغربی طاقتوں کے زیر فرمان تھی، ان دونوں کے زور کو برابر طور سے اور ایک ساتھ توڑنے کے لئے عرب کے سواد دنیا میں کوئی جگہ موزوں نہ تھی، جہاں سے دونوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا اور دنیا کو ان کے خون آشام پنجوں سے نجات دینا بہ آسانی ممکن ہوا۔

بعض اخلاقی خوبیاں: ان کے علاوہ اہلِ عرب کو خیر الامم بننے اور عالم کے لئے شاید نمونہ اور مصلح ہونے کے لئے کچھ اور اخلاقی خوبیوں کی بھی ضرورت تھی اور وہ ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی، ان خوبیوں کے بغیر وہ اسلام کی عظیم الشان تحریک کے علم بردار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ وہ دنیا کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتے تھے۔

شجاع و بہادر تھے: وہ حد سے زیادہ شجاع و بہادر تھے، وہ خطرات سے بے خوف تھے، وہ لڑائی کو کھیل سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے، یہی سبب ہے کہ وہ تمام دنیا کی قوموں اور سلطنتوں کے مقابلہ میں تنہا کھڑے ہوئے اور کسریٰ اور قیصر کو انہوں نے ایک ساتھ چیلنج دیا اور اس تحریک کے پھیلانے میں تھوڑی تھوڑی غیر مسلح جمعیتوں سے ہزاروں اور لاکھوں کی فوج کا بے خطر مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔

پر جوش تھے: ساتھ ہی وہ پر جوش بھی تھے اس لئے جس دعوت اور تحریک کو لے کر اٹھے، اس کو پوری کوشش، عزم اور جوش کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا، ان کے عزم اور جوش کو نہ پہاڑ روک سکا اور نہ سمندر اس سے ٹکرا سکا، ہر جگہ وہ توحید کا علم لئے بحر و بر، دشت و جبل میں پھیل گئے اور اپنے عزم راسخ سے ارکانِ عالم کو متزلزل کر دیا۔

حق گو تھے: ان کی جسمانی شجاعت و بہادری نے ان کو دل کا شجاع اور بہادر بھی بنا دیا تھا، جو بات ان کے دل میں ہوتی تھی وہی ان کی زبان پر تھی، اہلِ مدینہ میں جو نفاق کا عنصر پیدا ہو گیا تھا، وہ یہود کے اثر کا نتیجہ تھا، ورنہ قریش اور عام اہلِ عرب میں یہ بات نہ تھی یا تو وہ کھلے دشمن تھے یا کھلے دوست، اپنے نزدیک وہ جس کو حق سمجھتے تھے، اس کے ظاہر کرنے میں ان کو کسی کا باک نہیں ہوتا تھا۔

عقل و دانش والے تھے: باوجود اس کے کہ وہ عموماً ظاہری نوشت و خواند سے عاری تھے مگر فطرت کے عطیۂ عقل و دانش سے وہ کافی طور پر بہرہ مند تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ علی مرتضیٰؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، خالدؓ، ابوعبیدہؓ بن جراح، وغیرہ سینکڑوں ہزاروں صحابہ نے علم، مذہب، اخلاق اور سیاست میں جو نکتہ سنجیاں کیں، وہ خود ان کی عقل و دانش کی گواہ ہیں، روم و ایران کی متمدن قوموں سے جس طرح انہوں نے معاملہ، مراسلہ اور نامہ و پیام کیا اور علم و سیاست کے الجھے سے الجھے ہوئے مسئلہ کو جس طرح سلجھایا، وہ خود اسی نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے، ان کے شعرا کے کلام، ان کے مقرروں کی تقریریں، ان کے فصحا کے مقولے سنئے، تو ان کی اس فطری صلاحیت کا اندازہ ہوگا کہ ظاہری تعلیم کے بغیر کیوں کر یہ لعل و گہر وہ اپنے منہ سے اگل سکے۔

ذہن اور حافظہ کے تیز تھے: فطرت کا قاعدہ ہے کہ اگر اس کے بعض قویٰ بے کار رہیں تو ان کی قوت دوسرے زیر عمل قوی کو وہ منتقل کر دیتی ہے اور جس عضو سے زیادہ کام لیا جاتا ہے، اس کی قوت کو

وہ ترقی دیتی رہتی ہے، اسی اصول کے موافق ظاہری تعلیم اور نوشت وخواند سے محروم ہونے کے سبب سے جہاں عرب کے بعض قویٰ بے کار ہو رہے تھے وہاں ان کو اپنی یادداشت کے لئے تحریری اوراق اور سفینوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اپنے دل ودماغ پر بھروسہ کرنے کی عادت تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا ذہن اور حافظہ بہت قوی تھا، یہی سبب ہے کہ ان کے شعرا اپنے بڑے بڑے قصیدوں کو زبانی پڑھتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے اس کو برزبان یاد رکھتے تھے اور ان کی اسی قوت کا یہ فیض تھا کہ ان میں کا بڑا طبقہ تحریر کے بغیر قرآن پاک کی بڑی بڑی سورتوں کو یاد رکھتا تھا اور بہتیرے ایسے تھے جو پورے قرآن کو یاد رکھتے تھے اور یہ ان ہی کی تقلید ہے کہ دنیا کے ہر حصہ میں ایسے ہزاروں مسلمان پائے جاتے ہیں جو پورے قرآن کے حافظ ہوتے ہیں اور اہلِ عرب کی اسی خصوصیت کا مظہر یہ بھی تھا کہ احادیث نبوی اور واقعات کا بڑا سرمایہ تحریر کے علاوہ زبانی ایک دوسرے کو پوری ذمہ داری اور حفاظت کے ساتھ منتقل ہوتا رہا اور سینکڑوں اصحاب ایسے تھے جو ہزاروں لاکھوں احادیث کو حرف حرف اور لفظ لفظ کی پابندی کے ساتھ یاد رکھتے تھے، اہلِ عرب کی اس خصوصیت نے اسلام کی حفاظت اور اشاعت کا نہایت اہم فرض انجام دیا۔

فیاض تھے: اہل عرب کی ایک خاص امتیازی صفت ان کی فیاضی تھی، مہمان نوازی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، ہم سایوں اور پناہ گزینوں کی امداد میں وہ اپنی جان تک لڑا دیتے تھے، اپنی شہرت اور نام وری کے لئے اونٹوں کو ذبح کر کے کھلا دینا، یا جوئے میں جیتی ہوئی دولت کو احباب کے جلسۂ دعوت میں اڑا دینا اور اس پر فخر کرنا ان کی قومی رسم تھی اور یہی اوصاف ان کی شاعرانہ مدح میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں، اسلام نے ان کی اسی صفت کو تھوڑی سی اصلاح کے بعد خدا کی راہ میں خیرات و صدقات وزکوٰۃ سے بدل دیا اور اسلام کی مشکل کشائی میں اس نے سب سے زیادہ مدد دی۔

مساوات پسند تھے: چوں کہ وہ کبھی کسی دوسری قوم کے محکوم نہیں ہوئے تھے اور نہ کسی ایک مطلق العنان شخصی بادشاہ کے تابعِ فرمان بنے تھے اس لئے ان کی خودداری کا جذبہ بیدار تھا، وہ غلام بننا نہیں جانتے تھے، اپنے کو ذلیل کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور وہ بڑے سے بڑے شخص کے سامنے برابری کے ساتھ بے باکانہ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔

عرب میں بیسیوں لڑائیاں صرف اسی خودداری کی حفاظت میں پیش آئی تھیں، جس کا ایک منظر سبعہ معلقہ کے آخری قصیدہ میں نظر آتا ہے، اہلِ عرب کے اس جذبہ نے حق گوئی، مساوات اور جمہوریت پسندی وغیرہ اسلامی تعلیمات کے پھیلانے میں بڑی مدد دی۔

عملی تھے: اہلِ عرب کے فطری اخلاق وکردار کی آخری دفعہ یہ ہے کہ وہ طبعاً عملی اور عملیت پسند تھے، وہ اہلِ ایران اور اہلِ ہند کی طرح محض تخیل پسند، خیال آرا اور نظریہ باز نہ تھے، وہ مجسم عمل تھے اور عملیت کو پسند کرتے تھے، وہ چون وچرا اور کیسے اور کیوں کر کی فلسفیانہ الجھنوں سے پاک تھے، وہ دنیا کے کاروباری آدمیوں اور سپاہیوں کی طرح چند اچھی باتوں کو قبول کر کے ان پر فوراً عامل بن جاتے تھے، یہی سبب ہے کہ عجمیانہ نکتہ آفرینی اور بال کی کھال نکال کر اس کی الجھنوں کے سلجھانے میں کبھی گرفتار نہیں ہوئے، وہ ہمہ تن عمل اور صرف عمل تھے، اسی بنا پر شارع (علیہ السلام) نے ان کے سامنے وہ ایک عملی مذہب کو پیش کر کے ان کو سرتاپا عملی بنا دیا اور جو کچھ وہ تعلیم لائے تھے اس کا مجسم پیکر بن کر چند سال میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا، دور سے بدوی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آتے تھے اور شک وحجت اور مناظرہ وقیل وقال کے بغیر فرائض واخلاق کی عملی تعلیم حاصل کر کے اپنے قبیلہ میں واپس چلے جاتے تھے اور بالآخر اپنی عملی دعوت سے اپنے پورے قبیلہ کو مسلمان بنا لیتے تھے، وہ اگر مگر اور ممکن وناممکن کی بحث میں نہیں پڑتے تھے، وہ تعلیم کو دیکھتے تھے اور سنتے تھے، وہ اچھی معلوم ہوتی تو اس کو قبول کرتے اور اس پر عمل کر کے دینی ودنیاوی فوائد اور نتائج کے حصول کا یقین کرتے تھے اور اسی غیر متزلزل یقین اور ایمان کے بھروسہ پر وہ مشکل اور خطرناک کام کر گزرتے تھے، اہلِ عرب کی اسی خصوصیت نے اسلام کی سادگی کو برقرار اور عجمی فلسفیت ونظریت سے پاک ومبرا رکھا اور ساتھ ہی چند ہی سال کے اندر اندر مغرب ومشرق، شمال وجنوب میں اسلام کا پھریرا آسمان پر اڑنے لگا۔

ان اوصاف کی مصلحت: اہلِ عرب کے ان تمام فطری وطبعی اوصاف واخلاق کو دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری دین کی اشاعت اور حفاظت کے لئے جس قوم کا انتخاب کیا تھا، وہ ازل سے اس کے لئے منتخب ہو چکی تھی، باوجود ان کی ہر قسم کی گمراہیوں کے یہ چند اچھے اوصاف اس لئے ان میں ودیعت کئے گئے تھے تا کہ جب خدا کی بادشاہی کا دن آئے تو ان کی فطری استعداد کا

یہ سرمایہ اس کی امداد و اعانت کے لئے خزانۂ غیب کا کام دے، یہی وہ سرمایہ تھا جو اس وقت نہ ہند و عجم میں تھا، نہ روم و فرنگ میں، نہ ترک میں تھا نہ زنگ میں، وہ عرب اور صرف عرب میں تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری نبوت کے لئے اسی قوم کو برگزیدہ کر کے یہ امانت اس کے سپرد کی، آنحضرت ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کی اولاد میں اسماعیل کو پسند کیا اور اسماعیل کی اولاد میں بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو'' ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ کا بیٹا ہوں، اللہ نے تمام لوگوں کو پیدا کیا تو مجھے اس نے ان سب میں سب سے بہتر نسل میں رکھا، ان کو دو حصوں (عرب و عجم) میں تقسیم کیا تو مجھے اس حصہ میں (عرب میں) بنایا جو سب سے بہتر تھا، اس حصے کو بھی قبیلوں میں تقسیم کیا تو مجھے اس قبیلہ میں پیدا کیا جو سب سے بہتر تھا، پھر اس قبیلہ کو گھرانوں میں تقسیم کیا تو مجھے سب سے بہتر گھرانے میں پیدا کیا، پھر اس گھرانے کو افراد پر تقسیم کیا تو مجھے اس گھرانے کا سب سے بہتر فرد بنایا۔ (۱)

---

(۱) یہ دونوں حدیثیں ترمذی باب المناقب باب ماجاء فی فضل النبی ﷺ ص ۵۹۹ میں ہیں۔

صبحِ سعادت

دنیااور عرب کی سرزمین اس ظلمت میں تھی کہ صبحِ سعادت نمودار ہوئی اور خورشیدِ نبوت کے طلوع کا غلغلہ برپا ہوا، ظلمتِ شب کافور ہوئی اور تھوڑی دیر میں ذرہ ذرہ سورج کی کرنوں سے پرنور ہوگیا، یہ ظاہر ہے کہ یہ سورج گو دنیا کو روشن کرنے نکلا تھا لیکن وہ نکلا عرب ہی کے افق سے تھا، اس لئے ضروری تھا کہ اس کے نور سے پہلے اسی ملک کی سرزمین روشن ہو۔

ایک قوم کا انتخاب: سرورِ کائنات ﷺ کو گو خدا نے تمام عالم کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا اور اس بناپر ایک ایسی شریعتِ کامل عطا کی جو نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کے لئے ابد تک کافی ہے لیکن کوئی شریعت، کوئی قانون، کوئی دستور العمل اس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہوسکتا جب تک اس کے ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو جو اس شریعت کی عملی تصویر ہو اور جس کی ہر بات، ہر ادا، ہر جنبش، عملی خطیب بن کر گردوپیش کو اپنا ہم زبان اور ہم عمل بنالے۔

اس بنا پر خاتم انبیاؑ کا سب سے اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاحِ عالم کے لئے تیار کرنا تھا۔ (۱) دنیا کی اور قومیں بار باری اس منصب پر ممتاز ہو چکی تھیں، ایک زمانہ تھا جب بنی اسرائیل جیسی قوم جو آج تمام دنیا میں خوار و ذلیل ہے۔ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ (بقرہ ۲:۴۷) (ہم نے تم کو تمام دنیا کی قوموں پر فضیلت دی۔) کا تاج پہن چکی تھی لیکن اوپر بہ تفصیل گذر چکا ہے کہ اب تمام قوموں میں صلاحیت کا مادہ مفقود ہو چکا تھا، ایران تین ہزار برس تک ناز و نعمت میں پل کر ترقی کی روح فنا کر چکا تھا، رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہو چکے تھے، ہندوؤں کا دل و دماغ

(۱) شاہ ولی اللہؒ صاحب لکھتے ہیں کہ جو پیغمبر تمام عالم کے لئے مبعوث ہوتا ہے، وہ علاوہ ان اصول کے جو اور مذاہب میں ہیں چند اور نئے اصول اختیار کرتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے:

یدعو قوما الی السنۃ الراشدۃ ویزکیھم و یصلح شانھم ثم یتخذھم بمنزلۃ جوارحہ فیجاھد اھل الارض ویفرقھم فی البلاد وھو قولہ تعالٰی کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ (حجۃ اللہ البالغۃ ص۱۲۳ مطبوعہ ھند، ج ۱ ص ۹۳ مصر)	وہ ایک قوم کو سنتِ راشدہ کی طرف دعوت دیتا ہے ان کو پاک اور درست کرتا ہے، پھر ان کو اپنا دست و بازو بناتا ہے اور ان کو دنیا میں پھیلا دیتا ہے اور ان کے ذریعہ سے مجاہدہ کرتا ہے جیسا کہ خدا نے کہا تم بہترین امت ہو جو دنیا کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔

صرف وہم پرستی کا کام دینے کے قابل رہ گیا تھا، صرف ایک عرب تھا جو بن جتی زمین کی طرح مادہ ہائے نشوونما سے لبریز تھا اور ایک لوحِ سادہ کی طرح ہر قسم کی نقش آرائیوں کے قابل تھا، مشیت ایزدی نے اسی کو تاکا اور چندروز میں وہی عرب جو سرتاپا جہل، سرتاپا وحشت اور سرتاپا درندہ پن تھا کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آل عمران ۳:۱۱۰)(۱) کا مظہر بن گیا۔

ان لوگوں کا حلیہ وجمال اور خط وخال یہ تھا:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (حج ۲۲:۴۱)	ایسے لوگ کہ ہم اگر ان کو دنیا میں اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں۔

اصلاح وہدایت کی مشکلات: ہر قوم کی اصلاح وہدایت میں اول سخت اور متعدد مشکلات پیش آتی ہیں لیکن ان کی نوعیت ایک دو سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن عرب کی اصلاح میں ہر نوع، ہر حیثیت ہر جہت کی گوناگوں اور لاعلاج مشکلات تھیں اور ایسی تھیں جن میں سے ایک کا حل کرنا بھی قدرتِ انسانی سے بالاتر تھا، بنواسرائیل ایک مدت سے مصر میں قبطیوں کی غلامی کررہے تھے اور قبطیوں کے جوروظلم کا طوفان ان کے سر سے گذر چکا تھا، حضرت موسیٰؑ نے ان پر یہ احسان عظیم کیا کہ فرعون کے پنجۂ ستم سے ان کو چھڑا کر مصر سے نکال لائے لیکن غلامی میں رہتے رہتے ان کی طبیعت میں اس قدر ذلت پسندی آگئی تھی کہ جب ان سے کہا گیا کہ آگے کنعان کی زمین ہے، اس کو لڑ کر لو اور اسی پر تختِ سلطنت بچھاؤ، تو انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے صاف کہہ دیا کہ تم اور تمہارا خدا دونوں جاکر لڑو ہم تو یہاں سے آگے قدم نہیں بڑھاتے، یہ ایک امتدادِ معاشرت کا اثر تھا جو مرتے مرتے ان لوگوں کی طبیعت سے نہیں گیا اور جب تک یہ نسل پوری اپنی موت سے مرکر منقرض نہیں ہوگئی، بنواسرائیل کو کنعان کی زمین میں قدم رکھنا نصیب نہیں ہوا۔

یہ صرف ایک مشکل کی مثال تھی، اب عرب کی مشکلات کا اندازہ کرو۔

جہالت: عرب کی قوم امی محض تھی، الوہیت، رسالت، کتاب، معاد، عبادت ان میں سے کوئی چیز

---

(۱) تم بہترین قوم ہو جو انسانوں کے لئے (پردۂ عدم سے) باہر لائی گئی، جو نیکیوں کا حکم دیتی اور برائیوں سے روکتی ہے۔

ایسی نہ تھی جس سے ان کے کان آشنا ہوں، اسلام کا ہر لفظ جوان کے کان میں پڑتا تھا ان کو ایک تعجب انگیز اور بالکل بے گانہ آواز معلوم ہوتی تھی، قرآن مجید نے ان کی اس جاہلانہ حیرت واستعجاب کو متعدد آیتوں میں ذکر کیا ہے:

يٰسٓ. وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ. اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ. عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ. تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ. لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ. (یٰسین ۳۶:۱تا۶)

قرآن حکیم کی قسم، تو بے شبہ پیغمبروں میں سے ہے راہ راست پر ہے، یہ قرآن رحمت والے غالب خدا کے پاس سے اترا ہے تا کہ تو اس قوم کو آگاہ کرے جن کے اسلاف کو آگاہ نہیں کیا گیا اور اس لئے وہ غفلت میں پڑے ہیں۔

یہ نبوت کے شرف سے محروم قوم ایک آسمانی مذہب کے تمام خصائص سے محض بے گانہ تھی:

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ. اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ. وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ. مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِى الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ.

(ص ۳۸:۴تا۷)

اور انہوں نے تعجب کیا کہ ان میں ایک پیغمبر ہو کر ان کے پاس آیا، کافروں نے کہا یہ دروغ گو جادوگر ہے، اس نے اتنے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا، یہ عجیب بات ہے، ان کے پنچ اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو، اس میں اس کی (پیغمبر کی) کوئی غرض ہے، ہم نے تو سابق مذہب میں یہ نہیں سنا، یہ سب گھڑی ہوئی بات ہے۔

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ. (قٓ ۵۰:۲)

بلکہ ان کو تعجب ہوا کہ ان ہی میں سے ایک ان کے پاس پیغمبر بن کر آیا، کافروں نے کہا، یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔

صفاتِ الٰہی، آثارِ نبوت، احوالِ معاد، ان میں سے ہر بات کو سن کر وہ اسی طرح سرتاپا حیرت بن جاتے تھے، نبوت کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ انسان تو اس کے سزاوار نہیں، اس منصب پر تو فرشتوں کو ممتاز ہونا چاہیے تھا:

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ. (فرقان ۲۵:۲۱)

جو ایک دن ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ فرشتے پیغمبر بنا کر ہم پر کیوں نہ اتارے گئے۔

اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ

پیغمبر جب ان کے پاس سامنے سے اور پیچھے سے آتے ہیں کہ

مِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ قَالُوْا لَوْشَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ.

(فصلت ۴۱:۱۴)

ایک خدا کے سوا کسی اور کو نہ پوجو تو وہ کہتے ہیں کہ خدا اگر کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو اتارتا، ہم تو تمہاری باتوں کا انکار ہی کریں گے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا. قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا.

(بنی اسرائیل ۱۷:۹۴و۹۵)

ہدایت آنے کے بعد صرف اس شبہ نے لوگوں کو ایمان لانے سے باز رکھا ہے کہ کیا خدا نے آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، جواب میں کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے بستے ہوتے تو البتہ ہم آسمان سے کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے۔

نبی کا تخیل اگر ان کے ذہن میں کبھی آتا تھا، تو بشریت سے ماوراصورت میں، یعنی یہ کہ وہ انسانی ضروریات سے منزہ ہو، اس کے پیچھے خدا کا اور فرشتوں کا پرا ہو، آسمان اور زمین کے خزانے اس کے دستِ قدرت میں ہوں:

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا. اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا. اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا. اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ.

(بنی اسرائیل ۱۷:۹۰-۹۳)

انہوں نے کہا اے پیغمبر! ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک زمین سے ہمارے لئے تو چشمہ نہ بہادے، یا تیری ملکیت میں کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو جس میں نہریں جاری کردی ہوں یا جیسا کہ تو نے کہا ہے ہم پر بادل کا کوئی ٹکڑا نہ گرادے، یا خدا اور فرشتوں کا پرا بنا کر نہ لے آئے، یا تیرے پاس کوئی سونے کا گھر نہ ہو یا تو آسمان پر نہ چڑھ جائے۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا. اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا

(فرقان ۲۵:۷-۸)

انہوں نے کہا یہ عجیب پیغمبر ہے، یہ تو کھاتا پیتا ہے بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اترا جو اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا یا اس کے پاس کوئی خزانہ کیوں نہیں ڈال دیا گیا یا اس کے لئے خاص کوئی باغ کیوں نہ ہوا جس سے یہ کھاتا۔

پیغمبر کے لئے ان کے خیال میں یہ بھی ضروری بات تھی کہ وہ بڑا دولت مند ہو، اس کے قبضہ میں کوئی بڑی جائداد ہو، میووں کے ہرے بھرے باغ اور سونے چاندی کے خزانے اس کے پاس ہوں، چنانچہ گذشتہ آیت میں کفار کے اس خیال کی طرف بھی اشارہ ہے، اسی لئے مکہ اور طائف کے جو روٴسا دولت مند تھے وہ اس منصب کے سب سے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے:

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ۔ (زخرف ۴۳:۳۱)

وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا۔

کسی کتاب کے نازل ہونے کے معنی ان کے خیال میں یہ تھے کہ آسمان سے کاغذوں میں ایک لکھی لکھائی، ترشی ترشائی، جلد بندھی ہوئی ایک کتاب سب کے سامنے مجمع میں اتر آئے:

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (فرقان ۲۵:۳۲)

کافروں نے کہا اس پر قرآن یک بارگی کیوں نہیں اترا۔

وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّكَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ (بنی اسرائیل ۱۷:۹۳)

اور (کافروں نے) کہا ہم تیرے آسمان پر چڑھ جانے کے بھی اس وقت تک قائل نہیں ہوں گے جب تک ہم پر کوئی ایسی کتاب نہ اتار لائے جس کو ہم لے کر پڑھنے لگیں۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ كِتٰبًا فِیْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَیْدِیْهِمْ لَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ۔ (انعام ۶:۷)

اور اگر کاغذوں میں لکھی ہوئی کوئی کتاب ہم آسمان سے تم پر اتارتے، جس کو وہ اپنے ہاتھوں سے چھو بھی سکتے تو کافر یہی کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

غرض ایک آسمانی مذہب کی کیفیت سے بالکل بے خبر تھے، الوہیت اور صفاتِ الٰہی کے اسرار، نبوت کے خصائص، نزول کتاب کی حقیقت، ہر چیز ان کے لئے حیرت اور استعجاب کا سرمایہ تھی:

اَفَلَمْ یَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ یَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِیْنَ. اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ۔ (مومنون ۲۳:۶۸-۶۹)

کیا انہوں نے بات پر غور نہیں کیا، یا ان کے پاس وہ تعلیم آئی ہے جو ان کے اسلاف کے پاس نہیں آئی یا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا تو اس کے منکر ہیں۔

اس بنا پر عرب کے مشرکین اور کفار کو ایک مدت تک صدائے نبوت سے گوش آشنا ہونے کی حاجت تھی اور اس میں کئی برس صرف ہو گئے لیکن وہ لوگ جو اس صدا سے نامانوس نہ تھے ان تک آواز

پہنچنے کی دیر تھی کہ وہ سرتا پا لبیک تھے، حصہ اول میں گزر چکا ہے کہ سابقینِ اسلام عموماً وہی لوگ تھے جو اہل کتاب یا حنفا کے آغوش پروردہ تھے، اشخاص کے علاوہ قبائل کا بھی یہی حال تھا، مشرکین کلام الٰہی کا جواب خندۂ تحقیر سے دیتے تھے اور رموزِ نبوت کے دانا چشمِ پرنم اور دلِ پرکیف سے:

إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا. وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا. وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا۩

(بنی اسرائیل ۱۷: ۱۰۷ تا ۱۰۹)

جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے (یہود و نصاریٰ) جب ان کو قرآن کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو منہ کے بل وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، ہم سے اسی (ایک پیغمبر الزماں کے بھیجنے کا) جو وعدہ کیا تھا وہ ضرور پورا ہوا اور وہ منہ کے بل گر پڑتے ہیں اور یہ ان کے خشوع کو اور بڑھاتا ہے۔

وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ. وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ.

(مائدہ ۵: ۸۲-۸۳)

ان میں سب سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ محبت رکھنے والے وہ ہیں جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں، سبب یہ ہے کہ ان میں قسیس اور راہب ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے اور جب وہ کلام سنتے ہیں جو پیغمبر پر اترا ہے تو ان کی آنکھوں کو تو دیکھے گا کہ حق کو پہچان کر آنسو بہاتی ہیں اور کہتے ہیں کہ خدایا ہم ایمان لائے ہم کو بھی شہادت دینے والوں میں لکھ لے۔

مدینہ کے یہود جو اسلام سے سیاسی اور دینی کینہ اور تعصب رکھتے تھے اور اس بنا پر اسلام کے مقابلہ میں زبان سے اپنی کور باطنی کا اظہار وہ اپنا فرض سمجھتے تھے وہ بھی چشمِ دل کو بینشِ حق سے باز نہیں رکھ سکتے تھے:

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ۝

(بقرہ ۲: ۱۴۶)

جن کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ اس پیغمبر کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں ان میں سے کچھ لوگ جان کر حق پوشی کرتے ہیں۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ

اور جب خدا کے پاس سے پیغمبر وہ کتاب لے کر آیا جو خود

لِمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (بقرہ۲:۸۹)

ان کی آسمانی کتابوں کو سچ کر رہی ہے تو باوجود اس کے کہ وہ کافروں کو اس سے پہلے اسی کے نام سے دباتے تھے اب حق پہچان کر اس کا انکار کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی شہادتوں سے قطع نظر کر کے اگر واقعات پر غور کیا جائے تب بھی یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی، مجرد دعوتِ حق سننے کے ساتھ جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو لبیک کہا ان کے حالات پیشِ نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لئے صرف اثر پذیر دل اور ذوق آشنا نگاہ کا جویاں تھا، حضرت سعید بن زیدؓ، عثمان بن مظعونؓ، صہیب رومیؓ، ابوذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ وغیرہ جو سابقینِ اسلام ہیں، اسی قسم کے لوگ تھے، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ قریش کے مشرکین، خدا کا کلام تیرہ برس تک متصل سنتے رہے لیکن ان کے دل کی سنگینی میں کوئی فرق نہ آیا، ورقہ مکہ کا قریشی عیسائی، صرف ایک بار قرآن سنتا ہے اور ناموسِ اکبر کی آواز پہچان لیتا ہے، مکہ کے مشرک ترپن برس تک آپ ﷺ کے چہرہ کو دیکھتے رہے لیکن نورِ الٰہی کو نہ پہچان سکے اور عبداللہ بن سلام یہودی عالم نے صرف ایک دفعہ جمالِ پرانوار کو دیکھا اور پکار اٹھے کہ یہ حق کی تجلی ہے، رؤسائے قریش ہر روز اپنی آنکھوں سے نزولِ وحی کا تماشا دیکھتے ہیں اور جنبش نہیں کرتے اور نجاشی حکومت کی مسند پر اور ہرقل شہنشاہی کے تخت پر بیٹھ کر غائبانہ کلام اللہ کی چند آیتیں سنتے ہیں اور تڑپ جاتے ہیں، قریش کے گھر یہ دولت خود اترتی ہے اور وہ اس کو ٹھکرا دیتے ہیں لیکن مدینہ سے بنی اسرائیل کے پڑوسی جوان کی زبان سے آخری نبوت کی بشارت سن چکے تھے اتفاقاً مکہ آتے ہیں اور اس دولتِ ابدی کو اپنے گھر اٹھا لے جاتے ہیں، طائف کے سنگ دل جاہل، نبی پر پتھر برساتے ہیں اور اس کی ہنسی اڑاتے ہیں اور نجران کے عیسائی عالم مناظرہ کی غرض سے مدینہ آتے ہیں لیکن چہرہ پر پیغمبری کی معصومیت دیکھ کر دہل جاتے ہیں اور صلح کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔

قریش اور حجاز کے رازِ نبوت کے نامحرم دعوتِ حق کا جواب اکیس برس تک تیغ وسناں سے دیتے رہے لیکن یثرب، ہجر، یمن، عمان اور بحرین کے بڑے بڑے اور عظیم الشان قبائل جو یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کے اثر سے ان رموز سے کسی قدر آگاہ ہو چکے تھے، وہ آوازِ حق پہنچنے کے ساتھ دفعتاً مسلمان تھے۔

آبائی دین ورسوم کی پابندی: ہرنئی تحریک کوغور سے دیکھوتو معلوم ہوگا کہ اس کے قبول کرنے میں جو چیز سب سے پہلے عائق ہوتی ہے وہ قومی رسم و رواج اور آبائی دین و مذہب کی پابندی ہے، انسانیت کے پاؤں میں اس سے بھاری کوئی زنجیر نہیں، دوست و آشنا کا چھوٹنا، ماں باپ سے علاحدگی، آل واولاد سے کنارہ کشی، مال و جائداد سے دست برداری، جماعت کی مخالفت، قوم سے انقطاع، وطن سے دوری، ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو ہرانسان آسانی سے برداشت کر سکے، ملکی رسم و رواج کی دیرینہ محبت اور آبائی کیش وآئین کی موروثی الفت، حق و باطل کی تمیز اور نیک و بد کی پہچان کی حس مٹا دیتی ہے، عام دنیا کی فطری حالت کے علاوہ عرب کی قوم قدامت پسندی اور قدیم حالت پر بقا اور استحکام میں خاص شہرت رکھتی ہے، دنیا کہاں سے کہاں بدلتی چلی گئی، پرانی سامی نسل کی بدویانہ خصوصیتیں جو توراۃ میں پڑھتے ہیں وہ تمام سامی قوموں سے مٹ گئیں، مگر عرب میں اس وقت بھی نمایاں تھیں اور آج بھی نظر کے سامنے ہیں، دین ابراہیم کے چند اصول، حج، ختنہ اور قربانی وغیرہ ہزاروں برس کے بعد بھی عرب میں مٹ مٹا کر باقی رہ گئے تھے اور ان سے نہیں چھوٹے تھے، ان کے شعروشاعری اور فخر ومباہات کا سب سے پر جوش مضمون آبا و اجداد اور نام ونسب پر فخر وغرور تھا جس کو چھوڑنا ان کے نزدیک اپنی پرانی عزت وعظمت کی دیوار کو خود گرا دینا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے جب مکہ میں دین حق کی منادی شروع کی تو اس کی شدید مخالفت جس بنا پر سب سے زیادہ کی گئی وہ یہی دین آبائی کے ترک کا مسئلہ تھا اور یہی دین جدید کے بطلان کی سب سے مستحکم دلیل ان کے پاس تھی، چنانچہ قرآن مجید نے بار بار ان کے اس قول کو دہرایا ہے اور اس کی لغویت ظاہر کیا ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ. (بقرہ ۲:۱۷۰)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو، کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم اس کی پیروی کریں گے جس پر اپنے باپ دادوں کو ہم نے پایا، کیا اگر چہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں۔ (تب بھی)

بَلْ قَالُوا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِمْ مُهْتَدُونَ. وَكَذَٰلِكَ مَا أَرْسَلْنَا

بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم پر چل کر رہنمائی پائیں گے

مِنۡ قَبۡلِکَ فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَاۤ اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِهِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ. قٰلَ اَوَلَوۡ جِئۡتُکُمۡ بِاَهۡدٰی مِمَّا وَجَدۡتُّمۡ عَلَیۡهِ اٰبَآءَکُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ کٰفِرُوۡنَ.

(زخرف ۴۳:۲۲-۲۴)

اوراسی طرح ہم نے اے پیغمبر تم سے پہلے کسی آبادی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا لیکن اس کے دولت مندوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم کے پیرو ہیں۔ کہو اے پیغمبر کیا اگر چہ میں اس روش سے، جس پر تم نے اپنے بزرگوں کو پایا زیادہ سیدھا راستہ لے کر تمہارے پاس کیوں نہ آؤں (تب بھی تم ان ہی کی پیروی کرو گے) انہوں نے کہا کہ ہم تو جو دے کر تم بھیجے گئے ہو اس کا انکار ہی کرتے رہیں گے۔

وَاِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً قَالُوۡا وَجَدۡنَا عَلَیۡهَاۤ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلۡ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاۡمُرُ بِالۡفَحۡشَآءِ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ۝

(اعراف ۷:۲۸)

اور جب وہ کوئی بے شرمی کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اسی پر پایا اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے، کہہ دو اے پیغمبر کہ اللہ تو بے شرمی کی بات کا کبھی حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ پر تہمت باندھتے ہو جو تم نہیں جانتے۔

وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَی الرَّسُوۡلِ قَالُوۡا حَسۡبُنَا مَا وَجَدۡنَا عَلَیۡهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوۡ کَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ شَیۡـًٔا وَّ لَا یَهۡتَدُوۡنَ۝

(مائدہ ۵:۱۰۴)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کے پاس اور رسول کے پاس آؤ تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادوں کو جس پر پایا ہے وہی ہم کو کافی ہے، کیا ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ سیدھے راستہ پر ہوں (تب بھی وہ ان ہی کی پیروی کریں گے)۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ وَّلَا هُدًی وَّلَا کِتٰبٍ مُّنِیۡرٍ. وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَا وَجَدۡنَا عَلَیۡهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوۡ کَانَ الشَّیۡطٰنُ یَدۡعُوۡهُمۡ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیۡرِ.

(لقمان ۳۱:۲۰-۲۱)

کچھ لوگ ایسے ہیں جو علم و ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں بلکہ ہم اسی کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا، کیا اگر چہ ان کو شیطان دوزخ کے عذاب ہی کی طرف کیوں نہ پکارے تو وہ اسی کی پیروی کریں گے۔

کفار کے یہ سوال و جواب خود ظاہر کرتے ہیں کہ ان کو اپنے آبائی رسوم کا چھوڑنا کس درجہ محال نظر آتا تھا، آپ ﷺ نے بعثت کے تین برس بعد جب بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کی عدالت میں آپ پر سب سے بڑا جرم یہی قائم کیا گیا کہ یہ خاندانی دیوتاؤں کی تحقیر، بزرگوں کی توہین اور آبائی رسم و رواج کی مذمت کرتے ہیں، مکہ میں جب آپ ﷺ نے علی الاعلان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور بہت سے نیک لوگوں نے اس دعوت پر لبیک کہا تو قریش کے بڑے بڑے رئیسوں نے ابوطالب کے پاس جا کر آپ ﷺ کے خلاف جو الزامات قائم کئے وہ یہ تھے "اے ابوطالب! تمہارا بھتیجا ہمارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے، ہمارے مذہب کی توہین کرتا ہے ہم کو بے وقوف اور نادان کہتا ہے اور ہمارے باپ دادوں کو گمراہ بتاتا ہے، تو یا تو تم اس کو روکو یا ہم کو اور اس کو چھوڑ دو کہ باہم سمجھ لیں۔"

یہ ان کی عدالت کا پہلا مطالبہ تھا، ابوطالب نے ان کو سمجھا بجھا کر واپس کیا تو کچھ دنوں کے بعد انہوں نے پھر اپنا مطالبہ ان الفاظ میں پیش کیا "اے ابوطالب! تم نے اپنے بھتیجے کو اب تک منع نہیں کیا، اب خدا کی قسم ہم اپنے بزرگوں کی برائی، اپنی نادانی اور اپنے دیوتاؤں کی ہجو نہیں سن سکتے، تو یا تو اس کو باز رکھو اور یا ہم سے لڑنے پر آمادہ ہو جاؤ" اس اعلانِ جنگ سے کام نہ چلا تو وہ تیسری دفعہ ابوطالب کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں: "اے ابوطالب! ولید کا بیٹا عمارہ کیسا خوش رو نوجوان ہے تم اس کو متبنیٰ بنا لو اور اپنے بھتیجے کو قتل کے لئے ہمارے حوالہ کر دو کہ اس نے تمہارے اور تمہارے بزرگوں کے دین و مذہب کی مخالفت کی ہے، تمہاری قوم کی جماعت کو پراگندہ کر دیا ہے اور ان کو بے وقوف اور نادان کہتا ہے"، سب سے آخری دفعہ قریش کے رئیسوں نے خود آنحضرت ﷺ سے مل کر گفتگو کی اور کہا کہ "اے محمد! تمہارے سوا کسی قوم میں ایسا آدمی نہیں ملا جو اپنی قوم پر مصیبت لایا ہو جو تم لائے ہو، تم نے باپ داداؤں کو برا کہا، ہمارے مذہب کی تحقیر کی، دیوتاؤں کو گالی دی، ہم کو بے وقوف اور نادان بنایا اور جماعت میں تفرقہ ڈالا غرض کوئی برائی نہ تھی جو تم نے ہمارے ساتھ نہیں کی۔" (۱)

(۱) یہ تمام واقعات ابن اسحاق اور سیرت کی تمام کتابوں میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔ (ملاحظہ ہو سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۵۲ مطبوعہ مصر)

ان الزامات کی فہرست ایک ایک دفعہ پڑھو، معلوم ہوگا کہ آبائی دین، موروثی رسم ورواج اور خاندانی دیوتاؤں کی غلامی سے آزاد ہونا ان پر کتنا بار تھا اور وہ اس جرم کو کتنا سنگین سمجھتے تھے، موسم حج میں آنحضرت ﷺ جب لوگوں کے پاس جا جا کر توحید کا پیغام سناتے تھے تو ابولہب آپ ﷺ کے اثر کو باطل کرنے کے لئے آپ ﷺ کی تقریر کے بعد آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے صرف یہ کہتا جاتا تھا، لوگو! یہ وہی ہے جو تم کو تمہارے باپ دادوں کے مذہب سے برگشتہ کرتا پھرتا ہے۔(۱)

ابوطالب جنہوں نے ہر موقع پر آنحضرت ﷺ کی حمایت کی تھی اور وہ آپ کو اپنے جان و دل سے زیادہ عزیز رکھتے تھے وہ بھی آپ کی دعوت حق کو اپنے دین آبائی کے مقابلہ میں پذیرائی کے قابل نہ سمجھے، بھتیجے نے بار بار کہا ''چچا جان، کلمۂ شہادت ایک دفعہ پڑھ لیجئے کہ قیامت میں آپ کی شفاعت کی ایک سند مجھے ہاتھ آجائے۔'' ابوطالب نے جواب دیا'' جانِ پدر! سب کچھ تم پر نثار لیکن بزرگوں کے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتا۔'' عین اس وقت جب ابوطالب دنیا سے رخصت ہورہے تھے اور نزع کی حالت تھی آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ ''چچا جان! اب تو لا الہ الا اللہ کہہ دیجئے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں'' ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ نے جو ان کے پاس بیٹھے تھے کہا ''ابوطالب کیا تم (اپنے باپ) عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے'' آپ ﷺ بار بار لا الہ الا اللہ پڑھنے کی درخواست کرتے تھے اور یہ دونوں ان کو وہی عبدالمطلب کے دین سے علاحدگی پر شرم دلاتے تھے بالآخر ابوطالب نے یہی کہا کہ ''میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں'' اور لا الہ الا اللہ نہیں کہا۔ صحیح بخاری کی روایت ہے(۲)۔ صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے کہ ابوطالب نے کہا کہ بھتیجے! جو فقرہ تم کہتے ہو میں کہہ کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا لیکن قریش کہیں گے کہ ابوطالب موت سے ڈر گیا (۳)، ابن اسحاق میں ہے کہ انہوں نے آہستہ آہستہ وہ فقرہ کہہ دیا (۴)، بہرحال اس واقعہ سے جو دکھانا ہے وہ یہ ہے کہ اس حالت میں بھی مخالفین کے پاس اسلام سے باز رکھنے کے لئے اس سے زیادہ پرزور اور پر اثر دلیل نہ تھی کہ ابوطالب کیا آبائی مذہب کو چھوڑ دو گے؟ اس سے معلوم ہوگا کہ

---

(۱) مستدرک حاکم جلد اص ۱۵ کتاب الایمان (۲) کتاب الجنائز باب اذ قال المشرک عند الموت لا الہ الا اللہ ج اص ۱۸۱ (۳) صحیح مسلم کتاب الایمان، باب اول الایمان قول لا الہ الا اللہ ج اص ۳۰-۳۱ (۴) ابن ہشام، وفات ابی طالب، ذکر الاسراء والمعراج ج اص ۲۵۳

اسلام کی اشاعت کے راستہ میں یہ تخیل کتنا بڑا پتھر تھا۔

توہم پرستی: عرب کی اصلاح وہدایت کی راہ میں ایک اور عائق عرب کی توہم پرستی تھی، ہر قوم میں جاہلوں کا جس طرح یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ فلاں دیوتا یا فلاں پیر کے خلاف اگر کچھ زبان سے نکلا تو فوراً بلائیں آکر ہم کو لپٹ جائیں گی، عرب میں گھر گھر سیکڑوں بت اور بیسیوں صنم خانے تھے، دنیا کے تمام کام ان ہی اصنام اور بتوں سے متعلق سمجھے جاتے تھے، مدتوں سے یہ خیال راسخ چلا آتا تھا کہ فلاں بت کی پرستش یا خدمت گذاری میں اگر کوتاہی کی گئی تو آسمان سے پانی برسنا بند ہو جائے گا، فرزندِ نرینہ پیدا نہ ہوگا، باغوں میں پھل نہ آئیں گے، اسی بناپر اسلام کے نام سے ان کو لرزہ آتا تھا اور یہ تخیل صرف اسی وقت پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ ایک مدت سے عرب میں چلا آتا تھا، حضرت ہودؑ کی دعوت کے جواب میں ثمود نے کہا:

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰکَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ (۱) — ہم تو اس کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے کہ ہمارے کسی دیوتا نے تم کو آکے ستایا ہے۔

(ھود ۱۱:۵۴)

ابتداءً جب آنحضرت ﷺ نے بتوں کے خلاف وعظ کہنا شروع کیا تو اکثر لوگوں نے (نعوذ باللہ) پاگل سمجھ لیا (۲)، جاہلیت کے زمانہ کے بعض کافر احباب ہمدردی کی راہ سے جھاڑ پھونک کرنے آئے (۳)، ضمام بن ثعلبہؓ ایک صحابی تھے وہ مسلمان ہو کر اپنے قبیلہ میں جب واپس گئے اور لات وعزی کی مذمت شروع کی تو تمام قبیلہ خوف سے کانپ گیا کہ ''ضمام ان کو برا نہ کہو دیکھو کہیں تم کو برص، جنون یا جذام نہ ہو جائے'' (۴)، حضرت زنیرہ رضی اللہ عنہا مسلمان ہونے کے بعد بصارت سے محروم ہو گئی تھیں، کفار نے کہنا شروع کیا کہ ''لات وعزیٰ نے ان کو اندھا کر دیا ہے۔'' (۵) حضرت طفیلؓ بن عمرو دوسی مسلمان ہو کر جب اپنے وطن تشریف لے گئے اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا ''دیکھو ذوالشری (بت) کہیں برباد نہ کردے۔'' (۶)

---

(۱) ابن کثیر تفسیر سورہ ہود (آیت مذکور ج ۲ ص ۴۴۹ زمخشری ج ۱ ص ۶۱۷ مطبع لیسی کلکتہ ۱۸۵۶ء، ابن حیان ج ۵ ص ۲۳۳ مطبع السعادۃ مصر ۱۳۲۸ھ، بغوی وغیرہ تمام مفسرین نے لکھا ہے۔ (۲) دیکھو تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۰۲ آیت بِنِعْمَةِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ ونیز مَابِصَاحِبِهِمْ مِنْ جِنَّةٍ (۳) صحیح مسلم کتاب الجمعہ باب تخفیف الصلوٰۃ و الخطبۃ ج ۱ ص ۳۱۹-۳۲۰ (۴) مسند دارمی کتاب الصلوٰۃ باب فرض الوضوءِ والصلاۃ ص ۸۸-۸۹ مطبع نظامی کان پور ۱۲۹۳ھ (۵) اسد الغابۃ ترجمہ حضرت زنیرہؓ ج ۵ ص ۴۶۲ وسیرۃ ابن ہشام ذکر عدوان المشرکین علی المستضعفین الخ ج ۱ ص ۱۹۵ (۶) اسد الغابۃ ذکر طفیل بن عمرو دوسی ج ۳ ص ۵۴ وسیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۳۳

فتح مکہ کے بعد جب کہ دیوتاؤں کے زور وقوت کا راز افشا ہو چکا تھا اور اکثر قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا، تاہم لات، عزیٰ، مناۃ، ذی الکفین، سواع کے بت خانوں کو وہ اپنے ہاتھ سے نہ توڑ سکے، خاص مدینہ سے راسخ الایمان مسلمان بھیجے گئے، جنہوں نے اس فرض کو انجام دیا، پجاریوں نے کوئی مزاحمت نہ کی وہ سمجھتے تھے کہ ان دیوتاؤں کو کون توڑ سکتا ہے جو اس گستاخی کا ارادہ کرے گا وہ خود تباہ و برباد ہو جائے گا۔(۱)

توہم پرستوں میں کسی مذہب کی صحت و بطلان کی دلیل شواہد عقلی نہیں بلکہ دنیا کے ظاہری مادی فوائد اور جانی و مالی خیر و برکت ہوتی ہے لیکن قوانین گاہِ عالم میں ایک مذہب پرست بھی اسی طرح آلام و مصائب میں گرفتار ہو سکتا ہے جس طرح ایک غیر مسلمان، عرب کے بدو اور اعراب ابتداءً مسلمان ہونے کی ہمت بھی کرتے تھے تو معاً یہ توقع بھی کر لیتے تھے کہ اب وہ ہر قسم کے آفاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ ہیں، اس بنا پر اگر کبھی ان کی اس توقع کو صدمہ پہنچتا تو دفعتاً وہ متزلزل ہو جاتے تھے، صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے:(۲)

کان الرجل يقدم المدينة فان ولدت امرأته غلاما ونتجت خيله قال هذا دين صالح وان لم تلد امرأته ولم تنتج خيله قال هذا دين سوء.	باہر کا جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ میں آتا تھا اس کی یہ حالت تھی کہ اگر اس کی بیوی لڑکا جنتی اور اس کی گھوڑی بچہ دیتی تو وہ کہتا کہ یہ نہایت عمدہ مذہب ہے لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کہتا کہ یہ نہایت برا مذہب ہے۔

قرآن مجید کی یہ آیت اسی قسم کے لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہے(۳):

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۞ (حج ۲۲:۱۱)	اور بعض لوگ وہ ہیں جو خدا کی بندگی کنارہ کھڑے ہو کر کرتے ہیں (یعنی دل سے نہیں کرتے) اگر ان کو فائدہ پہنچا تو ان کو اطمینان ہو جاتا ہے لیکن اگر مبتلائے مصیبت ہوئے تو فوراً روبرگشتہ ہو جاتے ہیں۔

ہجرت کے بعد جب مسلمان مدینہ آئے اور اتفاق سے ایک عرصہ تک کسی مسلمان گھرانے

(۱) ابن سعد جز ثانی قسم اول ص ۹۹ وطبری ذکر ہدم اصنام ج ۳ ص ۱۶۴۸ (۲) تفسیر سورہ حج جلد ثانی ص ۶۹۴۔
(۳) صحیح بخاری ج ۲ تفسیر سورہ حج صفحہ مذکور۔

میں کوئی لڑکا نہ پیدا ہوا تو دشمن اس واقعہ کو اپنی بددعاؤں کا نتیجہ سمجھتے تھے اور خوش ہوتے تھے، آخر چھ مہینے کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ پیدا ہوئے تو مسلمان بے انتہا مسرور ہوئے۔(۱) سوءِ اتفاق یہ کہ اول اول جو لوگ مدینہ میں آتے تھے ان کو وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی تھی، ابتدائے ہجرت میں جب حضرت ابوبکرؓ و حضرت بلالؓ آئے تو سخت بیمار ہو گئے۔(۲)

حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ نے جب مدینہ کو ہجرت کی تو ان کو بھی مدینہ کی آب و ہوا ناموافق ہوئی(۳)، اگرچہ مخلصین اور اربابِ فہم پر اس قسم کی عارضی ناگواریوں کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا، تاہم عام لوگ جن کی وہم پرستی فطرتِ ثانیہ ہوگئی تھی، وہ اس قسم کے اتفاقی واقعات سے بے حد متاثر ہوتے تھے، چنانچہ جب عکل و عرینہ کے چند لوگوں نے مدینہ میں آکر اسلام قبول کیا اور آب و ہوا کی ناموافقت کے سبب سے بیمار ہو گئے اور آنحضرت ﷺ نے تبدیل آب و ہوا کی غرض سے ان کو اونٹوں کی چراگاہ میں بھیج دیا تو گو وہ صحیح ہو گئے تاہم مرتد ہو گئے(۴)، اسی طرح ایک بدو نے آکر آپ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی لیکن سوءِ اتفاق سے دوسرے دن بخار میں مبتلا ہوا تو اپنی بیعت توڑنی چاہی آپ ﷺ نے تین بار منع فرمایا لیکن اس کے اصرار سے آخر بیعت فسخ کر دی اور فرمایا(۵):

المدینة کالکیر تنفی خبثها و تنصع طیبها.	مدینہ آگ کی بھٹی ہے جو میل کو الگ کر دیتا ہے اور حقیقی جوہر کو خالص کر دیتا ہے۔

ان ہی اسباب کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے مدینہ کے متعلق یہ دعا فرمائی:

اللّٰهم حبب الینا المدینة کحبنا مکة او اشد اللّٰهم وصححها وبارک لنا فی مدها وصاعها وانقل حماها فاجعلها بالجحفة (۶)	خداوندا مکہ کی طرح یا اس سے زیادہ ہمارے لئے مدینہ کو محبوب بنادے، اس کو امراض سے صحیح کر دے، اس کے پیمانے میں برکت دے اور اس کے بخار کو جحفہ میں منتقل کر دے۔

(۱) مستدرک حاکم جلد۳ ص ۵۴۷ ذکر عبداللہ بن زبیر و اصابہ ذکر عبداللہ بن زبیر ج۴ ص ۶۹ (۲) صحیح بخاری کتاب المرضی باب عیادة النساء الرجال ج۲ ص ۸۴۴ و باب مقدم النبی ﷺ المدینة ج۱ ص ۵۵۸ (۳) صحیح مسلم کتاب الایمان باب الدلیل علی ان قاتل نفسه لایکفر ج۱ ص ۵۸ (۴) صحیح بخاری کتاب المحاربین ج۲ ص ۱۰۰۵ (۵) بخاری ج۱ ص ۲۵۳ کتاب فضائل المدینہ باب المدینة تنفی الخبث (۶) صحیح بخاری باب مقدم النبی ﷺ المدینة ج۱ ص ۵۵۸-۵۵۹

قبائل کی خانہ جنگیاں: اسلام کی اشاعت کا ایک بڑا مانع عرب کی باہمی خانہ جنگیاں تھیں، جو عرب کے خصائصِ قومی کا عنصرِ اعظم بن گئی تھیں، یہ خانہ جنگیاں ہزاروں برس سے چلی آتی تھیں اور ان کی وجہ سے قبائل میں ایسے مستمر اور ثابت الاساس انتقامی جذبات پیدا ہو گئے تھے جن کا مٹنا قریباً محال تھا، ان ہی لڑائیوں نے ثار (انتقام خون) کی رسم پیدا کر دی تھی، جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، یہ رسم ایسی سخت اور شدید الاثر تھی کہ ایک شخص کے خون کے لئے قبیلہ کا قبیلہ مٹ جاتا تھا، ہزاروں برس کے خون قومی قرض کی طرح باقی چلے آتے تھے جو درج رجسٹر ہوتے چلے آتے تھے اور بچہ بچہ کی زبان پر ہوتے تھے، جو بچہ پیدا ہوتا تھا وہ ہوش سنبھالنے کے وقت سب سے پہلے ثار کا لفظ سنتا تھا، یعنی خاندان میں فلاں شخص قتل کیا گیا ہے اور اس کے خون کا انتقام اب تک باقی ہے، اس لئے بچہ بچہ کا نصب العین ابتدائے زندگی سے یہی ثار ہوتا تھا۔

اس بنا پر ایک شخص یا ایک خاندان جس خلوص اور عقیدت مندی کے ساتھ اسلام کی طرف جھکتا تھا معاً اسی زور اور قوت کے ساتھ دوسرا فریق اسلام کی مخالفت اور اس سے سرکشی پر آمادہ ہو جاتا تھا، مکہ میں اسلام کی مخالفت کا صرف یہی راز تھا کہ خدا نے نبوت کے لئے ہاشم کا گھرانہ چن لیا تھا، بنوامیہ کی مخالفت اس کے لئے لامحالہ بنی ہوئی تھی۔

مدینہ میں اوس وخزرج دو قبیلے تھے، اسلام سے پہلے دونوں لڑلڑ کر تھک گئے تھے، اسلام کی آواز آئی تو گو دونوں نے ایک ساتھ لبیک کہا تاہم قبیلہ اوس کا ایک ایک فرد اگر ہمہ تن اخلاص و جوش تھا تو خزرج میں بیسیوں منافق تھے، انتہا یہ ہے کہ یہ ابتدائے اسلام میں ہجرت سے پہلے دونوں قبیلوں کی نماز کی امامت کے لئے باہر سے ایک تیسرے قبیلہ کا آدمی بلوایا تھا کہ خدا کے سامنے بھی ایک کو دوسرے کے پیچھے کھڑے ہونے سے عار تھا۔(۱)

خزاعہ اور بنوبکر باہم شدید دشمن تھے اور ان میں باہم پرانی عداوت چلی آتی تھی، مدینہ آنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کو صلح کا پیام اور اسلام کی دعوت دی، خزاعہ نے اسلام کی دعوت قبول کی، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنوبکر قریش کے حلیف بن گئے۔

خوب غور کرو انصار اسلام لا کر ہمہ تن نیکو کاری اور پاکیزہ نفسی کے پیکر بن گئے لیکن ثار کے

---

(۱) ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ عرض رسول اللہ نفسہ علی القبائل ج ا ص ۲۶۱

جذبات کس طرح آسانی سے دفعتاً مشتعل ہو جاتے تھے، ایک موقع پر ایک یہودی نے جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑ دیا تو انصار کے دونوں قبیلوں (اوس وخزرج) کی تلواریں میان سے نکل آئیں (۱) اور بڑی مشکل سے آنحضرت ﷺ نے ان کے جوش کو فرو کیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعۂ افک میں جب آنحضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر اس کی شکایت کی اور حضرت سعد بن معاذؓ نے کہا یا رسول اللہ اگر وہ (تہمت لگانے والا) ہمارے قبیلہ کا ہے تو میں اس کی گردن اڑا دیتا ہوں اور اگر ہمارے بھائی خزرج کے قبیلہ سے ہے تو آپ ﷺ حکم دیں میں بجالاؤں گا، اس پر سعد بن عبادہؓ جو قبیلہ خزرج کے رئیس تھے دفعتاً کھڑے ہو گئے اور کہا:

كذبت لعمر الله لاتقتله ولاتقدر على قتله	خدا کی قسم تو جھوٹ کہتا ہے تو اس کو قتل نہ کرے گا، نہ کر سکتا ہے،
ولو كان من رهطك ما احببت ان يقتل.	اور وہ شخص اگر تیرے قبیلہ کا ہوتا تو تو اس کو قتل کیا جانا پسند نہ کرتا۔

اس پر اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے، چنانچہ صحیح بخاری حدیث افک میں ہے:

فثار الحيان الاوس والخزرج حتى هموا ان يقتتلوا ورسول الله قائم على المنبر. (۲)	پس دونوں قبیلے اوس وخزرج مشتعل ہو گئے یہاں تک کہ دونوں کشت وخون پر آمادہ ہو گئے اور آنحضرت ﷺ منبر پر کھڑے تھے۔

ایک بار محلم بن جثامہ لیثی نے عہد اسلام میں قبیلۂ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر ڈالا آنحضرت ﷺ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا، قبائل کے تعلقات کی بنا پر عیینہ نے مقتول اور اقرع بن حابس نے قاتل کی طرف سے وکالت کی، بات بڑھی اور سخت شوروشغب ہوا تو آپ ﷺ نے عیینہ سے فرمایا "دیت کیوں نہیں قبول کر لیتے" اس نے کہا خدا کی قسم اس وقت تک دیت نہ قبول کروں گا جب تک اس کی بیویوں کو اس قدر نہ ستالوں جس قدر اس نے ہماری بیویوں کو ستایا ہے، اس پر اور شوروغل ہوا آپ ﷺ نے پھر یہی الفاظ فرمائے اور عیینہ نے وہی پہلا جواب دیا، چوں کہ یہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا اور قتل کا یہ پہلا مقدمہ تھا جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تھا، اس لئے قبیلۂ بنولیث کے ایک شخص نے جو

---

(۱) اصابہ ج اص ۸۸ مطبوعہ مصر تذکرہ اوس بن قبطی، معجم صغیر طبرانی میں بھی ایک اور اسی قسم کا واقعہ مذکور ہے، معجم عبداللہ ص ۱۲۴ مطبع انصاری دہلی ۱۳۱۱ھ۔ (۲) صحیح بخاری کتاب المغازی باب حدیث الافک ج اص ۵۹۵۔

اسلام قصاص کو دیت سے بدل دینا چاہتا ہے اور چوں کہ دلوں میں اب تک انتقام کے جذبات تازہ ہیں اور لوگ دیت لینا پسند نہیں کرتے اس لئے ان کو اسلام کے قبول کرنے میں تامل ہوگا لیکن آنحضرت ﷺ چوں کہ سفر میں تھے اس لئے دیت میں پچاس اونٹ اسی وقت دیے اور مدینہ پہنچ کر پچاس اونٹ کا وعدہ فرمایا۔(۱)

اہلِ عرب میں یہ جذبہ اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ گو آپ ﷺ نے فتحِ مکہ میں امنِ عام کی منادی کر دی اور تلوار کے میان میں کر لینے کا حکم دیا تاہم انتقام کا جوش اب تک تازہ تھا۔

قبیلۂ ہذیل کا ایک شخص اسلام لانے کی غرض سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جا رہا تھا اس نے زمانۂ جاہلیت میں قبیلۂ خزاعہ کا کوئی جرم کیا تھا اور وہ لوگ انتقام کے لئے اس کو ڈھونڈ رہے تھے، سوءِ اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا اور ان لوگوں نے اس کو فوراً قتل کر دیا کہ اگر بارگاہِ نبوت میں پہنچ گیا تو پھر اس کا موقع ہاتھ نہ آئے گا، آپ ﷺ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئے، ان لوگوں نے حضرت عمرؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ سے سفارش کی درخواست کی، آنحضرت ﷺ نے نماز کے بعد ایک خطبہ دیا جس کے الفاظ یہ تھے:

"خدا نے مکہ کو دارالحرام بنایا ہے آدمیوں نے نہیں بنایا ہے، خدا نے کل چند گھنٹوں کے لئے اس کو میرے لئے حلال کر دیا تھا لیکن آج اس کی قدیم حرمت دوبارہ لوٹ آئی ہے اور خدا کے سب سے نافرمان بندے تین آدمی ہیں ایک وہ جس نے حدودِ حرم میں کسی کو قتل کیا، دوسرا وہ جس نے اپنے قاتل کے سوا کسی دوسرے شخص کو مار ڈالا، تیسرا وہ جس نے زمانۂ جاہلیت کا انتقام لیا، تم نے جس شخص کو قتل کر ڈالا ہے میں اس کی دیت دوں گا۔"

چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی دیت ادا فرمائی۔(۲)

بنو ثعلبہ کے ایک آدمی نے جاہلیت میں اوس وخزرج کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا، بنو ثعلبہ

(۱) ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۸ کتاب الدیات مطبع کستلیہ ۱۲۸۰ھ (۲) مسند امام احمد بن حنبل ج ۴ ص ۳۱ و ۳۲

اسلام لاکر جب مدینہ آئے تو آنحضرت ﷺ خطبہ دے رہے تھے ایک انصاری بے اختیار چلا اٹھے کہ یارسول اللہ ﷺ یہ ہمارے مجرم ہیں ان سے قصاص دلوایئے آنحضرت ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا:

الالایجنی والد علی ولدہ. (۱) یعنی لڑکے کا جرم کا بدلہ باپ سے نہیں لیا جائے گا۔

ان واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ثار کا جذبہ کس طرح رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا اوراس جذبہ کا مشتعل ہوجانا کس قدر آسان ہوتا تھا۔

خانہ جنگیوں پر ختم نہیں، یوں بھی تمام قبائل رقیب اور حریفِ مقابل تھے، دومختلف قبیلوں کے آدمیوں میں کسی ذاتی معاملہ پر بھی نزاع ہوجاتی تھی اوران میں کوئی اپنے قبیلہ کا نام پکارتا تھا، تو قومی جنگ کا سامان ہوجاتا تھا، ایک دفعہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مار دیا، انصاری نے یاللانصار (انصار کی دہائی) پکارا، مہاجر نے بھی یاللمہاجرین کا نعرہ مارا، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ نے نکل کر فرمایا کہ یہ کیا جہالت کی پکار ہے:

ما بال دعوی الجاھلیة (۲)

یہ کیا جہالت کا دعویٰ ہے۔

لوگوں کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعلِ شنیع کا سخت دشمن ہے اس لئے جب تک وہ اپنا انتقام نہ لے لیتے ان کو اسلام لانے میں تامل ہوتا تھا، عمرو بن اقیش ایک صاحب تھے وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام سے متاثر اوراس کے قبول کرنے کے لئے ہر طرح آمادہ تھے لیکن ایک عائق تھا جو اس راہ میں حائل تھا، یعنی ثار، وہ جانتے تھے کہ اسلام لاکر اس خاندانی فرض کے ادا کرنے کی ان کو اجازت نہیں مل سکتی، ابن مندہ نے ان کے حال میں لکھا ہے:

وکان له ثار فی الجاھلیة وکرہ ان یسلم حتی یاخذہ. (۳)

ان کا انتقام زمانہ جاہلیت میں باقی رہ گیا تھا جب تک وہ نہ لے لیں انہوں نے مسلمان ہونا پسند نہ کیا۔

اسی طرح حضرت عمرو بن مالکؓ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اسلام لاکر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو قبیلہ والوں نے کہا، بنوعقیل پر ہمارا ثار (انتقام) باقی ہے وہ لے لیں تو اسلام لائیں چنانچہ انہوں نے اسی وقت بنوعقیل پر جو مسلمان ہو چکے تھے حملہ کیا

---

(۱) دار قطنی ج ۲ کتاب البیوع ص ۳۰۸ (۲) صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۹۹ کتاب المناقب باب ماینھی عنه من دعوة الجاھلیة (۳) اسد الغابہ ج ۴ ص ۸۵

اور اس فرض سے سبک دوش ہوئے۔(۱)

سیاسی مشکلات: جہالت، وحشت، پابندیِ رسوم، آبائی اثر وغیرہ وغیرہ ان میں سے ایک چیز بھی مانع اصلاح نہ ہوتی تاہم صرف سیاسی اسباب ایسے جمع تھے کہ قریش یا دیگر قبائلِ عرب کبھی اسلام کے آگے سر نہیں جھکا سکتے تھے، مکہ میں دو خاندان برابر کے رقیب تھے، امیہ اور ہاشم اور آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے امیہ کا پلۂ ترجیح علانیہ گراں ہو چکا تھا، آنحضرت ﷺ نے جب نبوت کا اظہار کیا تو سب سے پہلے امیہ کے خاندانوں نے سرکشی کی اور فتح مکہ تک یہی خاندان تھا جو تمام لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا علم بردار تھا، بنوامیہ کے بعد اور خاندان تھے اور وہ بھی حرم کے مناصبِ دہ گانہ (رفادہ وغیرہ) کے ممتاز حصہ دار تھے، ان میں سے ہر ایک دیکھ رہا تھا کہ اس جدید انقلاب میں ان فوائد اور اقتدار کا بالکل خاتمہ ہے، ابوجہل سے جب ایک شخص نے کہا کہ ''محمد کی دعوتِ اسلام کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے۔'' تو اس نے صاف کہا کہ میں کیا کہوں محمد کے خاندان نے عزت و شرف میں برتری کا دعویٰ کیا اور ثبوت میں دعوتیں کھلائیں، اسی کے جواب میں ہم نے اسی شان کی دعوتیں دیں، انہوں نے خون بہا دیے ہم نے بھی دیے، انہوں نے زرپاشیاں کیں ہم نے بھی کیں، ہم دونوں دوش بدوش ہو چکے تھے کہ دفعتاً ان کی طرف سے یہ دعویٰ پیش ہوا کہ ہمارے خاندان میں نبوت اور آسمان سے وحی بھی آگئی، اب ہم کہاں تک برداشت کریں، خدا کی قسم ہم کبھی محمد پر ایمان نہیں لاسکتے۔''(۲) یہی ابوجہل جب انصار کے ہاتھ سے قتل ہوا تو اس نے مرتے وقت حسرت سے کہا کہ کاش مجھ کو کاشت کاروں کے سوا کسی اور قوم نے قتل کیا ہوتا۔(۳)

خوب غور سے دیکھو بدر، احد، حمراء الاسد، احزاب وغیرہ تمام لڑائیوں میں یہی اموی عنصر تھا جو کام کر رہا تھا، قریش کے قبیلہ سے باہر جو بڑے بڑے قبیلے تھے، مثل غطفان، اسد وغیرہ وہ یا اہلِ مکہ ہی کے خاندان کی کوئی شاخ تھی، یا قریش کے حلیف و ہم عہد تھے، خیبر میں یہود تھے جو قوم کے لحاظ سے قریش سے الگ تھے لیکن عرب تجارتی حیثیت سے تمام تر ان ہی کے زیر بار تھے، ان ہی سے قرض دام لیتے تھے ان ہی کے ہاں مال و متاع رہن رکھتے تھے(۴)، خیبر اور غطفان ایک مدت دراز سے

(۱) اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر عمرو بن مالک بن قیس ج ۳ ص ۱۳ مطبع سعادہ مصر ۱۳۲۸ھ (۲) ابن ہشام حصہ اول ص ۱۹۳، اسلام حمزہ مطبوعہ مصر (۳) صحیح بخاری کتاب المغازی باب قتل ابی جہل ج ۲ ص ۵۶۵ (۴) طبری واقعہ خیبر ج ۳ ص ۱۵۷۵ و مابعد۔

باہم حلیف تھے اس طرح مکہ سے لے کر خیبر اور نجد تک ایک سلسلہ اتحاد میں مربوط تھا۔

کعبہ تمام عرب میں قبلہ گاہِ اعظم تھا، ہر سال تمام ملک حج کرنے کے لئے آتا تھا اور آستانۂ کعبہ پر سر جھکاتا تھا، کعبہ کے مجاور معمولی پنڈوے نہ تھے بلکہ خیمہ وخرگاہ، تیغ و سپر، جاہ وحشم غرض ریاست وامارت کے تمام سروسامان رکھتے تھے اس لئے تمام عرب میں ان کی شہنشاہی قائم تھی، یہی بات ہے کہ جب تک مکہ فتح نہیں ہوا اسلام چین سے نہیں بیٹھ سکا لیکن اسلام کی مخالفت صرف قریش کی متابعت تک محدود نہ تھی بلکہ بڑا سبب یہ تھا کہ اسلام سے خاص قریش کو جو نقصان پہنچ سکتا تھا براہ راست وہی تمام روسائے قبائل کو پہنچتا تھا، عرب کا ملکی نظام یہ تھا کہ تمام ملک میں قبائل پھیلے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک رئیسِ اعظم ہوتا تھا جو تمام قبیلہ پر حکم راں ہوتا تھا اور مالِ غنیمت سے چوتھ وصول کرتا تھا جس کو مرباع کہتے تھے، اس کے علاوہ غنائم میں سے جو عورت یا اور کوئی عمدہ چیز اس کو پسند آتی تھی اس کو چھانٹ لیتا تھا، اس کا نام صفی تھا، یہ گویا چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں، یہ ریاست خاندانی اصول پر چلتی تھی، باپ کے مرنے کے بعد بیٹا رئیس منتخب ہوتا تھا، قبیلہ کے تمام معاملات، ذاتی نزاعیں، قصاص یا خون بہا کے فیصلے سب، رئیس کے ہاتھ سے فیصل ہوتے تھے، یہ روسا عام قوم سے بہت سے حقوق میں ممتاز ہوتے تھے۔

قبائل میں یہی امتیازِ مراتب تھا کہ جو قبائل زیادہ شریف مانے جاتے تھے ان میں سے ایک آدمی کو اگر کوئی دوسرا قبیلہ قتل کر دیتا تھا تو اس کا خون دوسرے قبیلہ کے دو خون کے برابر سمجھا جاتا تھا اور اس لئے ایک کے بدلہ میں دو کو قتل کرتے تھے، یہ امتیاز اور فرقِ مراتب اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جب غزوۂ بدر میں قریش کی فوج میں سے عتبہ وشیبہ میدان میں آئے اور مبارز طلب ہوئے اور انصار ان کے مقابلہ کو نکلے تو عتبہ نے اس بنا پر ان کے مقابلہ سے انکار کر دیا کہ قریش اور انصار کا جوڑ نہیں۔(۱)

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جبلۃ بن الایہم خاندان غسان کا اخیر فرماں روا اسلام لایا اور مکہ میں آیا، ایک دن طواف میں اس کی چادر کسی شخص کے پاؤں کے نیچے آگئی، جبلہ نے اس کے گال پر تھپڑ کھینچ مارا، اس نے بھی برابر کا جواب دیا، جبلہ نے حضرت عمرؓ کے پاس جا کر شکایت کی، حضرت عمرؓ نے واقعہ سن کر کہا اس کا کیا قصور ہے، تم نے جو کیا اس کی جزا پائی، جبلہ نے کہا میرا یہ رتبہ ہے

(۱) ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی المبارزۃ ج ۱ ص ۲۶۴ مکتبہ کستلیہ مصر و سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۲۰ (طبع جدید ۹۶ء)

کہ کوئی مجھ پر ہاتھ اٹھاتا تو قتل کر دیا جاتا، حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہاں زمانۂ جاہلیت میں یہی قاعدہ تھا لیکن اسلام نے اس کا خاتمہ کر دیا، جبلہ نے کہا جو مذہب شرفا کو ذلیل کر دیتا ہے میں اس سے باز آتا ہوں یہ کہہ کر چوری سے روم چلا گیا اور عیسائی ہو گیا۔(۱)

عرب کا ہر رئیسِ قبیلہ درحقیقت جبلہ تھا اور اسلام قبول کرنے کے وقت اس کو یہی منظر نظر آتا تھا، اسلام ان تمام واقعات اور خصوصیات کو مٹاتا تھا، اس کے دربار میں شاہ و گدا، رئیس و عامی، شریف و حقیر کا ایک درجہ تھا، اس لئے عرب میں تمام رؤسائے قبائل کو صاف نظر آتا تھا کہ اسلام کا پھیلنا ان کے ہر قسم کے فخر و امتیاز کا مٹ جانا ہے۔

عرب میں ایک دوسری حریف طاقت یہودیوں کی تھی جو حجاز سے لے کر شام کے دروازوں تک پھیلے تھے، ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے مضبوط قلعے تھے، فنِ جنگ سے واقف تھے، سامان و اسلحہ وافر رکھتے تھے، دولت کی بہتات تھی، باغوں اور زمینوں پر ان کا قبضہ تھا، عرب کے تمام مادی ذرائعِ معاش کے وہ تنہا اجارہ دار تھے، پھر اسلام آیا تو اس طرح کہ اس نے یہودیوں کی ایک ایک برائی کو طشت از بام کیا اور ان کے مذہبی وقار کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا، اس لئے انہیں صاف نظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں جڑ پکڑ کر ان کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دے گی، چنانچہ قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع اور یثرب، خیبر، فدک، تیما، وادی القریٰ وغیرہ کے یہودی زمین دار سوداگر، مہاجن اور قلعہ نشین دل سے چاہتے تھے کہ اس قوت کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں اور آخر لڑائیاں پیش آئیں اور دین توحید کے مقابلہ میں انہوں نے اہل شرک کا ساتھ دے کر خندق واحزاب وغطفان کے معرکے پیش کیے، عرب کے مختلف قبیلوں اور سرحدی صوبوں پر ایران اور روم کی سلطنتیں فرماں روائی کرتی تھیں، عراق، یمن اور بحرین پر ایران کی حکومت تھی اور حجاز کے شامی حدود پر قیصر کا قبضہ تھا، عرب کے مختلف ہم سایہ قبیلے ان ہی دو میں کسی ایک سلطنت کی حفاظت کا دم بھرتے تھے اور یہ دونوں سلطنتیں اس بیچ کے سرحدی ملک کی ایک ایک حرکت اور جنبش پر نظر رکھتی تھیں، اس لئے اس ملک میں ایک اتنی بڑی عظیم الشان تحریک کا قوت پکڑنا، ان کو کسی طرح پسند نہیں آسکتا تھا، اسی لئے عرب میں اسلام کی قوت کا ان کو جب احساس ہوا تو انہوں نے اس کی دار و گیر کرنی چاہی، کسریٰ

(۱) الفاروق حصہ دوم ص ۲۱۸ و ۲۱۹۔

ایران نے یمن کے اپنے ایرانی گورنر کو لکھا کہ اس نئے مدعی کو پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کرو اور قیصر نے تو کھلم کھلا حملہ کی تیاری ہی کر دی تھی، جس کے باعث تبوک کی فوج کشی ہوئی اور آخر آنحضرت ﷺ کے بعد اسلام کو ان دونوں ہم سایہ طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

ذریعۂ معاش: اسلام لانے کا ایک بڑا مانع یہ تھا کہ عرب کا ذریعۂ معاش عموماً قافلوں پر حملہ آوری اور سلبِ اموال اور رہ زنی تھا، اوپر ہم امالی قالی سے نقل کر آئے ہیں کہ عرب کا ذریعۂ معاش غارت گری تھا اور چوں کہ حج کے چار مہینوں میں جنگ و غارت سے باز رہنے میں ان کے ذرائعِ معاش مسدود ہو جاتے تھے اس ضرورت سے وہ حج کے مہینوں کو ادل بدل کر لیا کرتے تھے۔

اندرونی عرب تمام تر دشت وصحرا اور بالکل ویرانہ ہے، زراعت یا تجارت کی کوئی صورت نہیں، باوجود اس کے لاکھوں نفوس آباد ہیں، اس لئے ان کو غارت گری کرنی پڑی اور امتدادِ زمانہ سے یہ عادت ان میں راسخ ہوگئی تھی، رفتہ رفتہ ٹھگی، رہ زنی اور سرقہ تمام ملک میں پھیل گیا تھا، یہاں تک کہ بڑے بڑے نام ور شعرا چور اور رہ زن ہوتے تھے۔

اکثر بڑے بڑے جتھے اس لئے قائم ہوتے تھے کہ بنجارے جو ملک میں پھر کر غلہ کی تجارت کرتے تھے ان کو لوٹ لیا کریں، آنحضرت ﷺ نے دومۃ الجندل پر جو سریہ بھیجا تھا اسی کے انسداد کی غرض سے بھیجا تھا، دومۃ الجندل مدینہ منورہ سے پندرہ منزل کے فاصلہ پر ہے تاہم یہ لوگ اس قدر فاصلہ سے خود مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تدبیر کر رہے تھے کہ آپ ﷺ کو خبر ہوگئی اور حفظ ماتقدم کے لئے خود وہاں تک گئے اور چند روز قیام کر کے ان اطراف کا بندوبست کیا۔(۱)

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اسلام لانے سے پہلے چند شخصوں کو قتل کر کے ان کا مال چھین لیا تھا، چنانچہ جب اسلام لائے اور اس واقعہ کا اظہار کر کے لوٹ کا مال بھی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

اما الاسلام فاقبل واما المال فلست منہ فی شیء. (صحیح بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اھل الحرب. ج۱ص۳۷۹)	اسلام تو میں نے قبول کیا لیکن مال سے مجھ کو کسی قسم کا واسطہ نہیں۔

---

(۱) سیرۃ النبی ج۱ص۲۱۸ طبع جدید ۱۹۹۶ء بحوالہ ابن سعد جز ثانی قسم اول ص۴۴ وزاد المعاد ج۱ص۳۷۰ "ض"

ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے حدیثوں میں جو یہ وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ اکثر بیعتِ اسلام کے وقت جن باتوں کا اقرار لیتے تھے ان میں ایک یہ بھی ہوتا تھا کہ چوری نہ کریں گے۔"(۱) اس کی یہی وجہ تھی کہ ان جرائم کا رواج تھا، ورنہ آج اگر شرفا سے بیعت کے وقت یہ اقرار لیا جائے تو لوگوں کو تعجب ہوگا کہ یہ بیعت لینے کی کیا چیز ہے۔

اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان تمام جرائم سے توبہ کرنا ہوتا تھا، اس لئے عرب کو اسلام قبول کرنے کے وقت یہ نظر آتا تھا کہ وہ تمام ذرائعِ معاش سے مجبور ہو جاتے ہیں، یعنی وہ قافلوں پر حملہ نہیں کر سکتے، کہیں ڈاکہ نہیں ڈال سکتے، کسی کا مال نہیں چھین سکتے تو اب ان کے لئے کیا باقی رہ جاتا ہے۔

قریش خوردہ زن اور غارت گر نہ تھے وہ شہر کی متمدن زندگی بسر کرتے تھے، تاہم دیگر اسباب کے ساتھ ان کے اسلام قبول نہ کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ قبولِ اسلام کا اثر ان کے وسائل معاش پر بھی پڑ سکتا تھا، قریش کا ذریعۂ معاش صرف ان تجارتی تعلقات تک محدود تھا جو انہوں نے باضابطہ طور پر دوسرے قبائل اور ممالک سے قائم کر رکھے تھے اور یہ تمام قبائل اور ممالک مذہبی حیثیت سے اسلام کے دشمن اور حریفِ مقابل تھے، اس بنا پر قریش کو خوف تھا کہ اگر وہ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو جائیں گے تو دفعتاً یہ تمام تجارتی تعلقات منقطع ہو جائیں گے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح (صفحہ ۱۳۸ ج ۴ مطبعۃ النیل مصر ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) میں امام شافعی کی روایت سے لکھتے ہیں:

قال الشافعي كانت قريش تنتاب الشام انتيابا كثيرا و كان كثير من معائشها منه. وتاتي العراق فيقال لما دخلت في الاسلام ذكرت للنبي ﷺ خوفها من انقطاع معائشها بالتجارة من الشام و العراق اذ فارقت الكفر و دخلت في الاسلام و خلاف ملك الشام و العراق لاهل الاسلام فقال النبي ﷺ اذا هلك كسرىٰ فلا كسرىٰ بعده فلم يبق بارض العراق كسرىٰ يثبت له امر بعده وقال اذا هلك قيصر فلا قيصر بعده فلم يكن بارض الشام قيصر فاجابهم على ما قالوا.	امام شافعی کا بیان ہے کہ قریش شام میں اکثر تجارتی حیثیت سے آمد و رفت رکھتے تھے اور ان کی معاش کا تعلق زیادہ تر اسی سے تھا اور اس غرض سے وہ عراق میں بھی آتے جاتے تھے تو کہا جاتا ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ سے ان ذرائع معاش کے منقطع ہو جانے کا خوف ظاہر کیا اور شام و عراق کے بادشاہوں کی اس مخالفت کا ذکر کیا جو ان کو اہل اسلام کے ساتھ تھی اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب کسریٰ ہلاک ہو جائے گا تو پھر اس کے بعد دوسرا کسریٰ نہ ہوگا چنانچہ عراق سے کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب قیصر ہلاک ہو جائے گا تو پھر دوسرے قیصر کا وجود نہ ہوگا، چنانچہ ارضِ شام میں پھر کوئی قیصر نہیں ہوا۔ جس کی وہاں حکومت ہو اس لحاظ سے آنحضرت ﷺ نے یہ جواب ان کے بیان کے موافق دیا ہے۔

(۱) صحیح بخاری کتاب الحدود جلد ۲ ص ۱۰۰۳ و ۱۰۰۴

رفعِ شک: اس موقع پر ایک غلطی کا ذکر کرنا ضرور ہے جو عام طور پر یورپ میں پھیلی ہوئی ہے، اہلِ مغرب کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ اس میں عرب کی ہر قسم کی خواہش ہائے نفسانی کے پورے کرنے کا سامان موجود تھا، عرب جنگ و جدل اور لوٹ مار کے شائق تھے، اسلام نے ان ہی چیزوں کو جہاد و غنیمت کی صورت میں بدل دیا، عرب سخت نفس پرست تھے اسلام نے چار بیویاں اور غیر محدود لونڈیوں کی اجازت دے دی، اہلِ عرب زاہدانہ زندگی سے بالکل آشنا نہ تھے اسلام نے بھی رہبانیت کی تحقیر کی، اب کیا چیز تھی جو اہلِ عرب کو اسلام سے روک سکتی تھی۔

لیکن یہ خیال تمام تر غلط ہے، جہاد اور تعددِ ازدواج اور سراری کی بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی، یہاں اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ جہاد یا تعددِ ازواج جو کچھ بھی تھا قدیم آزادی سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا، جہاد صرف کافروں سے جائز تھا، فرض کرو ایک قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا تو اس پر کوئی شخص ہتھیار نہیں اٹھا سکتا تھا اور اس کے مال و متاع سے تعرض نہیں کر سکتا تھا، لیکن قدیم رسم کے لحاظ سے اتحادِ مذہب کوئی روک نہ تھی، تمام قبائل بت پرستی میں متحد تھے لیکن ہمیشہ ایک دوسرے کو لوٹتے رہتے تھے، جہاد کے لئے اور بہت سی پابندیاں تھیں جو پہلے بالکل نہ تھیں جہاد میں صرف پاس پاس کے قبائل شریک ہوتے تھے، دور دور کے قبائل اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے، جہاد میں جو لونڈیاں گرفتار ہوتی تھیں ان سے اس وقت تمتع جائز ہوتا تھا جب ایک مہینہ کی مدت گذر جائے یا اگر حاملہ ہے تو بچہ پیدا ہو چکے لیکن اسلام سے پہلے فتح کے ساتھ ہی عورتوں کو تصرف میں لے آتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، پہلے نکاح کے لئے تعداد کی کوئی قید نہ تھی، ایک ساتھ آٹھ آٹھ دس دس شادیاں کرتے تھے، اب چار کی قید ہوگئی اور وہ بھی اس سخت شرط کے ساتھ کہ سب میں عدل اور مساوات رہے، اس لئے یہ کہنا کہ اسلام عرب کے مرغوبات کو قائم رکھتا تھا تمام تر غلط ہے، برخلاف اس کے عرب کی ایک ایک چیز روایاتِ قدیمہ، جہالت، عادات و رسوم، نفس پرستی ہر چیز اسلام کے قبول کرنے کی مانع تھی۔

ہر قوم پر جو چیز سب سے زیادہ سختی کے ساتھ حکم راں ہے وہ قدیم عادات اور رسوم اور خیالات ہیں، آج یورپ علوم و فنون اور آزادی خیال میں اس حد تک ترقی کر گیا ہے لیکن جو بے ہودہ تعجب انگیز رسمیں پہلے قائم تھیں اب بھی قائم ہیں یا تو تعود کی وجہ سے ان کی برائیاں سرے سے نظر ہی نہیں آتیں یا آتی ہیں تو عادت کی حکومت کے مقابلہ میں آزادیٔ خیال اور علوم و فنون سب عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں۔

عرب میں جس قدر رسمیں قوم میں عادتیں تھیں جو ان کی ہستی کی عناصر بن گئی تھیں اسلام ایک

یعنی انتقام خون، عرب کے جذبات کا سب سے بڑا مظہر تھا، اسلام نے ان کو بالکل مٹادیا، خاندانی فخر و مباہات ان کی قومی زندگی کی روح تھی جو فنا کردی گئی، ابوسفیان رئیس العرب کو بلالؓ (جو حبشی غلام تھے) کے ساتھ بیٹھنا پڑا یا تو قریش کو انصار کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے سے بھی عار تھا یا اب قریش کی لڑکیاں غلاموں (زید و سالم) وغیرہ کے گھر میں آگئیں، عکاظ وغیرہ کے میلے جہاں عرب سال کے سال جمع ہو کر اپنے مفاخر کی داستانیں سناتے تھے سرد پڑ گئے۔

اسلام ایک طرف تو عرب کے تمام مفاخر کو خاک میں ملاتا تھا، دوسری طرف خود اس میں ہوائے نفس اور تفریحِ طبع کا کوئی سامان نہ تھا، اسلام قبول کرنے کے ساتھ پانچ وقت کی نماز گلے کا ہار بن جاتی تھی جو آزاد مزاجوں پر سخت گراں تھی:

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ . اور وہ (نماز) خاشعین کے سوا اوروں پر یقیناً گراں ہے۔

(بقرہ۲:۴۵)

روزہ یعنی تیس دن تک متصل کھانا چھوڑ دینا کوئی آسان کام نہ تھا، زکوٰۃ ایسا سخت ٹکس تھا کہ محض اس کے ادا کرنے پر حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں عام بغاوت ہوگئی، صرف حج ایک ایسا فرض تھا جو بہ ظاہر زندہ دلی کا سامان رکھتا تھا لیکن اب حج وہ جاہلیت کا حج نہیں رہا تھا، طوافِ عریاں کی اجازت نہیں رہی تھی، بڑی دلچسپی کی چیز بت تھے وہ ایک ایک کر کے حرم سے نکال دیے گئے، مقامِ منیٰ میں خاندانی واقعات کی رجز خوانی کا جو طریقہ چلا آتا تھا بند کر دیا گیا، یہ فرائض اور اوامر کا حال تھا، اسی کے ساتھ محرمات اور نواہی کی وہ عالم گیری تھی کہ ان کے جاہلانہ خیال کے مطابق زندگی زندگی نہیں بلکہ زنداں بن گئی تھی، زنا حرام، شراب حرام، قمار حرام، سونا چاندی حرام، اطلس و حریر حرام، چنگ و عود حرام، تصویر حرام، پھر زندہ دلی اور لطفِ زندگی کے لئے باقی کیا رہ جاتا ہے۔

خوب غور سے دیکھو تمام دیگر مذاہب نے عبادتوں میں بھی دلچسپی کا سامان رکھا ہے، عیسائیوں کی نماز گا کر ادا کی جاتی ہے، پارسیوں میں زمزمہ ہوتا ہے، ہندو بھی عبادت کے وقت بھجن گاتے ہیں اور سامنے دل فریب بت ہوتے ہیں، لیکن اسلام میں بہ ظاہر دل آویزی اور دل فریبی کی ایک چیز بھی نہیں۔

مذکورہ بالا واقعات کی بنا پر یورپ کا یہ اعتراض کس قدر غلط اور تمام تر بے سر و پا ہے کہ اسلام اس لئے پھیلا کہ وہ نفس پرستی کی ترغیب دلاتا اور اس کے سامان مہیا کرتا تھا۔

پھر کیا تھا؟ اس کا جواب آگے آتا ہے۔

تبلیغِ نبوی ﷺ اور اس کے اصول
اور
اس کی کامیابی کے اسباب

تمام گذشتہ موانع، عوائق، مشکلات اور دشواریوں کی دیواریں آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے ٹوٹتی گئیں، اسلام پھیلا اور اس طرح پھیلا کہ آنحضرت ﷺ نے جب دنیا کو چھوڑا تو تمام عرب میں ایک بھی بت پرست نہ تھا، اس لئے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ مخالفین کے نزدیک تو اس کا جواب صرف تلوار ہے، لیکن کارلائل (۱) کے بہ قول نہتے اور یکہ وتنہا اسلام کے ہاتھ میں یہ تلوار کس تلوار کے زور سے آئی؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تلوار صرف اسلام کی تبلیغی دعوت تھی، اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں اسلام کی اس طاقت کی تشریح کر دینا مناسب ہے۔

فریضہ تبلیغ: "تبلیغ" کے لفظی معنی پیغام پہنچانے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اس کی اچھائی اور خوبی کو دوسرے لوگوں اور دوسری قوموں اور ملکوں تک پہنچائیں اور ان کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں، قرآن پاک میں تبلیغ کے ہم معنی چند اور الفاظ بھی ہیں جن میں سے ایک لفظ انذار ہے، جس کے معنی ہشیار اور آگاہ کرنے کے ہیں، دوسرا لفظ دعوۃ ہے جس کے معنی بلانے اور پکارنے کے ہیں اور تیسرا لفظ تذکیر ہے، جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں، بعثتِ نبوی ﷺ کے وقت دنیا میں دو قسم کے مذہب تھے، دو ایسے جو تبلیغی تھے یعنی عیسائیت اور بودھ مت، باقی زیادہ تر ایسے ہی تھے جو تبلیغی نہیں جیسے یہودیت، مجوسیت، ہندویت جو دو تبلیغی سمجھے جاتے تھے ان کی نسبت یہ فیصلہ مشکوک ہے کہ آیا یہ تبلیغ ان کے اصل مذہب کا حکم تھا یا بعد کے پیروؤں کا عمل ہے؟ کیوں کہ ان کے مذہبی صحیفوں میں اس تعمیمِ دعوت کی کھلی ہوئی ہدایتیں اور ان کے بانیوں کی زندگی میں اس کی عملی مثالیں نہیں ملتیں، تمام مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے، جس نے تبلیغ کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے متعلق اپنے صحیفہ میں کھلے احکام دیے اور اس کے داعی وحامل (علیہ السلام)

(۱) ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ (محمد ﷺ)۔

نے اپنی زندگی میں اس کی عملی مثالیں پیش کیں۔

جن مذہبوں نے تبلیغ کو اپنا اصول نہیں ٹھہرایا ان کے ایسا کرنے کی اصلی وجہیں دو ہیں، ایک یہ کہ ان کے نزدیک اس حق کے قبول کرنے کی عزت کا استحقاق پیدائش سے حاصل ہوتا ہے، کوشش سے نہیں، دوسرا سبب یہ ہے کہ جو حق ان کے پاس ہے وہ ان کے نزدیک اتنا پاک و مقدس ہے کہ ان کی خاص پاک و بزرگ و محترم نسل وقوم کے علاوہ دوسری تمام قومیں جو ناپاک و نجس و کم تر ہیں ان تک اپنے پاک مذہب کو لے جانا خود اس مذہب کی پاکی کو صدمہ پہنچانا ہے، یہی سبب ہے کہ حضرت مسیح نے ایک دفعہ جب ایک کنعانی (۱) (متی ۱۵) یا یونانی (۲) (مرقس ۷، ص ۶۹) عورت نے ان سے برکت چاہی تو فرمایا ''میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا'' (متی ۱۵، ۲۴ ص ۲۸) پھر فرمایا: ''مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی (بنی اسرائیل کا مذہب) کتوں (غیر اسرائیلی قوموں) کو پھینک دیں'' (۲۷ ص ۲۸) پھر فرمایا: ''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ پہلے اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ اور چلتے ہوئے منادی کرو'' (متی ۱۰-۶ ص ۱۷) پھر ارشاد فرمایا: ''وہ چیز جو پاک ہے کتوں کو مت دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ پھینکو۔'' (متی ۷-۶ ص ۱۲)

ہندوؤں نے اپنے مذہب کو تمام قوموں سے جو چھپا کر رکھا اس کا بھی یہی سبب تھا کہ وہ اپنا پاک دھرم ملیچھوں اور اچھوتوں کو سکھا کر اس کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے تھے، یہودیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ نامختون اس نعمت کے اہل نہیں۔

تبلیغ کی اہمیت: آنحضرت نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لا کر کھڑا کیا اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا، اس لئے اپنی تبلیغ کے لئے قریش و غیر قریش، حجاز و یمن، عرب و عجم، ہند و روم کی تخصیص نہیں فرمائی، بلکہ دنیا کی ہر قوم ہر زبان اور ہر گوشہ میں صدائے الٰہی کا پہنچانا فرض قرار دیا، ابتدائی وحی میں ان جانوں کو ہشیار اور بے خبروں کو آگاہ کرنا سب سے پہلا حکم تھا: يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ. قُمْ فَاَنْذِرْ (مدثر ۷۴: ۱-۲) ''اے چادر پوش! اٹھ کھڑا ہو اور ہشیار و آگاہ کر۔'' پھر بار بار حکم ہوتا رہا کہ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ (مائدہ ۵: ۶۷) ''جو تیری طرف اتارا گیا اس کو اوروں تک پہنچا۔''

(۱) ص ۲۸ کتاب العہد الجدید آکسفورڈ ۱۸۹۰ء (۲) ایضاً مرقس ۷ ص ۶۹

فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ (شوریٰ۴۲:۱۵) لوگوں کو دعوت دے اور مضبوط قائم رہ جس طرح تجھے حکم دیا گیا، فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى. (اعلیٰ ۸۷:۹) لوگوں کو نصیحت کر اگر نصیحت فائدہ مند ہو، وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ. (ذاریات ۵۱:۵۵) اور نصیحت کر کہ نصیحت اہل ایمان کو فائدہ پہنچاتی ہے، فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ. (ق۵۰:۴۵) قرآن سے سمجھاؤ اس کو جو میری دھمکی سے ڈرتا ہو، اور ان کے علاوہ بیسیوں آیتوں میں اس فرض کی اہمیت ظاہر کی گئی، حضرت علیؓ سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''اے علی! تمہاری کوشش سے ایک آدمی کا بھی دین حق کو قبول کر لینا دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بھی بڑھ کر ہے۔'' (۱)

اس سے زیادہ یہ کہ اسلام نے اپنے ہر پیرو پر خیر کی دعوت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور تواصی بالحق یعنی باہم ایک دوسرے کو سچائی کی نصیحت کرنا، ضروری قرار دیا ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض بتایا ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالنے کی جدو جہد کریں۔

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر پیامِ الٰہی لوگوں تک پہنچایئے اور اگر ایسا نہ کیا تو رسالت کا فرض انجام نہیں دیا:

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ، وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ. (مائدہ ۵:۶۷)	اے خدا کے پیغام پہنچانے والے تیرے پروردگار کے پاس سے جو کچھ تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچادے اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو تو نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا اور تجھ کو خدا لوگوں سے بچالے گا۔

اس کی وسعت: اس کے بعد اس فریضہ تبلیغ کی وسعت کی بحث ہے، پیغامِ الٰہی سچائی کا ایک بہتا چشمہ ہے جو آہستہ آہستہ قدرتی رفتار سے پہلے اپنی قریب کی زمین کو پھر آگے کو، پھر اس سے آگے کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ زمین کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے، آنحضرت ﷺ کو اس تبلیغ کا حکم اسی تدریج کے ساتھ ہوا، سب سے پہلے خاص اپنے گھر اور خاندان کے لوگوں کو سمجھانے کا حکم ہوا:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ. (شعراء۲۶:۲۱۴)	اور اپنے سب سے نزدیک کے اہل خاندان کو آگاہ و ہشیار کر

(۱) صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابہ باب فضل علی ج ۲ ص ۳۰۵ و صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۱۳ کتاب الجہاد باب دعاء النبی الی الاسلام۔

اس کے بعد یہ دائرہ بڑھ کر شہر مکہ اور اس کے اطراف کی آبادیوں تک پہنچتا ہے:

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا. (شوریٰ ۴۲:۷)
تا کہ تو مکہ اور جو اس کے آس پاس (کے بدوی) ہیں ان کو آگاہ وہشیار کرے۔

اب تبلیغ کا دائرہ اس سے بھی آگے بڑھتا ہے اور ہر زندہ روح یعنی سمجھ بوجھ، احساس وعقل وغیرہ حقیقی زندگی کی علامتیں جس میں موجود ہوں اس کی مخاطب ہوتی ہیں:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ. لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا. (یٰس: ۳۶:۶۹-۷۰)
یہ قرآن تو صرف ایک نصیحت اور صاف صاف خدا کا کلام ہے تا کہ وہ اس کو ہشیار کرے جو زندہ ہے۔

پھر جس حد تک بھی وہ آواز پہنچ جائے سب سے اس کا خطاب ہے:

لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ. (انعام ۶:۱۹)
تا کہ میں تمہیں آگاہ وہشیار کروں اور ان کو جن تک میری یہ آگاہ وہشیار کرنے والی آواز پہنچے۔

پھر تمام انسانوں تک اس کی وسعت ہوتی ہے:

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ. (ابراہیم ۱۴:۵۲)
یہ قرآن تمام انسانوں کے لئے پیغام ہے۔

آنحضرت ﷺ کو خطاب ہوا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا. (سبا ۳۴:۲۸)
اور ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لئے خوش خبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔

آپ ﷺ کو حکم ہوا کہ تمام انسانوں کو خطاب کر کے یہ اعلان فرمادیں:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا. (اعراف ۷:۱۵۸)
اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں۔

اس سے زیادہ یہ ہے کہ تمام کائنات آپ کی دعوت وتبلیغ کے دائرہ میں داخل ہے، فرمایا:

تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا. الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. (فرقان ۲۵:۱-۲)
برکت والا ہے وہ خدا جس نے حق اور باطل میں امتیاز بتانے والی کتاب اپنے بندہ (محمد ﷺ) پر نازل کی تا کہ وہ دنیا جہان کے لئے ہشیار وآگاہ کرنے والا ہو، وہ خدا جس کی ملکیت میں آسمانوں کی اور زمین کی سلطنت ہے۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس تبلیغ و دعوت کی وسعت اور اس میں کامیابی کی خوش خبری عین اسی وقت دے دی گئی تھی جب مسلمانوں کے دلوں میں ایک قسم کی مایوسی چھائی ہوئی تھی، چنانچہ آیت ذیل نازل ہوئی:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ. وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ (ص ۳۸: ۸۷-۸۸)

یہ قرآن تو دنیا کے لئے نصیحت ہے اور تم ایک زمانہ کے بعد اس کی خبر جانو گے۔

انبیا اور بانیانِ مذہب کے عملی نمونوں اور مثالوں کی تلاش اور جستجو کرو تو یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جائے گی کہ اسلام کے سوا اور جو مذہب تبلیغی سمجھے جاتے ہیں وہ حقیقت میں تبلیغی نہیں، خود بودھ نے ہندوؤں کے علاوہ کسی کو اپنی نجات کا راستہ نہیں بتایا اور نہ اس کا حکم دیا، حضرت عیسیٰؑ نے اسرائیل کے علاوہ کسی دوسری قوم کو نہ اپنا وعظ سنایا اور نہ ان کو اپنا مخاطب بنایا اور نہ ان میں سے کسی کو اپنا شاگرد کیا، نہ کسی دوسری قوم میں اپنی زندگی میں اپنا واعظ اور مبلغ بھیجا، حالاں کہ فلسطین میں رومیوں اور یونانیوں کی بڑی جماعت موجود تھی۔

آنحضرت ﷺ نے مکہ میں رہ کر اور اس کے پاس کے لوگوں کو بیدار و ہشیار کیا، حج کے موسم میں عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جا کر حق کا پیغام پہنچایا اور اسی زمانہ میں یمن اور حبشہ تک آپ کی آواز پہنچ گئی اور لوگ تلاش حق کے لئے آپ کے پاس آئے، مدینہ منورہ آئے تو قریش گو برسوں تک دوسرے قبیلوں تک اسلام کے پہنچنے میں سدِ راہ بنے رہے، پھر بھی مبلغ اور داعی بھیج کر قبیلوں تک آواز پہنچائی گئی اور بالآخر قریش کے خلاف اس لئے تلوار اٹھائی گئی کہ اسلام کو تبلیغ کی پر امن آزادی ملے، چھ برس کے جنگ وجدل کے بعد حدیبیہ میں قریش نے اسلام کے اس مطالبہ کو تسلیم کیا اور تبلیغ کی آزادی عطا کی، قرآن نے اسلام کی اس روحانی فتح کو فتحِ مبین قرار دیا اور اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (فتح ۴۸: ۱) نازل ہوئی (۱)، اس کے بعد ہی عرب اور بیرونِ عرب میں اسلام کے واعظ، قاصد اور مبلغ بھیجے گئے اور دنیا کے امرا و سلاطین کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے گئے اور عربوں کے علاوہ دیلم، ایران، حبش اور روم کے طالب آئے اور فیضانِ حق سے سیراب ہوئے، مشرکین عرب، یہود، عیسائی اور پارسی سب نے آپ کے زمانہ میں آپ کے نور سے روشنی حاصل کی۔

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب صلح الحدیبیہ ج ۲ ص ۸۸-۸۹

لیکن نفسِ تبلیغ کی فرضیت واہمیت سے بھی زیادہ اہم چیز تبلیغ کے اصول ہیں۔

تبلیغ کے اصول: یہ نکتہ کہ کس طرح لوگوں کو کسی سچائی کے قبول کی دعوت دینی چاہیے دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانِ وحی ترجمان سے ادا ہوا، وہ مذہب بھی جو تبلیغی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لئے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے لیکن صحیفۂ محمدی ﷺ نے نہایت اختصار لیکن پوری تشریح کے ساتھ اپنے پیروؤں کو یہ بتایا ہے کہ پیغامِ الٰہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبول حق کی دعوت کس طرح دی جائے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ	اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو دانائی اور عمدہ
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْھُمْ	نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے مناظرہ خوش آئند
بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔ (نحل ۱۶:۱۲۵)	طریق سے کر۔

تبلیغ و دعوت کے یہ تین اصول مسلمانوں کو سکھائے گئے، عقل و حکمت، موعظۂ حسنہ اور مناظرہ بہ طریقِ احسن، مسلمان متکلموں نے بیان کیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے یہ تینوں اصول وہی ہیں جو منطقی استدلال میں عموماً کام میں لائے جاتے ہیں، یعنی ایک تو برہانیات جن میں یقینی مقدمات کے ذریعہ سے دعویٰ کے ثبوت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں، دوسرے خطابیات جن میں موثر اور دل پذیر اقوال سے مقصود کو ثابت کیا جاتا ہے اور تیسرے جدلیات جن میں مقبولِ عام اقوال اور فریقین کے مسلم مقدمات سے استدلال کیا جاتا ہے، قرآن پاک نے پہلے طریقہ کو حکمت، دوسرے کو موعظتِ حسنہ اور تیسرے کو جدال سے تعبیر کیا ہے اور استدلال کے یہی وہ تین طریقے ہیں جن سے ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے مدعا کو ثابت کرتا ہے۔

خیر یہ تو فلسفیانہ نکتہ آفرینی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کے سامنے کوئی نئی بات پیش کرکے اس کے قبول کی دعوت دیتے ہیں تو عموماً تین طریقے برتتے ہیں، یا تو اس بات کے ثبوت اور تائید میں کچھ دل نشین دلیلیں پیش کرتے ہیں، یا اس کو مخلصانہ نصیحت کرتے ہیں اور موثر انداز سے اس کو نیک و بد اور نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں، یا یہ کرتے ہیں کہ اس کی دلیلوں کو مناسب طریقہ سے رد کرکے اس کی غلطی کو اس پر واضح کرتے ہیں، پہلے طریقہ کا نام حکمت، دوسرے کا نام

موعظۂ حسنہ اور تیسرے کا نام جدال بہ طریق احسن ہے، تبلیغ و دعوت کے یہی تین طریقے ہیں۔

قولِ لیّن: حکیمانہ استدلال ہو یا وعظ و نصیحت ہو یا جدال و مناظرہ ہو، ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے باتیں کرے کہ سختی اور شدت کا طریق دوسرے کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کرتا ہے اور کیسی ہی اچھی اور سچی بات ہو لیکن اس قسم کے جذبات اس کے قبول کی استعداد اس سے سلب کر لیتے اور سننے والے میں اپنی غلطی پر ضد اور ہٹ پیدا کر دیتے ہیں، جس سے دعوت کا فائدہ اور نصیحت کا اثر باطل ہو جاتا ہے، اسی لئے قرآن پاک نے اپنے پیغمبروں کو اپنے مخالف سے مخالف دشمن سے بھی نرمی ہی سے باتیں کرنے کی تاکید کی ہے، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغامِ ربانی لے کر جانے کی ہدایت ہوتی ہے تو ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے:

اِذْهَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی. فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی. (طٰہٰ ۲۰: ۴۳-۴۴)	تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، اس نے سرکشی کی ہے، تو اس سے نرم گفتگو کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے، یا (خدا) سے ڈرے۔

دعوت و تبلیغ میں رفق و نرمی اور لطف و تحمل کی تعلیم کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی کہ نہ کوئی داعی اور واعظ پیغمبروں سے بہتر ہو سکتا ہے اور نہ فرعون سے بڑھ کر کوئی مجرم ہو سکتا ہے، پھر ایسے مجرم کے سامنے اس لطف و نرمی سے وعظ و نصیحت کی تعلیم جب پیغمبروں کو ہوتی ہے تو عام داعیوں، مبلغوں اور واعظوں کو عام مخالفوں، مجرموں اور سرکشوں کے ساتھ بدرجہا زیادہ رفق و ملاطفت سے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

اعراض و قولِ بلیغ: آنحضرت ﷺ کو ان منافقوں کے بارہ میں جو آپ کی نافرمانی کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے یہ حکم ہوتا ہے:

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَ قُلْ لَّهُمْ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِیْغًا. (نساء ۴: ۶۳)	تو ان سے درگذر کر اور ان کو نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دلوں میں اثر کرے۔

اس تعلیم میں تین ہدایتیں ہیں: اول یہ کہ دعوت و تبلیغ میں مخالف کی بدسلیقگی، بدتہذیبی اور

درشتی سے درگذر اور ان کو برداشت کرنا چاہیے، دوسری یہ کہ ان کو نصیحت کرنا اور سمجھانا چاہیے اور تیسری یہ کہ گفتگو کا وہ موثر طرز و انداز اختیار کرنا چاہیے جو دل میں گھر کرے۔

تیسیر وتبشیر: ان ہی ربانی ہدایتوں کی تعمیل میں جب آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ کو یمن میں اسلام کی دعوت وتبلیغ کے لئے متعین فرمایا تو رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی یسرا ولا تعسرا و بشرا و لا تنفرا (۱) دین الٰہی کو آسان کر کے پیش کرنا، سخت بنا کر نہیں، لوگوں کو خوش خبری سنانا، نفرت نہ دلانا، یہ وہ تبلیغی اصول ہیں جو ایک داعی و مبلغ کی کامیابی کی جان ہیں، آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کے سامنے اور صحابہؓ نے عام مسلمانوں کے سامنے اسی اصول کے مطابق دین الٰہی کو پیش کیا اور کامیابی حاصل کی، دین کی جائز آسانی اور سہولت کو پیش کرنا اور اس کو سخت، درشت اور مشکل نہ بنانا ہی اس کے قبولِ عام کی راہ ہے، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے لطف و شفقت، رحم و کرم اور مہر و محبت کی دلنواز صداؤں سے دلوں کو پرامید اور مسرور بنانا اس سے بہتر ہے کہ بات بات پر خدا کی قہاری و جباری اور ہیبت و جلال کا ذکر کر کے دلوں کو خوف زدہ اور مایوس بنایا جائے۔

تدریج: تبلیغ کا ایک اور اصول آنحضرت ﷺ نے یہ تعلیم فرمایا کہ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ اس کی گردن پر نہ ڈالا جائے بلکہ رفتہ رفتہ وہ اس کے سامنے پیش کئے جائیں، پہلے توحید اور رسالت کو پیش کرنا چاہیے، اس کے بعد عبادات کو، عبادات میں بھی اہم پھر اہم کے اصول کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے، عبادات میں سب سے اہم نماز ہے، پھر زکوۃ ہے پھر دوسرے فرائض ہیں، حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجتے وقت آپ ﷺ نے فرمایا تم یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے تو ان کو پہلے اس کی دعوت دینا کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمدؐ اس کا رسول ہے۔ جب وہ یہ مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں اور جب وہ یہ بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے، یہ صدقہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دے دیا جائے گا، جب وہ اس کو تسلیم کر لیں تو دیکھو صدقہ میں چن چن کر ان کے بڑھیا مال کو نہ لینا اور ہاں مظلوم کی بدعا سے ڈرتے رہنا کہ اس

(۱) صحیح بخاری کتاب المغازی باب بعث ابی موسیٰ و معاذ الی الیمن جلد دوم ص ۶۲۲

کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔(۱)

تالیفِ قلب: تبلیغ ودعوت کے سلسلہ میں اسلام نے ایک اور طریقہ بھی پیش کیا ہے جس کو تالیفِ قلب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ (توبہ ۹:۶۰) اس کے لفظی معنیٰ ہیں ''دلوں کو ملانا'' اور اس سے مقصود اس شخص کے ساتھ جس کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہو، لطف ومحبت، امداد واعانت اور غم خواری وہم دردی کرنا ہے کیوں کہ انسان طبعاً شریفانہ جذبات کا ممنون ہوتا ہے اور یہ ممنونیت عناد اور ضد کے خیالات کو دور کر کے قبولِ حق کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے، آنحضرت ﷺ نے بہت سے لوگوں کو اپنے اس اعجاز سے اسلام کا حلقہ بگوش بنالیا تھا چنانچہ مکہ کے بعض رئیس اسی جذبہ سے متاثر ہو کر اسلام لائے تھے، آنحضرت ﷺ نے حنین کی غنیمت کا سارا مال ان ہی میں تقسیم کر دیا تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ پھر حق کے خلاف ان کی گردنیں نہ اٹھ سکیں صفوان جو اسلام کی سخت مخالف اور آنحضرت ﷺ سے نہایت بغض رکھتے تھے وہ کہتے ہیں کہ ''مجھ کو آنحضرت ﷺ نے دیا، جتنا دیا اور مجھے ان سے سخت بغض تھا لیکن آپ ﷺ کے ان احسانات نے مجھے ایسا متاثر کیا کہ اب میری نگاہ میں ان سے زیادہ کوئی پیارا نہیں''(۲) ایک دفعہ ایک بدو نے آکر کہا کہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بکریوں کے جتنے ریوڑ ہیں مجھ کو عنایت کیجئے، آپ ﷺ نے اس کو وہ سب دے دیے یہ فیاضی دیکھ کر ایسا اس پر اثر پڑا کہ اس نے اپنے پورے قبیلہ سے جا کر کہا ''بھائیو اسلام قبول کرو محمد اتنا دیتے ہیں کہ ان کو اپنے فقر وافلاس کا ڈر ہی نہیں رہتا''۔(۳)

ایک یہودی کا لڑکا آنحضرت ﷺ کی خدمت کرتا تھا وہ بیمار پڑا تو آنحضرت ﷺ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے اور جا کر اس کے سرہانے بیٹھے پھر فرمایا کہ لڑکے اسلام قبول کر لے، اس نے مستفسرانہ نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا، اس نے کہا ابوالقاسم (آپ ﷺ کی کنیت) کی بات مان لے، چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا اور جب آنحضرت ﷺ وہاں سے اٹھے تو زبان مبارک پر یہ فقرہ تھا کہ اس خدا کی حمد جس نے اس کو دوزخ سے بچالیا۔(۴)

---

(۱) صحیح بخاری باب مذکور ص ۶۲۳ (۲) صحیح مسلم کتاب الفضائل باب ما سئل رسول اللّٰہ ﷺ شیئا قط فقال لا ج ۲ ص ۲۹۰ مصر (۳) ایضاً (۴) صحیح بخاری کتاب الجنائز باب اذا اسلم الصبی الخ ج ۱ ص ۱۸۱

دعوتِ عقل: اسلام نے تبلیغ و دعوت کے جو اصول بتائے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک استدلالی اور عقلی مذہب ہو کہ بغیر اس کے حکمت و دانش مندی، وعظ و نصیحت اور جدال و مناظرہ کی بنیاد قائم نہیں رہ سکتی، اس بنا پر مذاہبِ عالم کی تاریخ میں نبوتِ محمدیہ سب سے پہلی ربانی آواز ہے، جس نے حاکمانہ قانون (توراۃ) یا صرف لفظوں کے الٹ پھیر (انجیل) یا راجاؤں کے احکام (وید) کے بجائے عقلِ انسانی کو مخاطب کیا، غور و فکر کی دعوت دی، فہم و تدبر کا مطالبہ کیا، اس نے اپنی ہر تعلیم کے ساتھ اپنی تعلیم کی خوبی، مصلحت اور حکمت خود ظاہر کی اور بار بار مخالفوں کو آیاتِ الٰہی میں غور و فکر کی ہدایت کی، فرمایا:

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ. قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ. (انعام ۶:۱۴۹-۱۵۰)	کہہ اے پیغمبر کہ تمہارے پاس کوئی (یقینی) علم ہے کہ اس کو تم ہمارے لئے ظاہر کرو، تم تو گمان ہی کے پیچھے چلتے ہو اور تم تو اٹکل ہی کرتے ہو، کہہ کہ اللہ ہی کی ہے پہنچتی ہوئی دلیل۔

نیز ارشاد ہوا:

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ. (انفال ۸:۴۲)	تا کہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جو جیتا رہے وہ دلیل سے جئے اور اللہ ہے سننے والا، جاننے والا۔

غفلت شعار کافروں کی نسبت فرمایا:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ. (یوسف ۱۲:۱۰۵)	اور آسمانوں میں اور زمین میں (خدا کی توحید کی) کتنی نشانیاں (دلیلیں) ہیں جن پر وہ گذر جاتے ہیں اور ان پر غور نہیں کرتے۔

غور و فکر کرنے والے اہلِ ایمان کی تعریف میں فرمایا:

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ. الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ	بے شبہ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں جو اللہ کو کھڑے بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر یاد کرتے ہیں، آسمانوں

قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران ۳:۱۹۰-۱۹۱)

اور زمین کی بناوٹ میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار تونے (یہ عالم) بیکار نہیں بنایا۔

اس سے زیادہ عقلی اور علمی استدلال کی دعوت اور کیا ہوگی، مگر بہر حال یہ خارجی استدلال تھا، اندرونی استدلال کی بھی اس نے دعوت دی، فرمایا:

وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ. (ذاریات ۵۱:۲۱)

اور خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں تم دیکھتے نہیں۔

صحیفۂ محمدی کی نسبت ہر جگہ یہ الفاظ فرمائے:

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ. (ق ۵۰:۸) — یہ بصیرت اور نصیحت ہے ہر رجوع ہونے والے بندہ کے لئے

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ. (اعراف ۷:۲۰۳) — یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے بصیرتیں ہیں۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ. (جاثیہ ۴۵:۲۰) — یہ لوگوں کے لئے بصیرتیں ہیں۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ. (نساء ۴:۸۲) — کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا. (محمد ۴۷:۲۴) — کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے تالے ہیں۔

وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ. (یٰسین ۳۶:۲) — حکمت والے قرآن کی قسم۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ. — یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

(یونس ۱۰:۱، لقمان ۳۱:۲)

نہ صرف اسی قدر بلکہ خدا کا وجود، توحید، رسالت، قیامت، جزا و سزا، عبادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اخلاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اس نے اس کی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں اور ہر مسئلہ کی مصلحتیں اور حکمتیں علی الاعلان ظاہر کی ہیں، آئندہ صفحوں میں ہر قدم پر اس کی دلیلیں آپ کو ملیں گی۔

مذہب میں زبردستی نہیں: یہ وہ حقیقت ہے جس کی صدا آج ہر در و دیوار سے آتی ہے لیکن شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ دنیا میں اس حقیقت کا اعلان سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی زبانِ مبارک

ہوا اور ظاہر ہے کہ جو مذہب اپنی اشاعت کے لئے صرف دعوت وتبلیغ کا راستہ رکھتا ہو جس نے اس کے اصول بتائے ہوں، جس نے عقل وبصیرت اور فہم وتدبر کا ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہو، ہر قدم پر عقلی استدلال اور مصلحت وحکمت کا اظہار کیا ہو، وہ کیوں کر جبر واکراہ اور زبردستی کے طریقہ کو اختیار کرسکتا تھا، اسلام نے نہ صرف یہ کہ مذہب کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فلسفہ بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز نہیں، اسلام میں مذہب کا اولین جز ایمان ہے، ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بھی بہ زور پیدا نہیں کرسکتی، بلکہ تیز سے تیز تلوار کی نوک بھی کسی لوحِ دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کرسکتی، فرمایا:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ. (بقرہ۲:۲۵۶)

دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے الگ ہوچکی۔

یہ وہ عظیم الشان حقیقت ہے جس کی تلقین انسانوں کو صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے ہوئی، دوسری جگہ فرمایا:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (کہف۱۸:۲۹)

اور کہہ دے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے تو جو چاہے قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے۔

ایمان اور کفران دو میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر کوئی زبردستی نہیں ہے، عقل وبصیرت والے اسے خود قبول کریں گے اور نافہم اس سے محروم رہیں گے، اسی لئے بار بار یہ واضح کیا گیا کہ رسول کا کام لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے، زبردستی منوانا نہیں:

اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ. (مائدہ۵:۹۲)

ہمارے رسول پر تو یہی فرض ہے کہ وہ صاف صاف ہمارا پیغام پہنچادے۔

آنحضرت ﷺ کو جو قریش کے اعراض ومخالفت سے حد درجہ غمگین تھے، تسکین دی گئی:

اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ. (شوریٰ۴۲:۴۸)

اے پیغمبر تیرا فرض صرف پیام پہنچا دینا ہے۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ. لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ. (غاشیہ۸۸:۲۱-۲۲)

اے پیغمبر تو نصیحت کرنے والا ہے، تو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ

پھر اگر وہ اسلام کی دعوت سے انکار کریں تو اے پیغمبر ہم

حَفِيْظًا اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ. (شوریٰ ۴۲:۴۸)

نے تجھ کو ان پر گماشتہ بنا کر نہیں بھیجا، تیرے ذمہ صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔

کسی دین کو زبردستی پھیلانا اسلام کی نگاہ میں ایک ایسا فعل ہے جس سے رسول کی شان کو اس نے بہت بلند سمجھا ہے، فرمایا:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ. (یونس ۱۰:۹۹)

اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ (لوگوں کو زبردستی مومن بنادے) تو زمین کے سب لوگ ایمان لے آتے تو کیا اے پیغمبر تو لوگوں پر زبردستی کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں۔

اسلام میں حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لئے لڑنا جائز ہے اور آنحضرت ﷺ کو بھی مجبوراً لڑنا پڑا، اس سے مخالفوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ لڑائی صرف اس لئے تھی کہ اسلام کو تلوار کے زور سے لوگوں میں پھیلایا جائے، حالاں کہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم ہو اور نہ آنحضرت ﷺ کی سیرت میں کوئی واقعہ ایسا ہے جس میں کسی کافر کو زبردستی تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو، بلکہ اگر ہے تو یہ ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ. (توبہ ۹:۶)

اور اگر (لڑائی میں) کوئی مشرک تجھ سے پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے، پھر اس کو وہاں پہنچا دے، جہاں وہ بے خوف ہو کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔

یہ نہیں کہا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے اس کو پناہ نہ دو، بلکہ یہ فرمایا کہ اس کو پناہ دے کر اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے اور اس کو کلام الٰہی سنایا جائے تا کہ اس کو غور و فکر کرنے کا موقع ملے، ظاہر ہے کہ جو مشرک اس طرح مسلمان ہوگا اس کے تبدیلِ مذہب کا محرک تلوار کے بجائے کوئی اور چیز (پیامِ حق) ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی مشروعیت، مظلوموں کی حمایت، جلاوطنوں کے حق دلانے، حج کا راستہ کھولنے اور عقیدہ کی آزادی حاصل کرنے کے لئے ہوئی تھی، جیسا کہ اس کا مفصل بیان کتاب میں کہیں آئے گا، قرآن کی اس آیت میں:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَاتَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ. (انفال ۸:۳۹)

اور ان کافروں سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔

فتنہ سے مراد عقیدہ اور مذہب کی آزادی نہ ہونا ہے، حضرت ابن عمرؓ صحابہؓ کی خانہ جنگیوں میں شریک نہ تھے، ایک شخص نے آکر ان سے کہا کہ کیا خدا نے فتنہ کے مٹانے کے لئے لڑنے کا حکم نہیں دیا اور اوپر کی آیت پیش کی، انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہ فرض آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ادا کر چکے، جب مسلمان کم تھے، تو انسان اپنے دین کے سبب سے فتنہ میں مبتلا کیا جاتا تھا، اس کو لوگ یا مار ڈالتے تھے یا قید کر لیتے تھے، یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو پھر فتنہ باقی نہ رہا۔(۱)

میدانِ جنگ میں تبلیغ: ناواقفوں نے ایک اور مسئلہ کی بھی غلط تعبیر کی ہے، اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی آپڑے تو میدان جنگ میں پہنچ کر بھی صلح و آشتی کا خیال دور نہ کیا جائے، بلکہ تلوار کے فیصلہ سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کرنی چاہئیں، اول کہ تم کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاؤ اور لڑائی سے ہاتھ اٹھا کر ہمارے بھائی بن جاؤ، اگر ایسا کرو تو تم دین، حکومت اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جاؤ گے، اگر یہ منظور نہ ہو تو اپنے مذہب پر قائم رہ کر ہماری سیاسی حکومت کو قبول کر لو، اس حالت میں تمہاری حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری ہمارے سر ہوگی، اگر وہ ان دو میں سے کوئی بات قبول کر لیں تو ان سے لڑنا جائز نہیں، اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے منظر ہیں کہ کسی دشمن سے دشمن قوم نے اسلام یا محض اطاعت قبول کر لی ہے اور خوں ریزی رک گئی ہے اور لڑائی کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گئی ہے۔

یہ قانون جو سرتاپا امن پسندی، سلامت طلبی اور خوں ریزی سے بچنے کی آخری کوشش پر مبنی ہے اس کو مخالفوں نے اس صورت میں پیش کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی تعلیم دی، آنحضرت ﷺ کا دستور تھا کہ جب کسی فوج کو متعین کرتے تو سردار کو یہ ہدایت فرماتے:

> "جب تو مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابل ہو تو اس کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دے، ان میں سے جو بات بھی وہ مان لے اس

---

(۱) صحیح بخاری جلد دوم ص ۶۷۰ کتاب التفسیر سورۃ الانفال باب قولہ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ الخ۔

کو قبول کرلے اور اس پر حملہ کرنے سے رک جا، اس کو اسلام کی دعوت دے اگر وہ قبول کرلے تو پھر اس سے رک جا، اس کے بعد اس سے خواہش کر کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آجائے تو اس کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے، اگر وہ نہ مانے تو اس کی حالت بدو مسلمانوں کی سی ہوگی، قانون اس پر مسلمانوں کا جاری ہوگا، لیکن غنیمت اور فی میں اس کا حصہ نہ ہوگا جب تک وہ جہاد میں شرکت نہ کرے، اگر وہ اسلام قبول نہ کرے، تو اس کو جزیہ دے کر ذمی بننے کو کہہ، اگر وہ اس کو مان لے تو اس سے بھی رک جا، اگر وہ اس کو بھی نہ مانے تو پھر خدا کی مدد مانگ اور لڑائی شروع کردے۔'' (۱)

یہ وہ اصولِ جنگ ہیں جس سے خوں ریزی کی روک تھام مقصود تھی، نہ یہ کہ کسی کو مجبور کرکے بزورِ شمشیر مسلمان بنالینا، صحابۂ کرامؓ کے زمانہ میں ایرانیوں سے جب لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے تین روز تک میدان جنگ میں تلوار نہیں اٹھائی، حضرت سلمان فارسیؓ تین روز تک ان کو سمجھاتے رہے اور کہتے رہے کہ میں تمہاری قوم سے ہوں لیکن دیکھتے ہو کہ عرب میرے زیرِ فرمان ہیں اگر تم بھی مسلمان ہوجاؤ تو تم کو بھی وہی حقوق ملیں گے جو ہمارے ہیں اور اگر تم اپنے ہی مذہب پر رہنا چاہو تو جزیہ دے کر رہ سکتے ہو لیکن محکوم ہو کر رہو گے (۲)، اس سے معلوم ہوا کہ جنگ میں دشمن کو بھی تبدیلِ مذہب پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ اس کے سامنے دوسری راہیں بھی کھلی تھیں۔

ثمامہؓ بن اثال قبیلۂ بنی حنیفہ میں سے تھے اور یمامہ کے رئیس تھے، یہ وہ قبیلہ ہے جو آخر تک سرکش رہا اور اسی میں آنحضرت ﷺ کے آخر زمانہ میں مسیلمہ پیدا ہوا تھا، ثمامہ اتفاق سے مسلمانوں کے ایک لشکر کے ہاتھ میں گرفتار ہوگئے اور مدینہ لاکر مسجد نبوی کے کھمبے میں باندھ دیے گئے، آنحضرت ﷺ نماز کے لئے تشریف لائے تو پوچھا کہ ثمامہ تمہاری کیا رائے ہے، جواب دیا ''محمد! میری رائے اچھی ہے، اگر مجھے قتل کروگے تو ایک خون والے کو قتل کروگے اور اگر احسان کروگے تو ایک شکرگذار پر احسان ہوگا اور اگر زرِ فدیہ چاہتے ہو تو جو مانگو گے دیا جائے گا''، آنحضرت ﷺ نے کچھ نہیں فرمایا پھر اسی طرح دوسرے دن سوال جواب ہوا، پھر تیسرے دن ہوا، تیسرے دن آنحضرت ﷺ نے

(۱) صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب تامیر الامام الامراء علی البعوث ووصیتہ ایاھم بآداب الغزو وغیرھا ج ۲ ص ۶۲ (۲) جامع الترمذی ابواب السیر باب ماجاء فی الدعوۃ قبل القتال ص ۲۶۸۔

فرمایا کہ ثمامہ کو چھوڑ دو، لوگوں نے کھول دیا، وہ رسی سے کھل کر آزاد ہو گئے مگر سچائی کی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑ گئی، مسجد نبویؐ کے قریب ایک نخلستان میں جا کر غسل کیا اور پھر مسجد میں آ کر کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئے (۱)، کیا کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کے لئے اس سے بہتر موقع مل سکتا تھا؟ بدر کے قیدی گرفتار ہو کر آئے لیکن ان سے یہ نہیں کہا گیا کہ تلوار یا اسلام، اسی طرح جنگ کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ رہا، قرآن پاک نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہا فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (محمد ۴:۴۷) "لڑائی ختم ہونے کے بعد ان قیدیوں کو احسان دھر کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو" یہ ارشاد نہ ہوا کہ اسلام یا تلوار۔

غزوۂ خیبر میں مسلمان روزانہ بعض قلعوں پر حملہ کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں، بالآخر شیر خدا علی مرتضٰی کو حکم ہوتا ہے کہ فوج لے کر جائیں، وہ پوچھتے ہیں یا رسول اللہ کیا میں ان سے لڑوں یہاں تک کہ وہ ہماری طرح ہو جائیں؟ فرمایا آہستگی سے روانہ ہو، یہاں تک کہ ان کے میدان میں پہنچ جاؤ، پھر ان کو اسلام کی طرف بلاؤ اور اس میں ان کا جو حق ہوگا وہ ان کو بتاؤ، خدا کی قسم اگر ایک شخص کو بھی خدا تمہارے ذریعہ سے ہدایت دے دے تو اس سے بہتر ہے کہ تمہاری ملکیت میں سرخ اونٹ ہوں (۲)، لیکن خیبر کے یہود نے اسلام کا مذہب قبول نہیں کیا بلکہ اسلام کی حکومت قبول کر لی اور مصالحت ہو کر تلوار نیام میں کر لی گئی۔

اسی طرح ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر ہتھیار اٹھانا جائز نہیں بلکہ کفر کا موجب ہے، کفار کو مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل معلوم تھا، اکثر لڑائیوں میں جب مشرک حملہ آور اپنی کمزوری محسوس کرتا تھا تو اپنی جان بچانے کے لئے کلمۂ توحید پڑھ دیتا تھا اور ایک بھرے ہوئے مسلمان کو مجبوراً اپنے غصہ کو ضبط کر کے ہاتھ روک لینا پڑتا تھا۔

ایک دفعہ ایک صحابی نے پوچھا کہ اگر لڑائی میں میرا حریف اپنی تلوار سے میرا ہاتھ اڑا دے اور جب میرے حملہ کی باری آئے تو درخت کی آڑ پکڑ کر کہے میں مسلمان ہوتا ہوں، تو اے خدا کے رسول میں کیا کروں، اس کو قتل کروں؟ فرمایا نہیں اس کا قتل جائز نہیں، عرض کی یا رسول اللہ میرا ہاتھ

(۱) صحیح بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفۃ و حدیث ثمامۃ بن اثال ج ۲ ص ۶۲۷ و سنن ترمذی ربط الاسیر (۲) صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الخیبر ج ۲ ص ۶۰۶

اس نے کاٹ ڈالا، فرمایا پھر بھی اس کا قتل جائز نہیں کہ اگر تم نے اب اس کو قتل کیا تو وہ وہ ہو گیا جو تم اس کے قتل سے پہلے تھے اور تم وہ ہو جاؤ گے جو وہ اس اقرارِ توحید سے پہلے تھا(۱)، حضرت اسامہ ابن زیدؓ آپ کے بڑے چہیتے خادم تھے، وہ ایک فوجی دستہ کے سپہ سالار بنا کر ایک لڑائی میں بھیجے گئے، جب گھمسان کا رن پڑا تو ایک کافر ان کی زد میں آیا، انہوں نے حملہ کا قصد کیا تو وہ لا الٰہ الا اللہ پکار اٹھا ایک انصاری جو پہلے اس پر جھپٹے تھے وہ تو رک گئے مگر اسامہؓ نے اس کافر کے اس کلمہ پڑھنے کو اس کی جان بچانے کے فریب پر محمول کر کے کچھ خیال نہ کیا اور نیزہ سے اس کا کام تمام کر دیا، آنحضرت ﷺ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو اسامہ سے سخت آزردہ ہوئے، اسامہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس نے صرف تلوار کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، فرمایا اور کتنا بلیغ فقرہ فرمایا اے اسامہ! تم نے کیا اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا۔ پھر برابر یہ فرماتے رہے اے اسامہ تم قیامت میں اس کے لا الٰہ الا اللہ کا کیا جواب دو گے، اسامہ کہتے ہیں کہ مجھ کو اتنی ندامت تھی کہ میں نے دل میں آرزو کی کہ کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا۔(۲)

دیکھو کہ واقعہ کی تصویر کتنی الٹ دی گئی ہے، واقعہ تو یہ تھا کہ اپنی حملہ آورانہ لڑائی کے گھمسان میں بعض کفار و مشرکین جن کو یہ معلوم تھا کہ کسی کلمہ گو کو مسلمان اپنے مذہب کے حکم کے بہ موجب قتل نہیں کرتے، جب وہ مسلمانوں کی زد میں پڑتے تھے تو اپنی جان بچانے کے لئے فوراً کلمۂ شہادت پڑھ دیتے تھے اور بیان اس صورت میں کیا جاتا ہے کہ اسلام نے کفار کو تلوار کی نوک سے کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا، یہ صداقت ہے؟

اسی طرح آنحضرت ﷺ کا ایک اور اعلان ہے جس کو اکثر غلط معنی میں پیش کیا گیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑائی کروں جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کریں اور جب وہ اقرار کر لیں تو انہوں نے اپنے جان و مال کو مجھ سے بچا لیا اور ان کی نیت کی پرسش خدا کا کام ہے، اس حدیث کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ مسلمان سے لڑنا تو جائز نہیں لیکن کسی غیر مسلم قوم سے بھی لڑنا اسی وقت تک جائز ہے جب تک

(۱) صحیح مسلم کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من مات لایشرک باللہ الخ ج ۱ ص ۵۱ (۲) صحیح مسلم کتاب الایمان باب مذکور ج ۱ ص ۵۱-۵۲ مصر۔

وہ توحید کا اقرار نہ کرے اور جب اس نے یہ کرلیا تو پھر اس سے بھی لڑنا روا نہیں، خواہ وہ حملہ کے ڈر سے لا الٰہ الا اللہ پڑھے یا سچے دل سے اس نے یہ اقرار کیا ہو، اس کی تحقیق کہ کس نیت سے اس نے کلمہ پڑھا، انسان کا فرض نہیں، خدا کا ہے، یہ بالکل ایک مصالحانہ اعلان ہے لیکن لوگ اس کو اس معنی میں پیش کرتے ہیں کہ گویا اسلام کا حکم یہ تھا کہ مسلمان دیوانہ وار تلوار لئے پھرتے اور جس کو پاتے اس کو ڈرا دھمکا کر کہتے کہ کلمہ پڑھو ورنہ سر قلم کردیں گے، غور کرو اگر یہ حکم ہوتا تو قیدی اقرارِ توحید کئے بغیر اس آسانی سے چھوڑے جاتے اور ہاری ہوئی قوموں سے اسلام نہیں، صرف چند درہم کا جزیہ لے کر ان کو آزاد کردیا جاتا؟ اور کیا مسلمانوں کو یہ اجازت ملتی کہ:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا . (انفال ۸:۶۱)

اور اگر کفار کا محارب فریق صلح کے لئے جھکے تو تو بھی جھک جا۔

بلکہ اس کے بجائے یہ حکم ہوتا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہوجائیں ان سے صلح نہ کرنا اور نیز کیا مسلمانوں کو یہ حکم ہوسکتا تھا کہ:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ. (توبہ ۹:۶)

اور اگر (لڑائی کے میدان میں) مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے، پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچادے، یہ اس لیے کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔

بلکہ یہ ہوتا کہ پناہ ملنے اور کلامِ الٰہی سننے کے بعد وہ مسلمان نہ ہو تو اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچانے کے بجائے اس کو قتل کر کے جہنم میں پہنچادو مگر ایسا نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو کس طرح الٹ کر بیان کیا جاتا ہے حالاں کہ اسلام نے ان مشرکوں سے بھی جو ہمارے کسی دوست، مشرک قبیلہ کے دوست ہوں اور ہم سے صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہتے ہوں لڑنے کو منع کیا ہے:

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا. (النساء ۴:۹۰)

تو اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں پھر نہ لڑیں اور تمہارے سامنے صلح کی طرح ڈالیں تو اللہ نے تم کو ان پر حملہ کرنے کی راہ نہیں دی۔

یعنی پھر ان پر تلوار اٹھانا درست نہیں، حالاں کہ اگر اسلام کی مذہبی جنگ جوئی کے وہی معنی ہوتے کہ یا "تلوار یا اسلام" تو کیا اس امن پسندی، اس صلح جوئی اور اس ترکِ جنگ کی صورت ممکن ہو سکتی تھی۔

مسلح تبلیغی جماعتیں: غلط فہمی پھیلانے کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے لئے جو جماعتیں ملک میں بھیجی جاتی تھیں وہ مسلح ہوتی تھیں لیکن یہ حقیقت بھلا دی جاتی ہے کہ یہ عرب کا واقعہ ہے جہاں کوئی منتظم اور باضابطہ حکومت نہ تھی، جس پر تمام رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری ہو، ایک ایک وادی میں ایک ایک قبیلہ اپنی اپنی الگ الگ ریاست قائم کئے ہوئے تھا اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے برسرِ پیکار تھا، راستوں پر رہزنوں اور ڈاکوؤں کا قبضہ تھا جن سے اکا دکا آدمی کا صحیح و سالم بچنا ناممکن تھا، اسی لئے جب کہیں کوئی تبلیغی مہم بھیجی جاتی تھی تو بدامنی کے ملک میں رہنے والوں کے عام دستور کے مطابق وہ اپنی ممکن حفاظت کے لئے مسلح جاتی تھی اور اس بات کی دلیل کہ اس مسلح جماعت کا تبلیغ و دعوت کے سوا کوئی مقصد نہ تھا اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی، جو فوجی حملہ کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔

غزوۂ بدر کے بعد جب قریش کا زور ٹوٹ گیا اور ملک میں اسلام بھی ایک قوت شمار ہونے لگا، تو آنحضرت ﷺ نے بعض بعض قبیلوں کی درخواست پر مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تبلیغ و تعلیم کے لئے ادھر ادھر بھیجا، تب بھی وہ اکثر راستہ میں جان سے ماری گئیں، واقعۂ رجیع میں ستر داعیوں کا مارا جانا، واقعۂ بئر معونہ میں چھ یا دس داعی مسلمانوں کا قتل ہونا، سریۂ ابن ابی العوجا میں پچاس مسلمانوں کی شہادت، واقعۂ ذاتِ اطلاح میں چودہ داعی مسلمانوں کا تیروں سے مارا جانا، عروہ بن مسعود ثقفیؓ کا تیروں سے چھد جانا اس دعویٰ کی شہادت ہے۔

تبلیغ و دعوت کی تنظیم: آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں تشریف فرما رہے، بہ نفسِ نفیس اس فرض کو انجام دیتے رہے، ایک ایک کے پاس جاتے اور حق کا پیغام سناتے، شہر سے نکل کر مکہ کے آس پاس جاتے اور آنے جانے والوں کو بشارت سناتے، مکہ سے نکل کر طائف گئے اور وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا، یہ بھی خدا کی مصلحت تھی کہ اس نے اپنے آخری دین کا مرکز مکہ معظمہ کو قرار دیا، جو عرب کا مرکزی شہر تھا اور حج کے موسم میں تمام قبیلے خود یہاں آجاتے تھے آپ ﷺ سال ہا سال حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور خدا کی دعوت پیش کرتے، اسی سالانہ تبلیغ سے اسلام

کو وہ جماعت ہاتھ آئی جس کا نام انصار ہے۔

الغرض ان تبلیغی سرگرمیوں سے مکہ میں سینکڑوں آدمی مسلمان ہو چکے تھے مگر قریش کے ظلم سے وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور آنحضرت ﷺ کے مشورہ سے وہ حبشہ کی طرف روانہ ہوئے، اس سفر کی مصلحت بھی عجیب وغریب تھی، ان مظلوم مسلمانوں کی ہجرت نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ وہ اس مسافرت میں جہاں جہاں سے گذرے اسلام کی آواز پہنچاتے گئے اور اس طرح یمن اور حبشہ دونوں ملکوں میں اسلام کی تحریک روشناس ہوئی۔

مکہ میں آنحضرت ﷺ کے بعد عام مسلمانوں میں سب سے پہلے مبلغ اور داعیِ حق حضرت ابوبکرؓ تھے، مکہ کے بہت سے معزز گھرانوں کے پر جوش نوجوان ان ہی کی تبلیغ سے اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے، حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیرؓ حضرت ابوبکرؓ ہی کی کوششوں سے دائرۂ اسلام میں آئے، حضرت ابوبکرؓ کے بعد اسلام کے دوسرے مبلغ حضرت مصعب بن عمیرؓ ہیں جن کے موثر وعظوں کو سن کر آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کے گھرانے کے گھرانے توحید کے پرستار ہو گئے تھے۔

مدینہ منورہ آ کر اسلام نے امن واطمینان کی سانس لی، تو آنحضرت ﷺ نے ان نومسلموں کی تعلیم کے لئے جو اطرافِ ملک سے دارالاسلام میں آتے تھے، نیز ملک کے مختلف گوشوں میں اسلام کی تبلیغ کے لئے ایک جماعت قائم کی جس کا نام عام طور سے اصحابِ صفہ (چبوترہ والے) مشہور ہے، اس میں بعض اوقات سو سے زیادہ آدمی داخل رہے ہیں، یہ لوگ ملک میں اسلام کی دعوت کے لئے بھیجے جاتے اور خود نومسلموں کو تعلیم دیتے، بئر معونہ میں ستر کے قریب جو داعی اور مبلغ راہ میں بے دردانہ قتل ہوئے تھے وہ اسی جماعت کے ارکان تھے۔

ان کے علاوہ وہ اکابرِ صحابہؓ جو وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں، بادشاہوں، قوموں اور قبیلوں میں اسلام کی دعوت لے کر پھیلے، احادیث وسیر کی کتابوں میں ان کے نام متفرق طور سے ملتے ہیں، میں نے تھوڑی سی کوشش سے اس قسم کے پینتیس صحابیوں کے نام جمع کئے ہیں جنہوں نے از خود آنحضرت ﷺ کے حکم سے اس فرض کو انجام دیا۔ ان کے نام یہ ہیں: ابوذر غفاری، طفیل بن عمرو دوسی، جعفر طیار، عمرو بن عبسہ سلمی، ضماد بن ثعلبہ، خالد بن ولید، علی بن ابی طالب، مہاجر بن ابی امیہ، زیاد بن

لبید، خالد بن سعید، عدی بن حاتم، علا بن حضرمی، ابوموسیٰ اشعری، معاذ بن جبل، جریر بن عبداللہ بجلی، دحیہ کلبی، عمرو بن امیہ ضمری، مغیرہ بن شعبہ، عمرو بن العاص، وبر بن نخیس، عروہ بن مسعود ثقفی، عامر بن شہر، منقذ بن حبان، ثمامہ بن اثال، محیصہ بن مسعود، احنف، ابوزید انصاری، عمرو بن مرہ، عیاش بن ربیع مخزومی، واثلہ بن اسقع، عبداللہ بن حذافہ سہمی، حاطب بن ابی بلتعہ، سلیط بن عمرو ابن عبد شمس، شجاع بن وہب اسدی (رضی اللہ عنہم)، ان ہی مبلغوں اور داعیوں اور قاصدوں کی پکار تھی جس نے یمن، یمامہ، بحرین، حجاز، نجد، غرض پورے عرب کو بیدار کر دیا اور عرب سے باہر ایران، شام، مصر، حبش ہر جگہ اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔

مبلغوں کی تعلیم و تربیت: سیرت کی دوسری جلد کے آغاز میں اشاعتِ اسلام کی تاریخ اور دعاتِ معلمین کی تعلیم و تربیت کا حال لکھا جا چکا ہے، سلسلۂ بیان کے لئے یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ ان کو سب سے پہلے قرآن پاک کی سورتیں یاد کرائی جاتی تھیں، لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا، آنحضرت ﷺ کے شب و روز کے ارشادات سننے کا موقع بھی ان کو ملتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تبلیغ کا درس اولین قرآن اور صرف قرآن تھا۔

دعوت بالقرآن: قرآن پاک اسلام کے دعویٰ اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے اور وہی اس کے مذہب کا صحیفہ ہے، خود آنحضرت ﷺ اور دوسرے مبلغ صحابہ بھی تبلیغ و دعوت میں صرف قرآن کی سورتیں پڑھ کر سناتے تھے اور جہاں ان کو اس کا موقع مل جاتا وہاں اس کی تاثیر اپنا کام کر جاتی تھی اور یہ فرض خود قرآن نے اپنا آپ قرار دیا تھا، اس کی تبلیغ کے لئے جہاد کی ضرورت تھی مگر اس جہاد کا ہتھیار لوہے کی تلوار نہیں بلکہ قرآن کی تلوار تھی، جس کی ضرب کی روک خود اور سپر سے بھی ممکن نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اسی تلوار سے جہاد کا حکم دیا اور فرمایا:

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا. (فرقان ۲۵:۵۲)	تو اے پیغمبر منکروں کا کہنا مان اور اس قرآن سے ان کے ساتھ بڑے زور سے جہاد کر۔

اس پیغامِ الٰہی کے زمین میں اترنے کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ خدا کے بھولے ہوئے بندوں کو ان کا عہد یاد دلائے، فرمایا:

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ. (ق ۵۰: ۴۵) تو اے پیغمبران کو جو میری دھمکی سے ڈرتے ہوں قرآن کے ذریعہ سے یاد دلا۔

قرآن رحمتِ عالم کا پیامِ عمومی ہے اور یہی اس کے نزول کی غرض و غایت ہے فرمایا:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا. (فرقان ۲۵:۱) برکت والا ہے وہ جس نے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب اپنے بندوں پر اس لئے اتاری تا کہ وہ تمام دنیا کو بیدار اور ہشیار کرے۔

یہی قرآن اسلام کی طاقت اور محمد رسول اللہ ﷺ کا اصلی ہتھیار تھا جس کی کاٹ نے کبھی خطا نہ کی۔

اشاعتِ اسلام کی قدرتی ترتیب: عرب میں صرف تین قومیں تھیں جن کا اسلام لانا گویا تمام جزیرہ نمائے عرب کا اسلام لانا تھا، یعنی مشرکین، یہود اور نصاریٰ، مشرکینِ عرب کا مرکز خانۂ کعبہ تھا اور ان کے مذہبی پیشوا قریش تھے، یہود کا صدر مقام مدینہ اور خیبر تھا، نصاریٰ اور مجوس شام اور یمن کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔

اس بنا پر الاقرب فالاقرب کے لحاظ سے اشاعتِ اسلام کی قدرتی ترتیب یہ تھی کہ قریش اور کفار مکہ کو پہلے دعوت توحید دی جاتی، پھر یہود کو حلقہ بگوش اسلام بنایا جاتا، اس کے بعد نصاریٰ اور مجوس کو دعوت دی جاتی، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اسی ترتیب کے ساتھ اسلام کی اشاعت کی اور اسی بنا پر قرآن مجید کا طریق دعوت مختلف نظر آتا ہے، تمام مکی سورتوں کے مخاطب کفارِ مکہ تھے اس لئے ان میں بت پرستی کی مذمت، توحید کی ترغیب، عجائبِ قدرت کا بیان، عذاب الٰہی سے تخویف اور صنادید قریش کی مخالفت کے جواب کے سوا کچھ نہیں لیکن جب آنحضرت ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو یہود سے سابقہ پڑا اور اب قرآن مجید کا طرزِ خطاب بدل گیا چنانچہ ابتدائی مدنی سورتیں زیادہ تر یہود کی مذہبی تاریخ، ان کی تحریفات، ان کی اخلاقی کمزوریوں اور قصصِ بنی اسرائیل پر مشتمل ہیں، سب سے اخیر میں نصاریٰ کی باری آئی اور فتحِ مکہ کے بعد قبائلِ عرب کے وفود کے سلسلہ میں نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا، اسی زمانہ میں سورہ آل عمران نازل ہوئی جس میں نصاریٰ کا ذکر ہے۔

مجوس عرب میں بہت کم تھے، بحرین اور یمن میں خال خال وہ پائے جاتے تھے، وہ بھی

ایرانی النسل تھے، خالص عرب نہ تھے اس لئے قرآن مجید نے خاص طور پر کسی سورہ میں ان سے خطاب نہیں کیا ہے، البتہ جابجا مناسب موقعوں پر ان کا نام لیا ہے اوران کے عقائد کی تردید کی اوران کو ثنویت یعنی دوخداؤں کی پرستش کے بجائے توحید کی دعوت دی ہے۔

قبولِ اسلام کے لئے کیا چیز درکار تھی: اگرچہ یورپ کا یہ عام دعویٰ ہے کہ عرب میں اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا لیکن ابتدا میں جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو قبول کیا، ان کے اوصاف کے پیشِ نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لئے صرف اثر پذیر دل کا جویاں تھا اور جب یہ آشیانہ مل جاتا تھا تو اس کے سامنے یہ طائرِ قدس اپنے پر ڈال دیتا تھا، چنانچہ ابتدائے بعثت میں جن اشخاص نے اسلام قبول کیا، وہ وہی تھے جو نیک طبع، ایمان دار، راستی پسند اور حق جو تھے اور جو نبوت کے اوصاف وخصائص سے واقف تھے، گزشتہ آسمانی مذاہب سے کچھ نہ کچھ آگاہ تھے اور معاشرت اور تمدن سے بہرہ ور تھے، اشخاص کے علاوہ جن قبائل اور آبادیوں نے اسلام کے قبول کرنے میں پیش دستی کی وہ بھی وہی تھیں جن میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی تھیں، عرب کے دو مختلف حصوں جنوبی وشمالی میں سب سے زیادہ اسلام کو کامیابی عرب کے جنوبی حصہ یعنی یمن، عمان، بحرین، یمامہ میں ہوئی اور شمالی حصہ میں سے مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں ہوئی کیوں کہ وہ تمدنی حیثیت سے دنیا کی ممتاز متمدن قوموں ایرانیوں اور رومیوں سے متاثر تھے اور مذہبی حیثیت سے یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کا میل جول اور خلا ملا تھا، اہلِ مدینہ بھی یہودیوں کے تمدن ومعاشرت، روایات اور رسم ورواج سے بہت کچھ متاثر تھے۔(۱)

اسلام کو عربوں سے جس قدر لڑائیاں پیش آئیں وہ سب نجد اور حجاز میں پیش آئیں لیکن مسلمانوں کی کوئی جرار فوج مدینہ، یمن، یمامہ اور بحرین کو فتح کرنے کے لئے نہیں بھیجی گئی، انصارِ مدینہ نے خود مکہ میں آکر اسلام کو لبیک کہا، اطرافِ مدینہ کے قبائل میں غفار نے خود مکہ آکر قریش کی تلوار کی آگ میں کھڑے ہوکر لا الٰہ الا اللہ پڑھا، یمن سے دوس کے قبیلہ کے آدمیوں نے خود مکہ معظمہ پہنچ کر ایمان کی دولت حاصل کی اور اس کے سردار نے اپنا قلعہ اسلام کی پناہ کے لئے پیش کیا، اشعر کا قبیلہ بھی اسی زمانہ میں غائبانہ مشرف بہ اسلام ہوا، ہمدان کا قبیلہ حضرت علیؓ کی دعوت پر

(۱) مستدرک حاکم، کتاب النکاح باب شانِ نزول آیت نِسَاؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ الخ ج ۲ ص ۱۹۵ (صحیح علی شرط مسلم)

ایک دن میں مسلمان ہو گیا۔

عمان کا بھی یہی حال ہوا، وہاں بھی اسلام نے صرف اپنی تبلیغی کوششوں کے ذریعہ سے اقتدار حاصل کیا، ایک بار آپ ﷺ نے عرب کے کسی قبیلے کے پاس ایک آدمی بھیجا، وہ لوگ اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور اس کو زدوکوب کیا، اس نے آکر آپ ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اہلِ عمان ہوتے تو تم کو نہ گالیاں دیتے نہ مارتے۔ (مسلم کتاب فضائل الصحابۃ باب فضل اہل عمان ج ۲ ص ۳۷۵)

یمامہ کے رئیس ثمامہ قید ہو کر مدینہ آئے، یہاں آزاد کر دیے گئے مگر مدینہ کی مسجد میں جو جلوہ انہوں نے دیکھا، اپنی ظاہری مادی آزادی کے بعد بھی اس کی نورانی زنجیر سے انہوں نے رہائی نہ پائی، خود بہ خود مسلمان ہو گئے اور اپنے قبیلہ میں جا کر اسلام کے داعی بن گئے اور آخر خون کا ایک قطرہ گرے بغیر اسلام نے وہاں اکثریت حاصل کر لی۔

دیہاتوں میں سب سے پہلے قریہ جواثی نے صدائے توحید پر لبیک کہا جو مضافاتِ بحرین میں تھا، اسی قریۂ جواثی کے باشندے فتحِ مکہ سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، چنانچہ مسجدِ نبوی ﷺ کے بعد عرب کے دیہاتوں میں سب سے پہلا جمعہ اسی گاؤں میں پڑھا گیا (۱)، بارگاہِ نبوت میں عرب کے وفود اگرچہ فتحِ مکہ کے بعد حاضر ہوئے لیکن بحرین کے لوگوں نے اس میں تمام قبائلِ عرب پر پیش دستی کی، چنانچہ ۵/ہجری میں سب سے پہلا وفد جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ قبیلۂ عبدالقیس کا تھا جو بحرین (۲) میں سکونت گزیں تھا۔

اہلِ یمن کا شمار اگرچہ مہاجرین اولین میں نہیں کیا جاتا لیکن جب آنحضرت ﷺ کی ہجرت کا حال معلوم ہوا اسی وقت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بھی یمن سے ۵۲ آدمیوں کو لے کر مدینہ کی طرف ہجرت کی غرض سے روانہ ہو گئے، بحری سفر تھا وہ لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو بادِ مخالف کے جھونکوں نے اس کو حبشہ میں پہنچا دیا جو مسلمانوں کا سب سے پہلا دار الہجرت تھا، وہاں حضرت جعفرؓ ابن ابی طالب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو یہیں اقامت کا حکم

(۱) صحیح بخاری کتاب الجمعہ باب الجمعۃ فی القریٰ والمدن ج ۱ ص ۱۲۲ (۲) صحیح مسلم کتاب الایمان، باب الامر بالایمان باللہ الخ ج ۱ ص ۲۷۔

دیا ہے تم لوگوں کو بھی یہیں ٹھہرنا چاہیے، چنانچہ وہ لوگ وہیں مقیم ہو گئے اور فتح خیبر کے زمانے میں مہاجرین حبشہ کے ساتھ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔(۱)

یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ، جہالت اور وحشت اور اس کی اشاعت کی سب سے بڑی محرک چیز تمدن، معاشرت اور اخلاق کی بلندی اور کتبِ آسمانی اور دیگر مذاہب سے واقفیت تھی، خود قرآن مجید نے اس کو ظاہر کیا ہے:

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا	دیہاتی بدوی کفر اور نفاق میں سب سے زیادہ سخت ہیں اور
يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ	زیادہ اس کے اہل ہیں کہ وہ ان احکام کو نہ جانیں جو خدا نے
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ. (توبہ۹:۹۷)	اپنے رسول پر اتارے ہیں اور اللہ جانتا اور حکمت والا ہے۔

اور بھی اس قسم کی آیتیں ہیں، جو لوگ بادیہ سے آ کر اسلام لائے تھے اور کچھ مسائل سیکھ کر واپس چلے جاتے تھے، ان سے جو بیعت لی جاتی تھی اس کا نام بیعتِ اعرابی تھا جو کم درجہ سمجھی جاتی تھی، اس بنا پر بادیہ میں الگ تھلگ رہنا صحابہؓ کے زمانہ میں معیوب سمجھا جاتا تھا، بلکہ بعض لوگ اس کو ارتداد کی علامت سمجھتے تھے۔(۲)

اشاعتِ اسلام کے اسباب وذرائع: گذشتہ مباحث پر ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد خود بہ خود یہ عقدہ کھل جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دین حق کو عربوں میں کس طرح پھیلایا اور آپ ﷺ کو کیوں کر کامیابی ہوئی، تاہم اگر واقعات کی روشنی میں ایک ایک صحابی کے قبولِ اسلام کے اسباب کی تلاش کی جائے تو حسب ذیل اسباب سامنے آئیں گے۔

۱-اسلام کے نشر واشاعت کا سب سے مقدم اور اصلی سبب معجزۂ قرآنی تھا، قرآن مجید جس موثر اور دل کپکپا دینے والے طریقہ سے عقائد ومعارف واخلاق کی تلقین کرتا تھا، اس کے سامنے وہ تمام عوائق اور موانع جن کا ذکر اوپر ہو چکا، فنا ہو جاتے تھے، جو لوگ سرے سے خدا کے وجود کے منکر تھے، قرآن مجید ان کے سامنے عالم کی بوقلمونی، مظاہرِ قدرت کی بوالعجبی، کائنات کی نیرنگی، اجرامِ فلکی کی جلوہ گری اور عناصر کی نگار آرائی سے اس طرح استدلال کرتا تھا:

(۱) صحیح مسلم فضائل جعفر بن ابی طالب واسماء بنت عمیس ج ۲ ص ۳۶۱ (۲) صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب تحریم رجوع المهاجر الی استیطان وطنه ج ۲ ص ۱۲۵ وسنن نسائی مع شرحه زهر الربی کتاب البیعة باب المرتد اعرابیا بعد الهجرة ج ۲ ص ۱۸۴ مصر۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ. (بقرہ۲:۲۸)

تم خدا کا انکار کس طرح کرتے ہو حالاں کہ تم کبھی بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی بخشی پھر ایک دن تم کو مردہ بنادے گا، پھر زندہ کرے گا اور پھر اسی کے پاس واپس کیے جاؤ گے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِىْ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ. (بقرہ۲ص۱۶۴)

آسمان و زمین کی پیدائش میں، شب و روز کے اختلاف میں، ان کشتیوں میں جو سمندر میں انسانوں کے لئے سودمند چیزوں کو لے کر چلتی ہیں، بادلوں سے پانی برسانے میں، اس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کرنے میں اور اس زمین میں ہر قسم کے جانداروں کے پھیلانے میں، ہواؤں کے چلانے میں، ان بادلوں میں جو فضائے آسمانی میں مسخر ہیں، دانش مندوں کے لئے یقیناً بڑی نشانیاں ہیں۔

وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ. (آل عمران۳:۸۳)

آسمان و زمین میں جو بھی ہے بہ رضا یا مجبوراً اسی کا اطاعت گذار ہے اور اسی کی طرف ایک دن سب لوٹائے جائیں گے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ. اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا. (آل عمران۳:۱۹۰-۱۹۱)

آسمان و زمین کی خلقت اور شب و روز کے الٹ پھیر میں ان ارباب عقل کے لئے بے شبہ بڑی نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے (ہر حال میں) خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی خلقت پر غور کرتے ہیں کہ خدایا تو نے یہ بے کار پیدا نہیں کیا۔

هُوَ الَّذِىْ يُسَيِّرُكُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِى الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ

وہ وہ ہے جو تم کو خشکی اور دریا میں سفر کراتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور موافق ہوا کشتی والوں

بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ. (یونس۱۰:۲۲)

کے لئے جاری ہے اور لوگ خوش ہو رہے ہیں کہ (دفعتاً) زور کا جھکڑ آیا اور ہر طرف سے موجیں آ گئیں اور لوگوں کو یقین ہو چلا کہ اب وہ گھر گئے، اس وقت وہ خدا کو خلوص ہو کر پکارنے لگتے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ. وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ. وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ (روم۳۰:۲۱-۲۳)

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے لئے تم ہی میں سے جوڑے بنائے کہ تم کو ان سے تسلی ہو اور تم میں باہمی محبت اور ہمدردی پیدا کی، اس بات میں سوچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا پیدا کرنا ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا ہے، اس بات میں جاننے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خدا کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا اور خدا کے فضل (روزی) کو ڈھونڈنا ہے، اس میں سننے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

خدا، یا ایک قوتِ اعظم کا اعتراف خود انسان کی فطرت ہے لیکن غفلت شعاری اور آبائی اثر اور دیگر اسباب سے یہ فطرت کبھی کبھی مردہ اور بے حس ہو جاتی ہے، قرآن مجید اسی خفتہ حس کو بیدار کرتا تھا:

اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. (ابراہیم۱۴:۱۰)

کیا خدا میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ. (بقرہ۲:۲۸)

اور کیسے تم خدا کا انکار کرتے ہو حالاں کہ تم بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی دی، پھر وہ تم کو موت دے گا پھر وہ تم کو زندہ کرے گا پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

عرب میں ملحد کم تھے زیادہ تر بلکہ قریباً تمام تر مشرکین تھے جو خدا کو اگرچہ مانتے تھے لیکن یہ بھی مانتے تھے کہ اس کے سوا اور بھی خدا ہیں جو خدا کے شریک ہیں اور نظامِ عالم ان ہی کے ہاتھ سے

انجام پاتا ہے، انسان کی فطرت ہے کہ جس سے براہِ راست اس کو کام پڑتا ہے اس کو زیادہ مانتا ہے، اسی سے زیادہ محبت کرتا ہے، اسی کی زیادہ پرستش کرتا ہے، چوں کہ مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بادلوں کی بارش، غلہ کی پیداوار، نباتات کی روئیدگی، سب اجرامِ فلکی یا اصنام کا کام ہے، اس لئے ان کو عبودیت کا جو تعلق تھا ان ہی معبودوں سے تھا، وہ ان ہی کی عبادت کرتے تھے، ان ہی سے محبت رکھتے تھے، ان ہی پر نذر چڑھاتے تھے، ان ہی کے سامنے قربانیاں پیش کرتے تھے، معرکوں میں ان ہی کے نام کی جے پکارتے تھے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ کا اصلی کام اسی شرک اور اصنام پرستی کو مٹانا تھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اصل وجودِ باری کے متعلق بہت کم استدلال ہے، زیادہ تر شرک کا ابطال اور اس کی تحقیر اور تہجین ہے۔

قرآن مجید طرح طرح سے نہایت موثر پیرایوں میں شرک کی لغویت کا اظہار کرتا تھا:

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَا اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ. اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ. اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا ۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ. اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ.	کیا وہ جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا اور اس کے بیچ میں نہریں بہائیں اور اس کے لئے پہاڑوں کی میخیں گاڑیں اور دونوں دریاؤں میں اوٹ رکھا، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ جانتے نہیں، کیا وہ جو پریشان خاطروں کی سنتا ہے جب وہ اس کو پکارتے ہیں اور بلا کو ہٹا دیتا ہے اور تم کو دنیا کا حکمراں بناتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے، تم بہت کم سوچتے ہو، کیا وہ جو تم کو خشکی اور تری کی اندھیریوں میں راستہ دکھاتا ہے اور وہ جو کہ اپنی رحمت (بارش) کے آگے ہواؤں کو بھیجتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے، مشرکین جن کو خدا کا شریک کہتے ہیں خدا ان سے برتر ہے، ایا کون ہے جو آفرینش کا آغاز کرتا ہے، پھر اس کو لوٹا لاتا ہے اور وہ کون ہے جو تم کو آسمان وزمین سے روزی دیتا ہے کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے تو کہہ دے کہ اگر سچے ہو تو دلیل لاؤ۔

(نمل ۲۷: ۶۱ تا ۶۴)

کفار اور مشرک عموماً قیامت کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ. (یٰس ۳۶: ۷۸) یعنی جب ہڈیاں سڑ گل چکیں تو اب کون ان کو جلائے گا، قرآن مجید ان سے خطاب کرتا تھا:

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى. ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى. فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى. اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى. (قیامہ ۷۵: ۳۷-۴۰)	کیا انسان پہلے منی نہیں تھا پھر گوشت کا لوتھڑا بنا، پھر خدا نے اس کو ٹھیک کیا اور اس سے دو جوڑا مرد اور عورت بنائے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ کردے۔

غرض عقائد، عبادات، اخلاق، اعمال ہر چیز کو قرآن اس موثر اور دل نشین طریقہ سے ادا کرتا تھا کہ دل میں گھر کر جاتا تھا اور رسم و عادت کا بند اس سیلاب کو کسی طرح روک نہیں سکتا تھا، اس پر بھی جو کفر پر ثابت قدم رہے وہ ذاتی اغراض کا اثر تھا حقیقی جحود اور انکار نہ تھا۔

تمام بڑے بڑے صحابہ، بڑے بڑے روسائے قبائل، بڑے بڑے شعرا اور خطبا قرآن ہی سن کر ایمان لائے، حضرت عمرؓ کس ارادہ سے چلے تھے لیکن جب قرآن مجید کی آیتیں سنیں تو کانپ اٹھے اور اسلام قبول کرلیا، عتبہ جو رئیسِ قریش اور علوم عرب کا ماہر تھا جب اس نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آکر کہا کہ تم نبوت کی دعوت سے باز آؤ، ہم تمہارے لئے سب کچھ مہیا کردیتے ہیں، آپ ﷺ نے حٰمٓ کی ابتدائی آیتیں پڑھیں، جب یہ آیت آئی:

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ (حٰم السجدہ ۴۱: ۱۳)	تو اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دے کہ میں تم کو اس کڑک سے ڈراتا ہوں جو عاد و ثمود کی کڑک کی طرح ہے۔

تو عتبہ نے بے تاب ہو کر آنحضرت ﷺ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا خدا کے لئے بس، تم کو قرابت کی قسم دلاتا ہوں، پھر واپس جا کر قریش سے کہہ دیا کہ محمد جو کلام پیش کرتے ہیں، وہ نہ تو شعر ہے نہ جادو ہے اور نہ کہانت ہے(۱)، (بلکہ کوئی اور چیز ہے) حضرت ابوذرؓ نے اسلام لانے سے پہلے اپنے بھائی انیس کو جو شعرائے عرب میں تھے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں تحقیقِ حال کے لئے بھیجا تھا، وہ خدمت

---

(۱) علامہ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح جلد چہارم ص ۴۴ مسند ابویعلیٰ وغیرہ سے روایت نقل کی ہے، نیز یہ روایت مستدرک حاکم میں بھی ہے (سیرۃ سوم ص ۲۴۰ طبع جدید) میں مصنف نے اس کے لئے کتاب التفسیر ابن مردویہ و مسند ابی یعلی و سیرۃ ابن اسحاق کا حوالہ دیا ہے، اور لکھا ہے کہ اخیر فقرہ صرف سیرۃ ابن اسحٰق میں ہے، دیکھئے سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۰) ''ض''

اقدس میں حاضر ہوئے اور قرآن مجید سنا تو جا کر حضرت ابوذرؓ سے کہا کہ لوگ ان کو کاہن اور شاعر کہتے ہیں، لیکن میں کاہنوں اور شاعروں دونوں کے کلام سے واقف ہوں، ان کا کلام دونوں سے الگ ہے، انیس کے بعد حضرت ابوذرؓ خود گئے اور واپس آئے تو ان کا آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا۔(۱)

ولید بن مغیرہ (حضرت خالدؓ کا باپ) جو اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا، جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ نے یہ آیتیں پڑھیں:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ	خدا عدل کا، احسان کا اور رشتہ داروں کو عطا کرنے کا حکم
وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ	دیتا ہے اور فحش سے، بری بات سے اور ظلم سے منع کرتا ہے
الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ	وہ تم کو سمجھاتا ہے کہ شاید تم سمجھ جاؤ۔
لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ. (نحل ۱۶: ۹۰)	

ولید نے کہا پھر پڑھنا آپ ﷺ نے دوبارہ پڑھا، وہ واپس گیا اور قریش سے جا کر کہا کہ یہ انسان کا کلام نہیں۔(۲)

عثمان بن مظعونؓ بڑے پایہ کے صحابی اور سابقینِ اسلام میں ہیں، یہی آیتیں ہیں جن کو سن کر ان کے دل نے سب سے پہلے اسلام کا جلوہ دیکھا، وہ خانہ کعبہ کو جا رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے راستہ میں اپنے پاس بٹھالیا، پھر فرمایا کہ ابھی مجھ پر یہ کلام اترا ہے، یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اوپر والی آیتیں پڑھیں وہ کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ اسلام نے میرے دل میں گھر کیا۔(۳)

جبیر بن مطعم نے کفر کے زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو سورہ طور پڑھتے سنا، جب اس آیت پر پہنچے:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ ھُمُ	کیا یہ لوگ از خود پیدا ہو گئے یا یہ خود خالق ہیں، کیا آسمان
الْخٰلِقُوْنَ. اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	اور زمین کو ان ہی لوگوں نے پیدا کیا، بلکہ (واقعہ یہ ہے کہ)
بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ. اَمْ عِنْدَھُمْ خَزَآئِنُ رَبِّکَ	ان میں ایمان نہیں، کیا ان کے پاس خدا کے خزانے ہیں۔
اَمْ ھُمُ الْمُصَیْطِرُوْنَ. (طور ۵۲: ۳۵-۳۷)	کیا یہی لوگ سربراہ کار ہیں۔

(۱) صحیح مسلم فضائل حضرت ابوذرؓ ج ۲ ص ۳۴۷ تا ۳۴۹ (۲) الجواب الصحیح ج ۴ ص ۴۶ بحوالہ عبدالرزاق (۳) مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۳۱۸ و فضل اللہ الصمد فی توضیح ادب المفرد و امام بخاری باب البغی جز ثانی ص ۳۳۸ قاہرہ ۱۳۷۸ھ۔

تو خود جبیر کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل اڑنے لگا۔ (۱)

طفیل بن عمرو الدوسی مشہور شاعر اور شرفائے عرب میں تھے، ہجرت سے پہلے وہ مکہ گئے، لوگوں کو آنے کی خبر ہوئی تو ان کے پاس گئے اور آنحضرت ﷺ کی نسبت کہا کہ ان کے پاس نہ جانا، وہ لوگوں پر جادوں کر دیتے ہیں، لیکن جب حرم میں اتفاقیہ آنحضرت ﷺ کی زبان سے قرآن سنا تو ضبط نہ کر سکے اور مسلمان ہو گئے۔ (۲)

ہجرت سے پہلے جب آنحضرت ﷺ نے طائف کا سفر کیا اور مشرکین کو اسلام کی دعوت دی تو اگرچہ ادھر سے اس کا جواب ڈھیلا اور پتھر تھا، تاہم خالد العدوانی نے جو طائف کے رہنے والے تھے آپ ﷺ کو

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۔ (طارق ۸۶:۱) قسم ہے آسمان کی اور رات کے چلنے والے ستارہ کی۔

پڑھتے سنا تو وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسی حالتِ کفر میں پوری سورہ یاد کر لی (۳) اور آخر اسلام لائے۔

حضرت ابوبکرؓ کو قیام مکہ کے زمانہ میں بعض مشرکین نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا، اسی زمانہ میں انہوں نے ایک مسجد بنوائی تھی اور اس میں نماز پڑھا کرتے تھے لیکن نماز بلند آواز سے پڑھتے تھے، جس کو سن کر محلہ کے نوجوان اور عورتیں جمع ہو جاتیں اور قرآن سنتیں تو ان کا دل خود بہ خود اسلام کی طرف کھنچتا، چنانچہ اسی بنا پر کفار نے حضرت ابوبکرؓ سے شکایت کی کہ قرآن پکار کر نہ پڑھا کرو، اس سے ہمارے بچے اور عورتیں مفتون ہوتی جاتی ہیں (۴)، انصار اول اول جب مقام عقبہ میں اسلام لائے تو قرآن ہی سن کر لائے تھے، جو لوگ داعی بنا کر بھیجے جاتے ان کو قرآن یاد کرایا جاتا اور وہ جہاں جاتے یہی کارگر آلۂ تسخیر لے کر جاتے، نجاشی کے دربار میں کفار قریش جب سفیر بن کر گئے اور ان کی شکایت پر نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر باز پرس کی تو حضرت جعفر طیارؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں، نجاشی بے اختیار رو پڑا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل ایک ہی چشمہ سے نکلے ہیں۔ (۵)

---

(۱) صحیح بخاری کتاب التفسیر سورہ طور ج ۲ ص ۷۲۰ (۲) ان کے اسلام کا حال ابن القیم (زاد المعاد) نے بہ تفصیل لکھا ہے اور ابن اسحاق کے حوالہ سے لکھا ہے ج ۲ ص ۴۴ مطبع میمنیہ مصر (۳) مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۳۳۵ (۴) بخاری شریف باب ھجرۃ النبی واصحابہ الی المدینۃ ج ۱ ص ۵۵۲-۵۵۳ (۵) مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۲۹۱ (مسند کی روایت میں یہ الفاظ وارد ہیں "ان ھذا والذی جاء بہ موسیٰ لیخرج من مشکاۃ واحدۃ" لیکن سیرت ابن ہشام میں وہ الفاظ ہیں جن کا ترجمہ مصنف نے متن میں نقل کیا ہے)۔ "ض"

حبش میں جب آپ ﷺ کی بعثت کا چرچا ہوا تو بیس شخص جو مذہباً عیسائی تھے، تحقیقِ حال کے لئے مکہ میں آئے اور آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے ان کے سامنے قرآن مجید کی آیتیں پڑھیں ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اسی وقت اسلام لائے، آنحضرت ﷺ کے پاس سے یہ لوگ اٹھے تو ابوجہل نے ان سے مل کر کہا، تم سخت احمق ہوا تنے دور سے سفر کر کے آئے اور دم بھر میں اپنا مذہب بدل لیا، انہوں نے کہا ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔(۱)

لکم دینکم ولنا دیننا.

قرآن کی پیشین گوئیوں کی صداقت نے بھی لوگوں کو کھینچا، چنانچہ اہل ایران کے مقابلہ میں رومیوں کی فتح کی جو پیشین گوئی کی تھی جس دن یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی صدہا کافر مسلمان تھے۔(۲)

ایک ضروری نکتہ: عام خیال یہ ہے کہ اہلِ عرب جو قرآن مجید سن کر اسلام قبول کر لیتے تھے وہ صرف فصاحت و بلاغت کا کرشمہ تھا، یعنی چوں کہ عرب میں شعر و خطابت کا بہت چرچا تھا اور تمام ملک میں شاعری کا مذاق سرایت کر گیا تھا اس لئے جب وہ دیکھتے تھے کہ کسی اور شاعر یا خطیب کا کلام ایسا فصیح و بلیغ نہیں ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتے تھے۔

بے شبہہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجز ہے لیکن اس کا اعجاز جس قدر عبارت و انشا میں ہے اس سے کہیں زیادہ معانی و مطالب میں ہے۔

فرض کرو کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایسا ہی معجز ہوتا جیسا اب ہے، لیکن اس میں صرف تاریخی واقعات یا اسی قسم کی اور کوئی بات ہوتی تو کیا یہی اثر پیدا ہو سکتا تھا، قرآن مجید ایک طرف تو فصاحت و بلاغت کے بنا پر اعجاز کا کام دیتا تھا، دوسری طرف جو مطالب اور مقاصد ادا کرتا تھا وہ اسلام ہی کے مقاصد اور مطالب تھے، وہ خدا کی عظمت و جلالت، اصنام کی تحقیر، انسان کا عجز و تعبد، سزا و جزا، بعث و نشر، جور و ظلم کی تقبیح، اخلاقِ حسنہ کی تحسین، ان مطالب کو اس طرح ادا کرتا تھا کہ خود بہ خود دلوں میں گھر کرتے جاتے تھے اور ان کو یہ نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ان باتوں کو اس لئے مان رہے ہیں کہ مسلمان ہو چکے ہیں بلکہ یہ باتیں براہِ راست ان کے دل میں اتر جاتی تھیں اور وہ مسلمان ہوتے جاتے تھے۔

(۱) ابن ہشام ج ۱ مطبوعہ مصر باب خدیث نقض الصحیفۃ ص ۲۳۷-۲۳۸ (۲) صحیح ترمذی تفسیر سورہ روم ص ۵۲۸۔

موانع کا ازالہ: عرب کو جو چیزیں اسلام سے روکتی تھیں ان میں سب سے اہم (جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں) ان کے اوہام واعتقاداتِ باطلہ تھے جو سینکڑوں ہزاروں برس سے چلے آتے تھے، یا سیاسی اور معاشی ضرورتیں تھیں، مقدم الذکر باتوں کا قرآن مجید اور اعجازِ نبوی نے استیصال کر دیا، عرب میں جو لوگ صاحبِ فہم اور ذی اثر تھے اور سیاسی اسباب سے مجبور نہ تھے، یہ ناممکن تھا کہ وہ قرآن سنتے اور ان کے تمام عقائد اور اوہام دفعتاً فنا نہ ہو جاتے، یہ اربابِ اثر جب خود متاثر ہو جاتے تھے تو ان میں سے ایک ایک شخص کے اثر سے ہزاروں اشخاص ہو جاتے تھے، کیوں کہ قبائل پرستی کی بنا پر قبیلہ کا ہر معزز رئیس اپنے پورے قبیلہ کے دل ودماغ کا مالک ہوتا تھا۔

البتہ جو لوگ سیاسی اسباب سے مطلقاً دعوتِ اسلام کی طرف متوجہ ہی ہونا نہیں چاہتے تھے، انہوں نے بار بار دار النبوۃ (مدینہ منورہ) پر چڑھائیاں کیں، لیکن نصرتِ ایزدی نے ان کو اس قدر شکستیں دیں کہ بالآخر مجبور ہو کر بیٹھ گئے، ان میں سے کچھ فنا ہو گئے، کچھ چار ونا چار اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے جن میں سے اکثر رفتہ رفتہ بالآخر دل سے مسلمان بن گئے۔

قبائل کی ریاست سیاسی حیثیت سے گو اسلام کے مخالف تھی لیکن بعض وجوہ سے اسلام کو تائید بھی پہنچاتی تھی، اسلام کی جمہوریت جس قدر ریاست کی مخالف تھی اسی قدر عام جماعت کی حامی تھی، اسلام سے اگر ایک رئیس کی شانِ ریاست وخودسری کو نقصان پہنچتا تھا تو ہزاروں آدمیوں کو نظر آتا تھا کہ اسلام قبول کر لینے سے ہر شخص رئیس کا ہمسر ہو جاتا ہے، غرض اسلام اگر ایک رئیس کو مٹاتا تھا تو سینکڑوں کو رئیس بنا دیتا تھا۔

اس کے ساتھ رؤسا کی ریاست بالکل زائل نہیں ہو جاتی تھی، بلکہ اسلام قبول کرنے پر وہ اپنے قبیلہ کے رئیس باقی رہتے تھے، صرف اتنا ہوتا تھا کہ ان کی بے قید مطلق العنانی قائم نہیں رہتی تھی اور اسلامی احکام کا پابند رہنا پڑتا تھا، اس لئے اگر کوئی خود غرضی بھی کرنا چاہتا تھا تو اس کو بھی یہ سودا گراں نہیں پڑتا تھا، مولفۃ القلوب کا گروہ اس کی ایک صریح نظیر تھا۔

اب صرف معاش کی ضرورت سدِ راہ نہیں ہو سکتی تھی لیکن لوگوں کو نظر آتا تھا کہ جن حدود میں اسلام کی حکومت قائم ہو جاتی ہے وہاں امن وامان قائم ہونے کی وجہ سے تجارت اور دیگر ذرائع معاش کثرت سے ترقی کر جاتے ہیں۔

۲۔نبوت کے متعلق ان کو جو شکوک تھے، مشاہدہ اور تجربہ نے ان کا پردہ چاک کر دیا، بڑی سے بڑی انسانیت اور پاک سے پاک زندگی کا جو تخیل ایک انسان کے ذہن میں آسکتا تھا، محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس سے بھی بہ درجہا بالاتر اور ارفع تھی، ان کو نظر آتا تھا کہ گو مدعیِ نبوت بہ ظاہر جامۂ بشریت میں ہے لیکن اپنی معنوی زندگی، اپنے معجزانہ اخلاق، اپنے مافوق الفطرت علم و معرفت، اپنے ربانی کرشموں کی بنا پر بشریت سے کوئی بالاتر مخلوق ہے، مَا هٰذَا بَشَرًا ط اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (یوسف ۳۱:۱۲) قرآن مجید نے آنحضرت ﷺ کے صدقِ نبوت پر اسی مقدس اور معصوم زندگی سے استدلال کیا ہے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. (یونس۱۰:۱۶)

اے قریش! نبوت سے پہلے بھی میں نے تم میں ایک مدت دراز تک زندگی بسر کی ہے کیا تم نہیں سمجھتے۔

زندگی کا یہی اعجاز تھا جس نے ظہورِ نبوت سے پہلے ہی امین کا خطاب اپنے لئے حاصل کر لیا تھا، بیوی کے برابر انسان کے اصلی حالات و اخلاق کا واقف کار کوئی اور نہیں، نبوتِ محمدی ﷺ کا معتقد اولین دنیا میں کون تھا، ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا بنت خویلد، لیکن ان کی اس زود اعتقادی کا راز کیا تھا، ۴۰ برس کے معجزانہ اخلاق اور مافوق الفطرت اوصاف و حالات کا تجربہ، وہ خود پیغمبر کو خطاب کر کے نبوت کی تسکین ان الفاظ میں دیتی ہیں، محمد! خدا کبھی تمہیں رسوا نہ کرے گا، تم رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرتے ہو، ناداروں کی طرف سے قرض ادا کرتے ہو محتاجوں کی خبر لیتے ہو، مہمانوں کے ساتھ بہ مدارات پیش آتے ہو، جو لوگ حقیقت میں مبتلائے آلام ہیں ان کی اعانت کرتے ہو۔(۱)

سن چکے ہو کہ عرب میں آپ ﷺ کی نبوت کا جب چرچا پھیلا تو ابوذر غفاریؓ نے انیسؓ اپنے بھائی کو تحقیقِ حال کے لئے بھیجا انہوں نے واپس آکر پیکرِ نبوت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا، میں ایک ایسے شخص کو دیکھ کر آیا ہوں جو بھلائیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔(۲)

نبوت کے بعد قریش نے ذاتِ نبوی کے ساتھ گو عداوت اور کینہ پروری کا کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا، تاہم کوئی ادنیٰ اخلاقی جرم بھی آپ ﷺ کی طرف منسوب نہ کر سکے، اسلام کے سب سے اول اعلانِ دعوت کے موقع پر جب آپ ﷺ نے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر قریش کے مجمع کو مخاطب کیا اور پوچھا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک فوجِ گراں تم پر حملہ آور ہونے کو تیار ہے تو کیا سچ مانو گے؟

(۱) صحیح بخاری بدء الوحی ج ا ص ۳ (۲) صحیح بخاری ج ا ص ۴۹۹ کتاب المناقب قصۃ اسلام ابی ذر۔

سب نے بہ یک آواز کہا محمد! تیری بات آج تک ہم نے جھوٹ نہ پائی (۱)، ابوسفیان جو ہجرت کے آٹھویں سال تک اسلام کے سخت ترین دشمن تھے۔ ۶ھ میں ہرقل قیصرِ روم کے دربار میں کفارِ قریش کی ایک جماعت کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے اخلاق و اوصاف کے متعلق اپنی شہادتیں پیش کررہے تھے، تاہم وہ ایک حرف بھی صداقت کے خلاف پیش نہ کرسکے، انہوں نے شہادت دی کہ محمد کبھی جھوٹ نہیں بولے، انہوں نے کبھی بدعہدی نہ کی، شرک سے روکتے ہیں، توحید کی تعلیم دیتے ہیں، عبادت، صدق، عفت، صلۂ رحمی کی تاکید کرتے ہیں، ہرقل ہر فقرہ پر کہتا جاتا تھا کہ نبوت کے یہی آثار و دلائل ہیں، یہ سب سے پہلا دن تھا کہ ابوسفیان کے دل نے آنحضرت ﷺ کی کامیابی کا یقین کیا۔ (۲)

کتاب کی دوسری جلد میں آپ ﷺ کے تمام محاسنِ اخلاق یعنی رفق و ملاطفت، حسنِ معاملت، جود و سخا، عدم تشدد، عفو و درگذر وغیرہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس پر مجموعی طور پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ درحقیقت آنحضرت ﷺ کا ایک معجزہ تھا اور یہ معجزہ تسخیر قلوب ہی کے لئے عطا ہوا تھا، قرآن مجید اس نکتہ کو خود بتاتا ہے:

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا انْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ. (آل عمران ۳:۱۵۹)	اور اے محمد اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے۔

آپ ﷺ کی یہی معجزانہ کشش تھی جو لوگوں کو کھینچ کھینچ کے دائرۂ اسلام میں داخل کرتی تھی اور کفار کے جاہلانہ شکوک و اوہام کو دم کے دم میں مٹا دیتی تھی، صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے آپ ﷺ سے بہت سی بکریاں مانگیں، آپ ﷺ نے دے دیں، اس پر آپ ﷺ کی فیاضی کا اس قدر اثر پڑا کہ اپنے قبیلے میں جا کر اس نے کہا "لوگو! مسلمان ہو جاؤ کیوں کہ محمد ﷺ اس قدر دیتے ہیں کہ ان کو خود اپنے تنگ دست ہونے کا مطلق خوف نہیں ہوتا" (۳)

فتح مکہ میں جب صفوان بن امیہ مجبوراً اسلام لایا تو آنحضرت ﷺ نے اس کو تین سو اونٹ دے دیئے، خود صفوان کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو اس قدر دیا کہ آپ ﷺ پہلے میرے نزدیک

(۱) صحیح بخاری تفسیر سورہ تبت ج ۲ ص ۷۴۳ و صحیح مسلم کتاب الایمان باب فی قولہ وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ج ۱ ص ۱۰۲ (۲) صحیح بخاری بدء الوحی ج ۱ ص ۴-۵ (۳) صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۹۰ باب ما سئل رسول اللہ ﷺ شیئاً فقال لا، و صحیح بخاری کتاب الادب باب حسن الخلق والسخاء ج ۲ ص ۸۹۱-۸۹۲

مبغوض ترین خلق تھے لیکن اس فیاضی سے محبوب ترین شخص بن گئے۔(۱) ہند خاندانِ نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی، جنگِ احد میں قوتِ بازوئے اسلام حضرت حمزہؓ کے شکم کو اسی نے چاک کیا تھا، اسی نے ان کا جگر نکال کر چبایا تھا جس کو نگل نہ سکی اور پھر اگل دیا تھا اور اسی نے بعض شہیدوں کے ناک کان کاٹ کر گلے کا ہار بنایا تھا، وہ فتحِ مکہ میں بھیس بدل کر آپ ﷺ کی خدمت میں اسلام لانے کے لئے حاضر ہوئی اور اب بھی گستاخی سے باز نہیں آئی لیکن دربارِ رسالت میں پہنچ کر آپ ﷺ کے حسنِ خلق سے اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار بول اٹھی یارسول اللہ سطحِ زمین پر آپ ﷺ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا مجھے مبغوض نہ تھا لیکن آج آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا محبوب نہیں ہے، آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ خدا کی قسم ہمارا بھی یہی حال تھا۔(۲)

آپ ﷺ پر ایک یہودی عالم کا قرض آتا تھا، اس نے تقاضا کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے اس نے کہا میں تو لے ہی کے ٹلوں گا، آپ ﷺ نے کہا تو اب میں تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں، چنانچہ آپ ﷺ ظہر سے لے کر فجر کی نماز تک اس کے ساتھ بیٹھے رہے، صحابہؓ نے اس کی اس گستاخی پر ناراضی ظاہر کی اور خدمت اقدس میں عرض کیا کہ "یارسول اللہ آپ کو ایک یہودی نے روک رکھا ہے" آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں لیکن مجھے خدا نے اس سے منع کیا ہے کہ میں کسی ذمی یا اور کسی شخص پر ظلم کروں"، دن چڑھا تو یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ "میرا نصف مال خدا کی راہ میں صدقہ ہے میں نے یہ گستاخی صرف اس لئے کی کہ توراۃ میں پیغمبر کے جو اوصاف مذکور ہیں انکا تجربہ کروں"۔(۳)

ثمامہ بن اثال آلِ یمامہ کا ایک رئیس تھا جو اسلام کا مجرم تھا، صحابہؓ کا ایک دستہ نجد کے اطراف میں بھیجا گیا تھا حسنِ اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا، گرفتار ہو کر مدینہ آیا اور مسجدِ نبوی ﷺ کے ایک ستون میں باندھ دیا گیا، آنحضرت ﷺ نماز کے لئے تشریف لائے تو اس پر نظر پڑی آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ ثمامہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟، اس نے کہا کہ اگر قتل کرنا چاہیں تو ایک خونی مجرم کو آپ قتل کریں گے اور اگر عفو فرمائیں تو یہ احسان ایک احسان شناس کی گردن پر ہوگا، اگر مال کی خواہش ہے تو فرمائیے جو ارشاد ہوگا حاضر کیا جائے گا، یہ سن کر آپ ﷺ اسی حالت میں اس کو چھوڑ کر چلے

(۱) صحیح مسلم باب مذکور (۲) مسلم ج ۲ ص ۵۵ قضیۃ ھند (۳) مشکوۃ ص ۵۱۳ کتاب الفتن باب فی اخلاقہ وشمائلہ ﷺ مطبع احمدی دہلی ۱۲۷۱ ہجری

گئے، دوسرے دن پھر اسی قسم کا سوال و جواب ہوا، تیسرے دن پھر یہی گفتگو کی، آنحضرت ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اس کے بند گرہ کھول دیے اور رہا کر دیا، اس پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ مجد سے نکل کر ایک کھجور کے درخت کی آڑ میں گیا اور وہاں غسل کیا، غسل کر کے مسجد میں آیا اور کلمہ توحید پڑھ کر آنحضرت ﷺ کی طرف مخاطب ہوا "محمد! زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ کوئی چیز مجھ کو مبغوض نہ تھی لیکن آج وہ مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے، مجھ کو آپ کے دین سے زیادہ کسی دین سے عداوت نہ تھی لیکن آج وہ میرے لئے تمام مذاہب سے عزیز تر ہو گیا ہے، مجھے آپ کے شہر سے زیادہ کسی شہر سے دشمنی نہ تھی لیکن وہ آج مجھ کو تمام شہروں سے زیادہ خوش نما نظر آتا ہے"۔(۱)

ایک بار آپ ﷺ کسی سفر میں تھے اور پانی ساتھ نہ تھا، صحابہؓ نے پیاس کی شکایت کی، آپ ﷺ نے ایک صحابی کے ساتھ حضرت علیؓ کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا، راہ میں ایک عورت اونٹ پر پانی کی دو مشکیں بھرے ہوئے لیے جا رہی تھی، دونوں صاحب اس کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے آئے، آپ نے برتن منگوائے اور مشکوں کے منہ کھول دئے، صحابہؓ نے باری باری سے پانی پینا شروع کر دیا، وہ کھڑی یہ تماشا دیکھتی رہی، فراغت کے بعد اس کی محنت کے صلہ میں آنحضرت ﷺ نے کھجور، آٹا اور ستو تھوڑا تھوڑا لوگوں سے جمع کر کے ایک کپڑے میں بندھوا کر اس کے اونٹ پر رکھوا دیا وہ گھر پہنچی تو لوگوں نے تاخیر کا سبب پوچھا، اس نے کہا راہ میں مجھ کو دو آدمی ملے اور وہ مجھ کو اس شخص کے پاس لے گئے جس کو لوگ بددین کہا کرتے ہیں، خدا کی قسم وہ یا تو اس آسمان و زمین کے درمیان سب سے بڑا جادوگر ہے اور یا واقعی خدا کا رسول ہے۔

لیکن اسلام کا یہ اثر صرف اسی کی ذات تک محدود نہ رہا بلکہ تربیت یافتگانِ نبوت کے فیضِ اثر سے اس کے تمام قبیلے تک وسیع ہو گیا۔(۲)

نبی کے امتیاز و شناخت کا ذریعہ صرف اخلاق ہی کا اعجاز نہیں، اس کی زبان کا ایک ایک حرف اس کی معصوم شکل و صورت کی ایک ایک ادا اعجاز اور سرتاپا اعجاز ہوتی ہے۔

روے و آواز پیمبر معجزہ است (رومی)

(۱) صحیح مسلم ج ۲ ص ۷۵-۷۶ کتاب الجہاد والسیر، باب ربط الاسیر وحبسہ و جواز المن علیہ (۲) بخاری ج ۱ ص ۴۹ کتاب التیمم باب الصعید والطیب وضوء المسلم

آپ ﷺ کی صداقت سے لبریز تقریر کا ایک ایک حرف دل میں اتر جاتا تھا اور نبوت کا اصلی معیار سامع کے سامنے روشن ہو جاتا تھا۔

جب آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو تمام مدینہ میں غل پڑ گیا، حضرت عبداللہ بن سلامؓ جو مدینہ کے مشہور یہودی عالم تھے اپنے نخلستان میں کھجور توڑ رہے تھے، آمد آمد کی خبران کے کان میں پہنچی تو فوراً آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ فرما رہے تھے: افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا الارحام وصلوا والناس نیام، تدخل الجنة بسلام. (۱) واپس گئے تو اس قدر متاثر تھے کہ آنحضرت ﷺ اٹھ کر حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مکان میں جوں ہی پہنچے حضرت عبداللہ بن سلام بھی آئے اور کہا کہ میں آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں اور نیز یہ شہادت دیتا ہوں کہ آپ ﷺ ایک حق مذہب لے کر آئے ہیں۔ (۲)

ضمادؓ ایک شخص تھے جن کے زمانۂ جاہلیت میں آپ ﷺ کے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے، وہ جنون کا علاج کرتے تھے، اتفاق سے وہ مکہ میں آئے تو کفار سے سنا کہ آپ ﷺ (نعوذ باللہ) مجنون ہو گئے ہیں، وہ آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہا ''محمد! میں جنون کا علاج کرتا ہوں''۔ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے ایک تقریر کی اور اس کو ان الفاظ سے شروع کیا:

ان الحمد لله نحمده و نستعينه من يهده الله فلا مضل له و من يضلل فلا هادی له و اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريک له و ان محمدا عبده و رسوله	تمام تعریفیں خدا کے لئے ہیں میں اس کی حمد کرتا ہوں اور اس سے مدد چاہتا ہوں، خدا جس کو ہدایت دیتا ہے اس کو کوئی شخص گمراہ نہیں کر سکتا جس کو گمراہ کرتا ہے اس کو کوئی ہدایت نہیں کر سکتا، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔

ان پر ان فقروں کا یہ اثر پڑا کہ وہ مکرر سننے کے مشتاق ہوئے، آپ ﷺ نے تین بار ان کلمات کا اعادہ فرمایا انہوں نے کہا کہ میں نے کاہنوں جادوگروں اور شاعروں کا کلام سنا ہے لیکن آپ ﷺ کے اس کلام کی طرح موثر کلام کبھی نہیں سنا، وہ سمندر تک پہنچ جائے گا، ہاتھ لایئے میں اسلام

(۱) مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۴۵۱ (۲) بخاری ج ۱ ص ۵۵۶ باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدينة.

پر بیعت کرتا ہوں۔(۱)

حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر حارث یعنی آپ ﷺ کے رضاعی باپ جب مکہ میں تشریف لائے تو قریش نے کہا کچھ سنا ہے تمہارا بیٹا کہتا ہے کہ لوگ مر کر پھر زندہ ہوں گے، انہوں نے آپ ﷺ سے کہا بیٹا یہ کیا کہتے ہو؟ آپ ﷺ نے نہایت زوردار لہجہ میں فرمایا: ہاں اگر وہ دن آیا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر بتا دوں گا کہ جو کچھ میں کہتا تھا سچ تھا، ان پر اس کا یہ اثر پڑا کہ فوراً مسلمان ہو گئے اور یہ اثر اس قدر دیرپا ہوا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میرا بیٹا ہاتھ پکڑے گا تو جنت میں پہنچا ہی کر چھوڑے گا۔(۲)

انسان کا چہرہ حقیقت کا آئینہ ہے آپ ﷺ کی ایک ایک ادا صداقت اور معصومیت کا پیکر تھی، آپ ﷺ کی شکل نہایت پر جلال تھی، چہرہ پرنور تھا، آواز موقر اور پر رعب تھی اور ان تمام چیزوں کا مجموعی اثر پیغمبرانہ اعجاز کے ساتھ دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا، حضرت عبداللہ بن سلام نومسلم یہودی عالم آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک کو دیکھ کر اسی اثر سے متاثر ہوئے اور بے اختیار بول اٹھے تھے:

وجه ليس بوجه كذاب (ترمذی:۴۰۹) جھوٹے آدمی کا یہ چہرہ نہیں ہو سکتا۔

اور یہی کشش تھی جس کا اظہار حجۃ الوداع میں اعرابِ بادیہ کی زبان سے ان الفاظ میں ہوا تھا:

هذا وجه مبارك. (ابوداؤد حج، باب المواقیت ج ا ص ۱۷۴) یہ مبارک چہرہ ہے۔

بارگاہِ نبوت میں پہنچنے کے ساتھ ہی یہ اثر آنکھوں کی راہ سے دل میں پہنچ جاتا تھا، ابورافع نامی ایک شخص قریش کی طرف سے قاصد بن کر آپ ﷺ کی خدمت میں آئے تھے، جوں ہی چہرۂ اقدس پر نظر پڑی وہ بہ ہزار جان شیدا تھے، اسلام قبول کیا (۳) اور آپ ﷺ کی غلامی کو فخر سمجھا۔(۴)

---

(۱) مسلم کتاب الجمعہ باب تخفيف الصلاة والخطبة ج ا ص ۳۱۹-۳۲۰ (۲) اصابہ ج ا ص ۲۹۶ تذکرہ حارث ابن عبدالعزیٰ مطبعہ سعادہ مصر (۳) ابوداؤد کتاب الجہاد باب يستجن بالامام في العهود ج ا ص ۲۷۵ (۴) اصابہ ص ۶۵-۶۶ واستیعاب ج ۲ ص ۶۶۸۔

اسلام
یا
محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ کام

آنحضرت ﷺ جس عظیم الشان پیغام کو لے کر آئے تھے اور جس مہتم بالشان کام کو انجام دینے کے لئے بھیجے گئے تھے، نیک دل اور حقیقت شناس لوگ تو سننے اور دیکھنے کے ساتھ اس کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے لیکن وہ بھی جن کے دل کے آئینے زنگ آلود تھے، پیغام کی سچائی، وحی کی تاثیر، پیغمبر کی پر اثر دعوت، اعجازِ معصومیت اور اخلاق کے پرتو سے صاف و شفاف ہوتے گئے اور عوائق، موانع، شبہات اور شکوک کی تو بر تو ظلمتیں اور تاریکیاں رفتہ رفتہ چھٹتی چلی گئیں اور اسلام کا نور روز بہ روز زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے افق پر درخشاں اور تاباں ہوتا گیا، یہاں تک کہ ۲۳ برس کی مدت میں ایک متحدہ قومیت، ایک متحدہ سلطنت، ایک متحدہ اخلاقی نظام، ایک کامل قانون، ایک مکمل شریعت، ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت، خدا پرستی، اخلاق، ایثار، تدین، تقویٰ، ایمان داری، اخلاق اور سچائی کا ایک مجسم عہد یعنی ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پیدا ہو گیا اور گویا یہی حقیقت تھی جس کی طرف آپ ﷺ نے اپنی امت کے سب سے بڑے مجمع میں (حجۃ الوداع) میں اپنی وفات سے تقریباً دو ماہ پیشتر یہ ارشاد فرمایا:

الا ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوٰت والارض.

ہاں اب زمانہ کا دور اپنی اسی حالت پر آ گیا جس حالت پر اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔

(بخاری، کتاب المغازی، باب حجۃ الوداع ج ۲ ص ۶۳۲)

اور یہی حقیقت تھی جس کی نسبت آپ ﷺ نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پیشتر ایک نہایت پر درد وداعی تقریر کے آخر میں یہ الفاظ فرمائے: (۱)

لقد ترکتکم علی البیضاء لیلھا ونھارھا سواء.

میں تم کو ایک روشن راستہ پر چھوڑ جاتا ہوں، جس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ اس کی رات بھی دن کے مانند ہے۔

(۱) سنن ابن ماجہ مقدمہ باب اتباع سنۃ رسول اللہ ﷺ ص ۲ و مستدرک حاکم ج ۱ ص ۹۶ و مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۱۲۶۔

اور آخری حجۃ الوداع کے مجمع عام میں تکمیل کی بشارت آئی کہ:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (مائدہ ۵:۳) آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر ختم کر دی۔

پروفیسر مارگولیتھ جن کی تائیدی شہادت بہت کم مل سکتی ہے، لکھتے ہیں:

"محمد (ﷺ) کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا، آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دار السلطنت مقرر کیا گیا تھا، بنیاد ڈال چکے تھے آپ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔" (۱)

ایک دور (یورپ) کے بیگانہ مستشرق کی بہ نسبت جس کا علم، عرب اور اسلام کے متعلق صرف چند کتابوں سے مستعار ہے، خود ایک عرب عیسائی اہلِ قلم کو فیصلہ کا زیادہ حق حاصل ہے، بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں ایک عیسائی عالم (داور مجاعص) نے لکھا:

"دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس (۲) کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ امی اور ناخواندہ تھا وہ کون؟ محمد بن عبداللہ قریشی، عرب اور اسلام کا پیغمبر، اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لئے اور اس سلطنت کے لئے جس کو اس نے قائم کیا، ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دئے، اس طرح کہ قرآن اور احادیث کے اندر وہ تمام ہدایات موجود ہیں جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اس کے دینی یا دنیاوی معاملات میں پیش آسکتی ہے، حج کا ایک سالانہ اجتماع فرض قرار دیا تا کہ اقوامِ انسانی میں اہلِ استطاعت ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے دینی و قومی معاملات میں باہم مشورے کر سکیں، اپنی امت پر زکوۃ فرض کر کے قوم کے غریب طبقہ کی حاجت پوری کی، قرآن کی زبان کو دنیا کی دائمی اور عالم گیر زبان بنا دیا کہ وہ مسلمان

(۱) لائف آف محمد مارگولیتھ ص ۴۷۱ (۲) مدینہ منورہ میں آپ دس برس زندہ رہے تھے۔

اقوام کے باہمی تعارف کا ذریعہ بن جائے، قوم کے ہر فرد کو ترقی کا موقع اس طرح عنایت کیا کہ یہ کہہ دیا کہ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر صرف تقویٰ کی بزرگی حاصل ہے، اس بنا پر اسلام ایک حقیقی جمہوریت بن گیا جس کا رئیس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے، مسلمانوں نے ایک مدت تک اس اصول پر عمل کیا، یہ کہہ کر کہ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں، اسلام میں داخل ہونا ہر شخص کے لئے آسان کر دیا، نا مسلموں کے لئے اسلامی ملکوں میں عیش و آرام اور امن و اطمینان سے سکونت کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپنے اوپر لے لی کہ ''تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے تو خدا کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی اولاد کو سب سے زیادہ فائدہ پہونچائے''، خاندانی اور ازدواجی اصلاحات بھی اس کی نظر سے پوشیدہ نہ رہیں، اس نے نکاح و وراثت کے احکام مقرر کئے، عورت کا مرتبہ بلند کیا، نزاعات اور مقدمات کے فیصلے کے قوانین بنائے، بیت المال کا نظام قائم کر کے قومی دولت کو بیکار نہ ہونے دیا، علم کی اشاعت اور تعلیم اس کی کوششوں کا بڑا حصہ رہی، اس نے حکمت کو ایک مومن کا گم شدہ مال قرار دیا، اسی سبب سے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانہ میں ہر دروازہ سے علم حاصل کیا، کیا ان کارناموں کا انسان دنیا کی سب سے بڑی ہستی قرار نہ پائے گا؟''

انگلستان کے مشہور انشا پرداز کارلائل نے اپنے ''ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ'' میں لاکھوں پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں میں صرف محمد عربی ﷺ ہی کے وجود گرامی کو اس قابل سمجھا کہ وہ آپ ﷺ کو نبوت کا ہیرو قرار دے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار ''محمد'' آپ کی نسبت کہتا ہے۔

''قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقا کا پتہ چلتا ہے جو تمام نبیوں اور مذہبی لوگوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔'' (۱)

الغرض دوست و دشمن سب کو اس کا اعتراف ہے کہ انبیا میں یہی برگزیدہ ہستی ہے جس نے کم سے کم مدت میں اپنی بعثت اور رسالت کے زیادہ سے زیادہ فرائض ادا کئے اور اصلاحاتِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا جس کی تکمیل اس کی تعلیم اور عمل سے نہ ہوگئی ہو اور یہ اس لئے کہ تمام انبیا (علیہم السلام) میں خاتم نبوت، مکمل دین اور آخری معلم کی حیثیت آپ ہی کو عطا ہوئی تھی، اگر انسان کی عملی و اخلاقی و دینی ضرورتوں کا کوئی گوشہ آپ کے فیض سے محروم رہ کر تکمیل کا محتاج ہوتا تو آپ ﷺ کے

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون ''قرآن'' جلد ۱۵ ص ۵۹۸۔

بعد بھی کسی آنے والے کی حاجت باقی رہ جاتی حالاں کہ آپ ﷺ نے فرمادیا کہ ”میرے بعد کوئی نبی نہیں، میں نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ ہوں۔“(۱)

آپ ﷺ کی تعلیمات کی یہی ہمہ گیری ہے جس پر کوتاہ بینوں کو آج نہیں بلکہ خود صحابہؓ کے عہد میں بھی تعجب ہوتا تھا، بعض مشرکوں نے حضرت سلمان فارسیؓ سے مذاقاً کہا کہ تمہارے پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں یہاں تک کہ اس کی بھی کہ تم کو قضائے حاجت کیوں کر کرنی چاہیے، حضرت سلمانؓ نے کہا ہاں یہ سچ ہے آپ ﷺ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبلہ رخ نہ بیٹھیں، نہ اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت کریں اور نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں جن میں کوئی ہڈی اور گوبر نہ ہو، (۲) نبوتِ محمدی ﷺ کی تعلیمات کی یہ ہمہ گیری ہی اس کی تکمیل کی دلیل ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پست سے پست اور غیر متمدن سے غیر متمدن اقوام سے لے کر بلند سے بلند اور متمدن سے متمدن قوموں تک کے لئے یکساں تعلیمات اور ہدایات رکھتی ہے، عرب کے بدویوں اور قریش کے رئیسوں دونوں کے لئے آپ ﷺ کی بعثت تھی، اس لئے آپ ﷺ کی تعلیمات میں پست کو بلند اور بلند کو بلند تر بنانے کی برابر کی ہدایت ہے، آج یہی چیز ہے کہ افریقہ کے وحشیوں میں اسلام اپنی تعلیمات کے ساتھ تنہا جاتا ہے، اور ان کو متمدن اور مہذب بنانے کے لئے مذہب سے باہر کسی تعلیم کی اس کو ضرورت پیش نہیں آتی ہے، لیکن عیسوی مذہب کو چند اخلاقیات کو چھوڑ کر کہ جن کا ماخذ انجیل ہے، عقائد پادریوں کی نسلوں سے دعائیں اور عبادات کلیساؤں کے حکم رانوں سے اور تہذیب وتمدن کی تعلیمات یورپ کے بے دینوں اور ملحدوں سے حاصل کرنی پڑتی ہیں، لیکن اسلام میں محمد رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کچھ نہیں، عقائد ہوں کہ عبادات اور دعائیں، اخلاق ہوں کہ آداب تمدن، خانگی معاملات ہوں یا لین دین کے کاروبار، انسانوں کے ساتھ معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ، سب کا ماخذ محمد رسول اللہ ﷺ کی ہمہ گیر تعلیمات ہیں۔

آپ ﷺ کی ان ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے، چار

---

(۱) صحیح بخاری جلد اول باب خاتم النبیین ص ۵۰۱ و جامع ترمذی کتاب الامثال باب ما جاء مثل النبی و الانبیاء ص ۴۶۶

(۲) جامع ترمذی ابواب الطہارۃ باب الاستنجاء بالحجارۃ ص ۵ و سنن ابن ماجہ کتاب الطہارۃ باب الاستنجاء بالحجارۃ والنھی عن الروث ص ۲۷۔

ابواب پر منقسم ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

آپ ﷺ نے بتایا کہ ہر انسان کا تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی دوسری مخلوقات کے ساتھ، اسی مفہوم کو دوسری عبارت میں یوں کہو کہ اس کا ایک تعلق اپنے آقا اور مالک کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے آقا اور مالک کے غلاموں کے ساتھ، یا یوں کہو کہ اس کا ایک رخ تو آسمان کی طرف ہے اور دوسرا زمین کی سمت، اس کو ایک لگاؤ تو عالمِ غیب سے ہے اور دوسرا عالمِ شہود سے، پہلے کے ساتھ اس کا تعلق ایک مہربان آقا اور فرماں بردار غلام کا ہے اور دوسروں کے ساتھ اس کا تعلق برادری اور بھائی چارے کا ہے، خالق اور مخلوق یا خدا اور بندہ کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے اس کا تعلق اگر صرف ہمارے ذہنی قویٰ اور قلبی حالات سے ہے تو اس کا نام عقیدہ ہے، اور اگر ان قلبی حالات کے ساتھ ہمارے جسم و جان اور مال و جائداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے، باہم انسانوں انسانوں میں، یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ و رابطہ ہے اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں اگر ان کی حیثیت محض قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے اور ان کی حیثیت قانون کی نہیں بلکہ روحانی نصیحتوں اور برادرانہ ہدایتوں کی ہے تو اس کا نام اخلاق ہے۔

قرآن پاک کی اصطلاح میں پہلے تعلقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہے اور دوسرے تیسرے اور چوتھے کی بجا آوری کا نام عملِ صالح ہے اور ان ہی دونوں کے مجموعہ پر کامل نجات کا انحصار ہے، عمل صالح کی تین قسمیں ہیں ۱۔ خدا کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کے احکام کی تعمیل، ۲۔ بندوں کے ساتھ کاروبار اور معاملہ میں قانون الٰہی کی پابندی ۳۔ اور ان کے ساتھ محبت، الفت اور نیکی اور بھلائی کا برتاؤ اور اس لحاظ سے کہ ان میں سے ہر ایک عمل کو جس میں خدا کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو، اسلام عبادت کہتا ہے، لیکن اصطلاح میں پہلے کا نام عبادات، دوسرے کا نام معاملات اور تیسرے کا نام اخلاق ہے، الغرض محمد رسول اللہ ﷺ جو عالم گیر شریعت اور دائمی ہدایت لے کر آئے وہ ان ہی چاروں عنوانوں کا مجموعہ ہے یعنی عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق ان ہی کی اصلاح، تعلیم اور تکمیل کے لئے آپ ﷺ کی بعثت ہوئی اور یہی آپ ﷺ کے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی کارنامے ہیں۔

عقائد

عقائد کی حقیقت اور اہمیت: انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں، یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں، یہ عام خیالات درحقیقت اس کے چند پختہ غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں، ان ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں، یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرۂ حیات کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہوتا ہے، ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں، ہمارے ارادہ کا محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں، عام بول چال میں ان ہی چیزوں کی تعبیر ہم "دل" کے لفظ سے کرتے ہیں، اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضا میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے، فرمایا:

الا وان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وهی القلب. (صحیح بخاری کتاب الایمان باب فضل من استبرء لدینه ج ۱ ص ۱۳)

انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا ہاں وہ ٹکڑا دل ہے۔

قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں، سب سے پہلے قلب سلیم (سلامت رو دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل قلب اثیم (۱) (گنہ گار دل) یہ وہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے اور تیسرا قلب منیب (رجوع ہونے والا دل) یہ وہ ہے جو اگر کبھی بھٹکتا اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہو جاتا ہے، غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں جس کا نام دل ہے، ہمارے اعمال کا ہر محرک ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے، اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا:

(۱) قرآن پاک کی آیت میں یہ ہے فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ (بقرہ ۲:۲۸۳)

انما الاعمال بالنیات. (صحیح بخاری آغاز کتاب ج ۱ ص ۲)

تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے۔

اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں آپ ﷺ نے یوں ادا فرمایا:

انما لا مریء ما نوی فمن کانت هجرته الی دنیا یصیبها او الی امرأة ینکحها فهجرته الی ما هاجر الیه. (صحیح بخاری آغاز کتاب ج ۱ ص ۲)

ہر شخص کے کام کا ثمرہ وہی ہے، جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت کی غرض دنیا کا حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہے تو اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے، جس کے لئے اس نے ہجرت کی (یعنی اس سے اس کو ثواب حاصل نہ ہوگا)

آج کل علم نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہتاً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمراں ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے، اب صحیح اور صالح عمل کے لئے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت میں ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔

جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ ثابت ہو سکتی ہے، اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لئے بھی چند مبادی اور چند اصولِ موضوعہ ہم پہلے تسلیم نہ کرلیں۔

بہ ظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لئے ہم کو رہنما نظر آتی ہے، لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں، وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لئے اس پابہ زنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندورونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے، اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینیات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعہ، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ "عملِ صالح" کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حسنِ عمل کا دارومدار ہے، عبداللہ بن جدعان ایک قریشی تھا جس نے جاہلیت میں بہت سے نیکی کے کام کئے تھے، مگر بایں ہمہ مشرک تھا، اس کی

نسبت آنحضرت ﷺ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ یارسول اللہ عبداللہ ابن جدعان نے جاہلیت میں جو نیکی کے کام کئے کیا ان کا ثواب اس کو ملے گا؟ فرمایا نہیں اے عائشہ کیوں کہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ بارالٰہا میرے گناہوں کو قیامت میں بخش دے۔(۱)

بدر کی لڑائی کے موقع پر ایک مشرک نے جس کی بہادری کی دھوم تھی حاضر ہو کر کہا کہ ''اے محمد! میں بھی تمہاری طرف سے لڑنے کے لئے چلنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے'' فرمایا ''کیا تم اللہ عز و جل اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو''، اس نے جواب دیا ''نہیں'' فرمایا ''واپس جاؤ کہ میں اہل شرک سے مدد کا خواستگار نہیں''، دوسری دفعہ پھر آیا اور وہی پہلی درخواست پیش کی، مسلمانوں کو اس کی شجاعت و بہادری کی وجہ سے اس کی درخواست سے بڑی خوشی ہوئی اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ وہ ان کی فوج میں شریک ہو جائے لیکن آنحضرت ﷺ نے اس سے پھر وہی سوال کیا کہ ''کیا تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان ہے''۔ اس نے پھر نفی میں جواب دیا، آنحضرت ﷺ نے پھر وہی فرمایا کہ ''میں کسی مشرک سے مدد نہ لوں گا''، غالباً مسلمانوں کی تعداد کی کمی اور اس کی بہادری کے باوجود اس سے آپ ﷺ کی بے نیازی کی کیفیت نے اس کے دل پر اثر کیا، تیسری دفعہ جب اس نے درخواست پیش کی اور آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ ''تم کو خدا اور رسول پر ایمان ہے'' تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور نور اسلام سے منور ہو کر لڑائی کی صف میں داخل ہوا۔(۲)

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کاموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور اس کا کوئی وجود نہیں رہتا، اسی طرح اس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے بے بنیاد اور بے اصل ہیں:

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ۔ (ابراہیم ۱۸:۴۱)	جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا، ان کے کاموں کی مثال راکھ کی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے، یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ غزوات نسخہ قلمی دار المصنفین و ابن حنبل جلد ۶ ص ۹۳ و ۱۲۰ مصر۔ (۲) صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب کراھۃ الاستعانۃ فی الغزو بکافر جلد دوم صفحہ ۱۰۶ مصر۔

سورۂ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے، کہ اس کے وجود کی حقیقت فریبِ نظر سے زیادہ نہیں:

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَعْمَالُھُمْ کَسَرَابٍۢ بِقِیْعَۃٍ یَّحْسَبُہُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓی اِذَا جَآءَہٗ لَمْ یَجِدْہُ شَیْئًا (نور ۲۴:۳۹)

اور جنہوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام اس سراب کی طرح ہیں جو میدان میں ہو، جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے۔

اس کی ایک اور مثال ایسی سخت تاریکی سے دی گئی ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا اور جس میں ہوش وحواس اور اعضا کی سلامتی کے باوجود ان سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے:

اَوْ کَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰہُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُھَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ یَدَہٗ لَمْ یَکَدْ یَرٰھَا ؕ وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَا لَہٗ مِنْ نُّوْرٍ۔ (نور ۲۴:۴۰)

یا ان کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں سخت اندھیرا ہو اس کے اوپر موج اور موج پر پھر موج ہو اور اس کے اوپر بادل گھرا ہو، اندھیرے میں ایک کے اوپر ایک کہ اس میں ہاتھ نکالے تو وہ بھی سوجھائی نہ دے، جس کو خدا نے نور نہ دیا اس کے لئے نور نہیں۔

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قائم نہیں ہوسکتی، اسی لئے ریا، نمایش اور خود غرضی کے کاموں کو کوئی عزت نہیں دی جاسکتی، وہ کام جو گو بہ ظاہر نیک ہوں لیکن نیکی کرنے والے کا ان سے اصلی مقصد نام ونمود پیدا کرنا ہوتا ہے تو اخلاقی نقطۂ نظر سے تمام دنیا ان کو بے وقعت اور ہیچ سمجھتی ہے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا اور فرمایا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰی ۙ کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَہٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْہِ تُرَابٌ فَاَصَابَہٗ وَابِلٌ فَتَرَکَہٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا ؕ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ

اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو احسان رکھ کر اور الہنے دے کر اس طرح نہ برباد کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کو دکھانے کے لئے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور خدا پر (جو نیکیوں کی جزا دیتا ہے) اور قیامت پر (جس میں نیکیوں کی جزا ملے گی) یقین نہیں کرتا، پس اس کی خیرات کی مثال اس چٹان جیسی ہے جس پر کچھ مٹی پڑی ہو، ذرا

الکافرین (البقرۃ ۲:۲۶۴) اس پر پانی برسا اور مٹی دھل کر پانی رہ گیا، جس پر جو کچھ بویا جائے گا وہ اگے گا نہیں اور خدا کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر عمل بے بنیاد ہے، وہ ہماری سیرابی کا اصلی سرچشمہ ہے، جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی، کیوں کہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر وفائدہ سے خالی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں، خدا کے وجود کا اقرار اور اس کی رضامندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض وغایت ہے، یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں، وہ ہمارے دل کا نور ہے، وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے اور ہمارے تمام کاموں کی بنیاد، ریا، نمائش، جاہ پسندی، خود غرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے دلی جذبات اور پست محرکات کے سوا کچھ اور نہ رہ جائے۔

تورات میں بعض عقیدوں کا ذکر ہے مگر ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت کی تعلیم سے وہ خالی ہے، انجیل میں ایمان کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے مگر اخلاق کی سچائی، اعمال کی راستی اور دل کے اخلاص کے لئے نہیں، بلکہ معجزوں اور کرامتوں کے ظاہر کرنے کے لئے اور خوارقِ عادت پر قدرت اور اختیار پانے کے لئے (۱)، اس کے برخلاف فلسفۂ یونان کے بہت سے پیروؤں اور ہندوستان کے بہت سے مذہبوں نے محض ذہنی جولانی، مراقبہ، تصور، دھیان اور علم کو انسان کی نجات کا ذریعہ قرار دیا اور اخلاق و عمل سے کوئی تعرض نہیں کیا، عیسائیوں، زردشتیوں اور برہمنوں نے عقائد کو یہ وسعت دی اور ان کی ایسی تفصیل کی کہ وہ سرتاپا خیالی فلسفہ بن گئے، جس سے تصوریت عملیت پر غالب آگئی اور انسان کے قوائے عملی سرد ہو گئے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے علم و عمل، تصور اور فعل، عقلیت اور عملیت میں لزوم ثابت کیا مگر اصلی زور انسان کی عملیت پر صرف کیا اور عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین واقرار ضروری قرار دیا جو دل کی اصلاح کرے اور عمل کی بنیاد اخلاق و عبادات کی اساس قرار پاسکے، عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ اور تصورات و نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا، چند سیدھے سادے اصول جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں ان کا نام عقیدہ اور ان پر یقین کرنے کا نام ایمان

(۱) متی ۱۷۔۲۰

رکھا، آپ ﷺ نے صریح الفاظ میں عقائد کے صرف پانچ اصول تلقین کیے، خدا پر ایمان، خدا کے فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال کی جزا اور سزا کے دن پر ایمان۔

یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا ضروری ہے، ان کے بغیر خالص عمل کا وجود نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس دنیا کا تنہا خالق اور مالک ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تاکہ وہی ہمارے کاموں کا قبلۂ مقصود قرار پاسکے اور اسی کی رضا جوئی اور اسی کی مرضی کی تعمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو اور ہم جلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں اور ہر نیکی کو اس لئے کریں اور ہر برائی سے اس لئے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے، اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے مبرا ہو کر خالص ہوسکیں اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضا گناہوں سے پاک ہوں، ہمارا دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے پاک ہو اور اس کے احکام اور اس کے پیغام کی سچائی پر دل سے ایسا یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات، ہمارے غلط استدلالات، ہماری گم راہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کرسکیں۔

خدا کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے ان احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم ان ہی کے واسطہ سے انسانوں کو پہنچا ہے، اگر ان کی صداقت، سچائی اور راست بازی کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغامِ ربانی اور احکامِ الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے اور انسانوں کے سامنے نیکی، نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے، جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے پھر اچھے اور برے، صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کے لئے نہیں ہوگی۔

خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں، مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں مخلوقات کو قانونِ الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں اور ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ نقل کرتے جاتے ہیں تاکہ ہم کو ان کا اچھا یا برا معاوضہ مل سکے۔

خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے، ان کو دور دراز ملکوں

اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لئے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکلوں یعنی کتابوں اور صحیفوں میں یا الفاظ و آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں، اس لئے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہے اس کی سچائی پر ایمان لانا ضرور ہے، ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جائے اور ہمارے لئے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل و عالم، بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔

اعمال کی باز پرس اور جواب دہی کا خطرہ نہ ہو اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیائے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے، یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت اور خلوت میں ان کی ذمہ داری محسوس کراتا ہے، اس لئے روزِ جزا اور یومِ آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے، اسی لئے محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے بلکہ مکی وحی کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔

یہی پانچ باتیں اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ پر، اس کے تمام رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے فرشتوں پر اور روز جزا پر ایمان لانا، یہ عقائدِ خمسہ یک جا طور پر سورۂ بقرہ میں متعدد دفعہ کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان ہوئے ہیں:

اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ........وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ وَبِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ۔ (بقرہ ۲:۳،۴)

جو لوگ غیب (خدا، خدا کی صفات اور ملائکہ) پر ایمان رکھتے ہیں..........اور جو کچھ تم پر (اے محمد) اترا اور تم سے پہلے (پیغمبروں پر) اترا، اس پر یقین رکھتے ہیں (یعنی انبیا اور ان کی کتابوں پر اور آخرت (روزِ جزا) پر یقین رکھتے ہیں۔

یہ تو سورہ کے آغاز کی آیتیں ہیں، سورہ کے بیچ میں پھر ارشاد ہوا:

وَلٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِکَۃِ وَ الۡکِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ (بقرہ ۲:۱۷۷)

اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر، آخری دن پر، فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لائے۔

سورہ کے آخر میں ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مِنۡ رَّبِّہٖ وَ

پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا اس پر وہ خود اور تمام مومن ایمان

الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (بقرہ۲:۲۸۵)

لائے، سب خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔

سورۂ نساء میں ان ہی عقائد کی تعلیم ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا ۢ بَعِيْدًا۔ (نساء۴:۱۳۶)

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو، ایمان لاؤ خدا پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری اور جو شخص خدا کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے پیغمبروں کا اور روز آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان

اٰمَنَ بِاللّٰہِ (بقرہ۲: ۲۸۵)

ایک قادر مطلق اور بہ ہمہ صفت موصوف ہستی پر یقین اور اس کو ایک جاننا تعلیمِ محمدی کی پہلی ابجد ہے، اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے باوجود اس کے کہ خدا کی توحید اور صفات پر ایمان رکھنا ان کے اصول میں بھی داخل تھا، مگر ان کی تعلیمات میں ترتیب مفقود تھی اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی نگاہ میں توحید کا مسئلہ اہمیت کے کس درجہ پر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس مسئلہ کی اصلی اہمیت محسوس کی اور اُس کو اپنے نصابِ درس کا پہلا سبق اور روحانی معارف وحقائقِ جسمانی اور اعمال واخلاق کا سرِ بنیاد قرار دیا، خدا اگر چاہے تو انسان کے تمام گناہوں سے درگذر کر سکتا ہے، مگر اسی ایک حقیقت سے انکار وہ جرم ہے، جس کو وہ کبھی معاف نہ فرمائے گا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (نساء۴: ۱۱۶)	یقیناً خدا شرک کو معاف نہ کرے گا اور اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہے معاف کر دے۔

پھر اس کے ساتھ خالص توحید کا بیان، اسما وصفات کی تشریح، شرک کے ہر پہلو کی نفی اور توحید کے ہر پہلو کی تکمیل تعلیمِ محمدی کی امتیازی شان ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ نبوتِ محمدیہ کی غرض وغایت صرف تخیل، نظریہ آرائی اور الٰہیاتی فلسفہ نہ تھا، بلکہ ایک زندہ قوم، جد وجہد اور عمل والی قوم، اخلاص وایثار اور نیکی وتقویٰ والی قوم کو پیدا کرنا تھا اور اس کو تمام دنیا کی پیشوائی کے لئے نمونۂ عمل بنانا تھا، اس لئے سب سے پہلے اہلِ عرب کو جو اس کے مخاطبِ اول تھے، رموز واسرارِ توحید کا اس طرح حامل بنانا تھا کہ ان کے رگ وریشہ میں ولولہ اور جوش کا ایک نشہ پیدا ہو جائے، اس کے لئے ضرورت تھی کہ سب سے پہلے زمین کو ہموار کیا جائے، شرک کے وہ تمام عقائد جو عربوں میں پھیلے ہوئے تھے ان کو مٹا دیا جائے اور جن وجوہ واسباب سے شرک کے یہ عقائد پیدا ہوتے ہیں ان کی بیخ کنی کی جائے۔

اصلاحِ عقائد: معلوم ہو چکا ہے کہ عرب میں جہالت اور وحشت کی وجہ سے سیکڑوں غلط عقائد اور توہمات پھیل گئے تھے اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی بہت سی غلطیاں داخل ہوگئی

تھیں، ان میں سب سے زیادہ بدتر اور تمام برائیوں کا اصلی محور شرک تھا، اس لئے سب سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اس کی اصلاح سے آغاز کیا۔

شرک اور بت پرستی کا اصلی زینہ اسباب و موثرات کا وجود ہے خدا نے عالم میں ایک سلسلۂ اسباب قائم کر دیا ہے اور عالم کے تمام واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادر مطلق کے دستِ قدرت میں ہے اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی، شرک اس طرح شروع ہوتا ہے کہ پہلے انسان ان اسباب و علل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اسباب سے متاثر ہوتا ہے، اجرامِ فلکی کی عظمت، آفتاب و ماہتاب کی نور افشانی، سمندر کا پرزور تلاطم، عناصر کی نیرنگ آرائیاں انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں، وہ ان کی عظمت و تاثیر سے متاثر، پھر منفعل اور بالآخر ان کا غلام بن جاتا ہے، اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان غور رسی کے دعویٰ سے اس قدر امتیاز اور تفریق کرتا ہے کہ یہ چیزیں خود خدا یا معبود نہیں ہیں لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی، بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے اور یہ چیزیں خدا کی شریک بنتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اصلی مسبب الاسباب نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے۔

شرک کی جو گوناگوں صورتیں دنیا میں موجود تھیں اور جس طرح آنحضرت ﷺ نے ان کا استیصال کیا ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ تعدد خدا کا ابطال: دنیا کی مشہور قوموں میں سے عیسائی اور مجوسی علانیہ مشرک تھے، یعنی تین اور دو خدا مانتے تھے، ہندو بھی اسی کے قریب قریب تھے، ان مذہبوں کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ خدا کے جو مختلف نمایاں اور اہم اوصاف ہیں ان کا مستقل اور مجسم وجود قائم ہو گیا، مثلاً صفتِ خلق اور احیاو اماتت، برہما، بشن، مہیش کے نام سے موسوم ہیں، مجوسیوں نے دیکھا کہ دنیا میں جس قدر اشیا اور افعال و حرکات ہیں سب باہم متضاد ہیں، نور و ظلمت، پستی و بلندی، یمین و شمال، نرم و سخت، رات دن، خیر و شر، حلم و غضب، غرور و خاکساری، فسق و صلاح، کوئی چیز مقابلہ اور تضاد سے خالی نہیں، اس لئے ایسے دو متضاد عالم کا خالق ایک نہیں ہو سکتا، اس بنا پر انہوں نے دو خدا تسلیم کئے اور ان کا نام یزدان اور اہرمن یا نور و ظلمت رکھا۔

قرآن مجید میں تمام احکام، نہایت تدریج کے ساتھ نازل ہوئے، یہاں تک کہ ۱۳ برس کی وسیع مدت تک روزہ، زکوٰۃ اور حج کچھ فرض نہیں ہوا تھا لیکن شرک کا استیصالِ کلی نبوت کا پہلا سبق تھا۔

سورہ زمر مکہ میں نازل ہوئی اور اسی سورہ میں شرک کی تمام صورتیں مٹادی گئیں، تمام دیگر سورتوں میں نہایت کثرت سے اس قسم کے شرک کا ابطال اور رد کیا ہے، اس لئے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

مجوسیوں کے شرک کی بنیاد اس پر تھی کہ افعال خیر و شر کا ایک خالق نہیں ہوسکتا، ورنہ لازم آئے گا کہ خدا شر کو پیدا کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص برائی کے پیدا ہونے کو جائز رکھتا ہے وہ خود اچھا نہیں ہوسکتا، اس لئے قرآن مجید میں نہایت کثرت سے تصریحات آئیں کہ جن کو ہم خیر و شر کہتے ہیں سب کا فاعل خدا ہے، آنحضرت ﷺ نے نہایت تصریح و تاکید کے ساتھ تعلیم کی کہ جو کچھ ہوتا ہے ہے سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے، باقی یہ مسئلہ کہ بری چیز کا خالق اچھا نہیں ہوسکتا، اولاً تو یہ مغالطہ آمیز غلطی ہے، ایک صناع مصور اگر ایک نہایت بدصورت جانور کی تصویر نہایت اچھی کھینچے تو اس کے کمالِ مصوری میں اس سے کچھ داغ نہیں آئے گا کہ جانور خود برا ہے، دوسرے یہ کہ اسلام نے اس مسئلہ کی جس اصلی گرہ کو کھولا ہے وہ یہ ہے کہ اشیا بذاتہ خیر و شر نہیں ہیں، بلکہ وہ اپنے صحیح یا غلط طریقۂ استعمال سے خیر یا شر ہو جاتی ہیں، آگ بجائے خود نہ خیر ہے نہ شر، اگر اس سے اچھا کام لیا جائے تو خیر ہے اور برا کام لیا جائے تو شر ہے، زہر نہ اچھا ہے نہ برا، اگر اس کو بیماریوں کے استیصال میں استعمال کیا جائے تو خیر ہے اور اگر کسی بے گناہ کے قتل میں استعمال کرو تو شر ہے، اسی طرح دوسری اشیا کے بھی خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں، نہ کوئی شے دنیا میں خیر مطلق ہے نہ کوئی شرِ محض، اسی لئے قرآن نے شر کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی ہے بلکہ خود انسان کی طرف کی ہے:

أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَنْ فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا. (جن ۷۲:۱۰)

ایا اہل زمین کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے پروردگار نے ان کو راہ پر لانا چاہا ہے۔

مَآ أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (نساء۴:۷۹)

تجھ کو جو نیکی پہنچی تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو مصیبت پہنچی وہ خود تیری طرف سے ہے۔

أَوَلَمَّآ أَصَابَتْكُمْ مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا

کیا جب تم کو کوئی مصیبت پہنچی جس کی دگنی تم ان کو

قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ. (آل عمران ۳:۱۶۵)

پہنچا چکے ہو تو تم نے کہا، یہ کہاں سے آئی، کہہ دے کہ خود تمہاری طرف سے ہے، خدا ہر بات پر قدرت رکھتا ہے۔

الغرض کسی شے کا ایسا پیدا کرنا جس میں خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں شر نہیں ہے، ان میں اس کے شر کے پہلو کو استعمال کرنا اور کام میں لانا شر ہے، ڈاکٹر بہت سی بیماریوں کے لئے زہریلی دوائیں بناتے ہیں مگر یہ شر نہیں، البتہ جب کوئی شریر ان دواؤں سے ان امراض کے ازالہ کے بجائے کسی کی جان لے لیتا ہے تو وہ شر ہے، حاصل یہ کہ اس دنیا میں جب خیر و شر اشیا میں بذاتہ نہیں ہے، تو اچھی چیزوں کے لئے الگ اور بری چیزوں کے لئے الگ خالق تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ خالق ایک ہی ہے دو نہیں ہیں:

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ. وَلَهٗ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (نحل ۱۶:۵۱،۵۲)

اور خدا نے کہا کہ دو خدا نہ بناؤ وہ ایک ہی خدا ہے، تو مجھ ہی سے ڈرو اور اسی کے لئے ہے جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔

۲۔ بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا: شرک کا بہت بڑا ذریعہ کسی خاص شخص، خاص شے کی تعظیم مفرط ہے، جس کو شخص پرستی، یا یادگار پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں، حضرت عیسیٰؑ، رام چندر، کرشن کو اسی خوش اعتقادی نے آدمی سے خدا بنا دیا، اس بنا پر قرآن مجید میں نہایت پرزور اور پر رعب الفاظ میں شخص پرستی کی تحقیر کی گئی:

یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (نساء ۴:۱۷۱)

اے اہل کتاب اپنے دین میں حد سے زیادہ نہ بڑھ جاؤ، اور خدا کی نسبت وہی کہو جو حق ہے مسیح یعنی عیسیٰ بن مریم صرف خدا کے پیغمبر ہیں،

لَنْ یَّسْتَنْكِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ یَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَیَسْتَكْبِرْ

مسیح کو خدا کا بندہ ہونے سے ہرگز عار نہیں اور نہ مقرب فرشتوں کو (عار ہے) اور جس شخص کو خدا کی بندگی سے عار ہوگا اور بڑائی کی لے گا تو خدا سب کو عن قریب اپنے حضور

فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا. (نساء۴:۱۷۲)

میں جمع کرے گا۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. (مائدہ۵:۱۷)

وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ بن مریم خدا ہیں کہہ دو کہ اگر خدا یہ چاہے کہ مسیح بن مریم کو اس کی ماں کو اور دنیا میں جو کچھ ہے سب کو برباد کردے تو کون ہے جو خدا کو روک لے اور خدا ہی کے لئے آسمان اور زمین اور جو چیزیں ان دونوں میں ہیں سب کی حکومت ہے، وہ جو چاہے کرے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللَّهِ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ. مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ (مائدہ۵:۱۱۶-۱۱۷)

اور جب خدا کہے گا کہ کیوں عیسیٰ تم نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا کہو، عیسیٰ عرض کریں گے کہ سبحان اللہ میری یہ مجال ہے کہ میں ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں، اگر میں نے کہا ہوگا تو تو جانتا ہوگا، تو میرے دل کی بات جانتا ہے اور میں تیرے دل کی بات نہیں جانتا تو بڑا غیب داں ہے، میں نے لوگوں سے صرف وہی کہا تھا جس کا حکم تو نے مجھ کو دیا تھا یعنی یہ کہ خدا کی عبادت کرو جو میرا بھی خدا ہے اور تمہارا بھی۔

آنحضرت ﷺ باوجود اس کے کہ حاصلِ کون ومکاں تھے لیکن بار بار قرآن مجید میں تاکید آتی تھی:

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (کہف۱۸:۱۱۰)

کہہ دے اے پیغمبر کہ میں تو تمہاری ہی طرح آدمی ہوں لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے۔

ایک خاص نکتہ غور کے قابل ہے جس قدر جلیل القدر انبیا علیہم السلام گذرے ہیں، ان کے خاص خاص لقب ہیں، مثلاً حضرت موسیٰ کلیم اللہ تھے، حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت عیسیٰ روح اللہ تھے لیکن آنحضرت ﷺ باوجود اس کے کہ اشرف انبیا تھے آپ ﷺ کا کیا لقب تھا اور کلمہ توحید میں، نماز میں، درود

میں آنحضرت ﷺ کے اسمِ گرامی کے ساتھ کیا امتیازی وصف شامل کیا گیا؟ صرف رسالت اور عبدیت:

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ — میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد خدا کے بندہ اور رسول ہیں۔

اس میں بھی عبدیت کا وصف رسالت پر مقدم ہے آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ بعض کفار کے حق میں دعائے بدکی اس پر یہ آیت اتری: (۱)

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ۔ (آل عمران ۳:۱۲۸) — تم کو کچھ اختیار نہیں ہے، خدا چاہے گا تو ان پر توجہ کرے گا یا ان کو عذاب دے گا کہ وہ ظالم ہیں۔

آنحضرت ﷺ بعض کفار کی ہدایت پانے اور اسلام قبول کرنے کے نہایت خواہش مند تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ (قصص ۲۸:۵۶) — تم جس کو چاہتے ہو اس کو ہدایت نہیں کر سکتے۔

آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن ابی کے لئے دعائے مغفرت کی اس پر قرآن مجید میں آیا: (۲)

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔ (توبہ ۹:۸۰) — تم ان کے لئے مغفرت چاہو یا نہ چاہو اگر تم ان کے لئے ستر دفعہ بھی مغفرت چاہوگے تو خدا ان کی مغفرت نہ کرے گا۔

آنحضرت ﷺ ہمیشہ ہر موقع پر اس امر کی تاکید اور اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ لوگ آپ کی زائد از اعتدال مدح نہ کریں جو منجر ہو کر شرک تک پہنچ جائے، بار بار فرماتے تھے:

لا تطرونی کما اطری الیهود و النصاریٰ۔ (۳) — میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنے پیغمبروں کی شان میں کیا۔

ایک دفعہ آپ ﷺ راستہ میں جا رہے تھے، ایک شخص نے دفعتاً آپ ﷺ کو دیکھا اور اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا آپ نے فرمایا ڈرو نہیں میں ایک قریشی خاتون کا بیٹا ہوں، جو گوشت کو

(۱) بخاری غزوہ احد باب لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ج ۲ ص ۵۸۲، یہ حدیث بخاری کے مختلف ابواب میں مذکور ہے۔ (۲) بخاری کتاب التفسیر، تفسیر سورہ توبہ ج ۲ ص ۶۷۳ (۳) بخاری جلد اول ص ۴۹۰ کتاب الانبیاء باب وَاذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ مَرْيَمَ۔

خشک کر کے کھایا کرتی تھی۔(۱)

بنو عامر کا ایک وفد جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگوں نے عرض کی آپ ﷺ ہمارے سید (آقا) ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا سید خدا ہے، لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہم سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا اچھا یہ کہو لیکن دیکھو کہیں تم کو شیطان اپنا وکیل نہ بنالے(۲)، اصلی الفاظ یہ ہیں: قولوا بقولکم ولا یستجر ینکم الشیطان.

ایک دفعہ ایک شخص نے ان الفاظ میں آپ ﷺ کو مخاطب کیا ''اے ہمارے آقا! اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند، آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگو! پرہیزگاری اختیار کرو، شیطان تمہیں گرانہ دے، میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے مجھے پسند نہیں کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ''۔(۳)

غور کرو کہ رسول کی شان میں یہ الفاظ ناجائز نہیں، مگر توحید کو شرک کے ہر شائبہ سے بچانے کا خیال ہر خیال پر غالب تھا۔

۳۔ درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد: شرک کا اصلی ضرر یہ ہے کہ خدا سے انسان کو جس درجہ کا تعلق جس قسم کا عجز و نیاز، جس مرتبہ کی محبت، جس درجہ التجا درکار ہے اس کا رخ دوسری جانب بدل جاتا ہے، ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوتا کائنات اور زمین وآسمان کے خالق نہیں ہیں، تاہم وہ ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں ان ہی دیوتاؤں اور معبودوں سے مانگتے ہیں، ان ہی کو حاجت روا جانتے ہیں، اٹھتے بیٹھتے ان ہی کا نام لیتے ہیں، ان ہی پر نذر و نیاز چڑھاتے ہیں غرض براہ راست ان کو جو تعلق ہوتا ہے ان ہی معبودوں سے ہوتا ہے، خود مسلمانوں میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا طرز عمل انبیا و صلحا بلکہ مزارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہے، اس بنا پر مقدم ترین امر یہ ہے کہ معبودوں کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے بلکہ صاف صاف بتا دیا جائے کہ خدا کے آگے کسی کی کچھ نہیں چل سکتی اور اس کی مرضی میں کوئی دست اندازی نہیں کر سکتا، حضرت ابراہیم

(۱) شمائل ترمذی (وابن ماجہ ابواب الاطعمہ باب القدید ۲۴۶ ''ض'' ومستدرک جلد ۳ صفحہ ۴۸ علی شرط الشیخین دخول الناس فی الاسلام افواجا بعد فتح مکۃ (۲) ادب المفرد امام بخاری ہل یقول سیدی الجزء الاول ص ۳۰۱ وابوداؤد کتاب الادب باب فی کراھۃ التماوح ج ۱ ص ۱۸۸ (۳) مسند احمد بن حنبل جلد ۳ ص ۱۵۳۔

نے اپنے باپ سے طلبِ مغفرت کا وعدہ کیا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا:

لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَکَ وَمَآ اَمْلِکُ لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ (ممتحنہ ۶۰:۴)	میں آپ کے لئے مغفرت کی درخواست ضرور کروں گا لیکن مجھ کو خدا کے سامنے آپ کی نسبت کوئی اختیار نہیں۔

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنی والدہ کے لئے استغفار کی اجازت مانگی تھی وہ نہیں ملی، البتہ یہ درخواست قبول ہوئی کہ میں ان کی قبر کی زیارت کرلوں۔ (۱)

قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ. (شعراء،۲۶:۲۱۴) تو آپ ﷺ نے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا: ''اے قریشیو! اے اولادِ عبدالمطلب! اے عباس! اے صفیہ! اے فاطمہ! میرے مال میں سے جو مانگو میں دے سکتا ہوں لیکن خدا کے ہاں میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا'' (۲)

قرآن مجید میں نہایت کثرت اور نہایت تشدد کے ساتھ اس مضمون کو ادا کیا گیا کہ تم لوگ جن کو حاجت روا سمجھتے ہو اور جن سے حاجتیں مانگتے ہو ان کو کارخانۂ ہستی میں کسی قسم کا اختیار نہیں:

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ فَلَا یَمْلِکُوْنَ کَشْفَ الضُّرِّ عَنْکُمْ وَلَا تَحْوِیْلًا . اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّہِمُ الْوَسِیْلَۃَ اَیُّہُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَہٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَہٗ ۔ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحْذُوْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۵۶،۵۷)	کہہ دو کہ خدا کے علاوہ تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری مصیبت کے ہٹانے یا بدلنے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے، جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ (بھی) زیادہ قرب حاصل کرنے کے لئے خود خدا ہی کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شبہ تیرے خدا کا عذاب ڈرنے ہی کے قابل ہے۔

۴۔ خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں: شرک کا ایک بڑا ذریعہ خوارقِ عادات کی نسبت غلط فہمی ہے، جن اشخاص سے خوارقِ عادات سرزد ہوتے ہیں ان کی نسبت لوگوں کو پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ خود خدا نہیں ہیں لیکن ان میں خدائی کا شائبہ ضرور ہے، ورنہ ایسے افعال کیوں کر سرزد ہوتے، جو قدرتِ انسانی سے بالاتر ہیں، یہی خیال رفتہ رفتہ دیوتا اور اوتار تک ترقی کرتا ہے اور بالآخر خدائی تک

(۱) صحیح مسلم کتاب الجنائز باب استئذان النبی ﷺ ربہ فی زیارۃ قبر امہ ج ۱ ص ۳۵۹ (۲) یہ روایت اس آیت کی تفسیر میں تمام تفسیروں اور حدیث کی کتابوں میں منقول ہے۔

پہنچادیتا ہے، حضرت عیسیٰؑ اسی بنا پر آج چالیس کرور آدمیوں کے خدا یا خدا کے بیٹے ہیں۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ انبیا علیہم السلام سے معجزات صادر ہوتے ہیں اور یہ امر خصائصِ نبوت میں ہے، تاہم یہ مسئلہ اسلام کے زمانہ تک مشتبہ اور مجمل رہا، قرآن مجید میں اس کے متعلق حسب ذیل امور بیان کئے گئے ہیں:

(۱) معجزات صادر ہوسکتے ہیں اور خدا اپنے مقبول بندوں کو معجزات عطا کرتا ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ. (انعام ۶:۳۷)

اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرت ﷺ) پر کوئی معجزہ خدا کے یہاں سے کیوں نہیں اترا کہہ دو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ معجزہ نازل کرے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(۲) باوجود اس کے کفار کو معجزہ طلبی سے روکا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ نبوت اور رسالت معجزہ پر موقوف نہیں:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ. (رعد ۱۳:۷)

اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرت ﷺ) پر کوئی معجزہ خدا کے ہاں سے کیوں نہیں اترا، تم تو صرف ڈرانے والے ہو اور ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوتا ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا. اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا. اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا. اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا.

(بنی اسرائیل ۱۷:۹۰ تا ۹۳)

اور کفار کہتے ہیں کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم زمین سے چشمہ نہ نکال دو یا تمہارے پاس کھجوروں یا انگوروں کا باغ نہ ہو کہ جس کے بیچ میں تم نہریں جاری کردو، یا آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرادو جیسا کہ تمہارا گمان تھا، یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لے آؤ یا تمہارا گھر سونے کا نہ بن جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تو اس چڑھنے پر بھی یقین نہ لائیں گے جب تک ہم پر کوئی کتاب نہ اتارو جس کو ہم خود پڑھیں کہہ دو کہ سبحان اللہ میں تو صرف بشر ہوں اور رسول ہوں۔

(۴) جو معجزے اس آیت میں کفار نے طلب کئے وہ ناممکن باتیں نہ تھیں، تاہم خدا نے آنحضرت ﷺ کو جو جواب تلقین کیا وہ یہ تھا کہ میں تو بشر ہوں، دوسری جگہ اس کا جواب یہ دیا کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں یعنی معجزے صادر ہوں گے تو یہ میرا فعل نہ ہوگا بلکہ خدا کا ہوگا:

وَقَالُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۔ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ. اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ. (عنکبوت۲۹: ۵۰، ۵۱)

اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرت ﷺ) پر ان کے خدا کے یہاں سے معجزے کیوں نہیں اترے، کہہ دو کہ معجزے تو خدا کے ہاں ہیں اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں کیا ان (کفار) کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر کتاب (قرآن) اتاری جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے اس میں بے شبہ ایمان لانے والوں کے لئے رحمت اور یاد رکھنے کی چیز ہے۔

اسی لئے معجزات کے ذکر میں ہمیشہ باذن اللّٰہ (خدا کی اجازت سے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

۵۔ حلال وحرام کرنا خدا کا کام ہے: شرک کی ایک قسم یہ تھی کہ انبیا یا پیشوایانِ مذہبی کو تحریم وتحلیل کا مجاز سمجھتے تھے، یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کردیں اور جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرادیں، قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا (توبہ۹: ۳۱)

ان لوگوں نے اپنے علما اور درویشوں کو رب بنالیا ہے۔

تو حضرت عدیؓ نے جو حاتم طائی کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے، آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ ہم لوگ اپنے پیشوایانِ مذہبی کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس چیز کو چاہیں حرام کردیں''، عرض کی کہ ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہی رب بنانا ہے''۔(۱) عموماً اہلِ مذاہب پیغمبروں کو شارعِ مستقل سمجھتے ہیں لیکن یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے، شریعت کی تاسیس، حلال وحرام کی

---

(۱) جامع ترمذی ابواب التفسیر سورہ توبہ ص ۵۰۶ وابن کثیر تفسیر آیت مذکور، ج ۲ ص ۳۴۸۔

تعیین، جائز و ناجائز کی تفریق، امر و نہی کے احکام یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، پیغمبر صرف مبلغ اور پیغام رساں اور تعلیم الٰہی سے ان احکام کے شارح اور بیان کرنے والے ہیں، اسی بنا پر قرآن مجید میں ذاتِ نبوی ﷺ کی صفتِ رسالت کو بار بار تاکید اور اصرار کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران ۳:۱۴۴)	محمد تو صرف ایک رسول ہے، اس سے پہلے اور رسول گذر چکے ہیں۔
اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (نساء ۴:۱۷۱)	مریم کا بیٹا عیسیٰ اللہ کا صرف رسول تھا۔

اس حصر سے مقصود یہ ہے کہ انبیا میں خدائی کی کوئی صفت نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ ان میں ہے وہ رسالت اور نبوت کے اوصاف ہیں۔

۶۔ **غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم:** شرک کا ایک بڑا ذریعہ یہ تھا کہ جو اعمال اور آداب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں وہ اوروں کے ساتھ بھی برتے جاتے تھے، یہ اگرچہ شرک فی العبادۃ یا شرک فی الصفات ہے لیکن رفتہ رفتہ شرک فی الذات تک منجر ہوتا ہے، سجدۂ عبادت خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن کفار اور دیگر اہلِ مذاہب بتوں اور مقتدایانِ دینی کو بھی سجدہ کرتے تھے اور سلاطین اور امرا کو سجدہ کرنا عام طور سے رائج تھا، آنحضرت ﷺ نے نہایت سختی سے اس کو روکا، بنو اسرائیل میں سجدۂ تعظیمی یا سجدۂ محبت جائز تھا، چنانچہ حضرت یوسفؑ کو ان کے والدین نے سجدہ کیا تھا لیکن چوں کہ اسلام میں توحید کو انتہائے کمال تک پہنچانا تھا، سجدۂ تعظیمی بھی منع کر دیا گیا، ایک صحابی خدمتِ اقدس میں آئے اور عرض کی کہ میں نے اہلِ عجم کو دیکھا ہے۔ وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں، آپ اجازت دیں تو ہم آپ ﷺ کو سجدہ کریں، آپ ﷺ نے فرمایا تو کیا میری قبر پر گذرو گے تو اس کو سجدہ کرو گے؟ عرض کی نہیں فرمایا تو اب بھی نہ کرو اگر میں کسی کو دوسرے کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے (۱)۔ اسی طرح ایک اور صحابی ملکِ شام سے آئے تو آپ ﷺ کو سجدہ کیا، آپ ﷺ نے پوچھا یہ تم نے کیا کیا؟ عرض کی کہ میں نے شام میں رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے مذہبی افسروں کو سجدہ کرتے ہیں، تو میرا جی چاہا کہ میں بھی آپ ﷺ کو سجدہ کروں، فرمایا ایسا نہ کرو اگر میں کسی کو

---

(۱) ابوداؤد کتاب النکاح باب حق الزوج علی المراۃ ج ۱ ص ۲۱۲۔

خدا کے سوا سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔(۱)

۷۔صفات الٰہی کی توحید: شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں وہ اوروں میں تسلیم کئے جائیں، جس کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ شرکتِ وصف کی بنا پر خدا کے شریک اور ہمسر بن جائیں، ان میں سے ایک وصف علمِ غیب ہے، اکثر اہل مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں کہ انبیا اور اولیا کو علمِ غیب ہوتا ہے، بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنوں کا یہی کام تھا کہ وہ آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے، عرب میں بھی کاہن یہی پیشہ کرتے تھے اور مختلف طریقوں سے پیشین گوئی کرتے تھے، کبھی فال سے کبھی پانسے پھینک کر اور کبھی یہ ظاہر کر کے کہ ان کو جنات غیب کا حال بتا جاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے نہایت تاکید اور استقصا کے ساتھ اس اعتقاد کو مٹایا اور علمِ غیب کی تمام صورتیں باطل کیں، خود قرآن مجید میں نہایت کثرت سے اس کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں:

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (انعام ۶:۵۹)	اور خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

آنحضرت ﷺ نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی اور فرمایا کہ مفاتحِ غیب پانچ ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

۱۔حمل یعنی لڑکا ہوگا یا لڑکی؟

۲۔کل کیا ہوگا؟

۳۔بارش کب ہوگی؟

۴۔کس جگہ موت آئے گی؟

۵۔قیامت کب آئے گی؟(۲)

اگرچہ علمِ غیب کی اور بھی صورتیں ہیں لیکن زیادہ تر ان ہی امور کی نسبت لوگ علمِ غیب کے مدعی تھے اور ان ہی باتوں کو لوگ پہلے سے جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

(۱) ابن ماجہ ابواب النکاح باب حق الزوج علی المرأۃ ص ۱۳۳ (۲) صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ باب قول اللہ عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا میں بہ تفصیل مذکور ہے ج ۲ ص ۱۰۹۷

یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بھی علمِ غیب کی نفی کی، ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے، انصار کی چند لڑکیاں گا رہی تھیں، گاتے گاتے انہوں نے یہ گانا شروع کیا:

وفینا نبی یعلم مافی غد — اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا کہ یہ نہ کہو وہی کہو جو پہلے گا رہی تھیں (۱)، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خاص حکم دیا کہ آپ اس حقیقت کو واضح کر دیں:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (انعام ۶:۵۰) — کہہ دو کہ اے پیغمبر میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔

اور غیب کا علم صرف خدا کی صفت ہے:

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (نمل ۲۷:۶۵) — کہہ دے اے پیغمبر کہ خدا کے سوا آسمانوں میں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔

غیب دانی کے مدعی کاہن جو عرب کی گلی گلی میں خدع و فریب کا جال پھیلائے بیٹھے رہتے تھے اور بت خانوں میں خدائی کرتے تھے، ان کی سطوت خاک میں مل گئی، بت خانے ویران ہو گئے تو ان کے یہ پجاری بھی فنا ہو گئے، صحابہؓ نے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے، فرمایا اب نہ جایا کرو، عرض کی ہم پرندوں سے فال لیا کرتے تھے، فرمایا "یہ تمہارا وہم تھا، اس کے سبب سے اپنے ارادہ سے باز نہ رہا کرو"، بعض لوگوں کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ کاہن کچھ نہیں، انہوں نے کہا یا رسول اللہ ان کی بعض باتیں سچی بھی نکل آتی ہیں، فرمایا "شیطان ایک آدھ بات سن لیتا ہے اور مرغی کی طرح قرقر کر کے اپنے دوست کے کانوں میں ڈالتا ہے اور وہ اس میں سو باتیں جھوٹ ملا دیتا ہے"، کبھی فرمایا "کہ فرشتوں کی زبان سے شیاطین فضائے آسمانی میں چوری چھپے کچھ سن لیتے ہیں اور کاہن اس میں سیکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر بیان کرتے ہیں"۔ جاہلوں میں کچھ ایسے مکار ہوتے ہیں جو چوری کا غائبانہ پتہ بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں، عرب ان کو عرّاف کہتے تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مال کا پتہ پوچھنے کے لئے کسی

(۱) صحیح بخاری کتاب النکاح، باب ضرب الدف فی النکاح و الولیمۃ ج ۲ ص ۷۷۳ و ترمذی ابواب النکاح باب اعلان النکاح ص ۱۸۳۔

عراف کے پاس جائے گا اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہ ہوگی، علم نجوم جس کے زور سے لوگ غیب کا حال دریافت کرلینے کے مدعی بنتے تھے، آپ ﷺ نے اس کا سیکھنا بھی جادو کی طرح گناہ بتایا اور فرمایا کہ جو کسی کاہن کے پاس جاکر اس کی باتوں کو سچ سمجھے وہ محمد پر جو کچھ اترا ہے اس سے انکار کرتا ہے۔(۱)

ان تعلیمات نے خدا کے علاوہ دوسروں کی غیب دانی کے عقیدہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، کہانت کی گرم بازاری سرد ہوگئی، فال، شگونِ بد، نجوم اور غیب دانی کے دوسرے خداعانہ طریقے مٹ گئے، پرندوں اور پانسوں کے ذریعہ سے غیب کا حال دریافت کرنا وہم و وسوسہ قرار پایا اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کی حکومت قائم نہ رہی۔

۸۔ **مخفی قوتوں کا ابطال:** کائنات میں خدا کے سوا جن غیبی اسباب و علل یعنی سحر و طلسم، جنات و شیاطین اور ارواحِ خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت و تصرف کا اعتقاد تھا اور ان سے بچنے کے لئے ان کی دہائی پکاری جاتی تھی، نذر چڑھائی جاتی تھی، قربانی کی جاتی تھی، آنحضرت ﷺ کی تعلیم اور وحی نے ان تمام مزخرفات کا قلع قمع کر دیا اور خدا کے سوا تمام دوسری مخفی اور پوشیدہ قوتوں کا ڈر انسانوں کے سینوں سے ہمیشہ کے لئے نکال کر پھینک دیا اور دعا و کلماتِ الٰہی کے سوا ہر نوع کی جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ، گنڈے، ٹوٹکے جن میں کسی غیر خدا سے غیبی استمداد یا شرک کا کلمہ ہو، کفر قرار پائے، اسی قسم کے فاسد خیالات کے استیصال کے لئے ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے ضمن میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا۔

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ . (فاتحہ:۴)

(اے عالم کے پروردگار) ہم تیرے ہی آگے سر جھکاتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

سحر و طلسم و جادو اور ٹوٹکے کے متعلق ارشادِ خداوندی ہوا:

وَمَا هُمۡ بِضَآرِّيۡنَ بِهٖ مِنۡ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ وَيَتَعَلَّمُوۡنَ مَا يَضُرُّهُمۡ وَلَا يَنۡفَعُهُمۡ وَ لَقَدۡ عَلِمُوۡا لَمَنِ اشۡتَرٰهُ مَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ (بقرہ۲:۱۰۲)

یہ جادو اور ٹوٹکے کرنے والے کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن خدا کے حکم سے اور یہ یہود وہ (جادو اور ٹوٹکے) سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان رساں ہیں، نفع بخش نہیں اور یقیناً ان کو علم ہے کہ جو ان کو حاصل کرتا ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

---

(۱) مشکوۃ باب الکہانہ ص ۳۸۴، ۳۸۵ میں صحیحین سے یہ حدیثیں نقل کی ہیں، علم نجوم کی حرمت والی حدیث ابوداؤد کتاب الطب باب فی الکاہن ج ۲ ص ۱۰۲، ابن ماجہ اور مسند احمد ج ۲ ص ۴۲۹ و ۴۷۶ سے لی ہیں۔

یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ سحر وجادو کی حقیقت وہم وتخیل سے زیادہ نہیں، فرمایا:

يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعٰى.

(طٰہٰ ۲۰:۶۶)

مصری جادوگروں کے جادو سے یہ اس کو خیال ہوتا تھا کہ وہ دوڑ رہے ہیں۔

بلکہ بعض صحابہؓ نے ان مکار جادوگروں کے قلع قمع کے لئے ان کے قتل تک کا حکم دے دیا،(۱) تا کہ انسانوں کے دلوں میں ان کا جو خوف وہراس بیٹھا ہوا ہے وہ دور ہو اور ان کے اس عاجزانہ قتل ہونے سے یہ ثابت ہو کہ ان میں کوئی غیر معمولی طاقت نہیں وہ بالکل بے بس ہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ ''یا رسول اللہ ہم جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے، اب آپ کیا فرماتے ہیں؟'' ارشاد فرمایا کہ ''تم اپنے منتر ہمارے سامنے پیش کرو اگر ان میں شرک کی کوئی بات نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں'' (۲) ایک اور صحابی نے ایک بیمار پاگل پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کی وہ اچھا ہو گیا اس نے ان کو انعام دیا، انہوں نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے واقعہ عرض کیا، فرمایا کہ ''میری عمر کی قسم ہر جھاڑ پھونک باطل ہے لیکن تم نے سچی جھاڑ سے روزی کھائی''۔(۳) ایک اور صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

ان الرقی و التمائم و التولہ شرک.

(ابوداؤد کتاب الطب، باب تعلیق التمائم ج ۲ ص ۱۰۰ و ابن ماجہ ابواب الطب باب تعلیق التمائم ص ۲۶۰)

بے شک جھاڑ پھونک، گنڈے اور میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں۔

ان ہی صحابی کے گھر میں ایک بڑھیا آیا کرتی تھی، گھر والوں نے اس سے کسی بیماری کا کوئی ٹوٹکا کرایا، ایک دھاگا پڑھ کر اس نے باندھ دیا تھا، وہ گھر آئے تو اس دھاگے پر ان کی نظر پڑی، انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور اس کو توڑ کر پھینک دیا، پھر فرمایا کہ عبد اللہ کا خاندان شرک کی باتوں سے مستغنی ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ جھاڑ پھونک، گنڈے اور میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں، ان کی بیوی نے کہا کیا وجہ ہے کہ ایک دفعہ میری آنکھوں میں کچھ پڑ گیا، جب میں جھاڑتی تھی تو پانی رک جاتا تھا اور جب چھوڑ دیتی تھی تو پانی بھر آتا تھا، انہوں نے

(۱) جامع ترمذی ابواب الحدود، باب ماجاء فی حد الساحر ص ۲۵۲، ۲۵۳ وابوداؤد کتاب الخراج و الامارہ و الفی باب فی اخذ الجزیۃ من المجوس ج ۲ ص ۳۰ (۲) کتاب الطب باب ما جاء فی الرقی ج ۲ ص ۱۰۰ (۳) ابوداؤد کتاب الطب باب کیف الرقی ج ۲ ص ۱۰۱، ۱۰۲۔

جواب دیا یہ شیطانی بات ہے تم نے کیوں وہ نہ کیا جو رسول اللہ ﷺ کرتے تھے، آنکھوں میں پانی ڈالتے اور یہ دعا پڑھتے، اے لوگوں کے پروردگار! اس بیماری کو دور کر، تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفا بخشی کے سوا کوئی شفا نہیں، ایسی شفا دے کہ پھر کوئی بیماری نہ رہے۔(۱)

۹۔ اوہام وخرافات کا ابطال: وہ تمام اوہام وخرافات جن سے شرک پرست اہلِ عرب لرزہ براندام رہتے تھے اور جن کو وہ بالذات موثر اور متصرف سمجھتے تھے آنحضرت ﷺ نے ان کا طلسم توڑ دیا اور اعلان فرما دیا کہ ان کی کوئی اصل نہیں فرمایا:

لا عدوی ولا طیرۃ ولا صفر ولا ھامۃ. (ابوداؤد وابن ماجہ ابواب الطب باب من کان یعجبہ الفال ص۲۶۱)	نہ چھوت ہے نہ بدفالی ہے نہ پیٹ میں بھوک کا سانپ ہے نہ مردہ کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے۔

ایک اور صحابی کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

العیافۃ و الطیرۃ و الطرق من الجبت. (ابوداؤد کتاب الطب باب فی الخط وزجر الطیر ج۲ص۱۰۳ وابن ماجہ)	پرندوں کی بولی سے فال لینا، ان کے اڑنے سے فال لینا اور کنکری پھینک کر یا خط کھینچ کر حال بتانا شیطانی کام ہے۔

ایک اور صحابی آپ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ "فال نکالنا شرک ہے" پھر ان صحابی نے کہا کہ "ہم صحابہؓ میں کوئی نہیں جو اس کو برا نہ سمجھتا ہو بلکہ خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔"(۲) یہ بھی آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "پچھتر (نوء) کچھ نہیں۔"(۳) یعنی پانی کی بارش میں اس کو بالذات کوئی دخل نہیں اسی طرح غولِ بیابانی کے متعلق عربوں کے جو معتقدات تھے ان کو آپ ﷺ نے ایک لفظ سے باطل کر دیا فرمایا:

لا غول. (ابوداؤد کتاب الطب باب فی الطیرۃ ج۲ص۱۰۳)	غول بیابانی کچھ نہیں۔

بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جانوروں کے متعلق ان کے خیالاتِ فاسدہ کا قرآن نے ابطال کیا،

---

(۱) یہ تمام روایتیں ابوداؤد جلد دوم کتاب الطب باب التمائم و باب ما جاء فی الرقی ص۱۰۰، ۱۰۱ اور ابن ماجہ باب تعلیق التمائم ص۲۶۰ میں ہیں۔ (۲) ابوداؤد کتاب الطب باب فی الطیرۃ ج۲ص۱۰۳ اور ابن ماجہ ذکر فال ابواب الطب ص۱۶۲ (۳) ابوداؤد باب فی الطیرۃ ج۲ص۱۰۳۔

سورہ انعام میں ان کے ان مشرکانہ عقائد اور اعمال کی بہ تصریح تردید کی گئی اور سورہ مائدہ میں فرمایا گیا:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ. (مائدہ ۵:۱۰۳) خدا نے بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام نہیں ٹھہرایا۔

بحیرہ: اس بچے کو کہتے تھے جس کا کان پھاڑ کر بتوں کی نذر کرتے تھے۔

سائبہ: اس جانور کو کہتے تھے جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔

وصیلہ: بعض لوگ نذر مانتے تھے کہ اگر بچہ نر ہو تو اس کو بت پر چڑھائیں گے اور اگر مادہ ہوا تو اپنے پاس رکھیں گے پھر اگر نر و مادہ پیدا ہوتے تو مادہ کے ساتھ نر بھی رکھ لیتے تھے یہ وصیلہ تھا۔

حامی: وہ اونٹ جس کے دس بچے بوجھ اٹھانے اور سواری کے لائق ہو چکتے تو دیوتا کے نام پر آزاد کر دیا جاتا۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوہام جو عرب میں پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کا استیصال فرمایا، یہ اوہام پرستی حقیقت میں قوموں کی تباہی کا ایک بڑا سبب ہوتی ہے، یہ اوہام حقیقت کے خلاف ہونے کے علاوہ بہت سے کاموں میں خلل انداز ہوتے ہیں اور غور سے دیکھو تو ان کا سلسلہ بالآخر کسی نہ کسی شرک تک منجر ہوتا ہے اور انسان کو صحیح طریقِ عمل سے روک دیتے ہیں، مثلاً بیماری میں طب کے قاعدہ کے موافق علاج کیا جائے تو مفید ہوگا، لیکن بہت سے لوگ وہم پرستی کے بنا پر ٹونے ٹوٹکے کو دافعِ مرض سمجھتے ہیں، اس قسم کے اوہام عرب میں نہایت کثرت سے پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت نے ان سب کو تصریح اور تعیین کے ساتھ باطل قرار دیا مثلاً:

۱۔ عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مر جاتا ہے تو چاند یا سورج گرہن لگتا ہے، حضرت ابراہیم آپ کے صاحب زادہ نے جب انتقال کیا تو سورج میں گرہن لگا ہوا تھا، لوگوں نے خیال کیا کہ ان ہی کے مرنے کا اثر ہے، آنحضرت ﷺ نے سنا تو مسجد میں جا کر خطبہ دیا کہ چاند اور سورج خدا کی قدرت کے مظاہر ہیں کسی کے مرنے سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔ (۱)

۲۔ یہ خیال تھا کہ سانپ اگر مارا جائے تو اس کا جوڑا آتا ہے اور انسان کو ہلاک کرتا ہے۔

۳۔ ایک دفعہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف رکھتے تھے کہ ایک ستارہ ٹوٹا، آپ ﷺ نے

(۱) صحیح بخاری ابواب الکسوف باب الصلاۃ فی الکسوف ج ۱ ص ۱۴۱، ۱۴۲۔

دریافت فرمایا کہ جاہلیت میں تم لوگ اس کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے تھے، لوگوں نے عرض کی کہ ہمارا اعتقاد تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے یا کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا ہے تو ستارے ٹوٹتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے ستارے نہیں ٹوٹتے۔(۱)

۴۔ شیر خوار بچوں کے سرہانے استرا رکھ دیا کرتے تھے کہ جنات ان کو نہ ستانے پائیں، ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے دیکھا تو اٹھا کر پھینک دیا اور کہا کہ آنحضرت ﷺ ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے۔(۲)

۵۔ نظر بد سے بچنے کے لئے اونٹوں کے گلے میں قلادہ لٹکاتے تھے، آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ کسی اونٹ کے گلے میں قلادہ نہ رہنے پائے۔(۳)

الغرض توحیدِ کامل کی تعلیم نے عربوں کے تمام مشرکانہ اوہام وخرافات کو ہمیشہ کے لئے مٹادیا، اسلام کی اس اصلاحی اہمیت کا اندازہ عیسائیت کی ان مقدس روایات وحکایات سے کرو جنہوں نے صدیوں تک دنیا کو دیووں، بھوتوں اور چڑیلوں کے تسلط اور عذاب کے شکنجہ میں مبتلا رکھا اور ان کو نکالنا اور بھگانا عیسائیت کا کمال اور اعجاز سمجھا جاتا رہا۔

۱۰۔ کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید: شرک کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب کفارہ اور شفاعت کے وہ غلط معنی تھے جو عربوں اور عیسائیوں وغیرہ میں رائج تھے، عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنی سمجھ رکھے تھے اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخیل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا، وہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر وجابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ اس کے دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے، اسی لئے وہ ان درمیانی ہستیوں کے خوش رکھنے کی ضرورت کے بھی معتقد تھے، چنانچہ وہ اپنے بتوں، دیوتاؤں اور فرشتوں کو اسی نیت سے پوجتے تھے اور کہتے تھے:

(۱) مسند احمد بن حنبل جلد اول ص ۲۱۸ مصر (۲) الادب المفرد باب الطیرۃ من الجن جزء ثانی ص ۳۶۴ مصر۔
(۳) موطا امام مالک باب ما جاء فی نزع التعلیق و الجرس من العین ص ۳۷۳۔

هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس ۱۰:۱۸) یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے جب ان کی اس بت پرستی پر ان کو ملامت کی تو انہوں نے صاف کہا:

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر ۳۹:۳) ہم ان کو اسی لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے تقرب میں نزدیک کردیں۔

یہودیوں میں بھی اسی قسم کی دوسری غلط فہمی تھی، وہ یہ سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھرانا خدا کا خاص کنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چوں کہ خدا کے پیارے اور محبوب ہیں، اس لئے ان کی اولاد اور نسل بھی دنیا اور آخرت میں یہی درجہ رکھتی ہے، اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی تو بھی ان کے خاندان کے بزرگ جو خدا کے مقرب اور برگزیدہ ہیں وہ ہر طرح ان کو اس سے بچالیں گے، ان کا دعویٰ تھا کہ:

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ ۵:۱۸) ہم خدا کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں۔

قرآن نے کہا:

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ (مائدہ ۵:۱۸) بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہو، یہ اسی کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے سزا دے۔

اور اسی بنا پر ان کا دعویٰ تھا:

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (آل عمران ۳:۲۴) ہم کو دوزخ صرف چند گنتی کے دن چھو کر چھوڑ دے گی۔

قرآن نے کہا:

وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ. (آل عمران ۳:۲۴) اور یہ اپنے دل سے بنا کر جو جھوٹ عقیدہ گھڑ چکے ہیں وہ ان کے مذہب کے بارہ میں ان کو دھوکا دے رہا ہے۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا اور ہے کہ باپ (خدا) نے تمام انسانوں کی طرف سے جو موروثی اور طبعی طور سے گنہ گار ہیں اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰؑ) کو قربانی دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ دے دیا اور وہ گناہوں سے پاک و صاف ہوگئے اور حضرت عیسیٰؑ اور ان کے بعد ان کے جانشین پوپوں کو گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، کہ وہ جو زمین پر کھولیں گے وہ

آسمان پر کھولا جائے گا، اسی لئے پوپوں کے سامنے اعترافِ گناہ کا عقیدہ عیسائیوں میں پیدا ہوا اور ان کو بندوں کے گناہوں کے معاف کرنے کا دنیا میں حق ملا۔

پیغامِ محمدی ﷺ نے ان کو ملزم قرار دیا اور کہا:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ ۹:۳۱)

انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔

اور اصولی طور پر اس نے یہ بتا دیا کہ:

وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ (آل عمران ۳:۱۳۵)

اور خدا کے سوا کون گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ بیٹا قیامت کے دن باپ کے داہنے بازو پر برابر بیٹھ کر خلق کا عدل و انصاف کرے گا، قرآن پاک نے ایک بڑے موثر طرز میں اس کی تردید کی ہے، قیامت کے دن خدا حضرت عیسیٰؑ سے پوچھے گا:

ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (مائدہ ۵:۱۱۶)

اے عیسیٰ! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناؤ۔

وہ کہیں گے بارالٰہا! میں نے تو ان سے وہی کہا جو تو نے کہا تھا، میں نے تو ان کو یہ تعلیم نہیں دی تھی، میں نے تو ان سے یہی کہا تھا کہ صرف ایک خدا کو پوجو:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (مائدہ ۵:۱۱۸)

اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو بخش دے تو تو سب کچھ کر سکتا ہے کہ تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہوں کی مغفرت اور معافی یا گناہوں پر سزا اور عذاب دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

بت پرست عربوں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ یہ دیوتا اور ان کے یہ بت خدا کی طرف سے دونوں عالم میں مختارِ کل ہیں، وہ یہاں دینے نہ دینے کا اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں، اس عقیدہ کا نام ان کے یہاں ''شفاعت'' تھا اور یہ دیوتا ان کے شفیع تھے، قرآن مجید نے کفارہ، غیر خدا کے اختیارِ مغفرت اور بت پرستانہ طریقۂ شفاعت کے عقائدِ باطلہ کی ہر طرح تردید کی، اور بتایا کہ یہ

اختیار خدا کے سوا کسی اور کو نہیں، سب اس کی عظمت اور جلال کے سامنے عاجز اور درماندہ ہیں:

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ. (زخرف ۴۳:۸۶)

یہ کافر خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جس نے حق کی شہادت دی اور وہ جانتے بھی ہوں۔

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا. (مریم ۱۹:۸۷)

یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جس نے رحم والے خدا سے اقرار لے لیا۔

ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ. (یٰسین ۳۶:۲۳)

کیا خدائے برحق کو چھوڑ کر جھوٹے معبودوں کو خدا بناؤں اگر رحمٰن مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں۔

کفار فرشتوں کو بھی اسی غرض سے پوجتے تھے، حکم ہوا:

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَاۤءُ وَيَرْضٰى. (نجم ۵۳:۲۶)

اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی لیکن اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لئے چاہے اور پسند کرے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَاۤءَ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ. (زمر ۳۹:۴۳)

کیا ان کافروں نے خدا کے سوا کو شفیع بنایا ہے، کہدے کہ اگر یہ کچھ اختیار اور سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں تو بھی؟ (شفیع بننے کے قابل ہیں؟)

خدا قیامت میں ان سے کہے گا:

وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَاۤءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا (انعام ۶:۹۵)

اور ہم دیکھتے نہیں تمہارے ساتھ تمہارے ان شفیعوں کو جن کو تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہاری ملکیت میں خدا کے ساتھ شریک ہیں۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ. وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَاۤىِٕهِمْ شُفَعٰٓؤُا (روم ۳۰:۱۲،۱۳)

اور جب قیامت قائم ہوگی تو مشرکین ناامید ہوں گے کہ جن کو وہ خدا کا شریک کار بتاتے تھے، ان میں سے کوئی ان کا شفیع نہ ہوا۔

خاص یہود کو مخاطب کر کے ان کے عقیدہ کی تردید میں کہا گیا:

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ..........وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا وَّلَا یُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا هُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ. (بقرہ۲:۴۸)	اے فرزندانِ اسرائیل ....اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی ایک دوسرے کے ذرا کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ کچھ اس کے بدلہ میں لیا جائے گا اور نہ کوئی ان کو مدد پہنچائی جائے گی۔

پھر اسی معنی کی آیت اسی سورہ میں دوسری جگہ ہے:

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ..........وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا وَّلَا یُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ (بقرہ۲:۱۲۳)	اے فرزندانِ اسرائیل..... اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی کسی کے ذرا بھی کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی بدلہ قبول ہوگا اور نہ شفاعت فائدہ دے گی۔

اور اسی معنی میں مسلمانوں سے بھی کہا گیا کہ وہ عمل پیش کریں، شفاعت کے بھروسے نہ رہیں:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا بَیۡعٌ فِیۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ (بقرہ۲:۲۵۴)	اے مسلمانو! جو کچھ ہم نے تم کو روزی دے رکھی ہے اس میں سے کچھ خرچ کر دیا کرو اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ لین دین ہے نہ دوستی ہے نہ شفاعت ہے۔

غرض آپ ﷺ کے پیغام نے ان معنوں میں شفاعت کے عقیدۂ باطل کی ہر جگہ تردید کی ہے اور اعلان کیا ہے کہ اس شفاعت کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہے:

اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلۡ اَوَلَوۡ كَانُوۡا لَا یَمۡلِكُوۡنَ شَیۡئًا وَّلَا یَعۡقِلُوۡنَ. قُلۡ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیۡعًا ؕ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ثُمَّ اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ. (زمر۳۹:۴۳،۴۴)	کیا انہوں نے خدا کے سوا اوروں کو شفیع بنا رکھا ہے، کہہ دے کہ اگر چہ ان کو کسی چیز کا اختیار نہ ہو اور نہ ان کو سمجھ ہو تو بھی، کہہ دے کہ شفاعت کا کل اختیار خدا ہی کو ہے اسی کا راج آسمانوں اور زمین میں ہے، پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت پاک نے کفار و مشرکین کے عقیدۂ شفاعت کی قطعی طور سے تردید کی، دوسری آیت

میں یہود ونصاریٰ کے عقیدۂ شفاعت کا صرف اتنا حصہ تسلیم کیا کہ خدا کے نیک بندے اپنے دوسرے بھائیوں کے حق میں شفاعت کریں گے:

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ. (زخرف۴۳:۸۶)	اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جنہوں نے حق کی گواہی دی اور وہ دانش رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ اسی شہادت کو اقرار لینا کہا گیا ہے:

لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا. (مریم۱۹:۸۷)	یہ لوگ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جو خدا کے نزدیک (دنیا میں اپنے عمل کے ذریعہ سے) اقرار لے چکا ہے۔

لیکن اس شہادتِ حق اور عہدِ الٰہی کے باوجود اس اختیار کے استعمال کے لئے اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضامندی شرط ہے:

مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ (یونس۱۰:۳)	(خدا کی بارگاہ میں) کوئی شفیع نہیں لیکن اس کی اجازت کے بعد۔
مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (بقرہ۲:۲۵۵)	وہ کون ہے جو خدا کے سامنے کسی کی شفاعت کر سکے لیکن اس کی اجازت سے۔
وَكَمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَأْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَرْضٰى. (نجم۵۳:۲۶)	اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت ذرا بھی کام نہیں آ سکتی البتہ اس کے بعد کہ خدا اجازت دے جس کو چاہے اور پسند کرے۔
لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا. (نبا۷۸:۳۸)	یہ فرشتے اور روح کوئی خدا سے اس دن بات نہ کر سکے گا لیکن جس کو وہ رحم والا اجازت دے اور ٹھیک کہے۔

پھر یہ شفاعت بھی ان ہی لوگوں کے حق میں ہو سکے گی جن کے حق میں اللہ تعالیٰ انبیا اور صالحین کو اس کی اجازت دے گا، فرمایا:

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ (سبا۳۴:۲۳)	اور شفاعت خدا کے نزدیک نفع نہ دے گی لیکن اس کے لئے جس کے لئے وہ شفاعت کی اجازت دے۔

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَهٗ قَوْلًا. (طٰہٰ ۲۰:۱۰۹)

اس دن شفاعت نفع نہ دے گی لیکن اس کو جس کے لئے خدا اجازت دے اور اس کے لئے بات کرنا پسند کرے۔

بلکہ خود انبیا علیہم السلام بھی سفارش ان ہی کی کریں گے جن کی سفارش خدا خود چاہے گا فرمایا:

وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ. (انبیاء ۲۱:۲۸)

اور وہ شفاعت نہیں کریں گے لیکن اس کی جس کے لئے خدا اپنی خوش نودی ظاہر کرے اور وہ اس کے خوف سے ترساں ہوں گے۔

پھر ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کے افراد کے لئے ازل ہی سے یہ اعلانِ عام ہو چکا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور شفاعت کا دروازہ بند ہے اور یہ وہ مجرم ہیں جن کے دل حق کی شہادت سے محروم رہ گئے:

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ۝ (مدثر ۷۴:۴۸)

تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دے گی۔

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ. (مومن ۴۰:۱۸)

ظالموں (مشرکوں)(۱) کا نہ کوئی دوست (اس دن) ہوگا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔

اور وہ بدنصیب گروہ جس کے حق میں رحمت کا یہ دروازہ بند رہے گا مشرکین ہیں، جیسا کہ ذیل کی آیت سے ظاہر ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (نساء ۴:۱۱۶)

اللہ اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ کوئی شریک ٹھہرایا جائے نہیں بخشتا اور اس سے نیچے کے گناہ جس کو چاہے بخش دے۔

لیکن اب ایسی حالت میں جب کہ وہی شفاعت کرسکیں گے جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دے گا اور وہ بھی ان ہی کی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرانا خود خدا کو منظور ہوگا، تو حقیقت میں خود اللہ ہی اپنے دربار میں اپنا آپ شفیع ہوگا، یا صوفیانہ اصطلاح میں یوں کہو کہ جلالِ الٰہی کی بارگاہ

---

(۱) اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان ۳۱:۱۳) بے شک شرک بڑا ظلم ہے (صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب قول اللہ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ الخ ج ۱ ص ۴۸۷)۔

میں اس کی صفت کریمی ورحیمی خود شفیع بن کر کھڑی ہوگی، اسی لئے ارشاد ہوا:

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ. (انعام ۶:۵۱)

اور اس قرآن کے ذریعہ (اے پیغمبر) ان لوگوں کو ہشیار کردے جو اس سے ڈرتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جمع کئے جائیں گے ان کے لئے ان کے رب کے سوا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں، شاید وہ بچتے رہیں۔

مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ. (سجدہ ۳۲:۴)

خدا کے سوا تمہارا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں پھر کیا تم سوچتے نہیں۔

خدا کی اس صفتِ کریمی ورحیمی کے مظہر اس دنیا میں بھی وہی ہوں گے جو اس دنیا میں اس کے مظہر بن کر آئے تھے اور وہ انبیائے کرام ہیں کہ خدا کے رحم وکرم ہی کے سبب سے جو اس کو اس دنیا کے ساتھ ہے، ان انبیا کی بعثت ہوئی اور وہ اپنی اپنی امت پر شاہد قرار پائے، اسی طرح خدا کی اجازت کے بعد اس دنیا میں بھی وہی خدا کے اس رحم وکرم وفضلِ عمیم کے مظہر قرار پائیں گے، نیز رحمت کے فرشتے اور امت کے نیکوکار اور صالح افراد بھی جن کو رحمتِ الٰہی نے چنا ہو اس منصب پر ممتاز ہو سکیں گے، خصوصاً وہ سراپا رحمت جو اس دنیا میں رحمۃ للعلمین کا مظہر بن کر آیا۔

۱۱۔ اجرامِ سماوی کی قدرت کا انکار: بہ ظاہر دنیا میں بہت سی باتیں آفتاب وماہتاب کی گردش اور ان کے سبب سے اختلافِ موسم کے اثرات سے ہوتی ہیں، اس لئے ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش کے اثر سے ہوتا ہے، یہی اعتقاد عرب کے مشرکوں میں بھی پھیلا تھا، وہ سورج اور چاند کو سجدے کرتے تھے، اسلام نے ان کو اس شرک سے روکا اور کہا:

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ (فصلت ۴۱:۳۷)

سورج اور چاند کو سجدے نہ کیا کرو۔

اسی طرح وہ زمانہ کو دنیا کے کاروبار میں حقیقی موثر جانتے تھے اور یہ کہتے تھے:

وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ. (جاثیہ ۴۵:۲۴)

ہم کو تو زمانہ مارتا ہے۔

اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں فلکِ کج رفتار اور دہرِ ناہنجار کی شکایت اب تک چلی جاتی ہے، عرب کے مشرکین بھی اسی طرح بولا کرتے تھے، ان کو جب کوئی خلاف توقع تکلیف پہنچتی تھی تو زمانہ کی شکایت کرتے تھے اور اس کو برا کہتے تھے (۱)، آنحضرت ﷺ نے اس سے منع کیا اور فرمایا کہ ''زمانہ کو گالی نہ دیا کرو کہ زمانہ خود خدا ہے'' (۲) اور فرمایا کہ خدا ارشاد فرماتا ہے کہ ''آدم کا بیٹا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے وہ زمانہ کو برا کہتا ہے، زمانہ میں ہوں میرے ہاتھ میں تمام کام ہیں، میں شب و روز کا انقلاب کرتا ہوں'' (۳) یعنی زمانہ کو جن تکلیفوں اور مصیبتوں کا خالق سمجھ کر لوگ برا کہتے ہیں، حقیقت میں ان کا پیدا کرنے والا خدا ہی ہے اس لئے یہ گالی حقیقت میں خدا کو دی جاتی ہے۔

اسی خیال کا یہ بھی اثر تھا کہ اہلِ عرب بارش کو نچھتر کی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ فلاں نچھتر کے سبب سے ہم پر پانی برسایا گیا، حدیبیہ کے موقع پر اتفاق سے رات کو بارش ہوئی، صبح کو نماز کے بعد آپ ﷺ صحابہ کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا ''تم جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا'' صحابہؓ نے عرض کی کہ ''خدا اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے''، ارشاد ہوا ''اس نے فرمایا آج صبح کو میرے بندوں میں سے کچھ مومن ہو کر اٹھے اور کچھ کافر ہو کر، جنہوں نے یہ کہا کہ خدا کے فضل و رحمت سے ہم پر پانی برسا وہ تو خدا پر ایمان لانے والے اور ستارہ کے انکار کرنے والے ہیں اور جنہوں نے یہ کہا کہ فلاں نچھتر سے پانی ہم پر برسا تو وہ خدا کے انکار کرنے والے اور ستارہ پر ایمان لانے والے ہیں''۔ (۴)

سورج گرہن اور چاند گرہن کو بھی لوگ عظیم الشان واقعات اور انقلابات کی علامت سمجھتے تھے، کم و بیش دنیا کی تمام قوموں میں وہ آسمانی دیوتاؤں کے غیظ و غضب کے مظہر یقین کئے جاتے تھے، ۹ ہجری میں اتفاق سے ایک دن سورج میں گرہن لگا اور اسی دن آپ ﷺ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیمؑ نے وفات پائی، صحابہؓ نے خیال کیا کہ یہ سورج میں گرہن لگنے کا سبب حضرت ابراہیم

---

(۱) فتح الباری شرح بخاری جلد ۸ ص ۴۴۱ و کتاب الاسماء والصفات بیہقی صفحہ ۱۱۵، انوار احمدی الہ آباد ۱۳۱۳ھ ہجری (۲) صحیح مسلم کتاب الالفاظ من الادب باب النھی عن سب الدھر ج ۲ ص ۲۶۸ (۳) صحیح بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورہ جاثیہ باب وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ج ۲ ص ۷۱۵ و کتاب الرد علی الجہمیہ باب قول اللہ تعالیٰ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللّٰهِ جلد ۲ ص ۱۱۱۶ (۴) صحیح بخاری کتاب الاذان باب یستقبل الامام الناس اذا سلم ج ۱ ص ۱۱۶ و صحیح مسلم کتاب الایمان باب من قال مطرنا بالنوء ج ۱ ص ۴۵۔

کی موت ہے، آنحضرت ﷺ نے جب یہ سنا تو تمام مسلمانوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا اور ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں اس خیال کی تردید کی، فرمایا کسوف وخسوف اور گرہن کو کسی کے جینے مرنے سے کوئی تعلق نہیں، یہ بھی خدا کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے۔(۱)

۱۲۔غیر خدا کی قسم سے روکنا: شرک کی ایک نہایت ہی باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیر خدا کی قسمیں کھاتے تھے۔

قسم کھانے کے معنی حقیقت میں شہادت کے ہیں، جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کو دراصل واقعہ پر گواہ بنایا جاتا ہے، عربوں میں بت پرستی کے رواج کے باعث بتوں اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں جو صریح کفر تھا، قریش اپنے دیوتا لات اور عزیٰ کی قسمیں کھایا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا(۲) لیکن رواج اور عادت کے باعث مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار ان کی زبان سے ان کی قسمیں نکل جاتی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جس شخص کی زبان سے لات اور عزیٰ کی قسم نکل جائے تو وہ لا الہ الا اللہ کہہ لے“، یہ گویا اس کفر کے کلمہ سے توبہ ہے، قریش میں باپ کی قسم کھانے کا بھی رواج تھا، اس سے بھی آپ ﷺ نے منع فرمایا، ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو آپ ﷺ نے باپ کی قسم کھاتے سنا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے منع کیا ہے کہ اپنے باپ کی قسم کھایا کرو، جس کو قسم کھانی ہو وہ یا تو خدا کی قسم کھائے اور یا چپ رہے“، حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت سے آج تک میں نے نہ تو اپنی بات میں اور نہ کسی اور کی بات دہرانے میں کبھی باپ کی قسم کھائی“(۳)، ان کی قسم بھی لوگ کھایا کرتے تھے اس سے بھی آپ ﷺ نے منع فرمایا، اسی طرح کعبہ کی بھی قسم لوگ کھایا کرتے تھے اس پر ایک یہودی نے آکر مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم بھی شرک کرتے ہو، کعبہ کی قسم کھاتے ہو، آپ ﷺ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ کعبہ نہیں بلکہ کعبہ والے (خدا) کی قسم کھایا کرو(۴)

---

(۱) صحیح بخاری ابواب الکسوف باب صلوۃ الکسوف ج ۱ص ۱۴۲ (۲) سنن نسائی کتاب الایمان و النذور الحلف باللات و العزی ج ۲ص ۱۲۴، ۱۲۵ ادارالکتاب دیوبند (۳) یہ تمام واقعات صحیح بخاری کتاب الایمان باب لا تحلفوا بآبائکم ج ۲ص ۹۸۳ وباب لا یحلف باللات و العزی ص ۹۸۴ صحیح مسلم کتاب الایمان باب النھی عن الحلف بغیر اللہ و باب من حلف باللات و العزی ج ۲ص ۱۸، ۹۱ نسائی کتاب کتاب الایمان الحلف بالاباء و الحلف باللات و العزی ج ۲ص ۱۲۴ میں مذکور ہیں۔(۴) نسائی کتاب الایمان والنذور ج ۲ص ۱۲۴۔

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سنا تو اس کو منع کیا اور کہا کہ غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے، میں نے رسول خدا ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ "جس نے غیر خدا کی قسم کھائی اس نے کفر کیا، یا شرک کیا" (۱)، دوسری روایت میں ہے "ہر وہ قسم جو غیر خدا کی کھائی جائے شرک ہے"۔(۲)

۱۳۔ خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں: اکثر نیک لوگوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیت عین خدا کی مشیت ہے، اس میں، نہ صرف بدعقیدہ لوگ بلکہ اہلِ توحید بھی غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے انسانوں کو اس دقیق غلطی سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ دنیا میں مشیت صرف خدا کی ہے، اسی کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے، تمام مشیتیں اور خواہشیں اسی کی مشیت اور خواہش کے ماتحت ہیں، اس کے ساتھ کسی مخلوق کی مشیت عالم کے کاروبار میں شریک نہیں، لیکن لوگوں نے خدا کی مشیت کے ساتھ اوروں کی مشیت کو بھی شریک کر لیا تھا، توحیدِ کامل کے معلم ﷺ نے اس خیال کی سختی سے تردید کی اور قرآن مجید نے جابجا اس حقیقت کو واضح کیا کہ مشیتِ الٰہی کے علاوہ کوئی اور حقیقی مشیت نہیں، تمام دیگر مشیتیں اس کی تابع اور ماتحت ہیں، عقیدہ کی یہ غلطی اس قدر عام تھی کہ جو لوگ عقیدہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی سلاطین، حکام اور بزرگوں کے ساتھ گفتگو میں یہ کہنا حسنِ ادب سمجھتے تھے کہ "جو خدا چاہیں اور جو حضور چاہیں"، آنحضرت ﷺ نے اس طرزِ کلام سے منع فرمایا یہاں تک کہ خدا کی مشیت کے ساتھ برابری سے خود اپنی مشیت کے ذکر سے بھی صحابہ کو روکا، اس قسم کا طرزِ کلام لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گیا تھا، اس میں یہ تصحیح فرمائی کہ خدا اور غیر کی مشیت کے درمیان عطف کا واؤ (اور) نہ لایا جائے، کہ اس سے برابری کا شائبہ نکلے، بلکہ "پھر" کا لفظ بولا جائے، تا کہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیت کے بعد اوروں کی مشیت کا درجہ ہے۔

نسائی میں ہے کہ ایک یہودی نے خدمتِ نبوی ﷺ میں آکر مسلمانوں سے کہا کہ "تم لوگ شرک کرتے ہو، کہتے ہو کہ جو خدا چاہے اور جو محمد چاہیں"، آپ ﷺ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا "یوں کہو کہ وہ ایک ہے جو چاہے پھر جو آپ چاہیں" (۳)، یہی واقعہ ابن ماجہ میں اس طرح ہے کہ ایک صحابی نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک یہودی یا عیسائی ان سے کہہ رہا ہے کہ "تم مسلمان بڑے اچھے لوگ ہوتے اگر شرک نہ کیا کرتے، تم کہا کرتے ہو کہ خدا جو چاہے اور جو محمد چاہیں، ان صحابی نے

(۱) جامع ترمذی ابواب النذور والایمان باب ص ۲۶۶ و مستدرک حاکم ص ۱۸ جلد ا کتاب الایمان من حلف بغیر اللہ فقد کفر۔ (۲) مستدرک حاکم بحوالہ مذکور (۳) نسائی کتاب الایمان والنذور، الحلف بالکعبۃ ج ۲ ص ۱۴۴ ادارالکتاب دیوبند۔

خدمتِ اقدس میں آکر اپنا خواب بیان کیا آپ ﷺ نے فرمایا ''میں اس فقرہ کی برائی جانتا تھا یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو محمد چاہیں'' (۱)، ابوداؤد میں یہی تعلیم اس واقعہ کی تقریب کے بغیر اس طرح مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ''یہ نہ کہا کرو کہ جو خدا چاہے اور جو فلاں چاہے، بلکہ یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو فلاں چاہے'' (۲) لیکن امام بخاری نے ادب المفرد میں اور بیہقی نے کتاب الاسماء میں جو روایت کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور کی مشیت کا نام بھی نہ لینا چاہیے، ایک شخص نے خدمتِ والا میں حاضر ہو کر سلسلۂ کلام میں کہا کہ ''جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں'' ارشاد ہوا کہ ''تم نے خدا کا ہمسر اور مقابل ٹھہرایا جو خدا چاہے ماشاء اللہ وحدہ'' (۳)۔

اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمام مدِ نظر تھا کہ اس سے بھی منع فرمایا کہ خدا اور رسول کی طرف ایک ضمیر پھیر کر ایک فعل لایا جائے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ خدا اور رسول کا درجہ برابر برابر ہے، ایک دفعہ آپ کے سامنے کسی شخص نے خطبہ کے اثنا میں یہ فقرہ کہا ''جس نے خدا اور رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی''، یہاں تک اس نے کہا تھا کہ آپ ﷺ نے اس کو روک دیا اور فرمایا ''اٹھ جاؤ تم برے خطیب ہو'' (۴) آپ ﷺ نے آزردگی کا اظہار اس لئے فرمایا کہ ان دونوں کو ساتھ کہنے سے سامعین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ خدا کی اور رسول کی نافرمانی کا حکم برابر ہے اور اس میں شرک کا شائبہ ہے، اس لئے خطیب کو یوں کہنا چاہیے تھا کہ اور جو خدا کی اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ..... '' جیسا کہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے اور ماثورہ خطبوں میں بھی منقول ہے۔

۱۴۔ شبہاتِ شرک کی ممانعت: جن باتوں میں شرک کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا تھا ان سے بالکل منع کر دیا، لوگ اولاد کا نام آفتاب و ماہتاب وغیرہ کی عبدیت کے ساتھ رکھتے تھے، مثلاً عبد الشمس، عبد مناف، ان ناموں سے سخت منع فرمایا، ارشاد ہوا کہ بہترین نام عبد اللہ اور عبد الرحمٰن ہیں (۵) اہلِ عجم اپنے سلاطین کو شاہنشاہ یعنی تمام بادشاہوں کا بادشاہ کہتے تھے، چوں کہ اس میں شرک کا احتمال تھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ نام خدا کو سب سے زیادہ ناپسند ہے (۶)۔

---

(۱) ابن ماجہ کتاب النذور باب النھی ان یقال ما شاء اللہ وشئت ص۱۵۴ (۲) ابوداؤد کتاب الادب باب لاتقولوا خبثت نفسی ج۲ ص۲۰۲ (۳) ادب المفرد امام بخاری شرح فضل الصمد جزء ثانی ص۲۵۳ قاہرہ و کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی صفحہ ۱۱۰ (۴) ابوداؤد کتاب الادب باب لاتقولوا خبثت نفسی ج۲ ص۲۰۲ (۵) ابوداؤد کتاب الادب باب فی تغییر الاسماء ج۲ ص۱۹۹ (۶) ابوداؤد کتاب الادب باب فی تغییر الاسم القبیح ج۲ ص۲۰۰۔

دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص پر اللہ کا بے حد غضب ہوا جس نے اپنے کو شہنشاہ کہا، خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں۔ (حاکم فی المستدرک کتاب الادب باب النھی عن التسمیة بملک الاملاک ج ۴ ص ۲۷۵)۔

غلاموں کو لوگ عبد یعنی بندہ کہتے تھے، حالاں کہ انسان خدا کا بندہ ہے، آدمیوں کا نہیں، اسی طرح غلام اپنے مالک کو "رب" کہتے تھے حالاں کہ رب خدا ہے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے قطعاً منع فرما دیا کہ "کوئی شخص غلاموں کو عبد یعنی بندہ نہ کہنے پائے بلکہ یوں کہے کہ میرا بچہ یا بچی اور اسی طرح غلام اور باندیاں اپنے آقا کو رب نہ کہیں، مالک کہیں کہ تم سب غلام ہو اور رب اللہ ہے"۔ (۱) ہانی ایک صحابی تھے جن کی کنیت ابوالحکم تھی، وہ جب خدمتِ اقدس میں اپنی قوم کے ساتھ آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ حکم خدا ہے اور خدا ہی حکم دینے والا ہے، تم کو لوگ ابوالحکم کیوں کہتے ہیں، عرض کی کہ میرے قبیلہ میں جب کوئی نزاع ہوتی ہے تو لوگ مجھ کو حکم یعنی ثالث بناتے ہیں اور میں جو فیصلہ کرتا ہوں اس کو سب تسلیم کر لیتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے بچوں کے کیا نام ہیں، بولے شریح، مسلم، عبداللہ، آپ ﷺ نے پوچھا سب میں بڑا کون ہے، عرض کی "شریح" فرمایا تو تمہاری کنیت ابوشریح ہے۔ (۲)

اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں، گویا اس نے برائی کرائی، ایک دفعہ ایک صاحب آنحضرت ﷺ کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھے، گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، انہوں نے کہا شیطان کا برا ہو، آپ ﷺ نے فرمایا یوں نہ کہو ورنہ شیطان غرور سے پھول جائے گا اور کہے گا میری قوت سے یہ ہوا، خدا کا نام لو تو شیطان دب کر مکھی کے برابر ہو جائے گا۔ (۳)

تصویر بنانے سے سخت منع کیا، اس کی یہی وجہ تھی کہ اول اول لوگ کسی بزرگ اور مقتدا کی تصویر گھر میں رکھتے تھے تو محبت یا یادگار کے طور پر رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ان ہی تصویروں کی پرستش ہونے لگتی تھی، چنانچہ ہندوؤں اور رومن کیتھولک عیسائیوں میں اس طرح تصویر پرستی اور اس سے بڑھ کر بت پرستی کا رواج ہوا، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے سرے سے تصویر کھینچنے سے منع فرمایا۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب الادب باب لا یقول المملوک ربی وربتی ج ۲ ص ۲۰۱ (۲) ابوداؤد کتاب الادب باب فی تغییر الاسم القبیح ج ۲ ص ۱۹۹ (۳) ابوداؤد کتاب الادب باب لا یقول خبثت نفسی ج ۲ ص ۲۰۲۔

۱۵۔قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا: شرک کا بڑا ذریعہ قبر پرستی اور یادگار پرستی ہے، قبروں اور یادگاروں کو لوگ عبادت گاہ بنالیتے ہیں، سالانہ مجمع کرتے ہیں، دور دور سے سفر کرکے آتے ہیں، قبروں پر مسجدیں بناتے ہیں، منتیں مانتے ہیں، نذریں چڑھاتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے ان تمام افعال سے منع کیا، وفات سے پانچ دن پہلے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بنالیتے تھے دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو مسجد نہ بنانا (۱)، عین وفات کے وقت چہرہ سے چادر الٹ دی اور فرمایا کہ خدا یہود ونصاریٰ پر لعنت کرے ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنالیا۔

۱۶۔ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے: یہ توحید کے متعلق وہ اصلاحات تھیں جن کا تعلق زیادہ تر اعمال اور روزمرہ کی بول چال سے تھا لیکن حقیقی اصلاح جس سے توحید کی تکمیل ہوتی ہے، وہ قلب وروح کی توحید ہے، انسان کے تمام کاموں کا کوئی نہ کوئی نفسیاتی محرک ہوتا ہے، کوئی طلبِ شہرت کے لئے کام کرتا ہے کوئی دنیاوی معاوضہ کے لئے کرتا ہے، کوئی نمائش اور دکھاوے کے لئے کرتا ہے، کوئی غیر کی محبت یا عداوت میں کرتا ہے، ان تمام کاموں کا محرک درحقیقت غیر خدا ہے جس نے خدا کی جگہ لے لی ہے اسی لئے قرآن مجید نے کہا:

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰہُ (فرقان ۲۵: ۴۳)

تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنا خدا خود اپنی نفسانی خواہش کو بنالیا ہے۔

اسی لئے بڑا بت وہی ہے جس کو انسان نے خود اپنے دل کے بت خانے میں چھپا رکھا ہے، اس بت کو توڑنا، توحید کی اصل تکمیل ہے، آپ ﷺ نے بتایا کہ انسان کے تمام کاموں کا دارومدار خود اس کے دل کے عمل پر ہے، انما الاعمال بالنیات اس لئے ایک مسلمان کے ہر قسم کے کاموں کا اصلی محرک صرف خدا کا حکم، خدا کا خوف، خدا کی اطاعت، خدا کی خوشنودی، خدا کی محبت، غرض صرف خدا ہونا چاہیے، جس درجہ تک ایک مومن کی اس قلبی کیفیت میں ترقی ہوگی، اس کے ایمان وتوحید کی تکمیل بھی پایۂ کمال کو پہنچتی جائے گی، اسی بنا پر وحیِ محمدی نے ہر جگہ اور ہر موقع پر انسان کو اس کے عمل کی غرض وغایت مرضاۃ اللہ اللہ کی خوشنودی مخلصین له الدین، اخلاص اور وجه ربه الاعلی، ذات خدا کو قرار دینے کی تعلیم دی ہے، اس بنا پر انسان جو کام خدا کے علاوہ کسی اور غرض ونیت

(۱) صحیح مسلم ج ا کتاب المساجد باب النھی عن بناء المساجد علی القبور ج ا ص ۲۰۰۔

کرے تو درحقیقت اس کام کے لئے اس نے ایک موقت خدا الگ بنالیا اور وہ گو اس وقت لفظی اور قانونی شرک کا مجرم نہیں لیکن معنوی و نفسی شرک کے ارتکاب کا یقیناً مجرم ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے خدا کے لئے دیا اور خدا ہی کے لئے رد کیا، خدا کے لئے چاہا اور خدا ہی کے لئے عداوت کی اور خدا ہی کے لئے بیاہ کیا، اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا''۔(۱)

متعدد صحابیوں (۲) سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ریا چھپا ہوا شرک ہے'' حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ چھپا ہوا شرک یہ ہے کہ انسان کوئی کام دوسرے کی موجودگی کے سبب سے کرے۔(۳) حضرت شداد بن اوسؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کی خیرات کی اس نے شرک کیا'' (۴) یہی صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ صحابہؓ کے مجمع میں آپ ﷺ فرمار ہے تھے کہ ''مجھے اپنی امت کے لوگوں پر سب سے زیادہ جس کا خوف ہے وہ شرک کا ہے، ہاں میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ چاند یا سورج کو سجدہ کریں گے، یا بتوں کو پوجیں گے، بلکہ یہ ہے کہ وہ غیر خدا کے لئے عمل نہ کرنے لگیں اور چھپی نفسانی خواہش میں نہ بتلا ہوں''۔(۵) حضرت محمود بن لبید انصاری آپ ﷺ کا قول نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ''مجھ کو سب سے زیادہ جس کا تم پر خوف ہے وہ شرکِ اصغر ہے''، صحابہؓ نے عرض کی ''یا رسول اللہ ﷺ شرک اصغر کیا ہے'' فرمایا ''ریا، قیامت کے دن جب لوگوں کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہوگا، خدا ریا کار لوگوں سے کہے گا کہ تمہارے لئے ہمارے یہاں کچھ نہیں، تم ان ہی کے پاس جاؤ جن کے دکھانے کو دنیا میں یہ کام کیا کرتے تھے'' (۶)، حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر ہم لوگ دجال کے متعلق آپس میں باتیں کررہے تھے کہ اسی اثنا میں آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کہ ''دجال سے بڑھ کر جو

---

(۱) مستدرک حاکم ترمذی، آخر ابواب صفۃ القیامۃ ص ۴۱۴، ترمذی کے دو نسخوں میں اس حدیث کے متعلق دو تنقیدیں درج ہیں، ایک میں منکر لکھا ہے، اور دوسرے میں حسن، اس کے ایک راوی اجلح کی نسبت لوگوں نے کلام کیا ہے، مگر حدیث کا نفسِ مضمون تمام اسلامی روایات اور احکام کے عین مطابق ہے، (۲) حضرت ابوسعید خدری، معاذ بن جبل، ابو ہریرہ، شداد بن اوس، محمود بن لبید، ابو سعید بن ابی فضالہ، رضی اللہ عنہم ان صحابیوں کی روایتیں ابن حنبل اور ابن ماجہ، مستدرک وغیرہ میں ہیں۔(۳) مستدرک حاکم کتاب الرقاق ص ۳۲۹ جلد ۴ (صحیح) (۴) بحوالہ مستدرک ج ۴ ص ۳۳۰، مسند ابن حنبل، مسند شداد بن اوس صفحہ ۱۲۶ جلد ۴ (۵) سنن ابن ماجہ باب الریا والسمعۃ ص ۳۲۰ (۶) مسند ابن حنبل مسند محمود بن لبید انصاری ص ۴۲۸ جلد ۵۔

خوف ناک چیز میرے نزدیک ہے کیا میں تم کو اس سے آگاہ نہ کردوں''، ہم سب نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ ﷺ فرمایا ''وہ شرک خفی ہے''، یعنی یہ کہ (مثلاً) کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے تو وہ نماز کو محض اس لئے درست کر کے پڑھے کہ کوئی دوسرا شخص اس کو دیکھ رہا ہے (۱)، ابوسعید بن ابی فضالہ انصاریؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''قیامت میں جب خدا اگلوں اور پچھلوں کو یک جا کرے گا تو ایک منادی آکر پکارے گا کہ جس نے اپنے کسی عمل میں خدا کے ساتھ کسی غیر کو بھی شریک بنالیا ہو تو وہ اپنا ثواب اسی غیر سے مانگے کہ خدا ساجھے سے بے نیاز ہے'' (۲)۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد کیا کہ ''خدا فرماتا ہے کہ میں تمام شریکوں میں سب سے زیادہ شرکت سے بے نیاز ہوں تو جس نے اپنے کسی کام میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کرلیا تو میں اس سے الگ ہوں اور وہ اسی کا ہے جس کو اس نے میرا شریک بنایا'' (۳)۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ صحابہؓ اپنے ہر عمل میں اس شرک خفی سے ڈرتے تھے، شداد بن اوس کہتے ہیں کہ ''ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے زمانۂ حیات میں ریا کو شرک اصغر گنا کرتے تھے''۔ (۴) ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ جارہے تھے، دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبلؓ صحابی آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں، حضرت عمرؓ نے رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے قبر مبارک کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس قبر میں مدفون ہستی نے کہا تھا کہ ''ریا کا ادنی شائبہ بھی شرک ہے'' (۵) اسی طرح ایک دفعہ عبادہ تابعی نے دیکھا کہ حضرت شدادؓ بن اوس صحابی اپنی جانماز پر بیٹھے زاروقطار رو رہے ہیں، رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن میں نے رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ اقدس پر غم وملال کے آثار دیکھے، عرض کی میرے ماں باپ حضور پر فدا ہوں، اس حزن وملال کا سبب کیا ہے؟ ارشاد ہوا کہ ''میں اپنے بعد اپنی امت پر ایک چیز سے ڈرتا ہوں''، عرض کی ''یا رسول اللہ وہ کیا ہے؟'' فرمایا ''شرک اور چھپی نفسانی خواہش''، میں نے دوبارہ گذارش کی یا رسول اللہ کیا آپ (ﷺ) کی امت آپ کے بعد شرک میں مبتلا ہوگی؟ فرمایا ''اے شداد! میری امت یقیناً سورج یا چاند

(۱) سنن ابن ماجہ باب الریاء والسمعۃ ص ۳۲۰ (۲) ایضاً وترمذی ابواب صفۃ الجنۃ باب ما جاء فی خلود اهل الجنة و اهل النار ص ۴۲۰ ومسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۲۱۵ (۳) ابن ماجہ باب الریاء ص ۳۲۰ (۴) مستدرک حاکم کتاب الرقاق جلد ۴ ص ۳۲۹ (صحیح) (۵) ایضاً ص ۳۲۸ (صحیح)۔

بت اور پتھر کی پرستش نہیں کرے گی لیکن وہ اپنے عمل کی نمائش اور ریا کرے گی"، عرض کی "یا رسول اللہ کیا ریا شرک ہے" فرمایا "ہاں"۔(۱)

ان واقعات اور تعلیمات کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کس طرح ہر پہلو سے شرک کی تردید اور توحید کی تکمیل فرمائی ہے، وہی عرب جو پہلے خدا کے سوا ہر چیز کی پرستش کرتے تھے انہوں نے آپ ﷺ کی تعلیم کے اثر سے خدا پرستی اور توحید کی انتہائی معراج حاصل کر لی۔

---

(۱) مستدرک حوالۂ مذکور ص ۳۳۰ حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد لکھا ہے، مگر ذہبی نے تصریح کی ہے کہ "اس کا ایک راوی عبدالواحد بن زید متروک ہے" تاہم چوں کہ حدیث کا نفس مضمون مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۱۲۶ اور سنن ابن ماجہ (باب الریاص ۳۲۰) میں ایسے سلسلوں سے مذکور ہے جن میں یہ عبدالواحد نہیں پڑتا، اس لئے ہم نے اس حدیث کو یہاں درج کیا ہے۔

توحید

اور

اس کے ایجابی اصول وارکان

یہ تو توحید کے سلبی اجزا تھے، یعنی توحید کے مخالف عقائد و خیالات کی نفی اور تردید لیکن نبوتِ محمدی ﷺ کا کارنامہ اس سے اہم اور بالاتر ہے اور وہ توحید کی اصل بنیاد کی استواری، اس کے اصول کی تعیین، امورِ ایمان کی تفصیل اور اس کے اجزا کی تکمیل ہے، عرب میں شرک و بت پرستی بھی تھی اور کہیں کہیں آسمانی مذاہب کی محرف صورتیں بھی موجود تھیں، مگر ایک صحیح مذہب کا تخیل ان کے سامنے مطلق نہ تھا، اس بنا پر عقائد اور ایمان کی کوئی صحیح اور مرتب صورت بھی ان کے ذہن میں نہیں ہوسکتی تھی، آنحضرت ﷺ نے ان کے تمام پچھلے مزخرفات اور اوہام کو جن کو دین کا درجہ دے دیا گیا تھا، یک قلم محو کر دیا، بت پرستی، جن پرستی، فرشتہ پرستی، ستارہ پرستی، فطرت پرستی، انسان پرستی، غرض شرک کی تمام صورتیں قطعاً مٹادیں اور ان کی جگہ مرتب، متقن، سنجیدہ حقائق اور سچائیوں سے معمور چند عقائد کی تعلیم دی جو انسان کے تمام اعمال اور اخلاق کا بنیادی پتھر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل: اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز خدا کی ہستی کا یقین اور پھر اس کی توحید پر ایمان ہے، دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان میں سے ہر ایک نے اس قادرِ مطلق کی طرف لوگوں کو دعوت دی، مگر یہ دعوت ان کے ایک مسلّم دعویٰ کی حیثیت سے تھی، انہوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا اور حقیقت میں جن نامحدود زمانوں میں قوموں کے لئے ان کی بعثت ہوئی ان میں دلیل اور برہان کی ضرورت بھی نہ تھی، کیوں کہ ان زمانوں میں بت پرستی، ستارہ پرستی اور فطرت پرستی کا رواج تھا، الحاد کا وجود نہ تھا لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت عمومی تھی جو آخری زمانہ تک کے لئے اور تمام قوموں کے لئے تھی اور علم الٰہی میں یہ تھا کہ بعثت محمدی ﷺ کے بعد عقل انسانی تحقیق وتلاش کے آخر مراحل طے کرنا چاہے گی اور قدرت کے سربہ مہر خزانے وقف عام ہوں گے اور عقلیت کا دور دورہ ہوگا اور ہر شے دلیل وثبوت کی

محتاج قرار پائے گی، اس لئے محمد رسول اللہ ﷺ کو دلائل و براہین، ثبوت اور شواہد کی بھی تلقین کی گئی۔

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیائے سابقین صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوئے تھے، جن میں مشرکین کا وجود تھا، ملحدین کا نہ تھا لیکن خاتم الانبیا ﷺ کی بعثت تمام قوموں اور طبقوں کے لئے ہوئی، اس لئے آپ ﷺ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپ ﷺ انسانی عقل کی ہر صنف کو مخاطب کررہے ہیں اور اس کے معیار اور سطح کے مطابق اس قادرِ مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش کررہے ہیں، اس لئے آپ ﷺ نے دوسرے پیغمبروں کی طرح صرف مشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا بلکہ مشرکوں، کافروں، ملحدوں، مشککوں، دہریوں، ہر ایک کو مخاطب فرمایا اور ان میں سے ہر ایک کی تسکین و تشفی کا سامان بہم پہنچایا۔

ایک قادرِ مطلق، خالقِ عالم اور صانعِ کائنات کی ہستی کے ثبوت اور انکار پر جب سے فلسفہ کا وجود ہے ہمیشہ بحثیں پیدا ہوتیں اور دلیلیں پیش کی جاتی رہی ہیں، مصر، یونان، ہندوستان، اسلامی ممالک اور آج یورپ میں بھی اس مسئلہ پر عقلائے زمانہ نے اپنی جودت ذہن، نکتہ رسی اور دقیقہ فہمی کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے مگر غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دلائل کی زبان اور طرز تعبیر میں گو تبدیلی ہوتی رہی ہے مگر اصل مغز سخن صرف ایک ہے، اس بنا پر وحیِ محمدی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر جو دلیل قائم کی، اس میں اسی مغز کو لے لیا ہے اور نہایت موثر طرزِ ادا میں اس کو بار بار دہرایا اور انسانوں کو متنبہ کیا ہے۔

وحیِ محمدی ﷺ کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادرِ مطلق، خالقِ عالم اور صانعِ ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے، متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے، آثارِ قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مردہ اور گم نام قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا، جس میں سامانِ تمدن، اعلا خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہو مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی بالکل نہیں نظر آتی، ان کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے، آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں، غرض جماعتِ انسانی کا کوئی حصہ، زمین کا کوئی گوشہ، زمانہ کا کوئی عہد، اس تخیل سے خالی نہیں ملتا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل

ہے، اسی لئے وحیِ محمدی ﷺ نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ (روم ۳۰:۳۰)	اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر، یہ خدا کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا، خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں، یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

كل مولود يولد على الفطرة. (۱)	ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

اسی لئے خدا کا اعتراف روزِ اول کا وہ عہد و پیمان ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان ہوا تھا اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے، کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نمایاں ہو جاتا ہے، قرآن پاک نے اس واقعہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ (اعراف ۷:۱۷۲)	اور جب تیرے خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے ان کی نسل کو لیا اور خود ان کو ان ہی پر گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، انہوں نے کہا ہاں، ہم گواہ ہیں۔

انسان کا یہ جذبۂ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے، وحیِ محمدی ﷺ نے بارہا انسان کے اسی دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا ہے اور اسی زیرِ خاکستر آگ کو ہوا دی ہے اور انسان کو اس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلایا ہے، وہ انسانوں سے پوچھتی ہے:

اَفِى اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (ابراھیم ۱۴:۱۰)	کیا آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے؟

ایک اور مقام پر اس نے کہا:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ. اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ. (طور ۵۲:۳۵-۳۶)	کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے، یا وہ ہی اپنے آپ خالق ہیں، یا ان ہی نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے (یہ کوئی بات نہیں) بلکہ ان کو یقین نہیں ہے۔

(۱) صحیح بخاری کتاب الجنائز باب ما قیل فی اولاد المشرکین ج ۱ ص ۱۸۵۔

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے، بہر حال موجود ہے اور اس کے اس وجود میں کوئی شک بھی نہیں ہے، اب سوال یہ ہے کہ کسی کے بن بنائے وہ آپ سے آپ بن گئی ہے یا خود اس نے اپنے آپ کو بنالیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں، نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ ہوسکتا ہے، اگر کوئی بے وقوف یہ کہے کہ نر و مادہ مل کر اپنا بچہ پیدا کرتے ہیں تو اس سے پوچھا جائے گا کہ سلسلۂ توالد و تناسل کا آغاز کیوں کر ہوا اور اولین نر و مادہ کا اور مادۂ تخلیق و روح کا خالق کون ہے؟

یہ گوناگوں عالم، یہ رنگا رنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں جان دار اور بے جان اشیا، یہ علل و اسباب کا تسلسل، یہ تغیر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظم اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون، انسان کے اندرونی قویٰ اور ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار، خواص و قویٰ کے رموز، انسان کی خیالی بلند پروازی اور عملی عجز و درماندگی، یہ تمام باتیں ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں۔ یہ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالقِ کل کا پتہ دیتا ہے:

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ۔ (آل عمران ۳:۱۹۰)	آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلنے میں عقل مندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

یہ شب و روز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور یہ چاند کی روشنی، ان کی مقررہ رفتار اور باقاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس ابلقِ ایام پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں اس کا سیاہ و سپید ہے:

وَمِنۡ اٰیٰتِهِ الَّیۡلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ (حٰم السجدۃ ۴۱:۳۷)	اور اس کی نشانیوں میں سے رات، دن اور سورج اور چاند ہیں۔

آسمان اور زمین کی پیدائش، دن اور رات کا الٹ پھیر تو ہے، دیکھو کہ خطرناک سمندروں میں کس طرح لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک کو تجارت کا سامان لے کر دوڑتے پھرتے ہیں، اگر پانی میں مٹی اور لوہے کا ایک ذرہ بھی ڈالو تو فوراً ڈوب جائے گا، مگر یہ لاکھوں من کے لدے ہوئے جہاز کیسے پھول کی طرح پانی پر تیر رہے ہیں، جس طرح فطری قاعدہ کے بہ موجب یہ عمل ظہور میں آرہا

ہے، وہ جس کے حکم سے بنا ہے اس کا کتنا بڑا احسان ہے، پھر ان سمندروں سے بخارات اٹھتے ہیں، وہ اوپر جا کر بادل بنتے ہیں اور وہ وہیں پہنچ کر برستے ہیں، جہاں پیداوار اور زمین کی نشوونما کی حاجت ہے اور پھر وہ بادل ہواؤں کے تخت پر بیٹھ کر کیسے ادھر ادھر ضرورت کے مطابق اڑتے پھرتے ہیں:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ	بے شبہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور دن رات کے
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ	الٹ پھیر میں اور ان جہازوں میں جو انسانوں کے لئے
تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ	فائدہ رساں سامان لے کر سمندر میں چلتے ہیں اور آسمان
اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ	سے اس کے پانی برسانے میں اور پھر اس پانی کے ذریعہ
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ	مرے پیچھے زمین کو زندگی بخشنے میں اور زمین میں ہر طرح
دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ	کے جو چلنے والے پھیلائے اس میں اور ہواؤں کے کبھی ادھر اور
الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ	کبھی ادھر بہنے میں اور آسمان اور زمین کے بیچ میں جو بادل کام
لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ. (بقرہ۲:۱۶۴)	میں لگے ہیں ان سب میں سمجھ والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔

آسمان اور زمین کی عجیب وغریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی اپنی پیدائش کی حکایت کتنی عجیب ہے:

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ.	بے شک آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے لئے
وَفِیْ خَلْقِكُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ	نشانیاں ہیں اور خود تمہاری پیدائش میں اور جو چلنے والے
لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ. (جاثیہ۴۵:۳،۴)	پھیلائے ان میں یقین کرنے والوں کے لئے دلیلیں ہیں۔

سورۂ انعام میں نباتات اور ان کی نیرنگیوں کو اپنی ہستی کی دلیل میں پیش کیا، یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے جس میں سے وہ اگتے ہیں، ایک ہی پانی ہے جس سے وہ سینچے جاتے ہیں، ایک ہی ہوا ہے جس میں وہ سانس لیتے ہیں مگر کتنے رنگ برنگ کے پھل پھول، میوے اور درخت لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا رنگ، ہر ایک کا مزہ، ہر ایک کی پتی، ہر ایک کا قد وقامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں:

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا	اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس
بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا	سے اگنے والی ہر چیز نکالی، پھر اس سے سبز خوشے

يُّخۡرِجُ مِنۡهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخۡلِ مِنۡ طَلۡعِهَا قِنۡوَانٌ دَانِيَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّ الزَّيۡتُوۡنَ وَ الرُّمَّانَ مُشۡتَبِهًا وَّغَيۡرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنۡظُرُوۡۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ وَيَنۡعِهٖ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكُمۡ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ. (انعام۶:۱۰۰)	نکالے،جن سے ہم جڑے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے گابھے میں سے لٹکتے گچھے اورانگور کے باغ اور زیتون اور انار ہم شکل اور جداجدا شکل کے،جب وہ پھلیں تو ان کے پھل اور پکنے کو دیکھو، بے شک ان میں ایمان والے لوگوں کے لئے دلیلیں ہیں۔

سورۂ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو، پھراس میں عورت مرد کے جوڑے ہونے کواوران کے درمیان مہر ومحبت کے جذبات کے ظہور کواپنی ہستی کی دلیل بتایا ہے، پھراپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں ،ایک ایک کر کے پیش کیا ہے،اول تو خود انسانوں کی پیدائش پھران میں عورت مرد ہونا اوران کے درمیان جذبات کی لہر پھر مختلف قوموں کی بولیوں،شکلوں اوررنگوں کو دیکھو کہ ایک ایک سے الگ ہے ،پھر انسانوں کے اندر کے اعمال کو دیکھو،ایک نیند ہی کی حقیقت پرغور کرو، یہی تمہاری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے:

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ تَنۡتَشِرُوۡنَ. وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡكُنُوۡۤا اِلَيۡهَا وَ جَعَلَ بَيۡنَكُمۡ مَّوَدَّةً وَّرَحۡمَةً ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ. وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِكُمۡ وَاَلۡوَانِكُمۡ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡعٰلِمِيۡنَ. وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمۡ بِالَّيۡلِ وَ النَّهَارِ وَ ابۡتِغَآؤُكُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّسۡمَعُوۡنَ. وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ يُرِيۡكُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّطَمَعًا وَّ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحۡىٖ بِهِ الۡاَرۡضَ	اوراس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کومٹی سے بنایا پھرتم آدمی بن کر چلتے پھرتے ہواوراس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ تم ان سے سکون حاصل کرواور تم سب کے درمیان پیار اور مہر رکھااور اس میں ان لوگوں کے لئے جو سوچتے ہیں دلیلیں ہیں اوراس کی نشانیوں میں سے آسمانوں کی اورزمین کی بناوٹ اور تمہاری بولیوں اور رنگوں کی بوقلمونی ہے،اس میں جاننے والوں کے لئے یقیناً دلیلیں ہیں اوراس کی عجیب قدرتوں میں سے تمہارا رات دن میں سونا اور تمہارااس کی مہربانیوں کوتلاش کرنا ہے اس میں ان کے لئے جو سنتے ہیں دلیلیں ہیں اوراس کے عجائب

بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ. وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ (روم ۳۰: ۲۰-۲۵)

قدرت میں سے یہ ہے کہ تمہیں وہ بجلی کی چمک دکھاتا ہے جس سے تم ڈرتے ہو اور کبھی رحمت کی بارش کی امید باندھتے ہو اور وہ آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس سے زمین کو اس کے مرے پیچھے زندہ کرتا ہے اس میں ان کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں دلیلیں ہیں اور اس کی دلیلوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔

اس اخیر آیت میں آسمان و زمین کے اس کے حکم سے قائم رہنے کا ذکر ہے تم کہتے ہو کہ یہ باہمی جذب و کشش سے قائم ہیں لیکن خود یہ جذب و کشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے؟ یہ خود حیرت انگیز ہے، سورۂ لقمان میں آسمانوں کے بلا کسی نظر نہ آنے والے سہارے کے کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے، یہ نظر نہ آنے والا سہارا قوتِ کشش ہی سہی لیکن وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہے، اس کے بعد ایک جامد اور بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع و اقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھر آنا کتنا حیرت انگیز ہے، یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ۚ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ. (لقمان ۳۱: ۱۰)

اس نے آسمانوں کی چھت کو کسی ایسے ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہے جو تم کو نظر آتے ہوں اور زمین میں ایسے کھونٹے ڈال دیئے کہ وہ تم کو لے کر ہل نہ جائے اور اس نے اس زمین پر ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلائے اور آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اسی زمین سے ہر اچھے جوڑے پیدا کئے۔

سورۂ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز، پھر قطرۂ آب (نطفہ) کے ذریعہ توالد و تناسل، پھر اس سڈول جسم کا بن جانا، پھر اس مٹی کے مردہ قالب میں دفعتاً کہیں سے زندگی آجانا اور اس میں روح پھنک جانا اور اس میں علم و حواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہو جانا، ان سب کو اپنی صفت میں پیش کیا ہے:

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ

وہ جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی اور انسان کی پیدائش

الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ. ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ. ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ.

(الم سجدہ ۳۲: ۷-۹)

مٹی سے شروع کی پھر اس کی نسل ذلیل سے نچڑے پانی سے بنائی، پھر اس کو سڈول کیا اور اس میں اپنی جان سے کچھ پھونک دیا اور تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنادئے، تم ان احسانوں کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

مردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں ودیعت ہیں اور خود انسانوں کے جسم و جان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے لیکن کوئی صاحبِ نظر ادھر نہیں دیکھتا، انسان کی زندگی، اس کے اندرونی جذبات، حواس ذہنی قویٰ اور دماغی حرکات ان میں سے ہر شے معما ہے:

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ. وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ. (ذاریات ۵۱: ۲۰، ۲۱)

اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری جانوں کے اندر، کیا تم نظر نہیں کرتے۔

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب و غریب نظام ہے وہ بھی غور کے قابل ہے، ایک ہی گھاس پھوس کی غذا ان کے پیٹ میں جاتی ہے پھر اسی کا کچھ حصہ لید اور گوبر، کچھ خون اور کچھ دودھ بن جاتا ہے اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستوں اور سرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص سپید، شیریں دودھ کی دھاروں کا نکلنا کتنا عجیب ہے؟

وَاِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ. (نحل ۱۶: ۶۶)

اور تمہارے لئے جانوروں میں عبرت ہے، ہم تمہیں ان کے پیٹوں کے اندر سے لید اور خون کے بیچ سے خالص اور پینے والوں کے لئے خوش گوار دودھ پلاتے ہیں۔

ایک ہی قسم کے پھل ہیں، اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت کو بڑھاتے ہیں اور دوسری طرح کھاؤ تو اس کو ضائع کر دیتے ہیں:

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۗ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ. (نحل ۱۶: ۶۷)

اور چھوہاروں اور انگوروں کے پھلوں کو دیکھو کہ ان میں سے تم نشہ اور اچھی روزی بھی حاصل کرتے ہو، اس میں سمجھ والوں کے لئے دلیل ہے۔

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ، سورج کا روشن چراغ

اور چاند کی خوش نما قندیل کتنی عجیب ہے، پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ برج طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسموں اور زمانوں کو نمایاں کرتا ہے:

تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا. (فرقان ۲۵:۶۱)

بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور ان میں ایک چراغ اور چمکانے والا چاند بنایا۔

ان ہی چند چیزوں تک اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہیں، بلکہ ہر شے اپنی خلقت، اپنی محکم روش اور اپنے قانون فطرت سے اس کی گواہی دیتی ہے:

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ. (نمل ۲۷:۸۸)

اس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط (نظام پر) بنایا۔

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، اس میں مستحکم نظم ونسق کی بندش نظر آتی ہے:

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ. ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ. (ملک ۶۷:۳،۴)

تجھے مہر والے خدا کی بناوٹ میں کوئی بے برابری نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر، کیا کوئی فطور دکھائی پڑتا ہے، پھر دہرا کر دوبارہ نظر کر، تیری نگاہ رد ہو کر تھک کر تجھ تک پلٹ آئے گی (مگر کوئی نقص نہ پا سکے گی۔)

اس قسم کی اور سینکڑوں آیتیں ہیں جن کا استقصا بھی مستقل ہے، ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل ہیں۔

۱۔ قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

۲۔ عالم کا نظم ونسق اور اس کا مرتب سلسلہ۔

۳۔ کائنات اور سلسلۂ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور فائدوں کا ہونا۔

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم علل و اسباب خود بخود بخت اتفاق سے نہیں بن گئے، بلکہ کسی حکیم و دانا اور قادرِ مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان کو بنایا ہے، عالم میں ہر چیز کے لئے علل و اسباب کا سلسلہ ہے، یہ سلسلہ یا تو کہیں جا کر ختم ہوگا یا یوں ہی مسلسل چلا جائے گا، اگر یہ یوں ہی مسلسل چلا جائے گا تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے پر غیر متناہی علل گذر جائیں اور غیر متناہی علل کا خاتمہ نہیں ہوسکتا اور نہ کہیں ان کا آغاز ہوسکتا ہے، اس لئے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہوسکتی، تسلسل عقلاً بھی محال ہے بلکہ انسان اس کے

تخیل سے بھی عاجز ہے، اس بنا پر لامحالہ سلسلۂ علل کا کہیں خاتمہ ہونا ضروری ہے جس علتِ کل پر تمام علتیں ختم ہو جاتی ہیں وہی خلق و پیدایش اور وجود و کون کی اصلی علت العلل ہے۔

یہ دلیل گو بہت کچھ پیچیدہ اور اصطلاحات سے لبریز اور بہت سے محذوف مقدمات پر مبنی ہے، تاہم وہ انسانی عقل میں آتی ہے اور بہتوں کے لئے تسکین کا باعث ہے، قرآن پاک کی ایک دو آیتوں میں بھی اس دلیل کا ماخذ مذکور ہے، سورہ ہود کے آخر میں ہے:

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ھود۱۱:۱۲۳)	اور خدا ہی کے پاس ہے آسمانوں اور زمین کی چھپی بات اور اسی کی طرف ہر بات لوٹائی جاتی ہے، تو اس کو پوج اور اس پر بھروسہ کر۔
وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى. (نجم۵۳:۴۲)	اور یہ کہ تیرے رب کی طرف ہے سب کی انتہا۔

آنحضرت ﷺ انسانی کمزوریوں سے واقف تھے، چند صحابیوں نے آکر عرض کی، یارسول اللہ ﷺ کبھی کبھی ہمارے دلوں میں ایسے خیالات اور وسوسے آتے ہیں جن کو ہم زبان سے ادا نہیں کر سکتے فرمایا کیا تم کو یہ کیفیت حاصل ہوگئی؟ گذارش کی ہاں یارسول اللہ، فرمایا "یہ تو خالص ایمان ہے"، مقصود یہ ہے کہ دل میں وسوسوں کا آنا اور پھر ان وسوسوں کو اتنا بدتر جاننا کہ ان کا زبان پر لانا بھی وہ گناہ سمجھے، یہ کیفیتِ ایمانی کے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: لوگ علم و دانش کا سوال کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ خیر اس کو تو خدا نے پیدا کیا اور پھر اس خدا کو کس نے پیدا کیا، آسمان کو خدا نے بنایا زمین کو خدا نے بنایا یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے پھر پوچھتے ہیں، اچھا تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا یہ شیطانی وسوسہ ہے، جب یہ حالت کسی کو پیش آئے تو کہہ دے اٰمنت باللّٰہ میں اللہ پر ایمان لایا۔(۱)

یہ تعلیم درحقیقت اسی مسئلہ کی ہے کہ خدا پر تمام علتوں کی انتہا ہے اور اس کے بعد کوئی علت نہیں، اس لئے یہ وسوسہ لائقِ جواب نہیں یہ جہالت اور نادانی کا سوال ہے۔

توحید پر عقلی دلیلیں: اگر کوئی عالم کا خالق و صانع ہے تو وہ یقیناً ایک ہے دو نہیں، تاہم دنیا میں ایسے عقل مند بھی ہیں جو دو تین بلکہ متعدد خداؤں کے قائل ہیں اور عالم کی ایک مملکت کو سیکڑوں حصوں میں

(۱) یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم کتاب الایمان باب بیان الوسوسة فی الایمان میں متعدد روایتوں سے مذکور ہیں، ج۱ ص۶۴۔

تقسیم کر کے ان کو مختلف خداؤں کی حکومتیں قرار دیتے ہیں، وحیِ محمدی ﷺ نے اس شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا ہے، وہ نظامِ عالم کی یکسانی اور وحدت اور کائنات کے علل و اسباب کا باہم توافق، تعاون، اشتراک اور اتحاد ہے، دنیا میں ایک ذرہ بھی اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک آسمان سے لے کر زمین تک کی تمام کارکن قوتیں اور اسباب ایک دوسرے کے موافق و مناسب نہ ہوں اور باہم ان میں اشتراکِ عمل نہ ہو، ایک دانہ زمین سے اس وقت تک اگ نہیں سکتا جب تک دانہ اگنے کے لائق نہ ہو، زمین میں اگانے کی صلاحیت نہ ہو، موسم اس کے مناسب نہ ہو، بارش موافق نہ ہو، آفتاب سے اس کو گرمی اور روشنی اس کے مزاج کے مطابق بہم نہ پہنچے، پھر اس کے اگنے کے مواقع اور عوائق ایک ایک کر کے دفع نہ ہوں، ان سب مراحل کے بعد وہ دانہ اگے گا اور پھل لائے گا، قرآن پاک نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ ءَالِهَةٌ إِلَّا ٱللَّهُ لَفَسَدَتَا	اگر زمین و آسمان میں اس ایک خدائے برحق کے سوا چند
فَسُبْحَٰنَ ٱللَّهِ رَبِّ ٱلْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ.	اور خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان برباد ہو جاتے، تو پاک
(انبیاء۲۱:۲۲)	ہے عرش والا خدا ان باتوں سے جو یہ مشرک کہتے ہیں۔

آسمان و زمین کا یہ تمام کاروبار، یہ تمام قوانین قدرت اگر ایک کے بجائے دو طاقتوں کے ہاتھ میں ہوتے تو یہ باہمی تصادم میں ایک لمحہ کے لئے بھی قائم نہ رہتے، فلسفیانہ اصطلاحات میں اس مطلب کو ادا کرو تو یوں ہوگا کہ عالمِ کائنات معلول ہے، اس کی کوئی علتِ تامہ ہوگی، یہ ظاہر ہے کہ ایک معلول کی دو علت تامہ نہیں ہوسکتی، کیوں کہ علت تامہ اس کو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو، اب عالم کی علت تامہ اگر ایک نہ ہو بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علتِ تامہ کے وجود کے بعد، عالم کے وجود میں دوسری علتِ تامہ کا انتظار رہے گا یا نہیں، اگر رہے گا تو پہلی شے علتِ تامہ نہیں رہے گی اور اگر انتظار نہ رہے گا تو دوسری شے علتِ تامہ نہ ہوگی، اس سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کی علتِ تامہ ایک ہی ہوسکتی ہے۔

توحید کے ثبوت اور شرک کے ابطال کی دوسری دلیل نظامِ عالم کی وحدت ہے، سورج، چاند اور تاروں سے لے کر انسان، حیوان، ہوا، پانی، درخت اور گھاس پات تک کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب ایک مقررہ نظام اور بندھے اصول کے ماتحت ہیں، جن میں کبھی سرِ مو فرق نہیں ہوتا، ہر شے ایک اصول

کی پابند اور ایک عادت جاریہ کے مطابق چل رہی ہے، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت قائم ہے اور وہ سب کسی ایک ہستی کے اشارے پر چل رہے ہیں:

وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ. (مومنون ۲۳:۹۱)

اور نہ اس خدائے برحق کے ساتھ کوئی اور خدا ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لے جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھ جاتا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا. سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا. تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (بنی اسرائیل ۱۷:۴۲-۴۴)

کہہ اگر خدائے برحق کے ساتھ کچھ اور خدا ہوتے جیسا کہ یہ (مشرکین) کہتے ہیں تو ایسی حالت میں وہ تخت والے (حکمران خدا سے حکومت چھیننے) کا راستہ ڈھونڈتے، پاک اور بلند ہے وہ (خدا) اس بات سے جس کو یہ (مشرک) کہتے ہیں، اس (خدائے) برحق کی پاکی ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان کے اندر ہے بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی پاکی کی گواہی نہ دیتی ہو۔

اسی وحدتِ نظام کے استدلال کو ایک اور آیت میں خدا نے بیان فرمایا ہے:

مَا تَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ. ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ. (ملک ۶۷:۳،۴)

تو خدا کے بنائے میں کوئی فرق نہیں دیکھتا پھر نگاہ کر، کیا کوئی فطور تجھ کو دکھائی دیتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر دوڑا، تیری نظر رد ہو کر، تھک کر واپس جائے گی۔

اس واقعاتی استدلال سے بڑھ کر جو بالکل نظمِ فطرت پر مبنی ہے کوئی دوسری صحیح دلیل نہیں ہو سکتی، اسی لئے قرآن پاک نے اس کو اختیار کیا ہے، یہ دنیا وحدتِ نظام ہی کے ماتحت چل رہی ہے، ورنہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی چل نہ سکے، اسی سے اس دنیا کے حاکم و فرماں روائے مطلق کی وحدت بہ خوبی ثابت ہے۔

توحید کی تکمیل: توحید خواہ کسی قدر محرف، شرک آمیز اور ناقص شکل میں ہو، دنیا کے تمام مذاہب و ادیان کی مشترک اور اولین تعلیم ہے لیکن ان مذاہب میں وہ کسی خاص اصل پر مبنی نہ تھی، محمد رسول اللہ ﷺ

کی تعلیم نے اس عمارت کو چند خاص اصول کے بنیادی پتھروں پر قائم کیا، یہ پتھر کیا ہیں؟ خدا کی حقیقی عظمت کی شناخت اور اس عالم کائنات میں انسان کی اصلی حیثیت اور مرتبہ کی تعیین۔

خدا کی حقیقی عظمت: اہلِ عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے، قدرت کے کارخانہ کا اس کو تنہا مالک نہیں سمجھتے تھے، یہودیوں کا خدا ایک خاندانی خدا تھا، جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کے لئے پیدا کی تھی اور اس کو بنا کر ساتویں دن وہ تھک کر بیٹھ گیا تھا، وہ انسانوں سے کشتی لڑتا تھا، اس کی اولادیں تھیں، عیسائیوں کا خدا سب کچھ مسیح بن مریم کو دے کر خود معطل ہو گیا تھا، ایرانیوں کے خدا کی خدائی نیکی وبدی کی دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی، ہندوؤں کا خدا اوتاروں کا بھیس بدل کر لاکھوں خدا بن گیا تھا اور برہما، مہیش اور بشن تینوں نے مل کر خدائی کے کاروبار باہم تقسیم کر لئے تھے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے، اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں، اس کی شاہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں، اس کے کارخانۂ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں، کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں، دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں، شجر، حجر، جنگل، پہاڑ، صحرا، دریا، سورج چاند، زمین، آسمان، انسان، حیوان زبان والے اور بے زبان سب اس کے آگے سربہ سجود اور اس کی تسبیح وتہلیل میں مصروف ہیں، سب کمزور ہیں وہی ایک قوت والا ہے، سب جاہل ہیں اسی ایک کو علم ہے، سب فانی ہیں، اسی ایک کو بقا ہے، سب محتاج ہیں وہی ایک بے نیاز ہے، سب اس کے بندے ہیں وہی ایک شہنشاہ ہے، غرض عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس پر صرف اسی کی حکم رانی ہے، وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے، وہ ہر قسم کے صفاتِ عالیہ، اوصافِ کمالیہ اور محامدِ جمیلہ سے متصف ہے، اس کے مانند کوئی نہیں، اس کی شبیہ ومثال کوئی نہیں، وہ تشبیہ وتمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتہ ناتے سے پاک ہے:

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (زمر ۳۹:۶)	وہ ہے اللہ تمہارا رب، اسی کی بادشاہی ہے، اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔
لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. (زمر ۳۹:۴۴)	آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. (انعام ۶:۱۴)

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ. (انعام ۶:۷۳)

چھپی اور کھلی کا جاننے والا۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ (قصص ۲۸:۸۸)

اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے، اسی کے ہاتھ میں فیصلہ کی طاقت ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ. (شوریٰ ۴۲:۱۱)

اس کے مانند کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (مومن ۴۰:۶۵)

وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ (انعام ۶:۵۹)

غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس کو جانتا ہے، درخت کا کوئی پتہ نہیں گرتا اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے لیکن وہ اس کے علم میں ہے۔

اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (آل عمران ۳:۲۶)

اے اللہ! اے بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت نصیب کرے، تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے، بے شک تو ہر بات پر قادر ہے۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ. (یونس ۱۰:۱۰۷)

اور اگر اللہ تجھے مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کرنا چاہے تو اس کے فضل و کرم کا کوئی روکنے والا نہیں، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنے فضل سے ممتاز کرے اور وہی گناہوں کو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ

اللہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں، وہی جیتا ہے اور سب اس کے سہارے جیتے ہیں، اس کو اونگھ ہے نہ نیند، آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے، کون ایسا ہے جو اس کے

مَا بَيْنَ اَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُودُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ. (بقرہ۲:۲۵۵)

سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے، جو لوگوں کے روبرو ہے اور جو ان کے پیچھے ہے، سب کو جانتا ہے اور وہ اس کے علم کے حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے، مگر جتنا وہ چاہے، اس کا تخت آسمانوں کو اور زمین کو سمائے ہے، ان آسمانوں کی اور زمین کی نگرانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اوپر اور بڑا ہے۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۚ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ. لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ. (حدید۵۷:۴،۵)

جو زمین میں گھستا اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا اور اس میں چڑھتا ہے وہ سب کو جانتا ہے اور تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کرو اللہ اس کو دیکھتا ہے اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام کاموں کا مرجع وہی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. (فاتحہ۱:۱)

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو تمام عالم کا پالنے والا ہے

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (آل عمران۳:۸۳)

اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کے زیرِ فرمان ہے۔

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ. ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ. فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ. (بروج۸۵:۱۴-۱۶)

وہی گناہوں کا بخشنے والا ہے، بندوں سے محبت کرنے والا ہے، تخت کا مالک ہے بڑی شان والا ہے، جو چاہتا ہے کر دیتا ہے،

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ. (جمعہ۶۲:۱)

آسمانوں میں اور زمین میں جو ہے سب اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (اسرائیل۱۷:۴۴)

اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔

ان معنوں کی ہزاروں آیتیں قرآن پاک میں ہیں، ان تعلیمات نے خدا کی عظمت، جلالت اور کبریائی کا وہ جلوہ پیش کیا جس کے سامنے معبودانِ باطل کی عزت خاک میں مل گئی، بتوں کی بڑائی کا طلسم ٹوٹ گیا، سورج، چاند، تاروں کی خدائی کا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا، جن و انس، شجر

دحجر، بحروبر، سب اس کے جلال وجبروت کے سامنے سربسجود نظر آئے پھر اس کے سوا کون تھا جو نیرنگِ وجود کے ساز سے اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا (طٰہٰ ۲۰:۱۴)، (میں ہوں خدا جس کے سوا کوئی دوسرا نہیں) کی صدا بلند کرسکتا۔

انسان کا مرتبہ: توحیدِ محمدی ﷺ کا دوسرا بنیادی اصول اس عالمِ خلق میں انسان کی حیثیت اور درجہ ہے، جو لوگ بتوں کو سجدہ کرتے ہیں، پتھروں کو پوجتے ہیں، درختوں کے آگے جھکتے ہیں، جانوروں کو دیوتا مانتے ہیں، جنات اور ارواحِ خبیثہ کے نام کی دہائی پکارتے ہیں، آسمانی مخلوقات کو ارباب جانتے ہیں، انسانوں کو خدا سمجھتے ہیں، وہ حقیقت میں انسان کے درجہ اور مرتبہ سے ناواقف ہیں، وہ دراصل اس طرح انسان کو پتھروں سے، درختوں سے، جانوروں سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے اور چاندتاروں سے کم تر جانتے ہیں، انہوں نے درحقیقت انسان کے اصلی رتبہ اور حیثیت کو نہیں پہچانا، آنحضرت ﷺ نے اپنی وحی کی زبان سے جاہل عربوں کو یہ نکتہ سوجھایا کہ انسان اس عالمِ خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے اور وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے، قرآن کے ابتدائی سورہ میں آدمؑ کی خلافت کا قصہ محض داستان نہیں بلکہ انسان کی اصلی حیثیت کو عیاں اور نمایاں کرنے والی تعلیم کا اولین دیباچہ ہے، اس کو فرشتوں کا مسجود بنانا گویا تمام کائنات کا مسجود بنانا تھا، اس کو تمام اسما کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیا کو اس کے تصرف میں دینا تھا، وہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (بقرہ ۲:۳۰) کے فرمان کے رو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے، اور اس کا سر خلافتِ الٰہی کے تاج سے ممتاز ہے، کروڑوں مخلوقاتِ الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل وہی منتخب ہوا، جو منصب اعلا نہ فرشتوں کو ملا، نہ آسمان کو عطا ہوا، نہ زمین کے حصہ میں آیا، نہ پہاڑ اس کے مستحق قرار پائے، صرف انسان ہی کا سینہ تھا جو اس امانت کا خزینہ دار ہوا، اور اسی کی گردن تھی جو اس بوجھ کے قابل نظر آئی، فرمایا:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط (احزاب ۳۳:۷۲)	ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو سب نے اس بار (امانت) کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔

وحیِ محمدی ﷺ نے انسان کا رتبہ یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بزرگیوں سے سرفراز فرمایا، عالم مخلوقات میں برتر بنایا اور انعام واکرام سے معزز کیا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔	ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے خشکی اور تری میں ان کو سواری دی اور ستھری چیزوں کی ان کو روزی بخشی اور اپنی بہت سی پیدا کی ہوئی چیزوں پر ان کو فضیلت عطا کی۔

(بنی اسرائیل ۱۷:۷۰)

انسان ہی وہ مخلوق ہے جو سب سے معتدل قویٰ اور بہترین اندازہ کے ساتھ دنیا میں پیدا ہوئی:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔	البتہ ہم نے انسان کو بہتر اندازہ پر پیدا کیا۔

(تین ۹۵:۴)

یہاں تک کہ انسان خدا کی صورت کا عکس قرار پایا، متعدد حدیثوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "خدا نے آدم کو اپنی صورت (۱) پر پیدا کیا"، اسی بنا پر آپ ﷺ نے تعلیم دی کہ "غلام کو سزا دو تو اس کے چہرہ پر نہ مارو کہ وہ صورتِ الٰہی کا عکس ہے"، عین میدانِ جنگ میں اگر تلواریں برس رہی ہوں تو حریف کے چہرہ پر وار نہ کرنا چاہیے، (۲) کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت (۳) پر بنایا ہے، غصہ میں یہ بھی نہ کہنا چاہیے کہ خدا تیرے چہرہ کو اور تیرے جیسے چہرہ کو بگاڑ دے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر خلق کیا (۴)، ان حدیثوں کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کی طرح خدا کی کوئی جسمانی شکل ہے اور آدم کی شکل اس کی نقل ہے۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (شوریٰ ۴۲:۱۱) بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسان میں خدا کی صفات کاملہ کی ایک دھندلی سی جھلک موجود ہے، علم، قدرت، حیات، سمع، بصر، ارادہ، غضب، رحم، سخا

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الاستیذان باب بدء الاسلام ج ۲ ص ۹۱۹، ابن ابی عاصم فی السنۃ والطبرانی من حدیث ابن عمر باسناد رجالہ ثقات وادب المفرد بخاری باب لا تقل قبح اللہ وجھہ ج ۱ ص ۲۶۸ واحمد بن ابی ہریرہؓ و صحیح مسلم کتاب البر والصلہ ج ۲ ص ۳۹۷ نیز توراۃ میں بھی یہ فقرہ ان الفاظ میں ہے، جس دن خدا نے آدم کو پیدا کیا، خدا کی صورت پر اسے بنایا (پیدائش ۵،۲ ص ۹ اکسفورڈ ۱۸۹۰ء (۲) صحیح بخاری کتاب العتق باب اذا ضرب العبد فلیجتنب الوجہ ج ۱ ص ۳۴۷ و مسند احمد ج ۲ ص ۴۸۳ و صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب النھی عن ضرب الوجہ ج ۲ ص ۳۹۷ (۳) صحیح مسلم کتاب البر آخری ٹکڑا صرف مسلم میں ہے ج ۲ ص ۳۹۷ (۴) الادب المفرد امام بخاری مع شرح فضل اللہ الصمد باب لا تقل قبح اللہ وجھہ ج ۱ ص ۲۶۸۔

وغیرہ صفات کی ناقص مثالیں اس کے اندر اللہ نے ودیعت رکھی ہیں اور چوں کہ انسان کے تمام اعضا میں اس کا چہرہ ہی اس کی شخصیت کا آئینہ دار اور اس کے اکثر حواس کا مصدر ہے جن سے اس کے تمام اوصاف کا ظہور ہوتا ہے، اس لئے آنحضرت نے انسان کے اعضا میں اسی کو فیضِ رحمانی کا مورد ظاہر کیا(۱)، اب غور کرو کہ وہ چہرہ جس کو خدا سے ایسی نسبت ہے کیا اس لائق ہے کہ غیر خدا کے آگے زمین پر رکھا جائے:

انسان تو کائنات میں خلیفۃ اللہ بن کر آیا ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ (انعام۶:۱۶۵)	اور اسی نے تم کو زمین کا نائب بنایا۔

تو اب وہ عالمِ کائنات میں خدا کے سوا کس کو سجدہ کرے۔

روئے زمین کی تمام چیزیں اس کی خاطر بنیں وہ روئے زمین کی خاطر نہیں بنا ہے:

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (بقرہ۲:۲۹)	جو کچھ زمین میں ہے خدا نے (اے انسانو!) تمہارے لئے بنایا۔
اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ (حج ۲۲:۶۵)	زمین میں جو کچھ ہے خدا نے اس کو تمہارے بس میں دے دیا ہے۔

تو اب وہ روئے زمین کی کس ہستی کے سامنے سر جھکائے۔

مشرک، بت پرست، ستارہ پرست، فطرت پرست، حقیقت میں غیروں کے آگے جھک کر یہ ثبوت دیتے ہیں کہ یہ ان کے لئے نہیں بلکہ وہ ان کے لئے بنے ہیں، جو چاند اور سورج کو پوجتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چاند اور سورج ان کے لئے نہیں بلکہ وہ چاند اور سورج کے لئے بنے ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی وحی اور تعلیم کے ذریعہ سے یہ بتایا کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے لئے بنی ہے اور انسان خدا کے لئے بنا ہے، اس لئے جب کائنات کا ہر ذرہ انسان کی خدمت گذاری میں مصروف ہے تو انسان کو بھی خدا ہی کی خدمت گذاری میں مصروف رہنا چاہیے:

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری وبغفلت نہ خوری

(۱) اس حدیث کی شرح میں فتح الباری شرح بخاری ج ۵ ص ۱۳۲ میں یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

انسانوں نے آسمانی مخلوقات کو اپنا معبود بنایا تو وحیِ محمدی ﷺ نے ان سے کہا:

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ	اور خدا نے رات، دن اور چاند اور سورج کو تمہارے لئے
وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ (نحل ۱۲:۱۶)	کام میں لگایا اور ستارے اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔

انسانوں نے جانوروں کو پوجا تو پیغامِ محمدی ﷺ نے ان اَن جانوں کو بتایا کہ یہ تمہارے ہیں تم ان کے نہیں ہو:

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ	اور جانوروں کو اس نے پیدا کیا تمہارے لئے، جن میں
(نحل ۵:۱۶)	اون کی گرمی اور دوسرے فائدے ہیں۔

انسانوں نے دریا اور سمندر کو دیبی اور دیوتا بنایا، حالاں کہ وہ بھی ان ہی کی خاطر عدم سے وجود میں آئے ہیں:

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ	اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو کام میں لگایا کہ تم اس سے
لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً	تازہ گوشت کھاؤ اور تا کہ تم اس میں سے آرائش کے موتی
تَلْبَسُونَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَ	پہننے کو نکالو اور دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر کو پھاڑتے پھرتے ہیں
لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ (نحل ۱۴:۱۶)	اور تا کہ تم خدا کے فضل وکرم (روزی) کی تلاش کرو۔

آگ بھی انسانوں کی مسجود بنی حالاں کہ وہ خود ان ہی کی محبت میں جل رہی ہے:

الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا	جس نے تمہارے واسطے ہرے درخت سے آگ پیدا کی
فَإِذَا أَنْتُمْ مِّنْهُ تُوقِدُونَ. (یٰس ۸۰:۳۶)	پس اس وقت تم اس سے روشن کرتے ہو۔

الغرض زمین سے لے کر آسمان تک جو مخلوق بھی ہے، انسان اس سے اشرف اور بلند تر ہے اور ساری مخلوق اسی کے لئے ہے، پھر اس انسان سے بڑھ کر اور کون نادان ہے جو مخلوقات میں سے کسی کو اپنا معبود اور مسجود بنائے، اس حقیقت کے آشکارا ہونے کے بعد شرک کا کوئی پہلو بھی ایسا ہے جس میں کوئی سچا مسلمان گرفتار ہو سکے اور ایک آستانہ کو چھوڑ کر وہ کسی اور چوکھٹ پر اپنا سر جھکا سکے۔

الغرض محمد رسول اللہ ﷺ نے جس توحید کی تلقین کی وہ ان ہی دو اصولوں پر قائم ہے، ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے، اس لئے کسی مخلوق کے سامنے اس کا سر نہ جھکنا چاہیے اور دوسرا یہ کہ ہر قسم کی قوت، ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصافِ کمالیہ صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کے لئے

ہیں جو ماورائے عرش سے زیرِ فرش تک ہر ذرہ پر حکم راں ہے، اس کی اطاعت کے دائرہ سے کوئی نقطہ باہر نہیں، انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھ کر صرف اسی کے آستانہ پر جھکنا چاہیے، ہماری تمام عقیدت، ہماری تمام محبت، ہمارا تمام خوف، ہماری تمام امیدیں، ہماری تمام دعائیں، ہماری تمام التجائیں، ہماری تمام عاجزیاں، صرف اسی ایک درگاہ پر نثار ہوں اور اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لحہ بسر ہو۔

وہ بزرگ و برتر ہستی کیا ہے؟ اور اس کی نسبت ہمارا کیا تخیل ہو؟ تعلیمِ محمدی ﷺ نے اس کا جواب بھی دیا ہے۔

خدا کا جامع اور مانع تخیل: قرآن پاک کی آیات، جاہلیت کے اشعار، اسلام سے پہلے عربوں کے واقعات، بلکہ عرب کے آثارِ قدیمہ کے کتبات سے یہ واضح طور پر ثابت ہے کہ عربوں کے ذہن میں ایک بالاتر ہستی کا تخیل ضرور موجود تھا، جس کا نام ان کے ہاں اللہ تھا مگر اللہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ اس کے صفات کیا ہیں؟ اس کی طرف کیا کیا باتیں منسوب کی جاسکتی ہیں، کن کن باتوں سے وہ پاک ہے، اس کا تعلق اپنے بندوں کے ساتھ کیسا ہے؟ ہم کو اس کے آگے کیسے جھکنا چاہیے؟ اس سے کیا مانگنا چاہیے اور کیوں کر مانگنا چاہیے؟ اس کے حضور میں دعا کیوں کر کرنی چاہیے؟ ہم اس سے کیوں ڈریں اور کیوں کر ڈریں؟ اور اس سے ڈرنے کی کیا حقیقت ہے؟ اس سے محبت کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اگر کی جاسکتی ہے تو کیوں کر؟ اور اس سے محبت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی قدرت کہاں تک ہے؟ اس کے علم کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ ہم سے دور ہے یا بالکل قریب؟ اس کے تقدس، بڑائی اور عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم توکل اور بھروسہ کیوں کر کریں؟ کیا وہ انسانوں کی کسی صنف سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں؟ اور وہ احکام واجب الاطاعت بھی ہیں؟ وہ کن باتوں سے خوش اور کن سے ناخوش ہوتا ہے؟ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی آگاہ ہے؟ کیا اس کی اجازت کے بغیر زمین کا ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرسکتا؟ اس کی مشیت اور اس کا ارادہ کیوں کر آسمان سے زمین تک ہر چیز کو محیط ہے؟ کیا اس کے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون بھی ہیں؟ کیا وہ انسانوں کی تعلیم اور اصلاح کے لئے پیغمبروں کو بھی مبعوث کرتا ہے؟ کیا ہم اس کی بارگاہ میں اپنے اعمال کے جواب دہ بھی ہیں؟ ہم سے وہ کیوں اور کیوں کر ہمارے اعمال کا مواخذہ کرے گا؟ یہ وہ باتیں ہیں جن

سے عرب جاہلیت کا دل ودماغ بالکل عاری اور خالی تھا اور ان چیزوں کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی تخیل نہ تھا، جاہلیت کا ایک ایک شعر پڑھ جاؤ ان کے مذاہب واعتقادات کا ایک ایک حرف تلاش کرلو، اس سے زیادہ کچھ نہ پاؤ گے کہ اللہ ایک طاقت ور اعلا ہستی ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور مصیبتوں اور بلاؤں میں اس کو پکارنا چاہیے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ربانی تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا، اس کی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا، اس کی مشیت وارادہ اور قدرت ووسعت سے آگاہ کیا، ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی ان کو تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہا، جس کی وسعت غیر محدود ہے، جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ ہے، جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل ہے، دلوں کے اسرار، زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لحہ اس کے روبرو ہیں، اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جواب دہ اور ذمہ دار ہے، اس کے مواخذہ کا خوف اس کی رحمت کی امید ہے، وہ محبوبِ ازل ہے، اس کی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہشیاری ہے، اس کے فضل وکرم اور لطف ومحبت کی نیرنگیاں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہیں، اس کی قوت ہر قوت پر غالب، اس کا ارادہ ہر ارادہ میں نافذ اور اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے، اس کی عبادت ہر مخلوق پر فرض اور اس کی اطاعت ہر مکلّف پر واجب ہے، وہ ہر عیب سے پاک ومنزہ اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے، انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ واصلاح کے لئے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں، جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے، وہ اندھیرے کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسوں کی امید، زخمیوں کا مرہم، بے قراروں کی تسلی اور بے کسوں کا سہارا ہے، وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے، ہم اس کو جب پکاریں وہ سنتا ہے، وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے، وہ جب چاہے آسمان وزمین کو فنا کردے اور جب چاہے ان کو پھر رچادے، اس کی محبت دنیا کا حاصل، اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے:

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (رعد ۱۳:۲۸)
ہاں خدا کی یاد سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے بھی خدا کا نام یاد نہ آتا تھا وہ اس کے

سواسب کچھ بھول گئے اور اس کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو گئے، وہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر حال میں اس کی یاد میں سرمست وسرشار رہتے تھے:

يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ — وہ خدا کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔

(آل عمران۳:۱۹۱)

اس سرمستی و سرشاری میں بھی انہوں نے جنگلوں میں راہبانہ زندگی بسر نہیں کی، دولت مندوں کی بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا، دنیا کی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا، بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جدوجہد اور سعی و کوشش کو اپنا مذہب سمجھا اور خدا کا حکم جان کر اس کو پوری مستعدی کے ساتھ بجالائے اور ان تمام ہنگاموں کے ساتھ دل کا معاملہ دل دارِ ازل کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا، خدا نے ان کی مدح کی کہ:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور۲۴:۳۷) — وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید وفروخت، خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

ان کی محبت الٰہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آ گیا، خدا نے ان کی توصیف کی کہ:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ. (بقرہ۲:۱۶۵) — ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔

ان کا توکل، ان کا صبر، ان کا استقلال، ان کی استقامت، ان کی بہادری، ان کی بے خوفی، ان کی صداقت، ان کی راست بازی، ان کی اطاعت، غرض ان کی ہر چیز ان کے اسی جذبۂ ایمانی کا پرتو تھی اور ہر وقت ان کے پیشِ نظر یہ تعلیم رہتی تھی کہ:

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ. — جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے تو خدا اس کو بس کرتا ہے۔

(طلاق۶۵:۳)

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ. (زمر۳۹:۳۶) — کیا خدا اپنے بندہ کو کافی نہیں۔

وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ (احزاب۳۳:۳۷) — اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے حالاں کہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرنا چاہیے۔

ان میں یہ تمام روحانی واخلاقی جوہر اسی ایمان باللہ کے بہ دولت پیدا ہوئے۔

اسماوصفات: دنیا کے آغاز میں خدا نے کہا تھا کہ ''ہم نے آدم کو سب نام سکھائے''، دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی اور علم کی وسعت کہاں سے کہاں پہنچی، مگر غور کیجئے تو ناموں کے ہیر پھیر سے ہم اب تک آگے نہیں بڑھے، یہی ہماری حقیقت رسی ہے اور یہی ہمارا فلسفہ ہے، ہم اپنے مفروضہ اصولِ منطق کی بنا پر ذاتیات اور حقائق کے ذریعہ سے اشیا کی تعریف کے مدعی بن گئے ہیں لیکن ہزاروں صدیاں گذرنے پر بھی ذاتی اور حقیقی تعریف (حد منطقی) کی ایک مثال بھی پیش نہ کر سکے، جو کچھ کر سکے وہ یہ کہ صفات وعوارض اور خواص کے مختلف رنگوں سے نئی نئی طفلانہ شکلیں بناتے اور بگاڑتے ہیں، جب مادیت کا یہ عالم ہے تو وراء الوراہستی میں ہماری بشری طاقت اس سے زیادہ کا تحمل کیوں کر کر سکتی، تجلی گاہِ طور اسی رمز کی آتشیں تصویر ہے۔

ہم خدا کو بھی اس کے ناموں، اس کے کاموں اور اس کی صفتوں ہی سے جان سکتے ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ نے عرب کے جاہلوں کو اسی نصابِ انسانی کے مطابق تعلیم دی، عرب کا جاہل اللہ نام ایک اعلاہستی سے واقف تھا لیکن اس کے ناموں اور کاموں کے تخیل سے بڑی حد تک نا آشنا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ کے اسماوصفات سے بھی وہ قطعاً بے گانہ تھا، دیوانِ عرب یعنی ان کی شاعری کے دفتر میں کہیں کہیں اللہ کا نام آتا ہے، مگر کہیں اس کی صفت کا ذکر نہیں آتا، قرآن پاک میں ان کے خیالات کا پورا عکس اتارا گیا ہے لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماوصفات سے بھی آگاہ تھے، بعض عیسائی عربوں میں اللہ کے ساتھ الرحمٰن کا لفظ بھی مستعمل تھا، جس کے معنی رحم کرنے والے کے ہیں، اصحاب الفیل کے عیسائی رئیس ابرہہ کے نام سے سدِ عرم (یمن) پر جو کتبہ لگا ہے اور جس کو جرمن فاضل گلازر نے شائع کیا ہے اس میں بھی دو جگہ رحمان کا لفظ آیا ہے، عرب عیسائی شعرا کے کلام میں بھی یہ لفظ ملتا ہے، عیسائیوں میں اس کے استعمال کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب مشرکین کو اس لفظ سے چڑھ ہو گئی تھی، اس لئے جب اسلام نے اس لفظ کو اختیار کیا تو مشرکین نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا، صلحِ حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضرت ﷺ نے معاہدہ کے کاغذ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھوائی تو قریش کے نمائندہ نے کہا کہ ''قسم ہے اللہ کی مجھے نہیں معلوم کہ رحمان کیا ہے؟''(۱)

محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سننے اور قرآن مجید میں بار بار خدا کے لئے رحمان کا

(۱) صحیح بخاری جلد اول کتاب الشروط باب الشروط فی الجهاد و المصالحة مع اهل الحرب و کتابة الشروط ج۱ ص ۳۷۹۔

لفظ مستعمل ہونے کی وجہ سے مشرکوں کو برہمی ہوتی تھی اور وہ کہتے تھے کہ ہم کبھی رحمان کے آگے سرنگوں نہیں ہوسکتے، قرآن نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا. (فرقان ۲۵:۶۰)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمان کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمان کیا ہے، کیا تم جس کو کہو اس کو ہم سجدہ کریں، رحمان کا نام ان کی نفرت کو اور بڑھا دیتا ہے۔

مشرکین کو یہ برا لگتا تھا کہ محمد ﷺ ایک طرف تو ان کے بتوں اور دیوتاؤں کی مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرف عیسائیوں کے رحمان کی مدح وستائش کرتے ہیں:

اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ. (انبیاء ۲۱:۳۶)

(مشرک آپ کو دیکھتے تو مذاق سے کہتے کہ) یہی وہ شخص ہے جو تمہارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے اور وہی مشرک رحمٰن کے ذکر سے انکار کرتے ہیں۔

تعلیم محمدی ﷺ نے عرب کے نا آشنایان حقیقت کو بالآخر آگاہ کیا کہ خدا کے اسماء وصفات کی کوئی حد نہیں، اس کو سب ہی اچھے ناموں سے پکارا جاسکتا ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ (اسرائیل ۱۷:۱۱۰)

کہہ دو (اے پیغمبر کہ) خدا کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا مسئلہ اسلام کے ان اہم مذہبی اصلاحات میں سے ہے جن سے نہ صرف عرب کے جاہل نا آشنا تھے بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے پیرو بھی ان کے متعلق غلطیوں میں مبتلا تھے، یہودیوں کے اسفار اور صحیفوں میں خدائے برحق کا اصلی نام ''یہوا'' تھا، مگر کبھی عام یہودیوں کو اس مقدس نام کے زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی، دوسرا عام نام ''امیم'' ہے جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے، ان دو کے علاوہ خدا کے بیسیوں نام اور اسما جو درحقیقت اس کے اوصافِ ذاتی اور اعمالِ ربانی کے ترجمان ہیں، توراۃ کا دفتر ان کے ذکر سے بالکل خالی ہے، صفاتِ الٰہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ فوجوں والا خدا یعنی رب الافواج ہے، جو خدا کی صفاتِ جلالی کا مظہر ہے۔

عیسائیوں کی انجیل اور مذہبی کتابوں میں ''باپ'' کا لفظ خدا کے لئے استعمال ہوا ہے، اس

لفظ کی حقیقت اور خدا پر اس کے اطلاق سے مقصود کیا ہے؟ گوشت و پوست اور مادیت سے بھرے ہوئے لفظ کا خدا پر مجازاً اطلاق بھی کہاں تک جائز ہے؟ اور اس سے اس مذہب میں کہاں تک غلطیاں پھیلیں، ان باتوں کو چھوڑ کر بھی دیکھئے تو خدا کے صرف جمالی صفات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے، عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدہ کو اسی مسئلۂ صفات کے پردہ میں چھپالیا اور یہ تاویل کی گئی کہ تثلیث کے اقانیم ثلاثہ باپ (خدا) بیٹا (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) اور روح القدس، حیات، خلق اور عظیم تین صفتوں سے عبارت ہیں، باپ حیات، بیٹا خلق اور روح القدس علم ہے اور یہ تینوں ایک ہیں اور تینوں وجود میں الگ الگ ہیں، اس تشریح سے صفاتِ الٰہی کے تجسم کے مسئلہ نے جنم لیا اور ایک خدائی خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔

ہندوؤں میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی نیرنگی نظر آتی ہے لیکن ہر صفت نے ان کے ہاں ایک مستقل وجود حاصل کرلیا ہے اور خود خدا ہر قسم کی صفات سے خالی اور مجرد رہ گیا ہے، اسی لئے ہندوستان کے تمام مذاہب اسی تجسمِ صفات کے جلوہ گاہ ہوکر رہ گئے ہیں، برہما، مہیش، وشنو، تین صفات، خالق ممیت (مارنے والا) اور قیوم کے مجسمے ہیں، غلط تعبیر نے وحدت کی جگہ یہاں بھی تثلیث پیدا کردی ہے، شنکراچاریہ نے خدا کے صرف تین اصلی صفات تسلیم کئے، حیات، علم اور سرور یا آنند، جین مذہب اور بعض ہندو فرقوں میں ایک خالقیت کی صفت کے تجسم نے اعضائے تناسل کی پرستش کی گمراہی پیدا کی، عام ہندوں میں ۳۳ کروڑ عجیب الخلقت دیوتاؤں کی عظیم الشان بھیڑ بھی صفات واسمائے الٰہی کی تجسیم اور مستقل وجود کے غلط فلسفہ نے پیدا کی اور اسی نے بت پرستیوں کی نت نئی صورتیں نمایاں کیں، مجوسیوں میں یزداں اور اہرمن کی ثنویت اور دوئی بھی خدا کی دوصفتوں ہادی اور مضل کو دو مستقل ہستیوں میں منقسم کردینے کا نتیجہ ہے، اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اس مسئلہ کی غلط تعبیر نے دنیا میں کتنی گمراہیاں پیدا کی ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کے ان تمام فاسد تخیلات کو باطل ٹھہرایا، ان کے غلط عقیدوں کی تصحیح کی اور ربانی ہدایت کے نور سے سراجِ منیر بن کر جس طرح حقیقت کو روشن کیا وہ نبوتِ محمدی ﷺ کے عظیم الشان کارناموں میں ہے۔

آپ ﷺ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں اور اس کی

باتوں کی کوئی انتہا نہیں، آپ ﷺ نے یہ دعا سکھائی کہ ''اے خداوندا! تیرے ہر اس نام کے وسیلہ سے جو تو نے اپنا رکھا، یا اپنی کتاب میں اتارا، یا کسی مخلوق کو سکھایا، یا اپنے لئے اپنے علمِ غیب میں اس کو چھپا رکھا میں تجھ سے مانگتا ہوں''۔ حضرت عائشہؓ کو یہ الہامی دعا تعلیم ہوئی ''خداوندا! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلہ کے جن میں سے کچھ کو ہم نے جانا اور جن کو نہیں جانا تجھ سے درخواست کرتا ہوں''(۱)، قرآن پاک کے ذریعہ بتایا گیا:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا. (کہف ۱۸:۱۰۹)

کہہ دے (اے پیغمبر) کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لئے سیاہی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے لیکن میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہوں گی، اگرچہ ہم ایسا ایک اور سمندر بھی کیوں نہ لے آئیں۔

دوسری جگہ کہا گیا:

وَلَوْ اَنَّمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ (لقمان ۳۱:۲۷)

اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر اور اس کے بعد سات سمندروں کا پانی سیاہی ہو جائے تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

الغرض تمام اچھے اور کمالی نام اسی کے لئے ہیں اور اسی کو زیبا ہیں:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى. (طٰہٰ ۲۰:۸)

نہیں ہے کوئی معبود لیکن وہی اللہ اسی کے لئے ہیں سب اچھے نام۔

بڑائی کا ہر نام اور خوبی کا ہر وصف اسی ذاتِ بے ہمتا کے لئے ہے، خواہ اس کو خدا کہو یا اللہ کہو، لغت اور زبان کا کوئی فرق اس میں خلل انداز نہیں:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ (بنی اسرائیل ۱۷:۱۱۰)

کہہ دے (اے پیغمبر) اس کو اللہ کہہ کر پکارو، یا رحمٰن کہہ کر، جو چاہو کہہ کر پکارو، سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

---

(۱) یہ تینوں دعائیں امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات باب البیان ان للّٰہ جل ثناء ہ اسماء اخر ص ۴، ۵ میں نقل کی ہیں اور پہلی روایت مسند ابن حنبل ج اص ۳۹۱ و ۴۵۲ میں بھی (بسند عبداللہ بن مسعود) ہے۔

لیکن مشرکوں کی طرح اس کو ایسے ناموں سے نہ پکارو جو اس کے کمال اور بڑائی کے منافی ہیں اور بتوں اور دیوتاؤں کے ناموں سے بھی اس کو یاد نہ کرو:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ (اعراف ۷:۱۸۰)	اور اللہ ہی کے لئے ہیں، سب اچھے نام، اس کو ان ناموں سے پکارو اور ان لوگوں سے علاحدہ رہو جو اس کے ناموں میں کجی کرتے ہیں۔

تعلیمِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیفۂ وحی اللہ تعالیٰ کے تمام اوصافِ حمیدہ اور اسمائے حسنیٰ سے بھرا ہوا ہے، بلکہ اس کا صفحہ صفحہ خدا کے اسما و صفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے، قرآن پاک کا کم کوئی ایسا رکوع ہوگا جس کا خاتمہ خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہو اور یہ تمام اوصاف اور نام اس عشق و محبت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوبِ ازل اور نورِ عالم کے ساتھ قرآن کے ہر پیرو کے دل میں ہونا چاہیے:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ. (نور ۲۴:۳۵)	اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال یہ ہے کہ ایک طاق ہو جس میں چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو، شیشہ اتنا صاف ہو کہ گویا ایک چمکتا ستارہ ہے، وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے جلایا گیا ہو، نہ وہ پورب ہے نہ پچھم ہے، اس کا تیل اتنا صاف ہے کہ آگ کے چھوئے بغیر وہ آپ سے آپ جلنے کو ہو، روشنی پر روشنی، خدا اپنی روشنی تک جس کو چاہے پہنچادے، اور خدا لوگوں (کے سمجھانے) کے لئے یہ مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔
اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ	اللہ نہیں ہے اس کے سوا کوئی اور معبود وہ ہمیشہ زندہ، تمام دنیا کو سنبھالے ہے، اس کو اونگھ اور نیند نہیں آتی، آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے، کون ہے جو اس کی مرضی کے بغیر اس کے سامنے سفارش کرنے کو کھڑا ہو، انسانوں کے سامنے اور پیچھے جو کچھ ہے اس کو وہ جانتا ہے

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

(بقرہ۲:۲۵۵)

اور وہ لوگ اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے لیکن جتنے کا وہ چاہے، اس کا تخت آسمانوں اور زمین کو سمائے ہوئے ہے اور ان دونوں (آسمان و زمین) کی نگہ بانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اونچا اور بڑا ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ. هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ. هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ.

(حشر۵۹:۲۲-۲۴)

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں، چھپے اور کھلے کا علم رکھنے والا، وہی رحم کرنے والا اور مہربانی والا ہے، وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں، سب کا بادشاہ، پاک، پوری سلامتی، امن والا، ہر شے پر گواہ، غالب، سب پر قابو والا، بڑائی والا، اس چیز سے پاک ہے جس کو یہ مشرک خدا کا شریک بتاتے ہیں، وہی اللہ پیدا کرنے والا بنانے والا، ہر چیز کی صورت کھینچنے والا اسی کے لئے سب اچھے نام ہیں، جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے، سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں، وہی سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ. هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ. لَهٗ مُلْكُ

آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اور وہی غالب اور دانا ہے، آسمانوں کی اور زمین کی حکومت اسی کی ہے، وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے، اور وہ ہر بات پر قادر ہے، وہی پہلا اور وہی پچھلا ہے اور وہی کھلا ہے اور وہی چھپا ہے اور ہر بات کو جانتا ہے، وہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر تخت پر برابر ہوا، وہ جانتا ہے جو زمین میں گھستا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے اور جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے،

السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ. يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ ؕ وَهُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ.

(حدید ۵۷:۱-۶)

آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور اللہ ہی تمام چیزوں کا مرجع ہے، وہ رات کو دن میں داخل کردیتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ سینوں کے سب بھیدوں سے واقف ہے۔

خدا کے متعلق اہلِ عرب کا جو پست تخیل تھا اور محمد ﷺ نے اس کو مٹا کر ان کے سامنے جو بلند تخیل پیش کیا اس کا اندازہ حسبِ ذیل واقعہ سے ہوسکتا ہے، آپ ﷺ نے جب توحید کا آوازہ بلند کیا تو مشرکین جو اپنے دیوتاؤں کی آل واولاد اور بیویوں اور گوپیوں کی حمد کے ترانے گاتے تھے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمائش کی کہ ذرا اپنے خدا کا نسب تو ہمارے سامنے بیان کرو، گویا وہ اپنے دیوتاؤں سے اسلام کے خدا کا مقابلہ کر کے بتانا چاہتے تھے کہ اس حیثیت سے اسلام کا خدا ہمارے دیوتاؤں کی ہم سری نہیں کرسکتا، اس کے جواب میں وحیِ محمدی ﷺ نے اپنے خدا کی حقیقت قرآن پاک کی اس سب سے مختصر سورہ میں پیش کی: (۱)

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ. اَللّٰهُ الصَّمَدُ. لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُوْلَدْ. وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ.

(اخلاص ۱۱۲:۱-۴)

کہہ دے (اے پیغمبر) وہ اللہ ایک ہے، وہ تنہا اور بزرگ اور بے نیاز اور عالم کا مرجع اور جاں پناہ ہے، نہ اس کے کوئی اولاد ہے اور نہ اس کے ماں باپ ہیں جنہوں نے اس کو جنا ہو، اور نہ اس کا کوئی ہم سر ہے (جو اس کی بیوی ہو)

یہ روایت حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے جو صحابہؓ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے جاتے تھے وہ اسی کے بعد اس سورہ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ ''صمد'' وہ ہے جو نہ جنتا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہو کیوں کہ جو جنا جاتا ہے وہ مرتا بھی ہے اور جو مرتا ہے وہ اپنا وارث وجاں نشین بھی چھوڑ جاتا ہے اور خدا نہ مرتا ہے نہ اس کا کوئی جاں نشین ہے اور کوئی اس کا ہم سر نہیں ہے، یعنی کوئی اس کے برابر نہیں اور نہ کوئی اس کے مثل ہے، غور کرو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے پہلے اہل عرب میں خدا کا کتنا پست اور ذلیل تخیل تھا جس کا اندازہ تم ان کے سوال سے کرسکتے ہو اور آپ ﷺ کی تعلیم کے بعد

(۱) مستدرک حاکم تفسیر اخلاص ج ۲ ص ۵۴۰ (صحیح) جامع ترمذی تفسیر سورہ مذکور ۵۵۹ و ۵۶۰ و کتاب الاسما بیہقی ابواب ذکر الاسماء التی تتبع نفی التشبیہ صفحہ ۲۳ (الہ آباد)۔

وہ تخیل کتنا پاک، اعلا اور بلند ہوگیا، جس کا اندازہ حضرت ابی ؓ کی تفسیر سے ہوسکتا ہے، جو اسی عرب نژاد قبیلہ کے ایک ممتاز فرد تھے، لیکن ان کا دل اب محمد رسول اللہ ﷺ کے فیضِ تعلیم سے منور ہو چکا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ آپ ﷺ سے سن کر کہتے ہیں کہ خدا فرماتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھے جھٹلایا اور آدم کے بیٹے نے مجھ کو گالی دی، اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا دوبارہ پیدا نہیں کرے گا، حالاں کہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے دوسری بار کا پیدا کرنا بہت آسان ہے اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا کی اولاد ہے، حالاں کہ میں وہ ایک اور ''صمد'' ہوں جس نے نہ کسی دوسرے کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے اور نہ اس کا کوئی ہم سر ہے(۱) حضرت ابو ہریرہؓ یمنی عرب ہیں، یعنی اس عرب کے ایک فرد ہیں جو تعلیمِ محمدی ﷺ سے پہلے ان حقائق سے بے بہرہ تھا اور اب وہ تنزیہ و تقدیس کے یہ موتی اپنے منہ سے اگل رہے ہیں۔

اس مختصر سورہ میں سب سے چھوٹا لفظ ''صمد'' ہے لیکن درحقیقت قرآن کی بلاغت نے اس ایک لفظ میں صفاتِ الٰہی کے بے پایاں دفتر چھپا رکھا ہے، ''صمد'' کے معنی لغت میں اونچی پتھریلی زمین یا چٹان کے ہیں جو کسی ایسے وادی میں ہو جہاں جب سیلاب آتا ہو تو اس پر نہ چڑھتا ہو اور لوگ اس وقت دوڑ دوڑ کر اسی پر چڑھ کر اپنی جانیں بچائیں، پھر صمد کے اس لغوی معنی سے اس سردار کے معنی پیدا ہوئے جو بزرگی اور شرافت میں انتہائی معراجِ کمال پر ہو، اس سردار کو بھی کہنے لگے جس کی موجودگی کے بغیر مجلس میں کوئی فیصلہ نہ ہوسکتا ہو اور اس سردار کو بھی کہتے ہیں جس کے اوپر کوئی سردار نہ ہو اور اس جائے پناہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوا جو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن میں پناہ دے سکے اور اس مرجع و مرکز کے معنی میں بھی آیا جس کی طرف ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے، صمد ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر خول نہ ہو، اسی سے اس کو بھی کہتے ہیں جو کھاتا پیتا نہ ہو اور جس کے آل و اولاد نہ ہو، اس کو بھی کہتے ہیں جس سے کوئی بے نیاز نہ ہو، اس بہادر کو بھی کہتے ہیں جس کو لڑائی میں بھوک اور پیاس نہ لگتی ہو، صمدۃ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے حمل نہ رہا ہو، حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ''صمد'' وہ سردار ہے جو اپنی بزرگی اور سرداری میں درجۂ کمال پر ہو، وہ شریف جس کی شرافت کامل ہو، وہ بڑا جس کی بڑائی میں کوئی نقص نہ ہو، وہ بردبار جس کی بردباری بدرجۂ اتم

(۱) صحیح بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورہ اخلاص ج ۲ ص ۷۴۴۔

ہو، وہ بے پرواو بے نیاز جس کی بے پروائی و بے نیازی کی کوئی حد نہ ہو، وہ زبردست جس کے جبروت کی انتہا نہ ہو، وہ علم والا جس کا علم بہ درجۂ اتم ہو، وہ حکیم جس کی دانائی بہ مرتبۂ کمال ہو، یعنی وہ جو بڑائی اور بزرگی کی ہر صنف میں کامل ہو۔(۱)

ان معنوں کے علاوہ صحابہ اور تابعین نے اس کی تفسیر میں حسب ذیل معانی بھی لکھے ہیں:

ابن عباسؓ	وہ جس کی طرف مصیبت کے وقت لوگ رجوع کریں۔
حسن بصریؒ	وہ حی وقیوم جس کو زوال نہ ہو اور جو باقی ہو۔
ربیع بن انس	جس کے نہ اولاد ہو نہ ماں باپ۔
عبداللہ بن مسعودؓ	جس کے اندر معدہ وغیرہ جسمانی اعضا نہ ہوں۔
بریدہؓ	جس میں جوف نہ ہو۔
عکرمہ وشعبی	جو کھاتا نہ ہو۔
عکرمہؓ	جس میں سے کوئی دوسری چیز نہ نکلے۔
قتادہؓ	باقی غیر فانی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معانی (۲) اس ایک لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں اور یہ سب صرف ایک حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں کیوں کہ اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے معنی چٹان کے ہیں جو لڑائی اور مصیبتوں کے وقت جائے پناہ کا کام دے، اسرائیلی الٰہیات میں بھی یہ لفظ یہی اہمیت رکھتا ہے اور بنی اسرائیل کے صحیفوں میں جائے پناہ کے لئے چٹان کا لفظ آیا ہے (۲۲،۳۰۔۳۱) میں ہے:

''اگر ان کی چٹان ان کو بیچ نہ ڈالتی اور خداوند تم کو اسیر نہ کرواتا کیوں کہ ان کی چٹان ایسی نہیں جیسی ہماری چٹان۔''

یہ ''چٹان'' اس موقع پر حقیقت میں خدا کی مدد ونصرت سے کنایہ ہے، سموال کے پہلے صحیفہ میں یہ کنایہ تصریح سے بدل جاتا ہے ''خداوند کے مانند کوئی قدوس نہیں، تیرے سوا کوئی نہیں، کوئی چٹان ہمارے خدا کے مانند نہیں''۔(۲۔۲ص ۲۴۷ آکسفورڈ ۱۸۹۰ء)

(۱) کتاب الاسماء والصفات، امام بیہقی بسند صفحہ ۴۳ (۲) ان معانی کے لئے دیکھو کتاب الاسما بیہقی صفحہ ۴۳، مفردات القرآن راغب اصفہانی ص ۲۸۸ مطبع میمنہ مصر ۱۳۲۴ھ، ابن جریر طبری جز ۳۰ ص ۱۹۶، ۱۹۷ میمنہ مصر ۱۳۲۱ھ، ابن کثیر ج ۴ ص ۵۷۰ مطبع مصطفیٰ محمد ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۷ء اور تفسیر سورۃ الاخلاص لابن تیمیہ ص ۳ ومابعد مطبع حسینیہ مصریہ ۱۳۲۳ھ۔

اس سورہ میں خدا کی صفت میں دو لفظ ہیں، احد (ایک) صمد (جائے پناہ) اور یہ دونوں خدا کے دو متضاد کمالی اوصاف کو حاوی ہیں، اس کی یکتائی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں، نہ اس کو کسی کی حاجت، نہ اس کو کسی سے غرض، وہ یکہ وتنہا، اکیلا، بے ہمتا، بے نیاز، بے پروا، سب سے مستغنی اور سب سے الگ ہے، لیکن اسی کمالِ یکتائی کے ساتھ وہ سب کے ساتھ، سب کا دست گیر، سب کی جائے پناہ، سب کا محتاج الیہ، سب کا مرکز، سب کا مرجع، سب کا ماویٰ، سب کا ملجا یعنی سب کی چٹان ہے جو مصیبتوں میں سہارا، بلاؤں میں تسلی اور اضطرابوں میں تشفی ہے:

فَفِرُّوْآ اِلَی اللّٰہِ (ذاریات ۵۱:۵۰) ہر جگہ سے بھاگ کر اللہ کے ہاں پناہ لو۔

یہ سورہ پاک (۱) توحیدِ اسلامی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے اور اسی لئے اس کو ثلث القرآن (تہائی قرآن) کا درجہ دیا گیا ہے، ایک صحابی تھے جو نماز کی ہر دو رکعت میں قرات کے آخر میں اس سورہ کو پڑھا کرتے تھے لوگوں نے یہ واقعہ آنحضرت ﷺ سے بیان کیا، آپ ﷺ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کرائی، انہوں نے کہا اس میں میرے رب کی صفتیں بیان ہوئی ہیں جو مجھ کو بہت محبوب ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا بشارت ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرتا ہے (۲) ایک اور انصاری صحابی تھے جو قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے، ان کا یہ حال تھا کہ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد پہلے اس سورہ کو پڑھ لیتے تھے تب کوئی دوسری سورہ پڑھتے تھے، ان کے مقتدی صحابہؓ نے اس پر اعتراض کیا تو انہوں نے کہا کہ مجھے امامت چھوڑنی منظور ہے مگر اپنی روش بدلنی منظور نہیں، لوگوں نے اس واقعہ کا تذکرہ آنحضرت ﷺ سے کیا، آپ ﷺ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو گذارش کی کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے یہ سورہ بہت محبوب ہے، ارشاد ہوا کہ یہ محبت تم کو جنت میں لے جائے گی (۳) قتادہ بن نعمانؓ ایک صحابی تھے جو رات رات بھر اسی ایک سورہ کو دہراتے اور لطف حاصل کرتے رہتے تھے، لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ یہ سورہ قرآن کا تہائی حصہ ہے۔ (۴)

اس گمراہی اور تاریکی کا اندازہ جو آنحضرت ﷺ سے پہلے عرب پر چھائی ہوئی تھی اس روحانی لطف اور نورانی فیض سے کرو جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس کے حصہ میں آیا۔

---

(۱) یہ سورہ اخلاص "ص"، (۲) صحیح بخاری کتاب التوحید باب ما جاء فی دعاء النبیؐ امتہ الی التوحید ج ۲ ص ۱۰۹۷

(۳) ایضا کتاب الصلوۃ باب الجمع بین السورتین فی رکعۃ ج ۱ ص ۱۰۶ (۴) مسند احمد بسند ابی سعید الخدری ج ۳ ص ۱۵، ۲۳، ۳۵، ۴۳۔

قرآن مجید اور احادیث میں اللہ تعالیٰ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آئے ہیں، صحیح حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو ان کو محفوظ رکھے یا نگاہ میں رکھے وہ جنت میں داخل ہوگا، خدا طاق ہے وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے (۱) آخری فقرہ اس علت کو ظاہر کرتا ہے کہ ۹۹ نام کیوں رکھے گئے، پورے سو کیوں نہ مقرر کئے گئے، اس لئے کہ اگر پورے سو ہوتے تو عدد طاق نہ رہتا اور اس سے توحید کا رمز آشکارا نہ ہوتا، صحیح احادیث میں اسی قدر ہے، یعنی ان ۹۹ ناموں کی تصریح نہیں ہے، ترمذی (ابواب الدعوات ص ۱۸۸ تا ۱۹۰) میں اور بعض کم درجہ حدیثوں میں ان ناموں کو گنایا بھی ہے، لیکن محدثین نے عموماً یہاں تک کہ حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے کہ یہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں پھر ان روایتوں میں بعض ناموں کا ادل بدل اور الٹ پھیر بھی ہے اور بعض ایسے نام بھی ان میں ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں اور بعض ایسے نام جو قرآن میں ہیں ان میں نہیں ہیں، اسی لئے علما کا فیصلہ یہ ہے کہ ان راویتوں میں ناموں کا انتخاب راویوں نے خود اپنی تلاش و تفحص سے کیا ہے، اس لئے ان روایتوں سے یہ شبہہ نہ ہو کہ اسمائے الٰہی صرف ان ننانوے میں محصور ہیں بلکہ بڑے بڑے ائمہ اور محدثین مثلاً عبدالعزیز بن یحیی، ابوبکر بن عربی، امام نووی، حافظ ابن حجر، امام خطابی، ابن تیمیہ اور قرطبی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ اسمائے الٰہی ان ننانوے میں محصور نہیں اور یہ بھی تصریحات ملتی ہیں کہ اسما اور صفات الٰہی کی کوئی حد و پایاں نہیں ہے (۲) اور اس پر محدثین نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں سے جو آغازِ مضمون میں اوپر گذر چکی ہیں استدلال کیا ہے۔

بہر حال قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کے تتبع سے علما نے ننانوے ناموں کا پتہ چلایا ہے اور ان کو الگ الگ ایک ایک کر کے گنایا ہے، یہ تمام نام وہ ہیں جو بہ طورِ علم اور بہ طورِ صفت قرآن پاک میں آئے ہیں، یا افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں، یا آنحضرت ﷺ نے دعاؤں

---

(۱) صحیح بخاری کتاب التوحید باب مقلب القلوب ج ۲ ص ۱۰۹۹، وصحیح مسلم کتاب الذکر والدعا باب فی اسماء اللہ تعالیٰ وفضل من احصاھا ج ۲ ص ۳۲۰ ومسند احمد بسند ابی ہریرہ ج ۲ ص ۲۵۸ وجامع ترمذی ترمذی میں پہلا فقرہ ابواب الدعوات ج ۲ ص ۱۸۸ پر اور دوسرا فقرہ ابواب الوتر ج ۱ ص ۱۰۳ میں ہے، کتب خانہ رشیدیہ دیوبند (ض) نسائی کتاب قیام اللیل و تطوع النہار باب الامر بالوتر ج ۱ ص ۱۸۹ دیوبند وابن ماجہ ابواب الدعا باب اسماء اللہ عز و جل ص ۲۸۳ وابن خزیمہ وابوعوانہ وابن جریر وطبرانی وبیہقی وغیرہ۔ (۲) تمہید ابوشکور سالمی الباب الخامس القول الثالث فی عدد الاسماء ص ۶۱ یہ ماتریدیہ کی مشہور مستند کتاب ہے۔

میں ان کی تعلیم کی ہے، ہم ذیل میں بہ ترتیب ایک ایک نام لکھتے ہیں اور اس کی مختصر لغوی تشریح کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ آنحضرت ﷺ نے خدا کا جو تخیل اور عقیدہ اپنے پیروؤں کو سکھایا وہ کتنا وسیع، کتنا بلند، کتنا منزہ اور پاکیزہ ہے، علما نے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے لیکن ہم نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیے ہیں، ایک وہ جن سے اس کے رحم و کرم عفو و درگذر یعنی صفاتِ جمالی ظاہر ہوتے ہیں دوسرے وہ جن سے اس کی شاہنشاہی، جلال و جبروت اور حکومت و استیلا کا اظہار ہوتا ہے اور ہم ان کو صفاتِ جلالی کہتے ہیں، تیسرے وہ اسما اور صفات جن سے اس کی تنزیہ، بلندی، کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصافِ حسنہ اور محامدِ عالیہ کا ثبوت ملتا ہے اور ان کو ہم صفات کمالی سے تعبیر کرتے ہیں۔

الغرض خدا کے تمام اسما و صفات ان ہی تین عنوانوں کی تشریح ہیں، یعنی یا تو ان سے خدا کی رحیمی و کریمی ظاہر ہوتی ہے، یا اس کے جاہ و جلال کا اظہار ہوتا ہے یا اس کی تنزیہ و کمال کا اثبات ہوتا ہے۔

صفات جمالی: یعنی وہ اسما و صفات جن سے خدا کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

اَللّٰہ: یہ خدا کا وہ نام ہے جو قرآن پاک میں بہ طور علم ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے، اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں خدائے برحق کے لئے استعمال ہوتا تھا، اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے، کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اس ہستی کے ہیں جس کی پرستش کی جائے، بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت و معرفت میں عقل انسانی حیران و سرگرداں ہو، دوسروں کی تحقیق ہے کہ اس کے معنی ہیں، وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت اور محبت رکھے جو ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے، اس اخیر تعبیر کی بنا پر اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں۔

اَلرَّحْمٰن: اللہ کے بعد یہ دوسرا لفظ ہے جس کو علم کی حیثیت حاصل ہے، اس کے معنی رحم والے کے ہیں، یہ گذر چکا ہے کہ رحمان کا لفظ اسلام سے پہلے صرف عیسائی عربوں میں مستعمل تھا، عام اہلِ عرب میں اللہ کا لفظ مستعمل تھا، قرآن مجید نے ہر سورہ کے شروع میں، نیز اور مقامات میں اللہ کو الرحمٰن کہہ کر سینکڑوں جگہ استعمال کیا ہے، بہ ظاہر تو یہ وصف و موصوف کی معمولی ترکیب ہے، مگر درحقیقت یہ

بدل و مبدل منہ ہیں اور اس سے اس رمز کی طرف اشارہ ہے کہ عام عربوں کا اللہ اور عرب عیسائیوں کا رحمان دو اجنبی ذاتیں اور دو بے گانہ ہستیاں نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں اور ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں، اس طرح ان دو مختلف قوموں کو وحدتِ الٰہی کی دعوت دی گئی جو ناموں کے تعدد کو حقیقت کے تعدد کا مرادف سمجھتی تھیں اور کہا گیا:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى	اللہ کہو یا رحمٰن کہو جو چاہو کہو، اسی کے لئے سب اچھے نام ہیں۔

(بنی اسرائیل ۱۷: ۱۱۰)

اَلرَّحِیْم: رحم کرنے والا، رحم کا لفظ اس رحم سے نکلا ہے جس سے بچہ کی پیدائش ہوتی ہے، اس لئے اصل لغت کے لحاظ سے اس لفظ میں بھی مربیانہ محبت کا جذبہ نمایاں ہے، یہی الرحمٰن اور الرّحیم خدا کی وہ دو صفتیں ہیں جن سے قرآن کا صفحہ صفحہ منور ہے، کائنات میں جو کچھ ہے، جو کچھ ہوگا، وہ اس کی رحمانی اور رحیمی ان ہی دو صفتوں کا پرتو ہے، اِس عالم اور اُس عالم دونوں میں اس کی ان ہی دونوں شانوں کا ظہور ہے اور ہوگا۔

الرب: پرورش کرنے والا، یعنی ہستی کے اول نقطہ سے لے کر آخر منزل تک ہر لمحہ اور لحظہ مخلوقات کی نشو و نما اور ظہور و ترقی کا ذمہ دار۔

اللطیف: لطف والا مہربان۔

العفو: معاف کرنے والا، درگذر کرنے والا۔

الودود: محبوب، محبت کرنے والا، پیار کرنے والا۔

السلام: امن و سلامتی، صلح و آشتی، ہر عیب سے پاک و صاف۔

المحب: محبت والا، پیار والا، چاہنے والا۔

المومن: امان دینے والا، امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانے والا اور ہر مصیبت سے نجات دینے والا۔

الشکور: اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول اور پسند کرنے والا۔

الغفور و الغفار: معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگذر کرنے والا۔

الحفیظ و الحافظ: حفاظت کرنے والا، نگہ بان، بچانے والا۔

الوھاب: دینے والا، عطا کرنے والا، بخشنے والا۔

الرازق و الرزاق: روزی دینے والا، نشو ونما کا سامان بہم پہنچانے والا۔

الولی: دوست، حمایتی، طرف دار۔

الرؤف: مہربان، نرمی اور شفقت کرنے والا۔

المقسط: انصاف والا، عادل۔

الھادی: راہ دکھانے والا، رہنما۔

الکافی: اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لئے کافی۔

المجیب: قبول کرنے والا، دعاؤں کا سننے والا۔

الحلیم: بردبار بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا۔

التواب و قابل التوب: توبہ قبول کرنے والا، گنہ گار کے گناہوں سے درگذر کر کے دوبارہ اس کی طرف رجوع ہونے والا۔

الحنان: ماں کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا۔

المنان: احسان کرنے والا۔

النصیر: مدد کرنے والا۔

ذو الطول: کرم والا۔

ذو الفضل: فضل والا۔

الکفیل: بندوں کی کفالت کرنے والا۔

الوکیل: بندوں کی ضرورتوں کا ذمہ لینے والا، سامان کرنے والا۔

المقیت: روزی پہنچانے والا۔

المغیث: فریاد کو پہنچنے والا، فریاد سننے والا۔

المجیر: پناہ دینے والا۔

المغنی: جو بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کیے ہوئے ہے۔

صفات جلالی: یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کی بڑائی، کبریائی، شہنشاہی ظاہر ہوتی ہے۔

الملک و الملیک: بادشاہ، فرمانروا۔

العزیز: غالب جس پر کوئی دست رس نہ پائے۔

القاھر و القھار: جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جا سکتا، سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا۔

المنتقم: سزا دینے والا، برائیوں کی جزا دینے والا۔

الجبار: جبروت والا جس کے سامنے کوئی دوسرا دم نہ مار سکے، جس سے کوئی سرتابی نہ کر سکے۔

المھیمن: سب پر شاہد اور گواہ اور دلیل۔

المتکبر: اپنی بڑائی دکھانے والا، کبریائی والا۔

شدید العقاب: سخت سزا والا۔

شدید البطش: بڑی گرفت والا، جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

نکتہ: خدا کے صفات جلالی کا ذکر زیادہ تر تورات میں ہے لیکن صحیفۂ محمدی ﷺ میں جہاں کہیں خدا کی ان جلالی صفتوں کا ذکر آتا ہے، ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل، حکیم اور علیم ہونے کا بھی ذکر ہوتا ہے، جس سے انسان کی اس غلط فہمی کا مٹانا مقصود ہے کہ خدا کی ان جلالی صفتوں کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک لا ابالی کی طرح دم کے دم میں جو چاہے کر گزرتا ہے، بلکہ اس کا قہر، اس کا

غلبہ، اس کا انتقام اور اس کی گرفت، عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور اس طرح ان جلالی ناموں سے بے رحمی اور ظالمانہ سخت گیری کا جوشبہہ پیدا ہوسکتا ہے، وہ دور ہو جاتا ہے، فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ. (آل عمران ۳: ۱۸۲) بے شک خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ کے وصف میں عزیز (غالب) کے ساتھ حکیم (حکمت والا) ہمیشہ قرآن میں آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا کے عذاب کے ذکر کے ساتھ اس کی رحمت کا تذکرہ بھی ہمیشہ قرآن میں کیا جاتا ہے اور دوزخ کے بیان کے ساتھ جنت کا سماں بھی لازمی طور پر دکھایا جاتا ہے۔

جہاں یہ کہا گیا کہ وَمَا مِنْ اِلٰـہٍ اِلَّا اللّٰـہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ (ص ۳۸: ۶۵) وہیں یہ بھی کہا گیا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ (ص ۳۸: ۶۶) قوموں کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا گیا تو فرما دیا گیا:

وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ. (مومن ۴۰: ۳۱) اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔

اس کی صفت ذُوْ عِـقَـابٍ اَلِیْـمٍ دردناک عذاب دینے والا جہاں بیان کی گئی تو اس سے پہلے لَذُوْمَغْفِرَۃٍ یقینی بخشش والا (حم السجدہ ۴۱: ۴۳) بھی فرما دیا گیا، غرض صفاتِ جلالی کے بیان میں یہ رعایت پیشِ نظر رکھی گئی ہے کہ ان کے ساتھ یا آگے پیچھے خدا کی صفاتِ جمالی کا بھی ذکر ہو، تاکہ خوف و خشیت کے ساتھ اس کی محبت اور لطف و کرم کے جذبات بھی نمایاں ہوں۔

صفاتِ کمالی: یعنی وہ اسماو صفات جن سے خدا کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے، اس طرح کے اسماو صفات پانچ قسم کے ہیں، ایک وہ جو اس کی وحدانیت سے متعلق ہیں، دوسرے اس کے وجود سے تعلق رکھتے ہیں، تیسرے اس کے علم سے، چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہ اور پاکی سے۔

صفاتِ وحدانیت: یعنی وہ صفتیں جو خدا کی یکتائی اور بے مثالی کو ظاہر کرتی ہیں اور وہ یہ ہیں:

الواحد: ایک۔

الاحد: ایک۔

الوتر: طاق جس کا کوئی جوڑا نہیں۔

صفاتِ وجودی: یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود، بقا، دوام، ازلیت اور بے زوالی ظاہر ہوتی ہے۔

الموجود: وجود والا، ہست۔

الحی: ہمیشہ زندہ، غیر فانی۔

القدیم: وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہیں، جو ہمیشہ سے ہے۔

القیوم: جو اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔

الباقی: جس کو ہمیشہ بقا ہے۔

الدائم: ہمیشہ رہنے والا۔

الاول: وہ پہلا جس کے پہلے کوئی نہیں۔

الأخر: وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

المقدم: جو سب کے آگے سے ہے۔

الموخر: جو سب کے پیچھے رہ جائے گا۔

الظاھر: جس کا وجود کھلا اور نمایاں ہے (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے)

الباطن: جو چھپا اور مخفی ہے، (یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے)۔

علم: یعنی وہ صفتیں جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔

الخبیر: خبر رکھنے والا۔

العلیم: جاننے والا۔

علام الغیوب: جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا۔

علیم بذات الصدور: دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا۔

السمیع: سننے والا۔

البصیر: دیکھنے والا۔

المتکلم: بولنے والا، اپنے علم اور ارادہ کو ظاہر کرنے والا۔

الواجد: پانے والا، جس کے علم سے کوئی چیز گم نہیں۔

الشہید: حاضر، جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہیں۔

الحسیب: حساب کرنے والا، یعنی جن چیزوں کا علم حساب کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے، یعنی وزن اور مقدار ان کا بھی جاننے والا۔

المحصی: گننے والا، یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے یعنی اعداد کا جاننے والا۔

المدبر: تدبیر کرنے والا، انتظام کرنے والا۔

الحکیم: حکمت والا، عقل والا، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا۔

المرید: ارادہ کرنے والا، مشیت والا۔

القریب: نزدیک جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہے۔

قدرت: یعنی وہ صفتیں جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔

الفاتح و الفتاح: ہر مشکل کو کھولنے والا۔

القدیر و القادر: قدرت والا۔

المقتدر: اقتدار والا، جس کے سامنے کوئی چون و چرا نہیں کر سکتا۔

القوی: زبردست، جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔

المتین: مضبوط جس میں کوئی کمزوری نہیں۔

الجامع: جمع کرنے والا، متفرق اور پراگندہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا۔

الباعث: اٹھانے والا، مردوں کو قبروں سے اٹھانے والا، یا دنیا میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا محرکِ اول۔

مالک الملک: سلطنت کا مالک جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں۔

البدیع: نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے والا۔

الواسع: سمانے والا۔ جو ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

المحیط: احاطہ کرنے والا، جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔

المحیی و الممیت: جلانے والا اور مارنے والا۔

القابض و الباسط: سمیٹنے والا اور پھیلانے والا۔

المعز و المذل: عزت دینے والا اور ذلت دینے والا۔

الخافض و الرافع: نیچا کرنے والا اور اونچا کرنے والا۔

المعطی و المانع: دینے والا اور روک لینے والا۔

النافع و الضار: نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا، یعنی نفع اور ضرر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

المبدئ و المعید: جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو، اس کو وجود میں لانے والا اور جو ہو کر فنا کر دی گئی، اس کو پھر دوبارہ وجود میں لانے والا۔

نکتہ: اس قسم کی صفتیں جن میں بہ ظاہر قبح نظر آتا ہے جیسے الضار (نقصان پہنچانے والا)، المذل (ذلت دینے والا)، الخافض (پست کرنے والا)، المانع (روکنے والا) وغیرہ، ان کا تنہا استعمال چوں کہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے، اس لئے جب تک ان کے ساتھ ان کے مقابل کی صفت نہ بولی جائے، ان کا استعمال جائز نہیں رکھا گیا ہے، یعنی خدا کو صرف الضار، الخافض، المانع اور المذل کہنا درست نہیں، جب تک اس کے ساتھ دوسرے پہلو کو بھی نہ ملایا جائے یعنی الضار، کے ساتھ النافع، الخافض کے ساتھ الرافع، المانع کے ساتھ المعطی اور المذل کے ساتھ المعز جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، قرآن پاک اور احادیث دونوں میں ان صفات کے استعمال میں یہ

رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، کیوں کہ تنہا نقصان پہنچانے والا ذلت دینے والا اور روکنے والا کوئی خوبی نہیں بلکہ ایک طرح کی برائی ہے، ہاں نقصان ونفع پہنچانے والا، عزت وذلت دینے والا اور دینے والا اور روکنے والا، دونوں کو ملا کر کہا جائے تو جائز ہوگا کہ اس سے مقصود خدا کی قدرت کی وسعت ہے، اگر کوئی ایسا نفع پہنچانے والا ہے، جس میں نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں یا ایسا عزت دینے والا جس میں ذلیل کرنے کی استطاعت ہی نہیں تو وہ اس عزت دینے اور نفع پہنچانے پر مجبور ومضطر ہوگا اور اس کی قدرت کا یہ کمال نہ ہوگا، البتہ جو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفع پہنچاتا اور ذلت دے سکنے کے باوصف عزت دیتا ہے، اس کا کمال ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

تنزیہ: یعنی وہ صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پاکی اور نیکی اور ہر عیب ونقصان سے اس کی برأت کو ظاہر کرتی ہیں۔

العلی: مرتبہ والا۔

العظیم: عظمت والا۔

الکبیر: بڑا۔

الرفیع: بلند۔

الجلیل: بزرگ۔

الکریم: شریف۔

الغنی: بے نیاز۔

الصادق: سچا، راست باز۔

الماجد: عزت والا۔

الحمید: تعریف والا۔

القدوس: پاک۔

الحق: سچا اور اصلی یعنی یہ کہ اس کے سوا سب باطل ہیں۔

الجمیل: اچھا۔

البر: نیک۔

العدل: عادل۔

سبوح: ہر عیب سے پاک۔

الصمد: بزرگی کی ہر صفت میں کامل۔

الرشید: سیدھی راہ چلنے والا، نہ بھٹکنے والا۔

ان تعلیمات کا اثر اخلاقِ انسانی پر: اللہ تعالیٰ کے ان اسما و صفات کا عقیدہ دین محمدی ﷺ میں محض نظری نہیں بلکہ عملی حیثیت بھی رکھتا ہے، یعنی اس کے یہ محامد و اوصاف، اخلاقِ انسانی کا معیار ہیں، ان اوصاف کو چھوڑ کو جو اس ذوالجلال کے لئے خاص ہیں اور جو بندہ کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں، بقیہ اوصاف و محامد انسان کے لئے قابل نقل ہیں، کہ وہ خدا کے محامد و اوصاف سے دور کی نسبت رکھتے ہیں اس لئے انسان پر فرض ہے کہ اگر وہ خدا سے نسبت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنے اندر اس کے محامد و اوصاف سے نسبت پیدا کرے اور ان کو خوبیوں کا انتہائی معیار جان کر ان کی نقل اور پیروی کی خواہش کرے، محامدِ الٰہی گویا استاد اعلا کی وصلی ہے، جس کو دیکھ کر شاگرد کو اپنے خط کی خوبی میں ترقی کرنی چاہے اس لئے انسان کو بھی اپنے حرف کے لکھنے (محامد الٰہی کی نقل اتارنے) میں ایک نظر اس استادِ ازل کی وصلی پر ڈال لینی چاہیے، تاکہ معلوم ہو کہ اس کی ذاتی مشق کہاں تک اصل وصلی کے مطابق ہے۔

گذر چکا ہے کہ قرآن کا پہلا سبق یہ ہے کہ بحکم اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (بقرہ۲: ۳۰) آدم کا بیٹا زمین میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے، خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف و محامد کا پرتو جتنا زیادہ نمایاں ہوگا اتنا ہی وہ اپنے اندر اس منصب کا استحقاق زیادہ ثابت کرے گا اور نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کر سکے گا، یہاں تک کہ اس میں وہ جلوہ بھی نمایاں ہوگا جب وہ سرتاپا خدائی رنگ

میں رنگ کر نکھر جائے گا:

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (بقرہ۲:۱۳۸) — خدا کا رنگ اور خدا کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے۔

تمام اہلِ تفسیر متفق ہیں کہ اس خدائی رنگ سے مقصود خدا کا دین فطرت ہے۔

یہ حدیث اوپر گذر چکی ہے کہ ان اللّٰہ خلق اٰدم علی صورتہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا اور ساتھ ہی اس کی تشریح بھی گذری ہے کہ اس صورت سے مقصود جسمانی نہیں بلکہ معنوی شکل وصورت ہے، یعنی یہ کہ خدا نے انسان میں اپنی صفاتِ کاملہ کا عکس جلوہ گر کیا ہے اور ان کے قبول کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے اور ان میں حدِ بشری تک ترقی کی استعداد بخشی ہے اور انسان کو اخلاق وصفت میں ملأ اعلا سے تشبہ اور ہم شکلی کا جوہر مرحمت فرمایا ہے اور یہی صوفیہ اور خاصانِ خدا کے اس مقولہ تخلقوا باخلاق اللہ ، خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو، کا مطلب ہے، حدیث میں یہی مفہوم بہ روایتِ طبرانی ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ حسن الخلق خلق اللّٰہ الاعظم، حسنِ خلق خدا تعالیٰ کا خلقِ عظیم ہے۔(۱)

اللہ تعالیٰ کے صفات کاملہ کی تین قسمیں اوپر بیان ہوئی ہیں، جلالی، کمالی اور تنزیہی، صفاتِ جلالی جو کبریائی، عظمت، شہنشاہی اور بڑائی کے اوصاف ہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوقات ان کی مستحق نہیں اور نہ یہ اوصاف بندگی وعبودیت کے رتبہ کے مناسب ہیں، ان کا انعکاس یہ ہے کہ بندوں میں ان کے مقابل کے صفات پیدا ہوں یعنی عاجزی، تواضع، فروتنی اور خاکساری، اس لئے ترفع، تکبر اور بڑائی کا اظہار منع ہے اور اسی لئے آدم جس نے فروتنی اختیار کی اور عجز وقصور کا اعتراف کیا، وہ مغفرت کے خلعت سے سرفراز ہوا اور شیطان جس نے ترفع اور غرور ظاہر کیا، دائمی لعنت کا مستحق ٹھہرا:

اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ. (بقرہ۲:۳۴) — اس نے آدم کے سجدہ سے انکار کیا اور غرور کیا اور کافروں میں سے ہوگیا۔

قرآن پاک میں ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف خدا کے لئے ہے، اس کے سوا کوئی اور اس کا مستحق نہیں:

(۱) کنز العمال جلد ۲ ص ۴ دائرۃ المعارف حیدر آباد ۱۳۱۲ھ بہ روایت حضرت عمار بن یاسرؓ۔

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لئے بڑائی ہے۔

(جاثیہ ۴۵: ۳۷)

صحیح مسلم میں (۱)، ابوسعید خدری اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما دو صحابیوں سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ عزت اس کا لباس اور کبریائی اس کی چادر ہے، (خدا فرماتا ہے) تو جو کوئی عزت اور کبریائی میں میرا حریف بنے گا میں اسے سزا دوں گا، دوسری جگہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ خدا کے نزدیک سب سے براوہ ہے جو اپنا نام بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ رکھتا ہے، خدا کے سوا کوئی بادشاہ اور مالک نہیں۔ (۲) اَلْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ. (حشر ۵۹: ۲۳) اسی کی شان ہے، البتہ اللہ تعالیٰ اپنی عزت وجلال اور قوت و جبروت کا فیضان بعض بندوں اور امتوں پر نازل کرتا ہے اور وہ ان کو طاقت اور قوت اور بادشاہی عطا کرتا ہے، مگر اس نوازش کے بعد بھی نیک بندوں اور صالح امتوں کا فرض یہی ہے کہ عین اس وقت جب کہ ان کے دست و بازو سے قوتِ حق اور ربانی جاہ وجلال کا اظہار ہو رہا ہو، ان کی پیشانیاں فرطِ عبودیت سے اس کے آگے جھکی ہوں اور سرِ نیاز اظہارِ بندگی کے لئے اس کے سامنے خم ہوں، کہ عزت وجلال خاص خدا کی شان تھی جس کا فیضان رسول پر ہوا اور رسول کی وساطت سے مومنوں پر ہوا، یہ ترتیب خود قرآن میں ملحوظ رکھی گئی ہے:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اور عزت خدا کے لئے ہے اور اس کے رسول کے لئے اور مومنوں کے لئے ہے۔

(منافقون ۶۳: ۸)

حاکم میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تین کپڑے ہیں، وہ اپنی عزت وجلال کا ازار باندھتا ہے اور اپنی رحمت کا جامہ پہنتا ہے، اور اپنی کبریائی کی چادر اوڑھتا ہے، تو جو شخص اس عزت کے سوا جو خدا کی طرف سے اس کو عنایت ہوئی ہے، معزز بننا چاہتا ہے تو وہی وہ شخص ہے جس کو قیامت میں کہا جائے گا ''(اس کا) مزہ چکھ تو معزز اور شریف بنتا تھا'' (سورہ دخان ۴۴: ۴۹) '' اور جو انسانوں پر رحم کرتا ہے خدا اس پر رحم کرتا ہے'' کیوں کہ اس نے وہ جامہ پہنا جس کا پہننا اس کو روا

(۱) کتاب البر والصلہ والآداب باب الکبر جلد دوم ص ۴۴۰ مصر (۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب ابغض الاسماء الی اللہ تبارک وتعالیٰ ج ۲ ص ۹۱۶ ومسلم کتاب الآداب باب تحریم التسمی بملک الاملاک وبملک الملوک ج ۲ ص ۲۳۱۔

تھا اور جو کبریائی کرتا ہے تو وہ خدا ہی کی اس چادر کو اتارنا چاہتا ہے جو خدا ہی کے لئے تھی۔‘‘(۱)

خدا کے صفاتِ کمالی میں سے وحدانیت اور بقائے ازلی وابدی کے سوا کہ ان سے تمام مخلوقات اور ممکنات طبعاً محروم ہیں، بقیہ اوصاف کے فیضان سے انسان مشرف ہوتا ہے، صفاتِ تنزیہی مثلاً قدرت، علم، سمع، بصر، کلام وغیرہ سے بھی مخلوقات تمام تر محروم ہیں، ان کی تنزیہ یہی ہے کہ وہ خدا کے عصیان، نافرمانی اور گنہ گاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں۔

خدا کے صفاتِ جمالی وہ اصلی اوصاف ہیں جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحبِ توفیق کے لئے حسبِ استعداد کھلا ہوا ہے، ان صفات کا سب سے بڑا مظہر عفو و درگذر ہے، عیسائیوں کی عام دعا میں ایک فقرہ ہے کہ ’’خداوندا! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر جس طرح ہم اپنے قرض داروں کو معاف کرتے ہیں‘‘، اسلام نے اس الٹی تشبیہ کو جائز نہیں رکھا ہے، اس کے ہاں یہ ہے کہ ’’اے انسان تو اپنے مجرموں کو معاف کر کہ خدا تیرے گناہوں کو معاف کرے‘‘، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ’’جو کوئی اپنے بھائی کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا خدا اس کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا‘‘۔(۲)

قرآن کہتا ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو کہ خدا تم کو معاف کرتا ہے:

اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا (نساء۴:۱۴۹)	اگر تم کوئی نیکی دکھا کر یا چھپا کر کرو یا کسی کی برائی کو معاف کرو تو اللہ (بھی) معاف کرنے والا قدرت والا ہے۔

ایک دفعہ عہدِ نبوت میں بارگاہِ عدالت قائم تھی، ایک مجرم کو سزا دی جا رہی تھی، سزا کا منظر دیکھ کر حضور ﷺ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا، اداشناسوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ ’’امام تک معاملہ پہونچنے سے پہلے ہی اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا کرو، خدا معاف کرنا اور عفو و درگذر کو پسند کرتا ہے، تو تم بھی معاف اور درگذر کیا کرو، کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ خدا تمہیں بھی معاف کرے، وہ بخشنے والا

(۱) کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۱۰۹ و مستدرک حاکم کتاب التفسیر سورۂ دخان ج ۲ ص ۴۵۱ (۲) صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب تحریم الظلم ج ۲ ص ۳۸۷ و ایضاً باب بشارۃ من ستر اللہ تعالیٰ الخ ص ۳۸۹۔

اور رحم کرنے والا ہے''۔(۱)

آنحضرت ﷺ ایک دفعہ صحابہؓ کے مجمع میں فرما رہے تھے کہ''جس کے دل میں غرور کا ایک ذرہ بھی ہوگا وہ بہشت میں داخل نہ ہوگا''، ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ! انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو، کیا یہ بھی غرور ہے، فرمایا:

ان اللہ عزوجل جمیل یحب الجمال (۲) اللہ تعالیٰ اچھا ہے اور جمال والا ہے، اچھائی اور جمال کو پسند کرتا ہے۔

یہ غرور نہیں، غرور حق کو پامال کرنا اور انسانوں کو دبانا ہے، یہی روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ ہے''خدا جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندہ پر اس کی نعمت کا اثر ظاہر ہو''(۳) یہ روایت بھی ہے''خدا جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے وہ سخی ہے سخاوت کو پسند کرتا ہے، وہ صاف ستھرا ہے صفائی اور ستھرے پن کو پسند کرتا ہے''۔(۴) روایت کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں''وہ جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے، اخلاقِ عالیہ سے محبت اور بداخلاقیوں سے نفرت رکھتا ہے''(۵) ایک موقع پر آنحضرت ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نصیحت فرماتے ہیں''اے عائشہ خدا نرمی والا ہے، وہ ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے''(۶) ایک دفعہ آپ ﷺ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا''لوگو! خدا پاک ہے اور پاک ہی کو قبول کرتا ہے''(۷) عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا''اے قرآن کے ماننے والو! وتر نماز پڑھا کرو کہ خدا یکتا (وتر) ہے وہ یکتا (وتر) کو پسند کرتا ہے''(۸)

---

(۱) مستدرک للحاکم جلد۴ ص۳۸۲ کتاب الحدود۔ (۲) صحیح مسلم کتاب الایمان باب تحریم الکبر و بیانہ ج۱ص۵۰ و ترمذی ابواب البر والصلہ باب الکبر ج۲ص۲۰ دیو بند (۳) کنز العمال کتاب الزینۃ ج۳ص۳۲۶ بحوالہ شعب الایمان بیہقی۔ (۴) کنز العمال کتاب الزینۃ ج۳ص۳۲۶ بحوالہ کامل لابن عدی (۵) ایضاً بحوالہ معجم اوسط طبرانی (۶) صحیح مسلم باب النھی عن ابتداء اھل الکتاب بالسلام ج۲ص۲۳۹، ابوداؤد کتاب الادب باب فی الرفق ج۲ص۱۸۸ مطبع کستلیہ، حاکم نسائی، ابن ماجہ ابواب الادب باب الرفق ص۲۷۰ (دیو بند)، بیہقی فی الآداب، (۷) صحیح مسلم کتاب الصدقات باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب ج۱ص۳۲۵ و ترمذی تفسیر سورہ بقرہ ج۲ص۱۲۸ دیو بند (۸) ابوداؤد استحباب الوتر ج۱ص۱۴۲۔

رحمت وشفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے مگر خدا کی رحمت وشفقت کے وہی مستحق ہیں جو دوسروں پر رحمت وشفقت کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا رحم کرنے والوں پر وہ رحم کرنے والا بھی رحم کرتا ہے لوگو! تم زمین والوں پر رحم کروتو آسمان والاتم پر رحم کرے گا۔(ابوداؤد کتاب الادب ج۲ص ۱۹۸ باب فی الرحمۃ) رشتہ داری اور قرابت کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تمام رشتہ داریاں اور قرابتیں رحم کے تعلق پر قائم ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''رحم کی جڑ رحمان سے ہے خدا فرماتا ہے کہ اے رحم! جو تجھ کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا، جو تجھ کو ملائے گا اس کو میں بھی ملاؤں گا''۔(۱) ترمذی میں یہی تعلیم ان الفاظ میں ہے ''میں خدا ہوں، میں رحمان ہوں میں نے رحم کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام (رحمٰن) سے اس کا نام (رحم) مشتق کیا ہے، تو جو اس کو ملائے گا میں اس کو ملاؤں گا، جو اس کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا'' (۲) پھر فرمایا ''جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا، خدا اس پر رحم نہیں کرتا'' (۳)، بخاری میں اس روایت کے یہ الفاظ ہیں ''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا'' (۴)، آپ ﷺ نے فرمایا ''خدا نے رحم کے سو حصے کیے، ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ زمین والوں کو عنایت کیا، اسی کا یہ اثر ہے کہ باہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رحم وشفقت سے پیش آتے ہیں، یہاں تک کہ گھوڑی بھی اپنے بچہ کے لئے اس خوف سے پاؤں اٹھالیتی ہے کہ اس کو صدمہ نہ پہنچے''۔(۵)

بخل خدا کی صفت نہیں، مگر آپ ﷺ نے فرمایا ''تم اپنی تھیلی کے منہ نہ بند کرو ورنہ تم پر تھیلی کا منہ بند کیا جائے گا'' (۶) یہ نصیحت بھی فرمائی کہ ''جو بندہ دوسرے بندہ کی پردہ پوشی کرے گا قیامت میں اس کی پردہ پوشی خدا کرے گا'' (۷) یہ بھی تعلیم دی گئی ہے کہ ''جب تک تم اپنے بھائی کی مدد میں ہو خدا تمہاری مدد میں ہے'' (۸)

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''خدا سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں اسی لئے اس نے فحش باتوں کو حرام کیا ہے'' (۹) اسی کی تفسیر دوسری حدیث میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''خدا بھی غیرت

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب باب من وصل وصله الله ج۲ص ۸۸۵،۸۸۶ (۲) ابواب البر والصلۃ باب ما جاء فی قطیعۃ الرحم ج۲ص ۱۲ (۳) ایضاً باب ما جاء فی رحمة الولد ج۲ص ۱۳ (۴) جامع بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد ج۲ص ۸۸۷ (۵) ایضاً (۶) صحیح ترمذی ابواب البر والصلۃ باب السخاء ج۲ص ۱۷ (۷) مسلم کتاب البر والصلہ باب بشارة من ستر الله تعالیٰ علیه فی الدنیا بان یستر علیه فی الأخرة ج۲ص ۳۸۹ (۸) ابوداؤد کتاب الادب باب فی المعونة للمسلم ج۲ص ۱۹۹ (۹) صحیح بخاری کتاب التوحید جلد دوم ص ۱۱۰۳۔

والا ہے اور مومن بھی غیرت والا ہے اور خدا کی غیرت یہ ہے کہ اس نے اپنے مومن پر جس بات کو حرام کیا ہے اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے تو وہ اس پر خفا ہو"۔(۱)

اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے:

وَاَنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ.	اور بے شک خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

(آل عمران ۳:۱۸۲)

اس لئے اس کے بندوں کا فرض ہے کہ وہ پھر آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں، محمد رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی زبان سے اس کی اس عملی تعلیم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا:

یاعبادی انی حرمت الظلم علی نفسی وجعلته بینکم محرما فلا تظالموا (۲)	اے میرے بندے! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔

پاکیزگی اور لطافت خدا کی صفتیں ہیں، اس لئے خدا کے ہر بندہ کو بھی پاک وصاف رہنا چاہیے، آپ ﷺ نے فرمایا:

ان اللّٰه طیب یحب الطیب ونظیف یحب النظافة فنظفوا ولا تشبهوا بالیهود. (۳)	خدا پاکیزہ ہے، پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اور پاک وصاف ہے، پاکی اور صفائی کو پسند کرتا ہے تو تم پاک وصاف رہا کرو، یہودیوں کی طرح گندے نہ بنو۔

یہ توحید کا ایک رخ تھا، اب اس کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کے قابل ہے۔

وہ قومیں جو توحید سے آشنا نہ تھیں، انہوں نے انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں پہچانا تھا، وہ انسان کو فطرت کے ہر مظہر کا غلام سمجھتی تھیں یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و توحید ہی تھی جس نے خدا کے سوا ہر شے کا خوف انسانوں کے دلوں سے نکال دیا، سورج سے لے کر زمین کے دریا اور تالاب تک ہر چیز آقا ہونے کے بجائے انسانوں کی غلام بن کر ان کے سامنے آئی، بادشاہوں کے جلال و جبروت کا طلسم ٹوٹ گیا اور وہ بابل و مصر، ہند و ایران کے خدا اور ربکم الاعلی ہونے کے بجائے، انسانوں کے

(۱) جامع ترمذی باب ما جاء فی الغیرة من ابواب النکاح ج ۱ ص ۲۲۰ دیوبند (۲) صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب تحریم الظلم ج ۲ ص ۳۸۶ و مسند ابن حنبل جلد ۵ ص ۱۶۰ مصر و ادب المفرد امام بخاری باب الظلم ص ۹۵ مصر ۱۳۰۴۔
(۳) ترمذی ابواب الاستیذان و الادب فی النظافة ص ۴۵۶ و ج ۲ ص ۱۰۷ (دیوبند)۔

خادم، راعی اور چوکیدار کی صورت میں نظر آئے جن کا عزل ونصب دیوتاؤں اور فرشتوں کے ہاتھ میں نہ تھا بلکہ خود انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔

تمام انسانی برادری جس کو دیوتاؤں کی حکومتوں نے اونچے نیچے، بلند وپست، شریف و ذلیل مختلف طبقوں اور ذاتوں میں منقسم کر دیا تھا اور جن میں سے کچھ کی پیدائش پرمیشور کے منہ، کچھ کی اس کے ہاتھ اور کچھ کی اس کے پاؤں سے تسلیم کی جاتی تھی، اس عقیدہ کی وجہ سے ایسی مختلف جنسوں میں بٹ گئی تھی جن کو کسی طرح متفق نہیں کر سکتے تھے اور اس طرح مساواتِ انسانی کی دولت دنیا سے گم ہو چکی تھی اور زمین قوموں اور ذاتوں کے ظلم وجبر اور غرور وفخر کا دنگل بن گئی تھی، توحید نے آکر اس اونچائی، نیچائی، بلندی وپستی اور نشیب وفراز کو برابر کیا، سب انسان خدا کے بندے، سب اس کے سامنے برابر، سب باہم بھائی بھائی اور سب حقوق کے لحاظ سے یکساں قرار پائے، ان تعلیمات نے دنیا کی معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی اصلاحات میں جو کام کیا، اس کے نتائج تاریخ کے صفحوں میں ثبت ہیں۔

بالآخر اس اصول کی صداقت کو انہوں نے بھی تسلیم کر لیا جو حقیقی توحید سے ناآشنا ہیں اور اسی لئے وہ مساواتِ انسانی کے حقیقی کوچہ سے بھی اب تک نابلد ہیں، انتہا یہ ہے کہ خدا کے گھر میں جا کر بھی تفاوتِ درجہ کا خیال ان کے دل سے دور نہیں ہوتا اور وہ دولت وفقر اور رنگ وقومیت کے امتیازات کو خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر بھی نہیں بھولتے، مسلمانوں کو تیرہ سو برس سے مساوات کی نعمت اسی توحید کامل کی بہ دولت حاصل ہے اور وہ ہر قسم کے مصنوعی امتیازات سے پاک ہیں، اسلام کی نظر میں سب ایک خدا کے بندے ہیں اور سب یکساں اس کے سامنے سرافگندہ ہیں، دولت وفقر، رنگ و روپ اور نسل وقومیت کا کوئی امتیاز ان کو منقسم نہیں کرتا، اگر کوئی امتیاز ہے تو صرف تقویٰ اور خدا کی فرماں برداری کا ہے:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ — تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے تقویٰ کرتا ہے۔ (حجرات ۴۹:۱۳)

خدا کا ڈر اور پیار: اس سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ خدا سے ڈرنے اور اس سے محبت کرنے کا ہے، عام طور سے مخالفوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے جس خدا کی تعلیم دی ہے وہ فقط قہار، جبار اور مہیب شہنشاہِ مطلق ہے، جس کی ہیبت وجلال سے تمام بندوں کو صرف ڈرتے اور کانپتے

رہنا چاہیے، اس کے گوشۂ چشم میں لطف وعنایت کا گذر نہیں، محبت اور پیار کا نذرانہ اس کے دربار میں قبول نہیں ہوتا، وہ اپنے کمزور بندوں پر نہ خود محبت کی نظر رکھتا ہے اور نہ بندوں سے اپنی محبت کا تقاضا کرتا ہے لیکن درحقیقت یہ تعلیمِ محمدی ﷺ کی بالکل غلط تصویر ہے، اللہ تعالیٰ کے جو اسما وصفات اوپر گذر چکے ہیں ان میں سے ایک ایک پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس کے چند پر جلال ناموں کو چھوڑ کر جو اس کی قدرتِ تامہ اور مالکیتِ عامہ کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں، بقیہ تمام نام صرف محبت اور پیار، لطف اور کرم ، رحمت اور مہر کی تجلی گاہ ہیں، مخالفوں کو اس حقیقت کے سمجھنے میں دو وجہوں سے مغالطہ ہوا۔

۱۔ آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت کی بھی انسانوں کو دعوت دی۔

۲۔ دوسرے مذہبوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے اظہار کی جو اصطلاحیں مقرر کی تھیں آپ ﷺ نے شدت کے ساتھ ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔

محبت کے ساتھ خوف وخشیت کی تعلیم: یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیم میں خدا کی محبت اور پیار کے ساتھ اس کے خوف وخشیت کو بھی جگہ دی ہے، غور کرو انسانوں میں تمام کاموں کے محرک دو ہی جذبے ہوتے ہیں، خوف اور محبت یہ دونوں جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ یا آگے پیچھے بھی، ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہوتے ہیں، ادعائے محبت کا نتیجہ ناز، تبختر اور کبھی گستاخی اور کبھی اپنے مہربان ومحبوب پر غایت اعتماد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جذبۂ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا انسداد صرف خوف کے جذبہ سے ہوسکتا ہے اس لئے خالق و مخلوق کے درمیانی رابطہ کی تکمیل نہ تنہا خوف سے ہوسکتی ہے اور نہ تنہا محبت سے، بلکہ ان دونوں کے اشتراک، امتزاج اور اعتدال سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے اور یہی نبوتِ محمدی ﷺ کی تعلیم ہے۔

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب موجود تھے ان کے اندر اس مسئلہ میں بھی افراط وتفریط پیدا ہوگئی تھی اور صراطِ مستقیم سے وہ تمام ترہٹ گئے تھے، یہودی مذہب کی بنا سراپا خوف وخشیت اور سخت گیری پر تھی، اس کا خدا ''فوجوں کا سپہ سالار'' (۱) اور ''باپ کا بدلہ پشتہا پشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا'' (۲)، حالاں کہ یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم وکرم اور محبت وشفقت کا ذکر کہیں کہیں موجود

(۱) یرمیا ۳۲، ۱۴، ۱۵ وغیرہ ص ۱۱۲۴ آکسفورڈ (۲) خروج ۲۰، ۵ ص ۱۱۹، و ۳۴، ۷: ص ۱۴۴ واستثناء ۴، ۳۲: ص ۲۸۵ و ۶، ۱۵: ص ۲۸۹، ۲۹۰ وغیرہ۔

اس کے برعکس عیسائیت زیادہ تر خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کے تذکروں سے معمور تھی، گو ایسا نہیں ہے کہ اس میں خدا کے خوف و خشیت کی مطلق تعلیم نہ ہو، بلکہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید ہے (۱)، مگر دونوں مذہبوں کے پیرووں نے ان دو متقابل تعلیموں کے درمیان اعتدال ملحوظ نہیں رکھا تھا، اسلام نے اسی نقطۂ اعتدال کو پیشِ نظر رکھا ہے، وہ نہ تو خدا کو محض جبار قہار، رب الافواج اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسماعیل کا خدا مانتا ہے، نہ اس کو مجسم انسان، انسانوں کا باپ یا محمد ﷺ کا باپ سمجھتا ہے اور نہ تنہا رحم و کرم اور محبت و شفقت کے صفات سے اس کو متصف کرتا ہے، بلکہ وہ خدا کی نسبت یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے اور رحمٰن و کریم بھی، وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور و رحیم بھی، وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے، خفا بھی ہوتا ہے اور نوازتا بھی ہے، اس سے ڈرنا بھی چاہیے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیے:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ. وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ.

(اعراف ۷: ۵۵، ۵۶)

(لوگو!) اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارا کرو، وہ حد سے بڑھ جانے والوں کو پیار نہیں کرتا اور زمین کی درستی کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ اور اس کو (اس کے عذاب سے) ڈرتے ہوئے اور (اس کے فضل و کرم) کی لو لگاتے ہوئے پکارا کرو، بے شک خدا کی رحمت اچھے کام کرنے والوں کے قریب رہتی ہے۔

چند نیک بندوں کی مدح میں فرمایا:

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا (انبیاء ۲۱: ۹۰)

وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہم کو امید اور ڈر کے ساتھ پکارتے تھے۔

اس سے زیادہ پر لطف بات یہ ہے کہ اسلام خدا سے لوگوں کو ڈراتا تو ہے مگر اس کو جبار و قہار کہہ کر نہیں بلکہ مہربان اور رحیم کہہ کر، چنانچہ خدا کے سعید بندوں کی صفت یہ ہے کہ:

(۱) خروج ۲۰، ۷: ص ۱۹ و ۳۴، ۷: ص ۴۴ و زبور ۵۶۔ ا ص ۱۰ آکسفورڈ ۳، ۱، ۸: ص ۴ وغیرہ میں خدا کے پیار اور رحم و کرم کا ذکر ہے (۲) لوقا کی انجیل ۱۲، ۵ ص ۱۱۷ آکسفورڈ اول پطرس ۱۷ ص ۳۷۷، دوم قرنیتون ۷، ۱، افسیون ۵، ۲۱ ص ۳۱۷، الغرض خدا سے ڈرنے کی تعلیم عیسائیت میں بھی دی گئی ہے۔

وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (یٰس ۳۶:۱۱) اور وہ رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (قٓ ۵۰:۳۳) جو رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔

نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کی زبان اس مہربان کے جلال کے سامنے گنگ ہے:

وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ (طٰہٰ ۲۰:۱۰۸) اور رحم والے کے ادب سے تمام آوازیں پست ہوگئیں۔

دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے وہ دو قسم کے تھے ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا، اس لئے وہ صرف خدا کے خوف و خشیت کی تعلیم دیتے تھے، مثلاً حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ، دوسرے وہ جو محبتِ الٰہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی خمخانۂ عشق کی طرف بلاتے تھے، مثلاً حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ۔

لیکن پیغمبروں میں ایک ایسی ہستی بھی آئی جو ان دونوں صفتوں کی برزخِ کبریٰ، جلال و جمال دونوں کا مظہر اور پیار اور ادب دونوں کی جامع تھی، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ، ایک طرف آپ ﷺ کی آنکھیں خوفِ الٰہی سے اشک بار رہتی تھیں اور دوسری طرف آپ ﷺ کا دل خدا کی محبت اور رحم و کرم کے سرور سے سرشار رہتا تھا، کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں یہ دونوں منظر آپ ﷺ کے چہرۂ انور پر لوگوں کو نظر آجاتے تھے، چنانچہ جب راتوں کو آپ ﷺ شوق و ولولہ کے عالم میں نماز کے لئے کھڑے ہوتے، قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتیں زبان مبارک پر ہوتیں اور ہر معنی کی آیتیں گذرتی جاتیں، تو جب کوئی خوف و خشیت کی آیت آتی، آپ ﷺ پناہ مانگتے اور جب کوئی مہر و محبت اور رحم و بشارت کی آیت ہوتی تو اس کے حصول کی دعا کرتے تھے۔(۱)

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ وہ خوف اور محبت کے کناروں سے ہٹا کر جہاں سے ہر وقت نیچے گرنے کا خطرہ ہے، خوف و خشیت اور رحم و محبت کے بیچ کی شاہ راہ میں انسانوں کو کھڑا کرے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ الایمان بین الخوف و الرجاء ایمانِ کامل خوف اور امید کے درمیان ہے، کہ تنہا خوف لوگوں کو خدا کے رحم و کرم سے ناامید اور محض رحم و کرم پر بھروسہ ان کو خودسر اور گستاخ بنا دیتا ہے، جیسا کہ اس عملی دنیا کے روزآنہ کے کاروبار میں نظر آتا ہے اور مذہبی حیثیت سے اس کے نتائج کا مشاہدہ عملاً یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا جاسکتا ہے، اسی لئے محمد رسول اللہ ﷺ

(۱) مسند ابن حنبل جلد ۶ ص ۹۲۔

نے اپنی تعلیم میں ان دونوں متضاد کیفیتوں کو ایمان اور عقیدہ کے رو سے برابر کا درجہ دیا لیکن ساتھ ہی عاجز و درماندہ انسانوں کو یہ بھی بشارت سنائی کہ خدا کی رحمت کا دائرہ اس کے غضب کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے، فرمایا:

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (اعراف ۷:۱۵۶)	اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

اور اس کی تفسیر خود صاحبِ قرآن علیہ السلام نے ان الفاظ میں کی:

ورحمتی سبقت غضبی۔ (بخاری۔ کتاب التوحید	میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی ہے۔

باب قول اللّٰہ بل ھو قرآن مجید ج۲ ص ۱۱۲۷)

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا اور اپنے کو "فرزندِ الٰہی" کا لقب دیا، بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خانوادہ اور محبوب ٹھہرایا، اور حضرت عیسیٰؑ کے جوڑ پر حضرت عزیزؑ کو فرزندِ الٰہی کا رتبہ دیا، لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا، بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لا کر کھڑا کرتا ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعویٰ تھا:

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَ اَحِبَّآؤُہٗ (مائدہ ۵:۱۸)	ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا:

قُلْ فَلِمَ یُعَذِّبُکُمْ بِذُنُوْبِکُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ (مائدہ ۵:۱۸)	اگر ایسا ہے تو خدا تمہارے گناہوں کے بدلہ تم کو عذاب کیوں دیتا ہے (اس لئے تمہارا دعویٰ صحیح نہیں) بلکہ تم بھی ان ہی انسانوں میں سے ہو جن کو اس نے پیدا کیا۔

دوسری جگہ قرآن نے تنہا یہودیوں کے جواب میں کہا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ ھَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّکُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰہِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ (جمعہ ۶۲:۶)	اے وہ جو یہودی ہو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے خاص چہیتے ہو تو موت (یعنی خدا کی ملاقات) کی تمنا کیوں نہیں کرتے۔

اسلام رحمتِ الٰہی کے دائرہ کو کسی خاندان اور قوم تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ وہ اس کی وسعت میں انسانوں کی ہر برادری کو داخل کرتا ہے، ایک شخص نے مسجد نبوی میں آ کر دعا کی کہ خدایا! مجھ کو اور محمد کو

مغفرت عطا کر''، آپ ﷺ نے فرمایا خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا(۱)، ایک اور اعرابی نے مسجد میں دعا مانگی کہ ''خدایا! مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحمت بھیج اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر''، آپ ﷺ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا ''یہ زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ'' (۲)

محبت کے جسمانی اصطلاحات کی ممانعت: اس مسئلہ میں تعلیمِ محمدی ﷺ کے متعلق غلط فہمی کا دوسرا سبب جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے یہ ہے کہ بعض مذاہب نے خدا کی محبت و کرم کی تعبیر کے لئے جو مادی اور جسمانی اصطلاحیں قائم کی تھیں، اسلام نے ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا، اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اسلام کا خدا رحم و کرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے معرا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان دوسرے غیر مادی خیالات کی طرح خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو بھی اپنی ہی انسانی بول چال میں ادا کرسکتا ہے، محبت اور پیار کے یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی مادی اور جسمانی رشتوں کے ذریعہ سے نمایاں ہوتے ہیں، اس بنا پر بعض مذاہب نے اس طریقۂ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے بھی بہترین اسلوب سمجھا، چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کیا، جیسا کہ عیسائیوں میں ہے، دوسرے نے ماں کی محبت کا بڑا درجہ سمجھا، اس لئے اس تعلق کو ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا اور دیبیاں انسانوں کی ماتائیں بنیں، جیسا کہ ہندوؤں کا عام مذہبی تخیل ہے، خاص ہندوستان کی خاک میں زن وشو کی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے، جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے، اس کی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ پر اثر منظر اور ناقابلِ شکست پیمان کوئی دوسرا نہیں، اس لئے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق و مخلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن وشو کی اصطلاح سے ادا کیا گیا، سدا سہاگ فقرا اس تخیل کی مضحکہ انگیز تصویر ہیں۔

یہ تمام فرقے جنہوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا، راہ سے بے راہ ہو گئے اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام بلکہ خواص تک کو گم راہ کر دیا، جو لفظ کی اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں گرفتار ہو گئے، عیسائیوں

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب و مسند احمد ج ۲ ص ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۹۶، ۲۲۱، ۵۰۳ (ض) (۲) ابوداؤد کتاب الادب باب من رد عن مسلم غیبۃ ج ۲ ص ۱۹۴ و مستدرک حاکم کتاب التوبۃ و الانابۃ ج ۴ ص ۲۴۸۔

نے واقعی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا سمجھ لیا، ہندوستان کے بیٹوں نے ماتاؤں کی پوجا شروع کردی، سدا سہاگ فقیروں نے چوڑیاں اور ساڑیاں پہن لیں اور خدائے قادر سے شوخیاں کرنے لگے،اسی لئے اسلام نے جو توحیدِ خالص کا مبلغ تھا،ان جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی اور خدا کے لئے ان الفاظ کا استعمال ضلالت اور گمراہی قرار دیا لیکن وہ ان الفاظ کے اصلی معنی اور منشا کا اور اس مجاز کے پردہ میں جو حقیقت مستور ہے اس کا انکار نہیں کرتا، بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے ناکافی اور غیر مکمل سمجھتا ہے اور وہ ان سے زیادہ وسیع و کامل معنی کا طالب ہے:

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ۲:۲۰۰) تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔

دیکھو کہ باپ کی طرح کی محبت کو وہ اپنے پروردگار کی محبت کے لئے ناکافی قرار دیتا ہے اور عبد و معبود کے درمیان محبت کے رشتہ کو اس سے کہیں زیادہ مضبوط و استوار ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

الغرض رحم و محبت کے اس جسمانی طریقۂ تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام سرے سے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان محبت اور پیار کے جذبات سے خالی ہے،اتنا کون نہیں سمجھتا کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اتری ہیں،انسانوں کے تمام خیالات اور تصورات اسی مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں، اس لئے ان کے ذہن میں کوئی غیر مادی اور غیر جسمانی تصور کسی مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہ راست پیدا نہیں ہوسکتا اور نہ اس کے لئے ان کے لغت میں کوئی ایسا لفظ مل سکتا ہے جو کسی غیر مادی اور غیر جسمانی مفہوم کو اس قدر منزہ اور بلند طریقہ سے بیان کرے، جس میں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شائبہ نہ ہو،انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے پیدا کرتا ہے اور اس طرح اُن اَن دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا سا عکس ذہن کے آئینہ میں اتر جاتا ہے۔

اس ان دیکھی ہستی کی ذات وصفات کے متعلق جس کو خدا کہتے ہو ہر مذہب میں ایک تخیل ہے،غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے پیروؤں کے گرد و پیش کی اشیا سے ماخوذ ہے لیکن ایک بلندتر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس تخیل کو مادیت، جسمانیت اور انسانیت

کی آلائشوں سے اس حد تک پاک ومنزہ کردے جہاں تک بنی نوع انسان کے لئے ممکن ہے، خدا کے متعلق باپ، ماں اور شوہر کا تخیل اس درجہ مادی اور جسمانی اور انسانی ہے کہ اس تخیل کے معتقد کے لئے ناممکن ہے کہ وہ خالص توحید کے صراطِ مستقیم پر قائم رہ سکے، اسی لئے نبوتِ محمدی ﷺ نے ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتوں کے ظاہر کرنے والے الفاظ کو خالق ومخلوق کے اظہارِ ربط وتعلق کے باب میں یک قلم ترک کردیا، بلکہ ان کا استعمال بھی شرک قرار دیا، تاہم چوں کہ روحانی حقائق کا اظہار بھی انسانوں ہی کی مادی بولی میں کرنا تھا، اس لئے جسمانی و مادی رشتہ کے بجائے جس کو دوسرے مذاہب نے منتخب کیا تھا اس رشتہ کے محض جذبات، احساسات اور عواطف کو خالق ومخلوق کے تعلقاتِ باہمی کے اظہار کے لئے اسلام نے مستعار لے لیا کہ اس طرح خالق ومخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کئے بغیر اس نے ربط وتعلق کا اظہار کیا اور استعمالات کی لفظی غلطی سے جو گمراہیاں پہلے پیش آچکی تھیں ان سے انسانوں کو محفوظ رکھا۔

ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں، جن کو کسی خاص تخیل اور نصب العین کی بناپر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے اور گو ان کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے، تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیشِ نظر رکھ کر استعمال کئے گئے تھے، ہر قوم نے اس علم اور نام کے لئے اسی وصف کو پسند کیا ہے جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہوسکتی تھی۔

اسلام نے خالق کے لئے جو نام اور علم اختیار کیا ہے وہ لفظ اللہ ہے، اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے اس میں اہلِ لغت کا یقیناً اختلاف ہے، مگر ایک گروہِ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ وَلاہٌ سے نکلا ہے اور وَلَہٌ کے اصلی معنی عربی میں اس ''غمِ محبت'' اور ''تعلقِ خاطر'' کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے، اسی سے بعد کو مطلق عشق ومحبت کے معنی پیدا ہوگئے اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ والہ (شیدا) مستعمل ہے اس لئے اللہ کے معنی ''محبوب اور پیارے'' کے ہیں، جس کے عشق ومحبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگرداں، متحیر اور پریشان ہیں، حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰنؒ گنج مرادآبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے، اللہ کا ترجمہ وہ ہندی میں ''من موہن'' یعنی ''دلوں کا محبوب'' کہا کرتے تھے۔

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن فضیلتوں پر پہلے نگاہ پڑتی ہے وہ ''رحمٰن'' اور ''رحیم'' ہیں۔ ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں ''رحم والا، مہربان''، لطف و کرم والا، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (محبوب، مہربان، رحم والا) کے ضمن میں قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں ان ہی صفاتِ ربانی کے بار بار دہرانے کی تاکید کی گئی ہے، ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے، کیا اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے کے لئے کوئی دلیل ہو سکتی ہے؟

لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں خدا کا دوسرا علم یہی لفظ ''رحمٰن'' ہے جو رحم و کرم اور لطف و مہر کے معنی میں صفت مبالغہ کا صیغہ ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی.	اس کو ''محبوب'' (اللہ) کہو یا ''مہربان'' (رحمان) کہو جو کہہ کر اس کو پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

(بنی اسرائیل ۱۷: ۱۱۰)

قرآن مجید نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کی صدہا بار کی تکرار کے علاوہ خاص طور سے ۵۳ موقعوں پر خدا کو اس رحمان کے نام سے یاد کیا ہے۔

ابھی اس سے پہلے باب میں اسمائے الٰہی کا ایک ایک نام تمہاری نظر سے گذر چکا ہے، ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے ہر قسم کے جلالی و جمالی اوصاف آگئے ہیں، استقصا کرو تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑی تعداد ان ہی ناموں کی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مہر و محبت کا اظہار ہوتا ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک وصف الودود (سورہ ذات البروج میں) آیا ہے، جس کے معنی ''محبوب اور پیارے'' کے ہیں کہ وہ سرتاپا مہر و محبت اور عشق اور پیار ہے، اس کے سوا خدا کا ایک اور نام الولی ہے جس کے لفظی معنی ''یار اور دوست'' کے ہیں، خدا کا ایک اور نام جو قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے الرؤف ہے، رؤف کا لفظ رافت سے نکلا ہے، رافت کے معنی اس محبت اور تعلقِ خاطر کے ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے، اسی طرح خدا کا ایک اور نام حنان ہے جو حن سے مشتق ہے، حن اور حنین اس سوزِ دل اور محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، یہ الفاظ ان مجازی اور مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں جو اسلام نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے اختیار کئے ہیں، دیکھو کہ وہ ان رشتوں کا نام نہیں لیتا لیکن ان رشتوں

کے سبب سے محبت اور پیار کے جو خاص جذبات پیدا ہوتے ہیں ان کو خدا کے لئے بے تکلف استعمال کرتا ہے اور اس طرح مادیت اور جسمانیت کا تخیل آئے بغیر وہ ان روحانی معنوں کی تلقین کر رہا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ غفار (بخشش کرنے والا) اور غفور (بخشنے والا) ہے، یعنی بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے، وہ سلام (امن وسلامتی) ہے، یعنی اپنے بے پناہ بندوں کے لئے وہ سرتاپا امن وسلامتی ہے، وہ مومن (امن دینے والا) ہے، وہ العدل ہے یعنی سرتاپا انصاف ہے، وہ العفو (معاف کرنے والا) ہے، الوھاب (عطا کرنے والا) ہے الحلیم (بردبار) ہے، الصبور (بندوں کی گستاخیوں پر صبر کرنے والا) ہے، التواب (بندوں کے حال پر رجوع ہونے والا) ہے، البر (نیک اور مجسم خیر) ہے اور المقسط (منصف اور عادل) ہے، ان میں سے ہر لفظ پر ٹھہر کر ذرا غور کرو کہ اسلام کا تخیل کس قدر بلند اور برتر ہے۔

توراۃ کے اسفار، انجیل کے صحائف اور وید کے حصص کا ایک ایک ورق پڑھ جاؤ، کیا اللہ تعالیٰ کے لئے ایسے پرمحبت اور سراپا مہر وکرم اسماوصفات کی کثرت تم کو وہاں ملے گی؟ یہ سچ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کے لئے ماں اور باپ کا لفظ یہود ونصاریٰ اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا، مگر اس سے یہ قیاس کرنا غلطی ہے کہ وہ لطفِ احساس اور مہر وکرم کے جذبات وعواطف سے یکسر خالی ہے، جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایہ سمجھتے ہیں، بات یہ ہے کہ اسلام ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ شرک وکفر کی اس ضلالت اور گمراہی سے بھی انسانوں کو بچانا چاہتا ہے جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو اصلیت سمجھ کر پاک اور سرتاپا روحانی معنوں کو مادی اور مجسم یقین کر لیتے ہیں اور اس طرح وہ توحید کی بلندترین سطح سے بہت نیچے گر کر سررشتۂ حقیقت کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ متکلمِ ازل کا آخری پیغام لے کر آئے تھے، اس لئے ضرورت تھی کہ آپ ﷺ کی تعلیم اس قسم کی لغزشوں سے پاک اور مبرا ہو، روحانی حقائق کی تعبیر کے لئے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا، یقیناً مادی اور جسمانی استعارات ومجازات سے چارہ نہیں، تاہم ایک دائمی تعلیم کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے کو استعمالات کی غلطیوں اور مجازات کی غلط فہمیوں سے محفوظ رکھتی، چنانچہ اسلام نے اسی بنا پر ان استعارات ومجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے اور خدا کے مہر وکرم اور عشق ومحبت کے

تذکروں کے ساتھ ادب ولحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کیا ہے، قرآن مجید اور احادیث روحانی عشق و محبت کے ان دلآویز اور ولولہ انگیز حکایات سے معمور ہیں، بایں ہمہ اسلام انسان کو بیٹا اور خدا کو (باپ) نہیں کہتا کہ عبد و معبود کے تعلقات کے اظہار کے لئے اس کے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہیں، وہ خدا کو ''اب'' (باپ) کے بجائے ''رب'' کہہ کر پکارتا ہے، وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے۔

اَب اور رب ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل اسلام کے مطمحِ نظر سے کس درجہ پست ہے، اَب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بنا پر ایک خاص لحظہ میں قائم ہوتا ہے اور پھر اس کی حیثیت بدل کر پرورش اور حفاظت کی صورت میں بچپن کے ایک محدود عرصہ تک قائم رہتا ہے، اس طرح گو باپ کو بیٹے کے وجود میں ایک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے مگر یہ تعلق حد درجہ ناقص، محدود اور آنی ہوتا ہے، بیٹے کے وجود، قیام و بقا، ضروریاتِ زندگی، سامانِ حیات، نشو ونما اور ارتقا کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اپنے باپ سے الگ مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے، مگر ذرا غور کرو کیا عبد و معبود اور خالق ومخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے، کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لحہ کے لئے بھی بے نیاز اور مستغنی ہوسکتا ہے، کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے۔

ربوبیت (پرورش) عبد و معبود اور خالق ومخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک، پیدائش سے وفات تک، بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے، جو ایک لحہ کے لئے منقطع نہیں ہوسکتا، جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے، وہ گہوارۂ عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے، انسان ذرہ ہو یا بہ صورت غذا، قطرۂ آب ہو یا قطرۂ خون، مضغۂ گوشت ہو یا مشتِ استخوان، شکم مادر میں ہو یا اس سے باہر، بچہ ہو یا جوان، ادھیڑ ہو یا بوڑھا، کوئی آن، کوئی لحہ، رب کے مہر وکرم اور لطف ومحبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے، اس سے لفظ رب یک قلم پاک ہے اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں

جن میں نصرانیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے۔

اب ان آیتوں اور حدیثوں کو دیکھو جن سے یہ روشن ہوتا ہے کہ اسلام کا سینہ اس ازلی و ابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے اور وہ خمخانۂ الست کی سرشاری کی یاد بھکے ہوئے انسانوں کو کس کس طرح دلا رہا ہے، اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے، ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت حبِ الٰہی ہے اور یہ وہ دولت ہے جو اہلِ ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی، زبانِ الٰہی نے شہادت دی:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرہ۲:۱۶۵)	اور جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔

اس نشۂ محبت پر باپ، ماں، اولاد، بھائی، بیوی، جان، مال، خاندان، سب کو قربان اور نثار ہو جانا چاہیے، ارشاد ہوتا ہے:

اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی يَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (توبہ۹:۲۴)	اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ دولت جو تم نے کمائی ہے اور وہ سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو، خدا اور اس کے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ محبوب اور پیارے ہیں تو اس وقت تک انتظار کرو کہ خدا اپنا فیصلہ لے آئے۔

ایمان کے بعد بھی اگر نشۂ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جادۂ حق سے دوری ہے، چنانچہ جو لوگ راہِ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے ان کو پکار کر سنا دیا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ (مائدہ۵:۵۴)	مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین (اسلام سے) پھر جائے گا تو خدا (کو اس کی کچھ پروا نہیں وہ) ایسے لوگوں کو لا کر کھڑا کرے گا جن کو وہ پیار کرے گا اور وہ اس کو پیار کریں گے۔

حضرت مسیحؑ نے کہا ”درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے“ ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے، تم کو زید کی محبت کا دعویٰ ہے مگر نہ تمہارے دل میں

اس کے دیدار کی تڑپ ہے، نہ تمہارے سینہ میں صدمۂ فراق کی جلن ہے اور نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں، تو کون تمہارے دعویٰ کی تصدیق کرے گا، اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعوے دار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں اس کے احکام کی پیروی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے، خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے:

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ۳:۳۱)	اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو کہ خدا بھی تم کو پیار کرے گا۔

محبت کیوں کر حاصل ہو، وحیِ محمدی ﷺ نے اس رتبۂ بلند کے حصول کی تدبیر بھی بتادی، فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا. (مریم ۱۹:۹۶)	جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، رحمت والا خدا ان کے لئے محبت پیدا کرے گا۔

اس آیت میں محبت کے حصول کے دو ذریعے بتائے گئے ہیں، ایمان اور عملِ صالح، یعنی نیک کام، چنانچہ طبقاتِ انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو ان ذریعوں سے خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ. (مائدہ ۵:۱۳ و بقرہ ۲:۱۹۵)	خدا نیکی کرنے والوں کے کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ (بقرہ ۲:۲۲۲)	خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ. (آل عمران ۳:۱۵۹)	خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ. (مائدہ ۵:۴۲ و حجرات ۴۹:۹)	خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ. (توبہ ۹:۴، ۷)	خدا پرہیزگاروں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِيْلِهٖ (صف ۶۱:۴)	خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کے راستہ میں لڑتے ہیں۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ. (آل عمران ۳:۱۴۶)	اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ. (توبہ ۹:۱۰۸)	اور خدا پاک صاف لوگوں کو پیار کرتا ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تین قسم کے آدمیوں سے محبت کرتا ہے

اور تین قسم کے آدمیوں کو پیار نہیں کرتا، محبت ان سے کرتا ہے جو اس کی راہ میں خلوصِ نیت کے ساتھ اپنی جان فدا کرتے ہیں اور ان سے جو اپنے پڑوسی کے ظلم پر صبر کرتے ہیں اور ان سے جو وضو کر کے خدا کی یاد کے لئے اس وقت اٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کے لئے بستر لگاتا ہے اور خدا کی محبت سے محروم یہ تین ہیں، اترانے والا مغرور، احسان دھرنے والا بخیل، جھوٹی قسمیں کھا کھا کر مال بیچنے والا سوداگر۔(۱)

دنیا کے عیش و مسرت میں اگر کوئی خیال کانٹا سا چبھتا ہے، اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور منغص بنا کر بے فکری کی بہشت کو فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہے، تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے، پہلے کا نام حزن و غم اور دوسرے کا خوف و دہشت ہے، غرض غم اور خوف یہی دو کانٹے ہیں جو عاجز و درماندہ انسان کے پہلو میں ہمیشہ چبھتے رہے ہیں لیکن جو محبوبِ حقیقی کے طلب گار اور اس کے والہ و شیدا ہیں ان کو بشارت ہے کہ ان کے عیش کا چمن زار ان کانٹوں سے پاک وصاف ہوگا:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ. (یونس۱۰:۶۲)	ہاں خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔

محبت کا وہ جذبہ جو بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان، نیکی، درگذر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے اس کا نام ''رحم'' اور ''رحمت'' ہے، اسلام کا خدا تمام تر رحم ہے، اس کی رحمت کے فیض سے عرصۂ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے، اس کا نام رحمٰن و رحیم ہے، جو کچھ یہاں ہے، سب اس کی رحمت کا ظہور ہے، وہ نہیں تو کچھ نہیں، اسی لئے اس کی رحمت سے ناامیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے، مجرم سے مجرم اور گنہ گار سے گنہ گار کو وہ نوازنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ و تیار رہتا ہے، گنہ گاروں اور مجرموں کو وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے میرے بندو! کہہ کر ان کے پاس تسلی کا یہ پیام بھیجتا ہے:

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ. (زمر۳۹:۵۳)	اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو پیام پہنچا دے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ یقیناً تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے، بے شک وہی بخشش کرنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔

فرشتے حضرت ابراہیمؑ کو بشارت سناتے ہیں تو کہتے ہیں:

(۱) احمد بن حنبل مسند ابوذر جلد ۵ ص ۱۷۶ و جامع ترمذی ابواب الدعوات ج ۲ ص ۱۹۴ (دیوبند)۔

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ. (حجر ۱۵:۵۵) تم ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہو۔

خلیل اللہ اس رمز سے ناآشنا نہ تھے کہ مرتبۂ خلت محبت سے مافوق ہے اس لئے جواب دیا:

وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ. (حجر ۱۵:۵۶) اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوااور کون ناامید ہوتا ہے۔

بندوں کی جانب سے خدا پر کوئی پابندی عائد نہیں، مگر اس نے اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر خود کچھ چیزیں فرض کرلی ہیں، من جملہ ان کے ایک رحمت بھی ہے، خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے، گنہ گاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے، سیہ کاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے، وہ غالب ہے، قاہر ہے، جبار ہے، منتقم ہے لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار وغفور بھی ہے، رحمان ورحیم بھی اور غفور ورؤف بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود عائد کرلی ہے اور اس کو اپنے اوپر فرض گردان لیا ہے:

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (انعام ۶:۱۲) اللہ نے از خود اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے۔

قاصدِ خاص کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گنہ گار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ اور تسلی کا یہ پیام دو کہ ہمارا بابِ رحمت ہر وقت کھلا ہے:

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (انعام ۶:۵۴)

اے پیغمبر جب تیرے پاس وہ آئیں جو میری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں تو ان سے کہہ کہ تم پر سلامتی ہو، تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں پر مہربان ہونا لازم کرلیا ہے، کہ جو کوئی تم میں سے براہ نادانی برائی کر بیٹھے پھر اس کے بعد بارگاہِ الٰہی کی طرف رجوع کرے اور نیک بنے تو بے شک خدا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصۂ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایۂ رحمت سے محروم نہیں:

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف ۷:۱۵۶) اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے۔

بخاری وترمذی وغیرہ کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو

از خود اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کرلی (۱) جامع ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا ''اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے تو وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا'' (۲) یہ اسلام کے تخیل کی صحیح تعبیر ہے، بارگاہِ احدیت کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گنہ گاروں کو بشارت سناتا ہے کہ ''اے آدم کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے آس لگائے رہو گے تمہیں بخشتا رہوں گا، خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں، مجھے پروانہیں اے آدم کے بیٹو! اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو تو میں معاف کردوں خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں مجھے پروانہیں، اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطحِ زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو، پھر تم میرے پاس آؤ اس حال میں کہ کسی کو میرا شریک نہ بناتے ہو تو میں بھی تمہارے پاس پوری سطحِ زمین بھر مغفرت لے کر آؤں'' (۳) کیا انسانوں کے کانوں نے اس رحمت، اس محبت، اس عفوِ عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سنی ہے۔

حضرت ابوایوبؓ صحابی کی وفات کا وقت جب آیا تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''اگر تم لوگ گناہ نہ کرتے تو خدا اور کوئی مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور وہ اس کو بخشتا'' (۴) یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم و کرم کے اظہار کے لئے گنہ گاروں ہی کی تلاش ہے کہ نکوکاروں کو تو سب ڈھونڈتے ہیں مگر گنہ گاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے۔

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم و کرم اور مہر و محبت کے عناصر پائے جاتے ہیں اور جن کی بنا پر دوستوں، عزیزوں، قرابت داروں اور اولادوں میں میل ملاپ اور رسم و محبت ہے، نیز جس کی بنا جس پر دنیا میں عشق و محبت کے شان دار مناظر آتے ہیں، تم کو معلوم ہے کہ یہ اس شاہدِ حقیقی کے سرمایۂ محبت کا کون سا حصہ ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کئے ان میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا، جس کے اثر سے لوگ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں،

---

(۱) صحیح بخاری کتاب بدء الخلق باب ماجاء فی قول اللہ وَهُوَ الَّذِي يَبْدَءُ الْخَلْقَ ج ۱ ص ۵۵۳، صحیح مسلم کتاب التوبہ بـاب فـی سعة رحمة اللّٰه ج ۲ ص ۴۴۳ و جامع ترمذی کتاب الدعوات ج ۲ ص ۱۹۴ (۲) کتاب الدعوات ج ۲ ص ۱۹۴ و صحیح مسلم کتاب التوبہ باب فی سعة رحمة الله ج ۲ ص ۴۴۴ (۳) جامع ترمذی (ابواب الدعوات) ج ۲ ص ۱۹۴ و دیگر کتب احادیث (صحیح) (۴) مسند احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۴۱۴۔

باقی ننانوے حصے خدا کے پاس ہیں(۱)، اس لطف و کرم اور مہر و محبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں اور کس نے گنہ گار انسانوں کے مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے، صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک شخص شراب خوری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا، صحابہ نے تنگ آ کر کہا "خداوندا! تو اپنی لعنت اس پر نازل کر کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے" رحمۃ للعالمین ﷺ کو لوگوں کی یہ بات ناپسند آئی فرمایا "اس پر لعنت نہ کرو کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت ہے" (۲) تم نے دیکھا کہ اسلام نے گنہ گاروں کے لئے خدا کی محبت کا دروازہ کس طرح کھول رکھا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم ان عربوں کو جو خدا کی محبت کیا خدا کی معرفت سے بھی ناآشنا تھے، کس طرح آشنائے حقیقت کر دیا اور ان کو ذاتِ الٰہی کے ساتھ وابستگی، محبت اور سرشاری کے لطف سے کس درجہ بہرہ اندوز کر دیا، بلالؓ کو دیکھو ٹھیک دوپہر کے وقت عرب کی جلتی ہوئی ریت پر ان کو لٹایا جاتا ہے، ایک گرم پتھر سینہ پر رکھا جاتا ہے اور خدائے واحد سے انحراف کے لئے ان کو مجبور کیا جاتا ہے، وہ یہ سب تکلیفیں اٹھاتے ہیں مگر زبان سے وہی احد احد (ایک ایک) کا ترانہ (۳) نکلتا ہے، مکہ کا ذرہ ذرہ صدائے حق کا دشمن ہے، ابوذر غفاریؓ یہ جان کر بھی صحنِ مکہ میں جوشِ وحدت سے سرشار ہو کر کلمۂ توحید کا بہ آوازِ بلند اعلان کرتے ہیں، ہر طرف سے پتھروں اور ہڈیوں کی بارش ہوتی ہے، بعض لوگ آ کر چھڑا دیتے ہیں لیکن جب دوسری صبح نمودار ہوتی ہے تو پھر محبتِ الٰہی کے کیف و مستی کا وہی عالم نظر آتا ہے اور مشرکین کی طرف سے وہی سزا ملتی ہے۔ (۴)

ایک صحابی جو رات کو میدان جنگ میں ایک پہاڑ پر پہرہ دینے کے لئے متعین تھے وہ اپنی نیند ٹالنے کے لئے خدا کی یاد میں مصروف ہوتے ہیں، دشمن پے در پے تین دفعہ تیر مارتا ہے جو بدن میں پیوست ہو جاتا ہے اور وہ بہ دستور نماز میں محو رہتے ہیں، ان کے ساتھی پوچھتے ہیں کہ تم نے نماز کیوں

(۱) بخاری کتاب الادب باب ج ۲ ص ۸۸۷ (۲) بخاری کتاب الحدود باب ما یکرہ من لعن شارب الخمر ج ۲ ص ۱۰۰۲ (۳) سیرۃ ابن ہشام ذکر عدوان المشرکین ج ۱ ص ۱۹۵ و اسد الغابۃ جلد ۱ ص ۲۰۶ جمعیۃ المعارف مصر (۴) طبقات ابن سعد جزء رابع قسم اول ص ۱۶۵ تذکرہ حضرت ابوذر غفاریؓ۔ وصحیح بخاری قصۃ اسلام ابی ذر و باب قصۃ زمزم ج ۱ ص ۵۰۰۔

نہیں توڑی، کہتے ہیں کہ ”جو سورہ شروع کی تھی جی نہ چاہا کہ اس کو تمام کئے بغیر چھوڑ دوں“۔(۱)

محمد رسول اللہ ﷺ کے دو جانشین عین حالتِ نماز میں زخم کھا کر گرتے ہیں مگر مقتدیوں کی صف اس حی وباقی کے سامنے کھڑی ہو کر ہر فانی ومیت ہستی کی محبت سے بے نیاز رہتی ہے، اسی لئے خدا نے بشارت دی کہ وہ خدا کے محبوب اور خدا ان کا محبوب ہے یعنی رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

مدینہ میں ایک اللہ والے مسلمان نے وفات پائی، اس کا جنازہ اٹھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا اس کے ساتھ نرمی کرو کہ اللہ نے بھی اس کے ساتھ نرمی کی ہے، کیوں کہ اس کو اللہ اور اس کے رسول سے محبت تھی، قبر کھودی جانے لگی تو فرمایا اس کی قبر کشادہ رکھو کہ خدا نے بھی اس کے ساتھ کشادگی فرمائی ہے، اس بار بار کے اہتمام کو دیکھ کر صحابہؓ نے پوچھا ”یا رسول اللہ ﷺ آپ کو اس مرنے والے کی موت کا غم ہے؟“ فرمایا ”ہاں کیوں کہ اس کو خدا اور رسول پیارے تھے“ (۲) ایک دفعہ آپ ﷺ نے ایک صحابی کو کسی جماعت کا افسر بنا کر بھیجا، وہ جب نماز پڑھاتے تو ہر سورہ کے آخر میں قل ھو اللہ ضرور پڑھتے، جب یہ جماعت سفر سے لوٹ کر آئی تو خدمتِ اقدس میں یہ واقعہ عرض کیا فرمایا ”ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں“، لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا کہ یہ میں اس لئے کرتا ہوں کہ اس سورہ میں رحم والے خدا کی صفت کا بیان ہے، تو مجھ کو اس کے پڑھنے سے محبت ہے، فرمایا ”ان کو بشارت دو کہ رحم والا خدا بھی ان سے محبت کرتا ہے“ (۳)، یہ بشارت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک کے سوا کسی اور نے بھی سنائی ہے۔؟

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمت والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہؐ قیامت کب آئے گی، فرمایا تم نے اس کے لئے کیا سامان کر رکھا ہے، انہوں نے نادم ہو کر شکستہ دلی سے عرض کی کہ یا رسول اللہؐ میرے پاس نہ تو نمازوں کا بڑا ذخیرہ ہے، نہ روزوں کا اور نہ صدقات وخیرات کا، جو کچھ سرمایہ ہے وہ صرف

(۱) صحیح بخاری وسنن ابی داؤد کتاب الطہارۃ باب الوضوء من الدم ج ۱ ص ۲۰ ومسند احمد ج ۳ ص ۳۴۴، ۳۵۹۔

(۲) ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ما جاء فی حفر القبر ص ۱۱۳ مطبع فاروقی دہلی (۳) مسلم کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرھا باب فضل قرأۃ قل ھو اللہ احد ج ۱ ص ۳۰۱ یہ واقعہ بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الجمع بین السورتین فی رکعۃ ج ۱ ص ۱۰۷ میں دوسری طرح مروی ہے اور اس میں رسول اللہ ﷺ کے الفاظ بھی دوسرے ہیں۔

خدااور رسول کی محبت ہے اور بس، فرمایا تو انسان جس سے محبت کرے گا اسی کے ساتھ رہے گا، صحابہؓ نے اس بشارت کو سن کراس دن بڑی خوشی منائی۔(۱)

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے تو فرشتۂ خاص جبریل سے کہتا ہے کہ میں فلاں بندہ کو پیار کرتا ہوں تم بھی اس کو پیار کرو، تو جبریلؑ بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور پھر زمین میں اس کو ہر دل عزیزی اور حسنِ قبول بخشا جاتا ہے“۔(۲)

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”جو بندہ اپنی اطاعتوں سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، یہاں تک کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے“(۳)۔ یہ دولت، یہ نعمت، یہ سعادت آستانۂ محمدی کے سوا کہیں اور نہیں بٹتی۔

امام بزار نے مسند میں حضرت ابو سعیدؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید ہیں لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیا اور شہدا بھی رشک کریں گے، یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے، وہ اچھی باتیں بتاتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔“(۴) یہ قابلِ رشک رتبہ محمد رسول اللہ ﷺ کے سوا اور کس کے ذریعہ عطا ہوا ہے۔

امام مالکؒ نے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”خداوند تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ان کو پیار کرنا مجھ پر لازم ہے جو آپس میں ایک دوسرے کو میری محبت کے سبب سے پیار کرتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور میری محبت

(۱) مسلم کتاب البر والصلہ والآداب باب المرء مع من احب ج ۲ ص ۴۰۴ و بخاری کتاب الادب باب ما جاء فی قول الرجل ویلک ج ۲ ص ۹۱۱ (۲) مسلم کتاب الادب باب اذا احب اللہ عبدا الخ ج ۲ ص ۴۰۴۔ (۳) بخاری کتاب الرقاق باب التواضع ج ۲ ص ۹۶۳ (۴) اس کی ہم معنی حدیثیں ابوداؤد، ترمذی، مالک اور شعب الایمان بیہقی میں بھی ہیں، دیکھو مشکوۃ کتاب الآداب الحب فی اللہ ومن اللہ فصل ثانی ج ۲ ص ۶۱۶، ۶۱۷ دمشق ۱۹۶۱ء۔

میں ایک دوسرے کے لئے اپنی جان و مال وقف کرتے ہیں''۔(۱)

یہ محبتِ الٰہی کی نیرنگیاں اسلام ہی کے پردہ پر نظر آتی ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''لوگو! خدا سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے اور اسی کی محبت کے سبب سے مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کے سبب سے میرے اہلِ بیت سے محبت کرو''(۲) یہ عشق و محبت کی دعوت محبوبِ ازل کے سوا اور کون دے سکتا ہے؟

عام مسلمانوں میں پیغمبرِ اسلام کا لقب ''حبیبِ خدا'' ہے، دیکھو کہ حبیب اور محبوب میں خلت و محبت کے کیا کیا ناز و نیاز ہیں، آپ ﷺ خشوع و خضوع کی دعاؤں اور خلوت و تنہائی کی روحانی ملاقاتوں میں کیا ڈھونڈتے اور کیا مانگتے تھے، کیا چاہتے اور کیا سوال کرتے تھے، امام احمد اور بزار نے مسندوں میں ترمذی نے جامع میں، حاکم نے مستدرک میں اور طبرانی نے معجم میں متعدد صحابیوں سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی دعاؤں میں محبتِ الٰہی کی دولت مانگا کرتے تھے، انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان ہے لیکن محبوبِ خدا کی نگاہ میں یہ چیزیں ہیچ تھیں، دعا فرماتے تھے، خداوندا:

اسئل حبک وحب من یحبک وحب عمل یقرب الی حبک. (احمد، ترمذی ابواب الدعوات ابواب شتی ج ۲ ص ۱۸۷، حاکم کتاب الدعاء ج ۲ ص ۵۲۶ و ۵۲۷	میں تیری محبت مانگتا ہوں اور جو تجھ سے محبت کرتا ہو اس کی محبت اور اس کام کی محبت جو تیری محبت سے قریب تر کردے۔
اللّٰھم اجعل حبک احب الی من نفسی واھلی ومن الماء البارد. (ترمذی ابواب الدعوات ابواب شتی ج ۲ ص ۱۸۷ و حاکم)	الٰہی تو اپنی محبت کو میری جان سے، میرے اہل و عیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔

عرب میں ٹھنڈا پانی دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے لیکن حضور ﷺ کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہیں بجھتی تھی، وہ صرف محبتِ الٰہی کا زلالِ خالص تھا جو اس تشنگی کو تسکین دے سکتا تھا، عام انسان روٹی سے جیتے ہیں، مگر ایک عاشقِ الٰہی (مسیحؑ) کا قول ہے کہ ''انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا''، پھر وہ کون روٹی ہے جس کو کھا کر انسان پھر کبھی بھوکا نہیں ہوتا، حضور ﷺ دعا فرماتے ہیں:

(۱) مشکوٰۃ باب مذکور ج ۲ ص ۶۱۶ (۲) مشکوٰۃ کتاب المناقب باب مناقب اھل بیت النبی ﷺ بروایت ترمذی الفصل الثالث ج ۳ ص ۲۶۵۔

اللّٰھم ارزقنی حبک وحب من ینفعنی حبہ عندک. (ترمذی ج ۲ ابواب الدعوات ج ۲ ص ۱۸۷)

خداوندا! تو اپنی محبت اور اس کی محبت جو تیری محبت کی راہ میں نافع ہو مجھے روزی کر۔

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرنا ہے مگر جانتے ہو کہ اس راہ میں آخری منزل کیا ہے، صحیحین میں ہے:

من کان اللّٰہ و رسولہ احب الیہ مما سواھما. (۱)

یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے تمام سوا کی محبتیں ہیچ ہو جائیں۔

بعض مذاہب کو اپنی اس تعلیم پر ناز ہے کہ وہ انسانوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ اپنے خدا کو ماں باپ سمجھیں اور اس سے اسی طرح محبت کریں جس طرح اپنے والدین سے کرتے ہیں اور چوں کہ اسلام نے اس طریقۂ تعبیر کو اس بنا پر کہ وہ شرک کا راستہ ہے ممنوع قرار دیا ہے، اس لئے ان مذاہب کے بہت سے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم محبتِ الٰہی کے مقدس جذبات سے خالی ہے، لیکن جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، دعویٰ سرتا پا بے بنیاد ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تعلیم محمدی ﷺ کی بلندیٔ نظر اور محبت کا علوئے معیار، دونوں ان مذاہب کے پیش کردہ نظریہ و معیار سے بہت بالاتر ہیں، ثبوت میں قرآن مجید کی یہ آیت پاک بھی پہلے پیش کی جا چکی ہے:

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ۲:۲۰۰)

تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو، بلکہ اس سے بہت زیادہ یاد کرو۔

لیکن احادیث سے ہمارا دعویٰ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے، لڑائی کا میدان ہے دشمنوں میں بھاگ دوڑ مچی ہے، جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آ رہا ہے، اپنی جان بچا رہا ہے، بھائی بھائی سے، ماں بچہ سے، بچہ ماں سے الگ ہے، اسی حال میں ایک عورت آتی ہے جس کا بچہ میدانِ حشر میں گم ہو گیا ہے، محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ جو بچہ بھی اس کے سامنے آ جاتا ہے اس کو اپنے بچہ کے جوشِ محبت میں چھاتی سے لگا لیتی ہے اور دودھ پلا لیتی ہے، دفعتاً رحمۃ اللعالمین ﷺ کی نظر پڑتی ہے اور آپ صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں ”کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے؟“ لوگ عرض کرتے ہیں ”ہرگز نہیں“، آپ فرماتے ہیں ”تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچہ سے ہے خدا کو اپنے بندوں سے اس سے کہیں زیادہ محبت ہے“۔ (۲)

---

(۱) مسلم کتاب الایمان باب بیان خصال من اتصف بھن وجد حلاوۃ الایمان ج ۱ ص ۴۷ بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان ج ۱ ص ۷، یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔ ”ض“ (۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد ج ۲ ص ۸۸۷۔

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ ﷺ واپس تشریف لا رہے ہیں ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لے کر سامنے آتی ہے اور عرض کرتی ہے ''یارسول اللہ ﷺ ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟'' فرمایا: ''ہاں بے شک اس سے زیادہ ہے۔'' بولی ''تو کوئی ماں تو اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا نہ کرے گی''، یہ سن کر فرطِ اثر سے آپ ﷺ پر گریہ طاری ہوگیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا: ''خدا صرف اس بندہ کو عذاب دیتا ہے جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے''۔(۱)

آپ ﷺ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں ایک صحابی ایک پرند کو مع اس کے بچوں کے چادر میں باندھ کر لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یارسول اللہ ﷺ میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا، ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی، میں نے ذرا سا کپڑے کو کھول دیا تو فوراً آ کر بچوں پر گر پڑی، ارشاد ہوا کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے، قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بہ درجہا زیادہ ہے۔(۲)

ایک صاحب ایک چھوٹے بچہ کو لے کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے ہیں، محبت کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار اس کو گلے سے لگائے جاتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم کو اس بچہ سے محبت ہے، انہوں نے کہا ہاں فرمایا ''تو اللہ کو تم سے اس سے زیادہ محبت ہے جتنی تم کو اس بچہ سے ہے، وہ تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے''۔(۳)

جمالِ حق کا پہلا مشتاق اور مستورِ ازل کے زیرِ نقاب چہرہ کا پہلا بند کشا، زندگی کے آخری مرحلوں میں ہے، مرض کی شدت ہے، بدن بخار سے تپ رہا ہے، اٹھ کر چل نہیں سکتا لیکن یک بہ یک وہ اپنے میں ایک اعلانِ خاص کی طاقت پاتا ہے، مسجدِ نبوی میں جاں نثار حاضر ہوتے ہیں، سب کی نظریں حضور ﷺ کی طرف لگی ہیں، نبوت کا آخری پیغام سننے کی آرزو ہے، دفعتاً لبِ مبارک ہلتے ہیں اور یہ آواز آتی ہے، لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی برأت کرتا ہوں کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست

(۱) سنن ابن ماجہ ابواب الزہد باب ما یرجی من الرحمۃ ص ۳۲۸ و مشکوٰۃ کتاب الدعوات باب سعۃ رحمۃ اللہ الفصل الثالث ص ۲۰۷ (۲) مشکوٰۃ کتاب الدعوات باب سعۃ رحمۃ اللہ الفصل الثانی ج ۱ ص ۲۰۶ بحوالہ ابوداؤد کتاب الاسما باب رحمۃ اللہ وغضبہ (۳) ادب المفرد امام بخاری باب رحمۃ العیال ص ۷۵، مصر۔

ہے، مجھ کو خدا نے اپنا پیارا بنایا ہے، جیسے ابراہیم کو اس نے اپنا پیارا بنایا تھا(۱)، یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا، عین حالت نزع میں زبان مبارک پر یہ کلمہ تھا ''خداوندا رفیق'' (۲)۔

اللہ تعالیٰ کی کریمی ورحیمی اس کی بے چارہ نوازی، عاجزوں اور درماندوں کی دست گیری اور اپنے گنہ گار بندوں پر اس کی شانِ تجسس کا ترانہ محمد رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے کانوں سے سنا اور نادم ومتاسف سیہ کاروں تک اس مژدہ کو پہنچا کر ان کے شکستہ اور زخمی دلوں پر مرہم رکھا، حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ حضرت رحمۃ للعالمین ﷺ نے یہ پیامِ ربانی ہم کو سنایا۔

میرے بندو! میں نے اپنے اوپر بھی اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کیا ہے، تو ایک دوسرے پر تم ظلم نہ کیا کرو، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک گم راہ تھا لیکن جس کو میں نے راہ دکھائی، تو مجھ سے راستہ پوچھو میں بتاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک بھوکا تھا لیکن جس کو میں نے کھلایا، تو مجھ سے کھانا مانگو میں تم کو کھلاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک پیاسا تھا لیکن جس کو میں نے پلایا، تو مجھ سے پانی مانگو میں تم کو پلاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک ننگا تھا لیکن جس کو میں نے پہنایا، تو مجھ سے کپڑا مانگو میں تم کو پہناؤں گا، اے میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں سب گناہوں کو معاف کرتا ہوں، تم مجھ سے معافی مانگو میں تم کو معاف کروں گا، اے میرے بندو! مجھے نقصان پہنچانا تمہاری طاقت میں نہیں ہے اور نہ مجھے نفع پہنچانا تمہاری قدرت میں ہے، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے، جن اور انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت دنیا کے سب سے بڑے پرہیز گار کے دل کے برابر ہو جائیں تو میری شہنشاہی میں ایک ذرہ اضافہ نہ ہوگا اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے جن وانس چھوٹے اور بڑے مرد اور عورت، دنیا کے سب سے بڑے گنہ گار کے دل کے برابر ہو جائیں تو بھی میری شہنشاہی میں ذرہ برابر کمی نہ ہوگی، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، جن وانس سب کسی ایک زمین مین کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں سب کے سوال کو پورا کروں تو میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ ہوگی لیکن اتنی جتنی ایک سوئی سمندر کے پانی میں ڈبو کر نکال لی جائے، اے میرے بندو! تمہارے ہی عمل ہوں گے جن کو میں گن گن کر تم کو واپس

(۱) صحیح مسلم کتاب المساجد باب النهی عن بناء المساجد علی القبور ج۱ص۲۰۱ (۲) صحیح بخاری کتاب المغازی باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ ج۲ص۶۳۸۔

کروں گا اور پورا کروں گا تو جس کو بھلائی ملے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے، وہ خود اپنے ہی کو ملامت کرے۔(۱)

محبت کا یہ پرکیف نغمہ دنیا نے محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی زبان مبارک سے سنا، تسلی و تشفی کا یہ روح افزا پیام آپ ﷺ ہی کے مبارک لبوں سے ادا ہوا، عفو و کرم کے بحرِ بے کراں کا یہ ساحلِ امید آپ ﷺ ہی کے دکھانے سے ہم کو نظر آیا اور گنہ گاروں کو میرے بندو کہہ کر پکارے جانے کی عزت آپ ہی کے وسیلہ سے میسر آئی ﷺ۔

---

(۱) صحیح مسلم کتاب البر والصلہ والآداب باب تحریم الظلم ج ۲ ص ۳۸۶، ۳۸۷ و ترمذی کتاب الزہد و مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۶۰ و صفحہ ۱۵۴، ۱۷۷، و ادب المفرد امام بخاری باب الظلم ص ۹۵ مصر، میں نے صحیح مسلم کی روایت سامنے رکھی ہے لیکن بعض الفاظ مسند سے لے کر بڑھا دیئے ہیں، اس کے بعض بعض ٹکڑے انجیل میں بھی ملتے ہیں (دیکھو متی ۲۵: ۲۵ تا ۴۵ ص ۴۷، ۴۸ آکسفورڈ) مگر دونوں کے ملانے سے وہی فرق نمایاں ہوتا ہے جو ناقص اور کامل میں ہونا چاہیے۔

فرشتوں پر ایمان

وَمَلٰٓئِکَتِہٖ (بقرہ ۲: ۲۸۵)

ملائکہ کا لفظ جمع ہے، اس کا واحد ملک ملاک اور مالک تین طرح سے مستعمل ہے، اس کے لغوی معنی قاصد اور ''رسول'' کے ہیں، اسی لئے قرآن پاک میں ملائکہ کے لئے رسل کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی ''قاصد'' اور ''پیام رساں'' کے ہیں، ان سے مراد وہ غیر مادی مگر مخلوق نیک ہستیاں یا ارواح ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب وعلل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں، اگر یہ عالم ایک مشین ہے تو ملائکہ اس کا انجن اور اس کے کل پرزوں کو حرکت دینے والی قوتیں ہیں، جو خدا کے مقررہ احکام اور قوانین کے مطابق ان کو حرکت دے رہے اور چلا رہے ہیں، یعنی وہ خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان پیام رسانی اور سفارت کی خدمت اس طرح انجام دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القا کرتا ہے اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس کو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں، ان کو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہے اور نہ ان کا کوئی ذاتی ارادہ ہے، وہ سرتاپا اطاعت ہیں اور خدا کے حکم سے سرِ مو تجاوز نہیں کرتے، گویا ان کی خلقت، اطاعت اور فرماں برداری کے لئے کی گئی ہے، دنیا پر رحمت یا عتاب جو کچھ نازل ہوتا ہے وہ ان ہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور خدا انبیا پر اپنے جو احکام اتارتا یا ان سے کلام کرتا ہے وہ ان ہی کی وساطت سے کرتا ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب بلکہ قدیم یونانی مصری فلسفہ میں بھی اس قسم کی ہستیوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے، صابئی مذہب میں یہ ستاروں اور سیاروں کی صورت میں مانے گئے ہیں، یونانی مصری (اسکندری) فلسفہ میں ان کا نام عقول عشرہ (دس عقلیں) رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی نو آسمانوں کے اندر بھی الگ الگ ذی ارادہ نفوس تسلیم کئے گئے ہیں، بلکہ خالص یونانی فلسفہ میں بھی بعض غیر مادی ارواحِ مجردہ کا پتہ لگتا ہے، جن میں سب سے اہم لوگس کا تخیل ہے جس سے مقصود وہ اولین ہستی ہے جس کو خدا نے تمام کائنات کی پیدائش کا ذریعہ اور واسطہ قرار دیا ہے اور جس کو اہلِ فلسفہ عقلِ اول سے تعبیر کرتے ہیں، پارسیوں میں ان ہستیوں کا نام ''امشاسپند'' ہے اور ان کی بے شمار تعداد قرار دی گئی ہے، یہودی

ان کو کروبیم کہتے ہیں اور ان میں سے خاص خاص کے نام جبریل اور میکائیل وغیرہ رکھتے ہیں، عیسائی بھی ان کو ان ہی ناموں سے یاد کرتے ہیں اور جبریل و روح القدس وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، ہندوؤں میں وہ دیوتاؤں اور دیبیوں کے نام سے روشناس ہیں، جاہل عرب ان کو خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے ہیں، بہرحال یہ تمام مختلف صحیح اور غلط نام ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں جس سے مراد وہ روحانی وسائط ہیں جو صانع و مصنوعات اور خالق و مخلوقات کے درمیان اس کے حکم کے مطابق عمل پیرا اور کار فرما ہیں۔

مذاہب سابقہ میں ان غیر مادی ذی روح مخلوق ہستیوں کی حیثیت نہایت مشتبہ تھی، وہ کبھی مخلوق کہی جاتی تھیں اور کبھی خدائی کے مرتبہ تک بھی بلند کر دی جاتی تھیں، ہندوؤں کے دیوتاؤں اور دیبیوں کی یہی کیفیت تھی، پارسیوں میں امشاسپند کا بھی یہی حال تھا، کہ کبھی ان کی حیثیت فرشتوں کی رہتی تھی، کبھی وہ خدا کے مقابل بن جاتی تھیں اور کبھی خود خدا ان میں سے ایک ہو جاتا تھا، ہندوؤں کی طرح پارسیوں میں بھی وہ قابل پرستش سمجھی جاتی تھیں، ان کے نزدیک سب سے عالی رتبہ امشاسپند ۶ تھے اور ان کے تحت میں ۳۳، پھر ان میں سے ہر ایک کے ماتحت ہزاروں تھے اور چوں کہ پارسی نیکی اور بدی کے دو متقابل خداؤں کے قائل تھے اس لئے دونوں کے ماتحت اچھے اور برے فرشتوں کی بے شمار تعداد تھی، نیکی کے فرشتے بہ راہ راست نیکی کی چیزوں کو اور برائی کے فرشتے مصیبتوں، ہلاکتوں اور برائیوں کو دنیا میں پیدا کرتے تھے اور اپنے اپنے خدا کی طرف سے ان اشیا پر حاکم سمجھے جاتے تھے، دونوں خدا اپنی اپنی فوجوں اور لشکروں کے پرے لے کر باہم نبرد آزما رہتے تھے، یہ بھی ان کا اعتقاد تھا کہ ہر امشاسپند یا نر فرشتہ کے ساتھ ایک یزد یعنی مادہ (فرشتہ) بھی ہوتی تھی جو اس کی بیوی تھی، ہندوؤں میں نر دیوتاؤں اور مادہ دیبیوں کا تصور تھا، مگر ان نر و مادہ ہستیوں میں کسی نر کو کسی مادہ سے خصوصیتِ خاص نہ تھی، بلکہ ہر ایک جنس کا ہر فرد دوسری جنس کے ہر فرد سے لطف اندوز ہو سکتا تھا، یہودیوں میں فرشتوں کی حیثیت ایسی تھی کہ ان کی تقدیس اور ثنا و صفت خدا سے مشتبہ ہو جاتی تھی، نظر آنے والے فرشتہ کی تعظیم کی جاتی تھی، اس کے آگے جھکا جاتا تھا اور اس کو خداوند کہہ کر اس طرح خطاب کیا جاتا تھا کہ کہیں کہیں یہ شبہہ ہو جاتا ہے کہ خدا مخاطب ہے یا فرشتہ (تکوین ۱۶، ۱۳، ۱۸، ۲، ۳، ۲۲ آکسفورڈ ۱۸۹۰ء) وہ کبھی کبھی خدا کے بیٹے بھی کہے جاتے تھے (تکوین ۶۔۲) عیسائیوں میں ان سے بعض مثلاً

روح القدس خدا کا ایک جز تسلیم ہو کر تثلیث کا رکن ہے۔

صابیوں میں فرشتوں کی قربانی کی جاتی تھی، ان کے ہیکل بنائے جاتے تھے اور ان کو مظہرِ خدا تسلیم کیا جاتا تھا، عربوں میں فرشتے مادہ سمجھے جاتے تھے، وہ خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارے جاتے تھے، ان کی پرستش ہوتی تھی اور سمجھا جاتا تھا کہ وہ خدا کے دربار میں سفارشی ہوں گے، یونانیوں میں عقلِ اول اور عقولِ عشرہ تمام عالم کے خالق، کارفرما اور مرجعِ کل مانے گئے اور خدا کو معطل ٹھہرایا گیا۔

اسلام نے آکر ان تمام عقائد کو مٹا دیا، خدائی اور ربوبیت کی ہر صفت سے وہ محروم بتائے گئے، ان کی پرستش ناجائز کی گئی، نر و مادہ کی مادی جنسیت سے وہ پاک کئے گئے اور انسانوں کو ان پاک مخلوقات کی غلامی و بندگی سے آزاد کیا گیا، ان کی تعداد بے شمار اور درجہ بندی کا کوئی تخیل باقی نہیں رکھا گیا، ان کی ہستی خدائے تعالیٰ کے سامنے ایک سراپا مطیع و فرماں بردار غلام کی قرار دی گئی، جس کا کام شب و روز صرف آقا کا حکم بجالانا ہے، عالم میں ان کا کسی قسم کا تصرف نہیں مانا گیا اور نہ نیکی و بدی کی دو تقسیمیں کی گئیں، نہ وہ الگ الگ جنس مخلوقات کے حاکم و منتظم قرار دیئے گئے، قرآن میں ان کی ہستی صرف اس قدر تسلیم کی گئی ہے کہ وہ غیر مادی ذی روح مخلوقات ہیں جن کا کام خدا کی حمد و ثنا اور اطاعت و فرماں برداری ہے، خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان وہ پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں، خدا کے حکم کے مطابق وہ مخلوقات کے کارخانہ کو چلا رہے ہیں لیکن اس چلانے میں خود ان کی ذاتی مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے، اسی لئے قرآن پاک نے یہودیوں کی طرح ان کو "خداوند" کا خطاب نہیں دیا، نہ پارسیوں کی طرح ان کو قابلِ پرستش کے لقب سے یاد کیا، نہ ہندوؤں کی طرح دیو اور دیوتا اور دیبی کہا، بلکہ صرف ملک اور رسول کے الفاظ استعمال کئے، جن کے لفظی معنی فرستادہ، قاصد، پیغام رساں اور ایلچی کے ہیں، بلکہ قرآن نے آغازِ خلقتِ انسانی کے قصہ میں یہ حقیقت واضح کر دی کہ ملائکہ اس لائق نہیں ہیں کہ آدم ان کو سجدہ کرے، بلکہ آدم میں یہ صلاحیت ہے کہ ملائکہ کا مسجود بنے، چنانچہ اس کو مرتبہ علم میں ان سے بالاتر ٹھہرایا گیا اور خدا کی جس تسبیح اور تقدیس کا ان کو دعویٰ تھا اس کے باوجود جب انسان کا جوہرِ طبیعت انہوں نے پہچانا تو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ:

سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ. (بقرہ۲:۳۲)	تو پاک ہے، ہم کو کوئی علم نہیں لیکن وہ جو تو نے ہم کو سکھایا، بے شک تو جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس قصہ نے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا کہ وہ ہستیاں جن کو دوسرے مذاہب نے انسانوں کا دیوتا، انسانوں کا خداوند اور کبھی خدا کا ہمسر اور متصرفِ مطلق قرار دیا تھا، اسلام میں ان کی حیثیت انسان کے مقابلہ میں کیا ہے؟ انسان اور فرشتے خدا کے سامنے برابر کے مخلوق اور بندے، یکساں عاجز و درماندہ ہیں، انسانوں کو مادی اشیا پر حکومت بخشی گئی ہے کہ اپنے نفع و نقصان کے لئے ان سے کام لے سکیں اور ملائکہ کو اپنے حضور میں متعین فرمایا گیا ہے کہ آسمان و زمین اور پوری مملکتِ الٰہی میں خدا کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کریں۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اسباب و علل کا ایک سلسلہ رکھا ہے جو ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے، لوگ ان ہی ظاہری اسباب و علل کو دیکھ کر دھوکہ کھاتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں، مثلاً آگ جلاتی اور روشن کرتی ہے، اس کو دیکھ کر آتش پرست اور مادہ پرست یقین کرتے ہیں کہ خود آگ میں جلانے کی طاقت ہے لیکن فرق یہ ہے کہ آتش پرست اس کے آگے سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور مادہ پرست گو اپنا سر اس کے آگے نہیں جھکاتے مگر ان کا دل جھک جاتا ہے، کیوں کہ وہ بھی ایمان رکھتے ہیں کہ یہ طاقت خود آگ کے اندر موجود ہے، کچھ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جلانے کی طاقت آگ میں نہیں ہے بلکہ اس کا ایک مستقل دیوتا یا فرشتہ ہے جو اس پر حکمراں ہے، یہ لوگ اس آگ کے فرماں روا کے سامنے جھکتے ہیں، اسلام کے نظریۂ توحید نے اس شرک کو بھی مٹایا اور بتایا کہ آگ اور آگ کا اگر کوئی فرشتہ ہے تو وہ کل کے کل اسی ایک رب العالمین اور فرماں روائے ارض و سما کے حکم کے تابع ہیں، اسی کے آگے جھکنا چاہیے اور اسی کی بندگی کرنی چاہیے۔

اسلام میں فرشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب ان نصوص سے مل سکتا ہے جو ان کے کاموں کے متعلق قرآن میں مذکور ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے مراد وہ غیر مادی ذی روح ہستیاں ہیں جو احکام اور پیغام الٰہی کو دنیائے خلق تک پہنچاتے اور نافذ کرتے ہیں اور وہ اسباب و علل جن کو مادہ پرست ذاتی طور سے موثر جانتے اور جن کو بت پرست دیوتاؤں کا کرشمہ سمجھتے ہیں ان کو فرشتے احکامِ الٰہی کے مطابق کام میں لگاتے اور مرضی الٰہی کو پورا کرتے ہیں۔

عقلی حیثیت سے یہ عقیدہ بھی اسی طرح قبول و انکار کے قابل ہے جس طرح عقلیات کے دوسرے عقائد اور نظریئے ہیں جن کی تصدیق یا تکذیب عقل کی دسترس سے باہر ہے، اس لئے اس

عقیدہ کو یہ کہہ کر کوئی رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ خلافِ عقل ہے، بلکہ جس طرح قیاسات اور عقلی نکتہ پردازی سے دوسرے عقلی مباحث کا فیصلہ کیا جاتا ہے ویسا ہی یہاں بھی کیا جا سکتا ہے، اشیا میں خصائص اور لوازم کے وجود اور ان کے اسباب وعلل کا مسئلہ عقلا میں ہمیشہ اختلافات کا دنگل رہا ہے اور یہ معما آج بھی اسی طرح لاینحل ہے جس طرح پہلے تھا، اس کا حل سائنس کی مادی تحقیقات اور تجربوں کی طاقت سے باہر ہے اور فلسفہ بھی اس کی گتھی کے سلجھانے سے عاجز ہے، اس لئے اگر حکمائے ملحدین کی شاہ راہ سے الگ ہٹ کر اس کے حل کی کوئی صورت اربابِ مذاہب نے نکالی ہے تو وہ محلِ اعتراض نہیں ہو سکتی اور نہ خلافِ عقل کہی جا سکتی ہے، کائنات کے حوادث میں جس طرح مادی علل واسباب کارفرما ہیں اسی طرح ان سے بالاتر روحانی علل واسباب بھی ساتھ ساتھ کارفرما ہیں اور ان دونوں قسم کے اسباب کے توافق سے حوادث کا وجود ہوتا ہے، یہی سبب ہے کہ انسان اکثر مادی علل واسباب کے موجود ہونے یا نہ ہونے کے باوجود کامیاب یا ناکام ہوتا ہے اور اس کا نام بخت و اتفاق رکھتا ہے، حالانکہ مسئلہ علل واسباب کو مان لینے کے بعد بخت واتفاق کوئی چیز نہیں رہ جاتا، یہی روحانی علل واسباب ہیں جن کا سررشتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے ان فرشتوں کو سپرد کیا ہے جو فرماں بردار چاکروں کی حیثیت سے نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں، ہمارے اور دوسرے متکلمین اور حکما کے اصطلاحات میں فرق یہ ہے کہ وہ ملائکہ کی تعبیر اسباب وعلل کے ''قوائے طبعی'' سے کرتے ہیں اور ہم ''قوائے روحانی'' سے۔

اس تقریر کا یہ منشا نہیں ہے کہ اشیا میں خواص وطبائع اور اس مادہ کی مملکت میں مقرر طبعی اصول و قوانین موجود نہیں ہیں، بلکہ مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی اندازہ (تقدیر) کے مطابق ہر چیز کے خصائص وطبائع اور اصول وقوانین مقرر کر کے ملائکہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کو ان ہی اصول وطبائعِ مقررہ کے مطابق چلاتے رہیں۔

سمجھنے کے لئے اس کی صحیح مثال خود انسان بلکہ ہر جان دار ہستی ہے، مخلوقات کی دو قسمیں ہیں، ذی روح اور غیر ذی روح، ذی روح مخلوقات کے اکثر افعال وحرکات اس کی روح کی ارادی قوت کی وساطت سے انجام پاتے ہیں، وہی روح اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضا بلکہ ہر عضو کے ایک ایک رگ وریشہ پر حکم راں اور مسلط ہے، بایں ہمہ وہ روح اصولِ مقررہ کے تحت ہی اعضا سے

کام لیتی ہے اور ان اصول سے باہر نہیں جاتی، اسی طرح غیر ذی روح اشیا میں ابر و باد سے لے کر دریا، پہاڑ، چاند اور سورج تک پر ارواح مقرر ہیں جو ان اشیا سے خدا کے اصولِ مقررہ کے مطابق یکساں افعال و حرکات کا صدور کراتی ہیں، جس طرح ہماری روح اپنے اعضا اور اعضا کے ذریعہ سے مادہ میں جو تغیرات پیدا کرتی ہے وہ اشیا کے مقررہ خواص و طبائع کے سہارے پر کرتی ہے، اسی طرح ملائکہ بھی ان ہی مقررہ خواص و طبائع کے ذریعہ اپنے مفروضہ فرائض انجام دیتے ہیں۔

الغرض جس طرح ہمارے ارادی افعال اور حکم الٰہی کے درمیان ہماری انسانی ارواح و نفوس واسطہ ہیں اسی طرح تمام عالمِ مخلوقات اور کائنات کے افعال اور حکم الٰہی کے درمیان یہ ملکوتی ارواح اور نفوسِ مجردہ واسطہ ہیں اور جس طرح ہماری انسانی ارواح کی اس وساطت سے خدا کی حکومت علی الاطلاق پر کوئی اعتراض نہیں واقع ہوتا، اسی طرح ان ملکوتی ارواح کی وساطت سے بھی خدا کی علی الاطلاق حکومت میں کوئی نقص نہیں واقع ہوتا، یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے ارادی افعال میں اختلافات کی اتنی نیرنگیاں نظر آتی ہیں مگر عالمِ کائنات کے جو نوعی افعال ہیں ان میں اختلافات اور نیرنگیوں کے بجائے یک سانی، ہم رنگی اور عدمِ اختلاف پایا جاتا ہے؟ کیوں کہ انسان نے ارادہ پاکر کسی قدر ذاتی اختیار پالیا ہے اور یہی ذاتی اختیار اس کے افعالِ اختیاری کی ذمہ داری، باز پرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے اور جس کی بنا پر وہ اپنی اطاعت کے ذریعہ سے ثواب اور عصیان کر کے عتاب کا مستحق ہو جاتا ہے، مگر دنیا کی یہ ملکوتی ارواحِ مجردہ یعنی یہ ملائکہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے تمام تر محروم ہو کر صرف اطاعت، فرماں برداری اور انقیاد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، اس لئے ان میں عصیان، تمرد، سرکشی اور حکم الٰہی سے انحراف کی کوئی صلاحیت نہیں ہے، اسی بنا پر اشیا کے تمام نوعی افعال و حرکات اور خصائص میں یک سانی، ہم رنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے، یہی حقیقت ہے جو فطرت، طبیعت اور نوعی خاصیت کی اصطلاحات کی صورتوں میں ہمارے لئے دھوکے اور اشتباہ کا باعث بن گئی ہے۔

۱۔ اب ہم کو تعلیماتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی آیات و احادیث سے ملائکہ کی حیثیت کو روشن کرنا چاہیے، ملائکہ کی سفارت و پیام رسانی، یعنی خالق کے احکام اور مرضی کو مخلوقات تک پہنچانا اور اس کام میں ان کا بے اختیار ہونا، ان دو آیتوں سے ثابت ہوتا ہے:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ — خدا ہی ہے جو فرشتوں اور آدمیوں میں سے پیام رساں اور

النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ . يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ. (الحج ۲۲: ۷۵-۷۶)	قاصد منتخب کرتا ہے، بے شک خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے اور وہ ان کے آگے اور پیچھے کا حال جانتا ہے اور تمام کاموں کا مرجع خدا ہی ہے۔

یعنی پیام رسانی اور سفارت کے سوا ان کو اصل حکم میں کوئی دخل نہیں ہے، اختیارات سب خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی تمام امور اور انتظامات کا مرجعِ کل ہے، دوسری جگہ ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (فاطر ۳۵: ۱-۲)	حمد ہو اس خدا کی جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور فرشتوں کو دو دو تین تین اور چار چار شہ پر بازوؤں والے پیام رساں بنانے والا ہے، وہ پیدائش میں جو چاہے بڑھا دے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ لوگوں کے لئے رحمت کھولے تو کوئی اس کا روکنے والا نہیں اور جو روک دے تو اس کے سوا کوئی چھوڑنے والا نہیں اور وہی غالب دانا ہے

اس آیت پاک میں بھی یہی حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ ملائکہ سفارت اور درمیانگی کے علاوہ اور کوئی اختیار نہیں رکھتے، رحمت کے دروازوں کا کھولنے والا اور بند کرنے والا صرف خدا ہے، یہ تعلیم اس غلط عقیدہ کی تردید کرتی ہے کہ فرشتوں کو دنیا کی حکم رانی اور انتظامات میں کوئی ذاتی دخل ہے، یا ان میں الوہیت اور ربوبیت کا کوئی شائبہ ہے، یا وہ پرستش کے قابل ہیں، یا ان کی دہائی بھی پکارنی چاہیے۔

۲۔ ملائکہ خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتے ہیں:

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (انفال ۸: ۱۲)	(یاد کرو) جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔
تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ. (قدر ۹۷: ۴)	اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے ہر کام کو لے کر نیچے اترتے ہیں۔

وہ جس طرح احکام لے کر اترتے ہیں، اسی طرح دربارِ الٰہی تک عروج بھی کرتے ہیں:

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ (معارج ۷۰: ۴)	فرشتے اور روح اس تک چڑھتے ہیں۔

موت کے وقت روح کا قبض کرنا، ان ہی سے متعلق ہے:

قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (سجدہ ۳۲:۱۱)
کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے وہ تم پر موت طاری کرے گا۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (انعام ۶:۹۳)
اور اگر دیکھو تم جب گنہ گار موت کے سکرات میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوں کہ نکالو اپنی جانوں کو۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ (انفال ۸:۵۰)
اور اگر دیکھو جب فرشتے کافروں کو موت دے رہے ہوں۔

اسی کے ہم معنی اور بھی کئی آیتیں ہیں جن سے ظاہر ہے کہ حکم الٰہی کے مطابق موت وفنا کی تدبیر علل واسباب کی ان ہی روحانی قوتوں سے متعلق ہے۔

دنیا میں کسی شے کے وجود، انقلاب اور فنا کے لئے کسی ایک علت وسبب کا وجود کافی نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ اس کے متعلقہ علل واسباب کی تمام کڑیاں باہم پیوستہ اور ایک دوسرے کی معاون ہوں اور موانع اور عوائق معدوم ہوں، یہ متعلقہ علل واسباب کا توافق اور موانع کا انسداد ہی تدبیر ہے جو بہ حکم الٰہی ملائکہ کے سپرد ہے(۱) اس تدبیر کو کبھی اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے، يُدَبِّرُ الْاَمْرَ (رعد ۱۳:۲) (وہ کام کی تدبیر کرتا ہے) اور کبھی ملائکہ کی طرف:

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۔ وَّ النّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۔ وَّ السّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۔ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۔ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۔ (نازعات ۷۹:۱-۵)
ڈوب کر (روحوں کے) کھینچنے والوں کی قسم ہے۔ (رگوں کی) گرہوں کے کھولنے والوں کی قسم ہے، (اس فضائے آسمانی میں) تیرنے والوں کی، پھر دوڑ کر (مادی اسباب وعلل پر سے) آگے بڑھ جانے والوں کی، پھر کام کی تدبیر کرنے والوں کی (قسم ہے)۔

یہی ملائکہ خدا اور رسول کے درمیان بھی سفیر ہیں:

اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (شوریٰ ۴۲:۵۱)
یا خدا (آدمی سے اس طرح باتیں کرتا ہے کہ اپنا) ایک سفیر بھیجتا ہے تو وہ اس (خدا) کی اجازت سے جو وہ (خدا) چاہتا ہے وحی کرتا ہے

---

(۱) صحیح بخاری کتاب بدء الخلق باب ذکر الملٰئکۃ ج ۱ ص ۴۵۵ میں ہے کہ رحم نسوانی پر ایک فرشتہ مقرر ہے، جو بچہ کی نسبت قضائے الٰہی کو تحریر کرتا ہے۔

دوسری جگہ ہے:

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (نحل ۱۶:۲) خدا روح کے ساتھ فرشتوں کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے۔

خاص آنحضرت ﷺ کے متعلق ہے:

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (بقرہ ۲:۹۷) بس اس (جبریل فرشتہ) نے (قرآن) کو خدا کے حکم سے تمہارے دل پر اتارا۔

۴۔ یہ لوگوں پر بشارت اور عذاب لے کر بھی اترتے ہیں:

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى (ھود ۱۱:۶۹) ہمارے سفیر ابراہیم کے پاس بشارت لے کر اترے۔

اسی طرح حضرت زکریا اور حضرت مریم علیہا السلام کو انہوں نے بشارت دی:

اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (مریم ۱۹:۹) میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں کہ تجھے ایک پاک لڑکا بخشوں۔

حضرت لوطؑ کے پاس ان کی قوم کی بربادی کے لئے آئے اور:

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ (ھود ۱۱:۸۱) کہا اے لوط ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد یہ فرشتے حضرت لوطؑ کی قوم پر کوہِ آتش فشاں کا منہ کھول دیتے ہیں اور تمام قوم برباد ہو جاتی ہے، یہ کام اگرچہ فرشتوں نے انجام دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو خود اپنی طرف منسوب کیا ہے، کیونکہ وہ فرشتوں کے ذاتی اختیار کے بجائے خدا ہی کے حکم سے ہوا تھا:

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ (ھود ۱۱:۸۲) تو جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اس کے اوپر کو نیچے کر دیا (یعنی زمین الٹ دی) اور اس پر تہ بہ تہ پتھروں کی بارش کی۔

۵۔ فرشتے انسانوں کے اعمال کی نگہ بانی اور نگرانی کرتے ہیں اور ان کے ثواب اور گناہ کے کاموں کو محفوظ رکھتے ہیں:

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ. كِرَامًا كَاتِبِيْنَ. بے شک تم پر نگہ بان ہیں جو بزرگ ہیں لکھنے والے ہیں جو

يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ. (انفطار ۸۲: ۱۰-۱۲)

تم کرتے ہو اس کو وہ جانتے ہیں۔

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ. (ق ۵۰: ۱۸)

کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا لیکن اس کے پاس ایک نگہبان حاضر ہے۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ. لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (رعد ۱۳: ۱۰، ۱۱)

تم میں سے کوئی بات چھپا کر کہے، یا زور سے کہے یا وہ رات میں چھپے یا دن کو کرے، خدا کے تعاقب کرنے والے اس کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے خدا کے حکم سے اس کی نگرانی کرتے ہیں۔

وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ. (الانعام ۶: ۶۱)

اور وہ (خدا) تم پر نگراں بھیجتا ہے یہاں تک کہ تم میں سے جب کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے قاصد اس کی عمر پوری کرتے ہیں اور وہ (اپنے اس کام میں) کمی نہیں کرتے۔

۶۔ وہ انسانوں کے اعمال کے مطابق ان پر خدا کی رحمت یا لعنت کے نزول کا ذریعہ اور واسطہ ہیں:

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ. (انبیاء ۲۱: ۱۰۳)

نیکو کاروں کو وہ بڑی گھبراہٹ (قیامت) غمگین نہ کرے گی اور فرشتے ان کا آگے بڑھ کر استقبال کریں گے (کہ) یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ. نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِى الْاٰخِرَةِ (فصلت ۴۱: ۳۰، ۳۱)

جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے اتریں گے کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کی خوش خبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، ہم ہیں جو تمہاری پہلی اور اس دوسری زندگی میں تمہارے رفیق ہیں۔

هُوَ الَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ (احزاب ۳۳: ۴۳)

وہی خدا تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِىِّ (احزاب ۳۳: ۵۶)

اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔

وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ (شوریٰ ۴۲:۵)	اور جو زمین میں ہیں ان کے لئے وہ خدا سے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔

اسی طرح وہ بدکاروں پر لعنت بھی کرتے ہیں:

أُولَٰئِكَ جَزَآؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَٰئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ. (آل عمران ۳:۸۷)	ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔
إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَٰئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ. (بقرہ ۲:۱۶۱)	جو کفر کی حالت میں مر گئے ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔

۷۔ جنت اور دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے زیر اہتمام ہوگا:

وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ (زمر ۳۹:۷۱)	اور کفر کرنے والے گروہ در گروہ کر کے دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے چوکیدار (فرشتے) کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تم ہی میں کے پیغمبر نہیں آئے۔
وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ. (زمر ۳۹:۷۳)	اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے وہ گروہ در گروہ جنت میں لے جائے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے پاسباں کہیں گے، تم پر سلامتی ہو خوش خوش جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ۔
وَالْمَلَٰئِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِم مِّن كُلِّ بَابٍ. سَلَٰمٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ. (رعد ۱۳:۲۳،۲۴)	اور ان (جنتیوں) پر فرشتے ہر دروازہ سے داخل ہو کر کہیں گے تم پر سلامتی ہو، یہ تمہارے صبر کا بدلہ ہے، یہ کیسا اچھا عاقبت کا گھر ہے۔
عَلَيْهَا مَلَٰئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ (تحریم ۶۶:۶)	اس (دوزخ) پر سخت دل، طاقت ور فرشتے مقرر ہیں۔

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً (مدثر۷۴:۳۱) — اور ہم نے دوزخ کا اہل کار فرشتوں ہی کو بنایا ہے۔

۸۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ قدس کے حاضر باش ہیں:

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ. (زمر۳۹:۷۵) — اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے اردگرد احاطہ کیے ہوئے اپنے پروردگار کی حمد وثنا میں مصروف ہوں گے۔

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى (صٰفّٰت۳۷:۸) — اعلیٰ اہل دربار کی باتیں وہ (شیاطین) نہیں سن سکتے۔

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ. (ص۳۸:۶۹) — مجھے خدا کے بلند درباریوں کا علم نہیں جب وہ باتیں کرتے ہیں۔

قیامت کے دن بھی یہ تختِ الٰہی کے حامل اور اس بارگاہ کے حاضر باش ہوں گے، جو ہر وقت اس کے ہر حکم کو بجالانے کے لئے تیار رہیں گے:

وَالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۭ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ. (حاقہ۶۹:۱۷) — اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور تیرے پروردگار کے تخت کو آٹھ (فرشتے) اس دن اوپر اٹھائے ہوں گے۔

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا. (الفجر۸۹:۲۱،۲۲) — ہرگز نہیں جب زمین ریزہ ریزہ کردی جائے گی اور تیرا رب تشریف فرما ہوگا اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے۔

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا. (نبا۷۸:۳۸) — جس دن روح اور فرشتے صف باندھے کھڑے ہوں گے۔

۹۔ فرشتے خدا سے سرکشی اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے، ہمیشہ اس کی تہلیل و تقدیس اور حمد وثنا میں مصروف رہتے ہیں، اس کے جلال وجبروت سے ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں اور اس کے حضور میں اہلِ زمین کے لئے عموماً اور نیکوکاروں کے لئے خصوصاً مغفرت کی دعا مانگا کرتے ہیں:

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ. (شوریٰ۴۲:۵) — اور فرشتے حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور زمین والوں کی بخشایش کی دعا مانگا کرتے ہیں، ہشیار کہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا خدا ہی ہے۔

یعنی یہ دھوکا نہ ہو کہ فرشتوں کی دعا ہی رحمت و برکت کا ذاتی سبب ہے، بلکہ بخشش اور رحمت کرنے والا صرف وہی خدائے واحد ہے اور یہ بخشش و رحمت اسی کے دستِ اختیار میں ہے:

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (مومن ۴۰:۷)	جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہیں اور جو اس کے پاس ہیں وہ سب اپنے پروردگار کی حمد اور تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کی بخشائش کی دعا کرتے ہیں۔
وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا یَسْتَحْسِرُوْنَ. یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ. (انبیاء ۲۱:۱۹،۲۰)	آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی ہے اسی کا ہے اور جو اس کے پاس ہیں (یعنی فرشتے) وہ اس کے سامنے اپنی عبودیت کے اظہار سے غرور نہیں کرتے اور نہ اس کی عبادت سے تھکتے ہیں، وہ رات دن خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اور سست نہیں پڑتے۔
بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ. لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ.......... وَهُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ. (انبیاء ۲۱:۲۶-۲۸)	بلکہ وہ بزرگ بندے ہیں جو بات میں اس (خدا) پر پیش دستی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں...... اور وہ اس کے خوف سے ترساں رہتے ہیں۔
لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ. (تحریم ۶۶:۶)	خدا ان کو جس بات کا حکم دیتا ہے وہ اس میں اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم دیا جاتا ہے۔
وَیُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ (رعد ۱۳:۱۳)	اور بجلی کی کڑک اور فرشتے خدا کی ڈر سے اس کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔
وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ. یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ. (سجدہ) (نحل ۱۶:۴۹،۵۰)	اور آسمانوں میں اور زمین میں جو چار پائے اور فرشتے ہیں وہ سب خدا کو سجدہ کرتے ہیں اور اس کے سامنے اپنی بڑائی نہیں کرتے وہ اپنے مالک سے جو ان کے اوپر ہے ڈرتے رہتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔

گذر چکا ہے کہ ملائکہ کا اعتقاد دنیا کے تمام مذہبوں اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح رہا ہے لیکن ان کے اس اعتقاد میں بہت سی باتیں ایسی داخل تھیں جو توحید کامل کے منافی تھیں، اسکندریہ کے نوافلاطونی فلسفہ کے رو سے عقلِ اول کی اضطراری پیدائش کے بعد خدا کو معطل ہو جانا پڑا اور فرشتوں کو عقول کی صورت میں اصلی کارفرما قرار دیا گیا تھا، عراق کے صابئی اجرام سماوی کی شکل میں ان کی

پرستش کرتے تھے اور ان ہی کو عالم کا فرماں روا مانتے تھے، یہود بھی ان کو کسی قدر صاحب اختیار تصور کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کو خداؤں کا درجہ دیتے تھے جیسا کہ توراۃ (صحیفۂ تکوین ۱۶، ۱۳، و ۱۸، ۲، ۳ و ۲۲،) کے قصوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے، ان کو وہ ''خدا کے بیٹوں'' کے خطاب سے بھی کبھی کبھی یاد کرتے تھے۔ (تکوین ۶:۲) ہندوؤں میں وہ دیوتا اور دیبی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے اور دوسری طرف اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے چھوٹے خداؤں کے مرتبہ پر بھی فائز تھے، عیسائی ان میں سے بعض مثلاً روح القدس کو خدا کا ایک جز تسلیم کرتے تھے اور یہ تثلیث کا ایک رکن تھا، عربوں میں فرشتے خدا کی بیٹیوں کا درجہ رکھتے تھے، وہ ان کی پوجا کرتے اور ان کو اپنے گناہوں کا شفیع سمجھتے تھے۔

تعلیم محمدی ﷺ نے ان تمام عقائد باطلہ کو مٹا دیا اور ایک ایک کر کے ان میں سے ہر عقیدہ کی تردید کر دی اور بتایا کہ فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں، ان کو خدائی کا کوئی اختیار حاصل نہیں، وہ صرف خدا کی اطاعت، عبادت اور اس کے احکام کی بجا آوری میں مصروف رہتے ہیں، ان میں سے جس کے جو کام سپرد ہے وہ اسی کو انجام دیتا ہے، وہ ہماری ہی طرح بندۂ محض ہیں، وہ نہ عبادت کے مستحق ہیں، نہ خدا کے بے اذن وہ شفاعت کا ایک حرف زبان سے نکال سکتے ہیں اور نہ خدا کے سامنے کچھ عرض کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں، یہودی ان کو خدا کے بیٹے اور عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، قرآن نے دونوں کی تردید کی اور بتایا کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں، وہ نہ مرد ہیں نہ عورت ہیں، نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں اور نہ خدائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں، وہ خدا کے خوف سے ہمیشہ کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ. لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ. يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ. وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّیْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِيْنَ. (انبیاء۲۱: ۲۶-۲۹)	مشرکوں نے کہا کہ مہربان خدا نے اپنا لڑکا بنایا ہے، وہ اس سے پاک ہے، بلکہ یہ (فرشتے) اس کے معزز بندے ہیں، جو بات میں اس پر پیش دستی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں، خدا اس سے جو ان کے آگے اور پیچھے ہوتا ہے واقف ہے، وہ شفاعت نہیں کرتے لیکن اسی کی جس کے لئے خدا پسند کرتا ہے اور وہ خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں اور ان میں سے جو یہ کہے کہ میں خدا

ہوں تو اس کو بھی اسی طرح ہم جہنم کی سزا دیں گے ایسے ہی ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔

اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ط سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا . لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ط وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا. (نساء۴:۱۷۱-۱۷۲)

خدا تو ایک ہی ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو، آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اس کی ملکیت ہے اور خدا کا وکیل ہونا کافی ہے، مسیح کو اس سے عار نہ ہوگا کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور نہ مقرب فرشتوں کو (اس سے عار ہے) اور جو لوگ اس کی عبادت سے عار اور غرور کریں گے تو وہ ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ط اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ. (آل عمران۳:۸۰)

خدا اس کا حکم تم کو نہیں دیتا کہ تم فرشتوں کو اور پیغمبروں کو خدا بناؤ کیا تم کو مسلمان ہونے کے بعد کفر کرنے کا حکم دے گا۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ. قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ط بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ط اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ (سبا۳۴:۴۰،۴۱)

اور جس دن وہ سب کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ مشرکین تمہیں کو پوجتے تھے، وہ کہیں گے پاک ہے تو، تو ہمارا والی ہے، وہ نہیں ہیں، بلکہ وہ جنوں کو پوجتے تھے، وہ اکثر ان ہی جنوں پر ایمان لائے ہیں۔

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ط لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا. (نبا۷۸:۳۸)

جس دن روح اور فرشتے صف بستہ خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے، تو کچھ بول نہ سکیں گے لیکن وہ جس کو وہ مہربان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے۔

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى. (نجم۵۳:۲۶)

اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی لیکن اس کے بعد کہ خدا جس کو چاہے اجازت دے اور پسند کرے۔

اَفَاَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ط اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا. وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ط وَ

کیا تمہارے لئے خدا نے بیٹوں کو پسند کیا اور خود فرشتوں میں سے لڑکیاں اپنے لئے پسند کیں، تم یقیناً بہت بڑی بات منہ سے نکالتے ہو اور ہم نے اس قرآن میں پھیر پھیر

مَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا. قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا. سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا. تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ.

(بنی اسرائیل ۱۷: ۴۰-۴۴)

کر سمجھنے کو باتیں بیان کی ہیں، لیکن یہ ان کی نفرت کو اور بڑھاتا ہے، کہہ دو اے پیغمبر کہ اگر اس ایک خدائے برحق کے ساتھ اور بھی چند خدا ہوتے تو اس تخت والے خدا کی طرف وہ راستہ ڈھونڈتے (کہ اس کے ہاتھ سے حکومت چھین کر خود قبضہ کر لیں) یہ مشرک جو کہتے ہیں خدا اس سے بلند و برتر ہے، ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے وہ اس کی تسبیح پڑھتے ہیں۔

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ۭ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ۭ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْــَٔـلُوْنَ. وَقَالُوْا لَوْ شَاۗءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ۭ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۤ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ.

(زخرف ۴۳: ۱۹، ۲۰)

اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں، عورتیں بنا دیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے، ہم ان کی گواہی لکھیں گے اور ان سے اس کی باز پرس کی جائے گی اور انہوں نے کہا کہ اگر خدا چاہتا تو ہم ان (فرشتوں) کو نہ پوجتے انہیں اس کا (تحقیقی) علم نہیں، وہ صرف انکل لگاتے ہیں۔

قرآن پاک میں اس مفہوم کی اور بہت سی آیتیں ہیں مگر یہاں استقصا مقصود نہیں۔

یہودیوں کا خیال تھا کہ فرشتے کھاتے پیتے بھی ہیں، چنانچہ توراۃ میں جہاں حضرت ابراہیمؑ کے پاس فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے، یہ بھی مذکور ہے کہ ”ابراہیم نے ان کے لئے دعوت کا سامان کیا اور انہوں نے کھایا“۔ (تکوین ۱۸، ۸ آکسفورڈ ۱۸۹۰ء) لیکن قرآن پاک نے اس قصہ کو دہرا کر یہ تصریح کر دی ہے کہ فرشتے انسانی ضرورتوں سے پاک ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے ان کے لئے دعوت کا سامان کیا مگر:

فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ.

(ہود ۱۱: ۷۰)

جب ابراہیم نے دیکھا کہ وہ کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے تو اس کو وہ انجان معلوم ہوئے اور دل میں ڈرا، انہوں نے کہا ڈرو نہیں، ہم لوط کی قوم کی طرف (ان کے تباہ کرنے کے لئے) بھیجے گئے ہیں۔

کفارِ قریش کا مطالبہ تھا کہ انسان کے بجائے کوئی فرشتہ پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا، اس

کے جواب میں کہا گیا:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ. (انعام ۶:۹)

اور اگر ہم پیغمبر کو فرشتہ بنا کر بھیجتے (آدمیوں کے لئے) تو اس کو آدمی ہی بناتے اور جس شبہہ میں اب ہم نے ان کو ڈالا ہے اسی میں وہ پھر بھی پڑے رہتے یعنی یہی کہتے کہ تم فرشتہ نہیں ہو بلکہ آدمی ہو۔

اس آیت اور دوسری آیتوں سے ملکوتیت اور بشریت کی قوتوں کا اختلاف ظاہر ہے، تاہم فرشتے کبھی کبھی عارضی طور سے انسان کے مثالی لباس میں بھی جلوہ گر ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت مریم علیہا السلام وغیرہ کے قصوں میں ہے:

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا. (مریم ۱۹:۱۷) وہ فرشتہ ایک اچھے خاصے بشر کی مثالی صورت میں ظاہر ہوا۔

یہی وہ صورت تھی جس میں حضرت ابراہیمؑ کو فرشتوں کے انسان ہونے کا دھوکا ہوا اور ان کے لئے دعوت کا سامان کیا، مگر یہ دھوکا جلد رفع ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ وہ انسان کی مثالی صورت میں فرشتے ہیں۔

ان تمام تفصیلات کے بعد یہ غور کرنا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانے سے اسلام کا کیا مقصود ہے، حقیقت میں اس سے دو باتیں مقصود ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بت پرست اقوام اور دوسرے اہلِ مذاہب میں ان فرشتوں کو خدائی کا جو مرتبہ دیا گیا تھا اس غلط عقیدہ کو مٹا کر یہ حقیقت ظاہر کی جائے کہ ان کی حیثیت بے اختیار محکوم بندہ کی ہے، جب تک اس کی تصریح نہ ہوتی کلمۂ توحید کی تکمیل ممکن نہ تھی۔

۲۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ مادہ کے خواص وطبائع کو دیکھ کر مادہ پرست جو ان مادی خواص وطبائع کی بالذات کارفرمائی کا یقین کرتے ہیں اس کا ازالہ کیا جائے، کیوں کہ یہی پتھر ان کی ٹھوکر کا باعث ہوتا ہے اور بالآخر خدا کے انکار تک ان کو لے جاتا ہے، درحقیقت ان مادی خواص وطبائع پر روحانی اسباب مسلط ہیں، جو خدا کے حکم سے اس کے مقررہ اصول کے مطابق نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں، مادہ اور اس کے خواص بالذات موثر نہیں، بلکہ کوئی دوسرا ہے جو اپنے ارواحِ مجردہ کے ذریعہ سے ان کو موثر بناتا ہے، اس عقیدہ سے مادیت کا بت ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جاتا ہے، غرض منزہ خالق اور مادی مخلوق کے درمیان احکام وشرائع کا نزول اور قدرتِ الٰہی کے افعال کا صدور ان محکوم ارواحِ مجردہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔

رسولوں پر ایمان

وَرُسُلِہٖ (بقرہ ۲:۲۸۵)

یہ عقیدہ اسلام کی ان خصوصیات میں سے ہے، جن کی تکمیل صرف اسی کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے، آنحضرت ﷺ کے وجودِ مبارک سے پہلے دنیا کی ہر قوم کو بجائے خود یہ خیال تھا کہ وہی اللہ تعالیٰ کی خاص محبوب اور پیاری ہے، تمام دنیا کی قوموں میں ہدایتِ ربانی کے لئے وہی منتخب کی گئی ہے، اس کے علاوہ دنیا کی تمام قومیں اس فیض سے قطعاً محروم ہیں اور رہیں گی، اسی کی سرزمین دیوتاؤں اور دیبیوں کا مسکن اور اسی کی زبان خدا کی خاص مقدس زبان ہے، بابل ونینوا ہو یا مصر و یونان، ایران ہو یا آریہ ورت ہندوستان، ہر ملک کے لوگوں کو بجائے خود تنہا خدا کی مقدس اور برگزیدہ مخلوق ہونے کا دعویٰ تھا اور وہ صرف اپنے کو خدا کے پیغام اور خطاب سے مشرف ہونے کا مستحق جانتے تھے، لیکن تعلیمِ محمدی ﷺ نے تنگ خیالی کے اس محدود دائرہ کو دنیا کی عظیم الشان وسعت سے بدل دیا، آپ ﷺ نے یہ سکھایا کہ دنیا کی تمام قومیں خدا کی نظر میں یکساں ہیں، نہ عرب کو عجم پر اور نہ عجم کو عرب پر فضیلت ہے، اور نہ کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر کوئی تقدم حاصل ہے، (۱) ساری زمین خدا کی ہے اور تمام قومیں ایک خدا کی مخلوق ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا لوگو! تم سب ایک ہی باپ (آدم) کی اولاد ہو اور وہ مٹی سے پیدا ہوا تھا (۲) اسی طرح یہ بھی تعلیم دی کہ انسانوں اور قوموں کا امتیاز رنگ روپ، ملک و مرز و بوم اور زبان سے نہیں ہے بلکہ صرف تقویٰ اور نکوکاری سے ہے۔ (۳)

اس تعلیم کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں اور ملکوں کی فطری فضیلت کی پرانی داستان فراموش ہوگئی، دنیا کی تمام قومیں ایک سطح پر آگئیں اور مساواتِ انسانی کا راستہ صاف ہوگیا، بنی اسرائیل جن کو خدا کا کنبہ ہونے پر ناز تھا، وحیِ محمدی ﷺ نے ان کی اس حیثیت کے تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور کہا:

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ (مائدہ ۵:۸۱) بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے بشر ہو۔

بنی اسرائیل کو دعویٰ تھا کہ نبوت اور پیغمبری صرف ہمارے خاندان کا ورثہ ہے جس طرح اس

---

(۱) مسند احمد بن حنبل، از ابونضرہ تابعی ج ۵ ص ۴۱۱ (۲) جامع ترمذی آخر کتاب المناقب فی ثقیف و بنی حنیفہ ج ۲ ص ۲۳۲ (۳) قرآن، اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ (حجرات ۴۹:۱۳)

آریہ ورت کا دعویٰ ہے کہ خدا کی بولی صرف یہیں کے رشیوں اور منیوں نے سنی، جو وید کے اوراق میں محفوظ ہے، اسی طرح دوسری قوموں کو بھی اپنی اپنی جگہ پر یہی خیال تھا، اسلام نے اس تخصیص کو خدا کے انصاف و عدل و کرم اور رحمتِ عام کے منافی قرار دیا اور کہہ دیا:

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ. (جمعہ ۶۲:۴)	یہ (نبوت) اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہے دے اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے۔
قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ. يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ. (آل عمران ۳:۷۳، ۷۴)	کہہ دو کہ ہدایت اللہ کی ہدایت ہے (اسرائیلی علما اپنے ہم مذہبوں سے کہتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ) جیسا دین تم کو دیا گیا کسی اور کو دیا جائے، یا یہ نئے دین والے تم سے خدا کے آگے جھگڑ سکیں، کہہ دو کہ (یہ نبوت کا) فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے اس کو دیتا ہے اور اللہ کی رحمت سب پر عام ہے اور وہ مصلحتوں کو اچھی طرح جانتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ مخصوص کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔
مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ. (بقرہ ۲:۱۰۵)	اہلِ کتاب میں جو منکر ہیں وہ یہ نہیں پسند کرتے اور نہ مشرکین پسند کرتے ہیں کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے مخصوص کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

اس نے یہ تعلیم دی کہ روئے زمین کی ہر آبادی میں، ہر قوم میں اور ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی راہ دکھانے والے، اس کی آواز پہنچانے والے اور انسانوں کو ان کی غفلت سے چونکانے والے پیغمبر یا نائب پیغمبر آئے اور یہ سلسلہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک برابر جاری رہا۔

بعثتِ محمدیؐ سے پہلے دنیا کی کل آبادی مختلف گھرانوں میں بٹی ہوئی اور ایک دوسرے سے نا آشنا تھی، ہندوستان کے رشیوں اور منیوں نے آریہ ورت سے باہر کی دنیا کو خدا کی آواز سننے کا کبھی مستحق نہیں سمجھا تھا، ان کے نزدیک پرمیشور صرف آریہ ورت کی ہدایت اور رہنمائی کا خواہاں تھا، زردشت

نے پاک نژادانِ ایران کے سوا سب کو یزداں کے جلوۂ نورانی سے محروم یقین کیا تھا، بنی اسرائیل اپنے خانوادہ کے سوا کہیں اور کسی نبی یا رسول کی بعثت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، عیسائی صرف اپنے کو خدا کی فرزندی کا مستحق سمجھتے تھے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے آکر بتایا کہ خدا کی ہدایت اور رہنمائی کے ظہور کے لئے کسی ملک، قوم اور زبان کی تخصیص نہیں، اس کی نگاہ میں عرب و عجم، شام و ہند سب برابر ہے، محمد رسول اللہ ﷺ کی ہمہ بیں آنکھوں نے پورب، پچھم، اتر، دکھن ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کا نور دیکھا اور ہر زبان میں اس کی آواز سنی:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ (یونس ۱۰:۴۷) اور ہر قوم کے لئے ایک رسول ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا (نحل ۱۶:۳۶) اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ (روم ۳۰:۴۷) اور ہم نے تجھ سے پہلے کتنے رسول ان کی اپنی اپنی قوم میں بھیجے۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ. (رعد ۱۳:۷) اور ہر قوم کے لئے ایک رہنما آیا۔

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ. (فاطر ۳۵:۲۴) اور کوئی قوم نہیں جس میں ایک ہشیار کرنے والا نہ آیا ہو۔

وَكَمْ أَرْسَلْنَا مِن نَّبِيٍّ فِي الْأَوَّلِينَ. (زخرف ۴۳:۶) اور ہم نے پہلی قوموں میں کتنے پیغمبر بھیجے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ. (ابراہیم ۱۴:۴) اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی بولی میں بھیجا تا کہ وہ ان کو بتا سکے۔

اس آخری آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول بہ تعلیم الٰہی تشریح و بیان کے لئے مامور ہیں۔

ایک یہودی کے لئے حضرت موسیٰ کے سوا کسی اور کو پیغمبر ماننا ضروری نہیں، ایک عیسائی تمام دوسرے پیغمبروں کا انکار کر کے بھی عیسائی رہ سکتا ہے، ایک ہندو تمام دنیا کو ملچھ، شودر اور چنڈال کہہ کر بھی پکا ہندو رہ سکتا ہے، ایک زردشتی تمام عالم کو بحرِ ظلمات کہہ کر بھی نورانی ہو سکتا ہے اور وہ ابراہیم اور

موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا کہہ کر بھی دین داری کا دعویٰ کر سکتا ہے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی ان کی پیروی کا دعوی کر کے ان سے پہلے کے کسی پیغمبر کا انکار کر سکے، آنحضرت ﷺ تہجد میں جو دعا پڑھتے تھے اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا والنبیون حق و محمد حق (۱) (سب نبی برحق تھے اور محمد بھی برحق ہے) غرض کوئی شخص اس وقت تک محمدی نہیں ہو سکتا جب تک وہ پہلے موسوی وعیسوی اور ایرانی و ہندی نہ بن لے اور کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیا کے تمام پیغمبروں کی یکساں صداقت، حقانیت اور راست بازی اور معصومیت کا اقرار نہ کر لے اور یقین نہ کرے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب کی طرح ہر قوم کو اپنی ہدایت اور رہنمائی سے سرفراز کیا ہے اور ان کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا خدا کا ماننا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا ۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا وَ اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا ۔ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ اُولٰٓئِکَ سَوْفَ یُؤْتِیْھِمْ اُجُوْرَھُمْ وَکَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔ (نساء۴:۱۵۰-۱۵۲)	بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہیں مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ میں کوئی راستہ نکالیں، وہی تو حقیقت میں کافر ہیں اور کافروں کے لئے ہم نے اہانت والا عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کیا تو وہی لوگ ہیں جن کی مزدوری خدا ان کو دے گا اور اللہ بخشنے والا، رحمت والا ہے۔
وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ. (بقرہ۲:۱۷۷)	اور فرشتوں پر، کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لانا نیکی ہے،
وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا. (نساء۴:۱۳۶)	اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں اور قیامت کا انکار کیا، وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔

(۱) صحیح بخاری کتاب التہجد باب التہجد باللیل ج ۱ ص ۱۵۱۔

بقرہ کے خاتمہ میں ہے:

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (بقرہ۲:۲۸۵)

ہر ایک خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا، ہم خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ

ہم ان پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

(بقرہ۲:۱۳۶،آل عمران۳:۸۴)

پیغمبروں میں تفریق کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ان میں سے بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں، اسلام نے اس کی ممانعت کی اور عام حکم دیا کہ دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں خدا کا رسولِ صادق اور راست باز تسلیم کیا جائے۔

یہودی حضرت عیسیٰؑ کو نعوذ باللہ جھوٹا اور کاذب سمجھتے تھے اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے اور اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے، یہودیت اور اسلام میں جو اشتراک ہے وہ مسیحیت سے زیادہ ہے، اس لئے اگر اسلام کی راہ میں حضرت مسیحؑ کا نام نہ آئے تو بہت سے یہود مسلمان ہونے کو تیار ہو جائیں، مگر اسلام نے کبھی یہ ننگ گوارا نہیں کیا اور جب تک کسی یہودی سے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت، معصومیت اور تقدس کا اقرار نہیں لے لیا، اس کو اپنے دائرہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی، چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بہت سے یہود آپ ﷺ کی رسالت اور شریعت پر ایمان لانے کو تیار تھے مگر حضرت عیسیٰؑ کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کی دوستی کے عظیم الشان فائدوں سے محروم رہنا گوارا کیا مگر مسیحؑ کی سچائی سے محروم رہنا قبول نہ فرمایا(۱) اور ان سے صاف کہا:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ. (مائدہ۵:۵۹)

اے یہود! کیا بیر ہے تم کو ہم سے مگر یہی کہ ہم خدا پر اور جو ہماری طرف اتارا گیا اور جو پہلے اتارا گیا اس پر ایمان رکھتے ہیں اور تم میں اکثر بے حکم ہیں۔

خود قریش کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے نام سے چڑھتے تھے، تاہم ان کی خاطر

(۱) تفسیر ابن جریر طبری جلد ششم ص ۱۶۷ مصر۔

حضرت عیسیٰؑ کی نبوت، تقدس اور معصومیت کا انکار نہیں کیا گیا، قرآن نے کہا:

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ. وَقَالُوا أَآلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ. إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ

(زخرف ۴۳: ۵۷-۵۹)

اور جب مریم کے بیٹے کی کہاوت بیان کی گئی تو تیری قوم اس سے چلانے لگتی ہے اور بولی کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ، یہ نام جو وہ تجھ پر دھرتے ہیں صرف جھگڑنے کو، بلکہ وہ جھگڑالو ہیں، وہ ایک بندہ ہے جس پر ہم نے فضل کیا۔

قریش کو معلوم تھا کہ اسلام عیسیٰ بن مریمؑ کو بندہ اور رسول مانتا ہے، خدا نہیں، باوجود اس کے عیسائیوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حضرت عیسیٰؑ کے ماننے کی وجہ سے عیسیٰ پرستی کا الزام دھرتے تھے، قرآن نے ان کے اس بے معنی اعتراض کی تردید کی۔

اسلام میں پیغمبروں کی کوئی تعداد محدود نہیں ہے، طبرانی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا مبعوث ہوئے، دوسری روایت میں اس سے کم تعداد بھی مروی ہے، قرآن پاک میں نام کے ساتھ صرف ان ہی انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے جن سے عرب مانوس تھے، یا ان کے ہم سایہ یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں جن کے تذکرے تھے، قرآن میں بعض ایسے انبیا بھی مذکور ہیں جن سے صرف عرب واقف تھے اور یہود و نصاریٰ بے خبر تھے، مثلاً حضرت ہودؑ اور حضرت شعیبؑ، بعض ایسے بھی ہیں جن کو یہود و نصاریٰ جانتے تو تھے لیکن پیغمبر نہیں تسلیم کرتے تھے مثلاً حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ، وحیِ محمدی نے ان سب کو پیغمبر تسلیم کیا اور ان کی صداقت و عظمت کا اقرار کیا۔

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعیت کی طرف اشارہ کر دینا مناسب ہے، اسلام سے پہلے نبوت، رسالت اور پیغمبری کی کوئی خاص واضح اور غیر مشتبہ حقیقت دنیا کے سامنے نہ تھی، یہود کے ہاں نبوت کے معنی صرف پیشین گوئی کے تھے اور نبی پیشین گو کو کہتے تھے اور جس کے متعلق وہ یقین رکھتے تھے کہ اس کی دعا یا بددعا فوراً قبول ہو جاتی ہے[1] اسی لئے حضرت ابراہیمؑ حضرت لوطؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کی نبوت اور

(۱) دیکھو توراۃ صحیفہ تکوین، باب ۲۰: ۷۔

رسالت کا محض دھندلا سا خاکہ ان کے ہاں موجود ہے، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے مقابلہ میں شام کے کاہن مالک کی پیغمبرانہ شان ان کے نزدیک زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے۔(۱) حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی حیثیت ان کے ہاں صرف بادشاہ کی ہے اور ان کے زمانہ کے پیشین گوئی کرنے والے پیغمبر اور ہیں، یہی سبب ہے کہ یہود کے قصوں اور کتابوں میں اسرائیلی پیغمبروں کی طرف نہایت سخت باتیں بے تامل منسوب کی گئی ہیں، عیسائیوں کے ہاں بھی رسالت اور نبوت کی کوئی واضح حقیقت نہیں بیان کی گئی ہے، ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ ''مجھ سے پہلے جو آئے وہ چور اور ڈاکو تھے'' (۲)، موجودہ انجیلوں میں نہ خدا کے رسولوں کی تعریف ہے، نہ ان کے تذکرے ہیں، نہ ان کی سچائی اور صداقت کی گواہی ہے، حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ جن کے تذکرے انجیل میں ہیں وہ بھی پیغمبرانہ شان کے ساتھ ان کے ہاں مسلم نہیں لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے آکر اس جلیل القدر منصب کی حقیقت ظاہر کی، اس کے فرض بتائے، اس کی خصوصیات کا اظہار کیا اور ان سب پر ایمان لانے کو نجات کا ضروری ذریعہ قرار دیا، آپ ﷺ نے بتایا کہ نبوت و رسالت خاص انسانوں کو خدا کا بخشا ہوا ایک منصب ہے، جس کو دے کر وہ دنیا میں اس غرض سے بھیجے گئے کہ خدا کے احکام لوگوں کو بتائیں اور سچائی اور نیکی کا راستہ ان کو دکھائیں، وہ ہادی (رہنما) نذیر (ہشیار کرنے والے) داعی (خدا کی طرف بلانے والے) مبشر (خوش خبری سنانے والے) معلم (سکھانے والے) مبلغ (خدا کے احکام پہنچانے والے) اور نور (روشنی) تھے، خدا ان سے ہم کلام ہوتا تھا، اپنی باتوں سے ان کو مطلع کرتا تھا اور وہ ان سے دوسرے انسانوں کو آگاہ کرتے تھے، وہ گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ تھے، وہ خدا کے نیک اور مقبول بندے تھے اور اپنے عہد کے سب سے بہتر انسان تھے، ان کے سب کام خدا کے لئے تھے اور خدا ان کے لئے تھا، یہ ہستیاں اپنے فرائض کو انجام دینے کے لئے ہر قوم میں پیدا ہوئیں جنہوں نے ان کو مانا، نجات پائی اور جنہوں نے جھٹلایا، ہلاک و برباد ہوئے، قرآن پاک نے ان کی زندگی کے سوانح، ان کی تبلیغ کی روداد، ان کے اخلاق کی بلند مثالیں اور ان کی خدا پرستی کا اخلاص اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کے پڑھنے اور سننے سے ان کی پیروی کا جذبہ، ان کی اتباع کا شوق اور ان کی صداقت کا یقین دلوں میں پیدا ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی اس نے شانِ نبوت

(۱) سفر تکوین ۴۱: ۸۱۔ (۲) انجیل

کے خلاف جو غلط باتیں دوسرے صحیفوں میں ان کی طرف منسوب تھیں ان کو چھوڑ دیا ہے یا ان کی تردید کر دی ہے۔

الغرض نبوت اور رسالت کی سب سے اہم خصوصیت اسلام نے جو یہ قرار دی کہ نبی ورسول گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں، بنی اسرائیل کو نبوت ورسالت کے اس بلند تخیل کی ہوا بھی نہیں لگی تھی، اس لئے انہوں نے نہایت بے باکی سے اپنے پیغمبروں کی طرف ہر قسم کے گناہ منسوب کر دیئے، عیسائی ایک حضرت عیسیٰؑ کو تو معصوم کہتے ہیں، باقی سب کی گنہ گاری کے قائل ہیں لیکن اسلام نے دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کی عظمت کی ایک ہی سطح قائم کی ہے، اس کے نزدیک گناہوں سے پاکی اور عصمت تمام انبیا اور مرسلین کا مشترک وصف ہے، کیوں کہ گنہ گار گناہ گاروں کی رہنمائی کا مستحق نہیں اور اندھا اندھے کو راہ نہیں دکھا سکتا، اس بنا پر محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی وتعلیم نے خدا کے تمام معصوموں کی عظمت وجلالت دنیا میں قائم کی اور جن کور باطنوں نے ان کی عصمت و بے گناہی کے دامن پر اپنے وہم و نادانی سے داغ لگائے تھے، ان کو دھو کر پاک وصاف کیا اور یہ رسالت محمدی ﷺ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

خود انجیل کے طرز سے ظاہر تھا کہ حضرت عیسیٰؑ احکام عشرہ کے برخلاف اپنی ماں کی عزت نہیں کرتے تھے، قرآن نے اس کی تردید کی، اور خود حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے کہلوایا:

وَبَرًّا ۢ بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ۔ (مریم ۱۹:۳۲)	اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنے والا اور مجھ کو خدا نے جبار اور بدبخت نہیں بنایا۔

کیونکہ احکام عشرہ کے مطابق ماں باپ کا ادب نہ کرنا بدبختی تھی، اسی طرح موجودہ انجیل نے حضرت عیسیٰؑ پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ نماز وروزہ کی پروانہیں کرتے تھے، قرآن نے ان کی زبان سے کہلوایا:

وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا ٥ (مریم ۱۹:۳۱)	اور خدا نے مجھ کو نماز اور زکوۃ کا حکم دیا ہے جب تک میں جیتا رہوں۔

یہود حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت رکھتے تھے، قرآن نے اس الزام کو دور کیا اور کہا:

وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ	اور مریم بنت عمران جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے اپنے پروردگار کی باتوں اور اس کی کتابوں کو سچ جانا اور وہ بندگی

الْقٰنِتِيْنَ. (تحریم ۶۶:۱۲) کرنے والوں میں تھی۔

وہم پرست یہود حضرت سلیمانؑ کو گنڈا، تعویذ اور عملیات وغیرہ کا موجد سمجھتے تھے، حالاں کہ سحر وجادو وغیرہ توراۃ میں شرک قرار دیا جاچکا تھا، قرآن نے علانیہ یہودیوں کے اس الزام کی تردید کی:

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (بقرہ ۲:۱۰۲) اور سلیمان نے کفر کا کام نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے کیا، لوگوں کو وہ جادو سکھاتے تھے۔

اسی طرح حضرت لوطؑ پر بدکاری کا جو الزام یہود لگاتے ہیں اس کی تردید کی۔

اوپر گذر چکا ہے کہ قرآن نے یا آنحضرت ﷺ نے دنیا کے تمام پیغمبروں کے نام نہیں لئے ہیں، صرف ناموں کی فہرست یا نامعلوم اشخاص کے نام لے لینے سے دلوں میں جوشِ عقیدت نہیں پیدا ہوسکتا، تاہم معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی صدائے دعوت ایک دن دنیا کے کناروں تک پہنچے گی اور بہت سی غیر قومیں اور دوسرے انبیا کی امتیں اس حلقہ میں داخل ہوں گی اور اپنے اپنے انبیا کا نام ونشان صحیفۂ محمدی ﷺ میں تلاش کریں گی اس لئے ایک جامع آیت میں تمام انبیا کا تذکرہ کردیا گیا اور ان کی صداقت کی پہچان بتادی گئی، فرمایا:

اِنَّا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ كَمَا اَوْحَيْنَا اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا. وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا. رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا. (نساء ۴:۱۶۳-۱۶۵)

ہم نے (اے محمد) تمہارے پاس وحی بھیجی جس طرح نوح اور ان کے بعد کے پیغمبروں کے پاس بھیجی اور ہم نے ابراہیم کو اور اسماعیل کو اور اسحاق کو اور یعقوب کو اور ان کے خاندان کو اور عیسیٰ کو اور ایوب کو اور یونس کو اور ہارون کو اور سلیمان کو وحی بھیجی اور داوٗد کو زبور عطا کی اور دوسرے رسولوں کو بھیجا جن کا حال تم سے ہم نے پہلے بیان کیا ہے اور ان رسولوں کو جن کا حال ہم نے تم سے بیان نہیں کیا اور خدا نے موسیٰ سے بات کی، ان رسولوں کو خوش خبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا تاکہ لوگوں کو رسولوں کے آجانے کے بعد خدا کے آگے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور خدا غالب ودانا ہے۔

انبیا کے متعلق یہی حقیقت سورۂ مومن میں دوبارہ بیان کی گئی ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِکَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْکَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْکَ (مومن ۴۰: ۷۸)

اور ہم نے یقیناً تم سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے، ان میں کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان کیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا۔

تعلیم محمدی ﷺ کے اصول کے مطابق یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قوموں اور ملکوں جیسے چین اور ایران اور ہندوستان میں بھی آنحضرت ﷺ سے پہلے خدا کے انبیا مبعوث ہو چکے ہیں اور اس لئے یہ تمام قومیں اپنے جن بزرگوں کی عزت وعظمت کرتی ہیں اور اپنے دین و مذہب کو جن کی طرف منسوب کرتی ہیں ان کی صداقت اور راست بازی کا قطعی انکار کوئی مسلمان نہیں کر سکتا، اسی بنا پر بعض علما نے ہندوستان کے کرشن اور رام (۱) کو بلکہ ایران کے زردشت (۲) کو بھی اور بعض صاحبوں نے تو بودھ تک کو پیغمبر کہا ہے، بہر حال امکان میں تو شک ہی نہیں لیکن یقین کے ساتھ ان ناموں کی تعیین بھی حد سے تجاوز کرنا ہے، اصل یہ ہے کہ قرآن نے انبیا کی دو قسمیں بیان کی ہیں، ایک وہ جن کے ناموں کی اس نے تصریح کی ہے اور دوسرے وہ جن کے نام اس نے بیان نہیں کئے ہیں، اس لئے صحیح یہ ہے کہ جن انبیا کے نام مذکور ہیں تمام مسلمانوں کو ان پر نام بہ نام ایمان لانا چاہیے اور جن کے نام مذکور نہیں ان کی نسبت صرف یہ اجمالی ایمان کافی ہے کہ ان قوموں میں بھی خدا کے فرستادہ اور پیمبر آئے تھے، گو بہ تخصیص ان کے نام نہیں معلوم ہیں، وہ قومیں جن کا نام لیتی ہیں اگر ان کی زندگی اور ان کی تعلیم نبوت اور رسالت کی شان کے مطابق ہیں تو ان کی نبوت اور رسالت کی طرف رجحان اور میلان بلکہ قرینہ غالب ہو سکتا ہے لیکن یقین اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے پاس ان باتوں پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف وحی ہے اور وہ اس تخصیص وتعیین سے خاموش ہے۔

اس قسم کے انبیا جن کے نام گو قرآن میں مذکور نہیں مگر وہ آنحضرت ﷺ کے پہلے گذر چکے ہیں اور ان کے پیرو ان کو اپنے ہاں نبوت ورسالت کا درجہ دیتے ہیں، ان کی شناخت اور پہچان کا ایک اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دی ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (نحل ۱۶: ۳۶)

اور ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی پرستش کرو اور جھوٹے معبود سے بچے رہو۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِىْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ. (انبیاء ۲۱: ۲۵)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں بھیجا لیکن اس کو یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں، مجھ ہی کو پوجو۔

---

(۱) کلمات طیبات حضرت شاہ مرزا مظہر جان جاناں مکتوب چہارم از صفحہ ۳۷ تا ۴۰ مطبع العلوم مراد آباد ۱۸۸۶ء۔

(۲) ملل ونحل ابن حزم، الکلام علی الیہود الخ ج ا ص ۱۱۳۔

اس لئے وہ تمام قدیم رہبرانِ انسانی اور رہنمایانِ عالم جو دنیا میں کسی مذہب کو لائے اور جن کی تبلیغ و تعلیم توحید کی دعوت اور بت پرستی سے اجتناب تھی اور جن کی زندگی اس تعلیم کے شایانِ شان تھی، ان کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اپنی قوم کے اور اپنے وقت کے رسول اور پیغمبر نہ تھے، کہ اتنی بڑی بڑی قومیں خود قرآن کے اصول کے مطابق انبیا اور رسولوں کے وجود سے خالی نہیں رہ سکتی تھیں، اسی بنا پر اسلام کی ان تلقینات میں سے جن کے تسلیم کئے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا، ایک یہ بھی ہے کہ وہ تمام ملتوں کے پیغمبروں اور تمام قوموں کے رسولوں کو جو حضرت خاتم نبوت ﷺ کے زمانہ سے پہلے پیدا ہوئے، یکساں صداقت کے ساتھ تسلیم کرے، ان سب نے تمام دنیا کو ایک ہی تعلیم دی ہے اور وہ توحید ہے، البتہ ان انبیا میں سے ایک کو دوسرے پر بعض بعض حیثیتوں سے ترجیح ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ م	ان رسولوں میں سے ہم نے کسی کو کسی پر فضیلت دی ان
مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ	میں سے کسی سے اللہ نے کلام کیا اور کسی کے بہت درجے
وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ	بڑھائے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو نشانیاں دیں اور پاک
بِرُوْحِ الْقُدُسِ (بقرہ۲:۲۵۳)	کی روح سے اس کی تائید کی۔

آپ ﷺ نے دوسرے انبیا کی جائز تعظیم و تکریم یہاں تک کی ہے کہ ان کے مقابلہ میں کبھی کبھی اپنی ہستی بھی فراموش کردی ہے، ایک دفعہ ایک صحابی نے آپ کو یا خیر البریۃ، اے بہترین خلق کہہ کر خطاب کیا، فرمایا وہ تو ابراہیمؑ تھے (۱)، ایک دفعہ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ سب سے عالی خاندان کون تھا: فرمایا یوسف پیغمبر بن پیغمبر بن پیغمبر بن خلیل اللہ (۲)، ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک یہودی مدینہ میں کہہ رہا تھا کہ ''قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ کو بشر پر فضیلت دی''، ایک مسلمان یہ کھڑے سن رہے تھے، ان کو غصہ آگیا کہ ہمارے پیغمبر کی موجودگی میں تم یہ کہہ رہے ہو اور اس کو ایک تھپڑ کھینچ مارا، اس نے دربارِ نبوی ﷺ میں جا کر شکایت کی، آپ ﷺ نے ان صحابی کو بلا بھیجا اور مقدمہ کی روداد سنی، پھر نہایت برہم ہو کر فرمایا کہ پیغمبروں میں باہم ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو (۳)، یعنی ایسی فضیلت جس سے کسی دوسرے نبی کی تنقیص ہوتی ہو۔

(۱) مسند احمد بن حنبل جلد ۳ ص ۱۷۸، ۱۸۴ (۲) صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب قول اللہ عزوجل لقد کان فی یوسف الخ ج ۱ ص ۴۷۹ (۳) صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب قول اللہ عزوجل وان یونس الخ ج ۱ ص ۴۸۵۔

یہی وہ تعلیماتِ محمدی ہیں جن کے ذریعہ سے دنیا میں وحدتِ مذاہب، روحانی مساوات، انسانی اخوت اور تمام انبیا اور پیغمبروں کے ادب و احترام کے جذبات پیدا ہوئے، بنی اسرائیل کے وہ پیغمبر جن کو ماننے والے تمام دنیا میں چند لاکھ سے زیادہ نہ تھے، محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے ان کی عظمت وجلالت اور ادب واحترام کرنے والے چالیس کروڑ سے زیادہ ہوگئے، وہ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام جو چھ سو برس تک یہودیوں کی جھوٹی تہمت سہتے رہے، محمد رسول اللہ ﷺ نے آکر دفعتاً اس کو مٹا دیا اور ان کی پاکی کی گواہی دی، جس کے بہ دولت آج چالیس کروڑ زبانیں ان کی عصمت کی شہادت دے رہی ہیں، ہندوستان، ایران، چین، جن کے سچے رہنماؤں کا ان کے ملک سے باہر کوئی ادب نہ تھا، جہاں جہاں مسلمان گئے ان کے جائز ادب واحترام کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔

وہ عرب جو پیغمبروں کے ناموں تک سے ناواقف تھے، جو نبوت ورسالت کے خصائص کے علم سے محروم تھے، جو انبیا اور رسولوں کی سیرتوں سے ناآشنا تھے، جو ان کے ادب واحترام اور تصدیق واعتراف سے بے گانہ تھے، جن کو اپنے دیوتاؤں کے سامنے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام پر تحقیرانہ ہنسی آتی تھی (۱) اور جو حضرت موسیٰؑ کی فضیلت کا ذکر سن کر اپنے غصہ کو ضبط نہیں کر سکتے تھے (۲)، محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے ان کا یہ حال ہوا کہ وہ ایک ایک پیغمبر کے نام ونشان اور تاریخ و سیرت سے واقف ہوگئے اور تبرکاً ان کے ناموں پر اپنی اولادوں کے نام رکھنے لگے اور جو آج بھی تمام مسلمانوں میں شائع اور ذائع ہیں، انہوں نے پیغمبروں کی صداقت اور سچائی کی گواہی دی، ان کے ادب واحترام کو اپنے سینوں میں جگہ دی، ان کی تعظیم وتکریم کو اپنے دین وایمان کا جز بنالیا، دنیا کی کسی قوم میں یہ رواج نہیں ہے کہ انبیا علیہم السلام کے نام ادب سے لئے جائیں، مگر ایک مسلمان کے لئے لازم ہے کہ جب کسی پیغمبر کا نام لے تو ادب سے لے اور ان پر درود وسلام پڑھے۔

☆

---

(۱) قرآن پاک سورہ زخرف ۴۳: ۵۷ (۲) صحیح بخاری کتاب الانبیا باب قولہ عز وجل وان یونس الخ ج ۱ ص ۴۸۵۔

کتبِ الٰہی پر ایمان

وَ كُتُبِهٖ (بقرہ۲: ۲۸۵)

ایک مسلمان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے صحیفۂ وحی پر ایمان لائے، ہر چند یہ عقیدہ گذشتہ عقیدۂ رسالت کا لازمی نتیجہ ہے، یعنی رسول کو رسول مان لینا، اس کی تعلیمات اور وحی کو مان لینے کا مرادف ہے، تاہم یہ تصریح اس لئے کی گئی تا کہ پوری طرح صاف اور واضح ہو جائے کہ رسول کو رسول مان لینے کے بعد اس کے صحیفۂ وحی کو مان کر اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے، سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں سچے مومنوں کی تعریف میں کہا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ...... (بقرہ۲: ۴)
اور جو اس (کتاب یا وحی) پر ایمان رکھتے ہیں جو تجھ پر (اے محمد) اتاری گئی......

کتابِ الٰہی پر ایمان لانے سے مقصود ان تمام صداقتوں اور حکموں کو بہ جان و دل قبول کرنا ہے جو اس میں مذکور ہیں، یہ گویا پوری شریعتِ مطہرہ کو قبول کر لینے کا مختصر ترین طریقۂ تعبیر ہے اور اس لئے ایمانیات کی بہت سی دوسری باتیں جن کی تفصیل ہر موقع پر ضروری نہیں، اس ایک فقرہ کے تحت میں آجاتی ہیں، قرآن پر ایمان لانے کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام مذکور ہیں ان سب کو بے کم و کاست ہم تسلیم کرتے ہیں، کہ اگر کوئی سرے سے ان کو تسلیم ہی نہیں کرتا تو ان کی تعمیل و پیروی کا اس سے کیوں کر مطالبہ کیا جا سکتا ہے؟ اسی بنا پر اس کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ بماجئت بہ جو کچھ میں لے کر آیا اس پر ایمان لاؤ، قرآن نے کہا:

وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ (محمد۴۷: ۲)
اور ایمان لائے اس پر جو محمد پر اتارا گیا۔

لیکن قرآن اگر اتنا ہی کہتا کہ میرے پیرو صرف مجھ پر ایمان لائیں، تو یہ کوئی اہم بات نہ ہوتی کہ ہر صاحبِ مذہب کی یہی تعلیم ہوتی ہے، قرآن نے عقائد کی اس دفعہ میں بھی اپنے تکمیلی پہلو کو پیشِ نظر رکھا ہے اور یہ ضروری قرار دیا ہے کہ اہلِ قرآن قرآن کے ساتھ ہی دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کریں، یعنی کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک صحیفۂ محمدی کے

ساتھ دوسرے پیغمبروں کے صحیفوں کو بھی من جانب اللہ تسلیم نہ کرے چنانچہ سورۂ بقرہ کے شروع والی مذکورہ بالا آیت کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ (بقرہ۲:۴)	اور جو ایمان لائے اس پر جو تجھ سے پہلے اتارا گیا۔

پھر اسی سورہ کے آخر میں فرمایا:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ (بقرہ۲:۲۸۵)	رسول ایمان لایا اس پر جو خدا کی طرف سے اس پر اترا اور اہلِ ایمان بھی، ہر ایک، خدا پر، اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر ایمان لایا۔

بقرہ کی آیتوں میں بعض انبیا علیہم السلام کا تفصیلی درجہ اور بقیہ تمام انبیا کا اجمالی ذکر کر کے ان کی کتابوں اور وحیوں کی تصدیق کا حکم دیا گیا ہے:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰى وَ عِیْسٰى وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ (بقرہ۲:۱۳۶)	(اے مسلمانو!) تم کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور خاندانِ یعقوب کی طرف اتارا گیا، اس پر، اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر، اور جو کچھ اور سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا ہم ان سب پر ایمان لائے۔

آلِ عمران میں کسی قدر تفصیل ہے:

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰى وَ عِیْسٰى وَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ (آلِ عمران۳:۸۴)	کہہ کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور خاندان یعقوب پر اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر اور دوسرے سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے جو کچھ دیا گیا اس پر ہم ان سب پر ایمان لائے۔

سورہ نساء میں اس پر ایمان لانے کے حکم کے ساتھ ساتھ اس کے انکار کو کفر بھی قرار دیا گیا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ	اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو، ایمان لاؤ خدا پر، اس کے

وَالْكِتٰبِ الَّذِىْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا. (نساء۴: ۱۳۶)

رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔

سورہ مومن میں ان منکروں کو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے جو کسی پیغمبر کے پیغام کی تکذیب کریں:

اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ڤ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ. اِذِ الْاَغْلٰلُ فِىْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ ؕ يُسْحَبُوْنَ. (مومن۴۰: ۷۰، ۷۱)

جن لوگوں نے کتاب کو اور جو پیغام دے کر ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا اس کو جھٹلا دیا وہ عن قریب جانیں گے، جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی، وہ گھسٹتے جائیں گے۔

نام کی تخصیص کے ساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے، توراۃ جس کو ایک جگہ صحفِ موسیٰ بھی کہا گیا ہے (اعلیٰ ۸۷: ۱۹) اور حضرت داؤدؑ کی زبور اور حضرت عیسیٰؑ کی انجیل اور خود قرآن، ان کے علاوہ ایک موقع پر صحفِ ابراہیم کا بھی تذکرہ ہے:

اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى. صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى. (اعلیٰ ۸۷: ۱۸، ۱۹)

یہ باتیں گزشتہ صحیفوں میں بھی ہیں، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

ان کے ماسوا اجمال کے ساتھ دو موقعوں پر گذشتہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے الفاظ ہیں۔

اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى. (طٰہٰ۲۰: ۱۳۳)

کیا اگلے صحیفوں میں جو کچھ ہے اس کی گواہی ان کو نہیں پہنچی؟

وَاِنَّهٗ لَفِىْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ (شعراء ۲۶: ۱۹۶)

اور بے شبہ یہ پہلوں کی کتابوں میں مذکور ہے۔

اس بنا پر انبیا کی طرح ان کتابوں پر بھی ہر مسلمان کا تفصیلی اور اجمالی ایمان ہے، جن کتابوں کے نام مذکور ہیں ان پر ناموں کے ساتھ اور جن کے نام مذکور نہیں ان پر بالاجمال ایمان ضروری ہے، کسی قوم میں اگر کوئی آسمانی کتاب ہے جس کا وجود قرآن سے پہلے ہے لیکن اس کا تصریحی نام قرآن میں مذکور نہیں ہے اور اس میں توحیدِ الٰہی کی دعوت اور طاغوت سے بچنے کی

نصیحت بھی ہے، تو اگرچہ ہم اس کو بہ تصریح خدا کی کتاب تسلیم نہیں کر سکتے، تاہم بالتصریح اس کا انکار بھی نہیں کر سکتے، اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ ''اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب'' (۱) یہی حال دوسری مشکوک کتابوں کا ہے۔

یہود توراۃ کے سوا کچھ نہیں مانتے، عیسائی توراۃ کے احکام نہیں مانتے لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں، تاہم انجیل سے پہلے کی دوسری زبانوں اور ملکوں کی آسمانی کتابوں کی نسبت مسلمانوں کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں کرتے، پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونے کا شبہ بھی نہیں کر سکتے اور برہمن ویدوں کے باہر خدا کے فیضان کا تصور بھی نہیں کر سکتے، لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ صحیفۂ ابراہیم، توراۃ، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقین کرے اور دوسری اگلی آسمانی کتابوں کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہوں، تکذیب نہ کرے، کہ ان کا کتبِ الٰہی ہونا ممکن ہے۔

حقیقت میں اسلام کی یہ تعلیم دنیا کی مہتم بالشان تعلیمات میں سے ہے، جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہ تھا، یہ رواداری، بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے، یہودی اپنی کتاب کو چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کر کے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے، عیسائی توراۃ اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہتوں کا متوقع ہو سکتا ہے، پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر بھی مینو (جنت) کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے، ہندو اپنے ویدوں کے سوا دنیا کی ہر آسمانی کتابوں کو دجل و فریب مان کر بھی آواگون سے نجات حاصل کر سکتا ہے، بودھ مت والے اپنے سوا تمام دنیا کی وحیوں کا انکار کر کے بھی نروان کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں، مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو من جانب اللہ نہ تسلیم کرے، جنت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

یہ تعلیم صرف نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ عملاً اس پر اسلامی حکومت کے قوانین اور احکام

(۱) صحیح بخاری کتاب الشہادات باب لایسأل اھل الشرک الخ ج ۱ ص ۳۶۹ و کتاب الاعتصام باب قول النبی لا تسئلوا اھل الکتاب عن شیء ج ۲ ص ۱۰۹۴ کتاب التوحید باب ما یجوز من تفسیر التوراۃ الخ ج ۲ ص ۱۱۲۵، کتاب التفسیر سورہ بقرہ باب قول اللہ تعالیٰ قولوا آمنا باللہ الخ ج ۲ ص ۶۴۴۔

مبنی ہیں، یہودیوں کی نظر میں صرف دو ہی قومیں ہیں، بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل، یا اسرائیل کا گھرانا اور غیر قومیں، یا مختون اور غیر مختون اور ان ہی دونوں تقسیموں پر ان کے قانون کی بنیاد ہے، عیسائیوں میں مذہبی حیثیت سے مسیحی، یہود اور بت پرست گو تین قومیں مانی جاتی ہیں مگر چوں کہ ان کے مذہب میں قانون نہیں ہے اس لئے وہ اکثر امور میں رومن لا کے پیرو رہے ہیں، لیکن رومن عیسائیوں میں بھی ملکی حیثیت سے دو ہی تقسیمیں ہیں، رومی اور غیر رومی، ایک رومی ملک میں غیر رومی کا کوئی حق نہیں کہ رومی حکومت کے لئے اور غیر رومی غلامی کے لئے پیدا ہوا ہے، پارسیوں میں پاک نژادانِ ایران اور بیرونی لوگ، دنیا کی دو ہی حیثیتیں ہیں، ہندوؤں میں اونچی ذاتیں اور اچھوت قوموں کی دو ہی صورتیں ہیں۔

مگر اسلام کے گذشتہ عقیدہ کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے قانونی حیثیت سے دنیا کی قوموں کو چار حصوں میں تقسیم فرمایا اور ان کے علاحدہ علاحدہ حقوق قرار دیئے، جن پر اسلام کی تیرہ صدیوں میں برابر عمل ہوتا رہا، یہ تقسیمیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ مسلمان، جو قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کو کتابِ الٰہی یقین کرتے ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بھائی اور ہر اچھائی اور برائی میں ایک دوسرے کا شریک ہے، وہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی بیاہ کر سکتے ہیں، اور ایک دوسرے کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتا ہے، اسلام کی سلطنت میں ان کے حقوق یکساں ہیں۔

۲۔ اہلِ کتاب، یعنی ان کتابوں کے پیرو جن کے نام قرآن میں مذکور ہیں، یا یوں کہو کہ جو قرآن کو گو آسمانی کتاب نہیں مانتے، مگر ان کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں مذکور ہے، کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہیں، وہ اپنی حفاظت کا مالی ٹکس (جزیہ) ادا کر کے اسلامی حکومتوں میں رہ سکتے ہیں، ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رہتی ہیں، ان کو اپنے مذہب کے بدلنے پر مجبور نہیں کیا جاتا، ان کی جان و مال اور عزت کے مسلمان محافظ ہوتے ہیں، ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں اور ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں، ان کا جائز کھانا ہم کھا سکتے ہیں اور ہم اپنا کھانا ان کو کھلا سکتے ہیں۔

۳۔ شبہ اہلِ الکتاب، یعنی وہ لوگ جو قرآن اور توراۃ وانجیل وزبور کو نہیں مانتے، مگر وہ خود اپنے لئے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں، جیسے صابئ جو ایک آسمانی کتاب کے دعوی کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے، اور مجوس یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعوی کرتے ہیں اور ساتھ ہی سورج، آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں، ترکستان اور سندھ کی فتح کے موقع پر علمائے اسلام نے ان ہی پر قیاس کر کے ہندوؤں اور بودھوں وغیرہ کو بھی اس صنف میں داخل کیا، مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کرسکتے اور ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے، ان دو باتوں کے علاوہ اہلِ کتاب کے بقیہ تمام حقوق آنحضرت ﷺ نے ان کو عطا کئے ہیں، وہ اسلامی حکومتوں میں ادائے جزیہ کے بعد ہر قسم کے ملکی حقوق میں شریک ہیں، ان کی جان و مال و آبرو اور ان کے معبدوں کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے۔

۴۔ کفار ومشرکین، یعنی وہ لوگ جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی دین الٰہی کی طرف منسوب ہیں ان کو چند شرائط کے ساتھ دیا جاسکتا ہے، لیکن حقوق حاصل کرنے کے لئے ان سے کہا جائے گا کہ وہ کسی نہ کسی آسمانی دین کے اندر اپنے کو داخل کرلیں، جیسا کہ عباسیوں کے ابتدائی زمانہ میں حرانی عراقیوں نے اپنے کو صابئیوں میں داخل کر کے اپنے لئے حقوق حاصل کئے تھے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی اس تعلیم نے دنیا میں امن وامان اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے میں کتنا عظیم الشان حصہ لیا ہے، یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد وشریعت کی سخت پیروی کے باوجود دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت اور میل جول کے لئے آمادہ کیا اور مجوسیوں، صابئیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مختلف ملکوں میں ان ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی بنیاد رکھنے کی ان میں قوت پیدا کی۔

وحدۃ الادیان: تمام رسولوں اور ان کے صحیفوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہو کہ آدم سے لے کر محمد علیہما السلام تک جتنے سچے مذہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے، چنانچہ درحقیقت آپ ﷺ کی یہی تعلیم تھی، اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے جو آدم سے محمد علیہما السلام تک باری باری پیغمبروں کے ذریعہ سے آتا رہا اور انسانوں کو اس کی تعلیم دی جاتی رہی۔

صحیفۂ محمدی نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کیے ہیں ایک دین اور دوسرا شرعہ، منسک اور منہاج، شرعہ اور منہاج کے معنی راستہ کے ہیں اور منسک کے معنی طریقِ عبادت کے ہیں، دنیا میں یہ راز سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلبِ پاک پر منکشف ہوا کہ دینِ الٰہی ہمیشہ سے ایک تھا، ایک رہا اور ایک رہے گا، نورِ معرفت ایک ہے، خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قندیلوں میں روشن ہو، اصل دین میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی، ایک ہی دین تھا جس کو لے کر اول سے آخر تک تمام انبیا آتے رہے، اس میں زمان ومکان کے تغیر کو کوئی دخل نہ تھا اور نہ قوم و ملک کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا، وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں آیا اور وہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی۔

یہ دائمی حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے؟ یہ مذہب کے اصل اصول ہیں، یعنی خدا کی ہستی، اس کی توحید، اس کے صفاتِ کاملہ، انبیا اور مرسلین کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوقِ انسانی، اخلاقِ فاضلہ، اچھے اور برے اعمال کی باز پرس اور جزا و سزا، یہ تمام مذاہب کے وہ بنیادی امور ہیں جن پر جملہ مذاہبِ حقہ کا اتفاق ہے، اگر ان میں کسی جہت سے کوئی اختلاف ہے تو طریقۂ تعبیر کی غلطی ہے یا باہر سے آکر اس تعلیم میں کوئی نقص شامل ہو گیا ہے۔

دوسری چیز جس کو آنحضرت ﷺ کی زبانِ وحی ترجمان نے شرعہ، منہاج اور منسک کہا ہے، وہ جزئیاتِ احکام اور متفقہ مقصد کے حصول کے جدا جدا راستے ہیں، جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہتے ہیں، مثلاً عبادتِ الٰہی، ہر مذہب کا جزء لازم ہے، لیکن طریق عبادت میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہر مذہب میں موجود ہے، عبادت کے لئے کوئی خاص سمت ہر مذہب نے مقرر کی ہے، مگر وہ سمت خاص خاص مصلحتوں کے لحاظ سے مختلف مقرر کی ہے، اسی طرح اعمالِ قبیحہ کا انسداد تمام مذاہب کا متفقہ نصب العین ہے، مگر اس انسداد کے راستے اور طریقے جدا جدا ہیں، غرض یہ راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانے میں اگر اصلاح وتبدیل کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہے، مگر اصل دین جو ازلی سچائی اور ابدی طاقت ہے، نا قابلِ تبدیل اور نا قابلِ تغیر رہا ہے۔

انبیا علیہم السلام کا دنیا میں وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اسی ازلی و ابدی صداقت کو ہمیشہ اہلِ دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں اور دین کو اس کے اصل مرکز پر ہمیشہ قائم رکھیں،

اور ساتھ ہی اپنی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو قوم کے مناسبِ حال ہوں، وہ اس کو بتائیں اور سکھائیں۔

انبیا کے سوانح پر نظر کرنے سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ ایک صاحبِ شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحبِ شریعت نبی اسی وقت مبعوث ہوا ہے جب کہ اگلا صحیفۂ وحی جو دین و شریعت کا محافظ تھا کھو گیا، یا انسانی دست برد سے ایسا بدل گیا کہ اس کی اصلیت مشتبہ ہوگئی، صحیفۂ ابراہیم کے گم ہوجانے کے بعد جس کا نہایت ناقص خلاصہ توراۃ کے سفرِ تکوین میں ہے، صحیفۂ موسیٰ نازل ہوا، صحیفۂ موسیٰ کے نوپیدا اختلاف کو دور کرنے کے لئے زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے، پھر انجیل آئی اور انجیل میں انسانی تصرفات کے راہ پانے کے بعد قرآن آیا، چوں کہ قرآن دنیا کے آخر تک کے لئے آیا ہے اس لئے ہر تحریف اور انسانی تصرف سے اس کی حفاظت کی گئی ہے اور قیامت تک کی جائے گی، اسی لئے اس کے بعد کسی اور صحیفہ کی ضرورت نہیں ہے اور نہ کسی پیغمبر کی بعثت کی حاجت ہے، البتہ اس کے معانی کی صحیح تشریح اور بدعات و احداثات کے انسداد کے لئے ائمہ، خلفائے مجددین، محدثین اور علمائے راسخین پیدا ہوتے رہے ہیں، اور ہوتے رہیں گے اور ان کی اصلاح کی صداقت کی پہچان سنتِ محمدی کا احیا اور بدعات کا قلع وقمع ہے۔

اب ہم کو پھر اوپر سے چلنا ہے اور اپنے ایک ایک دعوی کو وحی محمدی ﷺ کی روشنی میں دیکھنا ہے۔

وحدتِ دین کی حقیقت کو وحیِ اسلامی کے آخری ترجمان نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ. وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى	اس نے دین میں تیرے لئے وہی راہ مقرر کی جو نوح سے کہی تھی، اور ہم نے تیرے پاس جو حکم بھیجا اور جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور عیسیٰ سے، یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو، مشرکوں کو جدھر تو بلاتا ہے وہ ان پر گراں گذرتا ہے، خدا اپنی طرف جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے اور اپنی طرف اس کو راہ دیتا ہے جو (اس کی طرف) رجوع ہوتا ہے، اور یہ تفرقے لوگوں نے وحی کا علم (حقیقی) ملنے کے بعد آپس کی ضد اور تعصب سے پیدا کئے ہیں، اور

أَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ مِن بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ. فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ ۖ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۖ وَقُلْ آمَنتُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِن كِتَابٍ ۖ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ. (شوریٰ ۴۲:۱۳-۱۵)

اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات وقت مقررہ تک کے لئے نہ ہو چکی ہوتی تو (کشفِ حقیقت کر کے) ان کے اختلافات کا فیصلہ کر دیا جاتا اور جن کو ان اگلوں کے بعد کتاب وراثت میں ملی وہ اس امرِ حق کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جو ان کو چین نہیں لینے دیتا، سو تو سب کو اسی حقیقت کی طرف بلا اور اسی پر استواری سے قائم رہ، جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے اور ان تفرقہ اندازوں کی غلط خواہشوں کی پیروی نہ کر اور کہہ کہ میں ایمان لایا، ہر اس کتاب پر جو خدا نے اتاری اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں، ہمارا رب اور تمہارا رب وہی ایک اللہ ہے، ہم کو ہمارے کاموں کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمہارے کاموں کا، ہم میں تم میں کچھ جھگڑا نہیں، اللہ سب کو اکٹھا کرے گا اور اسی کی طرف پھر جانا ہے۔

ان آیاتِ مبارکہ میں کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہی ایک دین ہے جو نوح کو، ابراہیم کو، موسیٰ کو اور تم کو اے محمد (صلوات اللہ علیہم) عطا کیا گیا ہے، اگلوں کے بعد پچھلوں نے جن کو یہ کتاب ملی، اپنے ذہنی تحریفات اور دستی تصرفات سے اس میں تفرقے پیدا کئے اور آپس کی ضد اور تعصّبات سے فرقہ واری کی الگ الگ راہیں نکالیں، پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس وحدتِ دین کی حقیقت کا یقین اہلِ کتاب کو نہیں ہے، حالاں کہ وہ شکوک وشبہات کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، پھر حکم ہوتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ! تم اس حقیقت کی طرف لوگوں کو بلاؤ، اور استواری کے ساتھ اپنی اس دعوت اور دعوی پر قائم رہو اور یہ اعلان کر دو کہ میرا مسلک یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کتاب بھی دنیا میں آئی ہے، میں اس کی صداقت کو تسلیم کرتا ہوں اور تم اے اہلِ کتاب جو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں بٹ گئے ہو، تمہارے ساتھ انصاف کروں یعنی جس میں جو سچائی ہے اس کو قبول کروں، یا معاملات میں تمہارے ساتھ عدل وانصاف کروں، پھر فرمایا ہمارا اور تمہارا خدا

ایک ہی ہے، دو نہیں، اگر اتحاد چاہو تو اس نقطہ پر ہم تم متحد ہو سکتے ہیں، البتہ ہمارے اور تمہارے راستوں میں جو اختلاف ہے اس کے ذمہ دار ہم تم خود ہیں، نہ تم ہمارے کاموں کے جواب دہ ہو اور نہ ہم تمہارے کاموں کے، اب ہمارے تمہارے درمیان یہاں کوئی جھگڑا نہیں۔

اسی وحدت کی دعوت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانِ وحی نے ایک اور آیت میں دی ہے:

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۝ (آل عمران ۳:۶۴)	اے کتاب والو! آؤ ہم تم ایک بات پر جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے، متفق ہو جائیں، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں اور نہ آپس میں ایک ایک کو خدا کو چھوڑ کر رب بنائے، اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو کہہ دے کہ تم گواہ رہو کہ ہم حکمِ الٰہی کے تابع (مسلم) ہیں۔

یہود و نصاریٰ جنہوں نے اپنی فرقہ واریوں سے اصل دین میں تفریقیں پیدا کر دی تھیں ان کی طرف اشارہ کر کے محمد رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۭ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ. (انعام ۶:۱۶۰)	بے شک وہ جنہوں نے اپنے دین میں الگ الگ راہیں نکالیں اور کئی فرقے ہو گئے تجھ کو ان سے کوئی واسطہ نہیں، ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے، وہی ان کو جتادے گا جو کچھ وہ کرتے تھے۔

پھر دونوں کو اس کے بعد ہی اصل "دین قیم" کی جو ابراہیم کا تھا دعوت دی گئی:

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ڬ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. (انعام ۶:۱۶۱)	کہہ دے کہ میرے خدا نے اس سیدھی راہ کی طرف میری رہنمائی کی جو دین صحیح ہے، ابراہیم حنیف کا مذہب اور وہ (ابراہیم) مشرکوں میں سے نہ تھا۔

غرض اسلام وہ دین قیم ہے جو ہمیشہ انبیا کا دین رہا، اور موجودہ دین اسلام یہود و نصاریٰ کی تحریفات و تصرفات اور فرقہ پروریوں کو مٹا کر اسی ایک متحدہ دین کی پکار ہے، جس کی طرف انبیا اپنے اپنے زمانوں میں ہمیشہ لوگوں کو بلاتے رہے، اسی لئے اکثر انبیا علیہم السلام کے ناموں کو گنانے

کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ ہدایت فرمائی گئی:

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰاهُمُ اقْتَدِهْ (انعام ۶:۹۱) — یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی سو تو انہی کی راہ چل۔

بعض اسلامی حدود و شرائع کی تشریح کے بعد فرمایا گیا:

یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُبَیِّنَ لَکُمْ وَیَهْدِیَکُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ (نساء ۴:۲۶) — خدا چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے بیان کرے اور تم کو ان کے راستے دکھائے جو تم سے پہلے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اپنے حدود و شرائع میں بھی اگلے پیغمبروں کی تعلیمات کے ساتھ اتحاد رکھتا ہے، اور یہ امرِ واقعہ ہے جو لوگ قرآن کا اس لئے انکار کرتے تھے کہ یہ کوئی الگ صحیفہ ہے ان سے کہا گیا:

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی. صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰی (اعلیٰ ۸۷:۱۸،۱۹) — بے شبہ یہ بات اگلے صحیفوں میں تھی یعنی ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

ایک اور آیت میں کہا گیا:

وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ. (شعراء ۲۶:۱۹۶) — اور یہی پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں تھا۔

ایک مقام پر یہ فرمایا گیا:

مَا یُقَالُ لَکَ اِلَّا مَا قَدْ قِیْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِکَ (حم السجدہ ۴۱:۴۳) — (اے محمد) تجھ سے (اس کتاب میں) وہی کہا گیا ہے جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا۔

اس اعلان میں یہ ظاہر کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ سے وہی کہا گیا جو اگلے پیغمبروں سے کہا جا چکا تھا، ان معنوں میں قرآن کوئی نئی دعوت لے کر نہیں آیا ہے، بلکہ یہ اسی پرانی دعوت کی تکرار ہے، جس کی آواز دنیا سے گم ہو چکی تھی یا دب گئی تھی، اگر فرق ہے تو اجمال و تفصیل یا نقص و تکمیل کا کہ اسلام گذشتہ اجمال کی تفصیل اور دین سابق کی تکمیل ہے۔

اس لئے اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا، ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا، اور ایک ہی حقیقت تھی جو دہرائی جاتی رہی، لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلتی رہی، گم ہوتی رہی اور آخری دفعہ دنیا کے

کمالِ بلوغ کے زمانہ میں وہ پوری حفاظت کے وعدہ کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوئی اور قیامت تک محفوظ و باقی رہے گی۔

دوسری چیز جس کی مذہب میں ثانوی حیثیت ہے اور جو اصل مقصد نہیں ذریعہ ہے، وہ بدلتی رہتی ہے، اور عہدِ محمدی ﷺ تک برابر بدلتی رہی ہے، اس کا نام شرعہ، منہاج اور منسک ہے، یہودیوں کو آنحضرت ﷺ پر اعتراض تھا کہ آپ یہودی شریعت کے جزئیات میں کیوں تبدیلی کرتے ہیں، قرآن نے اس کے جواب میں یہی ہمیشہ کہا کہ یہ مقصود نہیں ذرائع ہیں، اصول نہیں فروع ہیں، ہر قوم کی مناسبت سے ان میں تغیر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، اس کی ایک مثال قبلہ ہے کہ مقصودِ اصلی نماز ہے اور سمت کا تعین ایک فرعی اور ثانوی چیز ہے، بنی اسرائیل کو اپنی آبائی مسجد (بیت المقدس) سے گرویدگی تھی وہ ان کا قبلہ ہوئی، ابراہیمی عربوں کو اپنی مرکزی مسجد (کعبہ) سے وہی دل بستگی اور لگاؤ تھا اس لئے یہ ان کا قبلہ بنی، چنانچہ قرآن نے تعیین قبلہ کے موقع پر کہا:

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (بقرہ۲:۱۴۸)

اور ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے، سو تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔

یعنی سمتوں اور جہتوں کی تعیین کو اہمیت کی چیز نہ سمجھو بلکہ نیکیوں کو اصلی اہمیت دو، اس لئے فرمایا:

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ...... الآية (بقرہ۲:۱۷۷)

نیکی یہی نہیں ہے کہ تم پورب یا پچھم کی طرف رخ کرو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو اللہ پر ایمان لائے (اور دوسرے نیک کام کرے)۔

اسی طرح خانۂ کعبہ کا حج یہودیوں میں نہ تھا، اسلام نے جب اس کو رائج کیا تو کہا ہر گروہ نے اپنے عام مذہبی اجتماع اور قومی عبادت کے لئے کوئی نہ کوئی طریقہ مقرر کیا ہے اور اسلام نے خانۂ کعبہ کے حج کو اس لئے تجویز کیا ہے:

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلٰى رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيمٍ. وَإِنْ جَادَلُوكَ فَقُلِ

ہر قوم کے لئے ہم نے عبادت کا طریقہ بنایا جس کی اس قوم کے لوگ مذہباً پابندی کرتے ہیں، سو اس بات میں وہ تجھ سے جھگڑا نہ کریں، تو اپنے رب کی طرف بلائے جا، تو

اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ۔ (حج ۲۲: ۶۷، ۶۸)

بے شک سوجھ کی سیدھی راہ پر ہے اور اگر وہ تجھ سے جھگڑنے لگیں تو کہہ دے کہ اللہ بہتر جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

سورۂ مائدہ میں عدل وانصاف اور قانونی جزاوسزا کے طریقوں کے ضمن میں ان یہودیوں اور عیسائیوں سے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا، یہی کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی کتابوں ہی کے احکام پر عمل کریں، جن کو وہ چھوڑ بیٹھے ہیں:

پہلے یہودیوں سے کہا:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ‌ ۚ يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ الَّذِيۡنَ اَسۡلَمُوۡا لِلَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَالرَّبّٰنِيُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوۡا عَلَيۡهِ شُهَدَآءَ (مائدہ ۵: ۴۴)

ہم نے توراۃ اتاری، اس میں ہدایت اور روشنی تھی، پیغمبر جو حکم بردار تھے وہ یہود کا فیصلہ کرتے اور ان کے عالم اور فقیہ کہ اللہ کی کتاب پر وہ نگہ بان تھے اور وہ تھے اس پر خبردار۔

پھر عیسائی شریعت کی نسبت کہا:

وَقَفَّيۡنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمۡ بِعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ التَّوۡرٰىةِ‌ ۚ وَاٰتَيۡنٰهُ الۡاِنۡجِيۡلَ فِيۡهِ هُدًى وَّنُوۡرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ التَّوۡرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِيۡنَ۔ وَلۡيَحۡكُمۡ اَهۡلُ الۡاِنۡجِيۡلِ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ (مائدہ ۵: ۴۶، ۴۷)

اور ہم نے ان پیغمبروں کے پیچھے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا، سچ بتاتا ہوا اس کو جو اس کے پہلے تھا یعنی تورات اور ہم نے اس کو انجیل دی اس میں ہدایت اور روشنی ہے اور تصدیق کرتی ہوئی اپنے سے پہلے کی یعنی تورات کی اور ہدایت اور نصیحت پرہیزگاروں کے لئے اور چاہئے کہ انجیل والے اس کا حکم دیں جو اس میں خدا نے اتارا۔

اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے کہا:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ‌ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ‌ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الۡحَـقِّ‌ ۚ (مائدہ ۵: ۴۸)

اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب سچائی کے ساتھ اتاری جو اپنے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور امانت کے ساتھ اس پر شامل ہے، سو تو ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو خدا نے اتارا اور تیرے پاس جو سچائی آئی ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔

دیکھو کس خوبی کے ساتھ صحیفۂ محمدی ﷺ نے اگلی کتابوں کی تصدیق اور مدح وتعریف کی اور ان اہلِ مذاہب کو جو اسلام پر ایمان نہیں لائے اپنی اپنی کتبِ منزلہ پر عمل کرنے کی دعوت دی اور پھر یہ دعویٰ کیا کہ قرآن تمام گذشتہ کتابوں پر امین و محافظ بن کر آیا ہے اور اس میں ان سب کتابوں کی سچائیاں یک جا ہیں لیکن ان لوگوں نے اپنی اپنی کتابوں کو چھوڑ کر اہوا (غلط خواہشوں) کی پیروی شروع کردی، یہ اہواء کیا ہیں؟ کتابِ الٰہی میں تحریف وتصرف کرکے آسانیاں پیدا کرنا اور احکامِ الٰہی کے مقابلہ میں انسانی اجتہادات کی آمیزش، "فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (افسوس ہے ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب بناتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے) (بقرہ ۲:۷۹)، آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ شریعتِ الٰہی کو چھوڑ کر ان اہلِ کتاب کی اہوا کی پیروی نہ کریں اس کے بعد حدودِ جزا وسزا میں ان خفیف اختلافات اور تبدیلیوں کو جو تورات، انجیل اور قرآن میں ہیں غیر اہم بتایا گیا، فرمایا:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا (مائدہ ۵:۴۸)

ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک دستور اور ایک راستہ بنا دیا۔

ان ہی اختلافات کی بنا پر یہود اور نصاریٰ دونوں ایک دوسرے کو بر سرِ باطل کہتے تھے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (بقرہ ۲:۱۱۳)

اور یہود نے کہا نصاریٰ کسی راہ پر نہیں اور نصاری نے کہا یہود کسی راہ پر نہیں، حالاں کہ وہ دونوں خدا کی کتاب پڑھتے ہیں۔

دونوں مل کر مسلمانوں سے کہتے تھے:

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا (بقرہ ۲:۱۳۵)

اور انہوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔

ارشاد ہوا کہ تم دونوں اپنے اپنے الگ راستوں کو چھوڑ کر آؤ اور اصل دین ابراہیمی پر متفق ہو جاؤ:

قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ

کہہ بلکہ ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جو موحد تھا، مشرک نہ تھا، تم لوگ کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری

اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ. فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ (بقرہ۲: ۱۳۵-۱۳۷)

طرف اترا اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو سب نبیوں کو ان کے خدا کی طرف سے دیا گیا، سب پر ایمان لائے، ہم ان رسولوں میں فرق نہیں کرتے اور ہم اس ایک خدا کے تابع ہیں، تو اگر یہ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو انہوں نے ہدایت پائی اور اگر روگردانی کریں تو وہی ہیں ضد اور مخالفت پر۔

یہود اور نصاریٰ کو یہ دعویٰ تھا:

لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (بقرہ۲: ۱۱۱)

یہود اور نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔

جواب دیا گیا:

تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ (بقرہ۲: ۱۱۱)

یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں۔

بلکہ:

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (بقرہ۲: ۱۱۲)

ہاں جس نے بھی اپنے کو خدا کا مطیع بنایا اور وہ نیکوکار ہے تو اس کی مزدوری اس کے خدا کے پاس ہے، نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غم۔

تمام اہلِ مذاہب کو یکساں خطاب کر کے فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَ الصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (بقرہ۲: ۶۲)

بے شک جو ایمان لائے (یعنی مسلمان) جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئی، جو بھی خدا پر اور آخری دن پر ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس ہے، نہ ان پر خوف ہوگا، نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اب جو ایمان لائے یعنی مسلمان اور جو یہودی بنے اور نصاریٰ اور صابئین ان میں سے جو

بھی اپنے اپنے دور نبوت میں خدا کی توحید پر، روزِ آخر کی صداقت پر ایمان لایا اور اچھے عمل کئے ان کو اپنے عمل کا پورا ثواب ملے گا، یعنی جس نے بھی اپنے اپنے پیغمبر کی اصلی تعلیم اور سچی شریعت کے مطابق جو شرک وکفر اور بت پرستی سے یقیناً پاک تھی، عمل کیا اس کو اس کا ثواب ملے گا، خدا کی توحید اور روزِ آخر کی صداقت پر ایمان لانا اور اچھے کام کرنا صرف عقل کی ہدایت سے نہیں ہوسکتا بلکہ کسی رسول کی تعلیم ہی سے ہوسکتا ہے اور اس پر تمام اہلِ مذاہب کا اتفاق ہے اس لئے رسالت کی تصدیق بھی اس کے ضمن میں داخل ہے کہ:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا. اُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا وَ اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا. وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِکَ سَوْفَ یُؤْتِیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًاo (نساء۴:۱۵۰-۱۵۲)	بے شک جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں جدائی کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ وہ اس میں درمیان کا راستہ اختیار کریں، وہی حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے اہانت کرنے والا عذاب تیار کیا ہے اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کا بھی انکار نہیں کیا، یہ وہ ہیں جن کو ان کی مزدوریاں خدا دے گا اور خدا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

دوسری آیت میں ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ (نور۲۴:۶۲)	مومن وہی ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔

اس بنا پر ان آیتوں سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ قبولِ عمل کے لئے ایمان شرط ہے، دوسری یہ کہ ایمان و عمل کے لئے نبی کی تصدیق ضروری ہے، اسی لئے اوپر جن چار فرقوں کا ذکر ہوا وہ چاروں وہ ہیں جو کسی نہ کسی پیغمبر کے ماننے والے ہیں، اس بنا پر کامل اسلام یہ ہے کہ تمام رسولوں کو صادق مانا جائے، چنانچہ اس کی تفصیل سورۂ مائدہ میں ہے:

قُلْ یٰٓاَهْلَ الْکِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی	کہہ دے اے کتاب والو تم کچھ نہیں جب تک تم توراۃ

تُقِيْمُوا التَّوْرٰةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ
اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ
اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۚ فَلَا
تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. اِنَّ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصَّابِئُوْنَ وَ
النَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُوْنَ. (مائدہ ۵: ۶۸، ۶۹)

اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف اتارا گیا اس کو قائم نہ کرو اور (اے پیغمبر) جو تیری طرف اترا ہے وہ ان کی سرکشی اور انکار کو اور بڑھائے گا، تو ان منکروں کا غم نہ کر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے اور صابی اور عیسائی، جو خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان لایا اور اچھے کام کئے تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس کے بعد ہی اس کا ذکر ہے کہ یہودیوں نے ہمیشہ رسولوں کا انکار کیا، اور نصاریٰ توحید کو چھوڑ کر تثلیث اور الوہیتِ مسیح میں مبتلا ہو گئے، اس لئے اصل اسلام سے یہ دونوں ہٹ گئے ہیں، فرمایا:

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ
اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ
بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا
يَّقْتُلُوْنَ. وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ
فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ
عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ. لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ
الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ
مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ
الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ
اَنْصَارٍ. لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ
ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنْ لَّمْ

بے شک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف کئی رسول بھیجے، جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی نفسانی خواہشوں کے خلاف احکام لے کر آیا تو انہوں نے کتنوں کو جھٹلایا اور کتنوں کا خون کرنے لگے اور خیال کیا کہ اس سے کچھ خرابی نہ ہوگی، سو اندھے ہو گئے اور بہرے، پھر خدا ان پر رجوع ہوا، پھر ان میں بہتیرے اندھے اور بہرے ہو گئے اور اللہ دیکھتا ہے، وہ جو کرتے ہیں، بے شبہ وہ کافر ہوئے، جنہوں نے یہ کہا کہ مریم کا بیٹا مسیح ہی اللہ ہے، مسیح نے تو یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کو پوجو جو میرا اور تمہارا رب ہے، بے شک جو اللہ کا شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور گنہ گاروں کی کوئی مدد کرنے والا نہیں، بے شبہ وہ کافر ہوئے جنہوں نے کہا اللہ تین میں

يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝ (مائدہ ۵: ۷۰-۷۳)

تیسرا ہے، حالاں کہ کوئی اللہ نہیں مگر وہی ایک، اگر وہ اپنے اس قول سے باز نہ آئے تو ان میں سے کافروں کو یقیناً دردناک عذاب چھوئے گا۔

یہ تو ان یہود و نصاریٰ کے ایمان کا حال تھا، اس کے بعد اسی رکوع میں ان کے حسنِ عمل کا جائزہ لیا گیا ہے اور اسی کے بعد ہی ان سے کہا گیا ہے:

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ. (مائدہ ۵: ۸۱)

اور اگر اللہ اور اس نبی پر اور جو اس نبی پر اترا اس پر یہ لوگ ایمان لے آتے تو ان (مشرکوں) کو وہ اپنا دوست نہ بناتے لیکن ان میں اکثر نافرمان ہیں۔

اسلام یعنی تمام نبیوں اور رسولوں کے واحد اور مشترک دین کا اصل الاصول دو باتیں ہیں، توحیدِ کامل اور رسالتِ عمومی، یعنی اللہ تعالیٰ کو توحید کی تمام صفتوں میں کامل بلاشریک ماننا اور اس کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں صادق اور راست باز تسلیم کرنا، چنانچہ فرمایا:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ. قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ. وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ.

(آل عمران ۳: ۸۳-۸۵)

کیا وہ دینِ الٰہی کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں، حالاں کہ جو بھی آسمانوں میں اور زمین میں ہے، وہ خوشی سے یا مجبوراً خدا کا مسلم یعنی فرماں بردار ہے اور اسی کی طرف سب لوٹائے جائیں گے (اے پیغمبر) کہہ کہ ہم اللہ پر اور جو اس نے ہم پر اتارا اور جو ابراہیم پر اور اسماعیل پر اور اسحٰق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولادوں پر اترا اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور سب پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے ملا، ہم سب کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں، ہم ان میں سے کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرماں بردار ہیں اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ خدا پر اور تمام رسولوں پر ایمان لانا دین اللہ ہے اور اسی کا نام اسلام ہے، جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا، آلِ عمران میں ہے کہ یہود و نصاریٰ تاویلاتِ باطلہ اور اتباعِ متشابہات کی وجہ سے گمراہ ہوگئے، یعنی دین اسلام سے روگرداں ہو کر اختلافات میں پڑ گئے، فرمایا:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ. فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ (آل عمران ۳: ۱۹، ۲۰)	بے شک دین خدا کے نزدیک اسلام ہے اور جن کو کتاب دی گئی، انہوں نے علم آنے کے بعد اس میں آپس کی ضد کے سبب سے اختلاف کیا اور جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرے گا تو اللہ جلد حساب لینے والا ہے تو اگر (اے پیغمبر) یہ تجھ سے پھر کج بحثی کریں تو کہہ دے کہ میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اپنے کو خدا کا تابع فرمان (مسلم) کر دیا ہے۔

اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ سے سوال کریں کہ وہ اسلام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں:

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ. (آل عمران ۳: ۲۰)	اور اے پیغمبر ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ دے کہ کیا تم نے بھی اسلام قبول کیا اگر کیا تو انہوں نے سیدھی راہ پائی اور اگر انکار کیا تو تجھ پر صرف پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہے۔

یہود و نصاریٰ کو اس اسلام کے قبول کرنے پر ہدایتِ تامہ کے ملنے کی بشارت ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ''ہدایتِ تامہ'' ہے، یہی وہ دین ہے جس کو یہود و نصاریٰ اور تمام اہلِ مذاہب نے جو کسی گذشتہ پیغمبر کی امت ہوں کھو دیا تھا اور اب جس کو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے دوبارہ دنیا میں پیش کیا گیا ہے، اس لئے جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ ناقص تھی اور اسلام جس کو لے کر آیا وہ کامل ہے، نیز یہ معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ ''اب جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصرانی اور صابئ جو بھی خدا اور یومِ آخر پر ایمان لایا اور اس نے نیک کام کیا، اس کو

خوف و غم نہ ہوگا''، ان میں خدا پر ایمان لانے سے مقصود ''توحیدِ کامل'' ہے اور اس کا یہ منشا نہیں کہ یہود و نصاریٰ اور صابئ وغیرہ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کے مستحق ہیں، یہود و نصاریٰ کیا، مسلمان بھی اس توحیدِ کامل کے بغیر نجات کے مستحق نہیں، جب تک مسلمانوں کا ایمان اور عملِ صالح ٹھیک اس تعلیم کے مطابق نہ ہو جو ان کے رسول کے ذریعہ سے دنیا میں آئی ہے، یہ اصول ہر ایک کے لئے ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا یہودی، عیسائی ہو یا صابئ، غرض کسی نبی کی پیروی کا مدعی ہو۔

نبوتِ محمدی ﷺ کا یہ دعویٰ نہیں کہ وہی ایک ہدایت ہے اور اس کے سوا سب ضلالت ہے، بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی ایک کامل ہدایت ہے اور بقیہ مذاہبِ سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں، یعنی وہ ابدی کامل ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب نبی لے کر آتے رہے چوں کہ ان کے پیرو اپنے تاویلات، تحریفات، تصرفات اور اختلافات سے اس کو برباد کر چکے تھے اس لئے محمد رسول اللہ ﷺ اسی کو لے کر آخری دفعہ تشریف لائے اور اب وہ ہدایت ہمیشہ کامل رہے گی، کبھی ناقص نہ ہوگی کیوں کہ اس کا صحیفۂ ہدایت (قرآن) تحریف و اختلاف اور تصرف سے محفوظ و پاک رہے گا۔

یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو نبوتِ محمدیؐ کی دعوت جہاں دی گئی ہے ''ہدایت'' کی بشارت بھی سنائی گئی ہے چنانچہ اسی آیت میں جو ابھی اوپر گذری یہ ہے:

وَقُلْ لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ (آل عمران ۳:۲۰)	اے پیغمبر! ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ کیا وہ اسلام لائے، اگر اسلام لائے تو انہوں نے سیدھی راہ پائی۔

سورۂ بقرہ میں ہے:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَمَآ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ . فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا	(اے مسلمانو!) کہو کہ ہم اللہ پر اور جو ہماری طرف اترا اور جو ابراہیم پر اور اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولاد پر اترا اور جو موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، (سب پر) ایمان لائے ہم ان میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے، اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرماں بردار ہیں، تو اگر یہ بھی

فَاِنَّمَاهُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ (بقرہ۲: ۱۳۶، ۱۳۷) اسی طرح مانیں جس طرح تم نے مانا تو انہوں نے سیدھی راہ پائی اور اگر اس سے باز رہیں تو وہ محض ضد پر ہیں۔

یہود و نصاریٰ اور اہلِ کتاب کو تعلیم محمدی ﷺ کی طرف دعوت اسی ''ہدایت'' کے پانے کے لئے ہے جو اسلام یعنی انبیا کے دین ازلی سے عبارت ہے اور جس کو لے کر محمد رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے اور اب فلاح و نجات اسی کے ماننے پر منحصر ہے:

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ۚ وَبِالْاٰخِرَۃِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ. اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (بقرہ۲: ۴، ۵)

جو اس کو جو تیری طرف (اے پیغمبر!) اترا اور جو تجھ سے پہلے اترا، دونوں کو مانتے ہیں اور پچھلی زندگی پر یقین رکھتے ہیں وہی اپنے پروردگار کی ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے قصہ کے بعد فرمایا کہ رحمتِ الٰہی گو عام ہے، مگر یہ نعمت خاص طور سے ان کا حصہ ہے جو تعلیم محمدی ﷺ کو قبول کریں اور وہی نجاتِ کامل کے مستحق ہیں:

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ۭ فَسَاَکْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ. اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ ۡ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ ۭ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعَا ۨ الَّذِیْ

اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہے تو اس رحمت کو میں ان کے لئے لکھ دوں گا جو پرہیزگار ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہمارے حکموں کو مانتے ہیں جو اس ان پڑھ فرستادہ پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں، جو ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے باز رکھتا ہے اور اچھی چیزوں کو ان کے لئے حلال کرتا ہے اور بری چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان کے بندھن کو اور ان زنجیروں کو جو ان پر پڑی تھیں اتارتا ہے تو جنہوں نے اس پیغمبر کو مانا اور اس کی تائید کی اور اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے چلے جو اس کے ساتھ اتری، وہی کامیاب ہیں' کہہ دے (اے پیغمبر) کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا رسول ہوں جس کی آسمانوں اور زمین کی

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ.

(اعراف ۷: ۱۵۶-۱۵۸)

شہنشاہی ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے، سو اللہ اور اس کے اس ان پڑھ پیغام رساں رسول پر ایمان لاؤ جو اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس رسول کی پیروی کرو تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ۔

ان آیات میں صاف ظاہر کر دیا گیا کہ گذشتہ مذاہب کے پیرووں کو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اس لئے ضروری ہے کہ وہ دین خالص جو انسانی تصرفات اور آمیزشوں سے مکدر ہو گیا تھا وہ صحفِ الٰہی کی پیشین گوئیوں کے مطابق آپ ﷺ کے ذریعہ پھر نکھارا گیا ہے اور جن اضافوں اور جزئیاتِ احکام کی سختیوں کو انسانوں نے اس میں شامل کر دیا تھا وہ آپ ﷺ کے ذریعہ سے دور کی گئیں، نیز آپ ﷺ عالم گیر پیغمبر بنا کر مبعوث کئے گئے ہیں، اس لئے ہدایتِ تامہ، نبوتِ عمومی اور نجاتِ کامل اور فلاحِ عام اب صرف وحیِ محمدی ﷺ کے اندر محدود ہے۔

الغرض دین محمدی ﷺ کو قبول کرنا اس لئے تمام انسانوں پر ضروری ہے کہ وہ دین ازلی جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس کے پیرووں کی تحریف و تصرف سے برباد ہو گیا تھا اسی کو صحیفۂ محمدی لے کر آیا ہے، اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا کیوں کہ اس کا نبی خاتم النبیینؐ، اس کا دین کامل دین اور اس کا صحیفہ تمام صحفِ الٰہی پر مہیمن اور حاوی ہے اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقا کا وعدہ کیا گیا ہے، یہ چاروں دعوے یعنی تکمیلِ دین، قرآن کا مہیمن ہونا، قیامت تک اس کا محفوظ و باقی رکھنا اور ختمِ نبوت حسب ذیل دلائل سے ثابت ہیں۔

تکمیلِ دین: قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے اور اس کے ذریعہ سے دین الٰہی اپنے تمام اصول و فروع (مناسک و مناہج و شرائع) کے لحاظ سے تکمیل کو پہنچ گیا، بلکہ گذشتہ مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور نبوت آئے گی جو اس کے کام کی تکمیل کرے گی، خدا نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا:

"میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔" (استثناء ۱۸: ۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ کے بعد ان کے مانند ایک اور نبی آنے والا تھا جس کے منہ میں اللہ تعالیٰ خود اپنا کلام ڈالے گا، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت موسیٰ کی طرح ایک اور صاحبِ شریعت نبی خدا کے نئے کلام کے ساتھ آئے گا، اسی طرح حضرت عیسیٰ نے بھی کہا:

"لیکن وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی روح ہے جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں تمہیں یاد دلائے گا۔" (یوحنا ۱۴:۲۶)

اور وہ فارقلیط (احمد) آکر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصور وار ٹھہرائے گا، گناہ اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے ...... میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی اس لئے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ سنے گی سو کہے گی، میری بزرگی کرے گی، (یوحنا ۱۶:۹-۱۲-۱۳)

حضرت عیسیٰ نے بھی اپنے کلام کو ہنوز ناتمام ہی فرمایا اور ایک آئندہ آنے والے کا پتہ دیا جو اس کی تکمیل کرے گا۔

آخر وہ موعود الامم ﷺ آیا اور دعویٰ کیا کہ میں موسیٰ کے مانند بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے آیا ہوں اور میرے منہ میں خدا نے اپنی بولی ڈالی ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی وہ سچائی کی روح ہوں جو مسیح کی اصلی بڑائی ظاہر کرنے، سچائی کی راہ بتانے اور مسیح کی ادھوری بات کو کامل کرنے کے لئے آئی ہے، میں اپنی نہیں کہتا بلکہ وہی کہتا ہوں جو اوپر سے سنتا ہوں اور آخر زمانہ نبوت کے ختم پر وحیِ الٰہی نے اس کی زبان سے یہ اعلانِ عام کیا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا. (مائدہ ۵:۳) — آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کا دین پسند کیا۔

اسی تکمیل کا یہ اثر تھا کہ اس نے یہود کے بعض سخت فقہی احکام کو جو ان کی سخت گیری کے لئے ان پر عائد تھے اور اصل دین ابراہیمی میں داخل نہ تھے (۱) یا انسانوں کے اضافے اور تصرفات تھے، بدل کر ایسے مناسب اور آسان احکام عطا کئے جو ہر زمانہ کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں، اسی لئے

(۱) دیکھو آیت كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ...... الآية (آل عمران ۳:۹۳)

اس نے کسی اپنے بعد میں آنے والے پیغمبر کی پیشین گوئی نہیں کی، نہ کسی نئے کلام کے نزول کی خبر دی، نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا کہ تکمیل کے بعد اب کسی نئے آنے والے، کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقع کہاں؟ اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ (جو محمد ﷺ سے پہلے نازل کیا گیا) پر ایمان لانے کی تاکید کی لیکن "وما انزل من بعدک" کے قبول کرنے کا کہیں اشارہ تک نہیں کیا۔

قرآن مہیمنِ کتب ہے: اس دین کامل کا صحیفہ تمام اگلی کتابوں کا مصدق ہے:

مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ	(مائدہ ۵:۴۸)	اپنے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا۔

وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے، اس لئے جو کوئی اس صحیفہ کو قبول کرتا ہے وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کر لیتا ہے، یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسرے صحیفہ کو حاصل نہیں، فرمایا:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا	اور ہم نے (اے محمد!) تیری طرف سچائی کے ساتھ یہ
بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ الْکِتٰبِ وَ مُھَیْمِنًا عَلَیْہِ	کتاب اتاری جو اپنے سے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی
(مائدہ ۵:۴۸)	ہے اور اس پر شاہد و حاوی ہے۔

لفظ "مہیمن" کی تفسیر اہل زبان مفسروں نے یہ کی ہے:

ابن عباسؓ: شاہد اور امین، قرآن اپنے پہلے کی ہر کتاب کا امین ہے۔

قتادہؒ: قرآن سے پہلے جو کتابیں تھیں ان کا وہ امین اور شاہد ہے۔

غرض قرآن اگلی کتابوں کی صداقتوں اور سچی تعلیموں کی امانت اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن محفوظ ہے اور رہے گا: پیغمبر کی حفاظت اس کے صحیفۂ الٰہی کی حفاظت پر موقوف ہے، قرآن سے پہلے کوئی کتابِ الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر بری نہیں رہی، لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو کر نئے قالب میں بدلتا رہا ہے، توراۃ جل جل کر خاک ہوئی پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی، انجیل میں تحریف و جعل تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا، پھر مترجموں کی کتر بیونت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی، زردشت کا صحیفہ سکندر کے نذر رہوا، اب صرف گاتھا کا ایک

حصہ بچا کھچا رہ گیا ہے، ان کتابوں کا یہ حال اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دائمی اور آخری کتابیں بنا کر نہیں بھیجا تھا، اسی بنا پر ان کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا گیا لیکن قرآن کی نسبت یہ وعدہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لئے باقی اور محفوظ رہے گا، اس کی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی، فرمایا اور کس وثوق سے فرمایا:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ۔ (حجر ۹:۱۵)	ہم نے اس نصیحت (کی کتاب) کو اتارا اور بے شبہ ہم ہیں اس کی حفاظت کرنے والے۔

یہ وعدۂ الٰہی ایک اور آیت میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے:

اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ. فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ. ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ. (قیامہ ۷۵:۱۷-۱۹)	بے شک ہمارے ذمہ ہے اس (قرآن) کو سمیٹ کر رکھنا، اور اس کا پڑھنا پھر جب ہم پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کے ساتھ رہ پھر بے شبہ ہم پر ہے اس کو کھول کر بتانا۔

اس آیت میں قرآن کی قرأت یعنی لفظ و عبارت اور بیان یعنی معنی دونوں کی ذمہ داری خدائے تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے، تیسری آیت میں اس کی تصریح ہے کہ اس حق میں باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ پاسکے گی، فرمایا:

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيۡزٌ. لَّا يَاۡتِيۡهِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِهٖ ؕ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ حَكِيۡمٍ حَمِيۡدٍ. (حٰم السجدہ ۴۱:۴۱،۴۲)	اور بے شک یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو غالب ہے باطل نہ اس کے سامنے سے اور نہ اس کے پیچھے سے اس کے پاس آئے گا، ایک حکمت والے اور خوبیوں والے کی طرف سے اترا۔

اس کتاب کو غالب فرمایا گیا یعنی جو اپنے ہر حریف کو اپنے دلائل کے زور سے پست کرے گی، باطل نہ اس کے سامنے سے اس میں مل سکتا ہے اور نہ پیچھے سے، یعنی نہ لفظ و عبارت کی طرف سے اور نہ حقیقت و معنی کی جہت سے کیوں کہ وہ ایک حکمت والے کی طرف سے اتری ہے اس لئے وہ اپنی حکمت و دانائی کی تعلیم سے غالب رہے گی اور چوں کہ وہ ایک سراسر خوبیوں والے کی جانب سے عطا ہوئی ہے، اس لئے ہر باطل کے عیب سے پاک رہے گی۔

یہ قرآن کا اپنا دعویٰ ہے اور ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔

ختم نبوت: مقدمات بالا کا نتیجہ خود یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی نبی کی، قرآن کے بعد کسی صحیفہ کی اور اسلام کے بعد کسی دین کی ضرورت نہ ہو لیکن وحیِ محمدی نے ہر شک کے ازالہ کے لئے آگے بڑھ کر یہ تصریح بھی کر دی کہ اب نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور آپ ﷺ کے بعد کسی نبی کی حاجت نہیں کہ دین کامل اور صحیفہ الٰہی محفوظ ہو چکا اور ہدایتِ ربانی کے دروازہ کے بند ہونے کا خطرہ دور ہو گیا، چنانچہ خود تاریخ انسانی گواہ ہے کہ بعثتِ محمدی ﷺ کے بعد سے دنیا کی حالت بدل گئی، متفرق قومیں پیوستہ ہو گئیں، زمین کے کونے ایک دوسرے سے مل گئے اور توحیدِ کامل کا غلغلہ عرش سے فرش تک بلند ہو گیا اور خدا کے تمام رسولوں کو سچا اور صادق ماننے کا ولولہ آہستہ آہستہ ترقی پانے لگا، یہاں تک کہ ان قوموں نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئیں ان دونوں صداقتوں کو اصولاً تسلیم کر لیا۔

وحدتِ ادیان اور دینِ اسلام: تفصیلِ بالا کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ وحدتِ ادیان کا منشا کیا ہے، یعنی یہ کہ اصل میں ایک ہی دین ہے جو تمام انبیا کا مذہب رہا لیکن وہ بعد کو ان کے پیروؤں کے صحائف میں تحریف و تصرف کے سبب سے بگڑتا رہا، اسی دین ازلی کو لے کر محمد رسول اللہ ﷺ آئے اور اسی کا نام اسلام ہے، جو اپنے صحیفہ کی بقا و حفاظت اور دین کی تکمیل اور نبوت کے اتمام کے سبب سے ہمیشہ قائم و باقی رہے گا، اگر تمام مذاہبِ سابقہ اپنے اپنے اس اصل دین پر آجائیں جس کی تعلیم ان کے پیغمبروں نے دی تھی تو وہ وہی دین ازلی ہوگا جس کا نام اسلام ہے اور نوحی، ابراہیمی، موسوی، عیسوی اور محمدی میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہے گا، اسی لئے فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓي اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ... (نساء۴: ۴۷)	اے وہ لوگو جن کو پہلے کتاب دی گئی، اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور ان کو پیٹھ کی طرف پھیر دیں یا سبت کے گنہ گاروں پر جس طرح لعنت کی تھی ہم ان پر لعنت کریں، اس وحی پر ایمان لاؤ جو ہم نے اب اتاری، (قرآن) جو ان تعلیمات کی جو تمہارے پاس ہیں تصدیق کرتی ہے۔

مشرکینِ عرب سے زیادہ اہل کتاب کو اس حقیقت کے سمجھنے کا زیادہ استحقاق تھا، اس لئے

ان ہی کو سب سے پہلے اس کا منکر نہ ہونا چاہیے:

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ (بقرہ۲:۴۱)	اور جو کتاب ہم نے اب اتاری جو تمہارے پاس والی کتاب کو سچا بتاتی ہے اس پر ایمان لاؤ اور تم پہلے کافر نہ بنو۔

لیکن ان کی حالت یہ ہوئی کہ:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ (بقرہ۲:۹۱)	اور جب ان سے کہا گیا کہ خدا نے جو بھی اتارا اس پر ایمان لاؤ تو جواب دیا کہ جو ہم پر اترا ہم اس کو مانتے ہیں اور وہ اس کے سوا کا انکار کرتے ہیں حالاں کہ یہی (قرآن) حق ہے اور جو ان کے پاس ہے اس کی تصدیق کرتا ہے۔

اس کے برخلاف محمد رسول اللہ ﷺ نے جس دین کو پیش کیا اس کی بنیاد تمام اگلی نبوتوں اور کتابوں کی صداقت کے تسلیم کرنے پر رکھی گئی، یہی سبب ہے کہ اسلام نے کسی کے مسلمان ہونے کے لئے صرف یہی ضروری نہیں قرار دیا کہ وہ تنہا محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایمان لائے بلکہ یہ بھی ضروری قرار دیا کہ وہ تمام نبوتوں اور صحیفوں پر ایمان لائے ، چنانچہ خود قرآن کی شہادت ہے کہ آنحضرت ﷺ کو صرف اسی کی تکلیف نہ تھی کہ آپ کے ہم وطن آپ کے صحیفہ کو نہیں مانتے تھے، بلکہ اس کی بھی تھی کہ وہ اگلے صحیفوں کو بھی نہیں مانتے تھے، سورۂ سبا میں ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (سبا۳۴:۳۱)	اور منکروں نے کہا کہ ہم اس قرآن پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے اور نہ اس سے اگلی کتاب پر (یعنی تورات پر)۔

اور اسی لئے آنحضرت ﷺ نے تصریح کے ساتھ فرمایا کہ جو میری عبودیت اور رسالت کے ساتھ عیسیٰ بن مریم کو بھی خدا کا بندہ اور اس کا رسول اور کلمہ اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی روح تسلیم کرے گا وہ جنت میں جائے گا(۱)، الغرض وہ ازلی و ابدی دین صرف ایک ہی تھا اور تمام انبیا علیہم السلام اسی ایک پیغام کو لے کر دنیا میں آئے تھے، یہی وحدتِ دین کی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے اپنے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

(۱) بخاری کتاب الانبیاء، باب قولہ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا الخ ج ۱ ص ۴۸۸۔

يَاأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوا صَالِحًا ط إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ. وَإِنَّ هٰذِهٖ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ. فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ط كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ. (مومنون۲۳:۵۱-۵۳)	اے پیغمبرو! ستھری چیزیں کھاؤ اور بھلا کام کرو، میں تمہارے کاموں سے آگاہ ہوں اور بے شک تم سب کی امت ایک امت ہے اور میں تم سب کا (ایک) پروردگار ہوں، تو مجھ سے ڈرتے رہو، تو ان کے پیروؤں نے اپنے مذہب کو آپس میں ٹکڑے کر ڈالا، ہر فرقہ اپنے پاس کے خیال پر نازاں ہے۔

اسی حقیقت کی مزید تشریح آنحضرت ﷺ نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

الانبیاء اخوۃ لعلات امہاتہم شتی و دینہم واحد.(۱)	تمام انبیا ایسے بھائی ہیں جن کا باپ ایک ہے اور مائیں مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔

---

(۱) بخاری کتاب الانبیا باب قول اللہ وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ الخ ج ۱ص ۴۹۰۔

پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان

وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (بقرہ۲:۱۷۷) وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ (بقرہ۲:۴)

اسلام کے سلسلہ ایمانیات کی آخری کڑی (۱) ایک پچھلے دن اور پچھلی زندگی یا پچھلی دنیا پر یقین کرنا ہے، سورہ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں ہدایت یاب اور کامیاب انسانوں کے ایمانیات کی آخری دفعہ یہ بیان کی گئی ہے:

وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ. (بقرہ۲:۴) اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ. (بقرہ۲:۱۷۷) جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لایا۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ (توبہ۹:۴۴) جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں۔

"آخرۃ" کے لفظی معنی پچھلی کے ہیں اور یہ لفظاً صفت ہے، عربی میں اوصاف کو موصوف کا قائم مقام کر کے اکثر موصوف کو حذف کر دیتے ہیں، مثلاً دنیا کے لفظی معنی قریب ترین کے ہیں اور یہ صفت ہے اس کا موصوف الحیاۃ (زندگی) یا الدار (گھر) ہے، اس لئے الدنیا کا مفہوم الحیاۃ الدنیا (قریب ترین زندگی یعنی اس عالم کی موجودہ زندگی) یا الدار الدنیا (قریب ترین گھر یعنی موجودہ عالم) ہے، اسی طرح الْاٰخر اور الْاٰخِرۃ کا مفہوم الیوم الْاٰخر و الحیٰوۃ الْاٰخرۃ و الدار الْاٰخرۃ (پچھلا دن اور پچھلی زندگی اور پچھلا آنے والا گھر ہے) یعنی موجودہ زندگی کے بعد آنے والی دوسری دنیا کی زندگی اور گھر اور قرآن پاک میں یہ لفظ ان ہی معنوں میں ایک سو تیرہ (۱۱۳) مقام پر آیا ہے اور ہر جگہ اس کا محذوف موصوف حیاۃ (زندگی) یا دار (گھر) ہے۔

چنانچہ حسب ذیل آیتوں کے پڑھنے سے یہ حقیقت منکشف ہوگی:

---

(۱) قرآن پاک میں جہاں جہاں ایمان کے تفصیلات ذکر کئے گئے ہیں وہاں یوم آخر پر ایمان سب سے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ (عنکبوت ۲۹:۶۴) — اور بے شک آخری گھر اصلی زندگی ہے۔

وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ (انعام ۶:۳۲) — اور بے شک آخری گھر بہتر ہے۔

ان دونوں آیتوں میں دار یعنی گھر کا لفظ موجود ہے:

اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ. (توبہ ۹:۳۸) — کیا پچھلی زندگی کو چھوڑ کر اس موجودہ زندگی پر تم راضی ہو گئے۔

اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَ اَتْرَفْنٰهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (مومنون ۲۳:۳۳) — جنہوں نے انکار کیا اور پچھلی (زندگی) کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہم نے موجودہ زندگی میں ان کو نعمت دی۔

ان آیتوں میں الحیاۃ الدنیا یعنی موجودہ دنیا کے تقابل سے ظاہر ہے کہ الآخرۃ سے مراد الحیاۃ الآخرۃ یعنی پچھلی زندگی ہے(۱) اور اس لفظ کے عموم میں وہ تمام منازل ومقامات داخل ہیں جو ابتدائے موت سے لے کر حشر ونشر اور اس کے بعد پیش آتے ہیں یا آئیں گے، چنانچہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ اس آیت میں:

یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ (ابراھیم ۱۴:۲۷) — جو ایمان لائے ان کو اللہ حیات دنیا میں اور آخرت میں اس پکی بات (کلمۂ توحید) پر مضبوط رکھے گا۔

---

(۱) دنیا اور آخرت کا یہ تقابل قرآن پاک کی بے شمار آیتوں میں موجود ومذکور ہے، حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے:

وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ (آل عمران ۳:۴۵) — دنیا اور آخرت میں معزز۔

سلسلۂ دعا میں ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (بقرہ ۲:۲۰۱) — پروردگار ہم کو دنیا میں نیکی اور آخرت میں نیکی دے۔

کفار کے بطلانِ عمل کے ذکر میں ہے:

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ (بقرہ ۲:۲۱۷) — ان کے عمل دنیا اور آخرت میں گر گئے۔

اِسْتَحَبُّوا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَةِ (نحل ۱۶:۱۰۷) — انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی۔

نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ (حٰمٓ السجدہ ۴۱:۳۱) — ہم ہیں تمہاری قریب کی زندگی اور پچھلی زندگی کے دوست۔

اور کبھی دنیا کے بجائے اولیٰ (پہلی زندگی) کا لفظ اختیار کیا گیا ہے، فرمایا:

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰی (نازعات ۷۹:۲۵) — تو خدا نے اس کو پچھلی زندگی اور پہلی زندگی کی سزا بنایا۔

وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰی. (لیل ۹۲:۱۳) — اور ہمارے ہی لئے ہے پچھلی اور پہلی زندگی۔

اس آیت میں ''آخرت'' سے مراد ''عالمِ برزخ'' ہے اور قرائن بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت میں قولِ ثابت پر قائم رہنا کون سی بڑی بات ہوگی، جب کہ ہر چیز اس وقت واضح اور نمایاں ہوگی، اس لئے اس آیت میں آخرۃ سے مراد عالمِ برزخ کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا، ایک حدیث میں تصریحاً بیان ہے کہ ''قبر (یعنی برزخ) آخرت کی منزلوں میں سے سب سے پہلی منزل ہے''(۱)۔

یومِ آخر اور حیاتِ آخرت پر ایمان اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے اور قرآن پاک میں ایمان باللہ کے بعد اسی کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، کیوں کہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آئندہ دنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے، اگر یہ بنیاد متزلزل ہوجائے تو اعمالِ انسانی کے نتائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے، اسی لئے تمام مذاہب نے کسی نہ کسی اصطلاح میں دوسری زندگی کو متفقاً تسلیم کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے اس آئندہ زندگی کو دو دوروں میں منقسم کیا ہے، ایک موت سے لے کر قیامت تک اور دوسرا قیامت سے لے کر ابد (ہمیشہ) تک جس میں پھر موت اور فنا نہیں، پہلے دور کا نام برزخ اور دوسرے کا نام بعث یا حشر ونشر اور قیامت ہے اور ان سب کے معنی جی اٹھنے، اکٹھے کئے جانے اور کھڑے ہونے کے ہیں لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے اور اسی لئے اس دوسری زندگی یا اس کے عالم کا نام قرآن میں الدار الاٰخرۃ اور عقبی الدار وغیرہ ہے، جس کے معنی دوسرے یا پچھلے گھر کے ہیں۔

توراۃ وانجیل میں برزخ وقیامت کی تفصیل نیز یہ کہ مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے انسان کی روح کس حالت اور کیفیت میں رہے گی، مذکور نہیں ہے لیکن اسلام میں یہاں بھی گنجلک اور ابہام نہیں، بلکہ اس نے اس کی پوری تفصیل کی ہے اور بتایا ہے کہ موجودہ عالم کے علاوہ عالمِ برزخ اور میدانِ قیامت ہمارے سزا وجزا کے دو مقام ہیں، شخصی موت کے بعد ہر شخص عالم برزخ میں داخل ہوجاتا ہے اور وہاں اس کے معاملات شروع ہوجاتے ہیں، پھر اپنے مقررہ وقت پر جس کو خدا نے اپنی

(۱) ابن ماجہ کتاب الزہد باب القبر و البلی ص ۳۲۵ وحاکم بحوالہ کنز العمال جلد ۸ ص ۹۵ حیدرآباد دکن، ترمذی ابواب الزہد باب ما جاء فی ذکر الموت ج ۲ ص ۵۷ ومسند احمد ج ا ص ۶۳۔

مصلحتوں اور حکمتوں کے لحاظ سے طے کرلیا ہے سلسلۂ خلق کے خاتمہ پر جب موجودہ دنیا پر عام موت اور فنا طاری ہوگی، دوسری زندگی کی دنیا شروع ہوجائے گی جو تمام تر ہماری پہلی دنیا میں ہمارے اچھے یا برے اعمال کا سراپا عکس اور ظل ہوگی، چنانچہ سورۂ توبہ کی حسب ذیل آیت میں ہمارے ان تینوں دورہائے حیات کا ذکر ہے:

سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ (توبہ ۹:۱۰۱)

ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

عذاب کی یہ تین منزلیں دنیا، برزخ اور قیامت ہیں۔

ان تینوں عالموں میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ اس موجودہ دنیا میں جسم (مادہ) نمایاں اور روح پوشیدہ ہے اور روح کو جو کچھ مسرت و تکلیف یہاں پہنچتی ہے وہ صرف اس مادی جسم کے واسطے سے پہنچتی ہے، ورنہ درحقیقت اس کی براہ راست راحت و لذت کا اس مادی دنیا میں کوئی امکان نہیں، دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے، روح نمایاں ہوگی اور جسم چھپ جائے گا، وہاں جو راحت و تکلیف پہنچے گی وہ دراصل روح کو پہنچے گی اور جسم اس کی تبعیت میں ضمناً اس سے متاثر ہوگا لیکن اس تیسرے عالم میں جہاں سے حقیقی اور غیر فانی زندگی شروع ہوتی ہے، روح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے اور دونوں کی لذت و تکلیف کے مظاہر بالکل الگ الگ ہوں گے۔

ا۔ برزخ

برزخ کا لفظ قرآن پاک میں تین جگہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان کا پردہ، حاجب اور حائل مراد ہے، چنانچہ سورۂ رحمٰن میں دو دریاؤں کا ذکر ہے جن میں ایک میٹھا اور دوسرا کھاری ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ حائل ہے جو ان کو آپس میں ملنے نہیں دیتا:

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ. (رحمٰن ۵۵:۲۰) ان دونوں کے بیچ میں ایک پردہ ہے (جس سے) ایک دوسرے پر بڑھ کر نہیں جاتا۔

اسی عجیب وغریب بحری منظر کا ذکر سورۂ فرقان میں ہے اور وہاں بھی یہی لفظ واقع ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا. (فرقان ۲۵:۵۳) اور اسی نے دو دریاؤں کو ملا کے چلایا، یہ میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے اور وہ کھاری کڑوا ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ اور روکی ہوئی اوٹ بنائی ہے۔

اسی بنا پر موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان جو مقام حائل اور حاجب ہے اس کا نام برزخ ہے، سورۂ مومنون میں نزع کے وقت کے بیان میں ہے کہ:

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ. (مومنون ۲۳:۱۰۰) اور ان مرنے والوں کے پیچھے ایک پردہ ہے اس دن تک جب کہ وہ (قیامت میں) اٹھائے جائیں گے۔

عربوں بلکہ کل سامی قوموں کے رسم و رواج اور مشاہدات کی بنا پر اسی درمیانی منزل (برزخ) کا نام قبر ہے، خواہ وہ خاک کے اندر ہو یا قعرِ دریا میں یا کسی درندہ یا پرند کے پیٹ میں، اسی لئے فرمایا:

وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِى الْقُبُوْرِ. (حج ۲۲:۷) بے شبہ اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں اٹھائے گا۔

اب ظاہر ہے کہ یہ بعث صرف ان ہی مردوں کے لئے مخصوص نہیں جو تودۂ خاک کے اندر دفن ہوں بلکہ ہر میت کے لئے ہے خواہ وہ کسی حالت اور کسی عالم میں ہو، اسی لئے قبر سے مقصود ہر وہ مقام ہے جہاں مرنے کے بعد جسم خاکی نے جگہ حاصل کی۔

موت وحیات کی منزلیں: قرآن پاک میں دوموتوں اور دو حیاتوں کا ذکر ہے، ایک جگہ دوزخیوں کی زبان سے کہا گیا ہے:

رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ۔ (مومن ۴۰:۱۱)	ہمارے پروردگار تو نے ہم کو دو دفعہ مارا اور دو دفعہ جلایا، ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا پھر کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے۔

ان دوموتوں اور دوحیاتوں کی تفصیل خود اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں فرمائی ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ (بقرہ ۲:۲۸)	کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو حالاں کہ تم پہلے مردہ تھے پھر تم کو اس نے زندہ کیا (انسان بنا کر پیدا کیا) پھر تم کو مار دے گا پھر تم کو جلائے گا پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

پہلی موت تو ہر انسان کی خلقت سے پہلے کی ہے جب وہ مادہ یا عنصر کی صورت میں تھا پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوا یہ اس کی پہلی زندگی ہے، پھر موت آئی، روح نے مفارقت کی اور جسم اپنی اگلی مادی صورت میں منتقل ہو گیا، یہ دوسری موت ہوئی، پھر خدا اس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کرے گا یہ اس کی دوسری زندگی ہوئی جس کے بعد پھر موت نہیں، قرآن پاک میں خود رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا گیا:

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ. ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ۔ (زمر ۳۹:۳۰،۳۱)	بے شک تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں پھر قیامت کے دن اپنے پروردگار کے سامنے دعویٰ پیش کرو گے۔
ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ. ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ○ (مومنون ۲۳:۱۵،۱۶)	پھر تم اس کے بعد مر جانے والے ہو پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

اب سوال یہ ہے کہ برزخ کے عالم میں کیا کیفیت ہوگی، اس کے سمجھنے کے لئے ایک مختصر سی تمہید کی ضرورت ہے۔

نینداور موت کی مشابہت: اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا میں روحانی عالم کی باتوں کے سمجھنے کے

لئے اپنی عجیب وغریب قدرت سے ہم کو ایک چیز عنایت کی ہے جس کو ہم نیند کہتے ہیں، روح کو اپنے جسم سے دو قسم کا تعلق ہے، ایک ادراک واحساس کا اور دوسرے تدبیر وتغذیہ کا، نیند وہ عالم ہے جس میں ہمارے تمام آلاتِ ادراک واحساس اس دنیا سے بے خبر ہو کر اپنے گردوپیش کی مادی دنیا سے یکسر بے گانہ بن جاتے ہیں، تاہم ہمارے نفس یا روح کا تعلق ہمارے جسم سے باقی رہتا ہے اور وہ اس حالت میں بھی جسم کی مادی زندگی، نشوونما اور بقا کی تدبیروں اور دل و دماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ کے غذا رسانی اور خون کے دوران میں مصروف رہتی ہے، اسی کا نام روح کا جسم سے تدبیری تعلق ہے، اب نیند اور موت میں فرق ہے تو یہ ہے کہ نیند کی حالت میں جسم سے نفس کا تدبیری تعلق قائم رہتا ہے، اس لئے جسم زندہ اور باقی رہتا ہے لیکن موت کی حالت میں جسم کا روح سے تدبیری تعلق بھی اکثر منقطع ہو جاتا ہے اس لئے جسم کے اجزا کچھ دنوں میں منتشر ہو جاتے ہیں، موت اور نیند کی یہی مشابہت ہے جس کی بنا پر تمام انسانوں کی زبانوں میں موت کو نیند سے تشبیہ دیتے ہیں اور دنیا بھر کی زبانوں کا یہ توافق الہامِ طبعی کی خبر دیتا ہے، قرآن پاک میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى (انعام ۶:۶۰)	اور وہی ہے جو تم کو رات میں مارتا ہے اور جانتا ہے جو تم نے دن میں کمایا پھر تم کو دن میں جلاتا ہے تاکہ مقررہ وقت پورا کیا جائے۔

اس سے زیادہ تفصیل سورہ زمر میں ہے:

اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا ۚ فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰى عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ. (زمر ۳۹:۴۲)	وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے اور جو نہیں مری ہیں ان کو ان کی نیند میں (وفات دیتا ہے) تو جس پر موت کا حکم اس نے جاری کیا اس کو روک لیتا ہے اور دوسری روح کو (جس پر موت کا حکم نہیں نیند والی کو) ایک مدت معینہ کے لئے چھوڑ دیتا ہے بے شک اس میں سوچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی نے برزخ کی زندگی کو نیند کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، قرآن پاک میں ہے کہ قیامت میں جب لوگ دوسری زندگی پا کر قبروں سے اٹھیں گے تو

گنہگاروں کی زبانوں پر یہ فقرہ ہوگا:

يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (یٰس ۳۶: ۵۲) اے ہماری خرابی کس نے ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے اٹھادیا۔

غزوۂ احد کے موقع پر ہے کہ جن کو مرنا تھا ان کی موت ٹل نہیں سکتی تھی، اگر وہ میدانِ جنگ کے بجائے گھروں میں بھی ہوتے تو نکل نکل کر اپنے مقتل میں خود آجاتے، اس مفہوم کو قرآن نے یوں ادا کیا ہے:

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ (آل عمران ۳: ۱۵۴) کہہ دے کہ اگر وہ گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے لئے مارا جانا لکھا گیا تھا وہ خود نکل کر اپنی سونے کی جگہوں میں چلے آتے۔

اسی لئے قرآن پاک میں دوسری زندگی کے لئے اکثر بعث کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی جگانے اور بیدار کرنے کے بھی ہیں (۱) جیسا کہ اوپر کی اس آیت میں ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ (انعام ۶: ۶۰) اور وہی ہے جو تم کو رات میں موت دیتا ہے اور دن کو جو تم کرتے ہو اس کو جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگاتا ہے۔

وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ. (حج ۲۲: ۷) اور بے شک اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں جگائے گا۔

احادیث میں ہے کہ قبر میں سوال و جواب کے بعد نکوکاروں سے کہا جاتا ہے کہ ”نم کنومة العروس“ (دلھن کی نیند سو جاؤ) جس کو وہی جگاتا ہے جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہے یہاں تک کہ خدا اس کو اس خواب سے اٹھائے گا۔ (۲)

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ برزخ کی زندگی جس میں روح، جسم سے الگ ہوتی ہے، روح کی

---

(۱) صحیح بخاری کتاب التہجد باب تحریض النبی علی قیام اللیل الخ ج ۱ ص ۱۵۲ میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ سے نماز تہجد کے لئے اس وقت تک بیدار نہ ہونے پر سوال فرمایا تو حضرت ممدوح نے ان لفظوں میں معذرت پیش کی، یا رسول اللہ انفسنا بید اللہ فاذا شاء ان یبعثنا بعثنا (ہماری روحیں خدا کے ہاتھ میں ہیں وہ جب جگانا چاہتا ہے جگاتا ہے) اس حدیث میں بھی بعث جگانے کے معنی میں آیا ہے۔ (۲) جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر ج ۱ ص ۲۰۵ (دیوبند) حدیث حسن غریب۔

ایک طویل وعمیق (۱) نیند کے مشابہ ہے۔

خواب میں لذت والم: انسان جب سوتا ہے تو اس کے ادراک واحساس کے آلات اپنی مادی دنیا سے عارضی طور پر بے خبر ہو جاتے ہیں، مگر اس کے ادراک واحساس کی تخیلی، تمثالی یا ذہنی دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادی دنیا کی طرح متشکل ہو جاتی ہے، اس میں وہ خود اپنے جسم سے الگ مگر ہو بہو وہی جسم دیکھتا ہے جو آتا جاتا، چلتا پھرتا اور دیکھتا سنتا سب کچھ ہے، اس کے سامنے کھانے پینے اور لطف انگیزی کے سب سامان ہوتے ہیں، نیز اس میں درد ورنج اور تکلیف کی تمام وہی صورتیں ہوتی ہیں جو مادی دنیا میں ہیں، اس کے خیالی جسم کو اگر اس عالم میں تکلیف ہوتی ہے تو وہ خود چیخ اٹھتا ہے اور اگر اس میں لذت ملتی ہے تو لطف اندوز ہوتا ہے اور ان دونوں کے اثرات اس کو اپنے مادی جسم میں جاگنے کے بعد بھی نظر آتے ہیں، غرض عالمِ خواب کی خیالی دنیا اور اس کی شادی ورنج اور لذت والم اور اس مادی دنیا کے جسمانی ومادی شادی ورنج اور لذت والم میں کوئی فرق نہیں ہوتا، اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ عالم خواب کی لذت وتکلیف، بے داری کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور مادی دنیا کی لذت وتکلیف، احساس وادراک کے وجود تک قائم رہتی ہے اور جس طرح مادی بے داری والی لذت وتکلیف خواب میں معدوم ہو جاتی ہے اسی طرح خواب والی لذت وتکلیف بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے۔

خواب والے لذائذ وآلام کے مختلف مناظر اور ان کے حقائق اور اسباب وعلل پر اگر فلسفیانہ حیثیت سے غور کیا جائے تو عجیب وغریب معاملات سامنے آتے ہیں، کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام احساسات ومعلومات جو کبھی بھی ذہن انسانی میں آئے ہوں اور ان کو بہ حالتِ بے داری مادی دنیا کے مشاغل اور زمانہ کے امتداد کے سبب سے انسان کتنا ہی فراموش کر چکا ہو، وہ خواب میں مادی گراں باری سے آزادی کے بعد سامنے مجسم شکلوں میں نمودار ہو جاتے ہیں اور بیچ کی کڑیوں کے بھول جانے کی وجہ سے وہ اس کو بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ انسان جن چیزوں کو

(۱) شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں فھذا المبتلی فی الرویا غیر انھا رویا لایقظۃ منھا الی یوم القیامۃ (باب اختلاف احوال الناس فی البرزخ ج ۱ ص ۷۲) یعنی یہ عذاب قبر کا گرفتار خواب میں ہے لیکن یہ کہ یہ ایسا خواب ہے، جس سے قیامت تک جاگنا نہیں ہے۔

بھول جاتا ہے وہ اس کے حافظہ سے حقیقت میں معدوم نہیں ہو جاتیں بلکہ دماغی حجرہ (ذہن) کے منتشر اسباب کے ذخیرہ (معلومات) میں چھپ کر گم ہو جاتی ہیں اور پھر بعد کو مل جاتی ہیں، اس لئے وہ تمام اچھے اور برے اعمال جو انسان نے عمر بھر کئے ہیں خواہ وہ ان کو آج بھول گیا ہو مگر ان کی یاد ذہن کے گوشوں میں پڑی ہے معدوم ومفقود نہیں ہوگئی۔

خواب کی عجیب وغریب صورت وہ ہے جس کو تمثیلی کہتے ہیں، جیسے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے فرزند کے خدمتِ کعبہ پر وقف کرنے کو قربانی کی شکل میں اور حضرت یوسفؑ نے والدین کو سورج اور چاند اور گیارہ بھائیوں کو گیارہ ستاروں کی صورت میں دیکھا، شاہِ مصر کے سولی پانے والے مصاحب نے اپنے سولی پانے کو اس رنگ میں دیکھا کہ اس کے سر پر خوان ہے اور بڑے بڑے پرندے اس میں چونچ مار مار کر کھاتے ہیں، شاہِ مصر نے مصر کی ہفت سالہ قحط سالی کو سات دبلی گایوں کی صورت میں دیکھا (۱)، آنحضرت ﷺ نے فتحِ مکہ کو اس شکل میں دیکھا کہ مسلمان سر منڈوائے اور بال ترشوائے حج کر رہے ہیں، مسیلمہ اور اسود عنسی دو کذابوں کو سونے کے دو کنگنوں کی صورت میں دیکھا، شہدائے احد کو موٹی گائے کی صورت میں ملاحظہ کیا، مدینہ کی وبا ایک پریشان مو، کالی عورت کی صورت میں نظر آئی، خلافت کو ڈول کھینچنے کی اور حضرت عمرؓ کے علم کو دودھ کی اور ان کی دین داری کو لمبی قمیص کی شکل میں دیکھا (۲) ان کے علاوہ ہر شخص کے ذاتی تجربوں سے بھی اس کی بے شمار مثالیں فراہم کی جاسکتی ہیں۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ انسان کے جسم میں اگر کسی قسم کا مادہ بڑھ جاتا ہے تو خواب میں اس کے مناسب مجسم شکلیں نظر آتی ہیں مثلاً اگر بلغم کی زیادتی ہو تو پانی، دریا اور سمندر نظر آئیں گے، اگر سودا بڑھ جائے تو ہاتھی اور کالی کالی صورتیں نظر آئیں گی، اسی طرح دوسرے تغیراتِ جسمانی بھی مناسب جسمانی ہیئت میں خواب میں مجسم اور متشکل ہو کر دکھائی دیتے ہیں۔ (۳)

اسی طرح اعمال جو جسم و مادہ سے بالکل الگ ہیں خواب میں اپنے مناسب قالب میں مجسم ہو جاتے ہیں، اگر کسی بھائی کا حقِ واجب کسی نے ادا نہیں کیا تو خواب میں اس کو نظر آئے گا کہ وہ اس

(۱) یہ کل تمثیلی خواب قرآن پاک میں مذکور ہیں دیکھئے سورہ والصافات و سورہ یوسف (ض) (۲) ان خوابوں کو صحیح بخاری کتاب التعبیر کے مختلف ابواب میں دیکھو ج ۲ صفحات ۱۰۳۷ تا ۱۰۴۲ (۳) حجۃ اللہ البالغۃ شاہ ولی اللہ ذکر برزخ ج ۱ ص ۲۷۔

کا گلا کاٹ رہا ہے، اگر کسی کی غیبت کی ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ مردار کھا رہا ہے، سونے چاندی کے خزانوں کو جمع کر کے اگر بخل کا اژدھا ان کی حفاظت میں بٹھایا ہے تو سانپ بن کر وہ اس کی گردن میں لپٹتا اور کاٹتا ہے، ذلت اور خواری کتے کی، حماقت گدھے کی اور شجاعت شیر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے، شبِ معراج میں آنحضرت ﷺ کے سامنے فطرت دودھ کی اور غیر فطرت شراب کی شکل میں پیش ہوئی (۱) اسی طرح کہن سال دنیا ایک بڑھیا کی شکل میں نظر آئی۔

اس قسم کی تمثیلات قرآن مجید میں بھی آئی ہیں، مثلاً غیبت کی نسبت فرمایا:

وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ (حجرات ۴۹:۱۲)	اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو برا نہ کہے، کیا تم میں سے کوئی پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کی بوٹی نوچ نوچ کر کھائے سوگھن آئے تم کو۔

سود کھانے کو جنون اور پاگل پن کی شکل میں ظاہر کیا:

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ (بقرہ ۲:۲۷۵)	جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے (یا نہیں اٹھتے) لیکن جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے حواس شیطان نے چھو کر کھودئے ہوں۔

یتیموں کا مال ناجائز طریق سے کھانے کو پیٹ میں آگ بھرنا فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا. (نساء ۴:۱۰)	وہ لوگ جو یتیموں کا مال ظلم کر کے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں اور آگے جہنم کی آگ میں داخل ہوں گے۔

وہ خود غرض لوگ جو بےکسوں کے کام نہیں آتے، قیامت میں ان کے بھی کوئی کام نہ آئے گا اور جو خود سیر ہو کر کھاتے ہیں اور غریبوں کے درد گرسنگی سے بےخبر رہ کر اپنے مال کا میل کچیل (زکوۃ) بھی ان کے کھانے کو نہیں دیتے، دوزخ میں ان کو زخموں کا دھوون کھانے کو ملے گا، فرمایا:

اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ. وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ. فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ. وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ. لَا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ. (حاقہ ۶۹:۳۳-۳۷)	بے شک وہ خدائے بزرگ پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور مسکین کے کھانے پر آمادہ نہیں کرتا تھا تو آج اس کا بھی یہاں کوئی دوست نہیں اور نہ زخموں کے دھوون کے سوا کوئی کھانا ہے، اس کو وہی گنہگار کھائیں گے۔

---

(۱) بخاری کتاب الانبیاء باب قول اللہ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ الخ ج ۱ ص ۴۸۹۔

بے لوث مخلصانہ فیاضی کی تمثیل سرسبز وشاداب باغ سے دی:

وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ کَمَثَلِ جَنَّۃٍ بِرَبْوَۃٍ (بقرہ۲:۲۶۵)	اور ان کی مثال جو اپنی دولت خدا کی خوشنودی چاہنے اور اپنے دلوں کی مضبوطی کے لئے خرچ کرتے ہیں ایک باغ کی ہے جو ایک ٹیلہ پر ہے۔

خدا کی راہ میں جان دینے والوں اور مرنے والوں کو جانِ نو اور حیاتِ جاوداں کی خوش خبری دی گئی، فرمایا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْیَآءٌ . (بقرہ۲:۱۵۴)	جو خدا کی راہ میں مارا جائے اس کو مردہ نہ کہو وہ لوگ زندہ ہیں۔

اسی طرح یہ ہے کہ جو خدا کو قرض دے گا، خدا اس کو بڑھا کر دے گا، جو دوسروں کو معاف کرے گا خدا اس کو معاف کرے گا، جو دوسروں کی عیب پوشی کرے گا خدا اس کی ستاری کرے گا، قرآن واحادیث اس قسم کی بالمعاوضہ جزا وسزا کے ذکر سے لبریز ہیں۔

جو لوگ راہِ خدا میں اپنا مال نہیں دیتے ان کی نسبت فرمایا:

سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِہٖ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (آل عمران۳:۱۸۰)	جس مال کا بخل کیا تھا قیامت میں اس کا ان کے گلے میں طوق پڑے گا۔
یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَ ظُھُوْرُھُمْ ط ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ (توبہ۹:۳۵)	جس دن اس سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لئے گاڑ رکھا تھا تو اب تم اس کا مزہ چکھو جس کو تم گاڑ کر رکھتے تھے۔

دنیا میں اللہ کے نورِ بصیرت سے روگردانی آخرت میں ظاہری نابینائی کی صورت میں رونما ہوگی اور اسی طرح جو خدا کو یہاں بھولے گا خدا اس کو وہاں بھلائے گا، چنانچہ حضرت آدمؑ سے جنت سے نکلتے وقت یہ فرمایا گیا تھا:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَعْمٰی . قَالَ	اور جس نے میری یاد سے روگردانی کی تو اس کے لئے ہے تنگ گذران اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں

رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیۡۤ اَعۡمٰی وَقَدۡ کُنۡتُ بَصِیۡرًا. قَالَ کَذٰلِکَ اَتَتۡکَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیۡتَهَا وَکَذٰلِکَ الۡیَوۡمَ تُنۡسٰی. (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۴-۱۲۶)

گے، وہ کہے گا میرے پروردگار تو نے مجھے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا میں تو دنیا میں آنکھوں والا تھا خدا کہے گا اسی طرح تیرے پاس ہماری نشانیاں آتی رہیں تو ان کو تو نے بھلا دیا اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا۔

یہی مفہوم اور زیادہ اختصار کے ساتھ اس آیت میں ہے:

وَمَنۡ کَانَ فِیۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰی فَهُوَ فِی الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰی وَاَضَلُّ سَبِیۡلًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۷۲)

جو کوئی دنیا میں (دل کا) اندھا تھا وہ آخرت میں اندھا ہے اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا۔

اس باب میں سب سے زیادہ صریح وہ حدیثِ صحیح ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بخیل کا مال سانپ کی صورت میں گلے کا ہار ہو کر نظر آئے گا یعنی وہ مال سونے اور چاندی کے سانپ کی صورت میں ہوگا:

قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) من اتاه الله مالا فلم یود زکاته مثل له ماله شجاعا اقرع له زبیبتان یطوقه یوم القیامة یاخذ بلهزمتیه ای شدقیه یقول انا مالک انا کنزک (بخاری تفسیر آل عمران باب وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ ج ۲ ص ۶۵۵)

رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو اللہ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو اس کا مال اس کو اچھل کر ڈسنے والے سانپ کی صورت میں دکھایا جائے گا جس کا سر زہر کی شدت سے گنجا ہوگا، اس کے منہ میں دو دانت ہوں گے وہ اس کے گلے میں قیامت کے دن پڑا ہوگا اور وہ اس کے دونوں جبڑوں کو کاٹے گا اور کہے گا میں ہوں تیرا مال، میں ہوں تیرا خزانہ۔

اسی طرح وہ حدیثیں ہیں جن میں مختلف اعمال کا مختلف شکلوں میں آنا بیان کیا گیا ہے مثلاً یہ کہ مرنے کے بعد قبر میں نماز و روزہ وغیرہ اعمال عذاب سے بچنے کے لئے ڈھال بن کر داہنے بائیں سے نمودار ہوں گے (۱)، یہ بھی حدیث میں ہے کہ مرنے کے بعد جب ایک دفعہ فرشتۂ الٰہی مردہ کو بیدار کرتا ہے تو اس کو آفتاب ڈوبتا ہوا دکھایا جاتا ہے (مثلت الشمس عند غروبها)، نیک مرد مسلمان اس تنگ وقت کو دیکھ کر نماز کی تیاری کرنا چاہتا ہے (۲)، یہ ظاہر ہے کہ یہ دنیا والا آفتاب وہاں نہیں بلکہ اس

---

(۱) مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۳۵۲ (۲) سنن ابن ماجہ ابواب الزہد ذکر القبر و البلی ص ۳۲۵ مطبع فاروقی دہلی۔

کی تمثیل ہوتی ہے جیسا کہ حدیث کے الفاظ میں ہے یعنی یہ کہ اس مردہ کو ایسا نظر آتا ہے اور وہ درحقیقت آفتاب نہیں بلکہ آفتاب کی مثالی صورت ہوتی ہے۔

گناہوں کی تمثیلی سزائیں: اوپر کے بیانات سے ہویدا ہے کہ غیر مجسم اعمال اور معانی اپنے جن تمثیلی پیکروں میں نظر آتے ہیں وہ درحقیقت ان اعمال و معانی سے تمثیلی مشابہت رکھتے ہیں مثلاً ایک صحیح حدیث میں ہے کہ مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعونؓ کی وفات کے بعد ایک صحابی نے خواب میں دیکھا کہ ان کے لئے ایک نہر بہہ رہی ہے اور جب اس کا ذکر آنحضرت ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے اس کی تعبیر میں فرمایا:

ذلک عملہ (بخاری کتاب التعبیر باب الرویا بالنہار ج ۲ ص ۱۰۳۷) یہ نہر ان کا (نیک) عمل ہے۔

اس تمہید کے بعد آنحضرت ﷺ کے اس رویائے صادقہ پر غور کرو جو ظاہر ہے کہ قیامت کا نہیں کہ ابھی وہ آئی نہیں، بلکہ برزخ ہی کا مرقع پیش کرتا ہے جو اب بھی قائم ہے، آپ ﷺ نے ایک صبح کو فرمایا کہ رات میں نے دیکھا کہ دو آنے والے آئے اور انہوں نے مجھے جگا دیا، میں ان کے ساتھ چل کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ ۱۔ ایک آدمی لیٹا ہے اور دوسرا اس کے سر پر ایک بڑا پتھر لئے کھڑا ہے اور وہ اس پتھر کو اس کے سر پر اس طرح دے مارتا ہے کہ اس کا سر چکنا چور ہو جاتا ہے اور پتھر لڑھکنے لگتا ہے وہ اس کے پیچھے جا کر اس کو اٹھا لاتا ہے اور اتنی دیر میں اس کا سر درست ہو جاتا ہے پھر وہ مارتا ہے اور پھر وہی صورت پیش آتی ہے، ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ ۲۔ ایک شخص اوندھا پڑا ہے اور دوسرا لوہے کا ایک آنکس لئے کھڑا ہے اور وہ اس سے اس کے جبڑے کو پھر نتھنے کو اور پھر آنکھوں کو گدی تک چیر ڈالتا ہے، پہلے ایک طرف، بعد ازیں دوسری طرف پھر آگے بڑھے تو دیکھا کہ ۳۔ تنور کی قسم کی ایک چیز دہک رہی ہے اور کچھ مرد اور عورت اس میں ننگے پڑے ہیں اور اس کے شعلے بھڑک بھڑک کر ان تک پہنچتے ہیں اور وہ چیختے ہیں، آگے بڑھے تو نظر آیا کہ ۴۔ ایک خون کی جیسی سرخ نہر بہہ رہی ہے اور ایک آدمی اس میں تیر رہا ہے، نہر کے کنارے ایک آدمی کھڑا ہے جس کے پاس بہت سے پتھر رکھے ہیں، وہ تیرنے والا آدمی تیر کر جب اس شخص کے قریب آتا ہے تو ایک پتھر اٹھا کر اس زور سے

مارتا ہے کہ وہ پتھر اس کے منہ میں جا کر پیٹ میں اتر جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم آگے بڑھے تو ایک سرسبز وشاداب چمن نظر آیا، جس میں بہار کی ہر کلی کھل رہی تھی، باغ کے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا، جس کا سر آسمان میں تھا اور اس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، آگے بڑھے تو ایک بہت بڑا باغ دیکھا جس سے زیادہ بڑا اور خوب صورت باغ میں نے نہیں دیکھا یہاں پہنچ کر اپنے دونوں ہم راہیوں کے کہنے سے اوپر چڑھا تو ایک شہر ملا جس کی دیوار میں سونے کی ایک ایک چاندی کی ایک ایک اینٹ لگی تھی، ہم لوگ دروازہ کے پھاٹک پر پہنچے، دروازہ کھلوایا تو اس کے اندر گھسے تو اس میں کچھ لوگ ملے جن کا آدھا دھڑ نہایت ہی خوبصورت اور آدھا بہت ہی بدصورت تھا، میرے ہم راہیوں نے ان سے ایک نہر کی طرف جو بیچ میں صاف وشفاف بہہ رہی تھی، اشارہ کر کے کہا کہ اس میں جا کر غوطہ لگاؤ وہ غوطہ لگا کر آئے تو ان کی بدصورتی کا حصہ جاتا رہا اور وہ پورے دھڑ سے خوبصورت ہو گئے، میرے ہم راہیوں نے مجھ سے کہا کہ یہ ''جنتِ عدن'' ہے اور وہ آپ کا دولت خانہ ہے، میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، سپید لکۂ ابر کی طرح ایک محل دکھائی دیا۔

پھر میں نے ان ہم راہیوں سے کہا کہ آج تو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں تو بتاؤ میں نے کیا کیا دیکھا، انہوں نے جواب دیا کہ پہلا شخص جس کا سر پتھر سے کچلا جا رہا تھا، وہ ہے جو قرآن پڑھ کر اس کی تعمیل سے انکار کرتا ہے اور صبح کی مفروضہ نماز سے غافل ہو کر سو رہتا ہے اور دوسرا شخص جس کے گل پھڑے اور نتھنے اور آنکھیں پھاڑی جاتی تھیں وہ ہے جو جھوٹ بول کر تمام دنیا میں اس کو پھیلاتا ہے اور تنور میں جو مرد اور عورتیں ننگی جل رہی تھیں، وہ بدکار مرد اور عورتیں ہیں اور جو شخص خون کی نہر میں تیر رہا تھا اور منہ سے پتھر نگلتا تھا وہ سود خوار ہے اور اس سدا بہار چمن میں جو دراز قد آدمی آپ نے دیکھا وہ ابراہیمؑ تھے اور ان کے گرد جو بچے تھے وہ ننھے اور کم سن بچے تھے جو فطرت پر مرے تھے، کسی صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ! مشرکوں کے بچے؟ فرمایا اور مشرکوں کے بچے بھی، وہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوب صورت اور آدھا بدصورت تھا وہ ہیں جنہوں نے کچھ اچھے کام بھی کئے تھے تو خدا نے ان کے گناہ دھو دئے۔(۱)

برزخ کی ان تمام سزاؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کی نوعیت اور کیفیت ان کے

(۱) صحیح بخاری کتاب التعبیر ملخصاً ج ۲ ص ۱۰۴۳ و ۱۰۴۴۔

اعمال کے بالکل مناسب اور مشابہ قرار دی گئی ہے، نمازِ صبح سے فارغ ہو کر بالین راحت سے سر نہ اٹھانے والے کا سر کچلا جانا، جھوٹے کا گل پھڑا پھاڑا جانا، زانی اور زانیہ کا برہنہ تنور کی آگ میں جلنا، خون چوسنے والے سود خوار کا انسانوں کے خون کے دریا میں تیرنا، اپنا دو بالشت کا پیٹ بھرنے کے لئے سارے غریبوں کی روزی چھین چھین کر جمع کرنے والے کا پتھر کے لقمے کھانا سراسر ان کے دنیاوی اعمال کی تمثیل وتصویر ہے اور آخر میں نصف حسنِ عمل سے آدھے دھڑ کی خوب صورتی اور نصف سوءِ عمل سے آدھے دھڑ کی بدصورتی پوری مشابہ ہے اور صاف وشفاف نہر کی صورت میں رحمت و مغفرتِ الٰہی کا ظہور بھی اسی قیاس پر ہے۔(۱)

ابھی تک دنیا نے جو کچھ ترقی کی ہے وہ نفس سے باہر آفاقی یعنی اپنے سے باہر کی بیرونی مادی دنیا کی اشیا کے خواص وصفات کے جاننے میں کی ہے، جن سے سائنس کی ایجادات واختراعات کا تعلق ہے لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ ایک وسیع دنیا اپنے اندر کی پڑی ہے، جس کو قرآن نے "انفس" کہا ہے، ان انفس یا ارواح کے اوصاف وخصائص کا ابھی تک بہت کم علم ہوا ہے، ہماری سائیکالوجی (علم النفس) ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے اور اسپر یچولزم (علمِ ارواح) ابھی طلسم و فریب کے عجائبات میں اسی طرح گرفتار ہے جس طرح موجودہ عہد سے پہلے آج کے معمولی سائنٹفک تجربے سحر وجادو کے نقش ونگار بنے ہوئے تھے، بہر حال ابھی تک علمِ نفس وروح کے عجائبات پر پردے پڑے ہوئے ہیں، ایک یہی مسئلہ کہ شے کے یقین اور اس کے خارجی وجود میں کیا تعلق ہے؟ ایک معما ہے، بہت سے ہندو اہلِ فلسفہ اور بعض مسلمان صوفیوں اور موجودہ زمانہ کے مشہور فلاسفر برکلے کے نزدیک تو کسی شے کے یقین اور وجود، یا یوں کہو کہ ذہنی اور خارجی وجود میں بہت کم فرق ہے بلکہ گویا نہیں ہے۔

بہر حال نفسِ انسانی کے اندرونی قوئی کا علم گو ابھی بہت کچھ محتاجِ تکمیل ہے، تاہم اتنا ثابت ہے کہ کسی شے کے تصوری یقین اور خارجی وجود میں بہت ہی شدید تعلق ہے، مسمرازم نے جو سراسر اسی اصول پر مبنی ہے، اس حقیقت کو کسی قدر واضح کر دیا ہے، اسی سے معلوم ہوگا کہ مذاہب نے سب سے زیادہ ایمان پر جو یقین ہی کا دوسرا نام ہے اس قدر زور بے سبب نہیں دیا ہے۔

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ذکر واقعات حشر ج اص ۲۸، ۲۹۔

قرآن پاک نے یقین کی دو قسمیں کی ہیں، علم الیقین اور عین الیقین، کسی شے کی دلیلوں کو سن کر یا بعض علامتوں کو دیکھ کر اس کے وجود کا اقرار کرلو، تو یہ علم الیقین (یقین جاننا) ہے اور اگر وہ شے خود تمہارے احساس اور مشاہدہ کے سامنے آجائے جس میں پھر شک وشبہہ کی گنجایش نہیں ہوسکتی تو وہ عین الیقین (خود یقین) ہے، قرآن پاک نے یقین کی ان دونوں صورتوں کو سورہ تکاثر میں بیان کیا ہے:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ. حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ. كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ. ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ. كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ. لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ. ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ. (تکاثر ۱۰۲: ۱-۷)	تم کو دولت ونعمت کی بہتات نے غفلت میں مبتلا کردیا یہاں تک کہ تم نے قبروں کو جا دیکھا، ابھی نہیں تم آگے جان لوگے پھر ابھی نہیں تم آگے جان لوگے، ہرگز نہیں اگر تم یقین کا جاننا جانتے تو البتہ دوزخ کو دیکھ لیتے پھر البتہ عین الیقین سے اس کو دیکھ لوگے۔

بنابریں اگر انسان اپنے اندر علمِ یقین حاصل کرے جو کمالِ ایمان کا اعلا درجہ ہے تو وہ اپنے باطن کی آنکھوں سے اپنی دوزخ یہیں دیکھ لے:

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ. لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ. (تکاثر ۱۰۲: ۵،۶)	نہیں یہ بات نہیں اگر تم کو علم یقین ہو تو دوزخ کو بے شبہ دیکھ لوگے۔

کفار آنحضرت ﷺ سے عذاب کے عینی مشاہدہ کا فوری مطالبہ کرتے تھے، وحیِ الٰہی نے اس کے جواب میں کہا:

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ط وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ. (عنکبوت ۲۹: ۵۴)	وہ تجھ سے جلد عذاب مانگتے ہیں حالاں کہ دوزخ گھیر رہی ہے منکروں کو۔

ایک دوسری آیت میں ہے کہ منافقین بہ زعمِ خود آزمایش کے ڈر سے جہاد کی شرکت سے عذر کرتے ہیں، اس کے جواب میں ان سے فرمایا گیا کہ وہ تو ابھی آزمایش میں مبتلا ہیں اور دوزخ ان کو گھیرے ہوئے ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ط اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ط وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ. (توبہ ۹: ۴۹)	اور ان میں کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ مجھے (جہاد میں عدم شرکت کی) اجازت دے دیجئے اور آزمایش میں نہ ڈالیے ہاں وہ تو آزمایش میں پڑ چکے اور دوزخ منکروں کو گھیر رہی ہے۔

لیکن یہ علم الیقین جس کے حصول کا ذریعہ صرف ایمان ہے، ہر شخص اس سے اس دنیا میں بہرہ ور نہیں ہوتا بلکہ بہتیرے اس کے منکر ہیں، اس لئے ان کو یہ اپنے پاس کی دوزخ اس وقت نظر نہیں آتی لیکن موت جس کا آنا ایک دن یقینی ہے جب وہ آئے گی تو مادہ کا یہ حجاب جو آنکھوں پر پڑا ہے اٹھ جائے گا، اس وقت اس عالمِ غیب کے کچھ اسرار ان پر منکشف ہو جائیں گے اور اعمال کے تمثیلی نتائج اور ثواب وعذاب اور جنت و دوزخ کے بعض مناظر ان کے سامنے آجائیں گے اور اس وقت وہ اپنے یقین کی آنکھوں سے کسی قدر واقعات کا مشاہدہ کریں گے:

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ. (تکاثر ۱۰۲:۷) پھر تم دوزخ کو عین یقین سے دیکھ لوگے۔

یہ موت کے بعد کا سماں ہوگا جس کو برزخ کا عالم کہتے ہیں، اس کے بعد جب قیامت آئے گی تو ہر راز فاش ہو جائے گا، يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (طارق ۸۶:۹) (جس دن تمام بھید کھل جائیں گے) اور بہشت و دوزخ اپنی ظاہری صورتوں میں اس طرح سامنے آجائیں گی کہ پھر شک وشبہہ کا شائبہ بھی باقی نہ رہے گا، وہ علمِ حقیقی اور یقینِ تحقیقی کا دن ہوگا، قرآن میں قیامت کے موقع پر ہے:

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ..... فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ. (ق ۵۰:۲۰و۲۲) اور نرسنگا پھونکا گیا، یہ ہے ڈر کا دن......... تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے کھول دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔

اس پردہ کے ہٹتے ہی اس دن انسان کے تمام اعمال ایک ایک کر کے اس کے سامنے آجائیں گے اور دوزخ منظر عام پر آجائے گی، فرمایا:

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى. يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى. وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى. (نازعات ۷۹:۳۴-۳۶) جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا جس دن انسان کو جو کچھ اس نے کیا ہے یاد آجائے گا اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے باہر لائی جائے گی۔

احوالِ برزخ کا عین الیقین: ایک طرف شاعر (ابو العتاہیہ(۱)) نے حیرت کے عالم میں کیا خوب کہا ہے:

الموت باب وکل الناس داخله ... یلیت شعری بعد الباب ما الدار

موت ایک دروازہ ہے اور تمام انسان اس دروازہ میں داخل ہوں گے، کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازہ کے بعد کون گھر ہے۔

---

(۱) الانوار الزاهية فی دیوان ابی العتاهية ص ۹۶ بیروت ۱۹۱۴ء۔

یہ علم جس کی حسرت اس شاعر نے کی، ظاہر ہے اس زندگی میں صرف علم الیقین کے ذریعہ سے حاصل ہوسکتا ہے، البتہ موت کے وقت جب وہ دوسرے عالم کے دروازہ پر کھڑا ہوگا تو اس کو پسِ پردہ کا نظارہ تھوڑا بہت ہو جائے گا اور وہی برزخ کا عالم ہے فرمایا:

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ. لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ. (مومنون ۲۳: ۹۹، ۱۰۰)	جب ان گنہ گاروں میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے تو وہ (زندگی کے پسِ پردہ کے بعض مناظر کو دیکھ کر) کہتا ہے اے میرے پروردگار مجھے ایک بار اور دنیا میں لوٹا دے تاکہ دنیا میں جو ماحول چھوڑ کر آیا ہوں اس سے شاید کوئی نیک کام کروں، ہرگز نہیں یہ بات ہی بات ہے جو وہ کہتا ہے اور (اب) ان گنہ گاروں کے پیچھے اس دن تک ایک پردہ (برزخ) ہے جب وہ (موت کے بستر سے جگا کر) اٹھائے جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ اگر موت کے وقت اور بعد کوئی غیبی کیفیت اس کے مشاہدہ میں نہیں آجاتی تو اس کا شک وشبہ دفعتاً یقین سے کیسے بدل جاتا ہے، فرمایا:

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِیْدُ. (ق ۵۰: ۱۹)	اور موت کی بے ہوشی حقیقت کو لے کر آگئی، یہی ہے وہ جس سے تو ہٹا کرتا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ سکرات کے وقت "حقیقت" کا کوئی منظر سامنے ضرور آجاتا ہے، اہلِ تفسیر نے بھی اس آیت سے یہی سمجھا ہے، ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

بالحق من امر الاٰخرة فتبينه للانسان حتى تثبته و عرفه.(۱)	حق یعنی آخرت کا کچھ حال تو موت کی سکرات انسان پر کھول دیتی ہے، یہاں تک کہ انسان اس کو یقین کر لیتا ہے اور جان لیتا ہے۔

حافظ ابن کثیر محدث اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

يقول عز و جل وجاءت ايها الانسان سكرة الموت بالحق اى كشفت لک عين اليقين الذى كنت تمترى فيه.(۲)	اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان موت کی بے ہوشی حق کو لے کر آگئی یعنی تیرے اس یقین کے پردہ کو کھول دیا جس میں تو شک کرتا تھا۔

(۱) تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲۶ ص ۹۱ (۲) تفسیر ابن کثیر بر فتح البیان ج ۹ ص ۲۹۸۔

قاضی شوکانی محدث کی تفسیر میں ہے:

ومعنی بالحق انه عند الموت یتضح له الحق ویظهر له صدق ما جاءت به الرسل من الاخبار بالبعث و الوعد و الوعید. (ج ۵ ص ۷۳)	اور حق لے کر آنے کے معنی یہ ہیں کہ موت کے وقت حق بات کھل جاتی ہے اور پیغمبر جس قیامت اور جزا و سزا کی خبریں لے کر آئے تھے ان کی سچائی ہویدا ہو جاتی ہے۔

مفتی آلوسی حنفی کی تفسیر کی عبارت یہ ہے (ج ۲۶ ص ۱۶۵):

والمعنی احضرت سکرۃ الموت حقیقة الامر الذی نطقت به کتب الله تعالیٰ و رسله علیهم السلام.	اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ موت کی مدہوشی اس حقیقتِ امر کو سامنے کر دیتی ہے جس کو اللہ کی کتابوں اور اس کے رسولوں نے بیان کیا ہے۔

زمخشری معتزلی (کشاف ج ۲ ص ۱۴۰۲ کلکتہ) اور ابو حیان اندلسی مالکی کی تفسیر میں بھی یہی ہے (بحر محیط ج ۸ ص ۱۲۴ مصر)۔

یہ مفسرین مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان سب کی متفقہ تفسیر یہی ہے، اس تفسیر کی صحت کی مزید دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد ہی قیامت کے ذکر میں ہے:

لَّكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ. (ق ۵۰:۲۲)	ہم نے آج تجھ سے تیرا پردہ کھول دیا تو آج تیری نظر تیز ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت کسی قدر انکشاف ہوتا ہے اور قیامت کے دن انکشافِ تام ہو جاتا ہے لیکن بہر حال موت کے وقت یقین کا پردہ بالکل کھل جاتا ہے۔

موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت: ''موت'' کے لئے قرآن میں اکثر ''خدا کی طرف بازگشت'' یعنی خدا کی طرف لوٹ جانے کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے:

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. (جمعہ ۶۲:۸)	بے شک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو اس سے ملنا ہی ہے پھر تم اس (خدا) کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو حاضر و غائب کا جاننے والا ہے تو وہ تم کو تمہارے کرتوت بتائے گا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ. (بقرہ۲:۱۵۶) ہم سب خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا. (مائدہ۵:۱۰۵) تم سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

یہ طرزِ ادا بیسیوں آیتوں میں اختیار کیا گیا ہے، یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع و بازگشت کے مفہوم میں ورود اور آمد داخل ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ارواحِ انسانی خدا کے یہاں سے اس جسم و قالب کی قید میں آئی ہیں اور موت کے وقت اس عناصر کی چہار دیواری سے نکل کر پھر ان کو وہیں واپس جانا ہے جہاں سے آئی تھیں، اس بازگشت کے سفر میں ان کا زادِ راہ صرف وہی ہوگا جو اس دنیائے دار العمل میں انہوں نے کمایا ہے، یعنی ان کے اندرونی و بیرونی اعمال اور اس کے بعد جو ان کی زندگی ہوگی، وہ ان کے ان ہی اعمال کی نوعیت پر منحصر ہوگی:

وَهُوَ الَّذِیْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. (انعام۶:۶۰)

اور وہی (خدا) ہے جو تمہیں رات کو موت (نیند) دیتا ہے اور دن کو جو کما چکے اس کو جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگا اٹھاتا ہے تا کہ مقررہ وقت (اصلی موت) پورا ہو پھر اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تم کو تمہارے اعمال جتائے گا۔

ایک اور آیت میں ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. (یونس۱۰:۲۳)

اے انسانو! تمہاری بغاوت کا نتیجہ تمہیں پر ہے، دنیا کی زندگی سے کچھ فائدہ اٹھا لو پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے تو ہم تم کو تمہارے اعمال جتائیں گے۔

اس میں دنیا کی زندگی کے بعد ہی خدا نے اپنی طرف واپس آجانے کی اطلاع دی ہے اور اہل تفسیر نے بھی اس رجوع الی اللہ سے موت ہی کے معنی سمجھے ہیں (طبری ۱۱ص ۶۴ مصر)

اب ہم ایک ایسی آیت پیش کرتے ہیں جس میں موت کا پورا نقشہ ہے اور اس کے بعد بیان ہے کہ اس دن مرنے کے بعد ہی خدا کے ہاں ہنکا کر لائے جاؤ گے، گویا جس طرح جانور ہنکا کر لائے جاتے ہیں ویسے ہی گنہ گاروں کی روحیں موت کے بعد نکال کر لائی جاتی ہیں، فرمایا:

كَلَّاۤ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ. وَقِيْلَ مَنْ رَاقٍ. ہرگز نہیں جب روح ہانس (ہنسلی) تک پہنچے اور لوگ کہیں

وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ . وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ. (قیامہ ۷۵: ۲۶-۳۰)

اب کون ہے جھاڑ پھونک کر کے بچانے والا اور سمجھا کہ اب جدائی کا وقت آ گیا اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ گئی، اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہانکا جانا۔

لیکن سعید اور نیکوکار روحوں کو موت کے وقت یہ محبت بھری صدائے غیب سنائی دیتی ہے:

يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً. (فجر ۸۹: ۲۷، ۲۸)

اے مطمئن روح تو اپنے مالک سے خوش اور تیرا مالک تجھ سے خوش تو اپنے مالک کے پاس واپس چلی جا۔

یہ کیسی دل آویز صدا اور کیسی دل کش واپسی ہوگی۔

اس وقت کا سماں: وہ لمحہ جب اس روح کی مہلت کا زمانہ اور عمل کی فہرست ختم ہوتی ہے کتنا دردناک ہے، اس وقت اس کی زندگی صرف اس کے گذشتہ اعمال کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے، ہر عمل کی صورت اس کو سامنے کھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور غیب کی کارکن صورتیں چلتی پھرتی دکھائی اور بولتی چالتی سنائی دیتی ہیں:

وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَ كُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ. وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ (انعام ۶: ۹۴، ۹۵)

اور کبھی تو دیکھے جس وقت گنہ گار موت کی بے ہوشی میں ہوں اور فرشتے ہاتھ کھولے ہوں کہ نکالو (اپنے جسموں کے اندر سے) اپنی روحوں کو، آج تم کو اس پر ذلت کی سزا ملے گی کہ تم خدا کی شان میں جھوٹ باتیں کہتے تھے اور اس کے حکموں کے ماننے سے غرور کرتے تھے اور تم ایک ایک کر کے (تنہا) جیسے ہم نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا، ہمارے پاس آئے اور جو سامان و اسباب تم کو دیا تھا (جس نے تم کو مغرور بنایا تھا) اس کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ موت کے وقت کس طرح فرشتے سامنے آتے ہیں اور روح جسم سے جس وقت الگ ہوتی ہے، اس کے گناہوں کی سزا کا دور شروع ہو جاتا ہے، یہی بات ایک اور موقع پر مذکور ہے:

وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ

اور کبھی تو دیکھے جس وقت فرشتے کافروں کی جان لیتے

يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ. ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ. (انفال ۸: ۵۰، ۵۱)

ہیں ان کے منہ پر اور پیچھے مارتے ہیں (اور کہتے ہیں) جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو، یہ تمہارے ہاتھوں کے پہلے کیے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اس سے واضح ہے کہ یہ سزا موت ہی کے عالم سے شروع ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ سزا نعوذ باللہ کسی انتقام کے سبب سے نہیں دیتا بلکہ وہ درحقیقت قانونِ عمل کے مطابق خود انسان کے کاموں کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔

نکوکاروں کا نقشہ اس سے بالکل الگ ہے ان کو ہر طرف سے بشارتیں سنائی دیتی ہیں اور ہر سمت خوشی و شادمانی کا سماں سامنے ہوتا ہے:

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ. وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ. وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ٥ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ. تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ. فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ. وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ. فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ. وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ. فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ. وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ. اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ. (واقعہ ۵۶: ۸۳-۹۵)

پھر کیوں نہیں جس وقت روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو اور ہم اس سے تمہاری نسبت زیادہ تر نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم کو دکھائی نہیں دیتا تو اگر تم کسی اور کے حکم کے نیچے نہیں ہو تو کیوں نہیں اس روح کو پھر پلٹا دیتے ہو اگر تم (اپنے انکار و تکذیب میں) سچے ہو تو اگر وہ (مرنے والا) مقرب بندوں میں سے ہوا تو خوشی و آرام اور نعمت کی بہشت ہے اور اگر وہ (اس سے کچھ کم درجہ) دہنے والوں میں ہوا تو تجھ پر سلامتی دہنے والوں میں سے اور اگر وہ حق کو جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہوا تو گرم پانی کی مہمانی اور دوزخ میں بیٹھنا ہے بے شبہ یہ بات یقین کے لائق ہے۔

یہ تمام سماں موت کے بعد اور عالمِ برزخ ہی کے مناظر ہیں۔

برزخ کا عذاب و راحت: اوپر کی آیتوں سے پوری طرح ہویدا ہے کہ روح و جسم کی مفارقت کے بعد اچھی روحوں کے سامنے رحمت کے اور بری روحوں کے رو بہ رو عذاب کے منظر گذرتے ہیں، قرآن پاک میں کچھ اور آیتیں ہیں جن سے ثابت ہے کہ یہ منظر نہ صرف روح کے سامنے ہی سے

گذرتے ہیں بلکہ کبھی کبھی وہ اپنے اعمال کے مدارج کے مطابق رحمت یا زحمت کے اندر بھی داخل کردی جاتی ہے، منافقین کی نسبت قرآن میں ہے:

سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ (توبہ ۹:۱۰۱)	ہم ان کو دو دفعہ عذاب دیں گے پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

"عذابِ عظیم" سے ظاہر ہے کہ دوزخ کا عذاب مراد ہے، اب اس عذابِ دوزخ سے پہلے عذاب کے دو دور ان پر اور گذر چکے ہوں گے، ایک تو یہ دنیاوی عذاب ہے اور دوسرا موت کے بعد ہی کا ہوسکتا ہے، قرآن میں آل فرعون کے ذکر میں ہے:

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۔ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (مومن ۴۰: ۴۵، ۴۶)	اور فرعون والوں پر بری طرح کا عذاب الٹ پڑا، آگ کہ اس پر وہ صبح اور شام پیش کئے جاتے ہیں اور جس دن قیامت کی گھڑی ہوگی (نداہوگی کہ) فرعون والوں کو (پہلے سے بھی) بڑھ کر عذاب میں ڈالو۔

اس سے ظاہر ہوا کہ گنہ گاروں کو قیامت سے پہلے برزخ کے عالم میں بھی عذاب کا کچھ نہ کچھ مزہ چکھایا جاتا ہے، ایسا ہی نیکوکاروں کی بہشت کے عیش و آرام کا منظر دکھایا جاتا ہے، اسی آیتِ پاک کی تشریح میں گویا آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے "تم میں سے جب کوئی مرتا ہے تو اس پر صبح و شام اس کا اصلی مقام پیش کیا جاتا ہے، اگر وہ اہلِ جنت میں سے ہوتا ہے تو جنت، اور اہلِ دوزخ سے ہوتا ہے تو دوزخ، پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا مقام اس وقت تک کے لئے کہ جب تو قیامت کے دن اٹھایا جائے۔"(۱) ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ جنتی مردہ کے سامنے جنت و دوزخ دونوں کے منظر سامنے کرکے کہتے ہیں کہ اگر تو اچھے عمل نہ کرتا تو تیرا یہ مقام نہ ہوتا، مگر تیرے نیک عمل کے سبب سے اب یہ جنت تیرا مقام ہے(۲) اور اس دن تک کے لئے کہ لوگ اٹھائے جائیں، اس پر سرسبزی بھر دی جاتی ہے۔(۳)

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الجنة والنار باب عرض مقعد المیت الخ ج ۲ ص ۴۸۸ مصر و جامع ترمذی کتاب الجنائز باب ماجاء فی عذاب القبر حدیث حسن صحیح ص ۲۰۵ (دیوبند) صحیح بخاری کتاب الجنائز باب المیت یعرض علیه مقعده بالغداة والعشی ج ۱ ص ۱۸۴ و کتاب الرقاق باب سکرات الموت ج ۲ ص ۹۶۴ (۲) صحیح بخاری کتاب الجنائز باب ما جاء فی عذاب القبر ج ۱ ص ۱۸۴ (۳) صحیح مسلم باب عرض مقعد المیت ص ۴۹۰ مصر۔

مشرکوں اور قیامت کے منکروں کا سوال تھا کہ اگر یہ پیغامِ الٰہی سچ ہے تو ہم کو فرشتے یا خدا نظر کیوں نہیں آتے، جواب میں کہا گیا کہ فرشتے جس دن نظر آئیں گے اس دن ایمان بالغیب کہاں؟ اور اوپر کی آیتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے موت کے وقت نظر آتے ہیں یا پھر قیامت میں نظر آئیں گے اس لئے ارشاد ہے:

یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِکَۃَ لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ وَیَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا. وَ قَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰہُ ھَبَآءً مَّنْثُوْرًا. اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ یَوْمَئِذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِیْلًا. وَیَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِکَۃُ تَنْزِیْلًا. اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذِ ٍالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ط وَکَانَ یَوْمًا عَلَی الْکٰفِرِیْنَ عَسِیْرًا. (فرقان ۲۵:۲۲-۲۶)	جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن ان گنہ گاروں کو کوئی خوش خبری نہیں اور کہیں گے (کہ یہ ڈراؤنا منظر جو ہم کو نظر آ رہا ہے) اب اوٹ میں روکا جائے اور ہم (خدا فرماتا ہے) ان کے کیے ہوئے کاموں کے پاس پہنچے اور ان کو اڑتا غبار بنا دیا (یعنی بے کار و بے سود و معدوم) جنت والے لوگ (یعنی جن کو جنت ملنے والی ہے) اس دن ان کے لئے خوب ٹھکانا اور دوپہر کے سونے کا مقام ہوگا اور جس دن آسمان بادل سے پھٹ جائے گا اور فرشتے آہستہ آہستہ اتارے جائیں گے، اس دن راج سچا خدا کا ہوگا اور وہ دن کافروں پر سخت ہوگا۔

کھلی بات ہے کہ آسمان کا بادل سے پھٹنا اور فرشتوں کا اترنا قیامت کا نقشہ ہے، اب اس سے پہلے فرشتوں کے دکھائی دینے کا وہ دن جس میں گنہ گاروں کے لئے کوئی خوش خبری نہیں اور وہ کہیں گے کہ کاش یہ ڈراؤنا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے نہ ہوتا اور جنت کے مستحقین کو ایک اچھا مستقر (قرارگاہ) اور دوپہر کی دھوپ سے بچانے والی خواب گاہ ملی ہوگی، قیامت سے پہلے اور موت کے بعد ہی کی کیفیت ہے۔

سورہ محمد میں موت کے وقت کا حال بیان ہوتا ہے کہ جب فرشتے ان گنہ گاروں کی روحوں کو قبض کرتے ہیں تو ان کے چہروں پر اور پیٹھوں پر ضرب لگاتے ہیں، فرمایا:

فَکَیْفَ اِذَا تَوَفَّتْھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْھَھُمْ وَاَدْبَارَھُمْ. ذٰلِکَ بِاَنَّھُمُ اتَّبَعُوْا مَآ	پھر کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کو وفات دیں گے، ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے ہوئے، یہ اس لئے

سَخِطَ اللّٰہَ وَکَرِھُوْا رِضْوَانَہٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَھُمْ (محمد ۴۷: ۲۷، ۲۸)

کہ انہوں نے اس کی پیروی کی جس نے خدا کو ان سے ناخوش کردیا اور جنہوں نے خدا کی خوشنودی کو پسند نہ کیا تو خدا نے ان کے کاموں کو بے نتیجہ کر دیا۔

یہ غیبی ضرب خواہ اس مادی جسم پر پڑتی ہو یا اس کے مثالی جسم پر یا روح پر، جو بھی کہیے بہر حال اس سے یہ ثابت ہے کہ گنہ گار مردہ پر موت کے وقت ہی سے عذاب کا ایک رنگ شروع ہوتا ہے۔

سورۂ انعام میں اس سے زیادہ ہے:

وَلَوْ تَرٰٓی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوْٓا اَیْدِیْھِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَکُمْ ۭ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْھُوْنِ... (انعام ۶: ۹۴)

اور اگر تو دیکھے جب گنہ گار موت کی سکرات میں ہوں اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوں کہ (اپنے جسم کے اندر سے) اپنی روحوں کو نکالو، آج تم کو ذلت کی سزا ملے گی۔

الیوم جس کے معنی آج کے ہیں، ظاہر ہے کہ اس سے وہی زمانہ مراد ہے، جس وقت سے فرشتے بدن سے روح نکالتے ہیں، اس ''آج'' سے مقصود ہمارا دنیاوی آج نہیں ہے جو ۲۴ گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے بلکہ برزخ کا پورا زمانہ ہے (دیکھو فتح القدیر شوکانی ج ۲ ص ۱۳۳ و تفسیر ابوالسعود برحاشیہ تفسیر کبیر ج ۴ ص ۱۳۸ و تفسیر روح المعانی آلوسی ج ۷ ص ۱۹۴، مصر)۔

قوم نوح کے غرق ہونے کے بعد ہی دوزخ میں جانے کا ذکر ہے:

اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۥ فَلَمْ یَجِدُوْا لَھُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْصَارًا. (نوح ۷۱: ۲۵)

وہ ڈبو دیے گئے پھر وہ آگ میں داخل کیے گئے تو انہوں نے خدا کے سوا مددگار نہیں پائے۔

حضرت لوط اور حضرت نوح علیہما السلام کی کافر بیویوں کی موت کے بعد ہی عذاب کا ذکر ہے:

وَّقِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ. (تحریم ۶۶: ۱۰)

اور کہا گیا کہ داخل ہونے والوں کے ساتھ تم دونوں بھی آگ میں داخل ہو جاؤ۔

یہ قیامت سے پہلے اور دنیا کے عذابِ ہلاکت کے بعد کے واقعات ہیں اور اسی وقفہ کا نام برزخ ہے۔

سورۂ یٰسین میں ایک خیر خواہِ قوم کا ذکر ہے جو عمر بھر اپنی قوم کو حق کی تبلیغ کرتا رہا تھا اور پھر وہ

غالبًا اسی حق کی راہ میں شہید ہوا، مرنے کے بعد جب اس کو بہشت ملی تو اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ مرنے کے بعد خدا نے کس طرح مجھے معاف فرمایا اور عزت بخشی تا کہ وہ بھی ایمان سے میری طرح بہرہ ور ہو کر اس مغفرت اور عزت سے سرفراز ہوتی:

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ. بِمَا غَفَرَلِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ. وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ. (یٰسین ۳۶: ۲۶-۲۸)	کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو اس نے کہا اے کاش میری قوم کو یہ معلوم ہوتا کہ میرے پروردگار نے میری مغفرت کی، اور مجھے عزت والوں میں سے بنایا اور ہم نے اس کے مرنے کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری اور نہ ہم اتارا کرتے ہیں۔

شہیدوں کی نسبت تو خاص طور پر ہے:

بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ. (آل عمران ۳: ۱۶۹)	بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ شہدا کو برزخ ہی میں کامل زندگی کے ساتھ جنت کی روزی ملتی ہے اور عام نیکوکاروں کا یہ حال ہے کہ ان کو فرشتے اس وقت سلامتی اور جنت کی خوش خبری سناتے ہیں، فرمایا:

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. (نحل ۱۶: ۳۲)	جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک وصاف حالت میں وفات دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ۔

قبر کی اصطلاح: سطورِ بالا میں عالمِ برزخ کے وہ مناظر دکھائے گئے ہیں جو قرآن کی آیتوں میں نظر آتے ہیں اور احادیثِ صحیحہ میں اس عالم کے حالات کی جو تفصیلیں مذکور ہیں وہ عمومًا (۱) قبر کی اصطلاح کے ساتھ بیان ہوئی ہیں لیکن اس لفظ قبر سے درحقیقت مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں جس کے

---

(۱) بعض معتزلہ عذاب قبر کے قائل نہ تھے اور ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں، یہ غلط فہمی ان کو اس لئے پیش آئی کہ قرآن میں لفظ قبر وقبور کے ساتھ عذاب کا ذکر نہیں لیکن اگر وہ دیکھتے کہ قرآن میں بعد موت اور قبل قیامت ارواح انسانی کے عذاب وثواب اور رحمت ولعنت کا ذکر موجود ہے تو ان کو اس انکار کی جرأت نہ ہوتی اور قرآن میں اسی قسم کی متعدد آیتیں بھی موجود ہیں۔

نیچے کسی مردہ کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں بلکہ وہ عالم ہے جس میں یہ مناظر پیش آتے ہیں اور وہ ارواح و نفوس کی دنیا ہے، مادی عناصر کی نہیں، اسی لئے قرآن پاک نے اس عالم کے تعلق سے ہمیشہ نفس ورنفوس کو خطاب کیا ہے اور ان ہی کے عذاب وثواب اور رحمت ولعنت کا ذکر کیا ہے، اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے وہ مرنے والے کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے جو ہو بہو اس کے خاکی جسم کا مثنیٰ ہوتا ہے، تم نیند میں ہو اور تمہارا نیم مردہ بے حس جسم بستر پر دراز ہے، مگر تم خواب میں دیکھ رہے ہو کہ بعینہٖ تمہارا جسم آگ میں جل رہا ہے یا باغ و بہار کی لذتوں میں مصروف ہے اور تم کو اس سے وہی تکلیف اور راحت مل رہی ہے جو بے داری میں اپنے بستر پر پڑے ہوئے جسم کی تکلیف و راحت سے مل سکتی ہے، اس خواب میں جس طرح تمہارے مادی جسم کے علاوہ تم کو اپنا ایک خیالی جسم نظر آتا ہے جو ہو بہو تمہارا مادی جسم ہے اسی طرح موت کے خواب میں بھی تم کو اپنا ایک جسمِ مثالی نظر آئے گا جو اکثر حالتوں میں ہو بہو تمہارے اس خاکی جسم کے مطابق ہوگا (۱) اور تمہاری روح اسی مثالی جسم کے عذاب و راحت سے متاثر ہوگی کہ اعمال کی اصل ذمہ دار روحِ انسانی ہے جسمِ خاکی نہیں، فرمایا كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (مدثر ۷۴: ۳۸) (یعنی ہر روح اور جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گرو ہوگی،) اس لئے اصل مکلّف روح ہے، جسم نہیں، جسم بہ منزلہ آلہ کے ہے، دنیا میں اس کا ایک جسم خاکی تھا، برزخ میں اس کا ایک اور جسم ہوگا جو مادہ و مادیات سے پاک و بری ہوگا تاہم اس کو اپنے جسمِ خاکی سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی اور اتنی ہی نسبت کی بناپر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے، کیوں کہ ہم اپنی آنکھوں سے مسلمان مُردوں کو اسی قبروں میں جاتے دیکھتے ہیں، قرآن پاک کی یہ آیت اوپر گذر چکی ہے:

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ	اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے
يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا	ہیں، مارتے ہیں ان کے منہ اور پیٹھ پر اور (کہتے ہیں)
عَذَابَ الْحَرِيْقِ. (انفال ۸: ۵۰)	چکھو جلنے کا مزہ۔

اس آیت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ گنہ گاروں پر موت کے بعد ہی عذاب شروع ہوجاتا ہے وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مار ان کے منہ اور پیٹھ پر پڑتی ہے، مگر یہ منہ اور یہ پیٹھ وہ

(۱) اس سے اس شبہہ کا ازالہ ہوتا ہے کہ ہم کو مردہ کا جسم سامنے پڑا نظر آتا ہے لیکن اس پر عذاب کا کوئی نشان نظر نہیں آتا اور نیز اس شبہہ کا بھی ازالہ ہوتا ہے کہ قبر میں جب جسم سڑ گل جاتا ہے تو پھر عذاب وثواب کا احساس اس کو کیسے ہوتا ہے۔

نہیں ہے جو بے جان لاشہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے بلکہ اس آیت میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے جس طرح جانور کو تیز ہنکاتے وقت کبھی آگے (منہ پر) اور کبھی پیچھے (پیٹھ پر) مارتے ہیں اسی طرح گویا کافر روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چلو عذاب کا مزہ چکھو، یہی مفہوم صاف لفظوں میں اس آیت میں ہے:

اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذٍ نِالْمَسَاقُ. (قیامہ ۷۵:۳۰) اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہنکایا جانا۔

بعض ایسی سعید روحیں بھی ہوتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس برزخ میں جسم خاکی کی شکل و صورت کی قید سے آزاد کر کے کوئی دوسرا مناسب مثالی جسم عطا کرتا ہے، جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ مومن کامل کی روح پرندوں کی شکل میں جنت میں اڑتی پھرتی ہے۔(۱) اور خصوصاً شہدا کے متعلق آیا ہے کہ وہ سبز پرندوں کی شکل میں ہوں گے اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں ان کا آشیانہ ہوں گی، اسی طرح دوزخ و بہشت کے متعلق آنحضرت ﷺ کا جو رویائے صادقہ پہلے گذرا ہے اس میں جن جسمانی قالبوں میں گنہ گاروں کی سزا و تکلیف کی صورتیں دکھائی گئی ہیں وہ تمام تر مثالی ہی ہیں، ظاہر ہے کہ مومن سعید اور شہدا کے وہ مثالی قالب اور گنہ گاروں کے یہ مثالی اجسام ان کے وہ قالب اور جسم نہیں ہیں جو ان کی قبروں میں سڑ کر فنا ہو گئے یا وہ آگ میں جل کر خاکستر ہوئے اور ذرے ہوا میں اڑ کر منتشر ہو گئے یا کسی جانور کے پیٹ میں جا کر اس کا جزوِ بدن بن گئے۔

بعض حدیثوں میں آنحضرت ﷺ سے ان مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات و مسموعات کا تذکرہ ہے تو ظاہر ہے کہ مادی زبان و منظر میں ان قوموں کے نزدیک جو مردوں کو گاڑتی ہیں اس میت کی یادگار اس دنیا میں اس مٹی کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے، ایک صحیح حدیث میں اس نیک مرد کا ذکر ہے جس نے خدا کے خوف سے یہ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کا جسم جلا کر راکھ ہوا میں اڑا دی جائے تا کہ وہ خدا کے سامنے حاضر نہ کیا جا سکے مگر قدرتِ الٰہی نے اس کو مجسم کر کے کھڑا کر دیا اور اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں سے نوازا۔(۲)

سوال و جواب: احادیثِ صحیحہ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مرنے کے بعد قبر میں دو

---

(۱) سنن ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ما جاء فیما یقال عند المریض اذا حضر ص ۱۰۶ (۲) بخاری جلد دوم ص ۹۵۹ کتاب الرقاق باب الخوف من اللہ۔

فرشتے آتے ہیں اور وہ مردوں سے توحید ورسالت کی نسبت سوال کرتے ہیں۔

اس کی تصدیق قرآن پاک کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے:

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ ۙ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ (نحل ۱۶: ۳۲)

جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک وصاف حالت میں وفات دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ (نساء ۴: ۹۷)

بے شک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت میں قبض کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے وہ ان سے کہتے ہیں تم کس بات میں تھے، وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم ملک میں بے یار و مددگار تھے، وہ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جاتے۔

ایک اور آیت ہے:

حَتّٰىٓ اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا یَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَیْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِیْنَ۔ قَالَ ادْخُلُوْا فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِی النَّارِ (اعراف ۷: ۳۷، ۳۸)

یہاں تک کہ جب ان جھٹلانے والوں کے پاس ہمارے فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرنے آئیں گے اور کہیں گے کہاں ہے وہ جن کو تم خدا کے علاوہ پکارتے تھے (اس وقت وہ مشرک) کہیں گے کہ ہمارے وہ دیوتا ہم سے کنارہ کش ہو گئے اور انہوں نے اپنے اوپر آپ گواہی دی کہ وہ کافر تھے تب خدا فرمائے گا کہ تم بھی ان لوگوں میں جا ملو جو جن وانس میں سے تم سے پہلے آگ میں جا چکے ہیں۔

پہلی آیت میں عدمِ ہجرت کے گناہ کے مرتکب مسلمانوں کا اور دوسری میں کافروں کا حال بیان کیا ہے کہ ان سے ان کی موت کے بعد ہی یہ سوال کیا جائے گا، بہر حال یہ تو خاص خاص گناہوں کے مجرموں کا حال تھا، اب عام لوگوں سے جو سوال ہو سکتا ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے یعنی توحید ورسالت کی معرفت کا ان سے سوال ہوگا۔

قرآن پاک میں ایک جگہ کلمۂ طیبہ (اچھی بات یعنی کلمۂ توحید) اور کلمۂ خبیثہ (بری بات

یعنی کلمۂ کفر) کی ایک ایک مثال ہے، کلمۂ طیبہ کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین میں مضبوط گڑی ہیں اور اس کی شاخیں آسمانوں تک پھیلی ہیں اور اس میں سدا بہار میوے لگے ہیں اور کلمۂ خبیثہ کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑ زمین سے اکھڑی پڑی ہے اور وہ اب گرا اور تب گرا، اس کے بعد قرآن میں ہے:

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ	اللہ ایمان والوں کو پکی بات پر اس دنیا میں مضبوط رکھے گا
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ	اور آخرت میں بھی اور اللہ ظالموں کو بچلاتا ہے۔
الظّٰلِمِيْنَ (ابراہیم ۱۴: ۲۷)	

اس کی تفسیر صحیح حدیثوں میں یہ ہے کہ یہ برزخ کے اسی سوال و جواب سے متعلق ہے کہ صاحبِ ایمان جس طرح اپنی اس زندگی میں ایمان کی بات پر قائم تھا، اسی طرح برزخ میں بھی اس پر قائم رہے گا اور جو کافر و مشرک یہاں اس پر قائم نہ تھا وہ وہاں بھی قائم نہ رہے گا اور بہک جائے گا۔

ہر چند کہ رسولِ پاک ﷺ کی صحیح تفسیر کے ہوتے ہوئے کسی اور استدلال کی حاجت نہیں، تاہم تائیداً یہ عرض ہے کہ اس آیت میں اہلِ ایمان کے آخرت میں بھی قولِ ثابت پر ثابت قدم رکھے جانے کی بشارت ہے، ظاہر ہے کہ اس آخرت سے قیامت اور بہشت و دوزخ کا دن تو مراد نہیں ہوسکتا کہ وہ تو کشفِ راز کا دن ہے اس دن تو کافر بھی اس قول ثابت سے پلٹنے کی جرأت نہیں کرسکتا، پھر یہ اہلِ ایمان کے لئے کوئی خاص بشارت نہ ہوگی اور نہ یہ اس اظہارِ احسان کا مناسب وقت ہوسکتا ہے، البتہ اس بشارت اور احسان کا اعلان و اظہار آخرت کے اس حصہ میں موزوں ہوسکتا ہے جہاں ہنوز اسرارِ پسِ پردہ کی پوری نقاب کشائی نہیں ہوتی اور وہ برزخ کا عالم ہے۔

اس آیتِ پاک کی اس تفسیر سے جو احادیثِ صحیحہ پر مبنی ہے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آخرت کی وسعتِ مفہوم میں برزخ کا میدان بھی داخل ہے۔

حقیقت میں اس عالم برزخ کا سوال و جواب کوئی نیا واقعہ نہ ہوگا بلکہ ہر روح کی پہلی زندگی کی ایمانی کیفیت و اقرار و انکار کی مثال ہوگی یا یوں کہو کہ آج کے آئینہ میں کل کا عکس نمایاں ہوگا، یعنی اقرار و انکار کی جس کیفیت پر زندگی کا خاتمہ ہوا ہوگا وہی بعد کو سوال و جواب میں نمایاں ہوگی۔

برزخ میں ارواح کا مسکن: آخری سوال یہ ہے کہ موت اور قیامت کی اس بیچ کی منزل (برزخ) میں ارواحِ انسانی کا مسکن کہاں ہوگا؟ قرآن پاک میں اس کا جواب متعدد آیتوں میں ملتا ہے، سب سے پہلی آیت تو ان مذکورہ بالا آیات کے بعد ہے جس میں ذکر ہے کہ فرشتے جب منکرین سے سوال جواب کرچکیں گے تو خدا ان کی روحوں کو حکم دے گا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عذاب کی آگ میں داخل ہو جائیں، اس کے بعد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۔ (اعراف ۷:۴۰)	بے شک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے غرور کیا ان کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے تا آں کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے (یعنی کبھی نہیں)۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیاتِ الٰہی کے منکروں اور جھٹلانے والوں کی روحیں مرنے کے بعد آسمانی بادشاہی کے حدود میں قدم نہ رکھ سکیں گی اور وہ فضائے زمین میں آوارہ پھریں گی یا اپنے خاکی جسموں کے لگاؤ سے جہاں وہ سپردِ خاک ہوئے ہوں منڈلاتی رہیں گی اور وہیں سے دوزخ کا منظر دیکھیں گی اور تکلیف اٹھائیں گی۔

اس کے برخلاف ہمہ تن پاک باز مومن روح کا یہ حال ہوتا ہے کہ موت ہی کے وقت رحمت کا فرشتہ بلکہ خود زبان رحمت اس کے کانوں میں یہ صدا دیتی ہے:

يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ. ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً. فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ. (فجر ۸۹:۲۷-۳۰)	اے مطمئن روح اپنے پروردگار کے پاس واپس چلی جا تیرا پروردگار تجھ سے خوش اور تو اپنے پروردگار سے خوش، تو میرے بندوں میں شامل اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔

ان سے بڑھ کر وہ پاک باز روحیں ہیں جنہوں نے اپنے خاکی جسموں، فانی زندگیوں، مادی خوشیوں اور زوال پذیر عشرتوں کو خدا کی راہ میں قربان کیا، تو ان کو خدا کی طرف سے ایک تمثالی جسم، غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و مسرت کی لازوال دولت اسی وقت عنایت کر دی جاتی ہے، فرمایا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ. (بقرہ ۲:۱۵۴)	جو خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں کر سکتے۔

یہ پرمسرت زندگی کیسی ہوگی اس کی تفصیل دوسری سورہ میں ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ. فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ.

اور تو ان کو جو خدا کی راہ میں مارے گئے مردہ نہ گمان کر، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، ان کو روزی دی جاتی ہے، خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو جو دیا ہے اس پر خوش ہیں اور جو ابھی ان کے پیچھے سے ان تک نہیں پہنچے ہیں ان کی طرف سے بھی خوش ہیں کہ ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم گین ہوں گے وہ اللہ کے مہر و کرم سے مسرور ہیں اور اللہ ایمان والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔

(آل عمران ۳:۱۶۹-۱۷۱)

یہ پرمسرت زندگی شہدا کو ملے گی، اس زندگی کا مقام خدا کے پاس بتایا گیا ہے، احادیثِ صحیحہ میں ہے کہ ان زندہ شہیدوں کی روحیں قفسِ عنصری سے پرواز کر کے جب اڑتی ہیں تو وہ سبز پرندوں کی صورت میں جنت کی سیر کرتی ہیں اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں [۱] ان کا نشیمن بنتی ہیں، اس کے بعد غالباً اتنا ہر ذی عقل تسلیم کرے گا کہ انبیا علیہم السلام کے روحانی مدارج و مراتب شہدا سے بہر حال اعلا اور برتر ہیں اس لئے ان کا مقام بھی اسی احاطۂ قدس کے اندر ہوگا، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے سیرِ معراج اور اپنے رویائے صادقہ میں بعض پیغمبروں کو آسمان اور بہشت کے مختلف مدارج میں دیکھا۔

بعض وہ سعید روحیں ہیں جو یہاں سے نکل کر فرشتوں کی صف میں داخل ہو جاتی ہیں، جیسا کہ حضرت جعفر طیارؓ کے متعلق احادیثِ صحیحہ میں آیا ہے کہ وہ شہادت کے بعد اپنے دونوں بازوؤں سے فرشتوں کے ساتھ عالمِ ملکوت میں اڑ رہے تھے، عالمِ برزخ میں یہ دو اڑنے والے بازو درحقیقت ان کے ان دونوں جسمانی بازوؤں کی مثال ہیں جو اس جنگ میں ان کے جسم سے کٹ کر گر گئے تھے اور وہ اس پر بھی اسلام کے علم کو اپنے بقیہ کٹے ہوئے بازو اور گردن کے سہارے سے پکڑے تھے، عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیت ایسے ہی لوگوں کی شان میں ہو:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ. نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (حٰمٓ السجدہ ۴۱:۳۰،۳۱)

بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے، ان پر فرشتے یہ خوش خبری لے کر اترتے ہیں کہ خوف نہ کھاؤ اور غم گین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا تھا، ہم دنیا کی زندگی میں تمہارے رفیق ہیں اور آخرت میں۔

یہ آوازۂ بشارت اور فرشتوں کی رفاقت اسی برزخ کا دلکش سماں ہو سکتا ہے۔

۲۔ آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل

قیامت اور جزائے اعمال

موت تو افراد کا معاملہ ہے، ایک مرتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ پیدا ہوتا ہے، قومیں بھی باری باری اس بازی گاہ کے تختہ پر آتی ہیں اور ایک قوم اپنا کھیل ختم کر کے کسی دوسری کے لئے جگہ خالی کر جاتی ہے، یہ سلسلہ ازل سے قائم ہے اور اب تک چل رہا ہے، کائنات جس نظام پر پیدا ہوئی تھی وہ بعینہٖ قائم ہے اور اس محفل کی جو رونق اول روز تھی وہ اب تک اسی طرح باقی ہے، غرض۔

ہزار شمع بہ کشتند و انجمن باقی است

لیکن کیا کوئی ایسا دن بھی آئے گا جب یہ ساری بساطِ ہستی الٹ جائے گی، کائنات کی یہ مجلس درہم برہم ہو جائے گی اور آسمان و زمین کے کرّے ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے اور پھر وہ خلاقِ عالم اپنی صفتِ خلق واحسان و جزا کے نئے منظر دکھائے گا اور نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو کر ایک اور عالم کسی نئے نظام پر وجود پذیر ہوگا۔

دنیا کے وہ تمام لوگ جو حال کو دیکھ کر مستقبل کا پتہ لگاتے ہیں کسی نہ کسی طرح اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح یہ افراد آتے اور فنا ہوتے ہیں اسی طرح ایک دن آئے گا جب اس پوری دنیائے حیات پر موت طاری ہوگی، سب سے زیادہ اس سوال کے جواب میں کرید بلکہ انکار کا حق فلسفہ اور سائنس کے محققوں (سائنٹسٹ) کو ہو سکتا ہے، مگر اہلِ فلسفہ کا بڑا گروہ اس امکان پر یقین رکھتا ہے اور اہلِ سائنس بھی اس کو بہر حال محال نہیں سمجھتے، بلکہ طبیعیات وہیئتِ جدیدہ کے مختلف محققوں کے خیالات اس باب میں امکان سے آگے بڑھ کر وقوع کی سرحد تک پہنچ چکے ہیں، وہ اس ہول ناک دن کی آمد کے متعلق اپنے علم کے زور سے پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں اور اس عالم گیر موت کے مختلف اسباب ظاہر کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ نظامِ عالم کی پوری گاڑی جس انجن سے چل رہی ہے وہ گرم آفتاب ہے جس کی یہ گرمی روز بہ روز کم ہوتی جاتی ہے، آخر ایک دن آئے گا جب یہ انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا اور ساری گاڑی ٹوٹ پھوٹ جائے گی، ایک سبب یہ

بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پورا نظامِ کائنات جذب و کشش کے ستون پر قائم ہے اور فضائے ہستی کے یہ تمام سیارے روز بہ روز کھنچتے چلے آتے ہیں تو ایک دن وہ بھی آئے گا جب باہمی توازن باقی نہیں رہے گا اس وقت تمام کرّے ایک دوسرے سے قریب ہو کر ٹکرا جائیں گے اور یہ تصادم ان کو چور چور کر دے گا۔

ایک اور خیال یہ ہے کہ اس فضا میں کروڑوں ستارے تیر رہے ہیں ان میں سے بہت کم کا علم ہم کو ہوا ہے، بہت ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں ہماری زمین کسی نئے ستارہ سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے، اور اس کی ساری آبادی هَبَاءً مَّنْثُوْرًا ہو کر رہ جائے۔

بہر حال اسبابِ طبعی کچھ ہوں مگر ایسا ہونا اہلِ سائنس کے نزدیک بھی امکان بلکہ وقوع کی امید سے خالی نہیں۔

اہلِ مذاہب میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی نوع سے ہر جگہ موجود ہے اور اس کا مجمل تذکرہ تمام آسمانی کتابوں میں ہے، تورات میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں، زبور میں اس کی تصریحات ہیں اور اس میں اس کو عدالت کا دن کہا گیا ہے(۱) ، حضرت مسیحؑ کے زمانہ میں یہود کے دو فرقے تھے ایک صدوقی جو یونانیوں کے اثر سے آزاد خیال ہو گیا تھا اور قیامت کا منکر تھا، مگر دوسرا فرقہ جو فریسی کہلاتا تھا بہ دستور اپنے پرانے عقیدے پر قائم تھا(۲) آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی جو یہود تھے وہ قیامت، حشر ونشر اور بہشت و دوزخ کے قائل تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ جب قیامت آئے گی تو اللہ تعالیٰ ایک انگلی پر آسمانوں کو، دوسری پر زمینوں کو تیسری پر درختوں کو چوتھی پر پانی کو اور اندر کی نم مٹی کو اور پانچویں پر تمام مخلوقات کو رکھے گا اور ندا دے گا کہ میں ہوں بادشاہ (۳) انجیل میں یہ عقیدہ پوری تصریح کے ساتھ مذکور ہے، حضرت عیسیٰؑ نے صدوقیوں کے مقابلہ میں تورات کی ایک آیت سے حیاتِ اخروی کا ثبوت پیش کیا ہے(۴) اور مکاشفاتِ یوحنا میں قیامت کے احوال واہوال کی پوری تفصیل وتشریح مذکور ہے، ہندو پرلے کے نام سے اس عقیدہ (فنائے عالم) پر یقین رکھتے ہیں، لیکن اس حقیقت کی کامل تشریح خاتم الانبیا محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے۔

قیامت کے نام: کسی شے کی حقیقت کی اولین گرہ کشائی اس کے ناموں کی تشریح سے ہوتی

(۱) زبور ۹۔۱۶، ۱۷، و ۲۲۔ ۱ و ۲ باب ۴۹، ۵۰ (۲) انجیل مرقس ۱۲۔۲۴، و اعمال ۲۳ (۳) صحیح بخاری تفسیر سورہ زمر ج ۲ ص ۷۱۱

(۴) متی ۲۲۔۳۱، ۳۲، لوقا ۲۰۔۲۷، مرقس ۱۲۔۱۸۔

ہے، قرآن پاک میں قیامت کو بیسیوں ناموں سے یاد کیا گیا ہے اوران میں سے ہر ایک نام اس کے ایک خاص پہلو کو نمایاں اور ظاہر کرتا ہے، قرآن میں اس کا سب سے پہلا نام جو سب سے پہلی سورہ میں ہے وہ یوم الدین ہے یعنی جزا کا دن، جس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ عمومی جزا اور ربانی عدالت کا دن ہوگا، اس کے علاوہ اس کے چند نام قرآن میں جابجا آئے ہیں:

الساعة	وہ گھڑی (وہ مقررہ وقت)۔
یوم القیامة	کھڑے ہونے کا دن (مردوں کے کھڑے ہونے کا دن)
الیوم الحق	سچا دن (نہ جس کے آنے میں کوئی شک ہے اور نہ جس کے فیصلہ میں کوئی غلطی ہوگی)۔
یوم معلوم	جانا ہوا دن یا مقررہ دن۔
الوقت المعلوم	جانا ہوا وقت یا مقررہ وقت۔
الیوم الموعود	موعودہ دن۔
الیوم الأخر	پچھلا دن۔
یوم الأزفة	قریب آنے والی مصیبت کا دن۔
یوم عسیر	ایک سخت دن۔
یوم عظیم	ایک بڑا دن۔
یوم عصیب	سخت دن۔
یوم البعث	جی اٹھنے کا دن۔
یوم التغابن	افسوس کا دن (۱)۔
یوم التلاق	باہم ملنے کا دن۔
یوم التناد	پکار کا دن۔
یوم الجمع	اکٹھے ہونے کا دن۔

(۱) عام مترجمین نے ہار جیت کا دن لکھا ہے اور شاہ عبد القادر صاحب نے نقصان اٹھانے کا دن لکھا ہے اسی سے اس میں حسرت وافسوس کا مفہوم بھی شامل ہوا "ض"۔

یوم الحساب	حساب کا دن۔
یوم الحسرة	حسرت کا دن۔
یوم الخروج	قبروں سے نکلنے کا دن۔
یوم الفصل	فیصلہ کا دن۔
القارعة	کھڑکھڑانے والی۔
الغاشية	چھا جانے والی۔
الطّامة الكبرٰى	بڑی مصیبت۔
النبأ العظيم	بڑی خبر۔
الحاقة	ضرور آنے والی گھڑی۔
الوعد	وعدہ۔
الواقعة	وقوع پذیر۔
امر الله	خدا کی بات۔
الصاخّة	بہرا کرنے والی گھڑی۔

قیامت کے اوصاف: یہ تو وہ نام ہیں جو اسمِ مفرد یا اضافت یا صفت کی صورت میں ہیں، ان کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ترکیبوں کے ساتھ اس کے بہ کثرت نام قرآن میں آئے ہیں، مثلاً:

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ (انعام۶:۷۳ و طٰہٰ ۲۰:۱۰۲)	جس دن نرسنگھا پھونکا جائے گا۔
يَوْمَ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ (مائدہ ۵:۱۱۹)	جس دن سچوں کو ان کی سچائی کام دے گی۔
يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ (شعراء ۲۶:۸۸)	جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد۔
وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ (فرقان ۲۵:۲۷)	جس دن گنہ گار اپنے دونوں ہاتھ چبائے گا۔
وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ (فرقان ۲۵:۲۵)	اور جس دن آسمان پھٹے گا۔
وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ۔ (مومن ۴۰:۵۱)	جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔
لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ۔ (آل عمران ۳:۲۵)	جس دن میں کوئی شک نہیں۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا (نمل ۲۷:۸۳)	جس دن ہم ہر قوم سے ایک گروہ کو اکٹھا کریں گے۔
يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. (مطففین ۸۳:۶)	جس دن لوگ جہان کے پروردگار کے لئے کھڑے ہوں گے۔
يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ (قمر ۵۴:۷)	(جس دن) لوگ قبروں سے نکلیں گے۔
يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ. وَ اُمِّهٖ وَ اَبِيْهِ. وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيْهِ. (عبس ۸۰:۳۴-۳۶)	جس دن آدمی اپنے بھائی اور ماں اور باپ اور بیوی اور بیٹوں سے بھاگے گا۔
يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا (بقرہ ۲:۴۸)	جس دن کوئی کسی دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گا۔
يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ (نور ۲۴:۲۴)	جس دن ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔
يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا. (انفطار ۸۲:۱۹)	جس دن کوئی دوسرے کے لئے کچھ نہ کر سکے گا۔
يَوْمَ لَا يُغْنِىْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا (دخان ۴۴:۴۱)	جس دن کوئی دوست کسی دوسرے دوست کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔

الغرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوصاف اس ہول ناک دن کے بیان کئے گئے ہیں، جن سے اس عظیم الشان دن میں انسان کی بے کسی، عاجزی اور اپنے اعمال کے سوا کسی دوسری چیز کے کام آنے سے قطعی مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔

قیامت میں فسادِ نظام ہوگا: قیامت کے متعلق بعض متکلمین کو یہ شبہہ ہوا ہے کہ وہ مادہ کے فنائے محض یا عدمِ محض کا نام ہے حالاں کہ یہ بات قرآنی تصریحات کے خلاف ہے، قرآن پاک کی بیسیوں آیتوں میں قیامت کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ تمام تر فنائے حیات اور آسمان و زمین کے نظام کی برہمی اور ان کی تباہی کے خاکہ کے سوا کچھ اور نہیں ہے، چنانچہ حسب ذیل آیات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ خود بہ خود سامنے آجائے گا:

اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ. وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ.	متنبہ کرنے والی اور کیا چیز ہے متنبہ کرنے والی اور تم کو کس

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ. وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ.
(قارعہ ۱۰۱: ۱-۵)

نے بتایا کہ کیا چیز ہے متنبہ کرنے والی، یہ وہ دن ہے جب لوگ پریشان پروانوں کی طرح اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہوں گے۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا. وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا. وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا. يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا. (زلزال ۹۹: ۱-۴)

جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور وہ اپنا بوجھ نکالے گی اور انسان کہے گا زمین کو کیا ہوا، اس دن وہ اپنی حالت بیان کرے گی۔

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ. وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ. وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ. وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ۝ (انشقاق ۸۴: ۱-۴)

جب آسمان پھٹ جائیں گے اور وہ اپنے مالک کی فرماں برداری کریں گے اور وہ فرماں برداری کے لائق ہیں، جب زمین پھیلائی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے اس کو ڈال دے گی اور خالی ہو جائے گی۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ. وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ. وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ. وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ. عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ.
(انفطار ۸۲: ۱-۵)

جب آسمان پھٹ جائیں گے اور جب ستارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر چلائے جائیں گے اور جب قبر کے لوگ زندہ کیے جائیں گے اس وقت روح نے جو کچھ پہلے اور پیچھے بھیجا ہے اس کو جان لے گی۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ. وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ. وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ. (تکویر ۸۱: ۱-۳)

جب آفتاب اندھیرا کیا جائے گا، جب ستارے تاریک ہو جائیں گے، جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ. فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ. وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ. وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ.
(مرسلات ۷۷: ۷-۱۰)

جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً ہونے والا ہے، جب ستارے ماند کر دئے جائیں گے اور جب آسمان کھول دیا جائے گا اور جب پہاڑ ریزہ ریزہ کر دئے جائیں گے۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ. وَخَسَفَ الْقَمَرُ. وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ. (قیامہ ۷۵: ۷-۹)

جب نگاہ ماند ہو جائے گی، جب ماہتاب بے نور ہو جائے گا اور آفتاب و ماہتاب اکٹھا کر دئے جائیں گے۔

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ. وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ. (معارج ۷۰: ۸، ۹)

جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح اور جب پہاڑ روئی کے گالوں کے مانند ہو جائیں گے۔

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ . وَ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً. فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ. وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ. (الحاقہ ۶۹:۱۳-۱۶)

جب صور میں ایک پھونک پھونکی جائے گی، جب زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور دونوں ٹکڑے ہوجائیں گے، اس دن ہونے والی بات ہوجائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس دن کمزور ہوجائے گا۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا.........فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا. اِلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا (مزمل ۷۳:۱۴-۱۷ و ۱۸)

جب زمین اور پہاڑوں میں لرزہ ہوگا اور پہاڑ پگھلا ہوا تانبا ہوجائیں گے .... کیوں کر تقی ہوسکتے ہیں، جب اس دن کا انکار کرتے ہو جو بچوں کو بوڑھا بنادے گا، آسمان اس دن پھٹ جائے گا اور خدا کا وعدہ پورا ہوجائے گا۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ (ابراہیم ۱۴:۴۸)

جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۝ (رحمٰن ۵۵:۳۷)

جب آسمان پھٹ جائیں گے اور سرخ تلچھٹ کی طرح ہوجائیں گے۔

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ. لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ. خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ. اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا. وَّ بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا. فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا. (واقعہ ۵۶:۱-۶)

جب ہونے والی بات ہوجائے گی جس کے ہونے میں جھوٹ نہیں ہے، زیروزبر کردینے والی، جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور پہاڑ پراگندہ کئے جائیں گے اس وقت وہ پریشان ذرات کی طرح ہوجائیں گے۔

وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا. وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا. (نبأ ۷۸:۱۹-۲۰)

اور آسمان کھول دئے جائیں گے تو وہ دروازے ہوجائیں گے اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب ہوجائیں گے۔

غرض اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت صرف نظامِ عالم کی درہمی اور دنیا کی حیاتِ موجودہ کی تباہی کا نام ہے جس کے بعد ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان بنے گا اور پچھلی دنیا کے نتائج پر اس دنیا کی حکومت کا قانون جاری ہوگا:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ

جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور

السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ. (ابراہیم ۱۴:۴۸)

آسمان بھی بدل جائیں گے اور سب لوگ اس ایک سب پر قابو رکھنے والے خدا کے سامنے نکل کر آئیں گے۔

قیامت کی حقیقت: اگرچہ قرآن پاک میں متفرق طور پر اس ہول ناک دن کے احوال و کیفیات کا ذکر گونا گوں طریقوں سے کیا گیا ہے، تاہم ایک خاص سورہ بھی اس نام سے اس میں موجود ہے، جس میں نہایت اختصار وایجاز کے باوجود انتہائی بلیغانہ وسعت ہے، چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے سے بڑے اور اہم سے اہم مطالب کو اس طرح بیان کیا ہے کہ عقل ساکت اور قلب مطمئن ہو جاتا ہے، اس سورہ کا آغاز ان آیتوں سے ہوتا ہے:

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ. وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ. اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ. بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ. بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ. يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ. فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ. وَخَسَفَ الْقَمَرُ. وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ. يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ. كَلَّا لَا وَزَرَ. اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۨالْمُسْتَقَرُّ. يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ. بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ. وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝ (قیامہ ۷۵:۱-۱۵)

میں قیامت کے دن کی اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں کیا (انسان) سمجھتا ہے کہ ہم (اس کے مرنے کے بعد) اس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کر سکتے، کیوں نہیں ہم تو اس کے پوروں کو درست کر سکتے ہیں، یہ نہیں بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ انسان چاہتا یہ ہے کہ خدا کے سامنے ڈھٹائی کرے، پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہے تو جب نگاہ چوندھلانے لگے اور چاند بے نور ہو جائے اور سورج اور چاند ایک جگہ کر دئے جائیں، انسان اس دن کہے گا کہ اب کہاں ہے بھاگنے کی جگہ، ہرگز نہیں، کہیں بچاؤ نہیں، اس دن تیرے رب کے پاس ہے جا ٹھہرنا، اس دن انسان کو جو اس نے آگے بھیجا (عمل) اور جو پیچھے چھوڑا (مال و دولت) وہ بتایا جائے گا بلکہ انسان اپنے حال کو آپ دیکھتا ہے اگرچہ وہ زبان سے بہانے تراشا کرے۔

ان میں سے پہلی ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے روزِ قیامت اور نفسِ لوامہ کی یکے بعد دیگرے قسم کھائی ہے، نفسِ لوامہ یعنی ملامت کرنے والے نفس سے مقصود انسان کے اندر کا ضمیر ہے جو اس کے ہر برے کام کے وقت اندر سے غم گین و نادم ہوتا ہے اور اس کے اس کام پر ملامت کرتا ہے، آخری

آیت میں اسی کیفیتِ ضمیر کو ان لفظوں میں ادا فرمایا ”بلکہ انسان اپنے حال کو آپ ہی خوب جانتا ہے اگرچہ وہ زبان سے اپنی برائیوں اور کوتاہیوں کے لئے سیکڑوں بہانے تراشا کرے، انسان کی اسی قلبی کیفیت کا نام نفسِ لوامہ ہے۔

ا۔ اجتماعیات کے عالم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرد اور جماعت کے احوال میں ایک خاص قسم کی مناسبت ہے، جس طرح شخص پیدا ہوتا ہے بڑھتا ہے، بیمار ہوتا ہے، تندرست ہوتا ہے، گنہ گار ہوتا ہے، نکوکار ہوتا ہے، پشیمان ہوتا ہے، محنت کرتا ہے، نکونام ہوتا ہے، بدنام ہوتا ہے، خاص طبعی توانین کی مطابقت سے وہ قوت حاصل کرتا ہے، اوران کی مخالفت سے وہ بیمار اور کمزور ہوتا ہے، پھر ایک خاص عمر کو پہنچ کر رفتہ رفتہ اس کے قوائے عمل سرد پڑتے جاتے ہیں اور وہ مرجاتا ہے، بعینہٖ یہی تمام احوال جماعتوں اور قوموں کو بھی پیش آتے ہیں وہ بھی پیدا ہوتی ہیں، بڑھتی ہیں، تندرست ہوتی ہیں، کمزور ہوجاتی ہیں، گناہ گار ہوتی ہیں، نکوکار بنتی ہیں اور ایک خاص وقت اور عمر کو پہنچ کر ان کے عملی قوی کمزور و مضمحل ہوجاتے ہیں اور وہ فنا ہوجاتی ہیں۔

دنیا میں اسی اصول پر ہزاروں قومیں پیدا ہوکر فنا ہوچکی ہیں، جن کے نام بھی تاریخ کے صفحوں پر آج تک موجود نہیں ہیں تو جس اصول پر اشخاص اور اشخاص کا مجموعہ جماعتیں اور جماعتوں کا مجموعہ اقوام پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہیں، کیا اسی اصول پر تمام اقوامِ عالم کا یہ مجموعہ جو پیدا ہوتا، بڑھتا اور ترقی کرتا چلا جاتا ہے کیا ایک دن فنائے محض کے آغوش میں جا کر نہ سوجائے گا، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے قیامت کے ثبوت میں اکثر عاد و ثمود و آل فرعون وغیرہ قوموں کی تباہی سے قیامت کی عمومی تباہی پر استدلال کیا ہے، اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

بہرحال اب جس طرح شخص کے اندر ایک نفس لوامہ یا ضمیر یا احساس ہے جو اس کے ہر برے فعل کے وقت اس کو ملامت کرتا اور اس کو گنہ گار ٹھہراتا ہے اور جب کبھی وہ اپنے تمام مجموعی کارناموں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اپنے کو قصوروار جانتا اور گنہ گار سمجھتا ہے، اسی طرح قوموں کا ضمیر بھی اپنے گناہوں پر پچھتاتا اور اپنی تقصیروں پر نادم اور کوتاہیوں پر شرمندہ ہوتا ہے اور ٹھیک اسی طرح یہ پوری انسانیت بھی ایک دن اپنے افراد کے مجموعی کارناموں پر نادم و پشیمان ہوگی اور اس کا ضمیر و نفسِ لوامہ بھی اس کو ملامت کرے گا، کائناتِ انسانی سے بڑھ کر خود کائناتِ ہستی بھی اس پر جو اس کے اندر کیا

گیا، اپنے خالق کے سامنے اپنی پشیمانی وندامت کا اظہار کرے گی، اسی عمومی اعترافِ قصور اور کلی ندامت و پشیمانی کا نام قیامت ہے اور اسی مناسبت سے سورہ بالا میں نفسِ لوامہ اور قیامت کو باہم ایک قسم یعنی شہادت میں یک جا کیا گیا ہے، اب اس تفصیل کی روشنی میں سورۂ مذکور کی آیتوں کو دوبارہ پڑھیے۔(۱)

۲۔ اس عالم کی ہر چیز پر اگر غور سے نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ وہ متضاد عناصر وقویٰ کا مجموعہ ہے، اس میں سردی وگرمی، بیماری وتندرستی، بقاوفنا اور دیگر ہر قسم کی متضاد قوتیں ودیعت رکھی گئی ہیں، ان متضاد قوتوں میں جب تک اعتدال قائم رہتا ہے وہ چیز زندہ رہتی ہے اور جس وقت یہ اعتدال جاتا رہتا ہے اسی لمحہ وہ فنا ہوجاتی ہے، ایک درخت میں ایک پھول کھلا، سردی وگرمی اور موسم کی تاثیر نے اس پر عمل کیا، جب تک ان متضاد تاثیرات واستعدادات میں اعتدال کی کیفیت رہی وہ پھول شگفتہ رہا جس آن کسی ایک قوت نے شکست کھائی، پھول کی ہستی معرضِ فنا میں آگئی، یہی حال دنیا کی ہر چیز کا ہے اور اسی اصول پر افراد، خاندان، جماعتیں، قومیں بلکہ حیوانات، شجر، حجر، غرض دنیا کی ہر چیز چل رہی ہے۔

پوری کائناتِ ہستی کو لیجئے اس کو خلاقِ عالم نے ان ہی متضاد عناصر واخلاط پر قائم فرمایا ہے، دن رات، روشنی وتاریکی، سردی، گرمی، پانی، آگ، بہار، خزاں، تندرستی، بیماری، دولت، افلاس، حیات وموت، آسمان وزمین، نیکی وبدی، خیر وشر، غرض جس کو بھی دیکھو یہی معلوم ہوگا کہ یہی اربعِ عناصر کی چہار دیواری، متضاد قویٰ اور حالات کی بنیادوں پر قائم ہے، ان میں جب تک اعتدال قائم ہے اس دنیا کی کل چل رہی ہے، جس دن ان کے اعتدال میں فرق آیا وہی دن اس کی فنا کا دن ہوگا۔

لیکن جس طرح افراد واشخاص میں بیماری کے بعد تندرستی اور تندرستی کے بعد بیماری کی صلاحیت موجود ہے اسی طرح اس نظامِ کائنات میں بھی تندرستی کے بعد بیماری اور بیماری کے بعد تندرستی کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں، کتنی دفعہ یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ دنیا ظلم وجور سے لبریز ہوگئی اور کشت و خون کے سیلاب نے اس کے امن وامان کو غرق کردیا، کہ دفعتاً وہ پھر ابھری اور اس کا غرق شدہ امن وامان کشتیٔ نوح بن کر کرۂ ارضی کو بچالے گیا، بارہا اس باغِ ہستی میں خزاں آئی اور پھر بہار کا موسم اس

(۱) مستفاد از تفسیر سورہ قیامہ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ، (ص ۱۳، ۱۴ طبع ثانی ۱۴۰۳ھ)۔

بچ گیا، اجرامِ سماوی کی باہمی مسابقت میں ہماری زمین کئی دفعہ ٹکرا جانے کے قریب پہنچی اور پھر بال بال بچ گئی، یہ کرّے اپنی رفتار میں بسا اوقات گرنے کے قریب پہنچے کہ پھر سنبھل گئے، مگر فساد و صلاح کا یہ نظام اسی وقت تک چل رہا ہے جب تک ان متضاد قویٰ اور کائنات کے استعدادات میں اعتدال قائم ہے، جس دن اعتدال فنا ہوگا، نظامِ ارضی کا پورا کارخانہ بھی درہم برہم ہو جائے گا، اس وقت زمین اپنی عمر کی پوری تاریخ اور کارناموں کے ساتھ اپنے خالق کے سامنے کھڑی ہوگی اور اپنے اوپر کی ہر کوتاہی و قصور کی شہادت اپنی زبان سے دے گی:

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا. وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا. وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا. يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا. بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا. يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ. فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ. وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ. (زلزال:۹۹:۱-۸)	جس وقت پوری زمین ہلائی جائے گی اور جب وہ اپنے اندر کے بوجھوں کو اگل دے گی اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے، اس دن وہ اپنی باتیں بیان کرے گی کہ اس کے پروردگار نے اس کو حکم دیا ہے اس دن لوگ لوٹیں گے کہ اپنے عمل دیکھیں تو جس کسی نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہے وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔

صورِ قیامت: قرآن میں قیامت کے ذکر میں صور پھونکنے کا بار بار ذکر ہے، فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ (الحاقہ ۶۹:۱۳۔ قٓ ۵۰:۲۰) پھر جب صور پھونکا جائے گا، صور کے لفظی معنی نرسنگھا کے ہیں، اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں بابلیوں، کنعانیوں، آرامیوں اور عبرانیوں وغیرہ تمام پرانی قوموں میں بادشاہی جلال و جلوس اور اعلانِ جنگ کے موقعوں پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا، اس لئے نرسنگھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کا اظہار یا غیر معمولی خطرہ کا اعلان ہے، چنانچہ توراۃ میں یہ محاورہ بہ کثرت استعمال کیا گیا ہے، قرآن میں ہے کہ اس دن ندا ہوگی لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ، آج کس کی بادشاہی ہے پھر اللہ تعالیٰ خود ہی جواب دے گا۔ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (مومن ۴۰:۱۶) اس ایک سب پر آنے والے کی، غرض وہ دن آسمان و زمین اور نظمِ کائنات کے شہنشاہِ مطلق کے اظہارِ جلال اور شدید خطرۂ حساب کا اعلان ہوگا، اس لئے نفخِ صور اور نرسنگھا پھونکنے کا قدیم محاورہ اس کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ واقعتاً اس دن اپنی شہنشاہی کا نرسنگھا پھونکنے کا حکم دے اور اس کی تعمیل ہو جیسا کہ صور کے لفظی معنی دلالت کرتے ہیں۔

عربوں کا انکار: اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ قیامت اپنے اندر کتنی عظیم الشان حقیقت رکھتی ہے لیکن اہلِ عرب کو توحید کے بعد جس عقیدہ سے شدت کے ساتھ انکار تھا جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے تھے اور جو ان کی عقل میں کسی طرح نہیں سماتا تھا وہ یہی قیامت اور حشر ونشر کا مسئلہ ہے، جاہلی عرب حیات بعد الموت، خدا کے آگے اپنے اعمال کے مواخذہ اور پرسش اور سزا و جزا سے قطعاً لاعلم تھے، اسی لئے ان کو اعمال کے خیر وشر اور نیکی و بدی میں وہ تمیز نہ تھی جس پر اخلاق ومعاملات کا تمام تر دارومدار ہے، عرب کا شاعر آنحضرت ﷺ کی اس تعلیم کو سن کر تعجب سے کہتا ہے کہ:

أموت ثم بعث ثم حشر　　حديث خرافة يا ام عمر

کیا موت ہے پھر جی اٹھنا ہے پھر اکٹھا ہونا ہے، اے ام عمر (شاعر کی بیوی کا نام) یہ سب خرافات باتیں ہیں۔

قریش کا ایک اور شاعر (۱) کہتا ہے۔

يحدثنا النبي بان سنحيي　　وكيف حياة اصداء و هام

یہ نبی ہم سے کہتا ہے کہ ہم پھر زندہ کئے جائیں گے حالاں کہ صدیٰ اور ہام ہو کر پھر زندگی کیسی۔

ان کا عقیدہ تھا کہ انسان مرکر پرندہ ہوجاتا ہے اور آواز دیتا پھرتا ہے، اسی کا نام ان کے ہاں صدیٰ اور ہام تھا۔

قرآن مجید میں بھی ان کے یہ اقوال بکثرت نقل کئے گئے ہیں، مثلاً:

ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌ ۢ بَعِيْدٌ. (ق ۵۰:۳)	کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہوجائیں گے یہ لوٹنا بہت دور ہے۔
ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ. ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً. (نازعات ۷۹:۱۰،۱۱)	کیا ہم دوبارہ الٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے کیا جب ہم سڑی ہوئی ہڈی ہوجائیں گے۔
ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا. (اسرائیل ۱۷:۴۹)	کیا جب ہم ہڈی اور چورا ہوجائیں گے تو ہم نئے بنا کر پھر اٹھائے جانے والے ہیں۔
مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ. (یٰس ۳۶:۷۸)	ان سڑی گلی ہڈیوں کو کون جلائے گا۔

ان میں بعضوں کا عقیدہ دہریوں کی طرح تھا کہ یہ دنیا اسی طرح قائم رہے گی، موت وحیات

(۱) صحیح بخاری هجرة النبی و اصحابه الی المدینة، ج ۱ ص ۵۵۸۔

کا بھی سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہے گا اور اس دنیاوی زندگی کے علاوہ کوئی دوسری زندگی نہیں ہے:

وَقَالُوْا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ إِلَّا الدَّهْرُ (جاثیہ ۴۵: ۲۴)	انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے دوسری نہیں، مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو مارتا ہے۔
وَقَالُوْا إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ. (انعام ۶: ۲۹)	اور انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔

انہیں اپنے اعمال کے حساب ومواخذہ کا بھی یقین نہ تھا:

إِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا. (نبا ۷۸: ۲۷)	وہ حساب کی امید نہیں رکھتے تھے۔

حباب بن الارت ؓ نہایت قدیم مسلمانوں میں ہیں، یہ لوہاری کا پیشہ کرتے تھے ان کے کچھ دام قریش کے ایک رئیس عاص بن وائل پر واجب الادا تھے، وہ جب جا کر تقاضا کرتے تو عاص کہتا جب تک تم محمد کا انکار نہ کرو گے میں تم کو کچھ نہ دوں گا، انہوں نے کہا ''یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں'' اس نے کہا ''کیا مر کر مجھے پھر جینا بھی ہے'' انہوں نے کہا ''بے شک'' اس نے مذاق سے کہا ''تو اچھا پھر وہیں میرا مال ودولت اور سروسامان ہوگا، وہیں تم دام بھی لے لینا'' (۱) اس سے اندازہ ہوگا کہ اس بارہ میں اہلِ عرب کا کفر کتنا شدید تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کے سامنے توحید کے بعد جس عقیدہ کو سب سے زیادہ زور کے ساتھ پیش کیا وہ یہی تھا، قرآن مجید کی مکی سورتوں میں سب سے زیادہ اسی مضمون کو مختلف تعبیروں اور موثر طریقوں سے روزمرہ کے عینی مشاہدات اور دلائل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، ان میں ہیبتِ الٰہی، ہنگامۂ قیامت اور حشر ونشر کے رست خیز کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ سننے والا سرتاپا اثر ہوجائے، انسان کے عجز، عقل کے قصور، خدا کی عظمت وقدرت اور کائنات کی حیرت انگیز خلقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سامع ہر قدم پر لرزہ براندام ہوجاتا ہے، پھر ایک طرف حیاتِ ابدی، نعیمِ جنت اور بہشت کی مسرتوں کا اور دوسری طرف موت کی بے بسی، دنیا کی فنا، دوزخ کی دہشت اور عذابِ الٰہی کی تہدید کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچا ہے کہ نفسِ انسانی اپنے تاثر کو چھپانے پر قادر نہیں رہتا۔

وحیِ الٰہی نے قیامت اور بہشت ودوزخ کے حالات ومناظر کو سب سے پہلے جن اسباب

---

(۱) صحیح بخاری تفسیر کھیٰعص ج ۲ ص ۶۹۱، ۶۹۲۔

سے پیش کیا ہے ان سے اہلِ نظر صحابہ ناواقف نہ تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں پہلے ایک بڑی سورت نازل ہوئی جس میں جنت و دوزخ کا بیان ہے یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے تب حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو، بدکاری نہ کرو، تو لوگ نہ مانتے، یہ آیت کہ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَ اَمَرُّ (قمر ۵۴:۴۶) (بلکہ ان کے وعدہ کا وقت قیامت کی گھڑی ہے اور قیامت کی گھڑی نہایت مصیبت کی اور تلخ ہوگی) مکہ معظمہ میں اتری اور میں اس وقت کم سن بچی تھی، کھیلتی تھی، بقرہ اور نساء کی سورتیں (جن میں احکام ہیں) اس وقت اتریں جب میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ (۱)

اس تشریح سے ثابت ہوتا ہے کہ تعلیمِ محمدیؐ نے اس حقیقت کو ایمان کے اصول و اساس میں کیوں داخل کیا ہے اگر یہ تعلیم عقائد میں داخل نہ ہوتی تو دلوں میں اعمال کی جزا و سزا کی ہیبت اور عظمت نہ بیٹھتی اور نہ احکامِ الٰہی کی تعمیل کی طرف دلی رجحان اور میلان پیدا ہوتا، بلکہ یہودیوں کی طرح جن کے صحیفوں میں زیادہ تر دنیاوی ہی جزا و سزا کا ذکر باقی رہ گیا ہے دوسرے اہلِ ایمان کے دل بھی سخت اور تاثر سے خالی ہو جاتے، چنانچہ اس فلسفہ کو خود قرآن مجید نے بیان کیا ہے:

فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ	تو جو لوگ آخرت کا یقین نہیں کرتے ان کے دل نہیں
مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ. (نحل ۱۶:۲۲)	مانتے اور وہ غرور میں مبتلا ہیں۔

اسی لئے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ نماز کی ہر رکعت میں سور فاتحہ کی تلاوت کریں جس کا ایک ٹکڑا یہ بھی ہے مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ روز جزا کا مالک، اسلام چاہتا ہے کہ یہ حقیقت اس کے پیروؤں کے دلوں میں پوری طرح گھر کر لے۔

قیامت پر قرآنی دلائل: قرآن نے قیامت کی ضرورت پر تمام دوسری دلیلوں سے قطع نظر کر کے عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے، اول یہ کہ انسان بےکار اور بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا اگر اس کے اعمال کا مواخذہ اور جزا و سزا نہ ہو تو خیر و شر اور نیکی و بدی کا فطری امتیاز لغو اور انسانی زندگی تمام تر بے مقصد، اس کے تمام کام بے نتیجہ ہو جائیں:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ	(اے لوگو!) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بےکار پیدا کیا

۱؎ صحیح بخاری جلد دوم ص ۷۴۷، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن۔

اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ. (مومنون ۲۳:۱۱۵) اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے۔

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی. کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بے کار چھوڑ دیا جائے گا۔
(قیامہ ۷۵:۳۶)

دوسری بات جو اس روزِ جزا کی ضرورت کے ثبوت میں قرآن نے پیش کی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا عادل اور منصف ہونا ہے، اگر اچھے اور برے انسانوں کے اعمال کی جزاوسزا نہ ہو تو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے، اور نیکی وبدی اور گناہ وثواب کے کوئی معنی نہ رہیں، بلکہ نعوذ باللہ خدا ظالم اور غیر منصف قرار پائے، اس موجودہ مادی دنیا میں بھی انسانوں کو اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ جزا ملتی ہے، تاہم یہ صاف نظر آتا ہے کہ بہت سے گنہ گار، سیہ کار اور ظالم یہاں آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بہت سے نیکوکار، پرہیز گار اور اچھے لوگ مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلتے ہیں، اس لئے یقیناً یہ موجودہ زندگی اعمال کی جزاوسزا کی اصلی جگہ نہیں ہوسکتی، اس بنا پر دوسری زندگی کا ماننا ضروری ہے، جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا نتیجہ مل سکے، اس موجودہ دنیا میں دنیاوی حکام اپنے ناقص علم کے مطابق اچھوں اور بروں کو ان کے اعمال کی جزاوسزا دیتے رہتے ہیں پھر کتنا ضروری ہے کہ پوری دنیا کا عالم الغیب حاکم اپنے صحیح علم کے مطابق لوگوں کو جزاوسزا دے کر اپنے عدل وانصاف کا ثبوت دے، سورۂ والتین میں اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے:

اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ. فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعۡدُ بِالدِّیۡنِ. اَلَیۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ.
(والتین ۹۵:۶-۸)

لیکن جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے ان کے لئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے پھر اس کے بعد تجھ کو کیا چیز جزا پر یقین لانے نہیں دیتی، کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں۔ (تمام فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا نہیں)۔

اسی لئے قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ نیک وبد کا نتیجۂ عمل یکساں نہیں ہوسکتا، ایک جگہ خدا فرماتا ہے:

اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالۡمُفۡسِدِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ اَمۡ

کیا ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کی طرح کردیں جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا پرہیزگاروں کو

نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ. (ص ۳۸:۲۸)	بدکاروں کی طرح کردیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ط سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ. (جاثیہ ۴۵:۲۱)	کیا انہوں نے جنہوں نے گناہ کمائے یہ خیال کیا ہے کہ ہم ان کو ان کی طرح کردیں گے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے، ان دونوں کی زندگی اور موت برابر ہوگی؟ ان کا یہ خیال برا ہے۔

لوگوں کو روز جزا اور قیامت پر یقین کرنے سے جو وہم مانع تھا وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جیتا نہیں، تو قیامت کے دن کیوں کر جلائے جائیں گے، یہ حقیقت میں استبعادی شبہہ ہے، یعنی چوں کہ مرکر دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا اس لئے اس کو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے، ورنہ اس کے ان ہونی اور محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے، وحیِ محمدی ﷺ نے اس گتھی کو اس طرح سلجھایا کہ کفار کے استبعاد کے وہم کو حسب ذیل مختلف طریقوں سے دور کردیا۔

۱۔ مرکر جینے کے بعد تاریخی مثالیں پیش کیں جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت عزیرؑ اور اصحابِ کہف کے قصوں میں مذکور ہیں اور ان سے استدلال کیا کہ جب چند آدمی یا پرند مرکر جی سکتے ہیں تو پوری دنیا بھی مرکر جی سکتی ہے۔

۲۔ جس طرح زمین گرمیوں میں خشک اور بے حیات ہوجاتی ہے اور پھر دفعتاً بارش کے ایک چھینٹے سے اس میں زندگی پیدا ہوجاتی ہے، سبزہ نکل آتا ہے، کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں، اسی طرح قدرتِ الٰہی کی ایک بارش زمین سے انسانی دفینوں کو اگلوادے گی وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (اور زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو باہر نکال دے گی) اور دوبارہ نئی زندگی پیدا کردے گی۔

۳۔ دوبارہ زندگی پر تعجب اور استبعاد اس لئے ہے کہ خدا کے دائرۂ قدرت کی پوری وسعت ہماری سمجھ میں نہیں آئی جس نے آسمان بنائے، زمین بنائی، آسمان سے پانی برسایا، مردہ زمین سے زندہ کھیتیاں، سبزہ اور درخت اگائے اور پانی کے ایک قطرہ سے انسان بنایا کیا وہ ان کی فنا کے بعد دوبارہ ان کی ایجاد پر قادر نہیں؟

۴۔ حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا، خدا نے اس کو ہست و موجود کیا، پھر رفتہ

رفتہ اس کو معدوم کر دیا تو جس نے پہلے بغیر کسی سابق مثال کے اس کارخانہ کو پیدا کیا وہ کیا دوبارہ اس کو پیدا نہیں کر سکتا، جس نے نقش اول بنایا کیا نقش ثانی کھینچنے پر اس کو قدرت نہیں؟

۵۔ دنیا میں باری باری بہت سی قومیں وجود میں آئیں اور قوانینِ الٰہی کے مطابق انہوں نے جسمانی زور و طاقت، مالی وسعت، اجتماعی اور تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی، بڑی بڑی عمارتیں بنائیں، عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی، قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومت و سلطنت قائم کی پھر جب انہوں نے غرور و نخوت، ظلم و ستم اور دوسرے قوانینِ الٰہی کی جو قوموں کی ہستی اور عظمت کی بقا کے لئے ضروری ہیں، مخالفت کی تو وہ فنا کر دی گئیں اور ان کا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا، عربوں سے سوال کیا کہ تمہارے عاد و ثمود جو کبھی بنو سام کے ممالک عراق و شام و مصر و عرب پر چھائے ہوئے تھے کیا ہوئے؟ سبا اور تبع کی عظیم الشان حکومتیں کیا ہوئیں؟ فرعون اور اس کی سلطنت کا کیا حال ہوا؟ قومِ لوط اور قومِ مدین کو زمین کیوں کر نگل گئی؟

اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِی الْاَرْضِ (مومن ۴۰:۲۱)	کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان سے پہلوں کا کیسا انجام ہوا جو ان سے قوت اور زمین میں یادگاروں کے لحاظ سے کہیں بڑھ کر تھے۔
اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ وَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ (ابراھیم ۱۴:۹)	کیا نوح کی قوم اور عاد و ثمود کی اور جو ان کے بعد آئے جن کو خدا ہی جانتا ہے، ان کی خبر تم کو معلوم نہیں ہوئی۔

یہ تو وہ قومیں ہیں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے ان کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں کتنی قوموں کے عروج و فنا کی داستانیں محفوظ ہیں، بابلی، اسیری، اکادی اور مصری قومیں جو کبھی روئے زمین پر کوس لمن الملک بجاتی تھیں، ہزار ہا سال سے بے نشان ہیں، نارمن جیسے فاتح کیا ہوئے، یونانی اور روم جو کبھی دنیا کے تنہا مالک بن گئے تھے اب ان کا کہیں وجود ہے؟ مجوس جو روم کے مقابل صدیوں تک برسرپیکار رہے اب ان کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں، امریکہ کے قدیم باشندے جو کبھی اس برِ اعظم کے واحد مالک تھے اب فنا کے قریب ہیں۔

الغرض جس طرح افراد جی کر مر جاتے ہیں جماعتیں وجود میں آ کر مٹ جاتی ہیں، قومیں پیدا ہو کر فنا ہو جاتی ہیں اسی طرح پوری دنیائے مخلوقات بھی ایک دن آئے گا جب قانونِ الٰہی کے مطابق معدوم ہو جائے گی۔

جس طرح عوام جو قوموں کی تاریخ سے واقف نہیں، صرف افراد کو جیتے اور مرتے دیکھتے ہیں، وہ گو افراد کی فنا کا یقین رکھتے ہیں لیکن قوموں کی فنا کے مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے اور اس میں شک کرتے ہیں، اسی طرح جن کی نظر دنیائے خلق کی تاریخ پر نہیں، وہ اس کے فنائے کامل پر اپنی جہالت اور نادانی سے اعتبار نہیں کرتے، حالاں کہ ایک وہ دن آئے گا جب پوری دنیا اپنے وجود کی صلاحیت سے معرا ہو کر فنا ہو جائیگی، کائنات کا یہ نظام بدل جائے گا، اس موجودہ عالم کا قانونِ طبعی ایک دوسرے قانونِ طبعی سے منسوخ ہو جائے گا اور جیسا کہ سائنس کہتا ہے اور قرآن نے نقشہ کھینچا ہے، آفتاب و ماہتاب، ستارے اور تمام اجرامِ فلکی ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے اور پوری دنیا کی عدالت قائم ہو کر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ. (ابراہیم ۱۴:۴۸)	جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی اور مخلوق اکیلے زبردست خدا کے سامنے نکل کھڑی ہوگی۔

سورہ ق میں قیامت پر استدلال ان ہی دلیلوں سے کیا گیا ہے:

قٓ. وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ. بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ. ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ. قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ. بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ. اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَ زَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ. وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا	قسم ہے اس بڑی شان والے قرآن کی (جو مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے ان کافروں کو عقلی انکار نہیں ہے) بلکہ ان کو اس پر تعجب ہے کہ ان میں ایک آدمی آ کر ان کو (قیامت کا) ڈرسناتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ تعجب کی بات ہے، کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو پھر زندہ ہوں گے) یہ دوبارہ لوٹنا تو دور از عقل ہے، (خدا کہتا ہے یہ تعجب کی کیا بات ہے) ہم کو معلوم ہے کہ زمین ان (مردہ جسموں) میں جو کمی کرتی ہے اور ہمارے پاس محفوظ

وَالْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَاَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ. تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ. وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الْحَصِيْدِ. وَ النَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ. رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ. كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوْدُ. وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ. وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ. اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ. (ق ۵۰:۱-۱۵)

کتاب ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ ان کافروں نے سچائی جھٹلا دی جب وہ ان کے پاس آئی، پس وہ الجھی باتوں میں پڑ گئے کیا انہوں نے اپنے اوپر کے آسمانوں کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا بنایا اور کس طرح اس کو سجایا ہے کہ اس میں کہیں سوراخ نہیں اور زمین کو پھیلایا ہے اور اس میں پہاڑ کے لنگر ڈالے اور اس میں قسم قسم کی رونق کی چیزیں اگائیں کہ ہر رجوع ہونے والے بندہ کو اس سے سوجھ ہو اور یاد آئے اور آسمان سے برکت کا پانی برسایا، پھر اس سے باغ اور کٹنے کھیت کے اناج اگائے اور کھجوروں کے لمبے درخت جن کے خوشے اوپر تلے ہیں، یہ بندوں کو روزی پہنچانے کے لئے ہے اور اس پانی سے مردہ آبادی کو ہم زندہ کرتے ہیں، اسی طرح (قبروں سے) نکلنا ہوگا اور کافروں سے پہلے نوح کی قوم، رس والوں اور ثمود اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائیوں نے اور جنگل والوں نے اور تبع کی قوم نے اس کو جھٹلایا، ان میں سے ہر ایک نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو میری دھمکی پوری اتری کیا ہم پہلے پیدا کر کے تھک گئے جو دوبارہ نہیں پیدا کر سکتے، بات یہ ہے کہ ان کافروں کو از سر نو پیدائش میں شک ہے۔

سورہ قیامت میں بھی اس کا بیان ہے اس کی آخری آیتیں یہ ہیں:

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى. اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى. ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى. فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى. اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِۦَ

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یوں ہی بے کار چھوڑ دیا جائے گا، کیا وہ پانی کی ایک ٹپکی ہوئی بوند نہ تھا، پھر وہ بندھا ہوا خون ہوا، پھر خدا نے اس کو بنایا اور اس کو ٹھیک کیا، پھر اس کو جوڑا کیا یعنی نر و مادہ کیا، کیا وہ خدا اس پر قادر نہیں کہ

الْمَوْتٰی. (قیامۃ ۷۵: ۳۶-۴۰)

مردوں کو دوبارہ جلائے۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ○ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ (بنی اسرائیل ۱۷: ۹۸، ۹۹)

اور وہ بولے کہ جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو پھر نئے بنا کر اٹھائے جائیں گے کیا یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں کو اور زمین کو بنایا وہ ان لوگوں کے مثل کو (دوبارہ بھی) بنا سکتا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَهُوَ الَّذِیْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ (روم ۳۰: ۲۷)

اور خدا وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کو دوبارہ خلق کرے گا اور یہ (دوبارہ خلق کرنا) اس کے لئے آسان ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ (حج ۲۲: ۵)

(لوگو!) اگر تم کو دوبارہ زندگی میں شک ہے تو ہم تو (پہلے) تم کو (اسی مردہ) مٹی سے پیدا کر چکے ہیں (پھر دوبارہ کیوں نہیں پیدا کر سکتے۔)

قیامت کے متعلق تمام دور دراز اور طول طویل شکوک وشبہات کا کتنا مختصر جواب ہے:

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِيْمٌ. قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ.

(یٰسٓ ۳۶: ۷۸، ۷۹)

وہ بولا کون ان سڑی کھوکھلی ہڈیوں کو جلائے گا کہہ دے وہی جس نے پہلی دفعہ ان کو بنایا۔

غرض وحی محمدی ﷺ نے ہر پہلو سے کفار کے اس استعجاب اور استبعاد کو دور کیا اور ان کو دوبارہ زندگی کا یقین دلایا۔

حشر جسمانی: اس بحث پر لوگوں نے قیامت برپا کر رکھی ہے کہ یہ دوبارہ زندگی اسی گوشت و پوست کے ساتھ ہوگی یا صرف روحانی ہوگی، جہاں جسم و جسمانیت کا مطلق گذر نہ ہوگا؟ گو قرآن پاک کی مختلف آیتیں مختلف پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں جن میں اشارتاً ہر قسم کی باتیں آجاتی ہیں، تاہم قیامت کے متعلق اوپر کی آیتوں میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو، کفار کو تعجب ہے کہ کیا ہمارا یہ جسم مر کر پھر جئے گا، کیا ہماری ان سڑی گلی ہڈیوں میں دوبارہ جان پڑے گی اور ہم قبروں سے نکل کر پھر اٹھ کھڑے ہوں گے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی زندگی کے علاوہ زندگی کا کوئی دوسرا مفہوم ان

کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا مگر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم تعجب نہ کرو اور انکار پر آمادہ نہ ہو کہ تمہارے یہ فنا شدہ جسم نہیں اٹھائے جائیں گے اور نہ تمہاری ان بوسیدہ ہڈیوں میں روح پھونکی جائے گی بلکہ وہ تو سراسر روحانی زندگی ہوگی کیوں کہ جب دوبارہ جسمانی زندگی کا تخیل ان کے لئے ناقابل فہم تھا تو خالص روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی ان کے فہم سے بالاتر تھا اور اب بھی ہے کہ ہم اس مادی دنیا کے جاننے والے سرتاپا روحانی زندگی کے تصور سے بالکل عاجز ہیں اس لئے مصلحتِ الٰہی اسی کی مقتضی تھی کہ وہ اصل واقعہ پر زور دے، کیسے اور کیوں سے تعرض نہ کرے اور صاحبِ فہم کو اس کے فہم کے مطابق اس راز کو سمجھنے دے، چنانچہ قرآن پاک کے اس اسلوبِ بیان کو اگر سمجھنا ہے تو ان آیتوں پر غور کرنا چاہیے:

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ۔ بَلْ ھُمْ بِلِقَآئِ رَبِّھِمْ کٰفِرُوْنَ۔ (سجدہ ۳۲:۱۰)	اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم زمین میں کھو جائیں گے کیا ہم نئی پیدائش میں پھر ہوں گے (خدا فرماتا ہے یہ کچھ نہیں بلکہ) یہ اپنے پروردگار کی ملاقات کے منکر ہیں۔

غور کرو کہ ان کی مادی معدومیت کے بعد مادی پیدائش کے پر تعجب انکار پر اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ یہ شکوک وشبہات اس لئے ان کو پیش آتے ہیں کہ مرنے کے بعد خدا کی ملاقات اور اس کے سامنے ہونے سے ان کو انکار ہے اور حواشی کو چھوڑ کر اصل مقصود یہی ہے کہ موت کے بعد اور آخرت میں خدا کے سامنے ہونے پر یقین رکھا جائے اس سے ان کو کیا مطلب کہ وہ کس طرح ہوگا؟ چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا:

قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمْ تُرْجَعُوْنَ۔ (سجدہ ۳۲:۱۱)	جواب میں کہہ دے کہ ملک الموت جو تم پر متعین ہے وہ تم کو موت دے گا پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے۔

یہی ملاقات اور رجوع الی اللہ اس عقیدۂ حشر کی اصلی روح ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم ان ہی باتوں کو سمجھ بوجھ سکتے ہیں جن کی مثالیں اور نظیریں اس مادی دنیا میں ہماری نگاہوں سے گذرتی رہتی ہیں اور وہ عالم جو نگاہوں سے مستور بلکہ تصور سے بھی دور ہے اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال اور تکرارِ سوال سے ہم بے نیاز ہو جائیں، تقریباً ناممکن ہے، ان کے متعلق جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس دیدہ شہرستانِ وجود یعنی دنیا کے قیاس پر اس نادیدہ شہرستانِ بقا

یعنی آخرت کا ہر نقشہ اور خاکہ بتایا اور سمجھایا جائے اور یہی محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے کیا ہے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی قدرت پر یقین رکھتے ہیں ان سے تو کچھ کہنا ہی نہیں لیکن جو شخص جسمانی حشر کا تصور اس لئے محال سمجھتا ہے کہ عام انسانوں نے کسی مردہ جسم کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا، تو اس کے نزدیک تنہا روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی زیادہ محال ہونا چاہیے، کیوں کہ کسی انسان نے اب تک کسی انسان کو روحانی وجود میں نہیں دیکھا ہے، بلکہ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکا ہے، وہ جب انسانی زندگی کا تصور کرے گا تو جسم و شکل و اعضا کے ساتھ ہی کرے گا، ان سے مجرد ہو کر نہیں کرے گا۔

موت جسم سے روح کی مفارقت کا نام ہے اس لئے اگر یہ سچ ہے کہ قیامت میں نئی زندگی ملے گی تو ظاہر ہے کہ موت کے بعد کی کیفیت اور صورت سے کوئی الگ صورت اور کیفیت ہوگی جس کا نام حیاتِ ثانیہ رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ روح کا دوبارہ تعلق جسم کے ساتھ تسلیم کیا جائے ورنہ غیر جسمانی زندگی تو قیامت کے پہلے بھی تھی اب نئی بات کیا بڑھ گئی جس کا نام حیاتِ ثانیہ رکھ دیا گیا۔

گو روحِ انسانی جسم کے اندر ہر فعل کی فاعل ہے مگر فاعل کے فاعل بننے کے لئے آلات اور اوزار کی بھی ضرورت ہوتی ہے جن کے بغیر وہ اپنے فعل کے بجالانے سے مجبور رہتا ہے، اسی طرح روح اپنے فعلِ لذت والم کے انجام دینے کے لئے جسمانی آلات اور اوزار کی محتاج ہے کہ لذت و الم کا کوئی روحانی احساس جسمانیت کے شائبہ سے مبرا ہو کر ہو ہی نہیں سکتا، اس بنا پر روحِ محض کا جنت کی لذتوں سے متمتع یا دوزخ کی تکلیفوں سے متالم ہونا کسی جسمانی وساطت کے بغیر تصور میں نہیں آتا، خواب میں دیکھو کہ روح کو جو لذت یا تکلیف پہنچتی ہے اس میں بھی جسمانی پیکر و ہیکل کی صورت نمودار ہوتی ہے۔

جسم و جسد: حشرِ جسمانی ماننے کے بعد یہ بحث بے سود ہے کہ آیا وہی جسم دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا جس کے قالب میں وہ روح پہلے دنیا میں رہتی تھی یا کسی دوسرے نئے جسمانی پیکر و ہیکل کی روح پھونکی جائے گی، یا یہ کہ آئندہ جسم اپنی مادیت اور ترکیب میں اسی دنیاوی جسم کے مماثل ہوگا، جب کہ یہ حقیقت ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اعمال کی ذمہ داری روح پر ہے جسم پر نہیں اور اسی طرح جزاو سزا کی راحت و تکلیف کا اصلی مورد روح ہے، جسم نہیں، تو پھر اب وہ کسی قالب میں بھی ہو

اور کسی رنگ میں بھی ہو، روح پر مواخذہ اور ثواب وعذاب کی لذت والم کا احساس یکساں ہوگا، البتہ یہ ضروری ہے کہ جو جسم ہم کو دوسری دنیا میں ملے گا، اس کی خصوصیات ولوازم اس خاکی جسم کے خصوصیات ولوازم سے بالکل الگ ہوں گے، چنانچہ خود ہمارے تخیل اور تصور اور نیز خواب ورویا میں جو جسم ہم کو نظر آتا ہے وہ جسم ہو کر نظر آنے کے باوجود مادی جسمانیت سے سراسر پاک ہوتا ہے اس لئے لفظ جسم کے بولنے سے ان ہی خصوصیات کا جسم سمجھ لینا ضروری نہیں ہے اور نہ اس جسم پر قیاس کر کے اس جسم پر اشکالات وارد کئے جاسکتے ہیں۔

خلقِ جدید: چنانچہ جو جسم قیامت میں عنایت ہوگا وہ نئی خلقت اور نئی آفرینش کا ممنون ہوگا، اسی لئے قرآن نے منکروں کے جواب میں یہ کہا ہے کہ:

بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ. (ق ۵۰:۱۵) — بلکہ یہ لوگ نئی آفرینش سے شک میں ہے۔

منکرین کی زبان سے کہلوایا:

ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا. (اسراء ۱۷:۴۹) — کیا ہم درحقیقت نئی آفرینش کر کے اٹھائے جائیں گے۔

ایک دوسری سورہ میں یہ تلقین ہے:

اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ. (سبا ۳۴:۷) — بے شک تم ایک نئی آفرینش میں ہونے والے ہو۔

پھر تمثیل دے کر فرمایا:

كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (انبیاء ۲۱:۱۰۴) — جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کا آغاز کیا اسی طرح ہم اس کو دوبارہ بنائیں گے۔

اسی لئے اس عالم کی اس نئی خلقت و پیدائش والے جسم کو بعینہ اسی جسم کے مطابق سمجھنا صحیح نہیں ہے، اور نہ اس خاکی جسم کے تمام خصوصیات کا بعینہ اس جسم میں ہونا ضروری ہے اس کو اگر اس عالم کے لفظِ جسم سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس لئے کہ ہماری زبان میں روح کے غلاف وقالب کے لئے جسم سے بہتر، قریب تر اور مشابہ تر کوئی دوسرا لفظ نہیں۔

یہ بات کہ حشر میں بعینہٖ گذشتہ گوشت و پوست کا ہونا اس لئے ضروری سمجھا جائے کہ وہ بھی عذاب وثواب میں شریک ہوں، تصریحِ قرآنی پر اضافہ ہے، قرآن میں تو یہ تصریح ہے کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ — بے شبہ جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہوئے ہم ان کو آگ

نَارًا کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَیْرَھَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ○ (نساء۴:۵۶)

میں ڈالیں گے جب جب ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کو اور کھالیں دیں گے جو پہلی کھالوں کی غیر ہوں گی تاکہ وہ عذاب چکھیں بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

جب کھالیں یکے بعد دیگرے بدلتی جائیں گی تو پہلا حصۂ جسم جو گناہ میں شریک تھا کہاں باقی رہا؟ اسی طرح یہ تصریح ہے کہ انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھالیں اس کے اعمال پر شہادت دیں گی، اس سے معلوم ہوا کہ وہ اصلی مجرم جو ان اعمال کا ذمہ دار اور اس مقدمہ کا مدعا علیہ ہے ان جسمانی اعضا کے علاوہ ہے اور وہ روحِ انسانی ہے۔

ذمہ داری روح پر ہے: یہی سبب ہے کہ موت و حیات، عذاب و ثواب اور اعمال کے مواخذہ کا اسلام نے جس سے تعلق بتایا ہے وہ نفس یعنی روح ہے:

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْبِ اللّٰہِ (زمر۳۹:۵۶)

تو (قیامت میں) کوئی نفس یہ کہنے لگے کہ اے افسوس اس پر کہ میں نے اللہ کے پہلو میں کمی کی۔

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (حشر۵۹:۱۸)

اور چاہئے کہ ہر نفس دیکھے کہ اس نے کل (قیامت) کے لئے کیا آگے بھیجا۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ. (تکویر۸۱:۱۴)

(اس دن) ہر نفس جان لے گا جو اس نے حاضر کیا

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ (انفطار۸۲:۵)

(اس دن) ہر نفس جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا۔

فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا (انبیاء۲۱:۴۷)

(تو اس دن) کسی نفس پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

جنت کی نسبت ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَھُمْ مِّنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ (سجدہ۳۲:۱۷)

کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے لئے (جنت میں) کیا آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔

ان آیتوں میں دیکھو کہ عمل کی ذمہ داری اور اس کے اچھے اور برے نتیجوں کا بار جسم پر نہیں بلکہ روح اور نفس پر ڈالا گیا ہے اور اسی کی تکلیف ولذت سے آشنا کیا گیا ہے، جنت میں داخلہ کی خوش خبری بھی اسی کو دی گئی ہے:

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ . وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ . اے مطمئن روح! میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا۔ (فجر ۸۹: ۲۹، ۳۰)

دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے: غرض اعمال اور ان کے نتائج کی اصل ذمہ دار، جنت و دوزخ کی لذت والم کی اصل احساس کرنے والی ہستی صرف روح ہے اور جسم کی حیثیت صرف ایک لباس وآلۂ احساس کی ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں، یہ جسم لاکھ بار بدلے مگر روح اگر وہی ہے تو وہ انسان وہی ہے اور اسی کو اپنی ذمہ داری کی جزا و سزا مل رہی ہے۔

لوگ اپنی ظاہر بینی سے اصل زور جسم پر دیتے ہیں حالاں کہ اس مٹی کے ڈھیر میں اگر روح کا خزانہ چھپا نہ ہو تو پھر اس مشتِ خاک میں دھرا کیا ہے، دیکھو انسان بچپن سے لے کر بوڑھاپے تک وہی ایک شخص ہے جو پہلے تھا حالاں کہ اس کی جسمانی ہیئت اور اس کا جسم کا مادہ ہر آن اور ہر لمحہ فنا ہو کر بدلتا ہے، بیماریوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا، پھر تندرستی کے بعد نئے ذرات داخل ہو کر لہلہائے، تم غلطی سے یہ سمجھتے ہو کہ ہر حال میں وہی جسم یکساں طور پر قائم ہے حالاں کہ حکیم سے پوچھو تو وہ بتائے گا کہ اس کے ذرے کیوں کر ہر آن جھڑتے اور گھستے رہے اور جو خوراک وہ کھاتا رہا وہ خون ہو کر کیوں کر بدل ما یتحلل بنی اور ان کی جگہ لیتی رہی، پھر کیا ایسے ہر آن فنا ہوتے رہنے والے اور چند سال کے بعد بالکل بدل جانے والے کو دائم الوجود اعمال کا ذمہ دار اور ان کے نیک و بد کی اصلی جزا یا سزا پانے کا مستحق ٹھہرایا جا سکتا ہے، لیکن جس طرح دنیا میں اگر کوئی مجرم آج بھاگ گیا اور چند سال کے بعد پکڑ کر جب لایا گیا تو وہ یہ عذر نہیں کر سکتا کہ چوں کہ وہ ہاتھ جس سے اس نے چوری کی تھی اور وہ پاؤں جن سے وہ مال لے کر بھاگا تھا اس عرصۂ دراز میں بدل گئے ہیں اس لئے وہ لائق تعزیر نہیں کیوں کہ وہ روح جس نے اپنے ارادہ و نیت سے اس کام کو اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے ذریعہ کرایا تھا جس طرح کل تھی بعینہٖ آج بھی ہے اور جو تکلیف اس کو اپنے پہلے جسم کے ذریعہ کل پہنچ سکتی تھی بعینہٖ آج بھی پہنچ سکتی ہے اور اس جسمانی تغیر سے اس کی روحانی شخصیت میں اصلاً کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، اس لئے پہلے ہی جسم کے ضروری ہونے پر زور دینا بے سود ہے، اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ جسم اگر بدل بھی جائے تو اعضا کی شہادت کا مسئلہ بھی اپنی جگہ پر صحیح ہوگا، جسم کے اعضا دنیا میں بدلتے جاتے ہیں مگر جو بیماری اگلے اجزا میں پیدا ہوگئی تھی وہ ان کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے، مٹ نہیں جاتی،

بلکہ وہی ان کے بعد آنے والے اجزا میں برابر سرایت کرتی رہتی ہے۔

اخروی جسم کیسا ہوگا: روحوں کو آخرت میں جو جسم ملیں گے وہ حقیقت میں ان کے اعمال ہی کے ظل وعکس ہوں گے، یعنی جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی ان کو جسم عنایت ہوں گے، چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا مگر، اس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گورا پن اعمال کی سیاہی وسپیدی کی صورت میں بدل جائے گا، خدا نے فرمایا:

وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ. ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ. وَوُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ. تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ.	کتنے چہرے اس دن روشن، ہنستے اور شاد ہوں گے اور کتنے چہروں پر اس دن کدورت ہوگی اور ان پر سیاہی چھائی ہوگی۔

(عبس ۸۰: ۳۸-۴۱)

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ. وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ.	جس دن کتنے چہرے سپید ہوں گے اور کتنے کالے، لیکن جن کے چہرے کالے ہوئے، کیا تم وہ ہو جو ایمان کے بعد پھر کافر ہو گئے تھے تو اپنے کفر کرنے کے بدلہ عذاب کا مزہ چکھو اور جن کے چہرے سپید ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اسی میں سدا رہیں گے۔

(آل عمران ۳: ۱۰۶، ۱۰۷)

صحیح حدیثوں میں ہے کہ جنت میں سب لوگ جوان بن کر داخل ہوں گے اور جسم پر کبھی بڑھاپا نہیں آئے گا، ان کا قد حضرت آدمؑ کے اولین بہشتی قد کے مطابق ہوگا (۱)، دوزخیوں میں سے کسی کا سر پہاڑ کے برابر ہوگا، کسی کا ایک پہلو مفلوج ہوگا، کسی کے ہونٹ لٹکے ہوں گے، دل کے اندھے، آنکھوں کے اندھے بن کر اٹھیں گے، سزاؤں کے بعد جب ان کے جسم چور چور ہو جائیں گے تو پھر صحیح وسالم نئے جسم نمودار ہوں گے اور پھر ان کی وہی کیفیت ہوگی، یہ بھی آیا ہے کہ جو اپنے کو بڑا سمجھے ہیں، وہ چیونٹی بن کر قیامت میں اٹھیں گے، ان تمام شواہد سے ہویدا ہے کہ اس دنیا کے جسمانی قالب ہمارے اس دنیاوی جسم کے مطابق نہیں بلکہ ہمارے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوں گے۔

(۱) جامع ترمذی ابواب صفة الجنة باب ما جاء فی صفة ثیاب اهل الجنة ص ۴۱۷ وباب ما جاء فی سن اهل الجنة ص ۴۱۸ ومسند احمد ج ۲ ص ۲۹۵۔۳۴۳، ۴۱۵ وج ۵ ص ۲۳۰ و ۲۴۳ ومسند دارمی کتاب الرقاق باب فی اهل الجنة ونعیمها ص ۳۸۱، ۳۸۲۔

جزا اور سزا

یوم آخر یا یوم دین پر ایمان لانے سے اسلام کا حقیقی منشا یہ ہے کہ لوگ اس کا یقین کریں کہ ان کے ہر عمل کا بدلہ ہے کچھ اس دنیا میں اور پورا دوسری دنیا میں، اسی کا نام جزا و سزا ہے، دنیا کے دوسرے مذاہب بھی اسلام کے ہم نوا ہیں۔

جزا و سزا دیگر مذاہب میں: درحقیقت مذاہب کا حقیقی تعلق اسی عقیدہ سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور اچھا یا برا جیسا کام اس سے صادر ہوتا ہے، اس کے مطابق اچھا یا برا معاوضہ اس کو دوسری دنیا میں ضرور ملے گا، اس عقیدہ کا نشان مصر و بابل جیسی دنیا کی قدیم قوموں میں بھی ملتا ہے، ہندوستان کے مذاہب میں اس دوسری دنیا کو دوسرے جنم سے تعبیر کیا گیا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ انسان جب مرتا ہے تو اس کے اچھے یا برے کاموں کے مطابق اس کی روح کسی جانور یا گھاس پھوس یا درخت کے قالب میں جا کر اپنے عمل کا نتیجہ بھگتتی ہے، اور پھر انسانوں کے قالب میں لائی جاتی ہے اور کام کرتی ہے، اس کے بعد جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اس کو یم لوک میں جانا پڑتا ہے، جہاں نرک (دوزخ) ہیں، وہاں وہ ہر قسم کی سزا بھگتتی ہے بعد ازیں اپنے بعض اچھے کاموں کی بدولت چندر لوک (چاند کی دنیا) میں جاتی ہے، جس روح کے کچھ کام اب بھی باقی ہیں وہ اس دنیا میں ہوا، بادل اور بارش کے ذریعہ سے دوبارہ آتی ہے اور اپنے کام کے مطابق حیوانات یا نباتات کے روپ میں سزا پاتی ہے اور پھر چھوٹ کر انسان بنتی ہے، یہاں تک کہ اس کے کام اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل نہ رہ جائے، اس وقت وہ مادی قالبوں کی قید سے نجات پا کر سورج لوک اور چندر لوک وغیرہ اجسامِ سماوی کی دنیاؤں میں جا کر آرام کرتی ہے، اور پھر اپنے علم و عمل کی کسی کمی کے سبب سے بادل، ہوا، اناج یا کسی دوسری مخلوقات کے قالب میں ہو کر اس کو اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے اور وہی عمل شروع ہوتا ہے، یعنی وہ نئے نئے جنموں میں سزا بھگتتی ہے اور اس وقت تک آمد و رفت اور آواگون کے چکروں میں پھنستی رہتی ہے جب تک اس سے اچھے یا برے کاموں کا صدور ہوتا رہتا ہے، اس لئے کامل اور دائمی نجات کی صورت یہ ہے کہ انسان سے اچھا یا برا کوئی کام صادر ہی نہ ہو، یہی

ترکِ عمل روح کو مادہ کی قید سے آزاد کر کے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا (موکش) دلاتا ہے، یہاں تک کہ موجودہ مادی دنیا پرلے (قیامت) کے بعد جب پھر نئے سرے سے بنے گی تو پھر وہی عمل اور سزا یعنی آواگون کا چکر شروع ہوگا اور پھر اسی طرح ہمیشہ چھٹکارا پائے گی اور پھر دوسرے پرلے کے بعد نیا دور اسی طرح شروع ہوگا، یہ چکر اسی طرح ہمیشہ رہے گا۔

یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا، الا یہ کہ ہمالہ کی چوٹی یا غار میں بیٹھ کر ترکِ عمل کے ذریعہ سے خود اپنے وجود سے ہاتھ دھولیا جائے، لیکن اگر اس اصولِ نجات پر دنیا عمل کرے تو یہ بہارستان دم کے دم میں خارستان بن جائے، ہر قسم کا کاروبار بند ہو کر دنیا آپ سے آپ فنا کے قریب آجائے، بدی کے ساتھ نیکی کا وجود بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جائے اور باایں ہمہ دائمی وابدی نجات میسر نہ ہو، کیوں کہ ہر پرلے کے بعد وہی جنم اور کرم اور آواگون پھر شروع ہوتا ہے۔(۱)

لیکن دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس چکر اور بے عملی سے انسان کو نجات دلائی ہے، انہوں نے موجودہ دنیا کے بعد ایک ہی دنیا اور تسلیم کی ہے جس میں لوگوں کو اچھے اور برے اعمال کی پوری پوری جزا ملے گی، مختلف زردشتی فرقوں نے آریہ نسل ہونے کے باوجود ہندوؤں کے تناسخ کے بجائے مختلف سامی مذاہب کے خیالات کی نقالی کی ہے اور خصوصاً بعد والوں نے اسلام کے عقائد کو ''ارداای ویراف'' کے عجیب وغریب مشاہدات کا رنگ دے کر اور اس کی کتاب کو اسلام سے بھی پہلے کی قرار دے کر تمام تر قبول کر لیا ہے۔(۲)

صحیفۂ ابراہیم یعنی سفر تکوین میں دنیا کی محنت ومشقت اٹھانے کے بعد پھر جنت میں داخلہ کا اشارہ ہے (تکوین ۲:۱۹) علی ہذا حضرت موسیٰ کے صحیفوں میں اخروی جزا وسزا کے اصول مذکور ہیں، نیکوکاروں کے لئے ایک ستھری آبادی کا ذکر ہے جس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں، بدکاروں کے لئے ہلاکت، بربادی اور دردناک عذابوں کی خبر ہے مگر مترجموں نے ہر جگہ اس کو دنیاوی ثواب وعذاب بلکہ ارضِ موعودہ کی ظاہری سلطنت کے معنوں میں دکھایا ہے، حالاں کہ بعض مقامات میں یہ بے جوڑ سی بات ہو کر رہ گئی ہے، حضرت آدمؑ کی جنت عدن اور اس کے چار

(۱) تناسخ کے رد میں الندوہ مئی، جون ۱۹۰۶ء میں مولانا عبدالسلام ندوی کا ایک مضمون ہے۔ (۲) دبستان المذاہب کا مصنف جو زردشتی مذہب سے پوری واقفیت رکھتا تھا، اس نے اپنی کتاب میں اس کی پوری تفصیل درج کی ہے ص ۸۷ و مابعد بمبئی ۱۲۷۷ھ۔

دریاؤں کا ذکر تکوین کے دوسرے باب میں ہے (آیات ۸تا۱۴) علاوہ ازیں تورات میں موت کے بعد کی زندگی کی تصریح ملتی ہے، حضرت ابراہیم (پیدائش ۲۵: ۸) اور یعقوب علیہما السلام (پیدائش ۴۹: ۳۳) کی موت کی تعبیر ان لفظوں میں کی گئی ہے کہ جان بحق ہوا اور وہ اپنے لوگوں میں جاملا، ساتھ ہی ہمیشہ کی بھلائی (استثناء ۶۔۲۴) کا بھی تذکرہ ہے، اور جہنم کی آگ (استثناء ۳۲۔۲۲) کا بھی بیان ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دئے جانے کی بھی تصریح ہے (یرمیاہ ۱۷، ۱۱) روح کی بقا اور آسمان پر چڑھنے کی تعلیم بھی ان صحیفوں میں موجود ہے (واعظ ۳۔۲۱) مرنے کے بعد روح کے خدا کے پاس واپس پھر جانے کا بھی تذکرہ ہے، (واعظ ۱۲۔۷) اور انسان کے اپنے ابدی مکان میں جانے کی بھی تصریح ہے، آخر میں ہے خدا سے ڈر اور اس کے حکموں کو مان کہ انسان کا فرضِ کلی یہی ہے، کیوں کہ خدا ہر ایک فعل کو ہر ایک پوشیدہ چیز کے ساتھ خواہ بھلی ہو خواہ بری، عدالت میں لائے گا، (واعظ ۱۲، ۱۳، ۱۴) زبور میں خدا کی عدالت کے دن کی تصریحات بار بار ہیں، امثالِ سلیمانی میں ہے کہ انسان کی راہیں خداوند کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور وہ اس کی ساری روشوں کو جانچتا ہے، شریر کی بدکاریاں اس کو پکڑلیں گی اور وہ اپنے ہی گناہوں کی رسیوں سے جکڑ جائے گا، وہ بے تربیت پائے مرجائے گا اور اپنی جہالت کی شدت میں بھٹکتا پھرے گا، (۵: ۲۱تا۲۳) دانیال میں ہے کہ اس وقت بہتیرے جو زمین میں خاک پر سو رہے ہیں جاگ اٹھیں گے، بعضے حیاتِ ابدی کے لئے اور بعضے رسوائی اور ذلت کے لئے (۱۲۔۲) حزقیال (۲۸۔۱۳) میں جنت کی طلائی اور جواہرات کی بنی ہوئی عمارتوں کے اشارات ہیں۔

حضرت مسیحؑ سے پہلے یہودیوں میں صدوقی نام ایک فرقہ پیدا ہوا جس نے حکم راں یونانیوں کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ان کی بعض باتیں قبول کر کے یہودی تعلیم میں شامل کیں (۱) من جملہ ان کے وہ قیامت اور حیاتِ اخروی کا بھی منکر ہوا، مگر اس کے مقابل کا دوسرا فرقہ جس نے اپنے کو فریسی (علاحدہ رہنے والا) کہا، اپنے پرانے عقیدے پر قائم رہا اور قیامت، حیاتِ اخروی اور جنت و دوزخ کے عقائد کو بہ دستور مانتا رہا، حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں فریسی یہی اعتقاد رکھتے تھے کہ جنت مادی ہوگی اور وہاں بہشتیوں کو ان کی بیویاں واپس ملیں گی (مرقس ۱۲، ۲۴) یہودیوں کی پچھلی کتابوں میں جزا و سزا کی تفصیل موجود ہے، چنانچہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب کے یہودی اس

(۱) برٹش انسائیکلوپیڈیا، مضمون صدوقین، (صدوکیز)۔

پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہود کیسے ہی گنہ گار ہوں مگر چند روز سے زیادہ دوزخ میں نہیں رہیں گے (بقرہ ۲: ۸۰ و آل عمران ۳: ۲۴) یہ چند روز بہ اختلاف روایت تین روز، چالیس روز (۱) یا گیارہ مہینے (۲) ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ کے عہد میں یہودیوں کے ان دونوں فرقوں کے درمیان سخت اختلافات برپا تھے اور دونوں ایک دوسرے کی تردید و ابطال میں مصروف تھے، حضرت عیسیٰؑ نے آکر صدوقیوں کے اس عقیدہ کی تردید کی اور قیامت اور جزاوسزا پر ایمان لانے کی تعلیم دی، حضرت عیسیٰؑ کے ایک حواری یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں جنت اور دوزخ کی پوری تصویر کھینچی۔

حضرت عیسیٰؑ کے اس جواب سے جو انہوں نے ایک صدوقی کے سوال کا دیا کہ اس دنیا میں لوگ شادی اور بیاہ نہیں کریں گے بلکہ فرشتوں کے مانند رہیں گے، ایسا سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے جنت کو صرف روحانی وجود بخشا ہے مگر در حقیقت ایسا نہیں ہے، حضرت عیسیٰؑ اپنی زندگی کی آخری شب میں اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر جب انگور کا افشردہ پیتے ہیں تو کہتے ہیں:

''میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کے پھل کا رس پھر نہ پیوں گا اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہت میں نیا نہ پیوں۔'' (متی ۲۶۔۲۹ ص ۴۹) (۳)۔

وہ یہودی علما کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:

''اے سانپو! اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیوں کر بھاگو گے''

(متی ۲۳، ۳۳ ص ۴۳)۔

اپنے ایک وعظ میں دوزخ کا منظر دکھاتے ہیں اور فرماتے ہیں:

''اس نے دوزخ کے درمیان عذاب میں ہو کے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور ابرہام (حضرت ابراہیمؑ) کو دور سے دیکھا اور اس کی گود میں لعزر کو اور اس نے پکار کے کہا کہ اے باپ ابرہام مجھ پر رحم کر اور لعزر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی سے بھگو کے میری زبان ٹھنڈی کرے کیوں کہ میں اس لو میں تڑپتا ہوں۔'' (لوقا ۱۶۔۲۳ و ۲۴ ص ۱۲۶)

مکاشفاتِ یوحنا میں دوزخ کو آگ اور گندھک کہا گیا ہے (۱۴، ۱۰ ص ۴۱۱) اور متی کی انجیل

---

(۱) کتب تفسیر میں ان آیتوں کی تفسیر دیکھو (۲) سیل کا ترجمہ قرآن مجید حاشیہ زیر ترجمہ آیت بقرہ (۳) اس کے اور آگے کے حوالوں کے لئے دیکھئے، الکتاب المقدس کتاب العہد الجدید۔ ''ض''۔

میں اس کے دروازے بھی بتائے گئے ہیں، (متی ۱۶-۱۸ص ۳۰) اسی طرح جنت اور اس کی طلائی جواہراتی تعمیر اور نہر آبِ حیات کا ذکر مکاشفات کے اکیسویں باب ص ۴۲۰ میں ہے اور وہاں کے انگوری افشردہ کا بیان متی میں ہے (۲۶-۱۹ص ۴۹) وہاں کے آبِ سرد کا ذکر بھی انجیل میں آتا ہے (لوقا ۱۶-۲۴ص ۱۲۶)۔

اسی طرح ہر ایک کے عمل کا حساب لئے جانے اور عمل کے مطابق بدلہ ملنے کا ذکر بھی حواریوں کے خطوط میں موجود ہے:

''مبارک وہ مرد ہے جس کے گناہوں کا حساب خداوند نہ لے گا''۔ (رومیون ۴-۸ص ۲۵۱)

''سو ہر ایک ہم میں سے خدا کو اپنا حساب آپ دے گا۔'' (رومیون ۱۴، ۱۲اص ۲۶۴)

''لیکن وے اس کو جو زندوں اور مردوں کا انصاف کرنے پر تیار ہے حساب دیں گے۔ (اول پطرس ۴-۵ص ۳۷۹)

اس باب میں اسلام کا تکمیلی پہلو یہ ہے کہ اس نے اس عقیدہ کو نہ صرف پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہی کیا بلکہ اس کے تمام ضروری اجزا فراہم کئے، گزشتہ مذاہب کے تشنہ بیانات پر سیر حاصل بحثیں کیں، ان کے نقائص کی تکمیل کی اور سزا و جزا کے اصول اس صفائی سے بیان کئے کہ اس عقیدہ کا ہر پہلو شکوک وشبہات سے پاک ہوگیا۔

آیندہ مباحث کے سمجھنے کے لئے پہلے چند اصول ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔

عالمِ آخرت کا فہم و ادراک: اس عالمِ آخر میں جو کچھ ہوگا وہ اگرچہ ہمارے اس زیرِ تجربہ وزیر مشاہدہ مادی عالم سے بالکل الگ ہوگا، تاہم چوں کہ انسانی فہم کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہیں، اس لئے یہ الفاظ جن مادی خصائص کو مستلزم ہیں یا ہم ان کے دیکھنے اور سننے کے اس دنیا میں عادی ہوگئے ہیں، ان لفظوں کو سن کر بعینہٖ وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو اس دنیا میں ان لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں، اسی سبب سے بعض کم فہم وہاں کے وقائع واحوال کا بیان سن کر ان میں سے بعض کو محال اور ناممکن کہہ اٹھتے ہیں اور بعضے ان کی تشریح وتاویل اس طرح کرتے ہیں کہ لفظ ومعنی میں ادنی اشتراک بھی باقی نہیں رہتا، یہ دونوں راستے سخت خطرناک ہیں اسی لئے وحیِ محمدی ﷺ نے ان نازک ودقیق اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی

کمزوریوں کا پورا لحاظ کیا ہے، اس نے نہ تو یہودیوں کی طرح ان واقعات کو سرتاپا مادی کہہ کر عالمِ آخرت کو بھی عالمِ آب وگل بنادیا ہے اور نہ عقل وخرد کے بعض نادان مدعیوں کی طرح ان کو مادہ سے اتنا بلند وبرتر کردیا ہے کہ ان کا وجود ہی موہوم وفرضی ہوگیا ہے، بلکہ انسانی عقلوں کے اختلافِ مراتب کا لحاظ کر کے بزم کے اہلِ نظر اور تماشائیوں دونوں کی تشفی اور تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

ان اخروی وقائع کے مختلف مفہوموں اور مصداقوں کا لحاظ کر کے وحیِ محمدی ﷺ نے ایسے جچے تلے الفاظ اختیار کئے ہیں جن سے ایک فلسفی بھی بہرہ یاب ہوسکتا ہے اور ایک عامی بھی اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے ایمان کا لطف اٹھاسکتے ہیں اور ایک ایسے مذہب کے لئے جو سارے انسانی طبقوں کو اپنا مخاطب بنانے کا دعویٰ کرتا ہے ایسی ہی وسعت کی ضرورت تھی تاکہ وہ سب کے لئے اپنی اپنی جگہ پر تشفی کا باعث ہوسکے، ان تمام اخروی واقعات کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ ظاہر ہے کہ طبعًا وہی الفاظ ہوسکتے ہیں جن کے چاروں طرف اس دنیا کا مادی ماحول، مادی مفہوم ومصداق اور جسمانی تخیلات لپٹے ہوئے ہیں، ان لفظوں کے سننے کے ساتھ جو مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ سرتاپا ان ہی مادی قیود ولوازم کے ساتھ آتا ہے، ہم جب آگ کا لفظ سنتے ہیں، تو معًا اس دنیاوی آگ کا مفہوم ذہن میں آتا ہے جس کو ہم یہاں دیکھتے ہیں، جو انسانوں، درختوں اور ہر اس چیز کو جو اس کے اندر ہوتی ہے بلاتمیز یکساں جلادیتی ہے، مگر اخروی آگ ایسی نہ ہوگی، اس کے اندر بعض درخت ہوں گے جو نہیں جلیں گے، وہ صرف گنہ گار انسانوں کو جلائے گی، کسی کے پاؤں کو چھوئے گی، کسی کی کمر تک آئے گی، کسی کے گلے تک پہنچے گی اور وہ ایسی تیز وگرم ہوگی کہ یہ دنیاوی آگ اس کے مقابلہ میں ٹھنڈک ہے، ''وزن'' کا لفظ سننے کے ساتھ اس عالم میں تولنے کی ساری خصوصیتیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں، ترازو، پاسنگ، پلے، ڈنڈی اور تولی جانے والی چیز میں جسمیت اور ثقل کا لگا ہونا، اسی طرح نامۂ عمل کے لکھنے کا مفہوم جب ہم سمجھنا چاہیں تو کاتب کی انگلیاں، قلم، دوات، سیاہی، کاغذ اور حروف کی ساری قیدیں ہمارے ذہن میں آئیں گی، اس بناپر ان الفاظ کے لغوی معنوں اور ان کے قریب الفہم مجازی معنوں کے سمجھنے میں اختلافِ آرا کی بڑی گنجایش ہے اس لئے حق تو یہ ہے کہ ان پر بلامزید تشریح اس طرح ایمان لایا جائے کہ ہماری تشریح سے ان کے الفاظ کے مفہوم کی وسعت تنگ نہ ہوجائے، بایں ہمہ ان لوگوں کو بھی دائرہ سے خارج نہ

کیا جائے، جو ان الفاظ سے وہ مفہوم سمجھ کر تسلی پانا چاہتے ہیں، جن کے وہ الفاظ متحمل ہو سکتے ہیں کہ اگر مرادِ الٰہی یہی تنگی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انسانی عقلوں کے اختلافِ مراتب کا لحاظ کئے بغیر اپنے مفہوم کو اس وسعت کے بجائے تنگ سے تنگ الفاظ میں ظاہر فرما سکتا تھا مگر ایسا نہیں کیا تا کہ اسلام مختلف العقول انسانوں کے لئے عالم گیر ثابت ہو سکے۔

ایک دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ عالمِ آخرت کے وقائع اور حالات کے سمجھنے میں اشکالات واعتراضات اس لئے پیش آتے ہیں کہ ہم وجود اور اس کے موجودہ تمام قوانینِ فطرت کو اس طرح لازم وملزوم سمجھتے ہیں کہ جب کسی شے کے وجود کا تذکرہ کیا جائے گا تو معاً اس کے وہی خصوصیات ولوازم سامنے آئیں گے جن کے دیکھنے کے ہم اس دنیا میں عادی ہیں، حالاں کہ اربابِ عقل نے یہ طے کر دیا ہے کہ اس موجودہ دنیا کے معلولات ومسببات اور ان کے موجودہ علل واسباب میں جو لزوم ہے وہ محض عادی ہے یعنی اس لئے ایسا ہے کہ ہم ایسا دیکھتے ہیں، یہ نہیں کہ اس لئے ایسا ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔

اس بنا پر اگر صرف اتنی سی بات ذہن نشین کر لی جائے کہ موجودہ مادی دنیا میں جو قوانینِ فطرت اور علل واسباب اور ان کے نتائج کارفرما ہیں، وہ صرف اسی عالم اور موجودہ دنیا کے قوانین ہیں اگر خدا تعالیٰ کوئی نئی دنیا بنائے یا نیا عالم خلق کرے تو ضروری نہیں کہ یہی موجودہ قوانینِ فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں، بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اس نئے عالم میں نئے قوانین پر عمل ہو، نئی خصوصیات کے جسم ہوں، نئی قسم کی زندگیاں ہوں، نئی قسم کی آگ ہو، نئی قسم کے باغ اور ان کے پھل ہوں، نئی قسم کے موجودات ومخلوقات ہوں، نئے علل واسباب ہوں اور نئے قوانین فطرت ہوں، وحیِ محمدی ﷺ نے اسی نئے عالم کے متعلق کہا ہے:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (ابراھیم ۱۴:۴۸)	جس دن یہ زمین نئی زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان (نئے آسمانوں سے)۔

اب کون کہہ سکتا ہے کہ اس نئی زمین اور نئے آسمان میں بھی وہی مادی قانون جاری ہوں گے جو اس موجودہ زمین و آسمان میں جاری ہیں، اس بنا پر جسمانیت و مادیت کے وہ تمام اعتراضات اور آئندہ حیات کے متعلق وہ تمام اشکالات جو اس دنیا اور اس کے قوانین کی بنا پر پیدا

ہوتے ہیں بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں۔

اس ضروری تمہید کے بعد جزا وسزا کی اسلامی تشریحات کی جانب قدم اٹھایا جاتا ہے، وھو الھادی الی الصواب.

اصولِ جزا: اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے، جس کو اہلِ فلسفہ قانونِ قدرت اور اہلِ مذہب تقدیر اور اندازۂ الٰہی کہتے ہیں، اسی طرح اس نے اپنے ہر عالم کے لئے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے، انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ اصولِ فطرت صرف مادیات تک محدود ہیں حالاں کہ مادیات ہوں یا روحانیات، ذہنیات ہوں یا عملیات، ہر ایک میں یہ یکساں جاری وساری ہیں، جس طرح یہ قانونِ فطرت ہے کہ زہر کھانے سے انسان کا جسم مرجاتا ہے اسی طرح یہ بھی اصولِ فطرت ہے کہ گناہ سے اس کی روح مرجاتی ہے اور جس طرح اصولِ حفظانِ صحت کی عدمِ پیروی سے انسان بیمار ہو جاتا ہے، اسی طرح اصولِ تزکیۂ قلب کی عدمِ متابعت سے بھی وہ مریض ہو جاتا ہے، پھر جس طرح دوا واصولِ حفظانِ صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری کے آلام سے نجات پاتا ہے ایسا ہی روحانی تدابیرِ علاج کے ذریعہ بھی وہ شفایاب ہوتا ہے۔

اعمال کے لوازم ونتائج: غرض جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص وآثار بھی پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات واعمال کے بھی کچھ آثار ولوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے، غرور اور خاکساری، بخل اور فیاضی، انتقام اور عفو، شجاعت اور بزدلی، تقویٰ اور فسق، ایمان اور کفر، ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر و نتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص ولوازم ہیں، جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے سمیت، شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی اور ان معنوی، روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت ومعلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی، مادی اور طبعیاتی اشیا میں ہے۔

اشخاص کی نیکوکاری وبدکاری اور افراد کی سعادت وشقاوت کے جو اصول ہیں وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح وفساد اور سعادت وشقاوت پر بھی حاوی ہیں، جس طرح ایک سائنٹسٹ (حکیم) کا کام ان مادی فیزیکل اصول کو جاننا اور بتانا ہے اور اس کی تعلیم کا نام ہماری اصطلاح

میں حکمت (سائنس) ہے، اسی طرح ان روحانی اسباب وعلل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا انبیا علیہم السلام کا کام ہے اور ان کی اس تعلیم کا نام شریعت ہے، انبیا کی اس تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحانی آثار و نتائج کا وہی یقین ہونا چاہئے جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیا کے خواص اور آثار کا ہوتا ہے، سائیکالوجی (علم النفس) اور سوشیالوجی (علم الاجتماع) کی وسعتِ تحقیق نے اس مفہوم کے سمجھنے میں اب بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے۔

عقاب وثواب ردِ عمل ہے: الغرض یہ مادی وجسمانی دنیا علت ومعلول اور عمل وردعمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرہ میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل اور داخل ہے، یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں عقاب اور اعمالِ صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے، قرآن نے ان ہی دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے، عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لئے عقاب اس اثر کا نام ہے جو اس فعل کے کرنے کے بعد لازم آجاتا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے لیا گیا ہے جس کے معنی لوٹنے کے ہیں اس لئے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ اور جزا کے معنی میں بولا گیا ہے۔

اسی ایک مسئلہ کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو جزا اور سزا کے شرعی اصول کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو چنانچہ قرآن پاک میں یہ کئی دفعہ فرمایا گیا ہے:

اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْن. (جاثیہ ۴۵:۲۸) — جو تم کرتے تھے وہی آج بدلہ پاؤ گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جزا وسزا ہمارے ہی اعمال کے ردعمل (ری ایکشن) کا نام ہے ایک اور جگہ ہے:

لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى. (طٰہٰ ۲۰:۱۵) — تا کہ ہر جان کو اس کا بدلہ دیا جائے جو وہ کرتی تھی۔

ان آیتوں میں یہ صاف تصریح ہے کہ یہ جزا وسزا تمام تر ہمارے دنیاوی اعمال کے آثار و لوازم ہیں:

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْن. (نحل ۱۶:۳۴) — تو ان کے برے کام ان پر پڑے اور ان کا ٹھٹھا کرنا ان پر الٹ پڑا۔

غرض جزا وسزا ان ہی اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے گویا اسی

اصول کی تشریح میں یہ اشارہ فرمایا کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو میں تم کو لوٹا کر یہاں دے رہا ہوں تو جو کوئی جزائے خیر پاوے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے وہ خود کو ملامت کرے۔(۱)

حصولِ راحت کا اصول: یہ فطری قانون ہے کہ ہم کسی بڑی تکلیف سے اسی وقت بچ سکتے ہیں جب اس کی خاطر ہم اس سے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو برداشت اور کسی بڑی خوشی کے حصول کے لئے ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو قربان کرتے ہیں، عاجلہ یعنی موجودہ اور آخرہ یعنی آئندہ ان دونوں کا جب کبھی تقابل پیش آتا ہے تو دون ہمت اور پست خیال لوگ عموماً موجودہ (عاجلہ) راحت کو پسند کر کے آئندہ کی راحت کی فکر نہیں کرتے کہ ان کی نگاہ میں موجودہ راحت گو چھوٹی ہو مگر نقد ہے اور آئندہ کی راحت گو بڑی اور خوش آئند ہو مگر وہ نسیہ ہے اور ان کا اصول یہ ہے کہ ''نقد را بہ نسیہ مگذار''، لیکن بلند ہمت اور عالی حوصلہ طبائع کا طریقِ عمل اس کے بالکل برخلاف ہے، فاتح اور کشور کشا آج اپنی جانیں جوکھم میں ڈالتے ہیں تاکہ کل سلطنت ان کے ہاتھ آئے، تاجر اور سوداگر آج اپنے سرمایہ کو بازار کے سپرد کر دیتے ہیں تاکہ دولتِ فردا سے بہرہ مند ہوں، ہر مہذب انسان اپنے بچہ کو بیس پچیس برس تک تعلیم و تربیت اور مشق و امتحان کی مصیبتوں کی آگ میں بے تامل جھونک دیتا ہے تاکہ اس کی آئندہ زندگی راحت و مسرت میں بسر ہو، لوگ اپنے سرمایۂ عزیز کو تکلیفیں اٹھا اٹھا کر جمع کرتے جاتے ہیں تاکہ کل اس سے زیادہ ضروری موقع پر اس کو کام میں لا سکیں اور تنگ دستی کی بڑی تکلیف سے بچ سکیں۔

غرض اگر انسانوں کی تمام کوششوں پر ایک غائر نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ کامیابی کے حصول کا یہی اصول ان کے اندر جاری و ساری ہے کہ تھوڑی سی تکلیف کو اس لئے برداشت کر لیا جائے کہ کسی بڑی تکلیف سے رہائی ملے، چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اس لئے برباد کیا جائے کہ کوئی بڑی خوشی حاصل ہو اور عارضی کامیابیوں کو اس غرض سے قربان کیا جائے کہ کوئی پائدار اور دائمی کامیابی نصیب ہو مگر یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ آئندہ کی خوشی و کامیابی کی فراوانی اور اس کے دوام و پائداری کا ہم

(۱) صحیح مسلم کتاب البر و الصلۃ باب تحریم الظلم ج۲ص ۳۸۷ و ترمذی کتاب الزہد و مسند ابن حنبل ج۵ص ۵۴، ۱۶۰، ۱۶۵ و شرح ادب المفرد بخاری باب الظلم ظلمات ج۱ص ۵۷۲۔

یقین ہو، کیوں کہ اگر ایسا یقین نہ ہوتو ہم کبھی اس ایثار وقربانی پر آمادہ نہ ہوں، اسی کے لئے ایمان کی ضرورت ہے تا کہ ہمارے اندر یقین پیدا ہو جائے اور ہم اس ایثار وقربانی کو خوشی خوشی گوار کر لیں، جن لوگوں میں یہ یقین پیدا نہ ہوگا ان سے یہ عظیم الشان قربانی بھی نہیں ہوسکتی، اسی لئے گنہ گار انسانوں کی یہ کیفیت قرآن نے بیان کی ہے:

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ. وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ. (قیامۃ ۷۵: ۲۰-۲۱)

ہرگز نہیں بات یہ ہے کہ تم موجودہ زندگی سے محبت رکھتے ہو اور آئندہ زندگی کو چھوڑتے ہو۔

حالاں کہ انسان اسی اصول کار کو اگر دنیا کی طرح آخرت کے معاملات میں بھی برتے تو اس کی کامیابی میں کوئی شک نہ رہے، آئندہ کا خیال کر کے موجودہ سے دست بردار ہو جانا یہی کامیابی کی کنجی ہے اور اسی اصول کے تحت میں دین و دنیا کی تمام نیکیوں اور کامیابیوں کا راز پوشیدہ ہے، موجودہ عارضی لذت کو آئندہ کی دائمی لذت پر اور حال کی معمولی راحت کو مستقبل کی دیرپا راحت پر قربان کردینا وہ سچائی ہے جس کے تسلیم کرنے سے کوئی انحراف نہیں کرسکتا،تم صبح خیزی کی معمولی تکلیف کو صحت کی دیرپا راحت کی خاطر قربان کرتے ہو، ورزش اور دوڑ دھوپ کی محنت کو اس لئے قبول کرتے ہو کہ کل کی پیری اور بیماری کی تکلیف سے تم کو وہ بچائے، غرض آج کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو اٹھاؤ گے تو کل کی بڑی تکلیف سے تم کو نجات مل سکے گی اور آج کی عارضی خوشیوں کو قربان کرو گے تو کل کی دائمی خوشی نصیب ہوگی، یہی وہ فلسفہ ہے جس کو قرآن نے اس آیت میں ادا کیا ہے:

وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا. (دھر ۷۶: ۱۲)

اور خدا نے ان کے صبر کرنے پر ان کو باغ اور ریشم کے کپڑے مزدوری دی۔

یہ صبر کیا تھا؟ دنیا کی عارضی خوشیوں کی قربانی تا کہ آخرت کی بڑی خوشی حاصل ہو اور یہاں ادائے نیکی اور احترازِ جرم کی معمولی تکلیفوں کی برداشت تا کہ وہاں کی بڑی تکلیف سے نجات ملے، یہی سبب ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ حفت الجنة بالمكاره وحفت النار بالشهوات.(۱) یعنی جنت دنیاوی تکلیفوں سے اور دوزخ دنیا کی معمولی خوشیوں سے گھری ہوئی ہے، نادان تقویٰ اور نیکی کی ان معمولی قیدوں سے گھبراتے اور گناہ کی عارضی و فانی لذتوں کے طلب گار ہوتے ہیں، اس لئے

(۱) جامع ترمذی ابواب صفة الجنة باب ما جاء حفت الجنة بالمكاره الخ ج۲ ص۸۳۔

آخرت کی بڑی تکلیف میں گرفتار ہوں گے اور وہاں کی ابدی لذت سے محروم رہیں گے اور جو دین و دیانت اور نیکی وتقویٰ کی ان معمولی تکلیفوں کو گوارا کریں گے اور گناہ کی عارضی لذتوں سے بچیں گے وہ آخرت کی لاانتہا لذتوں سے شادکام ہوں گے، یہی فلسفہ قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى. فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى. (نازعات ۷۹: ۴۰، ۴۱)	لیکن جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو ناجائز لذتوں اور خوشیوں سے باز رکھا تو جنت اس کا ٹھکانا ہے۔

نامۂ عمل: ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز بھی ایک دفعہ پیدا ہو جاتی ہے پھر وہ بے حکمِ خدا فنا نہیں ہوتی، اسی طرح افعال و اعمال بھی جو انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ فنا نہیں ہوتے موجودہ سائنس (جس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بھی پیدا ہو کر فنا نہیں ہوتی یہاں تک کہ فضا میں ہر آواز اور ہر صدا بھی جو کبھی بلند ہوئی ہے آج موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی اور ہم اس کو پکڑ پائیں تو سن سکتے ہیں) وہ اعمال و افعال کے دوامِ وجود کے اسلامی عقیدہ کو قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کر سکتی، دنیا کے ریکارڈ میں انسان کا ہر عمل و فعل ہمیشہ کے لئے گویا بھرا ہے۔

قرآن پاک نے اسی اصول کو اپنی ان آیتوں میں بیان کیا ہے:

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ. (یونس ۱۰: ۳۰)	اس وقت ہر جان جو اس نے پہلے کیا اس کو آزمالے گی۔
كُلُّ امْرِیءٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ. (طور ۵۲: ۲۱)	ہر آدمی اپنے عمل کے بدلہ گرو ہے۔
كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ. (مدثر ۷۴: ۳۸)	ہر جان اپنے عمل کے بدلہ گرو ہے۔
فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ. وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ. (زلزال ۹۹: ۷، ۸)	تو جو کوئی ایک چیونٹی بھر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھے گا اور جو چیونٹی برابر بدی کرے گا وہ اس کو بھی دیکھے گا۔
يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ (آل عمران ۳: ۳۰)	جس دن ہر جان جو اس نے اچھے کام کئے ان کو موجود پائے گی اور جو برے کام کئے وہ بھی۔

یہ بات کہ انسان کا ہر عمل و فعل صحیفۂ عالم پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جاتا ہے اس کو قرآن نے

کئی طریقوں سے ادا کیا ہے۔

ایک اس طرح کہ انسان کی زبان سے جب کبھی کوئی لفظ نکلتا ہے خواہ وہ کتنی ہی تنہائی میں بولا جائے خدائی شاہد اس کو سننے کو موجود رہتے ہیں اور وہ اس کو سن کر محفوظ کر لیتے ہیں:

اِذْ یَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ. مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ. (ق ۵۰: ۱۷، ۱۸)	جب دو لینے والے داہنے اور بائیں بیٹھے لیتے جاتے ہیں، کوئی بات وہ نہیں بولتا مگر ایک نگراں اس کے پاس حاضر رہتا ہے۔

کبھی اس کو اعمال کی تحریر و کتابت کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:

اَمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰهُمْ بَلٰی وَرُسُلُنَا لَدَیْهِمْ یَكْتُبُوْنَ. (زخرف ۴۳: ۸۰)	کیا یہ منکر سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور ان کی کانا پھوسی نہیں سنتے کیوں نہیں بلکہ ہمارے فرستادہ ان کے پاس (اعمال) کو لکھتے ہیں۔
اِنَّ رُسُلَنَا یَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ. (یونس ۱۰: ۲۱)	بے شک ہمارے فرستادہ تمہاری چالوں کو لکھتے رہتے ہیں۔

کبھی اللہ تعالیٰ ہر عمل کے موقع پر خود اپنی حاضری اور ذاتی علم و شہادت کو ظاہر کرتا ہے:

وَمَا تَكُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَیْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ (یونس ۱۰: ۶۱)	اور تو کسی کام میں نہیں ہوتا اور نہ قرآن سے کچھ پڑھتا ہے اور نہ تم لوگ کوئی کام کرتے ہو لیکن ہم موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں لگے ہوتے ہو۔

کبھی یہ کہا ہے کہ ہر انسان کا نامۂ عمل اس کی گردن میں لٹکا ہے، قیامت کے دن وہی فردِ عمل کی صورت میں انسان کے سامنے پھیلا دیا جائے گا کہ اپنا اعمال نامہ تم خود پڑھ لو۔ فرمایا:

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ وَ نُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا. اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰی بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۱۳، ۱۴)	اور ہم نے ہر انسان کا نتیجۂ عمل اس کی گردن میں چپکا دیا ہے اور قیامت کے دن ہم دفتر کر کے نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا کہ اپنا دفتر پڑھ لے آج تیرا نفس خود ہی محاسب ہو تو کافی ہے۔

اس آیت کا ایسا محمل ہے کہ نامۂ عمل کو اگر کوئی واقعی کاغذ کا دفتر یا حساب و کتاب کا رجسٹر نہ سمجھے تو سمجھ سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یہ تعبیر اس لئے اختیار کی گئی کہ جس طرح کاغذ اور رجسٹر میں قلم بند حساب کوئی بھول نہیں سکتا اور ایک ایک چیز اس میں درج ہوتی ہے، اسی طرح یہ اعمالِ انسانی فراموش نہ ہوں گے بلکہ لکھے ہوئے رجسٹر کی طرح محفوظ رہیں گے، فرمایا:

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ	اور نامۂ اعمال رکھا جائے گا تو گنہ گاروں کو تو دیکھے اس میں
مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا	جو کچھ لکھا اس سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہائے
الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ	افسوس کہ اس کاغذ کو کیا ہے کہ چھوٹی بڑی بات نہیں چھوڑتا
اَحْصٰهَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا	لیکن اس کو شمار کر لیا اور جو کچھ انہوں نے زندگی میں کیا اس
يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا. (کہف ۱۸:۴۹)	کو سامنے پائیں گے اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہ کرے گا۔

با ایں ہمہ اگر کوئی ٹھیٹ لفظوں کا پابند ہو کر نامۂ عمل کو واقعی کاغذوں کا دفتر سمجھتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معنی اس کی تائید کریں گے مگر کون سمجھا سکتا ہے کہ یہ کیوں کر ہوگا، اسی لئے اس پر بحث فضول ہے کہ یہ کیوں کر ہوگا، چاہے یہ ہو یا وہ بہر حال ہمارے اعمال کا ایک ایک نقطہ محفوظ رہے گا اور وہ خدا کے سامنے پیش ہوگا اور یہی اس عقیدہ کا اصل مقصد ہے۔

اعضا کی شہادت: انسان کا ہر عمل اپنے پیچھے یا اپنے کرنے والے کے اندر اپنا اچھا یا برا اثر چھوڑ جاتا ہے اگر دل کا آئینہ صاف ہو تو اس کو اپنے عمل کا چہرہ اس میں صاف دکھائی دے فرمایا:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ. وَّلَوْ	بلکہ انسان کو اپنے نفس کا حال آپ دکھائی دیتا ہے اگر چہ وہ
اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ. (قیامۃ ۷۵:۱۴،۱۵)	اپنے عذر تراشتا ہے۔

یہی وہ آئینہ ہے جو گناہ کے میل سے زنگ آلود ہو جاتا ہے:

كَلَّا بَلْ سكته رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (تطفیف ۸۳:۱۴)	نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

گویا اسی آیت کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ جب انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اگر وہ توبہ و انابت کرتا ہے اور آئندہ اس سے باز رہتا ہے تو وہ مٹ جاتا ہے اور اگر اسی طرح گناہ کیے جاتا ہے تو اس نقطہ کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن پورے دل پر چھا جاتا ہے۔ (۱)

(۱) ترمذی ابواب التفسیر سورہ ویل للمطففین ج ۲ ص ۱۷۱۔

اسی طرح وہ اپنے جن اعضا سے جو برا کام کرتا ہے اس کا اثر ان پر چھا جاتا ہے یہاں تک کہ چہروں پر اس اثر کے نقوش ابھر آتے ہیں، آنکھوں میں اس کی لکیریں پڑ جاتی ہیں اور ہاتھ پاؤں پر اس کے نشان نمایاں ہو جاتے ہیں، عالمِ غیب اور عالمِ غیب کو چھوڑ و اسی عالمِ ظاہر میں تاڑنے والوں کی نگاہیں انسانوں کے چہروں، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کے عنوانِ بیان سے انسان کے اندر کی تحریریں پڑھ لیتی ہیں، اسی طرح قیامت میں ان کے اعمال کے آثار و نتائج ان کے ایک ایک عضو سے نمایاں ہوں گے:

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (رحمٰن ۵۵:۴۱)	گنہ گار اپنی نشانی سے پہچان لئے جائیں گے۔

ایسی حالت میں اس وقت جب انسان کی زبانِ قال پر خداوند عدالت کے رعب و جلال سے مہرِ سکوت پڑ جائے گی، اگر انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھال تک اس کے اعمالِ بد پر گواہی دے دیں تو تعجب کی کیا بات ہے؟ فرمایا:

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ.......... اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ. (یٰسٓ ۳۶:۵۹و۶۵)	اے گنہ گارو! آج نیکوکاروں سے الگ ہو کر پہچان میں آجاؤ........ آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔
وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ. حَتّٰى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (حٰمٓ السجدہ ۴۱:۱۹-۲۱)	اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے اور وہ درجہ بدرجہ بانٹے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو ان کے کانوں، آنکھوں اور ان کی کھالوں نے ان پر ان کے کرتوتوں کی گواہی دی، انہوں نے کہا تم نے ہم پر کیوں گواہی دی، کہا کہ جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا اسی نے ہم کو بھی گویا کیا۔

اس لئے ان اعضا کی گویائی بھی اسی نوع کی ہوگی جس نوع کی گویائی دنیا کی ہر چیز کو حاصل ہے لیکن اس گویائی سے اگر کوئی حقیقی ہی زبان کی گویائی مراد لے کر تشفی پاتا ہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے۔

میزان: اکثر انسانوں کے اچھے یا برے دونوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں ایک قسم کا عمل کم ہوگا اور دوسرا زیادہ یا دونوں برابر، دو مادی چیزوں کے درمیان تفاضل اور گھٹ بڑھ کا علم ہم کو تولنے یا گننے سے ہوتا ہے، اس لئے وزن اور حساب سے عموماً عدل و انصاف ،حق اور ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے، اعمالِ انسانی کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ انسان کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ ملے گا، فرمایا:

جَزَآءً وِّفَاقًا.	(نبا ۷۸:۲۶)	پورا پورا بدلہ۔

اس برابری اور کمالِ عدل وانصاف کو ترازو کی ناپ اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا کیا، فرمایا:

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ. وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ٍالْحَقُّ. فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (اعراف ۷:۷-۹)	پھر ہم احوال سنائیں گے اور ہم کہیں غائب نہ تھے اور وزن اس دن حق ہے پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو وہ ہیں جن کا بھلا ہوا اور جس کی تولیں ہلکی پڑیں سو وہی ہیں جو اپنی جانیں ہار بیٹھے۔
فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ. فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ. وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ. فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ. (قارعہ ۱۰۱:۶-۹)	تو جس کی تول بھاری ہوئی تو وہ خوش خوش عیش میں ہوگا، اور جس کی تول ہلکی ہوئی تو اس کی ماں دوزخ ہے۔

ان دونوں آیتوں میں تول کے بھاری اور ہلکے ہونے سے مقصود، اعمالِ خیر کی کمی وبیشی ہے، پہلی آیت میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ وزن سے مراد حق وعدل ہے اور یہ کہ انسان کا ہر عمل علمِ الٰہی میں موجود ہوگا اور وہ کسی طرح بیش وکم نہ ہوگا۔

اس مفہوم میں یہ استعارہ قرآن میں بہ کثرت مستعمل ہوا ہے، ایک جگہ ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَ الْمِيْزَانَ (شوریٰ ۴۲:۱۷)	وہ اللہ جس نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا اور میزان کو۔

یعنی کتابِ الٰہی حقانیت کے ساتھ اتری ہے اور اسی کے ساتھ میزان بھی، جس سے مراد

(طبری تفسیر آیت مذکورہ ج ۵۲ ص ۱۲) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نظامِ کائنات کی ہر چیز میں جو عدل ہے
اعتدالِ کامل رکھا ہے اس کو بھی میزان ہی کے لفظ سے ادا فرمایا ہے:

وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ. (رحمان ۵۵:۷) اور خدا نے ترازو رکھی ہے۔

حساب: کمی بیشی کے علم کا دوسرا طریقہ حساب ہے، دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن میں بھی یہ استعارہ استعمال ہوا ہے اور بار بار فرمایا ہے کہ ہم قیامت میں تمہارے عمل کا حساب لیں گے، مگر اس حساب سے بھی وہی مقصود ہے جو وزن سے ہے، چنانچہ سورہ انبیا میں یہ مفہوم مزید تصریح کے ساتھ مذکور ہے اور جس سے میزان کی حقیقت بھی پوری طرح سمجھ میں آتی ہے، فرمایا:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ	اور ہم قیامت کے دن کے لئے ترازو میں یعنی انصاف
فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ	رکھیں گے پھر کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا اگر رائی کے دانہ کے
حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ.	برابر بھی کچھ ہوگا تو ہم لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں
(انبیاء ۲۱:۴۷)	حساب کرنے والے۔

اس آیت سے دو باتیں سمجھی جاسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ وزن سے مقصود انصاف اور عدمِ ظلم ہے، اور دوسری یہ کہ حساب سے مقصود یہ ہے کہ عملِ انسانی کا کوئی ذرہ بھی معاوضہ میں چھوٹنے نہ پائے گا اور نہ وہ خدا کے علم سے غائب ہے لیکن بہر حال وزن وحساب کے مادی ہی مفہوموں کو اگر کوئی صحیح باور کرتا ہے تو وہ بھی حق پر ہے۔

جنت و دوزخ: اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اعمال کی تکلیف اور ذمہ داری سے مقصودِ الٰہی کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ ارواحِ انسانی کو سعادتِ ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی عطا کی جائیں، مگر اس سعادت و ترقی کی بنیاد خدا نے اعمالِ نیک کے حصول اور اعمالِ بد سے پرہیز پر رکھی ہے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ خلقتِ انسانی کی غرض یہ ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل کرے تا کہ وہ اپنی مقررہ سعادت اور موعودہ ترقی کو حاصل کرے اور اس عالم کا نام جہاں یہ سعادتِ ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی ملتی ہیں، بہشت ہے اور اس عالم کا نام جہاں جا کر دنیاوی کمیوں کی تلافی اور گذشتہ حیاتِ فانی کے اعمالِ بد کے نتائج سے پاکی حاصل ہوگی، دوزخ ہے، اس لئے یہ کہنا

صحیح ہے کہ جنت ہی انسان کا اصلی گھر ہے مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

جنت انسان کی وراثت ہے: حضرت آدمؑ کا قصہ جو توراۃ اور قرآن پاک میں مذکور ہے وہ آغازِ خلقت کی محض تاریخ نہیں وہ حقیقتِ انسانی کی سچی اور حقیقی تفسیر ہے، عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اپنے فضل سے جس جنت میں جگہ دی تھی وہ پہلے ان کو اور ان کی نسل کو ہمیشہ کے لئے دے دی گئی تھی مگر چوں کہ اتفاقاً ان سے گناہ سرزد ہوا اس لئے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دے گئے مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آدمؑ کا زمین میں آنا تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا کیوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی خلقت سے پہلے ہی فرشتوں پر یہ ظاہر کر چکا تھا کہ:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (بقرہ۲:۳۰) — میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

حضرت آدمؑ کا زمین میں خلیفہ ہونا ان کے زمین میں سکونت پذیر ہونے کی پیشین گوئی ہے، مگر زمین میں بھیجنے سے پہلے ان کو جنت میں رکھنا پھر گناہ کیے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں بھیجنا یہ اشارہ رکھتا ہے کہ آدم اور ان کی نسل کی اصلی جگہ یہی جنت ہے، مگر اس سے دوری ان کے گناہ کی وجہ سے ہے اور اس کا حصول خدا کی اطاعت اور نیکوکاری کے ذریعہ ہوگا چنانچہ ان کے زمین میں اترتے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمادیا:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ. وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ. (بقرہ۲:۳۸:۳۹)

ہم نے کہا کہ تم سب اس جنت سے اترو، پھر کبھی تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو اس کو نہ ڈر ہوگا نہ غم اور جنہوں نے نہ مانا اور ہمارے حکموں کو جھٹلایا تو وہی ہیں دوزخ والے، وہ اس میں رہا کریں گے۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِیْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی. وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی.

خدا نے کہا کہ اس جنت سے تم دونوں ایک ساتھ اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ بد بخت ہوگا اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کے لئے تنگ معاش ہوگی اور

قیامت میں ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔ (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۳، ۱۲۴)

توراۃ میں ہے کہ جنت میں دو درخت تھے، ایک نیک و بد کی پہچان کا اور دوسرا زندگیٔ جاوید کا، توراۃ کی رو سے آدم کو اسی نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا ہے (تکوین ۲: ۱۶، ۱۷ ص ۵) لیکن آدم نے اس کو کھالیا اور اس کی وجہ سے سب سے پہلے ان کو اپنی برہنگی کا علم ہوا، آخر خدا نے ان کو جنت سے نکال دیا کہ وہ زندگی کے درخت کا پھل کھا کر خدائی کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں جب وہ جنت سے نکالے گئے تو ان سے کہا گیا۔ (سفر تکوین ۳۔ ۷ ص ۶)

''اور اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ سے حکم کیا کہ اس سے مت کھانا، زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا اور وہ تیرے لئے کانٹے اور اونٹ کٹارے اگائے گی اور تو کھیت کی نبات کھائے گا اور تو اپنے منہ کے پسینہ کی روٹی کھائے گا جب تک کہ زمین میں پھر نہ جائے۔'' (تکوین ۳۔ ۱۲ و مابعد ص ۶، ۷)

قرآن پاک میں اس درخت کا نام جس کے پھل کھانے سے آدم کو روکا گیا تھا، تصریحاً مذکور نہیں لیکن ایک آیت سے اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک و بد کی شناخت کا درخت تھا اور شیطان نے یہ کہہ کر ان کو کھلایا کہ یہ حیاتِ جاوید اور ملکِ جاویدان کا درخت ہے مگر اس کے کھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو برہنگی کا علم ہوگیا، جو نیک و بد کی تمیز کا نتیجہ ہے، فرمایا:

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى. فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۰۔ ۱۲۱)	شیطان نے آدم کو وسوسہ دیا کہا اے آدم کیا میں تجھے حیات جاویدانی اور سلطنتِ غیر فانی کا درخت بتاؤں تو (آدم اور حوا) دونوں نے اس درخت کا پھل کھایا تو ان کی بری چیزیں ان پر کھل گئیں۔

اب سوال یہ ہے کہ حیاتِ جاوداں غیر فانی بادشاہی سے مقصود کیا ہے، ظاہر ہے کہ جنت ہے، شیطان کا مقصود یہ تھا کہ اس جنت میں جس میں تم اب ہو، بے دردِ سر ہمیشہ رہنے کا نسخہ تم کو بتاؤں؟ انسان نے خواہش کی تو اس نے نیک و بد کی تمیز کے درخت کا پھل بتادیا، یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نیک و بد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مواخذہ کی بنیاد ہے، ہر وہ مخلوق بلکہ ہر وہ انسان جو اس ادراک سے خالی ہے وہ شرعی تکلیف اور مواخذہ سے گراں بار نہیں، غرض اس خیر و شر کی

معرفت کا لازمی نتیجہ شریعت کی تکلیف تھی چنانچہ وہ اس کے سر ڈالی گئی اور پھر نسلِ آدم میں یہ نیک و بد کی تمیز فطری الہام کے ذریعہ عنایت ہوئی، فرمایا:

وَنَفۡسٍ وَّ مَا سَوّٰهَا . فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَ تَقۡوٰهَا. (الشمس ۹۱: ۷۔۸)	اور نفس اور اس کی بناوٹ کی قسم، پھر نفس میں اس کی بدی اور اس کی نیکی کو الہام کیا۔

عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیتیں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہوں:

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَيۡنَ اَنۡ يَّحۡمِلۡنَهَا وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَ حَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا. لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الۡمُنٰفِقِيۡنَ وَ الۡمُنٰفِقٰتِ وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ وَ الۡمُشۡرِكٰتِ وَيَتُوۡبَ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا. (احزاب ۳۳: ۷۲،۷۳)	ہم نے اپنی امانت (تکلیف شرعی) آسمانوں پر اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور انسان نے اس کو اٹھالیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا تاکہ اللہ نفاق والوں اور نفاق والیوں اور شرک والوں اور شرک والیوں کو سزا دے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر رجوع ہو اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

انسان نے اپنی جہالت سے اس تکلیفِ شرعی کی امانت کو اٹھالیا جو نیک و بد کی معرفت کا لازمی نتیجہ تھا اور اس تکلیفِ شرعی کا لازمی نتیجہ جزا اور سزا تھی لیکن خدا کی رضامندی یہی تھی کہ اس کے سب بندے اس کی رحمت اور مغفرت کے مستحق ٹھہریں کہ اس کی رحمت و شفقت کا اقتضا یہی ہے کہ گنہ گاروں کو معاف کرے اور نیکوکاروں پر اپنی خاص رحمت نازل کرے لیکن اگر کاشت کار اپنے کھیتوں کو ابرِ رحمت سے مستفید ہونے کے قابل نہ بنائے تو وہ اس کی برکت سے مستفید نہ ہوگا، اسی طرح جو بندہ شرک و نفاق میں مبتلا ہو جانے سے اپنے آپ کو اس کی رحمت کے قابل نہ بنائے تو وہ بھی اس کی رحمت کی بارش سے سیراب نہ ہو سکے گا۔

غرض اس طرح وہ مصلحتِ الٰہی جو انسان کی پیدائش سے تھی پوری ہوئی اور وہ حیاتِ جاوید اور غیر فانی بادشاہی جس کا حصول قضائے الٰہی نے انسان کی محنت، جدوجہد اور سعی و عمل پر موقوف رکھا تھا اور جسے شیطان نے آدم کو بلاسعی و محنت محض بخت سے دلوانا چاہا تھا بالآخر اس کا ملنا تقدیرِ الٰہی، جدوجہد، سعی و عمل اور نظامِ ربانی کے مطابق شریعت کی پیروی کے ذریعہ سے مقرر ہوا، جیسا کہ پہلے

سے طے شدہ تھا، فرمان آیا:

اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (بقرہ ۲: ۳۸)	یہاں سے تم سب اترو پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی تو ان کو نہ ڈر ہوگا نہ غم۔
اِهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى. (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۳)	تم دونوں یہاں سے نیچے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ بدبخت۔

جب انسان کا اصل مقام، وہی حیاتِ جاوید اور مملکتِ ابد ہے تو اسی کا حصول اس کی تمام کوششوں کا محور ہونا چاہیے اور اسی حیاتِ باقی اور لازوال بادشاہی کی دولت کو اپنی اس فانی زندگی اور زوال پذیر پادشاہی کے تمام کاموں کے مزد و معاوضہ میں حاصل کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے باپ کی اس آسمانی بادشاہی کو پالے جس کی صفت یہ ہے:

فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى. اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى. وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى. (طٰہٰ ۲۰: ۱۱۷-۱۱۹)	تو شیطان تم کو جنت سے باہر نہ کردے تو پھر مشقت میں پڑ جائے اور جنت میں تجھ کو یہ ملا ہے کہ اس میں تو نہ بھوکا ہوگا اور نہ ننگا نہ پیاسا ہوگا اور نہ دھوپ کی تپش اٹھائے گا۔

آدم اس جنت سے نکلے تو ان کو بھوک بھی لگی، ننگے بھی ہوئے، پیاس بھی معلوم ہوئی اور دھوپ کی تپش کی تکلیف بھی ہوئی اور زمین میں آکر ان ہی چار چیزوں کی مشقت میں گرفتار ہوئے، کھانا، پینا، پہننا، رہنا یہی انسان کی چار مختصر ضروریات ہیں ان ہی کو اس نے اپنی ہوا و ہوس سے پھیلا کر ضروریات کا ایک عالم پیدا کرلیا جس کے مہیا کرنے، ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام تر توجہ کو مصروف کر کے اصل جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا، یہیں سے شریعت کی تکلیف عائد ہوئی اور جائز اکل، جائز شرب، جائز لباس اور جائز مسکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کا حکم ہوا، اسی سے شریعت کے اصول، معاملات اور اخلاقِ انسانی کی ذمہ داریاں پیدا ہوئیں اور پھر اس لئے تاکہ اس حیاتِ فانی میں پھنس کر حیاتِ غیر فانی کی طلب کو وہ بھول نہ جائے، عرفانِ الٰہی (عقائدِ صحیحہ) اور عباداتِ الٰہی

واطاعتِ الٰہی کی تلقین ہوئی جو جنت کی اصل غذا اور روزی ہے:

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْوٰرِثُوْنَ. الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ.	یہی وہ میراث لینے والے ہیں جو سایہ دار باغ کے وارث ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

(مومنون ۲۳: ۱۰، ۱۱)

لیکن یہ وراثت انسان کو اپنے اعمالِ خیر ہی کے ذریعہ ملے گی، چنانچہ اہلِ جنت کو جنت کے داخلہ کے وقت یہ بشارت ملے گی:

وَفِیْھَا مَا تَشْتَھِیْہِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْیُنُ وَاَنْتُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ. وَتِلْکَ الْجَنَّۃُ الَّتِیْٓ اُوْرِثْتُمُوْھَا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ.	اور اس جنت میں وہ کچھ ہے جس کو دل چاہے اور آنکھوں کو لطف ملے اور تم کو اس میں ہمیشہ رہنا ہے اور یہی وہ جنت ہے جس کے وارث اپنے کاموں کے بدلہ تم بنائے گئے۔

(زخرف ۴۳: ۷۱، ۷۲)

اور ان ہی کو منادیِ غیب یہ ندا دے گا:

وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْکُمُ الْجَنَّۃُ اُوْرِثْتُمُوْھَا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. (اعراف ۷: ۴۳)	اور ان کو پکار کر کہا گیا کہ یہی وہ جنت ہے، جس کے تم وارث اپنے ان کاموں کے بدلہ بنائے گئے۔

ملتِ توحید کے مبلغِ اعظم حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں کا ایک فقرہ یہ بھی تھا:

وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَۃِ جَنَّۃِ النَّعِیْمِ. (شعراء ۲۶: ۸۵)	اور مجھے باغِ نعمت کے وارثوں سے بنا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام نے انسان کا اصلی مقام وہی قرار دیا ہے جہاں نہ بھوک ہے نہ پیاس، نہ برہنگی ہے نہ دھوپ کی تکلیف، جہاں کی بادشاہی لازوال اور جہاں کی زندگی غیر فانی ہے لیکن اس کے حصول کا ذریعہ صرف انسان کا نیک عمل اور صحیح عرفان ہے جن کے مجموعہ کا نام تقویٰ ہے:

تِلْکَ الْجَنَّۃُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ کَانَ تَقِیًّا. (مریم ۱۹: ۶۳)	یہ وہ بہشت ہے، جس کا وارث اپنے بندوں میں سے ہم اس کو بنائیں گے جو تقویٰ والا ہوگا۔

انسانی جزا و سزا کے تین گھر: انسان کے تین گھر ہیں ایک موجودہ فانی عالم جس کو دنیا کہتے ہیں اور دوسرا درمیانی عالمِ موت، یا عالمِ قبر جس کا نام برزخ ہے اور تیسرا اس غیر فانی زندگی کا گھر جس کو دارِ آخرت کہتے ہیں، یہودیوں کے یہاں اصلی زور اسی دنیا کی جزا و سزا پر ہے ان کے ہاں تیسرے کا

ذکر بہت کم اور دوسرے کا مطلق نہیں اور عیسائیوں میں پورا زور تیسری منزل کی سزا و جزا پر ہے اور پہلی اور دوسری منزلوں کے ذکر سے خاموشی ہے لیکن وحیِ محمدی ﷺ کی تکمیل نے ان تینوں گھروں کو انسانی سزا و جزا کا مقام قرار دیا، انسان کو اپنے اعمال کی پہلی جزا و سزا تو اسی دنیا میں کامیابی و ناکامی کی صورت میں ملتی ہے، گو اس کامیابی و ناکامی کے سمجھنے کا معیار مختلف ہو اس کے بعد جب انسانی روح دوسری منزل میں قدم رکھتی ہے تو یہاں بھی وہ اپنے اعمال کی تھوڑی بہت جزا و سزا کا منظر دیکھ لیتی ہے، اس کے بعد جب موجودہ دنیا کے پورے کاروبار کا خاتمہ ہو کر اس فانی کائنات کا ہر نقش و نگار مٹ جائے گا اور پھر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا تو فانی انسانوں کو دائمی زندگی کے لئے بے دار کیا جائے گا اور اس وقت وہ اپنے اعمال کی پوری جزا و سزا پائیں گے۔

انسان کا پہلا دار الجزا: غرض انسان کا پہلا دار الجزا یہی دنیا ہے گو اس کے ہر نیک و بد فعل کی پوری جزا تو دوسری دنیا کی زندگی میں ملتی ہے لیکن اس کے نیک و بد فعل کے مماثل اس موجودہ دنیا کی زندگی میں بھی اس کو کچھ نہ کچھ جزا ملا کرتی ہے، انسان کی عزت، شہرت، نام وری، ہر دل عزیزی، محبوبیت، تسکین، اطمینان، سرور، فارغ البالی، حکومت، یہ سب اس زندگی کے اعمالِ خیر کے نتائج ہیں، ان کے برخلاف ذلت، رسوائی، بے عزتی، کس مپرسی، پریشاں حالی، بے اطمینانی، غم، خوف، محکومیت اس کے اعمالِ بد کے اثرات ہیں۔

یہودیوں کی توراۃ میں اعمال کے نتائج میں زیادہ اہمیت اسی دنیاوی دار الجزا کو دی گئی ہے، بلکہ توراۃ میں یہی خیال سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ خدا کی فرماں برداری اور نافرمانی کی جزا اسی دنیا کے رنج و راحت کی صورت میں اسی زندگی میں ملتی ہے، مثلاً خدا کے حکموں پر عمل کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری کھیتیاں سرسبز ہوں گی، اولادیں برومند ہوں گی، جانور جنیں گے، درخت پھل دیں گے اور دشمن مغلوب ہوں گے، اور اگر خدا کی نافرمانی کرو گے تو تم پر وبائیں آئیں گی، قحط پڑیں گے، اولادیں جیتی نہ رہیں گی، جانور مر جائیں گے، شہر تباہ ہو جائیں گے، باغ پھل نہ دیں گے اور دشمن تم پر چھا جائیں گے، عیسائیت نے اس کے بالمقابل سارا زور زمین کی مملکت پر نہیں بلکہ آسمان کی بادشاہت پر دیا ہے اور اس ظاہری زندگی کے فوز و فلاح کو اپنے مقصد سے خارج قرار دیا ہے، آنحضرت ﷺ جس دعوت کو لے کر آئے وہ یہودیت و عیسائیت کی اس افراط و تفریط دونوں سے پاک

ہے، اس نے ایمان اور عملِ صالح کا نتیجہ اس دنیا کی بادشاہی بھی قرار دی اور اُس دنیا کی بھی، زمین کی حکومت بھی اور آسمان کی جنت بھی، یہاں کی سرسبزی وشادابی بھی اور وہاں کا باغ و بہار بھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نکوکار مسلمانوں کے ذکر میں فرمایا:

فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ. وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ. (آل عمران ۳:۱۴۸)	تو خدا نے ان کو دنیا کا بدلہ بھی دیا اور آخرت کے ثواب کی خوبی بھی اور اللہ نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ایمان اور عملِ صالح والوں سے یہ وعدہ تھا کہ:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا. (فتح ۴۸:۲۹)	خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے، گناہوں کی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا۔

اور یہ بھی ان ہی سے وعدہ ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور ۲۴:۵۵)	خدا نے ان سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کئے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو ملک میں حاکم بنائے گا جس طرح ان سے اگلوں کو حاکم بنایا تھا۔

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جس طرح اس دنیا کی فانی زندگی سے اس دنیا کی باقی زندگی زیادہ پائدار ہے اسی طرح اس دنیا کے ثواب سے اس دنیا کے ثواب کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہے اور اسی دنیا کے حسنِ عمل کی کوشش سے اس دنیا کی بہتری بھی ملتی ہے، فرمایا:

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (نحل ۱۶:۳۰)	جنہوں نے نیک کام کئے، اس دنیا میں ان کے لئے بھلائی ہے اور بے شبہ آخرت کا گھر بہتر ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیا اچھا ہے۔

اسی طرح بدکاروں کی جزا جہاں اس دنیا کی دوزخ اور آگ کے عذاب کو فرمایا اسی طرح اس دنیا کی ذلت وخواری اور رسوائی کو بھی فرمایا:

خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ (حج ۲۲:۱۱)	اس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا۔
لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ	ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑی مار ہے۔

عَذَابٌ عَظِیْمٌ (بقرہ۲:۱۴)

خَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ (بقرہ۲:۲۱۷) — ان کے کام دنیا اور آخرت میں برباد ہوئے۔

یہ بھی فرمایا:

فَاُعَذِّبُھُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ (آل عمران۳:۵۶) — تو میں ان کو دنیا اور آخرت میں سخت سزا دوں گا۔

تنگی اور بدحالی کی سزا بھی یہیں ملتی ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَعْمٰی. (طٰہٰ ۲۰:۱۲۴) — اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو اس کے لئے تنگ گذران ہے اور قیامت میں میں اس کو اندھا اٹھاؤں گا کہ دنیا میں وہ دل کا اندھا بنا تھا۔

انتہا یہ ہے کہ خود صحابہؓ کو جنگ احد میں جو فتح نہیں ملی، اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی ان کی بعض کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کا ثمرہ بتایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّھُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا کَسَبُوْا (آل عمران۳:۱۵۵) — تم میں سے جو لوگ اس دن جب دونوں فوجیں بھڑیں پیچھے ہٹے ان کے بعض کاموں کی وجہ سے شیطان نے ان کو پھسلا دیا۔

ایک اور مقام پر عام طور سے فرمایا گیا:

وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ. (شوریٰ۴۲:۳۰) — جو مصیبت تم کو پہنچی وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث اور وہ بہت سی باتوں سے درگذر کرتا ہے۔

یہود کے ذکر میں قرآن نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے، عذاب کے موقع پر فرمایا:

ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ اَیْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الْمَسْکَنَۃُ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ — ان پر ذلت ماری گئی جہاں پائے گئے لیکن (جہاں عزت حاصل ہے) وہ خدا کے ذریعہ لوگوں کے سہارے اور اللہ کا غصہ کما لائے اور ان پر (قومی) محتاجی ماری گئی یہ اس لئے کہ وہ خدا کے حکموں کا انکار کرتے

وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ. ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ. (آل عمران ۳:۱۱۲)

تھے اور پیغمبروں کو مار ڈالتے تھے، یہ اس لئے کہ وہ نافرمان ہیں اور حدودِ الٰہی سے آگے بڑھتے ہیں۔

اس کے بالمقابل عام اہلِ کتاب سے کہا گیا:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (مائدہ ۵:۶۶)

اور اگر یہ تورات اور انجیل کو اور جو ان کی طرف ان کے پروردگار کی طرف سے (اب) اتارا گیا اس کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر (برکاتِ آسمانی) سے کھاتے اور اپنے پاؤں کے نیچے (ارضی خیر و برکت) سے کھاتے۔

ایک اور موقع پر اشارہ ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ. (اعراف ۷:۹۶)

اور ان آبادیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور پرہیز گاری کے کام کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کو کھولتے لیکن انہوں نے خدا کے احکام کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا۔

مگر یہ دار الجزا فانی ہے: لیکن یہاں ایک لغزش گاہ بھی ہے جس سے اہلِ ہوش کو باخبر رہنا چاہیے، اس دنیا میں گو انسان کو اعمال کی جزا و سزا کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ملتی ہے مگر کیا شخصی زندگی اور کیا جماعتی حیات کے لحاظ سے یہ دار الجزا جس کا نام دنیا ہے عارضی اور فانی ہے، یہاں کا غم بھی فانی اور یہاں کی خوشی بھی عارضی ہے، اس لئے صرف اسی دنیا کی کامیابی کو اپنی زندگی کا اصل مطلوب و مقصود اور غایت و منتہا نہیں بنانا چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس سے بھی زیادہ ایک اور وسیع آسمانی مملکت اور لازوال ربانی سلطنت ہے، جو فنا و زوال کے ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے اور جہاں کی نعمتیں اس دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ بہتر اور غیر فانی ہیں، اس لئے اس فانی دنیا کی لذتوں میں پڑ کر اس کو بھول نہیں جانا چاہیے، اس مسافر کی عقلِ سلیم کو داد کون دے گا جو راستہ کی عارضی خوش منظریوں اور سفر کی فانی دلچسپیوں میں پڑ کر اپنے خوش سواد اور سدا بہار وطن کو فراموش کر بیٹھے:

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا. وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى. (اعلیٰ ۸۷:۱۶،۱۷)

بلکہ تم دنیاوی زندگی کو بڑھ کر چاہتے ہو حالاں کہ آخرت کی زندگی اس سے بہتر اور اس سے زیادہ پائدار ہے۔

وَلَاَجۡرُ الۡاٰخِرَۃِ خَیۡرٌ (یوسف۱۲:۵۷) اور بے شک آخرت کی مزدوری (یہاں کی مزدوری سے) بہتر ہے۔

اس طرح گنہگاروں کے لئے یہاں کی ذلت ورسوائی سے بڑھ کر ایک اور ذلت ورسوائی کا مقام ہے:

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الۡخِزۡیَ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَةِ اَكۡبَرُ ۘ لَوۡ كَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ. (زمر۳۹:۲۶) تو خدا نے ان کو اس دنیاوی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا اور شبہ نہیں کہ آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے اگر وہ جانتے۔

اس دنیا کی ذلت ورسوائی تو شاید سہ بھی لے جائے مگر وہاں کے عذاب کی سختی کو کون سہ سکتا ہے کہ:

وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبۡقٰی. (طٰہٰ۲۰:۱۲۷) اور آخرت کا عذاب البتہ زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے۔

اس لئے اس فانی دنیا میں انسان کو اپنے حسنِ عمل کے بہ دولت جو زوروقوت، جاہ و جلال، نعمت و مال اور حکومت وسروری ملے ان کو بھی آخرت کی لازوال نعمتوں اور وہاں کی غیر فانی بادشاہی کے حصول میں صرف کرنا چاہئے کہ اس سے خود ان دنیاوی نعمتوں کو بھی بقا اور پائداری حاصل ہوگی، اسی فلسفہ کو محمد رسول اللہ ﷺ کی وحیِ حقیقت طراز نے قارون کی نصیحت کے ضمن میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

وَابۡتَغِ فِیۡمَاۤ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الۡاٰخِرَةَ وَلَا تَنۡسَ نَصِیۡبَكَ مِنَ الدُّنۡیَا وَ اَحۡسِنۡ كَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَیۡكَ وَلَا تَبۡغِ الۡفَسَادَ فِی الۡاَرۡضِ. (قصص۲۸:۷۷) اور خدا نے جو تجھ کو دیا ہے اس سے آخرت کا گھر تلاش کر اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول اور جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی (خدا کے بندوں پر) احسان کر اور (اس دولت سے) زمین میں خرابی نہ چاہ۔

چنانچہ ناخلف یہود پر تباہی اسی لئے آئی کہ وہ دنیاوی زندگی کی دولت وجائداد کی محبت میں ایسے پھنسے کہ ان کو اپنے کاروبار میں آخرت کے سودا کا خیال بھول کر بھی نہ آیا:

فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ وَّرِثُوا الۡكِتٰبَ یَاۡخُذُوۡنَ عَرَضَ هٰذَا الۡاَدۡنٰی وَیَقُوۡلُوۡنَ سَیُغۡفَرُ لَنَا ۚ وَاِنۡ یَّاۡتِهِمۡ عَرَضٌ مِّثۡلُهٗ تو ان کے بعد کچھ ناخلف کتاب کے وارث ہوئے جو اس دنیا کے سامان واسباب کو لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہوگا اور اگر دنیا ہی سامان واسباب پھر آئے تو پھر

يَأْخُذُوهُ أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِيثَاقُ الْكِتَبِ أَنْ لَا يَقُولُوا عَلَى اللهِ إِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوا فِيهِ وَالدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ. (اعراف ۷:۱۶۹)	پس کیا ان سے کتاب کے حق میں یہ عہد نہیں لیا گیا کہ وہ خدا پر حق کے سوا کچھ اور نہ بولیں حالاں کہ جو اس میں ہے وہ اس کو پڑھ چکے ہیں اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے کیا تم سمجھتے نہیں۔

یہ دار الجزا دار الاصلاح بھی ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت وشفقت سے انسان کو پیدا کیا اور اس ہمیشہ کی زندگی کا مقام بھی دکھایا اور بتا دیا کہ اس مقام کا دائمی وابدی استحقاق خود تمہارے عمل سے تم کو حاصل ہو سکتا ہے اور یہ دنیاوی زندگی اسی لئے اس کو دی گئی کہ وہ اس زمانہ میں اس سدا بہار سرزمین کی ملکیت کو اپنے عمل کی قیمت سے خرید سکے، پھر چوں کہ انسان دوسری مصلحتوں کے لحاظ سے طبعاً کمزور، زود فراموش اور بھولنے والا بھی پیدا ہوا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی اسی مستعار زندگی میں بار بار اپنے سنبھلنے، سدھرنے اور کامیاب بننے کے موقع عنایت کئے، رسولوں کی بعثت، معلموں کی آمد، شریعت کی تعلیم، پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ، گناہوں پر جسمانی سزا و تعذیر، عملِ خیر پر روحانی لذت اور عملِ شر پر روحانی غبار و کدورت کے لوازم اسی لئے مقرر ہوئے کہ اس کو ہر قدم پر اپنے اعمال پر تنبیہ اور اپنی غلط روی کا احساس ہو اور ان سب کے علاوہ اس نے اپنی غایتِ رحمت سے انسانوں کی تنبیہ اور اصلاح کے لئے حسبِ ذیل مراتب مقرر کئے:

۱۔ نیکی سے برائی کا کفارہ: چوں کہ انسان کتنی ہی کوشش کرے اپنے فطری کمزوریوں کی حد سے باہر نہیں نکل سکتا، اس لئے جس طرح اس دنیا میں اس نے انسانوں کے دلوں میں یہ فطری اصول ودیعت کر دیا ہے کہ جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو اس کی معمولی برائیوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے یا یہ کہ آخر میں اس کا کوئی ایک نیک کام اتنا زبردست ہو جاتا ہے کہ اس سے اس کی تمام اگلی برائیوں کی فرد دھل جاتی ہے، اسی کا نام کفارۂ عمل ہے چنانچہ وحیِ محمدی ﷺ نے اصولی طور پر یہ حقیقت ان الفاظ میں تلقین کی کہ:

إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (ھود ۱۱:۱۱۴)	بے شبہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

اس آیت کا یہ بھی منشا ہے کہ نیکیوں کی تدریجی ترقی بالآخر برائیوں کو کم کرتی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ پورا نیکوکار انسان بن جاتا ہے اور یہ بھی خوش خبری اس میں پوشیدہ ہے کہ یہی نیکیاں اس کی پہلی برائیوں کے نتیجہ کو بھی انشاء اللہ مٹا دیں گی، اس معنی کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں:

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا (نساء۴:۱۳)	تم کو جن باتوں سے منع کیا گیا ہے اگر ان میں کی بڑی باتوں سے تم بچتے رہو گے تو ہم تمہاری تقصیریں تم سے اتار دیں گے اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کر دیں گے۔
لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (مائدہ۵:۱۲)	البتہ اگر تم نماز کھڑی کرو اور زکوۃ دو اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو اچھی طرح کا قرض دو گے تو میں تمہارے گناہوں کو اتار دوں گا اور تم کو ان جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ (احقاف۴۶:۱۶)	یہ وہ ہیں جن کے اچھے عمل کو ہم قبول اور ان کی برائیوں سے درگذر کریں گے۔

۲۔ توبہ کفارہ ہے: انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اس کا دل ہے، اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ناپاک بنتا ہے، انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگذاشتوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرم سار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بے زار ہو کر آئندہ کے لئے نکوکاری کا خدا سے مستحکم وعدہ کرلے تو اس کا نام توبہ ہے، یہ توبہ گنہ گار سے گنہ گار انسان کو بھی خدا کی آغوشِ محبت میں لا کر ڈال دیتی ہے، آدمؑ کا قصور اور پھر ان کی توبہ اور رحمتِ الٰہی کا رجوع، واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوشِ رحمت کس طرح گنہ گار انسان کو واپس لینے کے لئے ہمیشہ وا رہتی ہے، رحمتِ الٰہی کے اس پرجوش نظارہ کی جو کیفیت محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفۂ وحی اور پیامِ نبوت میں نظر آتی ہے، اس سے ہندوستان کا ہرمت اور دھرم قطعاً محروم، تورات خاموش، زبور کی سریلی آواز مدھم اور انجیل کی خوش خبری مبہم ہے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیامِ ربانی میں اس کی کیفیات اور اصول و شرائط کو جس شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا وہ گویا رب العالمین کی طرف سے رحمۃ للعلمین کا خاص حصہ تھا، فرمایا:

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا. (مریم ۱۹:۶۰)

مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے تو وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک توبہ کی بھلائی اس کے گناہوں کے سارے دفتر دھوکر ان کی جگہ آپ لے لے گی:

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ. وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا. (فرقان ۲۵:۷۰)

مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو یہ وہ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں میں بدل دے گا اور اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔

اور یہی اس کی شانِ رحمت کا اقتضا ہے یہاں تک کہ چور اور ڈاکو بھی اپنے گناہوں سے توبہ کریں تو ان کو بھی بشارت ہے:

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ. أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. (مائدہ ۵:۳۹،۴۰)

تو جس نے اپنے پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور اپنے کو سدھارا تو بے شک اللہ اس پر رجوع ہوگا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے کیا تجھے نہیں معلوم کہ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے جس کو چاہے معاف کرے اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قطعی اصول ظاہر فرما دیا کہ:

وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ. (طٰہٰ ۲۰:۸۲)

اور بے شک میں اس کو بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے اور پھر راہ پر چلا۔

لیکن توبہ کس کے لئے ہے اور کس شرط کے ساتھ ہے:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا. وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ

اللہ کو ان کی توبہ قبول کرنی ضرور ہے جو نادانی سے برا کام کرتے ہیں پھر جلد توبہ کرتے ہیں تو یہی وہ ہیں جن کو اللہ معاف کرتا ہے اور اللہ سب جانتا ہے اور حکمت والا ہے اور ان کی توبہ نہیں ہے جو برے کام کرتے جاتے ہیں

السَّیِّاٰتِ حَتّٰی اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْئٰنَ وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَھُمْ کُفَّارٌ (نساء ۴: ۱۷، ۱۸)

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئی تو اس نے کہا اب میں نے توبہ کی اور نہ ان کی توبہ ہے جو کافر ہو کر مریں۔

مقصود یہ ہے کہ توبہ کے بعد اس بندہ کے دل میں آئندہ تلافی اور تدارک کا احساس بھی موجود ہو اور ظاہر ہے کہ موت کے وقت یہ احساس ممکن ہی نہیں، ہاں اگر وہ توبہ اپنے احساس کے اثر سے کرے اور اس کے بعد اتفاقاً موت آ جائے تو یقیناً رحمتِ الٰہی اس کے قبول کرنے میں تامل نہ کرے گی:

وَالَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِھَا وَاٰمَنُوْٓا اِنَّ رَبَّکَ مِنْ بَعْدِھَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ. (اعراف ۷: ۱۵۳)

اور جنہوں نے برے کام کئے پھر اس کے بعد باز آئے (توبہ کی) اور یقین کیا تو بے شک تیرا پروردگار اس کے بعد بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَہٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰہَ یَجِدِ اللّٰہَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا. (نساء ۴: ۱۱۰)

اور جو کوئی برا کام کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے پھر اللہ سے اپنے گناہ کی معافی چاہے تو وہ اللہ کو بخشش والا اور رحم کرنے والا پائے گا۔

۳۔ مصائب کی تنبیہ اور کفارہ: دنیا میں انسان کو مصائب سے زیادہ بری اور تکلیف دہ چیز کوئی دوسری نہیں معلوم ہوتی لیکن یہ حقیقت بھلانے کے لائق نہیں کہ افراد بلکہ جماعتیں اور قومیں بھی مصائب ہی کی تنبیہ اور سرزنش سے متنبہ اور ہشیار ہو کر آمادۂ اصلاح ہوتی ہیں، چنانچہ اکثر اخلاقی محاسن کے جوہر کو مصیبتوں ہی کی آگ نکھار کر کندن بناتی ہے، صبر، استقلال، تواضع، شکر، محبت اور رحم ان تمام اخلاقی فضائل کی تربیت ان ہی مصائب کے زیرِ سایہ ہوتی ہے، مغرور سے مغرور انسان بھی جب کسی اتفاقی مصیبت کی ٹھوکر کھاتا ہے تو سنبھل جاتا ہے، اس لئے غافل انسانوں اور خود فراموش سرمستوں کو ہوش میں لانے کے لئے کبھی کبھی کی مصیبتوں سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں کہ ان کی بہ دولت ملحد سے ملحد انسان بھی ایک دفعہ بے قرار ہو کر خدا کا نام لے ہی لیتا ہے۔

دولت ونعمت اور کامیابی ومسرت وہ شراب ہے جس کے نشہ کا اتار اتفاقی مصائب ہی کی ترشی سے ہو سکتا ہے، انسان خدا کو کتنا ہی بھولا ہوا اور اپنی دولت وثروت پر کتنا ہی نازاں ہو لیکن جب وہ کسی افتاد سے دوچار ہوتا ہے تو دفعتاً اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، بیماری، تنگ دستی، عزیزوں کی

موت، آرزوؤں کی ناکامی ان میں سے ہر چیز وہ ٹھوکر ہے جس کو کھا کر سرمست سے سرمست راہ گیر بھی ایک دفعہ چونک کر ہشیار ہو جاتا ہے اور اس کو اپنے راستہ کی غلطی معلوم ہو جاتی ہے، اس لئے ان مصائب میں انسانوں کے اعمالِ بد اور گناہوں کا کفارہ بننے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ اس تھوڑی تکلیف سے بندہ میں جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ بڑی بیش قیمت چیز ہے۔

قرآن پاک نے اس نکتہ کو جا بجا بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہ گاروں کو اس سے پہلے کہ ان کو ہلاک کرے، مصائب کی آزمایشوں میں ڈالتا ہے تاکہ شاید وہ اپنے بھولے ہوئے مالک کو یاد کریں اور اپنی غلط روی پر متنبہ ہو کر اپنی ہدایت واصلاح کی فکر کریں، فرمایا:

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ. (اعراف ۷: ۱۳۰)	اور بے شک ہم نے فرعون والوں کو قحطوں اور پھلوں کی کمی کی مصیبت میں گرفتار کیا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

بنی اسرائیل کے متعلق ہے:

وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ. (اعراف ۷: ۱۶۸)	اور ہم نے ان کو نعمتوں اور مصیبتوں کے ساتھ آزمایا تاکہ وہ شاید باز آئیں۔

اسی سورہ میں ایک اور جگہ اس اصول کو ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ. (اعراف ۷: ۹۴)	اور ہم نے کسی آبادی میں کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن وہاں کے رہنے والوں کو سختیوں اور مصیبتوں میں گرفتار کیا تاکہ وہ شاید گڑگڑائیں۔

مسلمانوں سے فرمایا گیا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ. الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْآ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ. اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَ	اور البتہ ہم تم کو تھوڑے خوف، بھوک اور دولت کی اور جانوں کی اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے اور ان صابروں کو خوش خبری سنا کہ جن کو جب کوئی مصیبت ستاتی ہے تو کہتے ہیں ہم خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں یہ وہ ہیں جن پر اللہ کی برکتیں اور رحمتیں

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ. (بقرہ۲: ۱۵۵-۱۵۷) ہوں گی اور یہی سیدھی راہ پائے ہوئے ہیں۔

اس اصول کے تحت میں آنحضرت ﷺ نے اس کے متعدد جزئیات بیان فرمائے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءً یُّجْزَ بِہٖ (نساء۴: ۱۲۳) (جو کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ اس کو دیا جائے گا) تو میں نے آنحضرت ﷺ سے اس کا مطلب پوچھا، فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے عتاب ہے، اس کا بدلہ دنیا میں بندہ کی ہر تکلیف سے پورا ہو جاتا ہے جیسے اس کو بخار آ جائے یا وہ کسی اور مصیبت سے دوچار ہو جائے، یہاں تک کہ جیب میں کوئی چیز رکھ کر بھول جائے اور اس سے جو تکلیف اس کو پہونچے وہ تکلیف بھی کفارہ بن جاتی ہے، یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے اس طرح صاف ستھرا ہو کر نکلتا ہے جیسے بھٹی سے سونا(۱)، دوسری حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کو کوئی مصیبت پیش نہیں آتی لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے، یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی کفارہ بن جاتا ہے، تیسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کو کوئی تکلیف یا بیماری یا غم یا اذیت نہیں پہنچتی لیکن یہ کہ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی۔'' چوتھی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کو کوئی تکلیف کانٹا چبھنے سے لے کر اوپر تک جتنی بھی پہنچے اللہ تعالیٰ اس سے اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے جیسے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں'' (۲) پانچویں روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا میں جو مسلمان کسی جرم کا مرتکب ہوا اور اس کی سزا یہیں مل گئی تو وہ اس کے لئے کفارہ اور اس کو اس گناہ سے پاک و صاف بنانے والی ہے۔ (۳)

سطورِ بالا سے ہویدا ہے کہ کوئی انسان جو اقرارِ توحید کے بعد گناہ سے ملوث ہو گیا ہو، دنیا میں توبہ، اعمالِ نیک اور مصائب پر صبر و شکر کے ذریعہ سے نجات پا سکتا ہے اور اس دنیا سے اسی طرح پاک و صاف ہو کر نکل سکتا ہے کہ موت کے بعد اس کو کسی نئے کفارۂ گناہ کی ضرورت پیش نہ آئے۔

---

(۱) یہ اور اس کی ہم معنی حدیثیں اکثر کتب حدیث میں ہیں مثلاً ترمذی تفسیر اواخر النساء ج۲ ص۱۳۴، سنن ابی داود، اوائل کتاب الجنائز ج۲ ص۳۶ مطبع کستلیہ (۲) صحیح بخاری اوائل کتاب المرضی میں یہ تینوں روایتیں ہیں ج۲ ص۸۴۳۔

(۳) صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیۃ باب قول اللہ قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا الخ ج۲ ص۱۱۱۳۔

اسی لئے قرآن پاک میں ہے:

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ.

(سجدہ ۳۲:۲۱)

اور ہم البتہ ان کو بڑے عذاب کے پہلے ادنی عذاب کا کچھ مزہ چکھائیں گے تاکہ وہ اب بھی باز آئیں۔

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ عذابِ الٰہی کا مقصد انتقام اور نفسِ سزا اور عقوبت نہیں بلکہ شریر نفس کو راہ راست پر لانا ہے، اسی لئے ایک اور آیت میں فرمایا:

مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا.

(نساء ۴:۱۴۷)

اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا (نیکیوں کا) قبول کرنے والا (تمہارے ہر عمل کو) جاننے والا ہے۔

الغرض یہ عذاب اس دنیا میں آئندہ گناہوں سے بچانے اور گذشتہ گناہوں سے پاک کرنے کے لئے ہوتا ہے اور عالم برزخ اور عالم بعث چوں کہ نئے عمل کے محل نہیں، اس لئے ان دونوں مقاموں میں آیندہ کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوسکتا، صرف گذشتہ بداعمالیوں کی سزا بھگت کر ان کے نتائج سے نجات مل سکتی ہے اور یہی عالمِ برزخ اور عالمِ بعث کے عذابوں کا مقصد ہے الّا یہ کہ پروردگارِ عالم خود اپنی رحمت سے نوازے اور معاف فرمائے۔

عذاب برزخ بھی کفارہ ہے: لیکن اگر کسی انسان کے اندر گناہوں کی ناپاکیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اس کی دنیاوی زندگی کے تمام کفارے بھی اس کو دھو کر پاک وصاف نہ بنا سکے تو اس کو اپنے مرنے کے بعد بھی برزخ کے عالم میں اپنے اعمالِ بد کی مناسب سزاؤں کی صورتوں میں تکلیفیں اٹھا کر پاک وصاف بننا پڑے گا یہی عالمِ برزخ کا عذاب ہے، اس سے ظاہر ہوگا کہ عالمِ برزخ کی یہ سزائیں اس لئے ہیں کہ ہم نے دنیا میں اپنی ناپاک خواہشوں اور ناپاک کاموں سے احتراز کرنے کی جو زحمت نہیں اٹھائی اور اچھے کاموں کے کرنے میں جو تھوڑی تکلیف پیش آتی ہے، اس کو برداشت کر کے اچھے کام جو نہیں کئے ان دونوں کے معاوضہ میں عالمِ برزخ میں آکر عذاب کی تکلیفیں اٹھائیں، تاکہ حیاتِ ثانی کے دروازہ پر پہنچ کر بھی اگر ہم ان سزاؤں کے ذریعہ پاک وصاف ہوسکیں تو پاک وصاف ہو کر اپنی موروثی بہشت کے قابل بن سکیں جو صرف پاکوں اور بے گناہوں کی

جگہ ہے، یعنی ان کی ہے جو یا سرے سے کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں یا یہ کہ گناہ کے مرتکب ہوئے مگر اعمالِ نیک، توبہ اور مصائب میں صبر و شکر کر کے یا برزخ میں سزا پا کر وہ گناہوں کے داغ سے نجات پا گئے۔

یہ بات کہ عذابِ برزخ بھی ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے، اسلام کے اس اصول سے مترشح ہے کہ ایک مسلمان کی ہر تکلیف اس کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ ہے، اس بنا پر عذابِ برزخ بھی اس کے گناہ کا کفارہ ہوگا، قرآن پاک کی بعض آیتوں سے یہ بات بھی کنایتاً نکلتی ہے۔

گنہ گار حشر کے دن کہیں گے:

وَبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِیْٓ اَجَّلْتَ لَنَا (انعام ۶:۱۲۹)	اور ہم مقررہ وقت جس کو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا، پہنچ چکے۔

اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ وہ حشر سے پہلے عذاب کے ایک دورے کو ختم کر چکے۔

بعض حدیثوں میں بھی اس کنایہ کی تصریح ملتی ہے، کنز العمال میں ایک حدیث ہے:

عن ابن عمر، طول مقام امتی فی قبورھم تمحیص لذنوبھم. (کنز العمال باب عذاب القبر ج ۸ ص ۹۶)	ابن عمر سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میری امت کے لوگوں کا اپنی قبروں میں طول قیام ان کو گناہوں سے خالص کرتا ہے۔

اسی لئے ایک اور حدیث میں آیا ہے:

اکثر عذاب امتی فی قبورھم. (۱)	میری امت کے لوگوں کو زیادہ تر عذاب ان کی قبروں میں ہوگا۔

اس حدیث کا (اگر وہ ثابت ہو تو) منشا یہ ہے کہ امت محمدیہ کے اکثر افراد اسی برزخ کے محدود زمانۂ عذاب میں نکھر کر اور پاک و صاف ہو کر جنت کے قابل ہو جائیں گے اور عذابِ دوزخ کی ضرورت ان کو پیش نہ آئے گی، حافظ ابن قیم ایک موقع پر لکھتے ہیں:

فان وفت بالخلاص منها فی هذه الدار والا ففی البرزخ. فان وفی بالخلاص والا ففی موقف القیامة و اهوالها ما یخلصهم من تلک البقیة. (۲)	اگر ان بیماریوں کا یہ علاج اس دنیا میں نجات کے لئے پورا ہو گیا تو خیر ورنہ برزخ کی سزا سے علاج کیا جائے گا تو اگر یہ نجات کے لئے کافی ہو گیا تو خیر ورنہ پھر قیامت کا مقام اور اس کی ہولناکیاں باقی بیماریوں سے نجات دلوائیں گی۔

---

(۱) اس حدیث کو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغۃ، باب الوقائع الحشریۃ ج ۱ ص ۲۹ مصر میں نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا ماخذ معلوم نہ ہو سکا (۲) شفاء العلیل لابن القیم مطبعہ حسینیہ مصر ۱۳۲۳ ہجری ص ۲۵۴۔

رویائے برزخ کی حدیثوں میں جو پہلے مفصل گذر چکی ہے وہ منظر دکھایا گیا ہے جس میں گنہ گار عذاب کے دور سے نکل کر اور نہر حیات میں نئی زندگی پا کر بہشت کے مستحق قرار پائے ہیں، (۱) غالباً ان ہی نجات پانے والے مومنوں کو دیکھ کر مشرکین بھی قیامت میں یہ کہیں گے:

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ۚ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُم مِّنَ الْإِنسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيَاؤُهُم مِّنَ الْإِنسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ لَنَا (انعام ۶:۱۲۸)

اور جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا، اے گروہ جن! تم نے بہت سے انسانوں کو اپنا بنالیا اور ان کے دوست انسان کہیں گے کہ ہمارے پروردگار ہم میں سے ایک نے دوسرے سے کام نکالا اور ہم مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لئے ٹھہرایا تھا پہنچ چکے۔

یہ الفاظ کہ ہم اپنے مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا پہنچ چکے، یہ معنی رکھتے ہیں کہ عالم برزخ کا مقررہ دورۂ عذاب ہم ختم کر چکے اور اب حشر ونشر کے عذاب کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، اس لئے بعض دوسرے نیک بختوں کی طرح ہم کو بھی اب چھٹکارا ملے، جواب ملے گا:

قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ. (انعام ۶:۱۲۸)

فرمائے گا آتش دوزخ تمہارا ٹھکانا ہوا اس میں سدا رہو گے لیکن یہ کہ جو اللہ چاہے، بے شک تیرا رب حکمت اور علم والا ہے۔

اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تمہارا دورۂ عذاب ختم نہیں ہوا ہے اور تمہاری پاکیزگی ابھی کامل نہیں ہوئی اس لئے ابھی اس دوسرے عالم کا عذاب بھی تم کو سہنا ہے، پھر جب خدا چاہے گا تم کو اس سے نجات دے گا، اس کا ہر کام علم وحکمت پر مبنی ہے، اس کے علم وحکمت اور مصلحت کا جب تقاضا ہو گا تم کو نجات ملے گی۔ (۲)

عذاب دوزخ کفارۂ گناہ ہے: ابھی یہ آیت اوپر گذر چکی ہے:

مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا. (نساء ۴:۱۴۷)

خدا کو تمہارے عذاب سے کیا کام اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا تمہاری شکر گذاری کو قبول کرنے والا اور (تمہارے دلوں کے حال کو) جاننے والا ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب التعبیر باب تعبیر الرویا بعد صلوٰۃ الصبح ج۲ص۱۰۴۴ (۲) حسب تفسیر ابن عباس، ابن جریر طبری ج۸ص۲۴ مصر۔

اس سے ابھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو گنہ گاروں کے عذاب سے کوئی خوشی نہیں حاصل ہوتی، نہ وہ چاہتا ہے کہ اس کے گنہ گار بندے اس عذاب میں مبتلا ہوں لیکن ازل سے اس نے اپنے جو قانون مقرر کر دئے ہیں وہ ان کو توڑتا بھی نہیں جس وقت آدم کو جنت کی سرزمین سے نکال کر اس دنیا میں اس لئے بھیجا گیا کہ وہ اپنے عمل کے استحقاق سے اس جنت کو دوبارہ ہمیشہ کے لئے حاصل کریں اسی وقت یہ قانون بھی ان کو سنا دیا گیا تھا:

اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ. (بقرہ ۲:۳۹،۳۹)	یہاں سے تم سب اترو تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت اترے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جنہوں نے ناشکری کی اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو وہی دوزخ والے ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اس آیت میں مستحقِ دوزخ ہونے کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں، ایک کفران اور دوسری تکذیب، دیکھو کہ اوپر کی نساء والی آیت میں عذابِ دوزخ سے نجات پانے کی دو شرطیں، شکر اور ایمان ان کے بالکل بالمقابل ہیں، اس سے ظاہر ہوا کہ شکر اور ایمان استحقاقِ جنت کی شرطیں اور کفران اور تکذیب استحقاقِ دوزخ کے اسباب ہیں، بقیہ تمام نیکیاں شکر اور ایمان کے فروع اور تمام برائیاں کفر اور تکذیب کی شاخیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لئے نہیں بنایا کہ وہ ان کو پیدا کر کے دوزخ کا ایندھن بنائے، بلکہ اس نے تو ان کو اپنی رحمت کے ظہور کے لئے پیدا کیا، غیظ و غضب کے اظہار کے لئے نہیں، فرمایا:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا. لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ	ہم نے یہ امانت آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا تا کہ اللہ نفاق کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں اور شرک کرنے والے اور شرک کرنے والیوں کو سزا دے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر وہ اپنی رحمت کے ساتھ رجوع ہو اور

غَفُوْرًا رَّحِیْمًا. (احزاب ۳۳:۷۲،۷۳) اللہ تو بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔

اس آیتِ پاک سے صاف ہویدا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اصلی صفت یہی ہے کہ وہ غفور و رحیم ہے، یعنی بخشش و رحمت اس کی صفتِ ذاتی ہے، اب اگر کوئی اپنے آپ پر ظلم کر کے گناہ کرتا ہے اور اس لئے وہ اپنے کو رحمتِ الٰہی سے دور کر لیتا ہے تو یہ خود انسان کا فعل ہے:

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ. (توبہ ۹:۷۰) اللہ نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے ہیں۔

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ. (مومن ۴۰:۱۳) اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔

غرض جو کچھ ہے وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہے:

لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى. (طٰہٰ ۲۰:۱۵) کہ ہر جان کو اپنے ہی کئے کا بدلہ دیا جائے گا۔

اس لئے بہشت یا دوزخ جو کچھ ہے انسان کے اپنے ہی عمل کا لازمی نتیجہ ہے، جس طرح دنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے، مثلاً کھانے کا نتیجہ شکم سیری، پینے کا سیرابی، بھوک کا تکلیف، بیماری کا بے آرامی، گرنے کا چوٹ، زہر کا موت، شہد کا مٹھاس، غرض ہر اچھے یا برے فعل کا ایک لازمی جسمانی نتیجہ ہے جو دنیا میں ہمارے عمل کے بعد ہم کو ملتا رہتا ہے، اسی طرح ہم کو اپنے اعمال کا ایک روحانی نتیجہ بھی لازمی ملنے والا ہے، جو ہم کو اس دوسرے عالم میں ملے گا، تو جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر مر کیوں گئے یا گرنے سے ہم کو چوٹ کیوں آئی، اسی طرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہم کو ان اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی کہ دونوں ہمارے اعمال کے یکساں لازمی نتیجے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی غایتِ رحمت سے ہم کو اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرما دیا ہے، ہم کو اس کے نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشا، عقل عنایت کی، ضمیر عطا کیا، پھر نبی اور رسول بھیجے، شریعت دی، کتاب مرحمت فرمائی، اس پر بھی اگر ہم باز نہ آئے اور ان اعمال کا ارتکاب کیا تو اب ہم کو ان اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ. یہ رسول بھیجے، نیکوں کو خوش خبری سنانے والے اور بدکاروں کو ہشیار کرنے والے تاکہ خدا پر انسان کی حجت

باقی نہ رہے۔ (نساء۴: ۱۶۵)

پھر اپنی رحمت سے سب سے آخر میں اپنی رحمت کے کامل مظہر کو دنیا میں بھیجا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ. (انبیاء۲۱: ۱۰۷)

ہم نے تجھ کو (اے پیغمبر) ساری دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔

لیکن ظالم و نادان انسانوں نے اس رحمت کے قبول سے انکار کیا اور طرح طرح کی بدعقیدگیوں اور بداعمالیوں سے اپنے کو برباد کیا اور جس غرض سے خدا نے ان کو پیدا کیا تھا اس سے اعراض کیا اور اپنے کو خود اپنے ہاتھوں سے ہلاکت و بربادی میں مبتلا کیا:

وَمَا کَانَ رَبُّکَ لِیُھْلِکَ الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَّاَھْلُھَا مُصْلِحُوْنَ. وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ. اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّکَ ؕ وَلِذٰلِکَ خَلَقَھُمْ (ہود۱۱: ۱۱۷، ۱۱۹)

اور نہ تھا تیرا رب جو آبادیوں کو ظلم سے ہلاک و برباد کرتا درآں حالے کہ ان کے رہنے والے نکوکار ہوتے اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو (زبردستی) ایک راہ پر کر دیتا (لیکن وہ ایسی زبردستی نہیں کرتا) اور وہ یوں ہی ہمیشہ اختلافات میں رہتے ہیں مگر جن پر تیرے رب کا رحم ہوا اور اسی واسطے ان کو پیدا کیا۔

اس آیت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو رحمت کے لئے بنایا ہے، عذاب کے لئے نہیں لیکن انسان خود اپنے عمل سے خدا کی رحمت کے بجائے اس کے عذاب کا سزاوار اپنے کو ٹھہرا لیتا ہے، اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

للرحمۃ خلقھم ولم یخلقھم للعذاب. (طبری جلد۱۲ص۸۱مصر)

خدا نے انسانوں کو رحمت کے لئے پیدا کیا عذاب کے لئے نہیں۔

لیکن اگر ظالم و نادان انسان نے خدا کی ان پے در پے رحمتوں کے باوجود اپنے کو اس کی رحمت کا مستحق نہ بنایا تو کیا وہ خدائے رحمان و رحیم جس کا یہ اعلان ہے:

کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ. (انعام۶: ۱۲)

اس خدا نے (مخلوقات پر) رحمت کو اپنے اوپر واجب کر لیا ہے۔

سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِہِ

تم پر سلامتی ہو تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر فرض

الرَّحْمَةَ (انعام ۶:۵۴)	ٹھہرالیا ہے۔
وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف ۷۔۱۵۶)	اور میری رحمت نے ہر چیز کو سمالیا ہے۔
وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ (کہف ۱۸:۵۸)	اور تیرا پروردگار بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔
وَرَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي.(۱)	اور میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی۔

وہ اپنے گنہ گار وسیہ کار بندوں سے ہمیشہ کے لئے اپنا منہ موڑ لے گا حالاں کہ اس کی رحمت کسی غرض سے نہیں بلکہ بے غرض ہے، فرمایا:

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ (انعام ۶:۱۳۳)	اور تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے۔

اور تسلی دی ہے:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ	اے میرے وہ بندو! جنھوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا
لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ	ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو، خدا سب گناہوں کو
الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ.	معاف کرتا ہے بے شک وہی بخشنے والا، رحمت والا ہے۔
(زمر ۳۹:۵۳)	

اس کی رحمت کا ظہور جس طرح اس دنیا میں ہوا ہے اس دنیا میں بھی ہوگا اور وہاں اس کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر اس کے مقامِ لعنت (دوزخ) سے دوری اور اس کے مقامِ رحمت (بہشت) سے قرب ہے فرمایا:

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَذٰلِكَ	جس سے خدا کا عذاب ہٹایا گیا وہی ہے جس پر اس نے
الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ. (انعام ۶:۱۶)	رحمت کی اور اس کی رحمت کا یہ حصول ہی کھلی کامیابی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ان پے بہ پے رحمتوں کا یہ تقاضا ہے کہ وہ گنہ گاروں کو زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان کے نتائج عمل کے بھگت لینے کے بعد آخر کار اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے اور وہ ان کو اپنی بخششوں سے سرفراز فرمائے۔

دوزخ قید خانہ نہیں شفا خانہ ہے: انسان جب عدم حفظِ صحت کی غلط کاریوں کے سبب سے بیمار ہوجاتا ہے تو اکثر یہی سمجھا جاتا ہے کہ فطرت نے اس کو ان کے معاوضہ میں بیماری کی تکالیف

(۱) صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیۃ باب وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا الخ ج ۲ ص ۱۱۱۰۔

کی سزائیں دی ہیں، مگر واقعہ یہ نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان غلط کاریوں کے جو برے نتائج انسان کے جسم کے اندر پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کرنے کے لئے جسم جد و جہد کرتا ہے، اس لڑائی کا نام بیماری اور اس لڑائی کی کشمکش کا نام بیماری کی تکالیف و آلام ہے، جن کو ہم دردِ سر، دردِ شکم، اعضا شکنی اور بے خوابی وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، یہی روحانی بیماریوں کا حال ہے جن کو ہم اصطلاحِ شرعی میں گناہ اور جن کے نتائجِ بد کو عذاب کہتے ہیں، یہ نتائج آتشِ دوزخ اور اس کے شدائد و آلام کی صورت میں ظاہر ہوں گے اور جن کا منشا یہ ہوگا کہ روحِ انسانی اپنی غلط کاریوں کے نتائجِ بد کو دور کرنے کے لئے جد و جہد میں مصروف ہوگی اور جونہی وہ ان سے عہدہ برآ ہوگی خدا کی رحمت سے سرفرازی پا کے اس عذاب سے نکل کر اپنی موروثی بہشت میں داخل ہوگی۔

اس تمہید سے یہ ظاہر ہے کہ دوزخ کی مثال یہ نہیں ہے کہ وہ مجرموں کے لئے قید خانہ ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ بیماروں کے لئے شفا خانہ ہے، بیمار کو شفا خانہ کے اندر بھی ہر قسم کی تکلیفیں محسوس ہوتی ہیں، درد، اعضا شکنی، شدتِ تشنگی، سوزشِ جسم، وہاں اس کو کڑوی سے کڑوی غذا پلائی جاتی ہے، بدمزہ سے بدمزہ کھانا کھلایا جاتا ہے، ضرورت ہوتی ہے تو اس کو نشتر دیا جاتا ہے، اس کا کوئی عضو کاٹا جاتا ہے، کوئی داغا جاتا ہے اور ان سب کی تکلیفیں اس کو اٹھانی پڑتی ہیں، مگر یہ ساری ایذا رسانی کسی انتقام اور تکلیف دہی کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ عدمِ صحت کی غلط کاریوں کے برے نتائج سے اس کے جسم کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کی جاتی ہے، اس کو جو تکلیفیں وہاں محسوس ہوتی ہیں وہ گو شفا خانہ کے اندر ہی محسوس ہوتی ہیں مگر ان سب کا سبب شفا خانہ نہیں بلکہ خود اس بیمار کا اصولِ صحت سے دانستہ یا نادانستہ انحراف کرنا اور اس کی وجہ سے ان بیماریوں میں مبتلا ہونا ہے۔

یہ اصول ان آیتوں اور صحیح حدیثوں سے پوری طرح سمجھ میں آتا ہے جن میں بالآخر عذابِ دوزخ سے نجات پانے کی کیفیت بیان کی گئی ہے، دنیاوی آلام و تکالیف کی نسبت قرآن نے یہ اصول پیش کیا ہے:

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ. (آل عمران ۳:۱۴۱)	اور تاکہ خدا ایمان والوں کو پاک و خالص کرے اور کافروں کو مٹائے۔

یہی اصول عذابِ اخروی پر صادق آتا ہے کہ اس سے بھی مقصود گنہ گار اہلِ ایمان کی پاکی و

صفائی ہے، چنانچہ حدیثِ صحیح میں ہے کہ حقوقِ عباد کے بعد:

حتی اذا ھذبوا ونقوا اذن لھم فی دخول الجنۃ. (صحیح بخاری کتاب الرقاق باب القصاص یوم القیامۃ ج۲ص ۹۶۷)	یہاں تک کہ جب گنہ گار چھٹ جائیں گے اور پاک و صاف ہوجائیں گے تب ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی۔

اس حدیث میں یہ دو لفظ ھذبوا و نقوا ذرا تشریح طلب ہیں۔ ھذبوا کا مصدر تھذیب ہے، تہذیب کے لغوی معنی یہ ہیں کہ درختوں کی خراب شاخیں اس لئے چھانٹ دی جائیں تا کہ ان میں سرسبزی وشادابی پیدا ہو اور ترقی کی نئی زندگی ان کو مل جائے اور نقوا کا مصدر تنقیہ ہے، تنقیہ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے اندر سے خراب و فاسد مادہ کو الگ کردیا جائے تا کہ وہ پوری طرح نکھر جائے، اس تشریح سے صاف کھل گیا کہ گنہ گاروں کو جنت کے داخلہ کے لئے کیا درکار ہے، اسی لئے قرآن پاک میں ہے کہ اہلِ جنت جب جنت کے قریب پہنچیں گے تو ندا آئے گی:

طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ. (زمر۳۹:۷۳)	تم پاک وصاف ہو چکے تو جنت میں سدا کے لئے آجاؤ۔

الغرض جب اس طیب و پاکیزگی کا دور آئے گا تو گنہ گاروں کو بھی نجات ملے گی، اسی لئے ہر گنہ گار کے لئے دوزخ سے نکلنے کی مدت خواہ کتنی ہی طویل ہو مگر بہر حال اس کی انتہا ہے، فرمایا:

لٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا. (نبا۷۸:۲۳)	دوزخ میں وہ صدہا سال تک پڑے رہیں گے۔

لیکن بالآخران صدہا سال کا بھی ایک دن خاتمہ ہوگا اور خدا نے چاہا تو ان کو نجات ملے گی۔

حدیث رویائے برزخ میں ہے کہ آپ ﷺ نے دوزخ میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جنہوں نے کچھ اچھے اور کچھ برے کام کئے تھے، ان کا آدھا دھڑ تو نہایت خوب صورت اور آدھا سخت بدصورت تھا جب ان کی سزا کی مدت ختم ہوئی تو فرشتوں نے ان سے کہا کہ جاؤ اور اس نہر میں جا کر پڑ جاؤ، سامنے وہ نہر تھی جس میں خالص سپید پانی بہہ رہا تھا وہ اس میں جا کر پڑ گئے، پھر نکل کر آئے تو ان کی وہ بدصورتی جاتی رہی اور نہایت خوبصورت ہوگئے،(۱) اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت کیوں کر گنہ گاروں کو سرفراز فرمائے گی۔

گویا دوزخ بھی ایک نعمت ہے: اس تفصیل کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ قیامت اور دوزخ

(۱) صحیح بخاری کتاب التعبیر باب تعبیر الرویا بعد الصبح ج۲ص ۱۰۴۴۔

کی ہول ناکیاں اور سزائیں بھی گنہ گاروں کے لئے اللہ تعالیٰ کی اسی طرح نعمت ہیں جس طرح اس دنیا میں شفاخانوں کا وجود بیماروں کے لئے نعمت ہے، اگر دوزخ نہ ہوتی تو گنہ گاروں کی پاکیزگی اور پاکوں کی جنت میں ان کے داخل ہونے کی کوئی صورت نہ تھی، اس رحمان ورحیم کی رحمت وکرم نے گوارا نہ کیا کہ ان بدبختوں کو ان کی نافرمانیوں کے باوجود ہمیشہ کے لئے محروم رکھا جائے، اس لئے ان کی صفائی کے لئے پہلے برزخ کا حمام مقرر کیا اور جو اس سے بھی پاک نہ ہو سکیں ان کے لئے دوزخ کی آگ مقرر کی کہ وہ اپنی ہر قسم کی بداعمالیوں کے میل کچیل کو جلا کر نکھر کر پاک ہو جائیں اور کندن بن کر بالآخر اپنی آبائی اور فطری وراثت (جنت) پائیں، اس نظریہ کو پیش نظر رکھ کر قرآن پاک کی ان آیتوں کو پڑھئے جن میں قیامت اور دوزخ کی ہول ناکیوں اور مصیبتوں کو بھی نعمت سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنتَصِرَانِ. فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ. فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ. فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ. فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْأَلُ عَن ذَنبِهِ إِنسٌ وَلَا جَانٌّ. فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ. يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ. فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ. هَٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ. يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ آنٍ. فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ. (رحمان ۵۵: ۳۵-۴۵)	تم پر آگ کے صاف اور دھواں ملے شعلے چھوٹیں گے پھر کوئی تمہاری مدد نہ کر سکے گا تو اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے، پھر جب آسمان پھٹ کر تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا تو اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے، پھر اس دن کسی انس وجن سے اس کے گناہ کی نسبت پوچھا نہ جائے گا تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ گنہ گار اپنی نشانیوں سے پہچان لئے جائیں گے پھر وہ اپنی پیشانیوں کے بال اور پاؤں سے پکڑے جائیں گے تو اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے، یہ وہ دوزخ ہے جس کو گنہ گار جھٹلاتے تھے، وہ اس دوزخ اور گرم پانی کے بیچ میں گشت کریں گے تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

ان آیتوں کی تفسیر کسی پہلو سے بھی کیجئے، یہ بات بہر حال ماننی پڑے گی کہ قیامت اور دوزخ کے ہول ناک احوال، مجرموں کے حق میں نعمت ہیں، اس لئے بھی کہ دنیا میں وہ ان کے ڈر سے برائیوں کو چھوڑ کر راہ راست پر آتے ہیں اور اس لئے بھی کہ آخرت میں وہ ان ہی کے ذریعہ سے

اپنے گناہوں کے نتائج بد سے بری ہوکر بہشتِ ربانی کے لائق بن سکیں گے۔

دوزخ میں رحمتِ الٰہی کا ظہور اور نجات: انسان اور وہ بھی اللہ کی توحید کا قائل اور رسولوں کی صداقت کا معترف خواہ کسی قدر گمراہ اور گنہ گار ہو، تاہم اس کے نامۂ اعمال میں کچھ نہ کچھ نیکیاں ضرور ہوں گی، قیامت گو اللہ تعالیٰ کے عتاب وجلال کا روز ہوگا جس میں ہر گنہ گار کو اپنی گنہ گاری کا ملزم ہونا پڑے گا، مگر بالآخر اس رحمان ورحیم کی شانِ رحیمی کا ظہور ہوگا اور رحمتی سبقت غضبی (۱) (اور میرے غصہ سے میری رحمت سبقت لے گئی ہے) کے اعلان کا مصداق شفاعت کی صورت میں جلوہ گر ہوگا ورنہ گنہ گاروں کو اس کی بہ دولت گناہوں کے داغ سے پاک وصاف ہوکر پاکوں کی بہشت میں داخلہ کی اجازت ملے گی، فرمایا:

وَمَنۡ يُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ وَيَعۡمَلۡ صَالِحًا يُّكَفِّرۡ عَنۡهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ (تغابن ۶۴:۹)	اور جو اللہ پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے اس سے اس کی برائیاں جھاڑ دے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا۔
وَاٰخَرُوۡنَ اعۡتَرَفُوۡا بِذُنُوۡبِهِمۡ خَلَطُوۡا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّتُوۡبَ عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ. (توبہ ۹:۱۰۲)	اور دوسرے لوگ جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور ملایا ایک کام نیک اور دوسرا بد، شاید اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرے، بے شک اللہ بخشنے والا، رحم والا ہے۔

اس معافی کی دوصورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ وہ بالکلیہ یعنی عذاب کے بغیر ہی معاف کردے، دوسرے یہ کہ وہ دوزخ میں کچھ دن جا کر خدا کی معافی سے سرفراز ہوکر اس سے نکلیں، فرمایا:

وَاِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتۡمًا مَّقۡضِيًّا. ثُمَّ نُنَجِّى الَّذِيۡنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيۡنَ فِيۡهَا جِثِيًّا. (مریم ۱۹: ۷۱،۷۲)	اور تم میں کوئی نہیں جو جہنم میں وارد نہ ہو، تیرے رب کا یہ ضروری فیصلہ ہے پھر ہم ان کو جو خدا سے ڈرے نجات دیں گے اور مشرکوں اور کافروں کو ہم اس میں گھٹنے کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔

احادیثِ صحیحہ میں اس کے متعلق آنحضرت ﷺ کی حسب ذیل تصریحات مذکور ہیں:

۱۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ شفاعت کے ذریعہ لوگ دوزخ سے چھوٹی ککڑیوں کے مانند نکلیں گے۔ (۲)

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الرد علی الجھمیة باب وَلَقَدۡ سَبَقَتۡ كَلِمَتُنَا الخ ج ۲ ص ۱۱۱۰۔ (۲) صحیح بخاری کتاب الرقاق باب صفة الجنة و النار ج ۲ ص ۹۷۰۔

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دوزخ سے کچھ لوگ اس کی جھلس کھا کر نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے۔(۱)

۳۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو خدا فرمائے گا کہ جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ کوئلے ہو کر نکلیں گے پھر وہ نہر حیات میں ڈال دیے جائیں گے تو وہ اس طرح اُگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اُگتا ہے۔(۲)

۴۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے قیامت کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا ''پھر میں سجدہ میں گر پڑوں گا اور پڑا رہوں گا تو آواز آئے گی کہ اے محمد! سر اٹھا مانگ، دیا جائے گا، تو میں سر اٹھاؤں گا اور اس حمد سے جو خدا مجھے سکھائے گا اس کی حمد کروں گا اور سفارش کروں گا تو خدا ایک حد مقرر فرمائے گا تو میں ان کو دوزخ سے نکالوں گا اور جنت میں داخل کروں گا، پھر لوٹ کر آؤں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا پھر وہ کچھ لوگوں کو بخش دے گا اسی طرح تیسری پھر چوتھی بار کروں گا یہاں تک کہ دوزخ میں پھر وہی رہ جائے گا جس کو قرآن نے روک رکھا ہے۔(صحیح بخاری کتاب الرقاق باب صفة الجنة و النار ج۲ ص۹۷۱)

۵۔ حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ محمد کی شفاعت سے کچھ ایسے لوگ دوزخ سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے جن کا نام جہنم والے ہوگا۔(ایضاً ص۲ ۹۷)

۶۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے سوال پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری سفارش سے سرفراز ہونے کی خوش قسمتی اس کو حاصل ہوگی جس نے خلوصِ قلب سے اللہ کی توحید کا اقرار کیا ہو۔(ایضاً)

۷۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلہ سے فراغت پائے گا اور چاہے گا کہ ان کو جنہوں نے اس کی توحید کی گواہی دی تھی، دوزخ سے نکالے، تو فرشتوں کو ان کے نکالنے کا حکم دے گا، فرشتے ان توحید والوں کو اس علامت سے پہچانیں گے کہ ان کی پیشانیوں میں سجدہ کے نشان ہوں گے کہ خدا نے آدم کے بیٹے کی پیشانی کے نشانِ سجدہ کو دوزخ کی

(۱) صحیح بخاری کتاب الرقاق باب صفة الجنة و النار ج۲ ص۹۷۰۔(۲) ایضاً۔

آگ پر حرام کر دیا ہے، تو وہ ان کو جلا نہ سکے گی، فرشتے جب ان کو نکالیں گے تو وہ جلے جھلسے ہوں گے پھر ان پر آبِ حیات چھڑ کا جائے گا تو وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے۔(ایضاًباب الصراط جسر جھنم ج۲ص ۹۷۳)

۸۔حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنت والے جنت اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہوچکیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ دیکھو جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہواس کو دوزخ سے نکالو تو وہ جل کر کوئلہ ہو کر نکلیں گے، پھر وہ نہرِ حیات میں ڈال دیے جائیں گے تو اس طرح وہ اگیں گے جس طرح سیلِ آب کے کنارے جنگلی دانا اگتا ہے۔(ایضاً کتاب الایمان باب تفاضل اھل الایمان ج۱ص ۸ و کتاب الرقاق باب صفة الجنة و النار ج۲ص ۹۷۰)

۹۔حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اہلِ دوزخ جو دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے وہ اس میں نہ مریں گے نہ جئیں گے لیکن وہ لوگ جن کو دوزخ کی آگ بعض گناہوں کی وجہ سے چھوئے گی تو وہ اس میں کچھ دیر کے لئے مرجائیں گے یہاں تک کہ وہ جل جائیں گے پھر ان کے حق میں شفاعت کی اجازت ہوگی تو وہ تھوڑے تھوڑے کر کے آئیں گے اور جنت کی نہروں میں پھیل جائیں گے اور اہلِ جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی بہاؤ تو وہ اس طرح اُگیں گے جیسے سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانے۔(صحیح بخاری کتاب الایمان باب تفاضل اھل الایمان ج۱ص ۸اور ج۲ کتاب الرقاق باب صفة الجنة و النار ص ۹۷۰ میں کسی قدر فرق کے ساتھ روایت ہے نیز صحیح مسلم کتاب الایمان باب اثبات الشفاعة الخ ج۱ص ۹)

۱۰۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے آخر میں جو شخص دوزخ سے نجات پا کر نکلے گا وہ گھسٹتا ہوا نکلے گا اور اس کو جنت بھری معلوم گی۔(صحیح بخاری کتاب الرقاق باب صفة الجنة و النار ج۲ص ۹۷۲ و صحیح مسلم کتاب الایمان باب اثبات الشفاعة ج۱ص ۹۰)۔

۱۱۔حضرت ابوسعید خدریؓ سے صحیحین میں روایت ہے کہ خدا فرمائے گا کہ ملائکہ نے سفارش کی اور پیغمبروں نے سفارش کی اور اہلِ ایمان نے سفارش کی اور اب صرف وہ رہ گیا جو تمام رحم

کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے یعنی خود وہ رحمان ورحیم، تو وہ دوزخ سے مٹھی بھر کر ان لوگوں کو نکالے گا جنہوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی۔ (صحیح بخاری کتاب الرد علی الجھمیة باب قول اللہ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ج ۲ ص ۱۱۰۷ و ۱۱۰۸)

۱۲۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ حکم ہوگا کہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا ہو اور اس کے دل میں جو برابر بھی نیکی ہو اس کو دوزخ سے باہر کرو، جس نے لا الہ الا اللہ کہا ہو اور گیہوں کے دانہ کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو اور جس نے لا الہ الا اللہ کہا ہو اور ذرہ برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو، اس کو دوزخ سے الگ کرو۔ (ترمذی (۱) ابواب صفة جھنم باب ماجاء ان للنار نفسین ج ۲ ص ۸۶ حدیث حسن صحیح)۔

احادیث کی کتابوں میں اس قسم کی اور بہت سی حدیثیں ہیں جن کا استقصا یہاں مقصود نہیں، ان تمام حدیثوں میں قرآن پاک کی اس اہم آیت کا جلوہ موجود ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (نساء ۴: ۱۱۶)

بے شک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا جو گناہ ہے وہ اس کو جس کے لئے چاہے گا معاف کردے گا۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ کے نتیجہ سے برأت کی جاسکتی ہے، مگر شرک وہ بیماری ہے جس کے نتائج سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں، اس لئے ان کے نتائج بد بھگتے بغیر نجات کا تصور بھی خدا کے قانونِ ابدی کے خلاف ہے۔

شرک وکفر کی بخشایش نہیں: احکامِ الٰہی اور شریعتِ ربانی کی کھلی ہوئی دو قسمیں ہیں، ایک کا تعلق دل اور قلب سے ہے اور جو بمنزلۂ اصل کے ہے، اس کو مذہب کی زبان میں ایمان، فلسفہ کی اصطلاح میں علم اور تصوف کی بولی میں عرفان کہتے ہیں اور دوسری قسم وہ ہے جو اس عقیدۂ اول کی فرع اور نتیجہ ہے اور جس کا تعلق اعضا اور جوارح سے ہے، اس کو ہم مختصراً عمل اور تفصیلاً عبادات ومعاملات اور اخلاق کہتے ہیں، شرک وکفر کے گناہ کا تعلق قسمِ اول سے ہے اور دوسرے گناہوں کا تعلق قسم دوم سے ہے، دلوں میں ایمان وعلم وعرفان کی اگر ایک کرن بھی ہو تو اس ظلمت کدہ کی روشنی کی امید کسی طرح کی جاسکتی ہے، مگر جس کا شانۂ دل میں اس نور کا ایک ذرہ بھی نہ ہو اس کی روشنی سے ہمیشہ کے لئے ناامیدی ہے، اسی لئے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہوجاتے ہیں اور جہاں ایمان کچھ بھی موجود

(۱) یہ روایت صحیح بخاری میں بھی حضرت انسؓ ہی کے واسطہ سے ہے مگر کسی قدر فرق کے ساتھ اور اس میں صیغہ يُخْرَجُ مجہول آیا ہے دیکھئے (کتاب الایمان باب زیادة الایمان و نقصانه ج ۱ ص ۱۱)"ض"۔

ہے، اعمالِ خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے البتہ اعمالِ شر کا بھی ساتھ ساتھ وجود ہے، جن کی تلافی عذابِ دوزخ کے بعد یا خدا کی رحمت سے ہوسکتی ہے اور نجات مل سکتی ہے، ایمان وعلم وعرفان جس کی حقیقت ایمان بالغیب ہے اس کا حصول موت کے بعد جب حقائق خود بخود ہمارے سامنے آجاتے ہیں، ہماری وسعت کا نتیجہ نہیں بلکہ خود ان حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہوگا، اس بنا پر شرک وکفر کے گناہ کی مغفرت کی امید قانونِ الٰہی کے مطابق ناممکن ہے، البتہ عمل کی کمی کی تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے، خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے۔

سمجھنے کے لئے ان دونوں کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ دنیا میں تعلیمی امتحان کے لئے ۳۳ نمبر کم از کم فرض کیا گیا ہے اب اگر کسی کا پرچہ بالکل سادہ ہے اور اس لئے اس کا نمبر صفر محض ہے تو رحم دل سے رحم دل ممتحن کے لئے بھی یہ ناممکن ہے کہ اس کو ادنا سے ادنا درجہ میں بھی کامیاب کر سکے لیکن جس نے کچھ جوابات لکھے ہیں اور کچھ چھوڑ دئے ہیں اور کچھ غلط لکھے ہیں تو اگر وہ ۲۹، ۳۰ کے قریب بھی پہنچ گیا ہے تو رحم دل ممتحن ۳۳ تک اس کو پہنچا کر ادنا درجہ میں کامیاب بنا سکتا ہے۔

الغرض ایمان وعلم وعرفان کے مجرم جن کا نام مشرک وکافر ہے، اپنے ناقابلِ تلافی نتیجہ کے بھگتے بغیر عذاب دوزخ سے رہائی کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی دنیاوی زندگی کا عرفانی فقدان رحمتِ الٰہی کو اپنی طرف جذب کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا، مگر کیا شرک وکفر کے گنہ گاروں کے لئے شرک وکفر کے دورۂ عذاب کے طے کرلینے کے بعد بھی رہائی کا تصور کیا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب آئندہ سطروں میں ملے گا؟

کیا دوزخ کی انتہا ہے: دوزخ جو عقابِ الٰہی کا گھر ہے کیا ہمیشہ آباد رہے گا؟ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کے قائلوں کے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے (۱) ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ

(۱) ابتدائی اسلامی فرقوں میں جہنم کی ابدیت اور غیر ابدیت پر بہت سے مناظرے ہو چکے ہیں جن کی تفصیل ملل ونحل کی کتابوں میں موجود ہے، ایک دو کو چھوڑ کر اس پر تو بے شبہہ قطعیت کے ساتھ سب کا اتفاق ہے کہ جنت کا وجود دائمی اور ابدی ہے لیکن جہنم کے دوام اور ابدیت میں کسی قدر اختلاف ہے، عام اہلِ سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ جہنم اور جنت دونوں کا وجود دائمی ہے، گنہ گار مومن اپنے گناہ کے بہ قدر عذاب اٹھا کر یا خدا کی رحمت سے معاف ہو کر بالآخر جنت میں داخل کئے جائیں گے، لیکن مشرک وکافر کے گناہ کبھی معاف نہ ہوں گے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں جلیں گے، فقہا اور محدثین کا ایک گروہ جو مرجیہ کہلاتا ہے اس بات کا قائل ہے جو مومن ہوگا وہ گنہ گار بھی ہوگا تو بھی دوزخ میں نہ جائے گا، بلکہ معافی سے سرفراز ہو کر شروع ہی سے جنت میں داخل ہوگا، اس کے برخلاف خوارج اور معتزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ مومن بھی اگر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مدت دراز کے بعد ایک دن جب جہنم کی آگ رحمتِ الٰہی کے چھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائے گی، حدیث صحیح میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنت میری رحمت اور دوزخ میرا عذاب ہے (۱) اسی کے ساتھ حدیثِ صحیح میں وارد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کا فیصلہ کیا اسی وقت اس نے اپنے عرش کے اوپر یہ لکھ دیا کہ:

رحمتی سبقت غضبی (۲) میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی ہے۔

اب اگر دوزخ جو اس کے غضب کا مظہر ہے، اس کی جنت ہی کی طرح دائمی و ابدی ہو تو اس کا غضب اس کی رحمت پر سبقت لئے جاتا ہے یا برابر ہوا جاتا ہے اور اس کا تخیل بھی اس رحمان ورحیم کی نسبت نہیں ہو سکتا، اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصوں میں

(بقیہ حاشیہ پچھلے کا) تو وہ بھی کفار کی طرح ہمیشہ دوزخ ہی میں رہے گا اور بھی اس بارہ میں لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔

اہل سنت کے ایک مختصر گروہ کا جس میں صحابۂ کرام اور تابعین کے نام بھی ہیں اور متاخرین میں جس کے پرجوش حامی حافظ ابن قیم ہیں، یہ خیال ہے کہ جب گنہ گار اپنے اپنے گناہوں کے بہ قدر عذاب پاچکیں گے تو جہنم فنا کردی جائے گی، حافظ ابن قیم نے اپنی دو کتابوں (شفاء العلیل اور حادی الارواح) (دونوں مطبوعہ ہیں حادی الارواح اعلام الموقعین کے ساتھ چھپی ہے) میں قرآن، احادیث، آثارِ صحابہ اور عقل کی پچیس دلیلوں سے اپنے مسلک کو مبرہن کیا ہے، (دیکھو شفاء العلیل از ص ۲۵۲ تا ۲۶۴ حسینیہ مصر اور حادی الارواح از ص ۱۶۷ تا ۲۳۵ جلد دوم مطبعہ جدیدہ مصر) علامہ ابن تیمیہ نے بھی اس نظریہ کو سلف اہل سنت کے ایک فریق کا خیال تسلیم کیا ہے (حادی الارواح ابن قیم جلد دوم ص ۱۶۷) ایک زیدی یمنی عالم شیخ مقبلی نے بھی اس کو قبول کیا ہے۔ (العلم الشامخ فی ایثار الحق علی الآباء و المشائخ ص ۱۲۲ طبع اول ۱۳۲۸ھ مصر) صوفیہ میں شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کے متبعین یہ فرماتے ہیں کہ کافر و مشرک جن پر خلودِ نار کا حکم ہے وہ بالآخر دوزخ میں رہتے رہتے ایسے ہو جائیں گے کہ ان کو اسی دوزخ میں راحت ولذت معلوم ہونے لگے گی جیسے بعض کیڑے غلاظتوں ہی کو پسند کرتے ہیں اور ان ہی میں لطف اٹھاتے ہیں، میں نے اس بات کو بہت ڈرتے ڈرتے لکھا ہے کہ اس میں اجمالِ الٰہی کی تصریح کا جرم عائد ہوتا ہے اگر یہ اختیار کردہ پہلو حق نہ ہو تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے اور توبہ کی توفیق بخشے اور اپنی مراد کا دروازہ مجھ پر کھولے۔☆☆

(۱) صحیح بخاری کتاب الرد علی الجهمية باب ان رحمة الله قريب من المحسنين الخ جلد دوم ص ۱۱۰۰ و صحیح مسلم کتاب الجنة و صفة نعيمها و اهلها باب النار يدخلها الجبارون و الجنة يدخلها الضعفاء ج ۲ ص ۳۸۲۔

(۲) صحیح بخاری باب قوله وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ جلد دوم ص ۱۱۱۰ و صحیح مسلم کتاب التوبه باب سعة رحمة الله ج ۲ ص ۳۴۳۔

☆☆ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جہنم کی غیر ابدیت کے سلسلے میں جمہور امت کے مسلک کے مطابق اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا۔ ملاحظہ ہو شذرات معارف، جنوری ۱۹۴۳ء (ادارہ)

سے صرف ایک حصہ دنیا میں اتارا اور ننا وے حصے قیامت کے دن کے لئے رکھے ہیں،(۱) اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ ایک دن آئے گا جب اس کے غضب پر اس کی رحمت غالب آئے گی اور اس کی رحمت کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور یہ وہ دن ہوگا جب گنہ گار اپنے گناہوں کی ناپاکیوں اور نجاستوں سے اپنے اپنے مقررہ وقت پر پاک ہو کر اس کی رحمت کی سرفرازی کے قابل بنیں گے۔

اسلام کے رو سے سب سے بڑے مجرم مشرک و کافر ہیں جو اس وقت تک نجات نہ پاسکیں گے جب تک دوزخ کے تنور میں ایک گرم کوئلہ بھی باقی ہے تاہم ان کے عذاب کی مدت کی نسبت بھی قرآن میں حسب ذیل تین تصریحات ہیں:

۱۔لٰبِثِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَحۡقَابًا.	(نبا ۷۸:۲۳)	وہ دوزخ میں صد ہزار سال ٹھہریں گے۔

صدہا ہزار سال کی مدت کسی قدر بڑی ہو پھر بھی ایک دن اس کا خاتمہ ہوگا، دوسری آیت جو صریحاً کفار و مشرکین کے حق میں ہے، یہ ہے:

۲۔اَلنَّارُ مَثۡوٰىكُمۡ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيۡمٌ عَلِيۡمٌ. (انعام ۶:۱۲۸)	دوزخ ہے تمہارا اٹھکانا اس میں تم سدا رہنے والے ہو لیکن یہ کہ اللہ جو چاہے، بے شک تیرا رب حکیم و علیم ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک و کفر کی سزا تو اصل میں قانوناً یہی ہے کہ دوزخ میں دائمی سزا دی جاتی رہے مگر اس کی رحمت کا اقتضا کچھ اور ہے لیکن وہ حکیم و علیم ہے اس لئے وہ اپنا ہر کام اپنی حکمت و مصلحت اور علم کے مطابق کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس کے حق میں کیا کرنا چاہئے اور کب کرنا چاہیے۔

تیسری آیت میں ہے:

۳۔خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ. اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيۡدُ. (ھود ۱۱:۱۰۷)	وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں لیکن یہ کہ جو تیرا رب چاہے، بے شک تیرا رب جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔

دوسری اور تیسری آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں اپنی مشیت کو عذاب کی انتہا بتایا ہے اور اپنے کو رب کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اس کی مشیت سے بالآخر اس عذاب کا ختم ہو جانا اس کی ربوبیت کا اقتضا ہے۔

(۱) صحیح مسلم کتاب التوبۃ باب فی سعۃ رحمۃ اللہ الخ ج ۲ ص ۴۴۳۔

قرآن پاک میں کوئی ایسی صاف وصریح آیت موجود نہیں ہے جس سے دوزخ کی بقائے دوام، عدمِ انتہا اور تسلسلِ وجود پر بہ تصریح استدلال کیا جاسکے، حالاں کہ اس کے برخلاف بہشت کی ہمیشگی و بقا اور عدمِ انقطاع و عدمِ فنا کی بیسیوں آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں، چنانچہ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس اوپر والی آیت کو ہم تمام وکمال یہاں نقل کرتے ہیں، فرمایا:

فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَھُمْ فِیْھَا زَفِیْرٌ وَّ شَھِیْقٌ. خٰلِدِیْنَ فِیْھَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ. وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍo (ھود ۱۱: ۱۰۶-۱۰۸)	تو لیکن جو بدبخت ہوئے وہ دوزخ میں ہوں گے اس میں ان کو گدھوں کی طرح چلانا اور ریکنا ہے جب تک آسمان اور زمین ہیں ، وہ اس دوزخ میں رہیں گے مگر جو چاہے تیرا رب بے شک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے اور لیکن وہ جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں ہوں گے ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم رہیں مگر جو چاہے تیرا رب یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔

دیکھو کہ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ دونوں کے لئے خلود و دوام فرمایا، پھر ان دونوں میں اس کے بعد اپنی مشیت سے استثنا فرمایا، مگر اہلِ دوزخ کے دوام کے ذکر میں فرمایا کہ مگر جو چاہے تیرا رب، بے شک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ وہ چاہے تو دوزخ کے عذاب کو ختم کردے اور چاہے تو قائم رکھے لیکن اہلِ جنت کے دوام کے ذکر میں بہ تصریح فرمایا کہ مگر جو چاہے تیرا رب، یہ غیر منقطع بخشش ہوگی، اس سے معلوم ہوا کہ اہل جنت کے حق میں اس کی مشیت یہی ہوگی کہ وہ بے انقطاع اور غیر منتہی دوام و تسلسل کے ساتھ ہمیشہ قائم و باقی رہے، اس آیت کی تفسیر میں متعدد ائمۂ سلف مثلاً ابن زید اور شعبی وغیرہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کے بارہ میں تو اپنی مشیت ظاہر فرمادی کہ وہ مسلسل اور غیر منقطع ہے، لیکن اہلِ دوزخ کی نسبت اپنی مشیت کو کسی مصلحت سے مخفی رکھا ہے(۱)۔

ایک مقام پر خاص طور پر کفار و مشرکین کا نام لے کر اس طرح فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَ الْمُشْرِکِیْنَ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا اُولٰٓئِکَ ھُمْ شَرُّ الْبَرِیَّةِ. اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ	بے شک اہل کتاب اور مشرکوں میں سے جنہوں نے کفر کیا، وہ جہنم کی آگ میں (خالد) پڑے رہیں، یہ بدترین لوگ ہیں، بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ بہترین

(۱) تفسیر طبری ج ۱۲ ص ۶۶، ۶۷ ودر منثور سیوطی تفسیر آیات ہود ج ۳ ص ۳۵۰۔

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ. جَزَآؤُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا.

(بینہ ۹۸: ۶-۸)

لوگ ہیں، ان کی جزا ان کے پروردگار کے نزدیک بسنے کے باغ ہیں جن میں نہریں بہتی ہوں وہ اس میں ہمیشہ (خالد) رہیں گے۔

غور سے دیکھو کہ اس میں اہلِ دوزخ کے مقابلہ میں اہلِ جنت کے دوام کی نسبت کتنی تاکید پرتاکید ہے، پہلے عدن فرمایا، جس کے معنی قیام اور بسنے کے ہیں پھر خالدین کہا کہ وہ اس میں رہا کریں گے، بعدازیں ابداً فرمایا کہ جنت میں ابدی طور سے قیام کریں گے۔

اسی طرح ایک اور سورہ میں ہے:

وَیُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ. وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ۭ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ○ (تغابن ۶۴: ۹، ۱۰)

اور اس کو ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے اور وہی بڑی کامیابی ہے، اور جنہوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں وہ اس میں رہا کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔

دیکھو کہ تقابلاً دونوں میں خالدین (رہا کریں گے) اور خالدین فیھا ابدا (ہمیشہ رہا کریں گے) کا فرق کتنا نمایاں ہے، کہیں یہ کیا گیا ہے کہ کفار کے عذاب میں مدت کی تعیین سے سرے سے خاموشی برتی گئی ہے اور جنت میں خلود کی تصریح فرمادی گئی ہے، مثلاً:

یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْھُھُمْ اَکَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ. وَاَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْھُھُمْ فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ.

(آل عمران ۳: ۱۰۶، ۱۰۷)

جس دن کچھ منہ سپید ہوں گے اور کچھ سیاہ تو جو سیاہ ہوئے تو کیا ایمان کے بعد کافر ہو گئے تھے تو اپنے کفر کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو اور جن کے منہ سپید ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور اس رحمت میں سدا رہیں گے۔

آیت بالا میں عذاب کے ذکر میں مدت کی تصریح سے سراسر خاموشی ہے اور رحمت کے ذکر میں خلود کی تصریحِ تام ہے۔

ان ہی آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ اور بعض صحابہ کرامؓ سے روایتیں ہیں کہ ایک دن آئے گا جب دوزخ کے میدان میں ہو کا عالم ہوگا اور کوئی ایک متنفس بھی وہاں نظر نہیں آئے گا۔ چنانچہ:

۱۔ طبرانی میں حضرت ابوامامہؓ صحابی سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جہنم پر ایک دن ایسا آئے گا جب خزاں رسیدہ پتے کے مانند ہو جائے گا اور اس کے دروازے کھل جائیں گے۔

۲۔ حضرت جابرؓ یا کسی اور صحابی سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جہنم پر ایک دن ایسا آئے گا جس میں اس کے دروازے کھل جائیں گے اور اس میں کوئی نہ ہوگا۔

۳۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں جو کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہنم پر ایک دن آئے گا جب اس میں کوئی نہ ہوگا۔

۴۔ تفسیر عبد بن حمید میں حضرت عمرؓ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر اہلِ دوزخ ریگستان عالج کے ذرات کے بہ قدر شمار بھی دوزخ میں رہیں پھر بھی ایک دن آئے گا جب وہ اس سے نکلیں گے۔

۵۔ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ جہنم پر ایک دن آئے گا جب اس کے خالی دروازے بھڑبھڑائیں گے اور اس میں کوئی نہ ہوگا اور یہ اس وقت ہوگا جب لوگ اس میں صدہا ہزار سال (احقاب) کی مدت پوری کر لیں گے۔

۶۔ عبدالرزاق، ابن منذر، طبرانی اور بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات میں ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ صحابی یا ابوسعید خدریؓ صحابی یا کسی اور صحابی نے فرمایا کہ الا ما شاء ربک کا استثنا پورے قرآن پر حاوی ہے یعنی جہاں جہاں قرآن میں خالدین فیھا (سدا اس میں رہیں گے) ہے وہاں یہ مشیت الٰہی کا استثنا قائم ہے۔

۷۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ دوزخ پر ایک زمانہ آئے گا جب اس کے

دروازے کھڑکھڑا جائیں گے۔(۱)

دفعِ شبہہ: قرآن پاک میں ایسی بھی چند آیتیں ہیں جن سے لوگوں کو دوزخ کے دوام کا خیال ہوا ہے مثلاً وہ تین آیتیں جن میں کفار کو خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ہمیشہ کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے:

۱۔اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَ اَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا۔ (احزاب ۳۳:۶۴،۶۵)	۱۔بے شک خدا نے کافروں پر لعنت کی اوران کے لئے وہ آگ مہیا کی جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔
۲۔وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا۔ (جن ۷۲:۲۳)	۲۔اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو اس کے لئے جہنم کی وہ آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔
۳۔اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا. اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۔(نساء۴:۱۶۸،۱۶۹)	۳۔بے شک جنہوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھے نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے لیکن جہنم کی راہ جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔

ان تینوں آیتوں میں خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا (دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے) کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جن کے حق میں یہ آیتیں آئی ہیں وہ اس وقت تک دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے جب تک حسبِ مشیتِ الٰہی دوزخ کے خاتمہ کا دور نہیں آئے گا۔

باقی چند آیتوں میں ابدا (ہمیشہ) کے بغیر صرف خالد ہے جیسے:

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ. (بقرہ۲:۲۵۷)	وہ اس میں خالد رہیں گے۔

یا ایک جگہ ہے:

وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. (سجدہ ۳۲:۱۴)	اور خلود کے عذاب کا مزہ چکھو۔

تو یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ خلود کے دو معنی ہیں ایک حقیقی دوام اور دوسرے قیامِ طویل

(۱) حافظ ابن قیم نے شفاء العلیل (ص ۲۸۵) میں ان روایات کو غیر مطبوعہ کتبِ سیر وحدیث سے نقل کیا ہے، ان میں سے بعض ابن جریر طبری میں بھی آیات مذکور کی تفسیر میں خصوصاً تفسیر سورہ ہود جلد ۱۲ ص ۶۶ میں مذکور ہیں اور حافظ جلال الدین سیوطی نے بھی تفسیر درمنثور، تفسیر سورہ ہود، جلد ثالث ص ۳۵۰ میں زیر آیت مذکورہ ہود ذکر کیا ہے اور کتاب الاسماء الصفات بیہقی (ص ۱۲۳) مطبوعہ الہ آباد میں چھپی روایت ہے۔

طویل، ان دو میں سے کسی ایک معنی کی تخصیص قرینہ سے ہوگی، اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے عربی اشعار میں پہاڑوں اور بدویانہ چولھوں کے پتھروں کے لئے خوالد اور خالدات کے لفظ صفت میں آتے ہیں کیوں کہ وہ تادیر اور زمانہ دراز تک باقی رہنے والے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ تنہا خلدین کا لفظ ابدیت کے مفہوم میں صریح نہیں جب تک اس کے ساتھ کوئی اور قرینہ قائم نہ ہو جو دوام کے معنی کی تخصیص کردے، جیسا کہ یہ قرینہ ان آیتوں میں ہے جہاں اہلِ جنت کو خلدین کہا گیا ہے کہ تقریبا بیس آیتوں میں اس خلود کے معنی دوام اور عدمِ انقطاع کے بتائے گئے ہیں، اس لئے جنت کے سلسلہ میں جہاں صرف خلدین بھی ہے وہاں ہمیشگی اور دوام ہی کے معنی لئے جائیں گے، برخلاف اس کے جہاں دوزخ کے ساتھ خلدین کا لفظ ہے وہاں دوام کے مفہوم کے لئے کوئی قرینہ موجود نہیں، اس لئے دوزخ والی آیتوں میں خلود سے مقصود یہ ہے کہ گنہ گار زمانہ دراز تک دوزخ میں رہیں گے، غالباً یہی وجہ ہے کہ گنہ گار اہلِ ایمان کی سزا میں کبھی خلدین کے ساتھ ابدًا استعمال نہیں کیا گیا، گنہ گار اہلِ ایمان میں سب سے بڑی دھمکی اس کو دی گئی ہے جس نے کسی مسلمان کا خون بے سبب بہایا ہو مگر اس کے لئے بھی خالدین کے ساتھ ابدًا استعمال نہیں کیا گیا، فرمایا:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءُهٗ جَهَنَّمُ	اور جو کوئی کسی باایمان کو قصداً قتل کرے گا تو اس کا بدلہ دوزخ
خَالِدًا فِيْهَا (نساء۴:۹۳)	ہے جس میں وہ خالدًا (یعنی مدت دراز تک پڑا) رہے گا

یہی سبب ہے کہ معتزلہ اور خوارج کے سوا تمام اہلِ اسلام اس بے گناہ مسلمان مقتول کے قاتل کی بالآخر بخشایش کے قائل ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان آیتوں میں خلود سے مراد ہمیشگی نہیں ہے بلکہ زمانہ دراز ہے کہ اہلِ توحید کی بالآخر نجات قرآن وحدیث کی متفقہ تعلیم ہے اور اس لئے مومن کے لئے اس کے کسی جرم کی سزا میں ہمیشگی کا مفہوم داخل ہی نہیں ہوسکتا، بنابریں ان آیتوں میں خلود کے معنی منطقی دوام نہیں بلکہ عرفی دوام یعنی مدتِ دراز کے ہیں، ہم عام طور سے مجرم کے لئے حبسِ دوام کی قانونی اصطلاح بولتے ہیں جس سے مراد ابد تک کیا، قیامت تک کا زمانہ بھی نہیں ہوسکتا بلکہ عمر بھر بھی نہیں، ایک طرف اس سے قانونی قید کی درازترین مدت مراد ہے جس کا قانونی اندازہ بیس سال کیا گیا ہے، کتنے مجرم ہیں جو اس مدت کو کاٹ کر آزادی حاصل کرتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو کسی شاہی عفوِ عام کے

سلسلہ میں قبل از مدت رہائی پا جاتے ہیں۔

دو چار آیتیں ایسی بھی ہیں جن میں مذکور ہے کہ یہ گنہ گار دوزخ سے الگ نہ ہوں گے چنانچہ وہ آیتیں حسب ذیل ہیں:

ا۔ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ. یَّصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ. وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ. (انفطار ۸۲: ۱۴-۱۶)

ا۔ بے شک گنہ گار دوزخ میں ہیں وہ انصاف کے دن اس میں داخل ہوں گے اور وہ اس سے چھپے نہیں رہ سکتے۔

۲۔ وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ. (بقرہ ۲: ۱۶۷)

۲۔ اور کہیں گے کہ کاش ہم کو دوبارہ دنیا کی زندگی ملتی تو ہم اپنے پیشواؤں سے ہی الگ ہو جاتے جیسے وہ ہم سے یہاں الگ ہو گئے اللہ ان کے کاموں کو ایسے ہی حسرتیں بنا کر ان کو دکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں۔

۳۔ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لِیَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ. یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنْهَا ؗ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ. (مائدہ ۵: ۳۶، ۳۷)

۳۔ بے شک جنہوں نے کفر کیا اگر ان کی ملکیت میں کل روئے زمین ہو اور اتنا ہی اور ہو، تا کہ اس کو فدیہ دے کر قیامت کے عذاب سے رہائی پائیں تو وہ ان کی طرف سے قبول نہ ہو اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں لیکن وہ اس سے نکلنے والے نہیں اور ان کے لئے قائم عذاب ہے۔

۴۔ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِیْدُوْا فِیْهَا وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ. (حج ۲۲: ۲۲)

۴۔ جب وہ چاہیں کہ اس دوزخ سے غم کی وجہ سے نکل پڑیں وہ اس میں لوٹا دئے جائیں گے اور (کہا جائے گا کہ) جلنے کی سزا چکھو۔

۵۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِیْدُوْا فِیْهَا وَقِیْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ. (سجدہ ۳۲: ۲۰)

۵۔ اور لیکن جنہوں نے نافرمانی کی تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے جب وہ چاہیں گے کہ وہ اس سے نکل جائیں اس میں لوٹا دئے جائیں گے اور کہا جائے کہ دوزخ کی اس مار کا مزہ چکھو جس کو تم جھٹلاتے تھے۔

یہ وہ پانچ آیتیں ہیں جن سے بعضوں کو عذابِ دوزخ کے دوام اور غیر منقطع بقا کا خیال پیدا ہوا ہے مگر ان میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو تو ان کے خیال کی غلطی فوراً معلوم ہو جائے گی، پہلی آیت کا منشا اسی قدر ہے کہ کوئی گنہ گار اگر یہ سمجھے کہ وہ کسی جگہ چھپ کر دوزخ کے عذاب سے بچ جائے گا تو یہ محال ہے کہ عذاب سے چھپ کر بچ جانا کسی طرح ممکن نہیں، دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوزخی کہیں گے کہ ہم کو دوزخ سے نکل کر دوبارہ دنیا میں جانے دیا جائے تو اب کی ہم نیکی کا کام کریں گے، اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اب یہاں سے نکل کر دنیا میں دوبارہ جانا نہیں، تیسری آیت میں ہے کہ پورے روئے زمین کی دولت دے کر بھی آخرت میں نجات خریدی نہیں جاسکتی اور نہ وہاں سے کوئی نکل کر بھاگ سکتا ہے، چوتھی اور پانچویں آیت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی دوزخی دوزخ کے عذاب سے گھبرا کر اس سے نکل بھاگنا چاہے گا تو وہ پکڑ کر پھر اسی میں ڈال دیا جائے گا، ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ گنہ گار از خود دوزخ سے نکل نہ سکیں گے اور نہ مدتِ عذاب کے اندر وہ خلاصی پاسکتے ہیں مگر اس سے خدا تعالیٰ کے حکم و اجازت سے بالآخر اس سے نجات پانے کی نفی نہیں نکلتی اور نہ اس کی کہ بقدرِ گناہ عذاب کی مدت بسر کرنے کے بعد بھی نجات نہیں مل سکتی اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہشت کی طرح دوزخ کو بھی غیر متناہی دوام بخشا گیا ہے۔

یہی وہ آیتیں ہیں جن سے گنہ گاروں کے لئے دوامِ عذاب کا مفہوم نکالا جاسکتا ہے مگر ایک ایک آیت کو غور سے پڑھو کہ ان میں سے کسی میں بھی دوزخ کے دوامِ بقا اور عدمِ فنا یا اس کے عذاب کے عدمِ انتہا کی تصریح ہے، حالاں کہ اس کے بالمقابل جنت کی بقائے دوام اور عدمِ انقطاع کی تصریح بار بار اور بہ تکرار ہے۔

ایک اور نکتہ لحاظ کے قابل ہے، اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خدا نے گنہ گاروں کو عذابِ دوزخ کی ابدیت اور دوام کی دھمکی دی ہے، تاہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے کہ نیکی کا بدلہ نہ دینا یقیناً برائی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی قدوسیت کا دامن تمام تر پاک ہے، اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ. (آل عمران ۳: ۱۹۴) تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا، اِنَّہٗ کَانَ وَعْدُہٗ مَاْتِیًّا. (مریم ۱۹: ۶۱) اس کا وعدہ جنت پورا ہی ہوگا، لیکن اگر برائی کا بدلہ حسب تہدیدِ سابق برائی کے ساتھ نہ دیا جائے تو حقیقت میں خلاف وعدگی نہیں جو قابلِ ملامت ہو، بلکہ اس کا نام مغفرت، کرم، عطا اور عفو ہے، جس کا اہل اس رحمٰن

ورحیم اور عفو و غفور سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں، اس لئے گنہ گاروں کے ساتھ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے اپنی حکمت و مصلحت کی بنا پر وہ جو چاہے کر سکتا ہے، چنانچہ مسند ابویعلی میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ خدا نے کسی نیک کام پر جس ثواب کا وعدہ فرمایا ہے وہ اس کو ضرور ہی پورا کرے گا، لیکن جس کسی کو اس کے کسی کام پر عذاب کی دھمکی دی ہے تو اس کو اختیار حاصل ہے۔(۱)

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر بالآخر گناہوں کی مغفرت اور خدا کی رحمت میں یہ وسعت اور عموم ہے کہ بڑے سے بڑے گنہ گار بھی دوزخ کی آگ میں جل کر بالآخر پاک وصاف اور جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں گے، تو اشارات و کنایات کے بہ جائے ان کی معافی کی صریح تصریح کیوں نہیں کر دی گئی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ ان مجرموں اور گنہ گاروں کے حق میں اچھا نہ ہوتا، کیوں کہ اس سے ان میں ندامت اور توبہ کے رجحان کے بہ جائے خودسری، گستاخی اور شوخی پیدا ہوتی اور ان میں آئندہ کے نتائج بد سے نڈر پن اور بے خوفی آ جاتی اور ایسا ہونا تنبیہ و اصلاح و تدارک کی مصلحتوں کے سراسر منافی ہوتا اس لئے ان کی قانونی سزا تو اللہ تعالیٰ نے دائمی عقاب مقرر فرمائی لیکن آخر کار ان کی نجات کو اپنی مشیت اور علم و مصلحت کے سپرد فرما کر ان کو یک گونہ اپنے سے ناامید بھی نہیں ہونے دیا اور امید و بیم کی حالت میں رکھ کر اپنے سامنے جھکنے اور محبت کرنے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا اور یہ اس باب میں وہ عظیم الشان اصلاح ہے جس کو ایک طرف عیسائیوں نے کفارہ کی اور دوسری طرف ہندو مذاہب نے کرم کی تعلیم دے کر غارت کر دیا تھا۔

عیسائیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہو کر جی اٹھنے پر ایمان لانے سے تمام گناہ دفعتاً معاف ہو جاتے ہیں، اس تعلیم نے اعمال کو غیر ضروری چیز ٹھہرا دیا تھا، اس کے برخلاف ہندو مذاہب نے خدا کو اتنا بے اختیار ٹھہرایا کہ اعمالِ بد کے نتائج جن کو کرم کہتے ہیں خدا چاہے بھی تو معاف نہیں ہو سکتے، اسلام نے آ کر ترازو کے ان دونوں پلوں کو برابر کر دیا ایک طرف فرمایا كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ہر نفس اپنے عمل کے ہاتھ میں گرو ہے۔(مدثر ۷۴: ۳۸) اور دوسری طرف فرمایا يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ خدا جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے (مائدہ ۵: ۱۸) یعنی قانوناً ہر انسان اپنے عمل کے نتائج کا یقیناً پابند ہے مگر خدا تعالیٰ کی قدرت اور رحمت اس قانون کے باوجود جو

(۱) بحوالہ حادی الارواح ابن قیم ص ۲۲۲، مصر۔

چاہے کرسکتی ہے، جس طرح اس دنیا کا حال ہے کہ گو خدا کے بنائے ہوئے قانون یہاں جاری ہیں جن کو آپ قانونِ فطرت کہتے ہیں مگر بایں ہمہ اس کا حکم اور اس کی خواہش اور مصلحت ان پر بھی حاکم ہے اور وہ جو چاہے کرسکتا ہے، اس تعلیم نے ایک طرف اعمال کو غیر ضروری ہونے سے بچالیا اور دوسری طرف خدا کی قدرتِ تام اور رحمتِ عام کا دروازہ بھی کھلا رکھا۔

عذابِ طویل کا سبب: بعض کم فہم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کا گناہ تو ایک لمحہ کا کام ہے پھر اس کا عقاب اتنا طویل کیوں رکھا گیا، سال دو سال یا عمر بھر کے گناہ کی سزا صدہا اور ہزرہا سال کے عقاب سے دینا مناسب نہیں، حالاں کہ یہ لوگ اگر دنیاوی ہی واقعات پر غور کرتے تو وہ ان کی تسکین کے لئے کافی ہوتے، دنیا کا ہر بڑے سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پاجاتا ہے، چوری، عملِ خلافِ قانون یا کسی کو قتل کرتے کتنی دیر لگتی ہے مگر اس کے معاوضہ میں سال ہا سال کی قید ہم خود اپنی انسانی عدالت گاہوں میں تجویز کرتے ہیں اور اس کو خلافِ عقل نہیں کہتے۔

دوسری صحیح تر مثال یہ ہے کہ انسان کو دیکھو کہ ذرا سی جسمانی بد پرہیزی اور اصولِ صحت کی معمولی سی غلطی کی پاداش میں وہ کبھی ہفتوں، مہینوں بلکہ سال ہا سال بیمار رہتا ہے اور ایک مدتِ دراز میں جاکر کہیں ان چند لمحوں کی غلطی کی تلافی کرپاتا ہے اور کبھی اس معمولی غلطی کی بدولت عمر بھر اس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے اور آخر میں جان دے دیتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت میں یکسانی نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلہ میں اس کی تلافی کی مدت صدہا اور ہزارہا گنا زیادہ ہوتی ہے، کیوں کہ طبیعت پر جو اثر پڑجاتا ہے اس کی تلافی کی مدت غلطی کی نوعیت، طبیعت کی صلاحیت اور خلاقِ عالم کی مصلحت کی بنا پر مختلف ہوتی ہے، اسی لئے عقابِ طویل سے رہائی یا شفایابی کی مدت بھی ہر گنہ گار کے لئے یکساں نہیں ہوسکتی۔ و اللہ اعلم بحقیقۃ الحال

مشرک وکافر کا انجام: اگر یہ صحیح ہے کہ بالآخر ایک دن جہنم کی آگ سرد ہوجائے گی تو کیا اہلِ کفر و شرک بھی اپنے گناہوں سے پاک ہوکر رحم وکرم کے سزاوار ہوجائیں گے؟ جواب یہ ہے کہ:

قرآن پاک میں اس کی تصریح موجود ہے کہ شرک وکفر کا گناہ معاف نہ ہوگا یعنی اس کے اخروی نتائج کی پاداش ضروری ہے اور یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ شرک وکفر کی جزا دوامِ عذاب اور خلودِ نار (خلدین فیھا ابدا) ہے یعنی جب تک دوزخ قائم ہے اس سے ان کو نجات نہیں مل سکتی مگر جب

حسبِ مشیتِ الٰہی وہ دن آئے کہ دوزخ کی مدتِ حیات ختم ہو جائے تو اس وقت عجب نہیں کہ ان کو بھی اس سے رہائی مل سکے۔

چنانچہ مشرکین وکافرین کے ذکر میں خدا فرماتا ہے:

قَالَ النَّارُ مَثْوٰكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ. (انعام ۶:۱۲۸)	فرمائے گا دوزخ کی آگ تمہارا ٹھکانا ہے، اس میں ہمیشہ رہو گے مگر یہ کہ جو چاہے اللہ، بے شک تیرا پروردگار حکمت اور علم والا ہے۔

اس آیت کا آخری ٹکڑا خاص طور سے غور کے قابل ہے فرمایا ''تیرا رب حکمت اور علم والا ہے، اس موقع پر خدا کے لئے خاص طور سے رب کا لفظ لانا، یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی شانِ ربوبیت اگر چاہے گی اور اس کے غیر محدود علم وحکمت کا اقتضا ہوگا تو دوزخ کے خاتمہ پر ان کو رہائی مل سکے گی۔

لیکن اس میں شک ہے کہ آیا اس کے بعد بھی وہ جنت میں داخل ہو سکیں گے، کیوں کہ حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے قرآن میں یہ تصریحِ الٰہی ہے:

اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ. (مائدہ ۵:۷۲)	یہ کہ بے شبہ اللہ کا جو شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

نیز ایک اور آیت میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ (اعراف ۷:۴۰)	بے شک جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے غرور کیا تو ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے تا آں کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو جائے۔

الغرض خدا کے اعلان کردہ قانونِ جزا کا اقتضا تو یہی ہے کہ گو دوزخ کے عذاب کا خاتمہ ہو جانے پر بھی جنت کے احاطہ میں ان کا گذر نہ ہو لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا دائرہ بہت وسیع ہے جیسا کہ خود اس نے اہلِ دوزخ کی نسبت کہا ہے کہ:

اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ. (ھود ۱۱:۱۰۷)	وہ سدا دوزخ میں رہیں گے لیکن تیرا رب جو چاہے بے شک تیرا رب جو چاہے کر گذرتا ہے۔

اس دائرہ کی وسعت کو کون کم کرسکتا ہے کیوں کہ اپنی رحمت کی وسعت کی نسبت اس کا اعلان یہ ہے:

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف ۷:۱۵۶) — اور میری رحمت ہر شے کو اپنی گنجایش میں لئے ہے۔

اس رحمتِ عام کی وسعت سے آسمان وزمین کا کون گوشہ محروم ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ پیغمبر کو جھٹلانے والوں کی نسبت خدا فرماتا ہے:

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ. (انعام ۶:۱۴۸) — تو (اے پیغمبر) اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے کہ تمہارا پروردگار وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب گنہ گاروں سے لوٹایا نہیں جاسکتا۔

یعنی کسی دوسرے میں یہ طاقت نہیں کہ اس کے بھیجے ہوئے عذاب کو گنہ گاروں کے سر سے ٹال دے لیکن خود اس کی رحمت بڑی وسیع ہے وہ چاہے تو ان کو دنیا ہی میں ہدایت دے کر جنت نصیب کرے یا آخرت میں عذاب دینے کے بعد درگذر کردے اور اس کی اصلی رحمت کا محل وہی ہے جہاں کسی دوسری رحمت کا وجود نہ ہوگا، فرمایا:

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ (انعام ۶:۱۶) — جس سے اس دن عذاب ہٹایا گیا تو خدا نے اس پر رحم کیا۔

صحیح بخاری (۱) ومسلم (۲) وترمذی (۳) میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر مومن کو معلوم ہو کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنت سے مایوس ہو جائے اور اگر کافر کو یہ معلوم ہو کہ اس کی رحمت کتنی وسیع ہے تو وہ بھی جنت سے ناامید نہ ہو، مصلح الدین سعدی نے غالباً اسی حقیقت کو اپنے ان دو شعروں میں ادا کیا ہے:

بہ تہدید اگر برکشد تیغ حکم — بہ مانند کروبیاں صم وبکم
وگر دردہد یک صلاے کرم — عزازیل گوید نصیبے برم (۴)

(۱) کتاب الرقاق باب الرجاء مع الخوف ج ۲ ص ۹۵۷ (۲) کتاب التوبہ باب فی سعۃ رحمۃ اللہ الخ ج ۲ ص ۴۴۴ ومسند احمد ج ۲ ص ۳۳۴ و ۴۸۴ (۳) ابواب الدعوات باب ماجاء فی فضل التوبۃ والاستغفار ج ۲ ص ۱۹۴ (۴) بوستاں ص ۵ مطبع نامی منشی نول کشور ۱۳۰۵ ہجری / ۱۹۰۲ء۔

خود اس رحمان و رحیم کا جس کی بادشاہی آسمان و زمین کو محیط ہے یہ ارشاد ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے:

یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ. (مائدہ ۵:۱۸)	جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جس کو چاہے عذاب دیتا ہے اور آسمانوں کی اور زمین کی اور ان کے بیچ کی بادشاہی اللہ کے لئے ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

لیکن اس کی یہ مشیت جیسا کہ اس نے (انعام ۶:۱۲۸) میں فرمایا ہے، اس کی وسیع حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے مگر کرتا وہی ہے جو اس کی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے۔

اس سے زیادہ اس باب میں کچھ اور کہنا حد سے آگے بڑھنا ہے کہ جس کی تصریح خود خدائے تعالیٰ نے فرمائی، اس کی تصریح کا حق کسی کو کیا ہے، اس لئے مشرک و کافر کے آخر انجام کے سوال کا جواب صرف مشیتِ الٰہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:

اَلنَّارُ مَثْوٰکُمْ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ اِنَّ رَبَّکَ حَکِیْمٌ عَلِیْمٌ (انعام ۶:۱۲۸)	دوزخ تمہارا ٹھکانا ہے اس میں سدا رہو گے لیکن جو چاہے اللہ، بے شک تیرا پروردگار حکمت والا اور علم والا ہے۔

جمہور کا مسلک: یہ جو کچھ کہا گیا وہ اس جماعت کا خیال ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کی معتقد ہے، جمہور کا مسلک اس سے کچھ مختلف ہے اس کے نزدیک بہشت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ باقی رہے گا اور ان لوگوں کو جو شرک و کفر کے مرتکب ہوں گے کبھی دوزخ سے نجات نہیں ملے گی۔

اس عقیدہ کے مطابق گنہ گاروں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو گو گنہ گار تھے مگر دل میں ایمان رکھتے تھے ایسے لوگ عذاب کے بغیر ہی یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے سرفراز ہو کر بالآخر جنت میں داخل ہوں گے دوسرے وہ جو ہمیشہ شرک و کفر میں مبتلا رہے اور اس سے توبہ کئے اور ایمان لائے بغیر مر گئے ایسے لوگوں کی بخشایش کبھی نہ ہوگی اور وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں داخل کر دئے جائیں گے، ان کی گنہ گاری اس درجہ ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف کسی طرح جذب نہ کر سکیں گے، یہ وہ زمینِ شور ہوں گے جس میں اس رحمتِ عام کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کر سکے گی۔

رحمت عمومی کے معتقدین گذشتہ آیتوں سے جو معنی نکالتے ہیں وہ جمہور کے نزدیک صحیح نہیں، وہ ان کے بیان کردہ مطالب کو تاویلات کا درجہ دیتے اور اس کی پیش کردہ روایات کو صحت اور قوت سے خالی جانتے اور قرآن مجید کی حسب ذیل آیتوں سے اپنے دعوی پر استدلال کرتے ہیں:

۱۔ اِنَّ اللّٰـهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَ اَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (احزاب ۳۳: ۶۴، ۶۵)	۱۔ بے شک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لئے وہ آگ مہیا کی جس میں وہ ہمیشہ سدا پڑے رہیں۔
۲۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰـهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۔ (جن ۷۲: ۲۳)	۲۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو اس کے لئے جہنم کی آگ ہے اس میں وہ ہمیشہ سدا پڑے رہیں۔
۳۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۔ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۔ (نساء ۴: ۱۶۸، ۱۶۹)	۳۔ بے شک جنہوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھے، نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے لیکن جہنم کی راہ، اس میں وہ ہمیشہ سدا پڑے رہیں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ ان پر ہمیشہ عذاب ہوگا اور جب عذاب ہمیشہ ہوگا تو عذاب کی جگہ یعنی دوزخ بھی ہمیشہ قائم رہے گی۔

ان آیتوں کے علاوہ اور بھی دوسری آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا عذاب کفار سے کبھی دور نہ ہوگا:

۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۞ (مائدہ ۵: ۳۶، ۳۷)	بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، بالفرض ان کے پاس ساری زمین کا خزانہ ہو اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور تا کہ وہ اس کو فدیہ دے کر قیامت کے دن کے عذاب سے چھٹ جائیں، تو ان سے یہ فدیہ قبول نہ کیا جائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں اور وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے اور ان کے لئے قائم رہنے والا عذاب ہے۔

۲۔ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ. (بقرہ۲:۱۶۷)

۲۔ وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے۔

قیامت کے منکروں کی نسبت فرمایا:

۳۔ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ. (جاثیہ۴۵:۳۵)

۳۔ تو آج اس (دوزخ) سے وہ نہیں نکالے جائیں گے اور نہ ان کا عذر سنا جائے گا۔

۴۔ اَلَا اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِىْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ. (شوریٰ۴۲:۴۵)

۴۔ ہاں کافر اور مشرک قائم رہنے والے عذاب میں ہوں گے۔

ظلم کا اطلاق قرآن میں شرک پر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ شرک کا عذاب قائم رہے گا:

۵۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ. خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ. (بقرہ۲:۱۶۱،۱۶۲)

۵۔ بے شک جنہوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور آدمیوں کی سب کی لعنت ہے، اس میں وہ سدا رہیں گے، ان کے عذاب میں کمی نہیں کی جائے گی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

۶۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا (فاطر۳۵:۳۶)

۶۔ اور ان کے لئے جنہوں نے کفر کیا جہنم کی آگ ہے نہ تو ان کا فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ سزا میں کچھ کمی کی جائے گی۔

شرک و کفر والوں کی مغفرت کسی حال میں نہ ہوگی، فرمایا:

۷۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ. (نساء۴:۱۱۶)

۷۔ بے شک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔

۸۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ. (محمد۴۷:۳۴)

۸۔ بے شبہ جنہوں نے کفر کیا اور خدا کے راستہ سے روکا اور اسی کفر کی حالت میں وہ مر گئے تو ان کو ہرگز معاف نہ کیا جائے گا۔

ان کے لئے جنت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہے:

۹۔اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ (مائدہ ۵:۷۲)	۹۔یقیناً جو خدا کے ساتھ شرک کرے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کردی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔
۱۰۔اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ (اعراف ۷:۴۰)	۱۰۔بے شک جنہوں نے ہمارے حکموں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے سرکشی کی ان کے لئے آسمان کے دروازے کھولے نہ جائیں گے اور نہ جنت میں وہ داخل ہوں گے تا آں کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں گھس جائے۔
۱۱۔وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (آل عمران۔۳:۱۷۶)	۱۱۔اور (اے پیغمبر!) تجھے وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں، غم میں نہ ڈالیں وہ ہرگز خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، خدا چاہتا ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ بنائے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مرتے دم تک شرک و کفر میں مبتلا رہے اور توبہ نہیں کی ان کا گناہ بخشا نہ جائے گا اور وہ جنت میں کبھی داخل نہ ہو سکیں گے، بلکہ ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں پڑے رہیں گے، جہاں نہ ان کے عذاب میں کبھی تخفیف ہوگی اور نہ ان کو موت آئے گی۔

تصویر کے دونوں رخ آپ کے سامنے آگئے:

بیا کایں داوری ہا را بہ پیشِ داور اندازیم

بہشت و دوزخ کی جزا و سزا بھی تمثیلی ہے: اوپر عالم برزخ کے ذکر میں ہم بہ تفصیل بتا چکے ہیں کہ آخرت میں جزا و سزا تمام تر تمثیلی ہوگی، اس تمثیلی کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ جیسا عمل ہوگا اسی کے مناسب و مشابہ اس کی جزا یا سزا ہوگی، مثلاً قرآن میں ہے کہ جو زکوۃ یعنی اپنے مال (۱) کا میل کچیل مستحقین کو کھانے کے لئے نہ دے گا تو اس کو دوزخ میں زخموں کا دھوون کھانے کو ملے گا (۲)، یا یہ کہ جو

(۱) حدیث میں ہے کہ زکوۃ مسلمانوں کی دولت کا میل ہے۔ (صحیح مسلم کتاب الزکوۃ باب ترک استعمال آل النبی ﷺ علی الصدقۃ ج ۱ ص ۳۹۹، ۴۰۰ و ابوداؤد کتاب الامارۃ باب فی بیان مواضع قسم الخمس ج ۲ ص ۲۲ (۲) الحاقۃ (۶۹:۳۴ تا ۳۶)

خدا کی راہ میں اپنی جان دے گا مرنے کے بعد اس کو جانِ تازہ اور حیاتِ نو بخشی جائے گی (۱) وہ دولت مند جس کو دھوپ کی تپش سے بچنے کے لئے قصر و محل اور پینے کے لئے ٹھنڈے سے ٹھنڈا پانی اور عزت کی جگہ عنایت کی گئی تھی اگر اس نے ان نعمتوں کے ملنے کا حق اس دنیا میں ادا نہ کیا تو دوسری دنیا میں اس کو یہ سامان ملے گا:

فِیْ سَمُوْمٍ وَّحَمِیْمٍ. وَظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ. لَّا بَارِدٍ وَّلَا کَرِیْمٍ. اِنَّھُمْ کَانُوْا قَبْلَ ذٰلِکَ مُتْرَفِیْنَ (واقعہ ۵۶:۴۲-۴۵)	وہ لو اور کھولتے پانی میں، دھوئیں کے سایہ میں، نہ ٹھنڈا نہ باعزت، بے شک وہ پہلے ناز و نعمت میں تھے۔

رویائے برزخ کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جن کا آدھا دھڑ خوب صورت اور آدھا بدصورت تھا یہ وہ تھے جن کے کچھ کام اچھے اور برے تھے (۲) اس لئے بداعمالی بدصورتی اور نیکی خوب صورتی کے رنگ میں نمایاں ہوئی، صریح طور سے یہ اصول ان حدیثوں سے مستنبط ہوتا ہے۔

۱۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ جو مومن خود بھوکا رہ کر کسی دوسرے بھوکے مومن کو کھلائے گا تو خدا اس کو جنت کے پھل کھلائے گا، اور جو پیاسا ہو کر کسی دوسرے پیاسے کو پلائے گا تو خدا اس کو جنت میں شرابِ طہور پلائے گا اور جو کوئی کپڑوں کا حاجت مند ہو کر ننگے کو پہنائے گا تو خدا اس کو جنت کے سبز جوڑے پہنائے گا۔ (ترمذی کتاب الزہد ابواب صفۃ القیامۃ ج ۲ ص ۷۱ (دیوبند)۔

۲۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کسی کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیف دور فرمائے گا اور جو کوئی کسی نادار کو یہاں کسی مصیبت میں پھنسائے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کو مصیبت میں مبتلا فرمائے گا اور کسی مسلمان کی ستر پوشی کرے گا تو خدا دنیا و آخرت میں اس کی ستر پوشی کرے گا اور جو کوئی اپنے بھائی کی مدد میں جب تک رہے گا خدا اس وقت تک اس کی مدد میں رہے گا (ترمذی ابواب البر و الصلة باب ما جاء فی الستر علی المسلم ج ۲ ص ۱۴)۔

۳۔ جو انسانوں پر رحم کرے گا خدا اس پر رحم فرمائے گا (ایضا باب ما جاء فی رحمة الناس ج ۲ ص ۱۴)

---

(۱) آل عمران (۱۶۹:۳) (۲) صحیح بخاری کتاب التعبیر باب تعبیر الرویا بعد الصبح ج ۲ ص ۱۰۴۴۔

تمثیل کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ جو امور معنوی اور غیر مجسم ہیں وہ اپنی مناسب مثالی شکل و صورت میں ظاہر ہوں گے، مثلاً:

۱۔ قرآن میں ہے کہ جو اس دنیا میں حقیقت بینی سے اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا (۱) دیکھو کہ دنیا کی معنوی قلبی نابینائی دوسرے عالم میں ظاہری جسمانی نابینائی کی شکل میں ظاہر ہوگی۔

۲۔ حدیث میں ہے کہ اہلِ تکبر قیامت کے دن چیونٹیاں بنا کر اٹھائے جائیں گے، جن پر ہر طرف سے ذلت وخواری چھائی پھرے گی (۲) دیکھو کہ تکبر کی جزا ذلت وخواری سے ملے گی اور چیونٹیوں سے زیادہ حقیر وذلیل کوئی ہستی نہیں اس لئے ان کی بڑائی اور تکبر کا معاوضہ یہ ہوگا کہ وہ چیونٹی بن کر اٹھیں۔

۳۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو بخل کرے گا قیامت میں اس کا مال سانپ بن کر اس کو ڈسے گا۔ (۳)

صفتِ بخل اس کے حق میں اسی سانپ کی صورت اختیار کر کے اس کی تکلیف کا باعث ہوگی، آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص بلا وجہ بھیک مانگ کر اپنی آبروریزی کرتا ہے، قیامت میں وہ اٹھے گا تو اس کے منہ پر گوشت نہ ہوگا (۴) دیکھو کہ دنیاوی بے شرمی وبے حیائی بے گوشت چہرہ کی صورت میں ظاہر ہوگی، اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ دو بیبیوں کا وہ شوہر جو ایک کا حق ادا کرتا اور دوسری سے غفلت برتتا تھا، قیامت میں اسی طرح آئے گا کہ اس کا ایک پہلو (گویا مفلوج ہو کر) جھک گیا ہوگا (۵) ایک پہلو کا عدم ادائے حق اپنی تمثیلی صورت میں ایک پہلو کی مفلوجی کیفیت میں نمودار ہوگا، یہ

(۱) بنی اسرائیل (۱۷:۷۲) (۲) ترمذی کتاب الزہد ابواب صفة القیامة ج۲ص۷۶ دیوبند (۳) صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں مثل له ماله شجاعا اقرع کتاب الزکوة باب اثم مانع الزکوة ج ۱ ص ۱۸۰ (۴) ترمذی ابواب الزکوة باب فی نہی المصدق ج ۱ ص ۱۴۱ و صحیح بخاری کتاب الزکوة باب من سال الناس تکثرا ج ۱ ص ۱۹۹ یہ روایت سنن نسائی کتاب الزکوة باب المسالة ج ۱ ص ۲۷۸ (دیوبند) و مسند احمد ج ۲ ص ۱۵ و ۸۸ میں بھی ہے اور سب میں یہ الفاظ ملتے ہیں "لیس فی وجهه مزعة" لیکن ترمذی جس کا مصنف نے حوالہ دیا ہے اس کی کتاب الزکوة کے دو ابواب باب من تحل له الزکوة میں ومسئلته فی وجهه خموش او خدوش او کدوح اور باب من لا تحل له الصدقة میں کان خموشا فی وجهه یوم القیامة (ج ۱ ص ۱۴۱ کے الفاظ آئے ہیں۔ "ض" (۵) ترمذی ابواب النکاح باب ما جاء فی التسویة بین الضرائر ج ۱ ص ۲۱۷۔

چند حوالے ذکر کئے گئے ہیں، ان ہی پر جزا وسزا کے اور دوسرے جزئیات کو قیاس کرنا چاہیے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے لئے حسب ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہیے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى. قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا. قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى. (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۴-۱۲۶)	جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کو تنگ گذران ملتی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے، وہ کہے گا اے میرے پروردگار! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا میں تو دیکھتا تھا فرمائے گا اسی طرح میری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے ان کو بھلا دیا، ایسے ہی آج تو بھلایا جائے گا۔

دیکھو کہ دل کی نابینائی قیامت میں ظاہری نابینائی اور یہاں خدا کو بھولنا اور اس کے احکام کو یاد نہ کرنا، وہاں رحمتِ الٰہی کی یاد سے بھول کی شکل میں نمودار ہوگا۔

دوزخ کی جسمانی سزائیں: دوزخ میں جسمانی اور روحانی دونوں سزائیں ملیں گی، قرآن پاک میں جن جسمانی سزاؤں کا ذکر ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ آتشِ دوزخ اور اس کی سوزش کا ذکر بار بار آیا ہے، بلکہ النار یعنی آگ گویا دوزخ کا دوسرا نام ہے، ان ہی معنوں میں السعیر یعنی جلتی آگ بھی بارہا مستعمل ہوا ہے اور عذاب الحریق (جلن کا عذاب) بھی دو چار جگہ کہا گیا ہے اور ایک جگہ یہ بھی ہے کہ:

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ. (مومنون ۲۳: ۱۰۴)	ان کے چہروں کو دوزخ کی آگ جھلس دے گی اور ان کی صورتیں اس میں بگڑ جائیں گی۔

دوزخ کا ایک اور نام سقر ہے، جس کے متعلق یہ ہے کہ:

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ. لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ. لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ. (مدثر ۷۴: ۲۷ تا ۲۹)	اور تمہیں کیا معلوم سقر کیا ہے، نہ وہ رحم کھائے گی نہ چھوڑے گی، چہروں کو جھلس دینے والی۔
كَلَّآ اِنَّهَا لَظٰى. نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى. (معارج ۷۰: ۱۵، ۱۶)	ہرگز نہیں وہ شعلہ والی آگ ہے، منہ کی کھال ادھیڑنے والی۔
اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ، كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ (مرسلات ۷۷: ۳۲، ۳۳)	دوزخ محل کے برابر اونچی چنگاریاں، اتنی بڑی پھینکے گی جیسے زرد رنگ کے اونٹ۔

۲۔ وہاں کوئی سایہ نہ ہوگا بلکہ یہ حکم ہوگا:

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ. لَّا ظَلِیْلٍ وَّلَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ. (مرسلات ۷۷: ۳۰، ۳۱) — چلو ایک چھاؤں کی طرف جس کی تین پھانکیں ہوں گی نہ گھن کی چھاؤں اور نہ تپش میں کام آسکے۔

۳۔ وہاں ٹھنڈک نہ ہوگی:

لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا. (نبا ۷۸: ۲۴) — اس میں وہ نہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ کسی پینے کی چیز کا۔

۴۔ دوزخ میں نہ موت آئے گی کہ چین آجائے اور نہ ایسی زندگی ہی ہوگی جس میں کوئی مسرت ہو، دوجگہ فرمایا:

لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی. (طٰہٰ ۲۰: ۷۴ و اعلیٰ ۸۷: ۱۳) — وہاں نہ مرے گا اور نہ جئے گا۔

۵۔ پینے کو گرم پانی ملے گا جس سے آنتیں نکل پڑیں گی:

وَسُقُوْا مَآءً حَمِیْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ. (محمد ۴۷: ۱۵) — اور وہ گرم پانی پلائے جائیں گے تو وہ پانی ان کی آنتوں کو ٹکڑے کردے گا۔

۶۔ اور پیپ پئیں گے:

اِلَّا حَمِیْمًا وَّغَسَّاقًا. (نبا ۷۸: ۲۵) — لیکن کھولتا پانی اور پیپ۔

۷۔ ان کے اوپر سے گرم پانی چھوڑا جائے گا:

یُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِیْمُ. (حج ۲۲: ۱۹) — ان کے سروں کے اوپر گرم پانی ڈالا جائے گا۔

۸۔ کھانے کو سینڈھے کا پھل ملے گا:

اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ..... اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِیْٓ اَصْلِ الْجَحِیْمِ. طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ. فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِئُوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ. ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَیْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِیْمٍ. (والصّٰفّٰت ۳۷: ۶۲، ۶۴-۶۷) — یا سینڈھے کا پھل .... وہ ایک درخت ہے دوزخ کی جڑ میں اس کے شگوفے جیسے شیطانوں کے سر، تو وہ کھائیں گے اور اس سے پیٹ بھریں گے پھر اس پر گرم پانی کی ملونی ہوگی۔

إِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّومِ. طَعَامُ الْأَثِيمِ. كَالْمُهْلِ. يَغْلِي فِي الْبُطُونِ. كَغَلْيِ الْحَمِيمِ.
(دخان۴۴:۴۳-۴۶)

سینڈھے کا درخت گنہ گار کی غذا ہے جیسے پگھلا تانبا، وہ پیٹوں میں کھولتا ہے جیسے کھولتا پانی۔

۹۔ خاردار جھاڑی کی خوراک ہوگی جس سے بدن کو کوئی فائدہ نہ ہوگا:

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ. لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ. (غاشیہ۸۸:۶،۷)

اور ان کے لئے کوئی کھانا نہ ہوگا لیکن خاردار جھاڑی جو نہ موٹا کرے گی اور نہ بھوک سے بے پروا کرے گی۔

۱۰۔ زخموں کے دھوون کی خوراک ملے گی:

وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ. (حاقہ۶۹:۳۶)

اور نہ کوئی کھانا مگر زخموں کا دھوون۔

۱۱۔ کھانا نگلا نہ جائے گا:

وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ (مزمل۷۳:۱۳)

اور گلے میں اٹکنے والا کھانا۔

۱۲۔ آگ کے کپڑوں کا لباس ہوگا:

فَالَّذِينَ كَفَرُوا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِنْ نَارٍ.
(حج۲۲:۱۹)

کافروں کے لئے آگ کے کپڑے قطع ہوں گے۔

۱۳۔ لوہے کے ہتھوڑے پڑیں گے:

وَلَهُمْ مَقَامِعُ مِنْ حَدِيدٍ. (حج۲۲:۲۱)

اور ان کے لئے لوہے کے ہتھوڑے ہیں۔

۱۴۔ گلے میں طوق اور زنجیریں:

إِذِ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُونَ ۝ (مومن۴۰:۷۱)

جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی وہ کھینچے جائیں گے۔

إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلَاسِلَ وَأَغْلَالًا وَسَعِيرًا. (دھر۷۶:۴)

ہم (خدا) نے کافروں کے لئے زنجیریں اور طوق اور آگ تیار رکھی ہے۔

مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ. (ابراھیم۱۴:۴۹)

وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔

دوزخ میں روحانی سزائیں: ان جسمانی سزاؤں کے ساتھ روحانی سزائیں بھی ہوں گی جو اہلِ نظر کی نگاہوں میں ان سے بھی بڑھ کر ہیں، چنانچہ دوزخ کی وہ آگ جس کی گرمی اور سوزش کا

حال اوپر گذر چکا، وہ دل کو جا کر جھانکے گی، فرمایا:

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ. الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ؀ سلگائی ہوئی اللہ کی آگ جو دلوں کو جھانکے گی۔

(ھمزہ ۱۰۴: ۶، ۷)

وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ. اور جب عذاب کو دیکھیں گے تو اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے۔

(یونس ۱۰: ۵۴)

يٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ اے حسرت اس پر کہ میں نے خدا کے پہلو میں کمی کی۔

(زمر ۳۹: ۵۶)

كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ وہ جب جب دوزخ سے غم کی وجہ سے نکلنا چاہیں۔

(حج ۲۲: ۲۲)

ذلت کا عذاب:

فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ تو آج ذلت کے عذاب کا بدلہ دئے جاؤ گے۔

(احقاف ۴۶: ۲۰)

اس افسوس وحسرت وندامت سے بڑھ کر یہ کہ ان کو معذرت پیش کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی:

لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ (تحریم ۶۶: ۷) آج معذرت نہ پیش کرو۔

اللہ عزوجل سے مکالمہ کا شرف ان کو نہ ملے گا جب وہ بات کرنا چاہیں گے تو وہ فرمائے گا:

اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ. ذلیل ہو اس دوزخ میں اور مجھ سے بات نہ کرو۔

(مومنون ۲۳: ۱۰۸)

سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلوہ سے بھی محروم رہیں گے:

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ. ہرگز نہیں وہ اس دن اپنے رب سے پردہ میں ہوں گے۔

(تطفیف ۸۳: ۱۵)

ان میں سے جنہوں نے اس دنیا میں اپنے پروردگار کو بھلا دیا تھا اس دن وہ بھی ان کو اپنی رحمت وشفقت کی یاد سے بھلا دے گا، فرمایا:

كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے ان کو

تُنْسٰی. (طٰہٰ ۲۰:۱۲۶) بھلا دیا ایسے ہی آج تو بھی بھلا یا جائے گا۔

ایسے دوزخی بھی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہِ کرم سے بھی محروم رہیں گے، وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا، نہ ان سے کچھ بات کرے گا اور نہ ان کی اصلاحِ حال کی کوئی فکر کرے گا، یہ حقیقت میں شفیق ومہربان رب کی انتہائی ناراضی کی تصویر ہے، اس درد کے احساس کو وہی کچھ سمجھ سکتے ہیں جو عشق ومحبت کے زخم خوردہ ہیں: فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ وَ اَیْمَانِھِمْ	جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی (جھوٹی) قسموں کے ذریعہ سے
ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَھُمْ فِی	تھوڑی سی دولت خرید ا کرتے ہیں، آخرت میں ان کا کوئی
الْاٰخِرَۃِ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ	حصہ نہیں، نہ قیامت میں خدا ان سے بات کرے گا نہ
یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ.	ان کی طرف دیکھے گا نہ ان کو سنوارے گا اور ان کے لئے
(آل عمران ۳:۷۷)	دردناک عذاب ہے۔

جنت

جنت کے نام: اس مقام کا نام جو نیکوکار انسانوں کا دائمی گھر ہوگا، قرآن پاک میں عموماً الجنۃ (باغ) بتایا گیا ہے اور کبھی کبھی اس کو مناسب اضافتوں کے ساتھ بھی ادا کیا گیا ہے مثلاً جنۃ النعیم (نعمت کا باغ) جنۃ الخلد (بقائے دوام کا باغ) جنت عدن (دائمی سکونت کے باغ) جنۃ الماویٰ (پناہ کا باغ) ان کے علاوہ اور دوسرے لفظوں سے بھی اس کی تعبیر کی گئی ہے مثلاً فردوس (باغ) روضۃ (چمن) دار الخلد (ہمیشگی کا گھر) دار المقامۃ (قیام کا گھر) دار السلام (امن وسلامتی کا گھر)۔

جنت کا دوام: اس موجودہ دنیا میں بھی گو لذتیں اور مسرتیں ہیں مگر جو چیز یہاں نہیں ہے وہ بقائے دوام ہے یہاں کی ہر لذت عارضی اور ہر مسرت آنی ہے، یہاں خوشی کا کوئی ایسا ترانہ نہیں جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو، یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹے، ہر روشنی کے ساتھ تاریکی، ہر وجود کے ساتھ فنا، ہر سیری کے بعد بھوک، ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے، انسان ہزاروں مشکلیں اٹھانے اور ہزاروں صدمے سہنے کے بعد ایک مسرت کا پیام سنتا اور خوشی کا منظر دیکھتا ہے مگر ابھی اس سے سیر ہونے کی بھی نوبت نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، غرض اس موجودہ عالمِ فانی کی ہر شے آنی جانی ہے اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے۔

لیکن جنت اس مملکت کا نام ہے جہاں کی لذتیں جاودانی اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں، جہاں حیات ہے مگر موت نہیں، راحت ہے مگر تکلیف نہیں، لذت ہے مگر الم نہیں، مسرت ہے مگر غم نہیں، جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں اور وہ شادمانی ہے جس کے بعد حزن و اندوہ نہیں، شیطان نے حضرت آدمؑ کے سامنے جنت کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ بالکل صحیح تھا، اس نے کہا اے آدم!

هَلْ اَدُلُّکَ عَلٰی شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْکٍ لَّا يَبْلٰى. (طٰہٰ ۲۰:۱۲۰)	کیا میں تجھے سدا جینے کا درخت اور وہ بادشاہی بتاؤں جس کو فنا نہیں۔

مگر جنت کا یہ وصف سنا کر ان کو جدھر کا راستہ بتایا وہ موت کے درخت اور فنا کے ملک کی

طرف کا تھا اور یہی وہ فریب تھا جس میں آدم گرفتار ہوئے، چنانچہ اسی جنتی زندگی کی تلاش میں وہ چیز کھالی جو ان کے حق میں زہر تھی یعنی گناہ کا پھل، نتیجہ یہ ہوا کہ جنۃ الخلد اور غیر فانی ملک سے نکل کر ان کو اس فنا کے ملک میں آنا پڑا اور پھر اس جنۃ الخلد اور غیر فانی ملک کا استحقاق ان کے اور ان کی نسل کے اعمالِ صالحہ کا صلہ قرار پایا، چنانچہ فرمایا:

اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّ مَصِیْرًا. (فرقان۲۵:۱۵)	یا ہمیشگی کا باغ جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا جو ان کا صلہ ہوگا اور واپسی کی جگہ۔

یہ ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہے، جہاں کا آرام دائم اور جہاں کی سلامتی ابدی، جہاں کی لذت بے انتہا، جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاوداں ہے، چنانچہ اس کی تصریح قرآن پاک کی سولہ آیتوں میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے، فرمایا:

۱۔وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا. (نساء۴:۱۲۲)	۱۔اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے ہم ان کو باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ کے لئے رہ پڑیں گے، اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی۔

اس تاکید پر تاکید اور پر زور طریقۂ تعبیر پر نظر ڈالئے کہ صرف خلود پر اکتفا نہیں کی بلکہ ساتھ ہی ابدًا فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا، اس پر بھی بس نہ کی بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے، پھر مزید تاکید کا اضافہ کیا کہ اور اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہوسکتی ہے؟ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خلودِ جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے:

۲۔وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا. (نساء۴:۵۷)	۲۔اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔
۳۔لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا. (مائدہ۵:۱۱۹)	۳۔ان کے لئے وہ باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہا کریں گے۔
۴۔وَجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ. خٰلِدِیْنَ	۴۔اور (اللہ ان کو خوش خبری دیتا ہے) کہ ان کے لئے وہ باغ

فِيهَآ اَبَدًا (توبہ ۹:۲۱،۲۲)	ہیں جن میں ہمیشہ کا آرام ہے اور جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔
۵۔وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا. (توبہ ۹:۱۰۰)	۵۔اور ان کے لئے وہ باغ مہیا کئے ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔
۶۔وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا. (تغابن ۶۴:۹)	۶۔اس کو ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔
۷۔وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا.قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا۔(طلاق ۶۵:۱۱)	۷۔اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک کام کرے اس کو وہ ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے اللہ نے اس کو روزی خوب دی۔
۸۔جَزَآءُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا. (بینۃ ۹۸:۸)	۸۔ان کی مزدوری ان کے رب کے حضور میں بسنے کے وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

یہ آیتیں وہ ہیں جن میں اہلِ جنت کو جنت میں خلودِ ابدی کی قطعی بشارت سنائی گئی ہے، ان کے علاوہ وہ آیتیں ہیں جن میں جنت کی راحتوں اور لذتوں کی ابدیت اور دوام کی خبر دی گئی ہے، فرمایا:

۹۔وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا.مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا. (کہف ۱۸:۲،۳)	۹۔اور ان مومنوں کو بشارت دے گا جنہوں نے اچھے کام کئے کہ ان کے لئے اچھی مزدوری ہے جس میں وہ ہمیشہ قیام پذیر رہیں گے۔

سورہ ص میں جنت کی اکثر نعمتوں کے بیان کے بعد ہے:

۱۰۔هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ .اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ. (ص ۳۸:۵۳،۵۴)	۱۰۔یہ وہ ہے جس کا حساب کے دن تم کو دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے بے شبہ یہ ہماری وہ روزی ہوگی جس کو ختم ہونا نہیں ہے۔
۱۱۔وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِى الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا	۱۱۔اور لیکن جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں رہا کریں گے جب تک آسمان اور زمین ہیں لیکن جو تیرا رب چاہے

شَآءَ رَبُّکَ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ۔(ھود ۱۱: ۱۰۸) وہ بخشش ہوگی جو منقطع نہ ہوگی۔

یعنی خدا کی مشیت کے سوا ان کو اس جنت سے کوئی الگ نہ کر سکے گا لیکن اس کی مشیت یہی ہوگی کہ ان کے لئے اس کی یہ بخشش دائمی اور غیر منقطع طریقہ سے ہمیشہ قائم رہے، پھر جس کے متعلق اس کی مشیت کا یہ اعلان ہے وہ فنا کیوں کر ہو سکے گی:

۱۲۔ وَجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ.(توبہ ۹: ۲۱) ۱۲۔ اور وہ باغ جن میں ان کے لئے قائم رہنے والی نعمت ہوگی۔

۱۳۔ اُکُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا (رعد ۱۳: ۳۵) ۱۳۔ جنت کا میوہ اور اس کا سایہ دائمی ہے۔

۱۴۔ وَفَاکِهَةٍ کَثِیْرَةٍ. لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ (واقعہ ۵۶: ۳۲، ۳۳) ۱۴۔ اور بہت سے میوے جن کا نہ انقطاع ہوگا اور نہ جن کی روک ہوگی۔

۱۵۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ. (تین ۹۵: ۶) ۱۵۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کے لئے وہ مزدوری ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

فنائے راحت اور انقطاعِ مسرت کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ راحت و مسرت کے اسباب کا خاتمہ ہو جائے اور دوسرے یہ کہ خود لذت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے، پہلی صورت کی نفی تو گذشتہ آیتوں میں کر دی گئی کہ راحت و مسرت کے اسباب کا وہاں خاتمہ نہ ہوگا، اب رہ گئی دوسری صورت تو گو خٰلِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا کہہ کر اس کی نفی بار بار کی جا چکی ہے مگر ایک جگہ بہ تصریح یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اس احاطہ میں موت کا گذر نہ ہوگا، فرمایا:

۱۶۔ لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰی (دخان ۴۴: ۵۶) ۱۶۔ جنت میں جانے والے پہلی موت کے سوا پھر موت کا مزہ نہیں چکھیں گے۔

لیکن ایک تیسری صورت یہ بھی ممکن تھی کہ مسرت کے اسباب بھی قائم رہیں اور اہلِ جنت کی زندگی بھی دائم ہو مگر کچھ دنوں کے بعد ان کو وہاں سے نکال کر الگ کر دیا جائے تو اس کی تصریح بھی فرما دی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ کوئی اہلِ جنت کو ان کے عیش و راحت کی منزل گاہوں سے باہر نکال سکے، فرمایا:

لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ. (حجر ۱۵: ۴۸) وہاں ان کو کوئی غم نہ چھوئے گا اور نہ وہ اس میں سے نکالے جائیں گے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ خود اہلِ جنت اس سے گھبرا کر نکل آئیں تو فرمایا کہ ان کی جبلت وفطرت ایسی ہوگی کہ وہ خود بھی اس مہمان خانۂ الٰہی سے نکلنا پسند نہیں کریں گے، فرمایا:

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا. سدا رہیں گے اس میں، اس سے منتقل ہونا نہ چاہیں گے۔

(کہف ۱۸: ۱۰۸)

دوام و بقا اور تسلسل وعدمِ انقطاع کی اس تو بر تو تاکید اور اصرار سے اندازہ ہوگا کہ اسبابِ مسرت کی بقا، راحت کا دوام اور زندگی کا تسلسل، جنت کی اصلی خصوصیت ہوگی، یہی وہ حقیقت ہے جس کی لالچ شیطان نے:

وَمُلْكٍ لَّا یَبْلٰی. (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۰) اور غیر فانی سلطنت۔

کہہ کر آدم کو دلائی تھی اور اس بہانہ سے اس عالمِ بقا سے ان کو اس عالمِ فنا میں بھجوا دیا، آخر وہ زمانہ آئے گا جب آدم کی اولاد کو ان کے نیک اعمال کی بدولت اس غیر فانی بادشاہی کی وراثت ہمیشہ کے لئے حاصل ہوگی۔

غیر فانی بادشاہی: دنیا میں شخصی راحت و آلام کا بلند سے بلند تخیل، ایک لفظ بادشاہی کے اندر بخوبی ادا ہو سکتا ہے، اگر انسان کو اس کی انتہائی آرزوؤں کے بر آنے کی خوش خبری دینے کے لئے کوئی لفظ ہو سکتا ہے تو یہی ہے، گویا بادشاہی اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان کی کوئی آرزو کامیابی سے محروم نہ رہے، سامانِ راحت اور اسبابِ شادمانی کی فراوانی سے اس کی مسرت میں کسی غم کا شائبہ نہ ہو، اونچے اونچے محل، ہرے بھرے باغ، بہتی نہریں، سرسبز و شاداب تختے، سونے چاندی کے اسباب، زر و جواہر کے برتن، زریں کمر غلام و خدام، ریشمی لباس، طلائی تخت، موتیوں کے ہار، سونے کے کنگن، شراب کے زمردیں اور بلوریں پیالے، حسین و مہ جبیں بیگمات، غرض ایک لفظ بادشاہی کے یہ تمام ضروری لوازمے ہیں۔

جنت کی مختصر ترین لیکن سچی تعریف آدم کے دشمن نے آدم کے سامنے کی تھی:

وَمُلْكٍ لَّا یَبْلٰی. (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۰) اور غیر فانی بادشاہی۔

آنے والی زندگی کے اس غیر فانی عیش و مسرت کے لئے مختلف پیغمبروں نے مختلف لفظ استعمال کئے ہیں چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے اس کے لئے آسمانی بادشاہی کی اصطلاح قائم فرمائی اور اپنی

گفتگو کے تمام استعاروں میں اس مفہوم کو اسی لفظ سے ادا کیا ہے، مگر جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے کہ انسانی لغت کے الفاظ سے جو مادیت کی گودوں میں پلے، اور مادیت کے ماحول میں پھولے پھلے ہیں، کسی روحانی مفہوم کی تعبیر ناممکن ہے، کہ اس کے ہر لفظ کے مفہوم کو ان ہی لوازم اور خیالات کے ساتھ انسان سمجھنے پر مجبور ہے، جو ہمیشہ سے اس لفظ کے ساتھ وابستہ چلے آتے ہیں، آپ بادشاہی کو آسمانی کہہ کر کسی قدر مادہ سے بلند کریں مگر بادشاہی کے مفہوم کے ساتھ جو موروثی خیالات ولوازم وابستہ ہیں وہ دور نہیں ہوسکتے، چنانچہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی کی آخری شب میں شاگردوں کو جب شراب کا پیالہ بھر کر دیتے ہیں تو آسمانی بادشاہی کے مادی لطف ومسرت کا ذکر اُن لفظوں میں کرتے ہیں۔

''میں پھر تمہیں کہتا ہوں کہ انگور کا شیرہ پھر نہ پیوں گا اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہی میں اسے نیا نہ پیوں۔'' (متی ۲۶۔۲۹ص ۴۹)

آپ نے دیکھا کہ باپ کی آسمانی بادشاہی میں بھی انگور ہی کا شیرہ پینے کو ملے گا۔

اور یوحنا حواری نے جب اس آسمانی بادشاہی کا خواب دیکھا تو وہ ان کو اسی سونے چاندی کے محل، آب حیات کی نہر اور جواہرات کی دیواروں میں نظر آئی، (مکاشفات یوحنا باب ۲۱، ۲۲ص ۴۲۰، ۴۲۱) اور پھر:

''وہاں رات نہ ہوگی اور وے چراغ اور سورج کی روشنی کے محتاج نہیں کیوں کہ خداوند ان کو روشن کرتا ہے اور وے ابدالآباد بادشاہی کریں گے۔'' (۲۲۔۵ص ۴۲۱)

لیکن ''یہ بادشاہی'' عیسوی پیغام میں ہنوز تفسیر کی محتاج ہے، نبوت کے آخری پیغام نے اس اجمال کی تفصیل ان لفظوں میں کی ہے:

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا. وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا. مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا. وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا.	تو اللہ نے اہل جنت کو اس دن کی تکلیف سے بچالیا اور ان کو تروتازگی اور شادکامی سے ملایا اور ان کے صبر کے بدلہ میں ان کو (رہنے کے لئے) باغ اور (پہننے کے لئے) ریشمی کپڑے دیئے، وہ ان باغوں میں تختوں پر تکیے لگائے ہوں گے ان میں نہ دھوپ ہوگی نہ ٹھنڈ اور ان کے

وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا. قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا. وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا. عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا. وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا. وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّ مُلْكًا كَبِيْرًا. عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ وَّ سَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا. اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا.

(دھر ۷۶: ۱۱۔۲۲)

سایے ان پر جھکے ہوں گے، ان کے خوشے پست ہو کر لٹکے ہوں گے، چاندی کے برتن اور نقرئی شیشوں کے آب خورے جو ناپ کر بنائے گئے ہیں ان کو لوگ ان کے پاس لئے پھریں گے اور ان کو وہاں وہ پیالا پلایا جائے گا جس میں سونٹھ ملی ہوگی اس میں ایک چشمہ کا نام سلسبیل ہے، اور سدا رہنے والے کم سن غلام ان کی خدمت میں گھوم رہے ہوں گے اور تو انہیں دیکھے تو سمجھے کہ موتی بکھرے ہیں اور جب تو یہ سب دیکھے تو وہاں نعمت وعیش اور بڑی بادشاہی دیکھے، ان کی پوشاک سبز نرم ریشم اور دبیز ریشم ہو اور ان کو نقرئی کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا پروردگار ان کو پاک شراب پلائے گا، یہ تمہاری مزدوری ہوگی اور تمہاری محنت کی قدر کی جائے گی۔

یہ پورا نقشہ اس عیش و مسرت کا ہے جو اس دنیا کے شاہانہ محلوں کے متعلق تخیل میں آتا ہے، اس بیان کی تائید و تصدیق اس صحیح حدیث سے ہوگی جو جامع ترمذی میں حضرت مغیرہؓ صحابی سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰؑ نے اپنے پروردگار سے پوچھا کہ اے پروردگار جنت والوں میں سے سب سے کم رتبہ کون ہوگا فرمایا وہ شخص جو جنت والوں کے جنت میں داخل ہوچکنے کے بعد آخر میں آئے گا تو اس سے کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ، وہ کہے گا کہ اب میں کہاں جاؤں کہ لوگ اپنے اپنے مقام پر جاچکے اور ربانی نوازشوں پر قابض ہوچکے، اس سے کہا جائے گا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ تجھے وہ ملے جو دنیا کے بادشاہوں میں سے کسی کے پاس نہ تھا، عرض کرے گا خداوندا میں راضی ہوں، فرمائے گا تیرے لئے اتنا اور اس سے دونا اور اسے تگنا اور چوگنا ہے، کہے گا خدوندا میں راضی ہوگیا، خدا فرمائے گا تیرے لئے وہ اور اس کا دس گنا ہے، عرض کرے گا میں راضی ہوگیا، فرمائے گا اس کے ساتھ یہ بھی کہ جو تیرا دل آرزو کرے اور جو تیری آنکھ کو لذت بخشے۔(۱)

---

(۱) جامع ترمذی تفسیر سورۂ سجدہ ج ۲ص ۱۵۵ (حدیث حسن صحیح)

باغ کا استعارہ: آخرت کے خانۂ عیش و راحت کے لئے قرآن پاک نے عموماً جنت اور کہیں روضہ کے لفظ کا استعمال کیا ہے، نادان اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شور و بے حاصل اور خشک صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چوں کہ سرسبز و شاداب باغوں ہی کی ہوسکتی ہے اس لئے ان کے لئے یہ لفظ اس مقامِ آخرت کے لئے قرآن نے استعمال کیا ہے، مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے، اس لئے عرب کی تخصیص بے معنی ہے، کیا دنیا کے سرسبز و شاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ و راغ اور رنگ و گل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان و گلستان کی تخصیص نہیں، یہ فطرتِ انسانی کی تصویر ہے، انسان کسی خطۂ ارضی میں آباد ہو مگر وہ سرسبز و شاداب قطعات، باغ و بہار اور کنارِ آب و نہر کو عیش و مسرت کا مقام سمجھتا ہے اور ان کو دیکھ کر اندر سے اس کی روح وجد کرتی ہے۔

اس استعارہ کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے، انسان کا گھر وہ عیش خانہ ہوتا ہے جس میں حزن و غم کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے، اہل و عیال اور دولت و مال کے متعلق ہر قسم کی فکریں اس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوتی ہیں، مگر جب انسان سیر و تفریح کے لئے باغ و چمن کا رخ کرتا ہے، تھوڑی دیر کے لئے وہ ہر غم کو بھول جاتا اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے اور ایسا شاداں و فرحاں بن جاتا ہے کہ غم والم اس کے ہر گوشۂ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں۔ وحیِ محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ و السلام نے اس لفظ کو اسی لئے استعمال کیا ہے تا کہ اس سے اخروی عیش و مسرت، شادی و خوشی اور فراغِ خاطر کی پوری تصویر کھینچ جائے۔

سامانِ جنت کے دنیاوی نام: یہ حقیقت بار بار دہرائی گئی ہے کہ عالمِ آخرت کی اشیا کو جن دنیاوی الفاظ سے ادا کیا گیا ہے ان سے مقصود بالکل وہی نہیں ہیں جو ان لفظوں سے سمجھنے کے ہم عادی ہیں، بلکہ ان اخروی اشیا کو ان دنیاوی الفاظ سے اس لئے ادا کیا گیا ہے کہ وہ ان سے خاص مناسبت رکھتی ہیں ورنہ از روئے حقیقت ان الفاظ کے لغوی مفہوم و معنی سے ان کی اخروی حقیقتیں بدرجہا بلند و اتم ہوں گی، چنانچہ قرآن مجید کی ان آیتوں میں:

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ	اور ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے یہ خوش خبری سنا
لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا	کہ ان کے لئے وہ باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی

رُزِقُوۡا مِنۡهَا مِنۡ ثَمَرَةٍ رِّزۡقًا قَالُوۡا هٰذَا الَّذِیۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ وَ اُتُوۡا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمۡ فِیۡهَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ. اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَةً فَمَا فَوۡقَهَا (بقرہ ۲: ۲۵، ۲۶)

ہوں گی وہ جب جب ان باغوں سے کوئی پھل دیے جائیں گے کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا اور وہ ان کو ایک دوسرے کے مشابہ دیا جائے گا اور ان باغوں میں ان کی صاف ستھری بیویاں ہوں گی اور ان باغوں میں رہا کریں گے بے شبہ خدا اس سے شرمندہ نہیں کہ وہ ایک مچھر کی یا اس سے بھی کم رتبہ چیز کی مثال بیان کرے۔

ان آیتوں کے سیاق وسباق اور نظم وترتیب پر لحاظ کر کے میرے ذہن میں یہی معنی آتے ہیں کہ ان میں دنیاوی الفاظ اور ان کے اخروی مفہوم کے درمیان تشابہ کا بیان ہے، ورنہ حقیقت کے رو سے ان الفاظ کے دنیاوی لغوی معانی اور اخروی معنوں میں وہی نسبت ہے جو مچھر اور کسی عظیم الجثہ شے کے درمیان ہو سکتی ہے، یہی سبب ہے کہ جنت کی لذتوں اور نعمتوں کی نسبت قرآن نے یہ بھی کہا ہے:

فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ. (سجدہ ۳۲: ۱۷)

تو کسی نفس کو معلوم نہیں کہ ان کے لئے ان کے (اچھے) اعمال کے بدلہ میں آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔

اس ''آنکھوں کی ٹھنڈک'' یعنی لذت وراحت کی کیفیت دنیاوی تخیل سے چوں کہ بہت بلند ہے اس لئے یہ فرمایا گیا ہے کہ جنت کی راحت ولذت کی حقیقت علم وفہم سے پوشیدہ اور مخفی ہے، آنحضرت ﷺ نے اسی مفہوم کو اپنے ان مبارک الفاظ سے واضح فرمادیا ہے:

قال الله اعددت لعبادی الصلحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر. (۱)

خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ مہیا کیا ہے، جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا۔

اگر جنت کے باغوں، نہروں، میووں، غلاموں، شرابوں، ریشمی کپڑوں اور طلائی زیوروں کی وہی اخروی حقیقت ہے جو ان لفظوں سے لغوی طور پر ہم اس دنیا میں سمجھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بہشت کی

(۱) صحیح بخاری کتاب التوحید و الرد علی الجهمیة باب قول الله یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّبَدِّلُوۡا کَلٰمَ اللّٰهِ ...الخ ج ۲ ص ۱۱۱۶ و کتاب التفسیر تفسیر سورہ سجدہ ج ۲ ص ۷۰۴ و صحیح مسلم کتاب الجنة و صفة نعیمها ج ۲ ص ۳۷۶ و ترمذی تفسیر سجدہ ج ۲ ص ۱۵۵۔

لذتوں اور مسرتوں کو ایک مخفی حقیقت نہ فرماتا اور نہ آنحضرت ﷺ اس کی توضیح میں اس درجہ بلندی کرتے کہ وہ ایسی چیزیں ہیں جن کو آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا اور نہ وہ کسی انسان کے خیال میں گذریں، مزید تاکید روایت کے دوسرے الفاظ میں ہے:

بله ما اطلعتم عليه. (صحيح بخاری تفسير سوره سجده ج۲ ص۷۰۴)	جو تم جانتے ہو اس کو چھوڑ دو۔

صحیح مسلم (۱) کی روایت میں یہ الفاظ ہیں بله ما اطلعكم الله عليه، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ "بلکہ خدا نے تم کو اس پر مطلع بھی نہیں کیا ہے"، دوسرے یہ کہ "خدا نے اس کا جو حال بتایا ہے اس سے بھی درگذر کرو"۔

غرض ان لفظوں سے جو بھی تم سمجھ سکتے ہو اس کو چھوڑ کر آگے بڑھو، اصحابِ تفسیر نے حضرت ابن عباسؓ سے بسند نقل کیا ہے:

وقال السفيان الثوری عن الاعمش عن ابی ظبيان عن ابن عباس لا يشبه شئ مما فی الجنة ما فی الدنيا الا فی الاسماء.	سفیان ثوری اعمش سے اور وہ ابو ظبیان سے اور وہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں جو کچھ ہے وہ دنیا کی چیزوں سے ناموں کے سوا اور کسی بات میں مشابہ نہیں۔

دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں:

ليس فی الدنيا مما فی الجنة الا الاسماء. (۲)	جنت میں جو کچھ ہے وہ ناموں کے سوا دنیا میں نہیں۔

غرض ان الفاظ سے ان ہی دنیاوی مشاہدات کی چیزوں کو سمجھنا ضروری نہیں بلکہ ان سے بدرجہا بلند لذائذ اور مسرتیں مراد ہیں جن کی تعبیر کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کسی وجہ مناسب کے سبب سے ان کو ان دنیاوی لفظوں سے ادا کیا جائے اور اس پر بھی مفہوم ادا نہ ہو سکے، اس میں اشکال نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ کی عدمِ قدرتِ کلام کے سبب سے نہیں بلکہ عاجز انسانوں کی ذہنی درماندگی کے

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الجنة و صفة نعيمها ج۲ ص۴۷۷ (۲) تفسیر ابن جریر طبری ج۱ ص۱۳۳ و بیہقی فی البعث کما فی الدر المنثور للسیوطی ج۱ ص۳۸۔

سبب سے ہے، کہ نادیدہ و ناشنیدہ اور دردل ناخلیدہ مفاہیم کے لئے ان کی زبان ولغت میں کوئی لفظ ہی نہیں۔

جنت کی مسرتیں اعمال کی تمثیل ہیں: یہ اصول بارہا بیان میں آچکا ہے کہ دوزخ کی تکلیفیں ہوں یا جنت کی مسرتیں، دونوں اعمالِ انسانی کی تمثیلیں ہیں، اسی لئے قرآن پاک نے بہ تصریح تمام یہ کہا ہے:

إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. — وہی بدلہ پاؤ گے جو تم کرتے تھے۔

(طور۵۲:۱۶)

حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں خدا فرمائے گا اے میرے بندو یہ تمہارے ہی عمل ہیں جو تم کو واپس مل رہے ہیں، تو جو نیکی پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جو برائی پائے وہ اپنے آپ کو ملامت کرے۔(۱)

مثلاً وہ نکوکار جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہمیشہ ترساں ولرزاں رہتے تھے ان کو جنت میں امن وسلامتی کے ساتھ وہاں کی تمام راحتیں ملیں گی تو:

قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ. — کہیں گے ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرتے

فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ. — تھے تو خدا نے ہم پر مہربانی فرمائی اور ہم کو دوزخ کی لُو کے

(طور۵۲:۲۶،۲۷) — عذاب سے بچالیا۔

اس آیت سے صاف نمایاں ہے کہ جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ڈرتے تھے وہ قیامت میں گرم لو (سموم) کے عذاب سے بچائے جائیں گے، قہر وغضب کی تمثیل شعلۂ آتش، لو وغیرہ گرم چیزوں سے ہے، تو جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ترساں تھے دیکھو کہ قیامت میں ان کو سموم یا گرم ہوا کی لو سے بچائے جانے کی بشارت ملی۔

دولت مند وقوی دست منکرین، غریب مسلمانوں کو دیکھ کر دنیا میں ان پر تحقیرانہ ہنستے تھے، قیامت میں اس کا الٹا ہوگا کہ یہ ان پر ہنسیں گے، فرمایا:

---

(۱) صحیح مسلم کتاب البر و الصلۃ باب تحریم الظلم ج۲ص۳۸۷۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	بے شک گنہ گار ایمان والوں پر ہنستے تھے ....
یَضْحَکُوْنَ...........فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ	...........تو آج ایمان والے کافروں
اٰمَنُوْا مِنَ الْکُفَّارِ یَضْحَکُوْنَ.	پر ہنسیں گے۔

(تطفیف ۸۳: ۲۹-۳۴)

نکوکاروں کے دنیا کے آنسو یہاں تبسم اور خندۂ مسرت میں بدل گئے اور گنہ گاروں کی وہاں کی ہنسی یہاں آنسوؤں کا تار بن کر ظاہر ہوئی۔

گنہ گار جو دنیا میں اپنی دولت وقوت کے نشہ میں چور اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ خوش اور مسرور رہتے تھے، وہ یہاں غم گین ہوں گے اور جو وہاں غم گین تھے وہ یہاں خوش اور مسرور ہوں گے:

فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا. وَّیَصْلٰی سَعِیْرًا.	تو وہ موت کو پکارے گا اور دوزخ میں داخل ہوگا کیوں کہ
اِنَّهٗ کَانَ فِیْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا.	وہ اپنے اہل وعیال میں (مغرورانہ) خوش تھا۔

(انشقاق ۸۴: ۱۱-۱۳)

اور جو نکوکار وہاں اہل وعیال میں بیٹھ کر بھی مسرت سے ناآشنا تھا اس کا یہ حال ہوگا کہ:

فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا. وَّیَنْقَلِبُ	تو اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ خوش خوش اپنے
اِلٰٓی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا. (انشقاق ۸۴: ۸، ۹)	لوگوں کے پاس لوٹے گا۔

قرآن پاک میں بارہا یہ آیتیں یا بعینہ ان ہی معنوں کی آیتیں آئی ہیں:

وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ	اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان کو باغوں کی خوش
لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ	خبری سنا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

(بقرہ ۲: ۲۵)

ان آیتوں میں ایمان اور عملِ صالح کے بالمقابل باغ اور اس کی نہروں کا ذکر پابندی کے ساتھ آتا ہے، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی خاص تمثیلی تعلق ہے، یہ ظاہر ہے کہ درخت اصلی چیزیں ہیں جن کی ترقی اور نشوونما پانی سے ہوتی ہے بعینہ اسی طرح ایمان اصل ہے جس کی جڑوں کی سیرابی اعمالِ صالحہ کی آب یاری سے ہوتی ہے، اگر ایمان ہو اور اعمالِ صالحہ نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہوگا جس کی ترقی اور نشوونما کی امید نہیں، اور اگر صرف عملِ صالح ہے اور ایمان نہیں

تو ریگ میں پانی کی روانی ہے جس کا وجود وعدم یکساں ہے، اس تمثیل کے ذہن میں آنے کے ساتھ قرآن پاک کی یہ آیت سامنے آتی ہے:

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ. اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ. تُؤْتِيْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ. (ابراہیم ۱۴: ۲۳-۲۵)	اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ ان باغوں میں داخل کئے گئے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ان میں سدا رہیں گے، وہاں سلامتی کی مبارک باد ہے، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے کیسی ایک مثال بیان کی، نیک بات ایک ستھرے درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط ہو اور ٹہنی آسمان میں ہو، اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ہمہ وقت پھل لایا کرتا ہے اور خدا مثالیں بیان کرتا ہے کہ لوگ شاید سوچیں۔

اس آیت میں جنت اور کلمۂ طیبہ کے درخت کی پوری تمثیل ہے، یہاں تک تقابل ہے کہ پہلے میں جب یہ کہا گیا کہ اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ان باغوں میں سدا رہیں گے تو دوسرے میں ہے کہ وہ درخت اپنے پروردگار کے حکم سے سدا پھل دیتا رہے گا، کلمۂ طیبہ سے یہاں مراد ایمان ہے،(۱) جس کی جڑ مضبوط و مستحکم اور اس کی شاخیں آسمان میں اور اس کے پھل سدا پھلنے والے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عثمان بن مظعونؓ صحابی کی وفات کے بعد ان کی ایک ہم سایہ صحابیہ نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہر بہہ رہی ہے اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت عثمان بن مظعونؓ کی ہے، انہوں نے آ کر یہ خواب آنحضرت ﷺ سے بیان کیا، آپ ﷺ نے اس کی تعبیر میں فرمایا **ذلک عملہ یجری لہ** یعنی یہ نہر ان کا عمل ہے جو ان کے لئے بہ رہی ہے (بخاری کتاب التعبیر باب رویا النساء ج ۲ ص ۱۰۳۷)۔

ان دونوں سابقہ حوالوں سے یہ ہویدا ہوتا ہے کہ ایمان کی تمثیل سدا بہار درخت سے اور عمل کی تمثیل نہرِ رواں سے ہے، اس بنا پر اہلِ جنت کے لئے بار بار جس باغ اور نہر جاری کی بشارت دی گئی ہے وہ حقیقت میں ان کے ایمان اور عملِ صالح کی تمثیلی شکلیں ہوں گی، ان کا ایمان خوش نما

(۱) تفسیر ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکورہ ج ۱۳ ص ۱۲۰۔

اور سدا بہار باغ اور ان کے اعمالِ صالحہ صاف و شفاف نہر کی صورت میں نمایاں ہوں گے اور وہ ان سے لطف ولذت اٹھائیں گے۔

اسی قیاس پر جنت کی دوسری لذتوں اور مسرتوں کی حقیقت کی تشریح کی جاسکتی ہے، علومِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک بڑے واقف کار اور اسرارِ شریعت کے ایک بڑے دانائے راز شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ حجۃ اللہ البالغۃ میں لکھتے ہیں:

واکثر الوقائع الحشریۃ من ھذا	حشر کے واقعات از قبیل تمثیل ہیں............
القبیل............وبالجملۃ فتشبحات	حاصل یہ کہ یہ تمام امور معانی کا جسمانی قالبوں میں
وتمثلات لما عندھا............وتتشبع	اور مثالی صورتوں میں ظاہر ہونا ہے............
النعمۃ بمطعم ھنیء ومشرب مرئ و	اللہ تعالیٰ کی عنایت و مہربانی، خوش مزہ کھانے، خوش گوار
منکح شھی و ملبس رضی ومسکن بھی.	پینے کی چیزوں، رغبت انگیز لذت نکاح، دل پسند لباس
(ص ۳۶۔ ہند ۲۹ مصر)	اور عمدہ مسکن کی صورتوں میں نمایاں ہوگی۔

ہم نے آیات واحادیث کے حوالوں سے پہلے کئی دفعہ یہ دکھایا ہے کہ اس تمثیل و تشبح کے کیا معنی ہیں اور کیوں کر غیر مجسم معانی اپنے مناسب قالبوں میں مجسم ہو کر وجود پذیر ہوتے ہیں، دنیا کے تمام اعمالِ صالحہ کی اگر تحلیل کی جائے تو ان کی اولاً دو قسمیں نکلیں گی، خدا پر ایمان اور خلوصِ دل سے اس کی اطاعت جس کو حقوق اللہ کہتے ہیں اور دوسری بندگانِ الٰہی کے ساتھ حسنِ سلوک، بندگانِ الٰہی کے ساتھ جو نیک سلوک کیا جاسکتا ہے وہ یہی ہے کہ ان کی عزت وآبرو کا پاس کیا جائے، جس کو عفت و عصمت کہتے ہیں اور ان کے ضروریاتِ زندگی کے مہیا کرنے میں امداد کی جائے اور ضروریاتِ زندگی یہی کھانا پینا، پہننا اور رہنا ہیں، ان ہی کی نسبت ہم ان کے ساتھ حسنِ سلوک کر سکتے ہیں، اب یہ پانچ قسمیں ہوئیں، جنت کی نعمتیں ان ہی پانچ قسموں میں منحصر ہیں، ایمان واخلاصِ طاعت کی جزا وہ خود تبارک وتعالیٰ ہے، وہ اپنے قرب اور اپنے دیدار سے نوازے گا، عفت وعصمت کی جزا حسین ومہ جبین بیویوں کی صورت میں نمایاں ہوگی، دوسروں کے کھلانے کی جزا جنت کے باغ اور پھل اور قسم قسم کے الوانِ طعام ہیں، دوسروں کو پلانے کی جزا خوش مزہ وخوش گوار پینے کی مختلف چیزوں کی فراوانی ہے، پہنانے کی جزا ریشم وحریر ودیبا واطلس اور بہتر سے بہتر خوش نما لباس ہے اور رہنے اور رکھنے میں

حسنِ سلوک کی جزا خوش منظر مکان وقیام گاہ ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی بہشت کی صفت یہ بیان فرمائی ہے:

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ . وَأَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ. (طٰہٰ ۲۰:۱۱۹)

بے شک تیرے لئے اس بہشت میں نہ بھوکا ہونا، نہ ننگا ہونا اور نہ پیاسا ہونا، نہ دھوپ میں رہنا۔

یہی چار مختلف انسانی ضرورتیں ہیں جو پھیل کر ایک دنیا ہوگئی ہیں، جب آدم کی اولاد کو اپنے اعمالِ صالحہ کی بدولت نجات ملے گی تو پھر ان کے لئے وہی بہشت ہے جس میں نہ بھوکا ہونا ہے نہ پیاسا ہونا، نہ ننگا ہونا نہ گرمی اور نہ دھوپ کی تکلیف میں گرفتار ہونا، اس حقیقت کی تعبیر دو طرح سے کی جاسکتی ہے، یا تو یہ کہ بہشت میں اہلِ بہشت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ان تمام انسانی ضرورتوں سے یکسر پاک و بے نیاز ہو جاتے ہیں، اس لئے وہاں نہ کوئی بھوکا ہوگا نہ پیاسا، نہ ننگا ہوگا اور نہ دھوپ اور لو کی محنت میں گرفتار، دوسرے یہ کہ بہشت میں اہلِ بہشت کو کھانے کے لئے ایسے الوانِ نعمت ملیں گے جن کو کھا کر انسان پھر بھوکا نہ ہوگا اور پینے کے لئے شراب و شربت کی وہ نہریں بہیں گی جن کو پی کر پھر پیاسا نہ ہوگا اور پہننے کو وہ کپڑے ملیں گے جو پھر نہ میلے ہوں گے اور نہ بوسیدہ ہو کر پھٹیں گے اور رہنے کے لئے ایسے گھنے باغ اور بلند مکانات ملیں گے جہاں دھوپ کا گذر نہ ہوگا۔

یہ اصول پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ دنیا میں انسان کے لئے جو لطف ولذت ہے وہ تھوڑی سی تکلیف کا نتیجہ ہے، انسانی اصول یہ ہے کہ بڑی لذت کے حصول کے لئے تھوڑی تکلیف گوارا کرتا ہے اور بڑی مسرت پر چھوٹی چھوٹی مسرتوں کو قربان کرتا ہے، اسی اصول پر اس کے تمام اعمال کی کامیابی و ناکامیابی کی بنا ہے، اعمالِ صالحہ کے بجالانے میں انسان کو اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور اپنی عارضی خوشیوں اور لذتوں کو ان پر قربان کرنا ہوتا ہے، صبح کے نمازی کو خوابِ سحر کی لذت کو خیر باد کہنا اور دوپہر کی جلتی دھوپ میں ظہر کے لئے مسجد جانا پڑتا ہے، خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا پڑتا ہے اور اپنی بہت سی ناجائز مگر بہ ظاہر دلچسپ خوشیوں کا ایثار کرنا پڑتا ہے، اس طرح پاکیزہ زندگی گذارنے پر اس کو آخرت کی غیر فانی دولت اور ابدی سعادت میسر آتی ہے۔

انسان کو دنیا میں ان اعمالِ صالحہ کی خاطر جن چیزوں کو قربان کرنا پڑتا ہے ان میں پہلی چیز تو

خود اس کی زندگی ہے پھر انسانی زندگی کی وہ چار قسمیں ہیں جن کا نام کھانا پینا، پہننا اور رہنا ہے، اس لئے آخرت میں ان قربانیوں کی جزا میں ان ہی کے مناسب و مماثل جو چیزیں ملیں گی وہ غیر فانی زندگی، الوانِ طعام، اقسامِ شراب و شربت، انواعِ لباس اور بہترین مسکن ہیں، قرآن پاک میں ہے:

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی. وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا. فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی. وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی. فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی. (نازعات ۷۹: ۳۷-۴۱)	پس جس نے خدا سے سرکشی کی اور دنیاوی زندگی (کے ناجائز لطف، آرام) کو ترجیح دی تو دوزخ اس کا ٹھکانا ہے لیکن جو خدا کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو ناجائز خواہشوں سے روکا تو اس کا ٹھکانا بہشت ہے۔

گو اس کی جزئی نیکیوں کی جزا تو وقتاً فوقتاً اس دنیا میں تھوڑی کر کے شہرت، تعریف، ہر دل عزیزی اور دولت کی صورت میں ملتی رہتی ہے، مگر پوری زندگی کی مجموعی جزا دوسری زندگی ہی میں اس کو ملے گی:

وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ. (آل عمران ۳: ۱۸۵)	اور تمہاری مزدوری قیامت کے دن پوری ادا کی جائے گی۔

لطف و مسرت کا تصور: مسرت ایک نفسی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو اپنی کسی خواہش کے پورے ہوتے وقت حاصل ہوتی ہے، اس بنا پر مسرت کے وجود کے لئے کسی خواہش کی تکمیل ضروری ہے، اب انسانی خواہشوں کی تحلیل کرو تو بالآخر ان کی انتہا ان ہی باتوں پر ہوگی جن کی طلب اس کی فطرت کے اندر ودیعت کر دی گئی ہے، اب غور کرو کہ وہ کیا چیزیں ہیں یا کیا چیزیں اس کے فہم میں آسکتی ہیں، وہ یہی ہیں، باغ و بہار، لباس و طعام، حور و قصور، خدم و حشم، سامان و اسباب اور زر و جواہر، مسرت اور راحت کا جب کبھی تخیل آئے گا اور جب کبھی ہم ان کو سمجھنا چاہیں گے اور کہنا چاہیں گے تو ہم کو ان ہی چیزوں کا نقشہ کھینچنا پڑے گا اور ہماری انسانی فطرت ان ہی مسرتوں اور خوشیوں کو ڈھونڈنے کی عادی ہے اور ان ہی کے حصول کی خاطر دنیا میں ہر طرح کی سیہ کاری اور گنہ گاری کی مرتکب ہوتی ہے، اس لئے ان سے احتراز کرنے پر جو چیزیں ہم کو وہاں ملیں گی وہ ہمارے ان ہی عادی و مانوس اسبابِ مسرت کی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوں گی اور ہم ان سے لطف اندوز ہوں گے۔

لطف و مسرت کا اعلاترین تخیل: اس دنیائے کون وفساد میں ہم ایک عجیب قسم کی مصیبت میں مبتلا ہیں، ہم کو تخیل کے لحاظ سے اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو وسیع اور غیر محدود دنیا بخشی گئی ہے لیکن عملاً اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے مطابق اپنی دنیا بنا لینے پر قدرت نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم نے صبر وشکر کا دامن نہیں پکڑا ہے تو ہم سے زیادہ اس دنیا میں تصور وتخیل کی تکلیف میں کوئی اور گرفتار نہیں، جنت آخرت کی اس دنیا کا نام ہے جو ہمارے اعلاترین تخیل اور ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کے مطابق ہوگی:

جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِیْهَا مَا یَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ یجزی اللّٰهُ الْمُتَّقِیْنَ. (نحل ۱۶:۳۱)	رہنے کے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، ان کے لئے ان باغوں میں وہ ہے جو وہ چاہیں اللہ اسی طرح پرہیزگاروں کو بدلہ دے گا۔
وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْۤ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ. (حٰم السجدہ ۴۱:۳۱)	اور تمہارے لئے جنت میں وہ ہے جو تمہارے دل چاہیں، اور تمہارے لئے اس میں وہ ہے جو تم مانگو۔
لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ فِیْهَا وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ. (قٓ ۵۰:۳۵)	ان کے لئے جنت میں وہ ہے جو وہ چاہیں اور ہمارے پاس اس سے بھی بڑھ کر ہے۔
وَفِیْهَا مَاتَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ. (زخرف ۴۳:۷۱)	اور جنت میں وہ ہے جس کی دل خواہش کریں اور جو آنکھوں کو لذت دے۔
لَهُمْ فِیْهَا مَا یَشَآءُوْنَ خٰلِدِیْنَ ؕ كَانَ عَلٰی رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا. (فرقان ۲۵:۱۶)	ان کے لئے جنت میں وہ ہے جو وہ چاہا کریں گے، یہ وعدہ ہے تیرے رب کے ذمہ۔
لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ (زمر ۳۹:۳۴)	ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں گے۔

الغرض جنت وہ مقام ہے جہاں ہم کو وہ کچھ ملے گا جہاں تک ہمارا مرغِ خیال اڑ کر پہنچ سکتا ہے، لطف ومسرت کا وہ بلند سے بلند تخیل جو تصور میں آسکتا ہے وہاں ہمارے لئے مہیا ہوگا، صحابہؓ میں ہر قسم کے لوگ تھے، جنت کے سامانِ مسرت کے متعلق وہ اپنی اپنی پسند اور آرزو کے مطابق آپ ﷺ سے پوچھتے رہتے تھے اور آپ ﷺ جواب دیتے رہتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جنت میں جو سب سے کم رتبہ ہوگا اس کی کیفیت بھی یہ ہوگی کہ

خدائے تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تو اپنی انتہائی آرزو دل میں خیال کر، وہ کرے گا تو خدا فرمائے گا کہ تجھ کو وہ سب دیا گیا جس کی تو نے آرزو کی تھی اور اس کے برابر" (۱) اور یہاں تک کہ بازار کا شوق ہوگا تو بازار بھی لگے گا لیکن وہ حقیقی خرید و فروخت نہ ہوگی کہ وہاں کمی کس چیز کی ہوگی بلکہ وہ مثالی صورتوں میں ہوگی۔ (الا الصور من الرجال) (۲)

کسی کو جنت میں کھیتی کا شوق ہوگا تو دانہ، سبزہ، غلہ اور پھر تیاری، یہ سب کام منٹوں میں انجام پا جائے گا (۳)، ایک بدوی نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ وہاں گھوڑے بھی ہوں گے فرمایا کہ اگر تم کو جنت ملی تو، اگر تم یہ بھی چاہو گے کہ سرخ یاقوت کا گھوڑا ہو جو تم کو جہاں چاہو بہشت میں لیے پھرے تو وہ بھی ہوگا، دوسرے نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ اونٹ بھی ہوگا فرمایا اگر تم جنت میں گئے تو تمہارے لئے وہ سب کچھ ہوگا جو تمہارا دل چاہے گا اور تمہاری آنکھیں پسند کریں گی۔ (۴)

جنت میں اہل جنت کے مختلف رتبے ہوں گے، اس لئے اعلا کے لباس و سامان کو دیکھ کر ادنی کو اپنی کمی کا خیال ہوگا، تو اس کے تصور میں یہ پیدا کر دیا جائے گا کہ (حتی یتخیل الیہ) کہ خود اس کا لباس و سامان اس سے بہتر ہے اور یہ اس لئے ہوگا کہ جنت میں کسی کو غم ہونا ممکن نہیں۔ (۵)

جنت جہاں کوئی جسمانی و روحانی آزار نہیں: کسی صاحبِ دل نے جنت کی یہ تعریف خوب کی ہے۔

بہشت آں جا کہ آزارے نہ باشد

دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی مسرور زندگی بھی ایسی نہیں مل سکتی جس کے پہلو میں مسرت کے پھول کے ساتھ غم کا کوئی کانٹا نہ چبھ رہا ہو، یا تو موجودہ مسرت کے آئندہ ختم ہو جانے کا خوف یا گذشتہ ناکامی کا افسوس ہے، اس بنا پر یہاں کی کوئی خوشی بھی کامل نہیں مگر جنت وہ مقام ہوگا جہاں نہ ماضی وحال

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الایمان باب اثبات الشفاعة ج اص ۹۱ و مشکوٰۃ المصابیح کتاب احوال القیامة و بدء الخلق باب صفة الجنة واهلها ج ۳ ص ۸۸ دمشق ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء، (۲) ترمذی ابواب صفة الجنة باب ما جاء فی سوق الجنة ج ۲ ص ۸۱ و مشکوٰۃ حوالہ سابق ص ۹۲ (۳) صحیح بخاری کتاب الحرث و المزارعة باب ج اص ۳۱۶ (۴) ترمذی ابواب صفة الجنة باب ما جاء فی صفة خیل الجنة ج ۲ ص ۸۰ و مشکوٰۃ المصابیح حوالہ سابق ص ۱۹ (۵) ترمذی ابواب صفة الجنة باب ما جاء فی سوق الجنة ج ۲ ص ۸۱ و مشکوٰۃ حوالہ سابق ص ۹۳۔

کا غم ہوگا اور نہ مستقبل کا خوف ہوگا چنانچہ اہل جنت کے متعلق بار بار ارشاد ہوا:

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ.	نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غم گین ہوں گے۔
(یونس ۱۰:۶۲)	

اور یہی بہشت کی سب سے بڑی نعمت ہوگی، اس میں جسمانی وروحانی ہر قسم کی نعمتیں داخل ہیں۔

دنیا میں کوئی انسان اس وقت تک کوئی لقمہ گلے سے نہیں اتار سکتا اور نہ کوئی چیتھڑا بدن پر رکھ سکتا ہے جب تک اس کے سر کا پسینہ پاؤں تک نہ آئے، دنیا کی تمام فانی مسرتیں ہماری فانی کوششوں کا فانی نتیجہ ہیں، مگر جنت کی خوشیاں بے غم وتکلیف ہماری گذشتہ فانی نیکیوں کا غیر فانی نتیجہ ہیں اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا رحم وکرم ہے کہ وہاں ہم کو ہماری آسایش کا تمام سامان اس قسم کی ادنا زحمت و مشقت اٹھائے بغیر میسر آئے گا جس کے بغیر دنیا میں کوئی انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا اور جس کی کشمکش سے یہ دنیا ہر انسان کے لئے دوزخ بنی ہے، چنانچہ اہلِ جنت جنت میں داخل ہوکر اور شاہانہ تزک و احتشام اور لباس وزیور سے آراستہ ہوکر خدا کی حمد وتعریف کا ترانہ ان لفظوں میں گائیں گے:

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ. وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۚ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ. الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ.	رہنے کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے ان میں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کی پوشاک ان میں ریشم ہوگی اور وہ کہیں گے پاک ہے وہ جس نے ہم سے غم دور کردیا، بے شک ہمارا پروردگار گناہوں کا معاف کرنے والا اور نیکیوں کی قدر کرنے والا ہے اور جس نے ہم کو اپنی مہربانی سے رہنے کے گھر میں اتارا اور ہم کو وہاں نہ مشقت پہنچی اور نہ اس میں ہم کو تھکنا ہے۔
(فاطر ۳۵:۳۳-۳۵)	
لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ. (حجر ۱۵:۴۸)	اس میں ان کو کوئی آزار نہ ہوگا اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

جنت جہاں رشک وحسد نہیں: موجودہ دنیا خیر وشر کے متضاد عناصر سے بنی ہے، یہاں ثواب کے ساتھ گناہ، رحم کے ساتھ سنگ دلی، محبت کے ساتھ کینہ ہے، یہ گناہ وکینہ اور بغض وحسد وہ آگ ہے جس نے یہاں کے قلبی امن وامان کے خرمن میں آگ لگا رکھی ہے، ہر شخص یہاں دوسروں کی اچھی

حالت کو دیکھ کر جلتا ہے اور دوسروں پر غصہ کے جوش وخروش سے ابلتا ہے، جنت وہ عالم ہے جہاں اس آگ اور سیلاب کا وجود نہ ہوگا، ہر قسم کے گناہ، سنگ دلی، عداوت اور بغض وحسد کا خاتمہ ہوگا اور خالص محبت والفت کے دریا موجزن ہوں گے، فرمایا:

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا. (مریم۱۹:۶۲)	اس میں امن وسلامتی کے سوا کوئی بے ہودہ بات نہیں سنیں گے
وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ. (اعراف۷:۴۳)	اور ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کو کھینچ لیا، ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔
وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ. (حجر۱۵:۴۷)	اور ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کو کھینچ لیا، بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

اسی کی تفسیر میں حدیث صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''وہاں نہ دلوں کا اختلاف ہوگا نہ باہم بغض اور کینہ، سب کے دل ایک دل کی طرح متحد ہوں گے'' (۱)

وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی: بہشت میں زندگی کی جو لذتیں ہوں گی ان کی تعبیر الوانِ نعمت اور انواعِ شربت وشراب اور دوسرے مادی لذائذ سے ہوسکتی ہے مگر وہ حظ ومسرت اور اطمینان وسکینت کے علاوہ کسی معنی میں بھی مادی خصوصیات سے آلودہ نہ ہوں گی، یہاں ہر کھانے پینے کے ساتھ بول وبراز، پسینہ اور سوئے ہضم کی علت لگی ہوئی ہے اور بغیر اس کے انسان یہاں زندہ نہیں رہ سکتا، مگر وہاں یہ کچھ نہ ہوگا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اہل جنت کھائیں گے اور پئیں گے لیکن نہ تھوکیں گے، نہ وہاں بول وبراز کی حاجت ہوگی نہ وہاں ناک سے رطوبت نکلے گی، نہ بلغم اور کھکھار جیسی گھنونی چیزیں ہوں گی، کھانا ایک ڈکار میں ہضم ہوگا، وہاں کے پسینہ میں مشک کی خوشبو ہوگی، جو بہشت میں داخل ہوگا اس کو وہ نعمت ملے گی کہ پھر کبھی تکلیف نہ ہوگی، نہ ان کے کپڑے بوسیدہ ہوں گے اور نہ ان کی جوانی زائل ہوگی، وہاں منادئ غیب یہ پکار کر کہہ دے گا، ''یہاں وہ تندرستی ہے کہ بیمار نہ پڑو گے، وہ زندگی ہے کہ پھر موت نہ آئے گی، وہ جوانی ہے کہ پھر بوڑھے نہ ہوگے اور وہ آرام ہے کہ پھر تکلیف نہ پاؤ گے، لوگوں کے چہرے اپنے اپنے اعمال کے مطابق چمکیں گے، کوئی ستارہ کی طرح،

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا باب فی صفات الجنۃ و اھلھا ج۲ ص۴۷۹۔

کوئی چودھویں کے چاند کے طرح''۔(۱)

غور کرو کہ وہ جسمانی زندگی ہماری موجودہ جسمانی زندگی سے کتنی مختلف ہوگی اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے، انسان کبھی شکمِ مادر میں ایک بچہ کی صورت میں زندہ تھا مگر وہاں اس کی زندگی اس کی غذا، اس کی سانس اور دوسرے لوازمِ حیات، بیرونِ شکم کے دنیاوی اصولِ حیات وقوانینِ زندگی سے بالکل مختلف تھے اور جس طرح شکم مادر میں بچہ کا اس بیرونی زندگی کے حکایات کو تعجب کے ساتھ سن کر آمادۂ انکار ہونا دانش مندی نہ ہوگی، ایسے ہی اس مادی زندگی کے خوگر اور اس عالمِ آب وگل کے باشندے اس دوسری زندگی کے اصولِ حیات، طرزِ غذا اور دوسرے لوازمِ حیات کو سن کر آمادۂ انکار ہوں تو ان کا یہ فعل بھی دانش مندی کے خلاف ہوگا۔

جنت ارتقائے روحانی ہے: مادی وجسمانی خلقت وفطرت کی لاکھوں برس کی تاریخ کے مطالعہ اور تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ مادہ نے لاکھوں برس کے تغیرات کے بعد انسانی جسمانیت تک ترقی کی ہے، وہ پہلے جماد بنا پھر نبات کی شکل میں آیا، پھر حیوان کا قالب اختیار کیا، پھر جسمِ انسانی کی صورت میں نمودار ہوا اور یہ مادیت کی معراجِ ترقی ہے، جمادیت مٹ کر نباتیت پیدا ہوئی اور نباتیت فنا ہو کر حیوانیت نمودار ہوئی، پھر حیوانیت معدوم ہو کر انسانیت ظہور پذیر ہوئی اور ارتقائے انسانی کا جسمانی پہلو تکمیل کو پہنچ گیا لیکن انسانیت کا دوسرا رخ جو روحانیت سے عبارت ہے، ہنوز اپنے آغازِ طفولیت میں ہے کیا اس پر بھی اسی ارتقائی دور کے مدارج نہیں آئیں گے، ایک مادہ پرست صرف بامِ ارتقا تک زینہ بہ زینہ چڑھ کر ٹھہر جاتا ہے لیکن مذہب اس سے بھی آگے لے چلتا ہے اور یہاں سے وہ اڑ کر سقفِ آسمان تک پہنچتا ہے اور ملکوتیت کی سرحد کی ترقی شروع کرتا ہے۔

قرآن پاک کی ان آیتوں پر غور کرنے سے اس نظریہ کے اشارات نکلتے ہیں:

اَلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ.	جو فردوس کی وراثت پائیں گے اور وہ اس میں سدا رہیں
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ.	گے اور ہم (خدا) نے انسان کو مٹی کی کشید سے بنایا، پھر اس
ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ. ثُمَّ خَلَقْنَا	کو (رحمِ نسوانی کے ایک) ٹھہراؤ کی جگہ میں ایک بوند بنایا
النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً	پھر اس بوند کو بندھا ہوا خون بنایا پھر اس خون کو لوتھڑا بنایا

(۱) یہ ساری حدیثیں صحیح مسلم باب فی صفات الجنۃ میں ہیں۔ (ج ۲ ص ۴۷۹ و ۴۸۰)

فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ. (مومنون ۲۳:۱۱-۱۴)

پھر اس لوتھڑے کو ہڈیاں بنایا پھر ہڈیوں کو گوشت پہنایا پھر اس کو ایک نئی صورت میں اٹھا کر کھڑا کیا تو برکت والا ہے سب سے بہتر بنانے والا (خدا)۔

لیکن یہ ترقی یہیں تک پہنچ کر رک نہیں جائے گی بلکہ آگے بھی ہوگی اس لئے جس طرح ماں کے پیٹ کی تنگ و تاریک دنیا میں زیست و حیات کے کچھ قواعد تھے، پھر عالم کی اس سے بھی وسیع تر دنیا میں اس نے قدم رکھا، جہاں ترقی و حیات کے دوسرے ہی اصول ہیں، اسی طرح اس دنیائے مادی سے نکل کر اس وسیع تر دنیا میں قدم رکھے گا جہاں ترقی اور سعادت کے اور دوسرے اصول ہوں گے، چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا:

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ. ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ. (مومنون ۲۳:۱۵،۱۶)

پھر بے شک تم اس کے بعد مرنے والے ہو اور پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

جس طرح انسانیت سے پہلے لاکھوں برس میں ایک نوع کی کیفیت مٹ کر دوسری نوع کی کیفیت پیدا ہوتے ہوتے انسانیت تک نوبت پہنچی، موت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوعِ انسانی کی تمام کیفیتیں مٹ کر ایک بلند تر نوع کی کیفیتوں کی تیاری شروع ہوئی، صد ہا ہزار ہا سال کے بعد قیامت سے دوسری نوعِ ملکوتی کا ظہور ہوگا۔

یہاں مسئلۂ ارتقا کا دوسرا اصول سامنے آتا ہے جس کو بقائے اصلح کہتے ہیں، ان مدارجِ ترقی کے اثنا میں ہزاروں وہ نوعیں فنا ہوتی رہتی ہیں جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور وہی باقی رہ جاتی ہیں جن میں آئندہ بقا کی پوری استعداد ہوتی ہے، جس طرح پچھلی استعداد سے آئندہ کی استعداد پیدا ہوتی ہے، اسی طرح اس دوسری ملکوتی نوع کی استعداد ان ہی کو ملتی ہے جن کے اندر اپنی پچھلی مادی و جسمانی زندگی میں اس کی استعداد پیدا ہو چکی تھی، دوزخ کے درجے ان لوگوں کے مقامات ہیں جو گویا ہنوز جمادی و نباتی و حیوانی منزلوں میں ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس دار الامتحان میں اپنی کمی استعداد کے بقدر رہ کر آگے کی استعداد پیدا کر لیں اور ملکوتیت کی ترقی حاصل کر سکیں۔

بہشت کے مختلف مدارج ان کی استعدادوں کے مقامات ہیں جو اپنی پہلی ہی زندگی میں اس ترقی کی استعداد پیدا کر چکے تھے لیکن یہاں پہنچ کر بھی ان کی روحانی ترقی کا دروازہ بند نہ ہوگا بلکہ

وہ بہ قدرِ استعداد تکمیل کے مدارج طے کرتے چلے جائیں گے شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ. (تین ۹۵:۶) ان (بہشتیوں) کے لئے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے۔

ایک دوسری آیت میں ہے کہ نشاۃِ ثانیہ میں اہلِ ایمان کے آگے پیچھے داہنے بائیں نور ہوگا پھر بھی دعا کریں گے:

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (تحریم ۶۶:۸)

ان کا نور ان کے سامنے اور داہنے دوڑے گا اور وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار ہمارے نور کو کامل اور ہم کو معاف کر، تو ہر بات کر سکتا ہے۔

مومنوں کے لبوں پر اللہ کے بخشے ہوئے نور کی مزید تکمیل اور اتمام کی دعا ادھر اشارہ کر رہی ہے کہ ان کے مدارج میں ترقی ہوتی رہے جس کا اقتضا خدا کی ربوبیت کا منشا ہے۔

امن وسلامتی کا گھر: انسان امن وسلامتی کا بھوکا ہے، لیکن وہ اس امن وسلامتی کو اسبابِ راحت کے انبار میں تلاش کرتا ہے اور نہیں پاتا، وہ دنیا میں امن کا گوشہ ڈھونڈتا ہے اور وہ اس کو نہیں ملتا، لیکن یہاں آکر اس کو نہ صرف امن کا گوشہ بلکہ امن وسلامتی کی ایک دنیا ملے گی، وہ پرند جو عمر بھر چار عناصر کے قفس میں گرفتار رہا یہاں وہ سدرۃ المنتہی کی ہر شاخ پر آزادانہ پرواز کرے گا، جنت کے جہاں وحیِ محمدی ﷺ نے اور بہت سے نام بتائے ہیں وہاں اس کا ایک نام دار السلام بھی بتایا ہے جس کے معنی امن وسلامتی کے گھر کے ہیں۔

اہلِ جنت کی نسبت ارشاد ہے:

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ (انعام ۶:۱۲۸) ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس سلامتی کا گھر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جس شریعت کو دے کر اپنے پیغمبر علیہ السلام کو مبعوث فرمایا ہے وہ حقیقت میں اسی امن وسلامتی کی نوید وبشارت ہے، اسی لئے فرمایا:

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ (یونس ۱۰:۲۵) اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے اس امن وسلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی، عبد اللہ بن سلام ایک یہودی عالم تھے، آنحضرت ﷺ کی جس صدائے نبوت نے سب سے پہلے ان کے دل میں گھر کیا وہ یہ تھی "لوگو! سلامتی پھیلاؤ، بھوکوں کو کھلاؤ، جب دنیا

غفلت کی نیند سوئے تو تم اٹھ کر خدا کی عبادت کرو، امن و سلامتی کے گھر میں رہنا تم کو نصیب ہوگا''۔(۱)

جنت کے ذکر میں اس امن و سلامتی کا تذکرہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے در و دیوار سے امن و سلامتی کے ترانے سنائی دیں گے:

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ. سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ. (رعد۱۳: ۲۴،۲۳)	اور فرشتے ہر دروازہ سے ان کے سامنے یہ کہتے ہوئے آئیں گے کہ تم پر سلامتی ہو کہ تم نے صبر کیا تھا تو کیسا اچھا پچھلا گھر ہے۔

وہاں امن و سلامتی کے سوا کچھ اور سنائی نہ دے گا:

اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا. (واقعہ۵۶: ۲۶)	لیکن سلامتی سلامتی کی پکار۔

فرشتے اہلِ جنت کو یوں کہیں گے:

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ. (ق۵۰: ۳۴)	اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو یہ زندگی جاوید کا دن ہے۔
لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا. (مریم۱۹: ۶۲)	اس میں سلامتی کے سوا کوئی اور بے ہودہ بات نہ سنیں گے۔

جنت کا ایک اور نام قرآن میں مقامِ امین، امن والا مقام بتایا گیا ہے، فرمایا:

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ. (دخان۴۴: ۵۱)	بے شک پرہیز گار لوگ امن والے مقام میں ہوں گے۔

مقامِ رحمت: خدا کی رحمت کب نہیں؟ اور کہاں نہیں؟ مگر دنیا کے فطری قوانین کے بہ موجب اس دنیا میں ایسے واقعات اور حادثے بھی پیش آجاتے ہیں جن کو ہم رحمت کے بہ جائے قہرِ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں، پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ خود ہم کو ہمارے اعمال کی بہ دولت خداوند تعالیٰ کے قہر و غضب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے، لیکن ایک عالم وہ ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر و غضب کا نام و نشان نہ ہوگا، وہاں ہر طرف اس کی رحمت اور فیض و کرم کی بارش ہوگی اور اس کی رحمت کے سوا وہاں کوئی اور منظر کہیں اور کبھی دکھائی نہ دے گا:

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ	ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت، خوشنودی اور ان باغوں

(۱) مسند احمد ج ۱ ص ۳۲۳ و ۳۲۴ و ۴۹۳۔

وَجَنّٰتٍ لَّهُمۡ فِيۡهَا نَعِيۡمٌ مُّقِيۡمٌ۔ (توبہ ۹:۲۱)
کی خوش خبری دیتا ہے، جن میں ان کے لیے ہمیشہ کا آرام ہے۔

اہلِ جنت کو جن کے چہرے خوشی سے دمکتے ہوں گے یہ آواز سنائی دے گی:

وَاَمَّا الَّذِيۡنَ ابۡيَضَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ فَفِىۡ رَحۡمَةِ اللّٰهِ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ۔ (آل عمران ۳:۱۰۷)
لیکن جن کے چہرے روشن ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اس میں وہ سدا رہیں گے۔

مقامِ نور: جنت نور کا وہ مقام ہے جہاں ظلمت و تاریکی کا نام و نشان نہ ہوگا، جنتیوں کے چہرے روشن ہوں گے، کوئی ستاروں کی طرح چمکے گا اور کوئی چاند کی طرح، ہر طرف ان کے انوار کی بارش ہوگی، آگے پیچھے، داہنے بائیں ہر سمت سے نورِ درخشاں ہوگا، فرمایا:

نُوۡرُهُمۡ يَسۡعٰى بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَبِاَيۡمَانِهِمۡ۔ (تحریم ۶۶:۸)
ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے دوڑے گا۔

اس دن اہلِ ایمان کے نورِ ایمان کی بجلیاں ہر طرف کوندیں گی:

يَوۡمَ تَرَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ يَسۡعٰى نُوۡرُهُمۡ بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَبِاَيۡمَانِهِمۡ بُشۡرٰٮكُمُ الۡيَوۡمَ جَنّٰتٌ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ۔ (حدید ۵۷:۱۲)
جس دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے چمکے گا آج تم کو خوش خبری ہو، وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں ہمیشہ رہا کرو گے، یہی بڑی کامیابی ہے۔

اس دن اہلِ نفاق اہلِ ایمان سے آرزو کریں گے کہ ذرا ٹھہر جایئے کہ ہمارے ظلمت کدہ میں بھی ایک دم کے لئے روشنی ہو جائے:

يَوۡمَ يَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا انۡظُرُوۡنَا نَقۡتَبِسۡ مِنۡ نُّوۡرِكُمۡ۔ (حدید ۵۷:۱۳)
جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہلِ ایمان سے کہیں گی کہ ذرا ٹھہرو ہم بھی تمہارے نور سے روشنی لیں۔

مقامِ رضوان: جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقامِ رضوان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے راضی اور خوش ہونا کہ اس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے اس بندہ پر عتاب فرمائے گا نہ اس سے ناراض ہوگا، بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوشنودی کی لازوال دولت عطا فرمائے گا، متقیوں

کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں رکھی ہیں، ان میں جنت، نہریں، پاک بیویاں اور ان سب کے بعد روح کی مسرت رکھی ہے، لیکن ان سب کے بعد بھی اپنی سب سے آخری نعمت اپنی اسی رضامندی کو ظاہر فرماتا ہے، چنانچہ سورۂ توبہ میں رحمت اور رضوان کے بعد جنت کے ذکر کو جگہ دی گئی ہے:

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ. (توبہ ۹:۲۱)

ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت اور خوش نودی (رضوان) کی خوش خبری دیتا ہے اور ان باغوں کی جن میں نعمتِ الٰہی قائم رہے گی۔

سورہ حدید میں بھی اسی طرح مغفرت اور رضائے الٰہی کے بعد بہ طور تکملہ کے جنت کا ذکر آتا ہے، فرمایا:

وَفِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ. سَابِقُوْآ اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ. (حدید ۵۷:۲۰،۲۱)

اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور خدا کی بخشش اور رضامندی بھی ہے اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑ، جس کا پھیلاؤ آسمان اور زمین کے پھیلاؤ کے برابر ہے یہ ان کے لئے بنائی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر یقین رکھتے ہیں، یہ اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے۔

سورہ آلِ عمران میں جنت کی تمام نعمتوں کو گنا کر ان کا خاتمہ رضوان کی عظیم الشان بشارت پر کیا گیا ہے، فرمایا:

لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ (آل عمران ۳:۱۵)

جنہوں نے پرہیز گاری کی، ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں وہ سدا رہیں گے اور ان کی بیویاں اور اللہ کی خوش نودی۔

سورۂ توبہ میں جنت کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر نعمت رضوانِ الٰہی کو قرار دیا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ

اللہ نے باایمان مردوں اور عورتوں سے ان باغوں کا وعدہ

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَ مَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ.

(توبہ ۹:۷۲)

کیا ہے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں سدا رہیں گے اور رہنے کے ستھرے گھر اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی ہے، وہی بڑی کامیابی ہے۔

بہشت کی مطمئن روحوں کو یہ نوید مسرت سنائی جاتی ہے:

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ. ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً. (فجر ۸۹: ۲۷،۲۸)

اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کے پاس اسی طرح واپس جا کہ تو اس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی ہو۔

اہلِ جنت کی یہ صفت آئی ہے:

رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ. (مائدہ ۵:۱۱۹)

خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش۔

ان ہی آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے یہ بشارت سنائی ہے کہ خداوند تعالیٰ اہلِ جنت کو آواز دے گا کہ اے جنت والو! وہ جواب دیں گے کہ اے خداوند ہم حاضر ہیں، سب بھلائیاں تیرے پاس ہیں، فرمائے گا (جنت کی نعمتیں پاکر) اب تم خوش ہوئے، عرض کریں گے پروردگار کیوں خوش نہ ہوں کہ تو نے ہم کو وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا، فرمائے گا کہ میں ان تمام گذشتہ نعمتوں سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ تم کو نہ دوں؟ کہیں گے اے پروردگار ان سے بہتر کیا ہے؟ فرمائے گا یہ کہ اپنی رضامندی وخوشی تم پر اتاروں پھر اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔(۱)

مقامِ طیب وطاہر: موجودہ دنیا کی ہر چیز آلودگیوں اور نجاستوں سے بھری ہے، لیکن بہشت وہ مقام ہے جو پاکی، ستھرائی، لطافت اور طہارت کا مظہر ہے، اس میں وہی داخل ہوں گے جو گناہوں سے پاک ہو چکے ہوں، فرمایا:

طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِیْنَ. (زمر ۳۹:۷۳)

تم پاک ہو چکے تو جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ۔

جو زندگی وہاں ملے گی وہ بھی پاک وصاف اور ستھری اور ہر جسمانی وروحانی آلائش سے بری ہوگی، مثلاً:

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الرقاق باب صفة الجنة و النار ج۲ص۹۶۹ وکتاب الرد علی الجهمية و التوحيد باب كلام الرب مع اهل الجنة ج۲ص۱۱۲۱ ومسلم كتاب الجنة و صفة نعيم اهلها باب احلال الرضوان الخ ج۲ص۳۷۷۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ.

(نحل ۱۶: ۹۷)

مرد ہو یا عورت جس نے مومن بن کر اچھے کام کیے ہم اس کو ایک پاک زندگی دے کر جلائیں گے اور ان کو ہم ان کے سب سے بہتر عمل کے مطابق بدلہ دیں گے۔

جو گھر وہاں ملیں گے وہ بھی پاک وصاف اور ستھرے ہوں گے:

وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً (صف ۶۱: ۱۲) اور پاک گھر۔

جو بیویاں ملیں گی وہ بھی پاک ہوں گی:

وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (آل عمران ۳: ۱۵) اور پاک بیویاں۔

وہاں کی جو باتیں ہوں گی وہ بھی پاک ہوں گی:

وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ (حج ۲۲: ۲۴) اور اہلِ جنت کو پاکیزہ گفتگو کی طرف رہنمائی کی جائے گی۔

ان کو پینے کی جو چیز ملے گی وہ بھی پاک ہوگی:

شَرَابًا طَهُوْرًا. (دہر ۷۶: ۲۱) پینے کی پاک چیز۔

غرض کہ ہر چیز وہاں پاک، صاف، طیب و طاہر اور تمام روحانی جسمانی آلودگیوں سے مبرا ہوگی۔

مقامِ تسبیح وتہلیل: اس آرام ولطف کے بعد اہلِ جنت کی روحانی لذت اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور تسبیح و تہلیل ہوگی، یہ ان کی روحانی غذا ہوگی، وہ عالم جہاں ہر طرف انوارِ الٰہی برسیں گے، جہاں صفائی اور ستھرائی کے سوا کوئی اور منظر نہ ہوگا، جہاں قدس ونزاہت کی ہر طرف صورتیں نظر آئیں گی وہاں حمد وثنا کے روح افزا ترانے بھی ہر طرف سے بلند ہوں گے:

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. (یونس ۱۰: ۱۰)

جنت میں ان کی ندا یہ ہوگی کہ اے میرے اللہ! تیری پاکی اور ان کی آپس کی دعا سلامتی ہوگی اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ دنیا کے پروردگار اللہ (تعالیٰ) کی حمد ہو۔

جنت کی تمام شاہانہ نعمتوں کے بعد بڑی نعمت یہ ہوگی کہ خدا کی تسبیح وتہلیل کی نئی نئی پر لطف راہیں وہاں ان پر کھلیں گی، فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا ۖ وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ. وَهُدُوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۖ وَهُدُوا إِلَىٰ صِرَاطِ الْحَمِيدِ○ (حج ۲۲:۲۳،۲۴)	بے شک اللہ ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، ان میں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے، اور ان کی پوشاک ان میں ریشم کی ہوگی اور وہ راہ دکھائے جائیں گے اچھی بات کی اور وہ دکھائے جائیں گے اس سراپا حمد (ذات) کی راہ۔

وہ اپنے ہر سرور اور نعمت کے شکریہ میں فرشتوں کے ساتھ مل کر حمدِ الٰہی کا سرودِ سرمدی گائیں گے اور یہ وقت ہوگا جب عالم وجود کے ہر گوشہ سے اس کی حمد کا ترانہ بلند ہوگا، فرمایا:

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ. وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ۖ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ. وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۖ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ. (زمر ۳۹:۷۳-۷۵)	جنت کے نگہ بان ان سے کہیں گے تم پر سلامتی ہو تم پاک ہو چکے تو جنت میں چلے جاؤ، اہلِ جنت کہیں گے اس اللہ کی حمد ہو جس نے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہم کو اس سرزمین کا مالک کیا کہ جنت میں جہاں چاہیں رہیں، تو کام کرنے والوں کی کیسی اچھی مزدوری ہے اور دیکھے گا کہ فرشتے عرشِ الٰہی کو گھیرے اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر رہے ہوں گے اور سب لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ حمد ہو سارے عالم کے پروردگار کی۔

اہلِ جنت کے متعلق قرآن پاک میں ایک جگہ ہے:

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا ۖ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا. (مریم ۱۹:۶۲)	وہ نہ سنیں گے وہاں بے کار بات، مگر سلام اور ان کی روزی اس میں صبح اور شام ہوگی۔

اس صبح و شام کی روزی سے مقصود کیا جنت کے کھانے کے الوانِ نعمت ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو صبح و شام کی تخصیص کیا تھی وہ تو ہر وقت سامنے ہوں گے، میرا گمان یہ ہے کہ اس روزی سے خدا کی تسبیح و تہلیل کی روحانی روزی اور ربانی غذا مراد ہے اور حدیث کے ان لفظوں کو اسی کی تفسیر جانتا ہوں، صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے جنت کی نعمتوں کے سلسلہ میں فرمایا:

يسبحون الله بكرة وعشيا. (كتاب الجنة باب في صفات الجنة ج۲ص۳۷۹) وہ صبح و شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کریں گے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اہلِ جنت کو خدا کی تسبیح و تقدیس کا الہام ہوا کرے گا۔(۱) اور شاید قرآن پاک کی اس آیت کے یہی معنی ہوں:

وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَ هُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ. (حج ۲۲:۲۴) اور اچھی بات کی طرف ان کی رہنمائی کی جائے گی اور اس سراپا حمد کا راستہ ان کو بتایا جائے گا۔

مقامِ قرب: اہلِ جنت کو جو کچھ نصیب ہوگا ان کے سوا سب سے اعلا مرتبہ قربِ خاص کا مقام ہوگا، بندے اپنے پروردگار کی حضوری کا شرف پائیں گے، قرآن پاک میں جابجا ان کے لئے یہ آتا ہے جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس) یہ قرب خاص کے اشارے ہیں اور ایک جگہ یہ اشارہ اس تصریح سے بدل جاتا ہے:

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ. فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ. (قمر ۵۴:۵۴،۵۵) بے شک پرہیزگار باغوں میں اور نہروں میں، سچائی کی نشست گاہ میں اس بادشاہ کے حضور جس کا سب پر قبضہ ہے۔

دیدار: جنت کی سب سے آخری لیکن بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی تجلی کا نظارہ ہے، کون ہے جو اس مطلعِ انوار کے دیدار کی تاب لا سکے، تاہم یا تو یہ آنکھیں کچھ اور ہوں گی یا وہ نورِ مطلق کسی خاص شان میں نمایاں ہوگا، اس وقت یہ عالم ہوگا کہ وہ نور کا مرکز بن کر نمودار ہوگا اور جنت کی مشتاق آنکھیں اس کی طرف اٹھی ہوں گی:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ. اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ. (قیامہ ۷۵:۲۲،۲۳) کتنے چہرے اس دن تروتازہ اور اپنے پروردگار کی سمت دیکھ رہے ہوں گے۔

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت جریر بن عبد اللہؓ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "تم اپنے پروردگار کو بالمشاہدہ دیکھو گے" دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جیسے چاند کو تم دیکھ رہے ہو ایسے ہی تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے، اس دیدار و رویت میں کوئی ایک دوسرے

(۱) مسلم كتاب الجنة و صفة نعيمها باب في صفات الجنة و اهلها و تسبيحهم الخ ج۲ص۳۷۹ و مسند احمد ج۳ص۳۴۹،۳۵۴،۳۸۴ و سنن دارمی کتاب الرقاق باب في اهل الجنة و نعيمها ص۳۸۲۔

کا مزاحم نہ ہوگا۔(۱) اس تمثیل سے رسول اللہ ﷺ کے دو مقصود ہیں ایک تو شدتِ یقین کا اظہار کہ جس طرح تم اس روشن چاند کو بے شک وشبہہ دیکھ رہے ہو اسی طرح بے شک وشبہہ اپنے پروردگار کو دیکھو گے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ جس طرح لاکھوں کا مجمع بھی ہو تو سب لوگ ایک چاند کو یکساں حیثیت سے بہ اطمینان اس طرح دیکھ سکتے ہیں کہ ایک کا دیکھنا دوسرے کے دیکھنے میں عائق نہیں ہوتا، اسی طرح دیدارِ الٰہی میں کروڑوں کا ہجوم خدا کے دیدار سے ایک دوسرے کا مانع نہ ہوگا، اتنا ہی نہیں بلکہ جس دن جنتی اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے ان کی زبان پر سلامتی کی دعا ہوگی:

تَحِیَّتُهُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ (احزاب ۳۳:۴۴) ان کی دعا جب وہ اپنے پروردگار سے ملیں گے سلامتی ہوگی۔

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ سراپا رحمت پروردگار خود اپنے بندہ کو اپنی زبان سے سلامتی کا پیام دے گا:

سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ. (یٰسین ۳۶:۵۸) رحمت والے پروردگار کی طرف سے پیامِ سلامتی ہوگا۔

بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”خداوند تعالیٰ اپنے بندہ سے ترجمان کے بغیر خود کلام فرمائے گا“ (۲)۔

یہ رویت کیوں کر ہوگی؟ اہل روایت لفظ کے قائل ہیں، اہل عقل زیادتِ ایمان کی تاویل کرتے ہیں، اہلِ حقیقت اس کو اسماوصفات کی ناقابل بیان جلوہ انگیزی سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن فیصلہ یہ ہے:

بیا کین داوری ہارا بہ پیش داور اندازیم

ان تعلیمات کا عملی اثر: اوپر کے صفحوں میں قیامت، حشر ونشر اور جنت ودوزخ کے پورے مناظر گذر چکے، یہ ایمان بالغیب مذہب کی حقیقت کا اصلی جوہر ہے اور اسی کے یقین میں مذہب کی اصلی طاقت پوشیدہ ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ اہلِ عرب کو ان حقائق کی تسلیم سے کس قدر انکار تھا، بلکہ مر کر جی اٹھنا اور اس موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ان کے نزدیک کس قدر مستبعد تھا، قرآن پاک کا بڑا حصہ شرک کے ابطال اور توحید کے اثبات کے بعد اسی حیات بعد الموت کی تلقین اور اس پر ایمان کی دعوت پر مشتمل ہے، آنحضرت ﷺ اپنے اکثر خطبوں میں اس کا حال بیان کرتے تھے اور جمعہ کے

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الرد علی الجهمية باب قول الله وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ الخ جلد ثانی ص ۱۱۰۵ و ۱۱۰۶ (۲) صحیح بخاری جلد ثانی کتاب الرد علی الجهمية باب کلام الرب یوم القيامة مع الانبياء وغيرهم ص ۱۱۱۹۔

خطبوں میں خصوصیت کے ساتھ سورہ ق تلاوت فرماتے تھے، جس میں قیامت کے حالات ہیں، مگر دیکھو کہ ۲۳ برس کی مسلسل تعلیم، قرآن پاک کی تاثیر اور محمد رسول اللہ ﷺ کے فیضِ ہدایت سے نہ صرف ان کا انکار، اقرار سے بدل گیا بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مناظر ان کے دل و دماغ کی لوح میں منقوش ہو گئے تھے:

یاد ہوگا کہ اسلام کے آغاز میں ایک عرب شاعر نے طنزاً کہا تھا:

اموت ثم بعث ثم حشر حدیث خرافة یا ام عمر

کیا مرنا ہے، پھر جینا اور پھر اکٹھا ہونا اے عمر کی ماں یہ خرافات باتیں ہیں۔

لیکن چند ہی سال کے بعد یہ طنزِ انکار، رمزِ یقین سے بدل گیا اور اس وقت عرب کا شاعر یہ کہنے لگا ہم آسمان تک پہنچ گئے اور خدا سے امید ہے کہ ہم اس سے بھی اونچے جائیں گے۔ (۱)

وانا لنرجو فوق ذٰلک مظھرا اور ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ اس سے بھی بلند مقام میں ظہور کریں۔

آنحضرت ﷺ استفسار فرماتے ہیں کہ آسمان سے بھی بلند مقام اور کیا ہے؟ عرض کرتا ہے کہ جنت یا رسول اللہ؟ آپ ﷺ فرماتے ہیں انشاء اللہ، دیکھو کہ جن کی نظریں زمین سے اونچی نہیں جا پاتی تھیں ان کا تخیل آسمان سے بھی اونچا جانے لگا، جن کو مر کر پھر جینا دور از عقل معلوم ہوتا تھا، جن کو آخرت کے مواخذہ کا کوئی ڈر نہ تھا، جن کو اپنے اعمال کی جواب دہی کی پروا نہ تھی، جو سزا و جزا کے مفہوم سے بے گانہ تھے، جو جنت و دوزخ کے تخیل سے ناآشنا تھے وہ اس ہولناک منظر سے ڈرنے لگے، دوسری زندگی پر ان کو اسی طرح یقین آگیا جس طرح آج کی زندگی پر تھا، آخرت کے مواخذہ سے وہ بید کی طرح کانپنے لگے، اعمال کی جوابدہی سے ترساں و لرزاں رہنے لگے، سزا و جزا کے خوف سے وہ اپنے ہر عمل کی باز پرس خود کرنے لگے، جنت کا اشتیاق ان کو بڑی سی بڑی قربانی پر آمادہ کر دیتا تھا، دوزخ کا ڈر ان کے دل کے اندر کے ہر تار کو چھیڑا کرتا تھا، ان کی آنکھوں کو اشک بار رکھتا تھا، فرائض اور ذمہ داری کو دیانت داری کے ساتھ ادا کرنے پر ہر لحظہ ان کو آمادہ کرتا رہتا تھا، راحت کے خواب اور آرام کے بستر سے ان کو چونکا کر عمل کے میدان میں تنہا لے آتا تھا اور ہر نیک کام اور عمدہ عمل کے لئے ان کو ہمہ تن سرگرم اور سرتاپا مصروفِ جدوجہد بنا دیتا تھا، تنہائی اور تاریکی

(۱) اصابہ ج ۶ ص ۲۱۹ مطبع شرفیہ مصر ۱۹۰۷ء اور استیعاب ذکر نابغہ جعدی ج ۱ ص ۳۲۱ حیدرآباد ۱۳۱۸ھ۔

میں ان کے دل اور بدن کو برائیوں اور بداعمالیوں سے باز رکھتا تھا، ان کے ضمیر اور دل کے صفحوں کو ہر وقت خدا کی آنکھوں کے سامنے کھلا رکھتا تھا۔

ایک دفعہ کسی حقیقت کے متعلق دو صحابیوں میں جھگڑا تھا، آنحضرت ﷺ نے فریقین کی باتیں سن کر ایک کے حق میں فیصلہ دے دیا پھر فرمایا ''میں بھی ایک آدمی ہوں، مدعی اور مدعا علیہ میں سے ممکن ہے کہ کوئی زیادہ اچھا بولنے والا ہو جو اپنے دعوی کو خوبی کے ساتھ بیان کرے اور میں اس کے موافق اس کا فیصلہ دوں لیکن درحقیقت وہ چیز اس کی نہ ہو تو گویا میں اس کے گلے میں آگ کا ایک طوق پہنا رہا ہوں''۔ یہ سن کر فریقین پر یہ اثر ہوا کہ دونوں رونے لگے اور ہر ایک اپنا حصہ دوسرے کو دینے لگا۔(۱)

حضرت عمرؓ خدا کے مطیع وفرمانبردار تھے، رسول کے عاشق وشیدا تھے، نیکیوں سے مالا مال تھے جنت کی بشارت سے سرفراز تھے، تاہم آخرت کے مواخذہ اور جواب دہی سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ ایک دفعہ انہوں نے کہا کہ اگر وصالِ نبویؐ کے بعد میرے اچھے اور برے اعمال برابر برابر رہیں تو بھی میں خوش ہوں، اگر جنت نہ ملے تو پروا نہیں مگر الٰہی دوزخ نہ ملے''(۲) وہ نزع کی حالت میں بہت بے چین تھے، بعض صحابہ ان کے اچھے اعمال گنا کر ان کو تسلی دینے لگے تو جواب میں کہا خدا کی قسم اگر کل زمین میرے لئے سونا ہو جاتی کہ اس کو دے کر عذابِ الٰہی سے بچ سکتا تو میں دے دیتا(۳) ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی تھیں اے کاش میں جنگل کی گھاس ہوتی(۴) اے کاش میں کچھ نہ ہوتی۔(۵)

قیامت کے متعلق قرآن پاک کی یہ عجیب موثر آیت:

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ	لوگو! اپنے رب سے ڈرو، قیامت کا بھونچال ایک بڑی
شَیْءٌ عَظِیْمٌ. یَوْمَ تَرَوْنَھَا تَذْھَلُ کُلُّ مُرْضِعَةٍ	چیز ہے جس دن اس کو دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی
عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَھَا	عورت اپنے دودھ پیتے بچہ کو بھول جائے گی اور پیٹ والی
وَتَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی وَمَا ھُمْ بِسُکٰرٰی وَلٰکِنَّ	اپنا پیٹ ڈال دے گی اور لوگوں کو نشہ میں دیکھو گے لیکن وہ
عَذَابَ اللّٰہِ شَدِیْدٌ. (حج ۲۲: ۱،۲)	نشہ میں نہ ہوں گے بلکہ خدا کا عذاب سخت ہوگا۔

(۱) سنن ابی داؤد کتاب الاقضیۃ باب فی قضاء القاضی اذا اخطا ج۲ ص۷۵ (۲) صحیح بخاری باب الھجرۃ ج۱ ص۵۵۷ (۳) صحیح بخاری فضائل حضرت عمرؓ جلد اول صفحہ ۵۲۱ (۴) ابن سعد جزء النساء ج۸ ص۵۱ (۵) صحیح بخاری مناقب عائشہ وتفسیر سورۂ نور باب قولہ لَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ الخ ج۲ ص۶۹۹ ومستدرک حاکم ترجمہ عائشہ ج۴ ص۹ وابن حنبل ج۱ ص۲۷۶ وص۳۴۹۔

جب اتری اور آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کو سنایا اور اس کی تفسیر کی تو ان کے چہروں کا رنگ بدل گیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے (۱) ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے قبر کا ذکر کیا اور موت کے بعد کے عذاب کا حال بیان کیا تو صحابہ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ (۲) حضرت ابو ہریرہؓ کو ایک بار قیامت کے ایک منظر کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اثنائے روایت میں وہ تین دفعہ بے ہوش ہو کر گرے اور جب امیر معاویہؓ کے سامنے یہ آیت (۳) دہرائی گئی تو ان پر بھی گریہ طاری ہو گیا۔ (۴)

اس یقین و ایمان کا دوسرا سماں یہ ہے کہ بدر کا میدانِ جنگ ہے، مشرکین کی ایک ہزار لوہے میں ڈوبی ہوئی فوج کا سیلاب امنڈا آرہا ہے، ادھر تین سو نہتے مسلمان صف باندھے کھڑے ہیں کہ آپ ﷺ صحابہؓ کی طرف خطاب کر کے فرماتے ہیں "لو اس جنت کا موقع سامنے ہے جس کی وسعت آسمان و زمین کے برابر ہے"، ایک انصاری حیرت سے پوچھتے ہیں کہ کیا آسمان و زمین کے برابر؟ آپ ﷺ فرماتے ہیں ہاں وہ خوشی سے واہ واہ کہہ اٹھتے ہیں، آپ ﷺ دریافت فرماتے ہیں کہ تم نے واہ واہ کیوں کہا؟ عرض کی اس امید سے کہ شاید میں بھی اس میں ہوں، فرمایا تم اس میں ہو، یہ سن کر وہ کھجور نکال نکال کر جلدی جلدی کھانے لگے، بالآخر جنت کے جانے میں اتنا توقف بھی شاق گذرا، بولے اتنی دیر بھی کیوں کی جائے، یہ کہہ کر کھجوریں پھینک دیں اور تلوار کھینچ کر آگے بڑھے اور شہید ہوئے۔

غزوہ احد میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، احد کے میدان میں دار و گیر کا شور برپا تھا، لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں کہ ایک صحابی نے آگے بڑھ کر پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! اگر خدا کی راہ میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا، فرمایا جنت میں، وہ کھجور کھا رہے تھے ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں اور لڑ کر جان دے دی، قیسؓ ایک صحابی تھے وہ ایک جہاد میں شریک تھے، انہوں نے اسلامی فوج کے سپاہیوں کے سامنے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جنت کے دروازے تلواروں کے سایے کے نیچے ہیں، ایک معمولی سا مسلمان پاس کھڑا تھا، اس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ کیا آپ نے خود

(۱) صحیح بخاری تفسیر سورہ حج جلد دوم ص ۶۹۳ (۲) سنن نسائی کتاب الجنائز باب التعوذ من القبر ج ۱ ص ۲۲۴ مطبوعہ دیوبند (۳) یہاں مراد یہ آیت ہے وَتَرَىٰ كُلَّ أُمَّةٍ جَاثِيَةً (جاثیہ ۴۵: ۲۸) "ض" (۴) جامع ترمذی ابواب الزهد باب ما جاء فی الریاء و السمعة ج ۲ ص ۶۳۔

رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے، انہوں نے کہا ہاں، یہ سن کر وہ اپنے دوستوں کے پاس آیا اور سلام کر کے رخصت ہوا، میان توڑ کر پھینک دی اور تلوار لے کر دشمن کی صف پر جا پڑا اور شہادت حاصل کی۔(۱)

ان حیرت انگیز واقعات میں سے ہر ایک واقعہ پر غور کرو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے منکر اور کافر عربوں کے دل و دماغ اور ذہن و اعتقاد کو کس طرح آن کی آن میں بدل دیا اور دم کے دم میں ان کے عقائد و اخلاق کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

---

(۱) یہ تینوں واقعے صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب ثبوت الجنۃ للشہید ج ۲ ص ۱۳۷، ۱۳۸ میں ہیں، دوسرا واقعہ سنن نسائی میں بھی ہے، کتاب الجہاد باب ثواب من قتل فی سبیل اللہ ج ۲ ص ۵۰، مگر نسائی میں صرف پہلا واقعہ ہے، دوسرا نہیں "ض"۔

قضا وقدر

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ (قمر ۵۴: ۴۹)

اگرچہ قرآن پاک میں ایمان کے سلسلہ میں اس کا ذکر کہیں نہیں آیا مگر اس کا اعادہ بار بار قرآن میں اتنی دفعہ ہوا ہے کہ اس کی اہمیت اس کی مقتضی ہے کہ اس کو بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دی جائے، چنانچہ بعض صحیح حدیثوں (۱) میں یہ ایمانیات کی آخر کڑی قرار بھی دی گئی ہے اور سلسلۂ توحید میں اسلام نے اللہ تعالیٰ کی وسعتِ قدرت اور مشیتِ مطلقہ کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کا لازمی نتیجہ بھی یہی ہونا چاہیے۔

اس عقیدہ کا ماحصل یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ اب تک ہوا، جو کچھ اب ہو رہا ہے اور جو کچھ آئندہ ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے علمِ سابق اور فیصلۂ ازلی کے مطابق ہوا ہے، ہوتا ہے اور ہوگا، جس طرح مہندس اور انجینئر مکان بنانے سے پہلے مکان کی تمام جزئیات پر غور کر کے پہلے ہی نقشہ تیار کر لیتے ہیں اور اسی مجوزہ نقشہ کے مطابق معمار اور مزدور اس تعمیر کو مکمل کرتے ہیں، اسی طرح اس مہندسِ ازل، خالقِ کائنات نے کائنات کی پیدائش سے پہلے اس کے تمام اصول وقواعد اور دوسرے اہم جزئیات طے کر کے ہر چیز کی نسبت فیصلہ کر دیا تھا، اب اسی فیصلہ کے مطابق یہ کائنات اور اس کے تمام حوادث و واقعات انجام پا رہے ہیں، موت وحیات، فقر وغنا، کامیابی وناکامی، تکلیف وراحت ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کے مطابق وہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔

نفس یہ عقیدہ بھی اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، جو کچھ مخصوص ہے، وہ اس کی تکمیلی تعلیم ہے۔

توراۃ میں حضرت آدمؑ وشیطان اور ہابیل وقابیل کے قصوں میں اس عقیدہ کے اشارات پائے جاتے ہیں، حضرت یوسفؑ کا خواب اسی حقیقت کی تعبیر ہے، مگر ان اشارات سے گذر کر زبور میں علی کھلی تعلیم بھی ملتی ہے، زبور ۱۳۹: ۱۴ تا ۱۶ (کتاب مقدس عہد قدیم ص ۹۹) میں ہے۔

''تیرے کام حیرت افزا ہیں، اس کا میرے جی کو بڑا یقین ہے جب کہ میں پردے میں بنایا جاتا تھا اور زمین کے اسفل میں منقوش ہوتا تھا تو

(۱) صحیح مسلم بروایت ابن عمرؓ وابوہریرہ رضی اللہ عنہما، کتاب الایمان ج ۱ ص ۲۳ مصر۔

میرے جسم کی صورت تجھ سے چھپی نہ تھی، تیری آنکھوں نے میرے بے ترتیب مادہ کو دیکھا اور تیرے دفتر میں یہ سب چیزیں تحریر کی گئیں اور ان کے دلوں کا حال بھی کہ کب بنیں گی، جب ہنوز ان میں سے کوئی بھی نہ تھی۔"

اس کے بعد زبور ۱۴۸: ۱ تا ۶ (ایضاً ص ۱۰۴) کا ترانہ حمد اسی لے میں شروع ہوتا ہے:

"......... خداوند کے نام کی ستایش کریں کہ اس (خدا) نے حکم دیا اور وہ (مخلوقات) موجود ہو گئے، اس نے ان کو پائداری بخشی، اس نے ایک تقدیر مقرر کی جو ٹل نہیں سکتی۔"

انجیل میں اس کی تعلیم خدا کی مرضی کے عنوان سے ہے، حضرت عیسیٰؑ زندگی کی آخری شب کی دعا میں فرماتے ہیں، میری مرضی نہیں، تیری مرضی پوری ہو، (متی ۲۶۔ ۳۹ ایضا کتاب العہد الجدید ص ۵۰) اور اسی مرضی کا ذکر یوحنا (۵۔ ۳۰ ایضاً ص ۱۵۴ و ۶۔ ۳۸ ایضاً ص ۱۵۷) اور خطوط (فلپون ۲۔ ۱۳، ایضاً ص ۳۵۲) میں ہے اور رومیون کے نویں باب (ایضاً ص ۲۵۸) میں اس کی پوری تفصیل ہے، مگر خاتم النبیین علیہ الصلوۃ والسلام کی تعلیم نے اول یہ کیا کہ اس مسئلہ کی مجمل حقیقت کی توضیح اور اس کی حکمت و مصلحت کی تشریح کی اور پھر یہ کیا کہ گذشتہ مذاہب کی طرح اپنے دفتر کے کسی ایک گوشہ میں بہ طور ایک حقیقتِ ثابتہ کے اس کو کہہ کر خاموشی اختیار نہیں کر لی بلکہ بار بار اتنی دفعہ دہرایا کہ سننے والوں کے دلوں میں اس کی عقیدت نے گھر کر لیا اور یہ تلقین یقین کی صورت میں ان کی رگ و ریشہ میں پیوست ہو گئی اور ایسا اس نے اس لئے کیا کہ صبر و شکر کی اخلاقی تعلیم صرف نظریہ کی صورت میں نہ رہ جائے بلکہ عملی حیثیت میں اس کے پیروؤں کے اندر استقلال و ثبات کی روح اور دنیا کے مصائب و حوادث میں تسلی و تشفی کی قوت پیدا کرے اور اس طرح یہ عقیدہ پہلے کی طرح صرف ایک مذہبی تلقین یا فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت میں نہ رہے بلکہ ایک مفید عملی تعلیم کی شکل اختیار کر لے۔

وحیِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصطلاح کے لئے دو لفظ اختیار کئے ہیں، ایک قدر ہے جس کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں اور دوسرا قضا جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں:

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَٰهُ بِقَدَرٍ. (قمر ۵۴: ۴۹) ہم نے ہر چیز کو اندازہ سے پیدا کیا۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا (انعام ۶: ۲) وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے بنایا پھر ایک وقت کا فیصلہ کیا۔

یہ دونوں لفظ بجائے خود اس عقیدہ کی اسلامی حقیقت کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں، مقصود یہ ہے کہ کائنات کی پیدائش سے پہلے کائنات کی ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے اندازہ اور تقدیر سے ہر ایک کا فیصلہ فرما دیا ہے اور متعین کر دیا ہے، اسی کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے، اس میں خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی تغیر نہیں ہو سکتا، آسمان کو جس طرح بنایا، آفتاب کو جس طرح روشن کیا، چاند کے متعلق جو اصول مقرر فرمایا، ستاروں کے نکلنے اور ڈوبنے کے جو احکام دے دئے، موت وحیات، فنا و بقا اور عروج وزوال، غرض کائنات کی ہر شق اور ہر پہلو کے متعلق جو اصول متعین فرمادئے ان ہی پر وہ چل رہی ہے، قرآن پاک میں کائنات کے بہت سے حالات کے بیان کرنے کے بعد ہے:

وَالشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقۡدِيۡرُ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ. وَ الۡقَمَرَ قَدَّرۡنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالۡعُرۡجُوۡنِ الۡقَدِيۡمِ. لَا الشَّمۡسُ يَنۡۢبَغِىۡ لَهَاۤ اَنۡ تُدۡرِكَ الۡقَمَرَ وَ لَا الَّيۡلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِىۡ فَلَكٍ يَّسۡبَحُوۡنَ ٥ (یٰس ۳۶: ۳۸-۴۰)	اور سورج اپنے ٹھہراؤ پر چل رہا ہے، یہ ہے غالب اور علم والے کی تقدیر (اندازہ) اور چاند کو ہم نے تقدیر (اندازہ) کر دی ہیں منزلیں، یہاں تک کہ وہ پرانی ٹہنی کی طرح (خمیدہ ہو کر) لوٹتا ہے، نہ تو سورج کی قدرت میں ہے کہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے آگے بڑھے، ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔

یہ تو آسمان کی بات تھی، زمین کے متعلق ارشاد ہوا:

وَقَدَّرَ فِيۡهَاۤ اَقۡوَاتَهَا (حٰمٓ السجدہ ۴۱: ۱۰)	اور زمین میں اس کی روزیاں اندازہ کر دیں۔

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ دنیا کی ہر چیز میں اس نے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے:

قَدۡ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَىۡءٍ قَدۡرًا. (طلاق ۶۵: ۳)	اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ بنایا۔

موت وحیات بھی اسی اندازہ کے مطابق ہے، فرمایا:

نَحۡنُ قَدَّرۡنَا بَيۡنَكُمُ الۡمَوۡتَ (واقعہ ۵۶: ۶۰)	ہم نے تمہارے درمیان موت کو اندازہ کر دیا۔

ہر شے میں اللہ تعالیٰ نے جو اندازہ لگایا ہے وہ وہی چیز ہے جس کو لوگ قانونِ قدرت کہتے ہیں اور جس پر دنیا چل رہی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ہر حصہ اور ہر پہلو کے متعلق اپنے احکام معین فرمادئے ہیں جن کی اطاعت اس پر واجب ہے، علیٰ ہذا انسانوں کی ترقی وزوال، موت و حیات، بیماری وصحت، دولت وافلاس، آرام وتکلیف، سعادت وشقاوت ہر ایک کے اصول وقواعد

مقرر فرمادئے ہیں، غرض ان کو آرام و تکلیف جو کچھ بھی پیش آتی ہے خدا کے علم اور اجازت سے پیش آتی ہے:

مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ — نہیں پہنچی تم کو کوئی مصیبت لیکن اللہ کے حکم سے۔

(تغابن ۶۴:۱۱)

اور چوں کہ تقدیر سے کوئی چیز ہٹ نہیں سکتی اس لئے مقدرات کو نوشتۂ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں، کہ جس طرح لکھی ہوئی بات قائم رہتی ہے، مٹتی اور بھولتی نہیں، ایسے ہی یہ باتیں بھی مٹتیں اور بدلتیں نہیں:

وَمَا تَحۡمِلُ مِنۡ اُنۡثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلۡمِهٖ ؕ وَ مَا یُعَمَّرُ مِنۡ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا یُنۡقَصُ مِنۡ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیۡرٌ. (فاطر ۳۵:۱۱)

اور کوئی عورت حمل میں نہیں رکھتی اور نہ جنتی ہے لیکن خدا کے علم سے اور نہ کسی دراز عمر کو عمر کی درازی ملتی ہے یا اس کی عمر کم کی جاتی ہے لیکن وہ کتاب میں ہے، بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔

اس آیتِ پاک میں دو ٹکڑے ہیں، ایک یہ کہ جو عورت بھی اپنے پیٹ میں بچہ رکھتی ہے، یا بچہ جنتی ہے، وہ خدائے پاک کے علم سے ہے، دوسرا یہ ہے کہ جس کو چھوٹی بڑی جو عمر بھی ملتی ہے وہ کتابِ الٰہی میں پہلے سے لکھی ہوتی ہے، ان دونوں ٹکڑوں کے ملانے سے معلوم ہوگا کہ کتابِ الٰہی میں ہونا اور علمِ الٰہی میں ہونا دونوں ہم معنی ہیں۔

قرآن پاک نے اس کو بھی ظاہر کیا ہے کہ قضا و قدر کے عقیدہ کی فلسفیانہ حقیقت سے زیادہ اس کی نظر اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت پر ہے، انسان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی ناچیز کوشش کی ذرا سی کامیابی پر فخر و غرور کے نشہ میں چور ہو جاتا ہے اور ذرا سی ناکامی پر وہ دل شکستہ ہو کر ہمت ہار بیٹھتا ہے، یہ دونوں مختلف اخلاقی بیماریاں اس لئے اس کو لاحق ہوتی ہیں کہ وہ اپنے کام کے اچھے یا برے نتیجے کو خود اپنے کام کا لازمی نتیجہ جانتا ہے، اس لئے وہ کبھی اپنے کیے پر مغرور اور کبھی ملول ہوتا ہے اور یہ دونوں کیفیتیں افراد اور اقوام کی متانت، استقلال اور صبر و ثبات کے جوہر کو برباد کرتی ہیں، اس لئے ایک ایسے عقیدہ کی ضرورت تھی جو کامیابی کے فخر و مسرت اور ناکامی کے افسوس و حسرت دونوں موقعوں پر عاجز انسانوں کی دست گیری کرے اور وہ یہی عقیدۂ قضا و قدر ہے۔

اس عقیدہ کا منشا یہ ہے کہ ہم کو جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہ راست نتیجہ نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا نتیجہ ہے، اس لئے اس پر ہمارا فخر وغرور کرنا بے جا ہے، اسی طرح ہم کو جو ناکامی پیش آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت و مصلحت کا نتیجہ ہے اور ہمارے کام سے پہلے ہی ہمارے کاموں کے نتیجے اس علام الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے تھے، اس لئے ہم کو دل شکستہ اور مایوس نہ ہونا چاہیے بلکہ اسی جوش وخروش اور سرگرمی سے پھر از سر نو جدوجہد میں مصروف ہو جانا چاہیے:

اس مسئلہ کی یہ پوری توضیح سورہ حدید میں ان لفظوں میں مذکور ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ. لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ. (حدید ۵۷: ۲۲، ۲۳)	کوئی مصیبت نہیں آتی ملک میں اور نہ خود تم (اس ملک کے بسنے والوں) میں لیکن یہ کہ وہ ایک کتاب (الٰہی) میں اپنی پیدائش سے پہلے درج ہوتی ہے، یہ کہ اللہ پر آسان ہے ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ تم اس پر جو تم سے جاتا رہا ہے غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو (اللہ) دے اس پر اترایا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے، بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا۔

اس آیتِ کریمہ نے مسئلہ قضا وقدر کے فلسفہ کو اس خوبی سے واضح کیا ہے کہ اس کی تائید کے لئے کسی مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی، یہ اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا کہ صحابۂ کرامؓ کی گردنیں عین کامیابی وفتوحات کی حالت میں خداوند قادرِ مطلق کے آگے جھک جاتی تھیں اور ناکامی کی حالت میں ان کے دل یاس وناامیدی سے دوچار نہیں ہوتے تھے اور ان کی عملی زندگی کا جو نتیجہ بھی پیش آتا تھا وہ اس کو اپنی طرف سے نہیں بلکہ خداوند عالم کی طرف سے سمجھ کر خاموش رہتے تھے، مالی بے چارگی، مصیبت، عزیزوں کی مفارقت، لڑائیوں کی ناکامی، کسی موقع پر وہ رحمتِ الٰہی سے مایوس ہونا نہیں جانتے تھے اور ہر خطرناک سے خطرناک کام کے لئے وہ قدم اٹھا بیٹھتے تھے کہ ان کا یقین تھا کہ موت اپنے وقت پر آئے گی اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا، اسی لئے ان کے دلوں میں وہ عزم ہوتا تھا کہ نہ اس کو پہاڑ روک سکتے تھے نہ سمندر بہا لے جا سکتے تھے، نہ حوادث کا طوفان اس کو اکھاڑ سکتا تھا اور نہ بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے اس کو جلا سکتے تھے:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ	کسی کے اختیار میں نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مر سکے، یہ

كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۔ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (آل عمران ۳:۱۴۴-۱۴۶)

لکھا ہوا مقرر ہے جو کوئی دنیا کا معاوضہ چاہے گا تو ہم اس کو اس میں سے کچھ دیں گے اور جو آخرت کا معاوضہ چاہے گا اس میں سے کچھ (یہاں) دیں گے اور پورا معاوضہ شکر کرنے والوں کو آئندہ (وہاں) دیں گے، کتنے پیغمبر تھے جو لڑے، ان کے ساتھ بہت سے خدا کے طالب تھے تو خدا کی راہ میں ان کو جو مصیبت پیش آئی اس کی وجہ سے نہ دل ہارے، نہ سست ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ان آیتوں نے یہ واضح کر دیا کہ قضا و قدر کے عقیدہ کا نتیجہ پستی، سستی اور دون ہمتی نہیں بلکہ بلندی استقلال اور صبر و ثبات ہے اور یہی وہ چیز ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے کارناموں میں ہر دیکھنے والے کو صاف نظر آتی ہے، ان کو صاحبِ وحی کی یہ تعلیم تھی کہ وہ دشمنوں سے کہہ دیں کہ ہمیں ڈر نہیں کیوں کہ:

لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ (توبہ ۹:۵۱)

ہم پر کوئی آفت آ ہی نہیں سکتی لیکن جو خدا نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے، وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ ہی پر چاہئے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔

خطرات اور مشکلات کی ان کو پروا نہیں کہ جن کے لئے موت لکھی ہے وہ میدانِ جنگ میں بھی مریں گے اور بسترِ راحت پر بھی اور جن کی موت کا مقررہ وقت نہیں آیا وہ تلواروں کی دھاروں اور سمندروں کے طوفانوں سے بھی سلامت بچ کر نکل آئیں گے:

يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۚ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ (آل عمران ۳:۱۵۴)

منافق کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات مان لی جاتی تو ہم یہاں مارے نہ جاتے، کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن پر یہاں مرنا لکھا جا چکا تھا وہ از خود اپنے مقتل میں نکل کر چلے جاتے۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ

تم جہاں بھی رہو تم کو موت آ کر پالے گی اگرچہ تم مضبوط

فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ. (نساء۴:۷۸) اور مستحکم قلعوں میں ہو۔

یہی وہ عقیدہ ہے جو مسلمان کی ناقابلِ ہزیمت جرأت اور غیر شکست پذیر عزیمت اور بے خوف بہادری کا راز ہے، کچھ لوگوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ مسئلۂ تقدیر کے ماننے سے انسان کا مجبورِ محض ہونا لازم آتا ہے اور اس سے یہ تعلیم نکلتی ہے کہ انسان اپنی تقدیر پر صابر وشاکر ہوکر سست وغافل بن کر بیٹھ رہے، حالاں کہ اگر یہ صحیح ہوتا تو نہ رسولوں کی بعثت کی ضرورت تھی، نہ ربانی کتابوں کے اترنے کی حاجت ہوتی، نہ تبلیغ وارشاد کی تاکید ہوتی، نہ اصلاح وہدایت کا حکم ہوتا اور خدا کی مخلوق اپنے حال پر چھوڑ دی جاتی، مگر ایسا نہیں کیا گیا، لاکھوں پیغمبر بھیجے گئے، کتنی کتابیں اتریں، کروڑوں مبلغ اور مرشد بنا کر پھیلائے گئے، ہدایت وارشاد کی تاکید پر تاکید آئی، لوگوں کی دعوت و اصلاح ہر مسلمان کا فرض ٹھہرایا گیا، کوشش ومحنت، سعی وتلاش اور جدوجہد کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی، محمد رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد سے معمور زندگی ہمارے لئے نمونہ ٹھہرائی گئی اور خلفائے راشدین اور عام صحابہؓ نے اپنے کارناموں سے اس نمونہ کی کامیابی کی تصدیق کی۔

اب کیا محمد رسول اللہ ﷺ کی تلقین اور آپ کا عمل دو متضاد چیزیں تھیں؟ نہیں یہ دونوں ایک دوسرے کی مؤید تھیں اور اس طرح یہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتی تھیں کہ اعملوا فکل میسر لما خلق (۱) لوگو! اپنے اپنے کام کئے جاؤ کہ تم میں سے ہر شخص سے وہی کام صادر ہوں گے جن کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے، کام کرنا انسان کا فرض ہے اور اس کے نتیجہ کے مطابق جزا دینا خدا کا کام ہے اور یہ تقدیر ہے، فرمایا:

اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی. فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی. وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی. فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی. وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰی. وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی. فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی. وَمَا یُغْنِیْ عَنْہُ مَالُہٗٓ اِذَا تَرَدّٰی. اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی. (لیل ۹۲:۴-۱۳)	بے شبہ تمہاری کوششیں مختلف رخ کی ہیں تو جس نے دیا اور پرہیزگاری کی اور نیکی کو سچ کر دکھایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ آسانی کی طرف لے چلیں گے اور جس نے نہ دیا اور بے پروائی برتی اور نیکی کو جھٹلایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ سختی کی طرف لے چلیں گے اور اس کی دولت مندی اس کو گڑھے میں گرنے سے نہیں بچا سکتی ہے، بے شک راہ سوجھانا ہمارا فرض ہے اور آخر واول ہمارے لئے ہے۔

(۱) بخاری کتاب التفسیر واللیل اذا یغشی ج۲ص۸۳۷ وکتاب القدر باب قولہ وکان امر اللہ قدرا الخ ج۲ص۹۷۷ و کتاب الادب باب الرجل ینکت الشیء الخ ج۲ص۹۱۸ وکتاب التوحید باب قول اللہ ولقد یسرنا القران الخ ج۲ص۱۱۲۶۔

یہ ہے قضا وقدر اور سعی وعمل کی باہمی تطبیق جس کی ژولیدگی نے اسلام سے پہلے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا، کام کرنا اور عمل کر دکھانا انسان کا فرض ہے اور اس کے مطابق اس کی جزا کا دینا جو اس کام کے لئے پہلے سے مقدر ہو چکی ہے، خدا کا کام ہے، نیکوں کو آہستہ آہستہ نیکی کے مزید راستہ کے دکھانے کا نام توفیق وہدایت ہے اور بروں کو خدا کی طرف سے اس توفیق وہدایت کے نہ ملنے کا نام عدمِ توفیق وضلالت ہے اور ان دونوں میں سے ایک کا ملنا انسان کی ابتدائی کوشش سے ہے، خدا فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا. (عنکبوت ۲۹:۶۹) — اور جو ہماری بات میں کوشش کرتے ہیں البتہ ہم ان کو اپنا راستہ سوجھاتے ہیں۔

خدا کی طرف سے توفیق وضلالت کا ملنا خود انسان کے اچھے یا برے عمل کا لازمی نتیجہ ہے:

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ. (بقرہ ۲:۲۶) — اور ہم اس سے گمراہ نہیں بناتے لیکن ان ہی کو جو ہمارا حکم نہیں مانتے۔

غرض پہلے فسق عدم اطاعت اور نافرمانی ہوتی ہے، تب اس کے نتیجہ کے طور پر خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى. وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى. (نجم ۵۳:۳۹،۴۰) — اور انسان کے لئے نہیں لیکن وہی جس کی اس نے کوشش کی اور بے شک اس کی کوشش (خدا کے حضور) دیکھی جائے گی۔

اس کی مثال بالکل بچہ کی سی ہے، بچہ چلنا یا بولنا کیوں کر سیکھتا ہے، وہ پہلے چلنے اور بولنے کی خود کوشش کرتا ہے تو اس کے والدین اس کو چلنا اور بولنا سکھاتے ہیں، بچہ پاؤں اٹھاتا ہے اور والدین اس کے ہاتھ پکڑ کر اس کو دو چار قدم چلاتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ چلنا سیکھتا ہے، وہ پہلے زبان ہلاتا ہے اور مبہم آوازیں نکالتا ہے تو والدین اس کو بامعنی الفاظ کی تلقین کرتے ہیں اور اس طرح دونوں کی کوششیں مل کر بارآور ہوتی ہیں، اسی طرح تقدیر الٰہی اور عملِ انسانی باہم مل کر انسانوں کی عملی تاریخ تیار کرتے ہیں۔

جبر وقدر: عموماً لوگ اسی موقع پر جبر وقدر کے مسئلہ کو چھیڑتے ہیں، یعنی یہ کہ انسان اپنے عمل میں مجبور ہے یا مختار، حالاں کہ یہ سررشتۂ کائنات کا وہ عقدہ ہے جس کا حل نہ صرف یہ کہ مذاہب کے ناخن

سے نہیں ہوتا بلکہ عقل کے ناخن سے بھی نہیں ہوسکتا، جس طرح اہلِ مذاہب ارادۂ الٰہی اور ارادۂ انسانی کی باہمی تطبیق میں حیران ہیں، اسی طرح فلسفۂ الٰہیات کے معلم علمِ الٰہی اور انسان کی عملی آزادی کے درمیان اور فلسفۂ اخلاق والے انسان کی آزادیٔ عمل اور اس کے موروثی اثرات، فطری جذبات اور ماحول کی تاثیرات کی مجبوریوں کے درمیان جو تصادم ہے اس کو بہ مشکل بچا سکتے ہیں۔

دنیا کے عام مذاہب کا بھی یہی حال تھا، ہر دھاگے میں یہ گرہ اسی طرح پڑی ہوئی تھی اور اس کے حل کی صورتیں دو ہی انہوں نے نکالی تھیں، یا تو سرے سے اس سے خاموشی برتی جائے اور دبے پاؤں اس راستہ سے گذر جایا جائے، یا بحث چھیڑی تو جبر ہی کی طرف ان کا میلان نمایاں تھا، چنانچہ یہی جبر ہندو مذاہب میں تناسخ اور آواگون اور کرم کی صورت میں ہے، عیسائیوں میں حضرت آدمؑ کے گناہ اور خدا کی مرضی (۱) کے پیرایہ میں ہے اور یہودیوں کے مجموعۂ تورات میں حضرت ایوبؑ کا صحیفہ ادھر ہی رہبری کرتا ہے، دوسری طرف مجوسی تھے جنہوں نے انسانی اختیار و آزادی کو یہاں تک بڑھا دیا تھا کہ خود خدا بھی اس کے آگے مجبور تھا، خدا کو نہ صرف انسانوں کے بلکہ فرشتوں کے کاموں پر کوئی قابو حاصل نہ تھا۔ (۲) غرض آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے مذاہب کی یہی دو نوعیتیں تھیں، یعنی یا تو ان کو اس مشکل کی خبر ہی نہیں تھی یا تھی تو خدا کی قدرتِ مطلقہ اور مشیتِ عامہ کی اس طرح تعبیر کرتے تھے کہ انسان بالکل بے بس اور مجبور نظر آتا تھا، یا یہ کہ تناسخ کے چکر میں اس کو پھنسا کر اس کی زندگی کو اس کے پچھلے جنم کے کرموں کے ہاتھوں گرو کر دیتے تھے، یا پھر اس سے بچے تو انسان کو کامل خود مختار بنا کر خود خدا کو مجبور بنا دیا۔

تمام انبیا میں آنحضرت ﷺ ہی کی شخصیت وہ نمایاں شخصیت ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس دیرینہ راز کے چہرے سے پردہ ہٹایا، حقیقت یہ ہے کہ یہ دو صداقتیں ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا اور اس کے ذرہ ذرہ پر قدرت مطلقہ رکھتا

(۱) انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی گرفتاری کی رات کو دعا میں فرمایا اے خدا اگر تو اس پیالہ کو ہٹا سکتا ہے تو ہٹا دے لیکن میری نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو۔ (کتاب مقدس عہد جدید متی ۲۶: ۳۹ ص ۵۰)، عیسائیوں کے جبری و قدری فرقوں کی معرکہ آرائی کا حال فرنچ فاضل موسیو دی کانت کی کتاب الاسلام (ترجمہ عربی) ص ۷۷ و مابعد ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء مصر سے کسی قدر معلوم ہوسکتا ہے۔ (۲) شفاء العلیل فی القضاء والقدر والتعلیل مقدمۃ الکتاب ص ۳ حافظ ابن قیم مطبوعہ مصر ۱۳۲۳ ہجری۔

ہے، آسمان وزمین اور بر وبحر میں کوئی چیز نہیں جو اس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر حرکت بھی کر سکے، اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اسی کی قدرت اور مشیت کے ماتحت ہیں، یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی اور خصوصاً اسلام کی جان ہے، اگر یہ نہ ہو تو مذہب کی قوت بے اثر ہو کر رہ جائے اور ایک ایسا خدا ماننا لازم آجائے جس کے اختیارات محدود، جس کی قدرتیں ناقص اور جس کی شاہنشاہی ناتمام ہو۔

۲۔ دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کو نہ سہی مگر انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح اختیار ضرور بخشا گیا ہے، کہ اگر یہ اختیار نہ تسلیم کیا جائے اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا جائے جس طرح دوسری مخلوقات ہیں تو پھر انسان کے لئے خیر و شر کا امتیاز، جزا وسزا، شریعت، کتاب، تعلیم اور انبیا کی بعثت یہ تمام چیزیں بے کار محض ہو جائیں، ظلم و انصاف دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے، انسان کا اپنے کسی فعل پر قابلِ مدح یا قابلِ ملامت ہونا بے معنی ہو جائے، کسی اچھے کام پر خدا کا اس کو انعام اور برے کام پر عذاب دینا سراسر ظلم بن جائے، بلکہ اس دنیا کی عدالت میں بھی وہ اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہ ٹھہرے۔

الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں، ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرتِ تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت وارادہ ہر جز وکل پر حاوی ہے اور دوسرے یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے، نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا اور بدی کے کاموں پر ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے اور اسی کی بنا پر وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزا وسزا پانے کا مستحق ٹھہرے گا، اسی پر وہ فطرت کے سامنے دنیا کی عدالت میں اور آخرت میں بھی مواخذہ اور باز پرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے اور اسی کے لئے خدا کی طرف سے اس کے پاس ہدایت کی کتاب اور راستہ دکھانے والے رسول اور نبی آتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا صحیفۂ ربانی پہلی اور آخری آسمانی کتاب ہے، جس نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی جگہ پر تسلیم کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے، ایک طرف وہ کہتا ہے کہ ”خدا کی اجازت کے بغیر درخت کا ایک پتہ بھی گر نہیں سکتا“ (۱) اور دوسری طرف وہ کہتا ہے ”ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے“ (۲) یعنی خدا کی ہمہ گیر

(۱) انعام ۶:۵۹ (۲) مدثر ۷۴:۳۸

قدرت، وسیع اختیار اور ناقابل رد مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار، خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادہ کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی ہے، یہی ارادہ اور اعضا کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت، اس کی ذمہ داری، تکلیف، باز پرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے اور اسی پر اس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے، اس لئے انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً اور شرعاً نہیں جو اس کے ارادہ اور نیت سے صادر نہ ہوئی ہو بلکہ اس کے کرنے یا نہ کرنے میں وہ مجبور و بے اختیار رہا ہو، انما الاعمال بالنیات (بخاری آغاز کتاب ج ۱ ص ۲) اس تطبیق سے نہ تو خدائے پاک کی قدرت واختیار کی وسعت میں فرق آتا ہے اور نہ انسان کا تمام تر مجبور ہونا لازم آتا ہے، خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیے ہوئے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو چھین لے، مگر ایک وقت مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور فرمائے ہوئے وعدہ کے مطابق وہ اس کو اس اختیار اور قدرت سے محروم نہیں کرتا، فرمایا:

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ	تو جو چاہے مومن بن جائے اور جو چاہے کافر ہو جائے۔

(کہف ۱۸: ۲۹)

اس لئے ہر انسان اپنی جنت آپ بناتا اور اپنی دوزخ آپ مہیا کرتا ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ○	جس نے نیک کام کیا تو اپنے لئے کیا اور برا کام کیا تو اپنے لئے کیا، تیرا پروردگار بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

(فصلت ۴۱: ۴۶)

کہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ ظلم ہو جس سے اللہ تعالیٰ کی جناب پاک و برتر ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ سے ارشاد ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ. وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ. اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ	اے پیغمبر! ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے اگرچہ وہ سمجھتے نہ ہوں اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف دیکھتے ہیں تو کیا تم اندھوں کو سوجھاؤ گے اور اگرچہ وہ نہ دیکھیں، بے شک اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ ہیں

يَظْلِمُوْنَ. (یونس ۱۰: ۴۲-۴۴) جو اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں۔

وہ انسان جو اندھا اور بہرا بنتا ہے اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے، خدا اس کو اندھا اور بہرا بنا کر پھر اس کو دیکھنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا کہ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ اس کا ظلم ہوتا اور ظلم کے ہر شائبہ سے اس کا ہر حکم اور ہر کام بری ہے، لوگوں کو قرآن کی ہدایت وضلالت کے الفاظ سے بھی دھوکا ہوا ہے، حالاں کہ ہدایت اور ضلالت خدا کا وہ فیضان ہے جو انسان کے اچھے یا برے کام کے جواب میں خدا کی طرف سے ہوتا ہے، ضلالت کی نسبت فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ. خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (بقرہ ۲: ۶، ۷)

بے شک جنہوں نے (اسلام کی تعلیمات کے قبول) سے انکار کیا ان کو تمہارا تنبیہ کرنا یا نہ کرنا دونوں برابر ہے، وہ ایمان نہ لائیں گے، خدا نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کردی، اور آنکھوں پر پردہ ہے۔

دیکھو جب انسان سے کفر کا صدور پہلے ہو چکا تب خدا کی طرف سے ضلالت کا فیضان ہوا، اور اس کو تشبیہاً یوں ادا کیا کہ ان کے دلوں پر مہر پڑگئی کہ سمجھتے نہیں، کانوں پر مہر پڑگئی کہ سنتے نہیں، اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہے کہ دیکھتے نہیں، دوسری جگہ فرمایا:

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (نساء ۴: ۱۵۵) بلکہ خدا نے ان کے کفر کے سبب سے ان کے دلوں پر مہر کردی۔

یہاں بھی ان کا کفر خدا کی مہر پر مقدم ہے، مقصد یہ ہے کہ جب کفر کا صدور ہوتا رہتا ہے تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو جاتا ہے اور یہی خدا کی مہر ہے۔(۱)

برخلاف اس کے اگر لوگ کانوں سے پیغامِ حق کے سننے اور آنکھوں سے دیکھنے اور دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ اپنی توفیق وہدایت سے سرفراز فرمائے، ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ (یونس ۱۰: ۹)

بے شک جو ایمان لائے اور نیک کام کیے، ان کو ان کا پروردگار ان کے ایمان کے سبب ہدایت دے گا۔

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد ۴۷: ۱۷) اور جنہوں نے ہدایت قبول کی ان کو ہدایت میں اور بڑھایا۔

---

(۱) قرآن پاک میں جہاں جہاں خدا کی اس مہر کا یا کسی کو ہدایت نہ دیے جانے کا ذکر ہے وہاں اس کے کفر وفسق کی علت ہمیشہ پہلے ذکر کردی گئی ہے اس لئے ان آیتوں سے جبر پر استدلال صحیح نہیں۔

ایرانی فلسفۂ خیر وشر کی آمیزش نے اس مسئلہ کو اور زیادہ الجھا دیا ہے، حالاں کہ عربی الفاظ خیر و شر کو اعمال کے خیر وشر سے بحث نہیں، عربی میں مطلق خیر کے معنی دولت ونعمت وآرام کے اور شر کے معنی غربت، تکلیف اور مصیبت کے ہیں، قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ ان ہی معنوں میں آئے ہیں البتہ جب ان کے ساتھ لفظ عمل شریک ہوگا تو عمل خیر اور عمل شر کے معنوں میں یہ استعمال ہوگا۔ جیسے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ. وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ. (زلزال۹۹: ۷،۸)	جو کوئی چیونٹی برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھے گا اور جو برائی کرے گا وہ بھی دیکھے گا۔

اس لئے حدیثوں کے ان الفاظ میں:

والقدر خیره و شره من اللّٰه تعالیٰ (۱)	اور اس پر ایمان کہ خیر اور شر کی تقدیر خدا کی طرف سے ہے۔

کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسانوں کے اچھے اور برے کام سب خدا کی طرف سے ہیں، بلکہ یہ معنی ہیں کہ انسانوں کو راحت و رنج، مسرت وتکلیف، دولت وافلاس اور صحت ومرض وغیرہ اچھائی اور برائی سب خدا کی طرف سے پہنچتی ہے اور اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر ہوسکتا ہے؟

بعض لوگوں کو صحیح مفہوم کے سمجھنے میں ان آیتوں سے بھی شبہہ ہوتا ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت دے دیتا، اس سے وہ غلطی سے یہ سمجھے ہیں کہ وہ خود خداوند تعالیٰ ہی ہے جو ان کافروں کو ہدایت سے جبراً روکے ہوئے ہے حالاں کہ ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ از خود اسلام قبول نہیں کرسکتے اِلَّا یہ کہ خود خدا زبردستی ان کو مسلمان بنا دینا چاہے مگر ایسے زبردستی سے مسلمان یا کافر اور نیک یا بد بنا دینا اللہ تعالیٰ کے جاری قانون کے خلاف ہے چنانچہ ان آیتوں کا یہی مطلب ہے:

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (دھر۷۶: ۳۰)	تم نہیں چاہو گے الا یہ کہ خود خدا چاہے اور (تم کو زبردستی مسلمان بنادے)۔
مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (انعام۶: ۱۱۱)	وہ نہیں ہیں کہ ایمان لے آئیں الا یہ کہ خدا چاہے۔
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى (انعام۶: ۳۵)	اور اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت پر متفق کر دیتا۔
فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ. (انعام۶: ۱۴۹)	تو اگر وہ (خدا) چاہتا تو البتہ ان سب کو وہ خود ہدایت دے دیتا۔
وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ. (نحل۱۶: ۹)	اور اگر وہ خدا چاہتا، البتہ ان سب کو ہدایت دے دیتا۔

(۱) مسلم کتاب الایمان ج۱ص ۲۲،۲۳ و ابوداؤد کتاب السنۃ باب فی القدر ج۲ص ۶۷ و ترمذی ابواب الایمان باب ما جاء فی وصف جبرئیلؑ للنبی الایمان و الاسلام ج۲ص ۸۸ و ابواب القدر باب ما جاء فی الایمان بالقدر خیره و شره ج۲ص ۳۶ ''ض''

مگر اس کی عادت نہیں کہ وہ بندے کے ارادہ اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت دے، اس لئے اس مشیت الٰہی کے ساتھ قرآن پاک کی وہ آیتیں مطابق ہوں گی جن میں بندوں کی مشیت کا بھی اعتبار کیا گیا ہے:

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (کہف ۱۸:۲۹)	تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔
فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا. (دھر ۷۶:۲۹ و مزمل ۷۳:۱۹)	تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ قبول کرے۔
فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا. (نبا ۷۸:۳۹)	تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف بازگشت کرے۔
اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (فرقان ۲۵:۵۷)	لیکن جو اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرنا چاہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے گمراہی بھی اترتی ہے مگر کن کے لئے یہ تصریح فرمایا:

۱۔ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ. (بقرہ ۲:۲۶)	اور اللہ اس سے گمراہ نہیں کرتا مگر نافرمانوں کو۔
۲۔ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ. (صف ۶۱:۵)	جب وہ کج ہوئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو کج کر دیا اور اللہ بے حکم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔
۳۔ بَلْ سكتہ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ. (تطفیف ۸۳:۱۴)	بلکہ ان کے کام ان کے دلوں پر زنگ بن گئے۔
۴۔ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ. (نساء ۴:۱۵۵)	بلکہ ان کے کفر کے سبب سے اللہ نے ان پر مہر کر دی۔
۵۔ ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ. (توبہ ۹:۱۲۷)	وہ پھر گئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو اس لئے پھیر دیا کہ وہ لوگ سمجھتے نہ تھے۔
۶۔ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ. (اعراف ۷:۱۰۱)	اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔
۷۔ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (بقرہ ۲:۱۰)	ان کے دلوں میں (پہلے سے) (نفاق کی) بیماری تھی تو خدا نے بیماری بڑھا دی۔

ان آیتوں میں سے ہر ایک پر غور کرو ہر ایک سے یہ صاف و صریح معلوم ہوگا کہ انسان کی بداعمالی مقدم ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے ضلالت، گمراہی، زنگ، مہر اور بیماری فرمانا موخر ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضلالت، زنگ، مہر اور بیماری کا اترنا، علت اور انسانوں کا کفر و گناہ و نفاق معلول نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے، یعنی انسان کا فسق و فجور، کجی، زنگ، کفر، انصراف (پھر جانا) نادانی اور قلب کی بیماری پہلے ہوتی ہے اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں ضلالت و گمراہی اور دل پر مہر بعد کو ہوتی ہے اور یہی طبعی اصول بھی ہے، انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غم گین ہوتا ہے، تب آنسو کے قطرے ٹپکتے ہیں، اگر کوئی اس کو الٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی سخت نادانی ہوگی۔

بہر حال اس مسئلہ میں مہبط وحی و رسالت محمد رسول اللہ ﷺ کی عجب مصلحت بینی یہ ہے کہ آپ نے اپنی امت کو اس پر جس شدت سے ایمان لانے کی تلقین فرمائی اسی شدت سے اس میں بحث و مناقشہ سے منع فرمایا۔(۱) اور درحقیقت اس نظریہ سے اسی طرح فائدہ اٹھانے میں راز ہے، یہ کلی جہاں چٹکی کہ خوشبو اڑ گئی۔

اس عقیدہ کے تمام وسیع اطراف اور گوشوں کو چھوڑ کر جن کو متکلمین کی مجادلانہ کاوشوں نے پیدا کیا ہے، قرآن حکیم کی صرف اس آیت کو سمجھ لینا کافی ہے:

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا. (فرقان ۲۵:۲)	اور خدا کی سلطنت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کا ایک اندازہ (تقدیر) لگا دیا۔

---

(۱) مشکوٰۃ کتاب الایمان باب الایمان بالقدر الفصل الثانی ج ۱ ص ۶۳ بحوالہ ترمذی ''ض''۔

ایمان کے نتائج

گذشتہ صفحوں میں ایمان کی حقیقت اور اس کی چھ شاخوں خدا، فرشتے، رسول، کتاب، یومِ آخر اور قدر کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور دکھایا گیا ہے کہ ان میں سے ہر عقیدہ کی حقیقت کیا ہے، اس کی صداقت کی دلیلیں کیا ہیں؟ اور اس کی تعلیم میں شارع علیہ السلام نے کیا کیا مصلحتیں رکھی ہیں اور شروع میں یہ بحث بھی کی جا چکی ہے کہ ہر مذہب میں اور خصوصاً مذہبِ اسلام میں ایمان کو اولین اہمیت کیوں دی گئی ہے، وہ بحثیں اصول کی تھیں، یہاں خاتمہ میں نتائج کی حیثیت سے پھر اسی دعویٰ کی تکرار کی جاتی ہے، یعنی یہ کہ درحقیقت ایمانیات اسی لائق ہیں کہ ان کو مذہب میں یہی اولین درجہ دیا جائے، کیوں کہ مذہب جن نتائج تک پہنچنا چاہتا ہے وہاں ایمان کی روشنی کے بغیر پہنچنا ممکن ہی نہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم کسی دستور پر عمل کریں یہ ضروری ہے کہ ہم اس دستور کی خوبی اور سچائی کا یقین کریں کہ اگر ایسا نہ ہو تو ہم اس پر ایمان داری کے ساتھ نہ تو عمل کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے نفس وضمیر پر اس کا اثر ہو سکتا ہے، یہ حقیقت ہر دلیل سے ثابت ہے کہ ہمارے تمام اعمال ہمارے دل کے تابع ہیں، اس لئے جب تک دل نہ بدلے گا ہمارے اعمال میں تغیر نہیں ہو سکتا، یعنی ہمارے اعمال کی اصلاح تمام تر ہمارے دل کی اصلاح کے زیر اثر ہے اور ایمان کا مقصد دل کی اصلاح ہے کہ اگر یہ درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو گیا۔

یہاں ایک خاص نکتہ ہے جس کو سمجھے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہیے، یہودیوں نے سب سے زیادہ اہمیت رسم ورواج کو دی تھی اور عیسائیوں نے ان کے برخلاف صرف ایمان پر نجات وفلاح کا دارومدار رکھا، چنانچہ حواریوں کے خطوط وملفوظات میں اس تعلیم کو بہت کچھ نمایاں کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ عمل نہیں بلکہ صرف ایمان نجات کا ذریعہ ہے، اسلام کی پہلی تکمیلی شان اس بارہ میں یہ ہے کہ وہ دونوں کی اصلاح کر کے ان دونوں کو جمع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نجات نہ تنہا ایمان اور نہ تنہا عمل پر بلکہ ایمانِ صحیح اور عملِ صالح کی جامعیت پر موقوف ہے۔ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے) دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایمان کو محض ایمان کی بنا پر اہمیت نہیں دیتا بلکہ اس لئے اہمیت دیتا

ہے کہ وہ عملِ صالح کی علت وسبب ہے، یعنی وہ عملِ صالح کے لئے راستہ بناتا اور تخم ریزی کے لئے زمین درست کرتا ہے۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اس لئے نخلِ ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہو سکتی ہے، اب اگر ایسا کوئی شخص تم کو نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہو مگر اس کے اعمال میں اس ایمان کے مطابق کوئی بہتر تغیر نظر نہیں آتا تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ایمان نے اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ و بار پیدا نہیں کیا ہے، یہی سبب ہے کہ قرآن پاک ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصفِ لازم بتاتا ہے، ہر اہم موقع پر اس نے مسلمانوں کو:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	اے وہ لوگو! جو ایمان لائے

کی ندا سے خطاب کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کر سکتے ہیں جو ایمان سے متصف ہیں، بہت سے موقعوں پر ہے:

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ	اگر تم ایمان والے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات ایمان والوں ہی کے لئے خاص ہے اور وہی اس کے اہل و سزاوار ہیں، فرمایا:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ	ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔

(بقرہ ۲:۱۶۵)

اس سے معلوم ہوا کہ محبتِ الٰہی ایمان کی بہت بڑی علامت ہے ایک اور سورہ میں ہے:

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.	ایمان والوں کی بات یہ ہے کہ جب ان کو فیصلہ کرنے کے لئے اللہ ورسول کی طرف بلایا جائے تو کہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا اور ان ہی لوگوں کا بھلا ہے۔

(نور ۲۴:۵۱)

اس سے ظاہر ہوا کہ ایمان کا ایک نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اس کا فیصلہ کے آگے سر جھکانا ہے، دوسری آیت میں ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ. (حجرات ۴۹:۱۰) ایمان والے تو آپس میں بھائی ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں میں باہمی محبت اور شفقت ہونا بھی ایمان کی نشانی ہے، ایک اور آیت میں ہے:

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ. اور خدا ہی پر چاہئے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔

(آل عمران ۳:۱۶۰)

معلوم ہوا کہ خدا پر بھروسہ اور توکل اہلِ ایمان کی شان ہے، سورہ مومنون میں اہل ایمان کے اوصاف یہ بتائے گئے ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ. الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ. وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ.........وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ.	بے شبہ اہلِ ایمان نے بھلائی پائی جو اپنی نماز میں ادب سے جھکے رہتے ہیں اور جو نکمی باتوں پر دھیان نہیں دیتے اور جو زکوۃ ادا کرتے ہیں اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں..........اور جو اپنی امانتوں اور وعدوں کی نگرانی رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔

(مومنون ۲۳:۱تا۵، ۸، ۹)

ان آیتوں سے اہلِ ایمان کے ضروری اوصاف یہ معلوم ہوئے ''نماز میں خشوع وخضوع، بے کار باتوں سے احتراز، زکوۃ وخیرات دینا، عفت و پاک دامنی، امانت، ایفائے عہد، نمازوں کی پابندی''، ان آیتوں میں ایک عجیب رمز ہے، دیکھو کہ اہلِ ایمان کے اوصاف کا آغاز بھی نماز سے کیا گیا اور انجام بھی نماز پر رکھا گیا، اس سے اشارہ نکلا کہ نماز ایمان کی اولین وآخرین نشانی ہے اور اسی لئے ایمان کے بعد سب سے زیادہ اس پر زور دیا گیا ہے۔

ہم نے یہ چند آیتیں یہاں مثالاً نقل کی ہیں ورنہ اگر کوئی استقصا کرے تو قرآن میں ایمان کے اثرات ونتائج اور بہت سے ملیں گے، احادیث میں بھی اس مضمون کی کمی نہیں، صحیح حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں''،(۱) حافظ بیہقی نے اپنی کتاب

(۱) صحیح مسلم کتاب الایمان باب شعب الایمان ج ۱ ص ۳۵ و صحیح بخاری کتاب الایمان باب امور الایمان ج ۱ ص ۶۔

شعب الایمان میں مختلف حدیثوں سے ایمان کی ان ستر شاخوں کو ایک ایک کر کے گنایا ہے، اس کتاب کا خلاصہ مختصر شعب الایمان کے نام سے چھپ بھی گیا ہے، (۱)۔

ایک حدیث میں ایمان کی شناخت، اخلاق کی پاکیزگی کو بتایا گیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا:

اکمل المومنین ایمانا احسنهم خلقا (سنن ابی داؤد کتاب السنة باب رد الارجاء ج۲ص۱۹۴) — مومنوں میں اس کا ایمان سب سے زیادہ کامل ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

حسنِ اخلاق کا اساسی مرکز محبت ہے، یہ محبت سب سے پہلے تو اسی ہستی سے ہونی چاہئے جو تمام محبتوں کا مرجع و مرکز ہے، یعنی اللہ تعالیٰ، اور اس کے بعد اسی محبتِ الٰہی کے ضمن اور تبعیت میں اس ہستی سے بھی محبت کرنا جس کی ہدایت اور تعلیم کے وسیلہ سے یہ جوہرِ ایمانی ہم کو ہاتھ آیا، اس محبت کے سامنے دوسری تمام دنیاوی محبتیں اور قرابت اور رشتہ داری کے علائق ہیچ ہیں، فرمایا:

لایومن احدکم حتی اکون احب الیه من ولده و والده و الناس اجمعین. (۲) — تم میں سے کوئی اس وقت تک ایمان میں کامل نہیں جب تک اس کے دل میں میری محبت اس کی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو۔

ایمان کا تیسرا اثر یہ ہے کہ اس کو اپنی ہم جنس برادری اور پڑوسی سے بھی اسی طرح محبت و پیار اور اخلاص ہو جس طرح خود اپنے آپ سے، فرمایا:

والذی نفسی بیده لا یومن احدکم حتی یحب لاخیه او لجاره ما یحب لنفسه. (بخاری و مسلم کتاب الایمان باب الدلیل علی ان من خصال الایمان الخ ج۱ص۳۷) — قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں جب تک وہ اپنے بھائی یا پڑوسی (راوی کو شک ہے) کے لئے وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے۔

آپ ﷺ نے ایک دفعہ صحابہؓ کو خطاب کر کے فرمایا جب تک تم مومن نہ بنو گے جنت میں داخل نہ ہوسکو گے اور مومن نہ بنو گے جب تک تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو گے، میں

---

(۱) اب یہ مکمل کتاب الدار السلفیہ بمبئی سے چھپ گئی ہے۔ ''ض'' (۲) مسلم کتاب الایمان باب وجوب محبة رسول الله الخ ج۱ص۴۷ و بخاری کتاب الایمان باب حب الرسول ج۱ص۷۔

تمھیں بتاؤں کہ تم میں آپس میں محبت کیوں کر ہوسکتی ہے، آپس میں سلام پھیلاؤ (مسلم کتاب الایمان باب بیان انہ لا یدخل الجنۃ الخ ج۱ص۴۰)۔

یہ محبت کسی نمائش، ریا یا ذاتی نفع ونقصان کے لئے نہ ہو، بلکہ خدا اور صرف خدا کے لئے ہو، فرمایا ''تین باتیں جس میں ہیں اس نے ایمان کا مزہ پالیا، اول یہ کہ اس کے دل میں خدا اور رسول سے بڑھ کر کسی اور کی محبت نہ ہو، دوسری یہ کہ بندگانِ خدا سے صرف خدا کے لئے محبت کرتا ہو، تیسری یہ کہ کفر سے نجات پانے کے بعد پھر اس میں آلودہ ہونا اس کے لئے اتنا ہی تکلیف دہ ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا''، (۱) ایک صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ کامل اسلام کس مسلمان میں ہے، فرمایا ''اس مسلمان میں جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔'' (۲)، فرمایا کہ ''ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں جن میں سے ایک شرم وحیا ہے'' (۳)، یہ بھی تعلیم فرمادی کہ ''جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ زبان سے بات نکالے تو اچھی ورنہ چپ رہے، جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کو دکھ نہ پہنچائے، جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ مہمان کی عزت کرے'' (۴)، ایک صحابی آپ کے اس ارشاد کو نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''تم میں سے کوئی اگر کوئی برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے مٹادے، یہ نہ ہوسکے تو زبان سے ٹوک دے، یہ بھی نہ ہوسکے تو اپنے دل میں اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے۔ (۵)

اس کے بالمقابل آپ ﷺ نے متنبہ فرمایا کہ ''نفاق کی چار نشانیاں ہیں جس میں ان میں سے ایک بھی پائی جائے اس میں اتنا نفاق کا عنصر موجود ہے، اگرچہ وہ نماز گذار اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو اور اپنے کو وہ مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو، ایک یہ کہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو توڑ دے، امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے، غصہ آئے تو گالی بکے''۔ (۶)

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان ج۱ص۷، وصحیح مسلم کتاب الایمان باب بیان خصال من اتصف بھن الخ ج۱ص۳۷ (۲) مسلم باب بیان تفاضل الاسلام ج۱ص۳۶ (۳) ایضاً باب شعب الایمان ج۱ص۳۵۔ (۴) یہ تمام روایتیں صحیحین کتاب الایمان میں ہیں، صحیح مسلم کتاب الایمان باب الحث علی الجار ج۱ص۳۸۔ (۵) صحیح بخاری کتاب الایمان، پیش نظر مسلم ہے باب بیان کون النھی عن المنکر الخ ج۱ص۳۸ (۶) ایضاً باب بیان خصال المنافق ج۱ص۴۲، صحیح بخاری میں تین ہی کا ذکر ہے، ملاحظہ ہو کتاب الایمان باب علامۃ المنافق ج۱ص۱۰۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کی شاخیں ہیں وہ ایمان ہے اور اسی لئے وہ مذہب کا اصل الاصول ہے، وہ نہ ہو تو انسانی نیکیوں کی ساری عمارت بے بنیاد ہے، اس تقریر سے کسی کو یہ شبہہ نہ ہو کہ ایمان کے بعد عمل کی ضرورت نہیں، اسلام نے اسی نکتہ کو بار بار ادا کیا ہے کہ نجات کا مدار ایمان اور عملِ صالح دونوں پر ہے، اسی لئے اٰمنوا کے ساتھ ساتھ وعملوا الصّٰلحت پر بھی اس نے ہمیشہ زور دیا ہے، بلکہ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ ان دونوں میں ایمان اصل اور عمل اس کی فرع ہے، ایمان ملزوم اور اعمال حسنہ اس کے خصوصیات اور لوازم ہیں، یعنی ان دونوں میں اصل و فرع اور لازم وملزوم کا تعلق ہے، جو ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہو سکتے، اس لئے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں رہ سکتا اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے برگ و بار درخت ہے جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم و وجود برابر ہے، اس بنا پر جہاں ایمان ہے اس کے عملی نتائج و آثار کا وجود بھی ضروری ہے۔

کاغذ کے نو سو چھ صفحے (۱) سیاہ ہو چکے ہیں، ناظرین کے ہاتھ ان اوراق کی گراں باری سے اور آنکھیں ان سطور کی کم سوادی سے تھک چکی ہوں گی، اس لئے بہتر ہے کہ رہ روِ قلم کے ساتھ قافلۂ نظر کے دوسرے رفقا بھی کچھ دیر آرام کریں ہر چند کہ......

رہ رواں را خستگیِ راہ نیست عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است

سید سلیمان ندوی

دار المصنفین۔ رمضان ۱۳۵۰ ہجری

---

(۱) یہ پہلے ایڈیشن کے لحاظ سے لکھا گیا تھا "ض"

اشاریہ و کتابیات

سیرۃ النبی ﷺ

(حصہ چہارم)

مرتبہ

ضیاء الرحمٰن اصلاحی

و

محمد شریف محسنی

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

اشخاص واعلام

(الف)

آدمؑ (حضرت): ۲۲، ۲۴، ۳۸، ۸۰، ۱۴۸، ۳۲۹، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۶۰، ۳۶۷، ۳۸۰، ۳۸۱، ۴۰۲، ۴۱۳، ۴۲۸، ۴۴۵، ۴۷۹، ۵۲۶، ۵۲۸، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۵۵، ۵۶۳، ۵۷۱، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۳، ۶۱۳، ۶۳۴، ۶۴۲

آرسی دت: ۱۶۸، ۱۶۹

آریوس: ۱۶۳

آلوسی حنفی (مفتی شہاب الدین سید محمود): ۴۸۷

آمنہ (حضرت): ۳۹

ابراہیمؑ (حضرت): ۳۰، ۳۲، ۳۳، ۳۸، ۳۹، ۷۱، ۷۶، ۸۳، ۹۶، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۲۲، ۲۲۰، ۱۲۵، ۱۳۸، ۱۷۹، ۱۸۱، ۲۱۹، ۲۲۱، ۲۲۶، ۲۳۴، ۳۰۸، ۳۱۰، ۴۰۰، ۴۰۹، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۳۰، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۶، ۴۳۸، ۴۴۱، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۷، ۴۵۹، ۴۷۷، ۴۸۲، ۵۱۶، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۴۸

ابراہیمؑ (آنحضرت ﷺ کے صاحب زادے): ۳۲۰، ۳۲۹

ابرہہ: ۳۶۰

ابن ابی حاتم: ۲۰۴

ابن ابی العوجا: ۲۷۲

ابن اثیر: ۱۰۶

ابن اعرابی (امام لغت): ۱۲۷

ابن تیمیہ: ۲۴۹، ۲۸۰، ۳۷۰، ۵۷۵

ابن جریر (امام، مفسر، مورخ): ۱۱۳، ۱۱۴، ۴۸۶، ۵۸۰

ابن حجر (حافظ) ۲۰۶

ابن حزم اندلسی: ۷۶

ابن درید: ۱۲۰، ۱۲۶

ابن ریطہ: ۲۰۷

ابن زید (مفسر): ۱۱۴، ۱۲۱، ۵۷۷

ابن عبدربہ: ۱۹۶

ابن قیم (حافظ): ۲۴۲، ۲۸۲، ۵۶۱، ۵۷۵، ۵۸۰، ۵۸۴

ابن کثیر (حافظ، محدث): ۴۸۶

ابن مندہ: ۲۴۴

ابن منذر: ۵۷۹

ابن ہمام: ۴۸، ۶۳

ابوالبلاد طہوی: ۱۹۱

ابوالنجم (شاعر): ۱۹۴

ابوامامہؓ (حضرت) ۵۷۹

ابوایوب انصاریؓ: ۲۸۹، ۴۰۲

ابوبکر صدیقؓ (حضرت): ۹۶، ۱۲۹، ۲۰۸، ۲۲۳، ۲۴۰، ۲۴۳، ۲۵۱، ۲۷۱، ۲۸۲

ابوبکر بن عربی: ۳۷۰

ابوجعفر رازی: ۱۱۳، ۲۰۲

ابوجہل: ۲۳۳، ۲۳۷، ۲۴۵، ۲۸۳

ابوحمزہ: ۲۱۷

ابوحیان اندلسی مالکی: ۱۱۳، ۴۸۷

ابودجانہؓ (حضرت): ۲۰۰

ابوذر غفاریؓ (حضرت): ۲۳۳، ۲۷۱، ۲۸۱، ۲۸۵، ۴۰۳، ۴۰۹

ابورافع:۲۹۰
ابورزین:۱۱۳، ۱۲۱
ابوزید انصاری:۲۷۲
ابوزید سیرافی:۱۶۹
ابوسعید بن ابی فضالہ (حضرت)۳۳۵، ۳۳۶
ابوسعید خدریؓ (حضرت):۳۳۵، ۳۸۶، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۹، ۵۹۲
ابوسفیان بن حرب:۲۵۱، ۲۸۲
ابوشریح:(دیکھیے ہانیؓ)
ابوطالب (آپ ﷺ کے چچا):۲۳۶، ۲۳۷
ابوطلحہؓ (حضرت):۲۰۰، ۲۰۵، ۲۰۶
ابوظبیان (راوی حدیث):۶۰۸
ابوعبدالرحمٰن السلمی:۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵
ابوعبیدہ بن جراح امین الامت:۲۰۵، ۲۰۶، ۲۲۳
ابوالعتاہیہ:۴۸۵
ابولہب:۱۹۳، ۲۱۱، ۲۳۷
ابوموسیٰ اشعریؓ (حضرت):۱۵۹، ۲۷۲، ۲۷۵،
ابونضرہ تابعی:۴۲۸
ابوہریرہؓ (حضرت):۲۰۱، ۲۰۵، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۶۷، ۳۸۲، ۴۰۵، ۵۷۱، ۵۷۹، ۵۹۲، ۶۱۵، ۶۳۲، ۶۳۴
ابی بن کعبؓ (حضرت)۲۰۵، ۲۰۶، ۳۲۲، ۳۶۷
ابی عاصم:۲۰۶
احمد (امام)۴۰۶
احلج (حضرت):۲۷۲
احنفؓ:۲۷۲
ارسٹس (پادری):۱۶۳
ارسطو:۳۰، ۴۳، ۴۴، ۹۰
ارسیسی نس:۱۶۵
اسامہ بن زیدؓ (حضرت):۲۱۲، ۲۶۸
اسحٰقؑ (حضرت):۳۲، ۳۸، ۳۹، ۴۲، ۸۳، ۱۲۵، ۴۳۳، ۴۳۶، ۴۴۱، ۴۵۴، ۴۵۷، ۴۵۹
اسرائیل والفنسون (ڈاکٹر):۲۱۹
اسما بنت عمیس:۲۷۶
اسمٰعیلؑ (حضرت):۳۳، ۳۸، ۳۹، ۱۲۵، ۲۲۶، ۴۳۶، ۴۴۱، ۴۵۴، ۴۵۷، ۴۵۹
اسود عنسی (کذاب):۴۷۷
اعشیٰ (جاہلی شاعر):۹۴، ۲۸۱
اعمش:۶۰۸
افلاطون:۳۰، ۳۷
اقرع بن حابس:۲۴۲
الیاسؑ (حضرت):۳۳، ۱۲۵
الیسعؑ (حضرت):۳۳، ۱۲۵
امراء القیس:۲۱۳
ام زرع:۶۵، ۶۷
ام عمرو:۵۱۲
امیر خسرو:(دیباچہ)
امیر معاویہ (حضرت):۶۳۲
امیم:۳۶۱
امیمہ (باندی):۲۱۴
انس بن مالکؓ (حضرت):۱۲۸، ۲۰۰، ۲۰۵، ۴۰۴، ۵۷۱، ۵۷۳، ۵۸۴
انیس:۲۸۰، ۲۸۱
ایتھنز:۳۷
ایڈیسن:۹۰
ایوبؑ (حضرت):۳۲، ۱۲۵، ۴۳۶، ۶۴۲

(ب)

بخاری (امام):۲۰۴، ۲۸۱، ۳۱۰، ۳۳۲، ۳۵۴
بخت نصر:۲۲۱

برہما: ۳۶۲،۳۵۰
بریدہؓ: ۳۶۸
بزار (امام): ۴۰۶،۴۰۵
بشر: ۲۱۲
بشن: ۳۵۰
بشیر: ۲۱۲
بغوی: ۲۳۸
بلالؓ (حضرت: ۲۴۰، ۲۵۱، ۴۰۳
بلقیس: ۱۹۰
بلیشیا: ۱۶۳
بودھ: ۲۵۶، ۴۳۷
بوعلی سینا: ۴۴
بیہقی (امام): ۳۳۲، ۳۶۳، ۳۶۸، ۵۷۹، ۶۵۱

(پ)

پٹیر: ۱۶۳

(ت)

تابطشرا: ۱۹۱، ۲۱۱
ترمذی (امام) ۴۰۶
تیمور: ۳۷

(ٹ)

ٹرٹلین: ۱۶۶

(ث)

ثمامہ بن اثال: ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۷۲، ۲۸۷

(ج)

جابرؓ (حضرت): ۵۷۰، ۵۷۹
جاحظ: ۱۹۱، ۱۹۳
جالوت: ۱۰۹
جبرئیلؑ (حضرت) ۴۰۵، ۴۱۲
جبلہ: ۲۴۶، ۲۴۷
جبیر بن مطعم: ۲۸۱، ۲۸۲
جذیمہ ابرش: ۱۹۱
جریر بن عبداللہ بجلی: ۲۷۲، ۶۲۸
جسٹنین (شاہ): ۱۶۱، ۱۶۵
جعفرؓ (طیار): ۲۷۱، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۸۲، ۵۰۰
جلال الدین سیوطی (حافظ): ۵۸۰
جلیح: ۱۹۲
جولیس سیزر: ۱۵۹
جوہری (امام): ۱۱۲

(ح)

حاتم طائی: ۳۱۳
حارث (آپ ﷺ کے رضاعی باپ): ۲۹۰
حارث (جاہلیت کا ڈاکو): ۲۱۰
حازی (کاہن): ۱۹۳
حاطب بن ابی بلتعہ: ۲۷۲
حاکم (محدث): ۲۰۶، ۴۰۶
حبیب بن ربیعہ: ۲۰۸
حسن بصری: ۳۶۸
حلیمہؓ (آپ ﷺ کی رضاعی ماں): ۲۹۰
حمزہؓ (حضرت): ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۸۷
حمزہ اصفہانی: ۱۸۹
حمید الدین فراہیؒ: ۱۵۲، ۵۱۰
حواؑ (حضرت): ۵۴۵

(چ)

چنگیز: ۳۷

(خ)

خالد العدوانیؓ: ۲۸۲
خالد بن سعید: ۲۷۲
خالد بن عبداللہ: ۲۰۳
خالد بن ولیدؓ: ۲۰۸، ۲۲۳، ۲۷۱، ۲۸۱
خباب بن الارت: ۵۱۳

خدیجہ بنت خویلد:۲۸۵
خرافہ:۶۵،۶۷،۱۹۱
خضر (حضرت) ۱۲۲
خطابی (امام):۲۷۰
خفاجی (شہاب):۶۷

(د)

داؤدؑ (حضرت):۱۴،۳۲،۱۰۹،۱۲۲،۱۲۴،۱۲۵،
۱۷۰،۱۷۱،۴۳۳،۴۳۴،۴۳۶،۴۴۲
داورمجاعص (عیسائی عالم):۲۹۲
دجال:۳۳۵
دحیہ کلبی (حضرت):۲۷۲
درید بن الصمہ:۲۱۶
دیوجانیس:۳۰

(ڈ)

ڈریپر:۱۶۳،۱۶۵،۱۶۶
ڈمیس:۱۶۵،۱۶۶

(ذ)

ذونواس (یہودی):۱۸۰
ذویزن:۱۸۰
ذہبی (علامہ):۳۲۷

(ر)

رازی (امام):۳۵،۱۰۸
راغب اصفہانی (امام):۱۱۲،۱۲۳،۳۶۸
رام چندر:۳۰۷،۴۳۷
ربیع بن انس:۳۶۸
رستم:۹۰
ریحانہ (اخت عمرو معدی کرب):۲۱۶
رفاعہ:۲۱۲
ریونڈرفارسٹر:۲۱۹

(ز)

زبیر بن عوام:۲۲۳،۲۷۱
زردشت:۱۵۵،۱۵۸،۴۲۹،۴۳۷،۴۶۳
زکریاؑ (حضرت)۳۲،۱۲۵،۴۱۹،۴۳۴
زکی پاشا (علامہ):۱۸۶
زمخشری (امام)۱۳۱،۴۸۷
زنیرہؓ (صحابیہ):۲۳۸
زوزنی:۱۹۸
زیاد بن لبید:۲۷۱
زید بن ثابت (کاتب وحی):۶۵
زید بن حارثہ (آپ ﷺ کے منہ بولے بیٹے):
۲۰۱،۲۵۱

(س)

سام:۱۷۰
سالم (غلام):۲۵۱
سسی نس:۱۶۶
سطیح (کاہن):۱۹۳
سعد بن عبادہ:۲۴۲
سعد بن معاذؓ:۲۴۲
سعد بن وقاصؓ:۲۰۳
سعید بن زیدؓ:۲۳۳
سفیان ثوری:۲۰۳،۲۰۴،۲۰۵،۶۰۸
سقراط:۳۰،۳۱
سکندر:۲۲۱،۴۶۳
سلطان محمود:۳۷
سلمان فارسیؓ:۱۰۶،۲۳۳،۲۶۶،۲۹۴
سلیط بن عمر بن عبد شمس:۲۷۲
سلیک بن السلکہ:۲۱۱
سلیمانؑ (حضرت):۱۴،۳۲،۳۸،۳۹،۱۲۲،
۱۲۴،۱۲۵،۱۷۷،۴۳۳،۴۳۴،۴۳۶
سلیمان ندوی (سید):(دیباچہ)،۱۷۸،۶۵۴
سہیل بن بیضا:۲۰۰

حیل: ۱۶۷،۱۶۶،۱۶۴

سینٹ پال: ۲۱۹،۱۶۳

سینٹ سرل: ۱۶۳،۱۶۲

(ش)

شاطبی (امام): ۶۰

شافعی (امام): ۲۴۹،۱۲۱،۱۱۵،۱۰۸،۶۱،۶۰

شاہ ولی اللہ دہلوی: ۶۳،۶۰،۱۵،۱۴،۱۱،۹،۳،
۴۷۷،۴۷۶،۲۲۷،۱۰۸،۱۰۵،۶۸،۶۷،۶۶،
۶۱۲،۴۸۳

شبلی (حضرۃ الاستاذ، علامہ): (دیباچہ)، ۱۷۸

شجاع بن وہب اسدی: ۲۷۲

شداد بن اوس: ۳۳۶،۳۳۵

شریح: ۳۳۳

شعبی: ۵۷۷،۳۶۸

شعیبؑ (حضرت): ۴۳۳

شق (کاہن): ۱۹۳

شنکراچاریہ: ۳۶۲

شمر یرعش (بادشاہ): ۱۸۹

شوکانی محدث (قاضی): ۴۸۷

شیبہ: ۲۴۶

(ص)

صاعد اندلسی: ۱۸۹

صفوان بن امیہ: ۲۸۶،۲۶۰،۲۱۲

صفیہ (حضرت): ۳۱۱

صہیبؓ رومی (حضرت): ۲۳۳

(ض)

ضماد بن ثعلبہ (حضرت): ۲۸۹،۲۷۱

ضمام بن ثعلبہؓ (حضرت): ۲۳۸

ضیاء الدین اصلاحی: (دیباچہ)

(ط)

طالب (حضرت علیؓ کے بھائی): ۱۹۱

طبری (امام): دیکھئے ابن جریر

طبرانی: ۵۷۹،۴۰۶

طرفہ: ۱۹۷

طفیل بن عمرو دوسی: ۲۸۲،۲۷۱،۲۴۰،۲۳۸

طلحہؓ (حضرت): ۲۷۱،۲۲۳

(ع)

عاص بن وائل: ۵۱۳،۲۳۳

عائشہؓ (حضرت): ۳۲۱،۲۹۸،۲۴۲،۷۳،
۶۳۱،۵۵۹،۵۱۴،۳۸۴،۳۷۰،۳۶۳

عامر بن شہر: ۲۷۲

عبادہ بن صامت (حضرت): ۹۷

عبادہ (تابعی): ۳۳۶

عباس بن عبدالمطلب (حضرت): ۲۰۸،۲۰

عباس بن مرداس سلمی: ۱۸۸

عبدالرحمٰن بن عوفؓ: ۲۰۴،۲۰۳،۲۰۲،۲۰۱

عبدالرحمٰن عباسی قمر: (دیباچہ)

عبدالرزاق: ۵۷۹

عبدالسلام ندوی (مولانا): ۵۲۸

عبدالعزیٰ مزنی: ۱۸۴

عبدالعزیز بن یحییٰ: ۳۷۰

عبدالقادر (شاہ) ۵۰۳

عبداللہ: ۳۳۳،۳۱۸

عبداللہ بن ابی بن سلول (منافق): ۱۰۷،۱۰۰،
۳۰۹،۲۱۴

عبداللہ بن ام مکتومؓ (حضرت): ۹۴

عبداللہ بن امیہ: ۲۳۷

عبداللہ بن جدعان: ۲۹۸،۲۹۷

عبداللہ بن حذافہ سہمی: ۲۷۲

عبداللہ بن زبیرؓ (حضرت): ۲۴۰
عبداللہ بن سلام (حضرت): ۲۸۹،۲۳۳،
۶۲۱،۲۹۰
عبداللہ بن عباسؓ: ۲۰۰،۲۱۳،۲۱۵،۳۶۷،
۳۶۸،۴۰۶،۴۶۳،۵۶۵،۶۰۸
عبداللہ بن عبدالمطلب (والد حضور ﷺ):
۱۸۵،۲۲۶،۳۱۰
عبداللہ بن عمرؓ: ۲۶۵،۳۳۱،۵۶۱،۶۳۴
عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ: ۵۷۹
عبداللہ بن مسعودؓ (حضرت): ۱۱۹،۳۶۳،
۳۶۸،۳۷۰،۵۷۲،۵۷۹
عبدالمطلب (دادا): ۱۸۵،۲۲۶،۲۳۷،۳۱۱
عبدالواحد: ۳۳۷
عبدیالیل: ۲۰۸
عبید بن ایوب الغیری: ۱۹۰
عتبہ: ۲۴۶،۲۸۰
عثمان بن عفانؓ (حضرت): ۲۰۸،۲۲۳،۲۷۱
عثمان بن مظعونؓ (حضرت): ۲۳۳،۲۸۱،
۴۸۱،۶۱۱
عدی بن حاتم (حضرت): ۲۱۰،۲۷۲،۳۱۳
عروہ بن مسعود ثقفی: ۲۷۰،۲۷۲
عزیرؑ (حضرت): ۱۷۹،۳۹۱،۵۱۶
عزیٰ (کاہن): ۱۹۳
عطا بن السائب: ۲۰۱،۲۰۲،۲۰۳،۲۰۴
عکرمہؓ: ۳۶۸
علاء بن حضرمیؓ: ۲۷۲
علیؓ (حضرت): ۶۶،۱۹۱،۲۰۰،۲۰۱،۲۰۲،۲۰۳،
۲۰۴،۲۰۵،۲۰۶،۲۲۳،۲۴۳،۲۵۴،۲۶۷،
۲۷۱،۲۷۴،۲۸۸،۴۷۵
عمار بن یاسرؓ (حضرت): ۳۸۱
عمارہ: ۲۳۶
عمرؓ (حضرت): ۶۶،۹۶،۱۰۰،۱۰۲،۱۰۶،۱۲۹،
۱۵۵،۱۹۲،۲۰۱،۲۰۳،۲۲۳،۲۴۳،۲۴۶،۲۴۷،
۲۸۰،۳۳۰،۳۳۶،۴۷۷،۵۷۹،۶۳۱
عمران (مریمؑ کے باپ): ۴۳۵
عمران بن حصین (حضرت): ۵۷۱
عمرو: ۱۹۴
عمرو بن اقیش: ۲۴۴
عمرو بن العاصؓ: ۲۷۲
عمرو بن امیہ ضمری: ۲۷۲
عمرو بن عبسہ السلمی (حضرت): ۲۷۱
عمرو بن عدی لخمی (بادشاہ): ۱۹۱
عمرو بن قمیہ: ۱۹۹
عمرو بن لحی: ۱۸۴
عمرو بن مالک: ۲۴۴
عمرو بن مرہ: ۲۷۲
عمرو معدی کرب (عرب کا شاعر): ۲۱۶
عمرو بن یربوع: ۱۹۰
عناق (فاحشہ): ۲۱۴
عنیزہ: ۲۱۳
عیاش بن ربیع مخزومی (حضرت): ۲۷۲
عیاض مالکی (قاضی): ۷۶
عیسیٰ مسیحؑ (حضرت): ۴،۳۳،۳۸،۳۹،۴۰،۶۸،
۷۸،۷۹،۸۵،۸۸،۹۶،۱۰۹،۱۱۴،۱۱۷،۱۱۸،
۱۲۵،۱۲۶،۱۵۴،۱۵۹،۱۶۲،۱۶۴،۱۷۰،۱۷۲،
۱۷۸،۱۸۲،۲۵۳،۲۵۶،۳۰۷،۳۰۸،۳۱۲،
۳۲۲،۳۲۳،۳۵۰،۳۶۲،۳۹۰،۳۹۱،۳۹۳،
۳۹۸،۴۰۶،۴۲۵،۴۳۱،۴۳۲،۴۳۳،۴۳۵،

۴۳۶، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۷، ۴۵۲،
۴۵۴، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۹، ۴۶۲، ۴۶۶، ۵۰۲،
۵۲۹، ۵۳۰، ۵۸۴، ۵۸۶، ۶۰۳، ۶۳۵، ۶۴۲

عیینہ: ۲۴۲

(غ)

غزالیؒ (امام): ۳، ۱۴، ۱۵، ۱۰۸

غیلان بن سلمہ ثقفی: ۲۱۶

(ف)

فارقلیط (احمد رسول اللہ ﷺ): ۲۶۴

فاطمہ: ۲۰۰، ۲۱۲، ۳۱۱

فردوسی (شاعر): ۳۷

فرزدق (شاعر): ۲۱۶

فرعون: ۸۲، ۱۴۱، ۲۲۸، ۲۵۸، ۴۹۱، ۵۱۹،

فضل رحمٰن گنج مراد آبادی (مولانا): ۳۹۴

(ق)

قارون: ۵۵۳

قباد اول بن فیروز: ۱۵۶، ۱۵۷

قتادہ (مفسر): ۱۱۴، ۱۱۵، ۳۶۸، ۴۶۳

قتادہ بن نعمان (حضرت): ۳۶۹

قرطبی: ۳۷۰

قزوینی: ۱۶۹

قسطنطین: ۹۶، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۳، ۱۶۵

قیسؓ (حضرت): ۶۳۲

قیصر: ۲۲۳، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹

(ک)

کارلائل: ۲۵۲، ۲۹۳

کرشن: ۳۰۷، ۴۳۷

کسریٰ: ۲۲۳، ۲۴۷، ۲۴۹

کعب بن اشرف (یہودی سردار): ۱۷۸، ۲۰۹

کلیب بن وائل: ۱۹۶

(گ)

گبن: ۱۵۶، ۱۶۰، ۱۶۲

گلازر: ۳۶۰

گوتم بدھ: ۱۶۷

(ل)

لبید اعصم: ۱۷۷

لبید بن ربیعہ (شاعر): ۱۹۹

لقمانؑ (حضرت): ۱۰۹، ۱۱۶

لوطؑ (حضرت): ۳۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۴۱۹، ۴۲۶،
۴۳۳، ۴۳۶، ۴۹۳، ۵۱۹

لیکی: ۱۶۷

(م)

مارس: ۱۶۳، ۱۶۴

مارگولیتھ (پروفیسر): ۲۹۲

مالکؒ (امام): ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۲۱، ۴۰۵

مالک (شام کا کاہن): ۴۳۴

مانی: ۱۵۵

مبشر: ۲۱۲

مجاہد: ۱۱۳، ۱۲۱

مجد الدین فیروز آبادی (علامہ): ۱۹۹

محلم بن جثامہ لیثی: ۲۴۲

محمد انوار صدیقی: (دیباچہ)

محمد بن مسلمہ انصاری (حضرت): ۱۷۸

محمود بن لبید (حضرت): ۳۳۵

محی الدین ابن عربی: ۵۷۵

محیصہ بن مسعود (حضرتؓ): ۲۷۲

مخبل (شاعر): ۱۹۴

مرثد غنویؓ (حضرت): ۲۱۴

مرزا مظہر جان جاناں: ۴۳۷

مریمؑ (حضرت): ۵۲، ۱۶۲، ۱۶۴، ۱۶۶، ۱۷۰،
۳۰۷، ۳۰۸، ۳۵۰، ۴۱۹، ۴۲۷، ۴۳۳، ۴۳۵،
۴۳۸، ۴۳۹، ۴۵۲، ۴۵۶، ۴۶۶
مزدک: ۱۵۶
مسحل (شیطان): ۱۹۴
مسعود ثقفی: ۲۰۸
مسلم: ۳۳۳
مصعب (باندی): ۲۱۴
مسیلمہ (کذاب): ۲۶۶، ۴۷۷
مصعب بن عمیر (حضرت): ۲۷۱
مصلح الدین سعدی: ۵۸۷
معاذ بن جبلؓ (حضرت): ۲۰۶، ۲۵۹، ۲۷۲،
۳۳۵، ۳۳۶
مغیرہ بن شعبہؓ (حضرت): ۱۵۷، ۲۴۸، ۲۷۲، ۶۰۵
مقاتل: ۱۱۳
مقبلی (شیخ): ۵۷۵
ملا دوست محمد کابلی: ۶۷
ملکم: ۱۵۸
منقذ بن حبان: ۲۷۲
موسیٰؑ (حضرت): ۴، ۱۴، ۳۰، ۳۳، ۳۸، ۳۹،
۴۰، ۷۲، ۸۲، ۹۶، ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۹،
۱۴۰، ۱۵۴، ۱۷۰، ۱۷۹، ۲۲۸، ۲۵۸، ۳۰۸، ۳۹۰،
۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۶، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۱، ۴۴۷،
۴۴۸، ۴۵۰، ۴۵۴، ۴۵۷، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱،
۴۶۲، ۵۲۸، ۶۰۵
موسیو دی کانت: ۶۴۲
مہاجر بن ابی امیہؓ (حضرت): ۲۷۱
مہیش: ۳۵۰، ۳۶۲
میدانی نیشاپوری: ۱۹۶
میکائیل (فرشتہ): ۴۱۲

(ن)

نائیس: ۱۶۳
نارمن: ۵۱۷
نجاشی: ۲۳۳، ۲۸۲
نوحؑ (حضرت): ۳۲، ۵۲، ۸۳، ۹۶، ۱۲۵،
۱۴۷، ۳۹۰، ۴۳۶، ۴۴۸، ۴۹۳، ۵۱۰، ۵۱۷
نوشیرواں: ۱۵۷، ۱۵۹
نولڈیک (جرمن محقق): ۱۸۱، ۲۲۰
نووی (امام): ۳۷۰
نپولین: ۳۷

(و)

واثلہ بن اسقع (حضرت): ۲۷۲
وبر بن نخیسؓ (حضرت): ۲۷۲
ورقہ (عیسائی): ۲۳۳
وشنو: ۳۶۲
ولید (پدر عمارہ): ۲۳۶
ولید بن مغیرہ: ۲۳۳، ۲۸۱
وہب اسدیؓ (حضرت): ۲۱۶

(ہ)

ہابیل وقابیل: ۶۳۴
ہاجرہؑ (حضرت): ۲۱۹
ہارونؑ (حضرت): ۳۲، ۱۲۵، ۲۵۸، ۴۳۶
ہاشم: ۲۴۱
ہانیؓ (ابوالحکم): ۳۳۳
ہرقل: ۲۳۳، ۲۸۵
ہرمز: ۱۵۷
ہشام کلبی: ۱۸۴، ۱۸۶، ۲۱۱
ہندہ: ۲۸۷

ہنریکوس لامنس: ۷۹
ہنیبال: ۳۷
ہودؑ (حضرت): ۲۲۸، ۴۳۳

(ی)

یحییٰؑ (حضرت): ۳۳، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۱۲۴، ۱۲۵، ۳۹۰، ۴۳۴
یزدگرد (بادشاہ ایران): ۱۵۵، ۱۵۸
یعقوبؑ (حضرت): ۳۲، ۷۲، ۸۳، ۱۲۵، ۱۷۹، ۴۳۳، ۴۳۶، ۴۴۱، ۴۵۴، ۴۵۷، ۴۵۹، ۵۲۹
یوحنا: ۵۳۰، ۶۰۴
یوسفؑ (حضرت): ۳۲، ۳۸، ۳۹، ۵۳، ۸۲، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۳۱۴، ۴۳۳، ۴۳۸، ۴۷۷، ۶۳۴
یوسفوس (یہودی مورخ): ۲۱۹
یونسؑ (حضرت): ۳۳، ۸۰، ۱۲۵، ۴۳۶
یہوا: ۳۶۱

☆☆☆

کتب

(الف)

آثار البلاد (قزوینی): ۱۶۹
ارض القرآن: ۱۸۶
اسباب النزول (سیوطی): ۲۱۸
الادب المفرد: ۳۳۲
البحر المحیط (تفسیر ابوحیان): ۱۱۳، ۴۸۷
الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح: ۲۴۹
الفاروق: ۲۴۶
المستدرک للحاکم: ۳۸۲، ۴۰۶
الندوہ (رسالہ): ۵۲۸
الوطن (اخبار): ۲۹۲
انجیل: ۴، ۵۷، ۶۸، ۱۰۹، ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۷۲، ۲۶۱، ۲۸۲، ۲۹۴، ۳۰۰، ۳۹۶، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۵، ۴۴۷، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۶، ۴۶۰، ۴۶۳، ۴۷۰، ۵۰۲، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۵۲، ۵۵۵، ۶۰۴، ۶۳۵
انسائیکلوپیڈیا آف مذاہب واخلاق (پروفیسر نولدیکی): ۱۸۱
انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا: ۲۹۳
اوستا: ۴۴۳

(ب)

بلوغ الادب واطوار العرب: ۱۹۶

(ت)

تاریخ الیہود فی بلاد العرب: ۲۱۹

تاریخ ایران:۱۵۸
تاریخ زوال وانحطاط سلطنت روم (گبن): ۱۵۶، ۱۶۰، ۱۶۲
تاریخ عالم:۱۵۵
تاریخ معرکہ مذہب وسائنس (ترجمہ ڈریپر): ۱۶۰، ۱۶۲
تاریخ ملوک الارض (حمزہ اصفہانی):۱۸۹
تاریخ ہندوستان:۱۶۳
تحریر ابن ہمام:۴۸
تحفۃ الاخلاء فی عصمۃ الانبیاء:۷۶
تفسیر جریر طبری:۱۱۳، ۴۸۸، ۵۴۳، ۵۶۵
تفسیر ابوالسعود:۴۹۳
تفسیر روح المعانی (آلوسی):۴۹۳
تفسیر زمخشری:۴۸۷
تفسیر سورہ قیامہ (مولانا حمید الدین فراہی):۵۱۰
تفسیر عبد بن حمید:۵۷۹
تفسیر کبیر (رازی):۴۹۳
توراۃ:۴، ۳۹، ۴۰، ۵۷، ۶۸، ۱۰۹، ۱۱۲، ۱۱۴، ۱۱۸، ۱۲۴، ۱۵۶، ۱۵۹، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۹، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۳۴، ۲۶۱، ۲۸۷، ۳۰۰، ۳۶۱، ۳۷۴، ۳۹۶، ۴۲۴، ۴۲۶، ۴۳۶، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۵، ۴۴۷، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۳، ۴۶۶، ۴۷۰، ۵۰۲، ۵۱۱، ۵۲۹، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۹، ۵۵۲، ۵۵۵، ۶۳۴، ۶۴۲

(ج)

جامع ترمذی:۴۶، ۲۹۰، ۳۷۰، ۳۸۵، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۶، ۴۰۷، ۵۷۳، ۵۸۷، ۵۹۲، ۶۰۵
جمہرۃ ابن درید:۱۱۲، ۱۲۶

(ح)

حجۃ اللہ البالغۃ:۳، ۹، ۶۳، ۶۱۲

(د)

دیوان الحماسہ:۲۱۱
دیوان فارسی (مولانا حمید الدینؒ):۱۵۲

(ز)

زاد المعاد:۲۴۸، ۲۸۲
زبور:۵۷، ۶۷، ۱۷۰، ۱۷۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۵، ۴۴۷، ۵۰۲، ۵۲۹، ۵۵۵، ۶۳۴، ۶۳۵

(س)

ستیارتھ پرکاش:۱۶۹
سفرنامہ ابوزید سیرافی (سلسلۃ التواریخ):۱۶۹
سنن ابن ماجہ:۳۳۱
سنن ابوداؤد:۱۰۲، ۱۰۳، ۲۰۱، ۲۹۰، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۳۲، ۳۸۵، ۶۵۲
سنن دارقطنی:۲۱۲، ۲۴۳
سنن نسائی:۳۳۱
سیرت ابن اسحٰق:۲۳۷
سیرۃ النبی (جلد دوم):۲۰۱
سیرۃ النبی (جلد سوم): ۲۸۰
سیرۃ النبی (جلد چہارم): دیباچہ:۹، ۱۰، ۱۱۰، ۱۲۰

(ش)

شاہنامہ:۱۵۶
شرح تحریر ابن ہمام:۴۸
شرح الشفا:۷۶
شعراء النصرانیہ:۱۹۴
شعب الایمان:۶۵۲
شفاء العلیل:۷۶

شمائل ترمذی: ۱۹۱

(ص)

صحاح اللغۃ (جوہری): ۱۱۲، ۱۲۷
صحیح ابن حبان: ۲۳۸
صحیح بخاری: ۱۱۹، ۱۲۹، ۱۸۴، ۱۹۲، ۱۹۳، ۲۰۰، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۳۷، ۲۳۹، ۲۴۲، ۲۴۸، ۲۹۱، ۲۹۶، ۲۹۷، ۳۸۵، ۴۰۱، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۸۱، ۵۶۸، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۸۷، ۶۰۸، ۶۱۱، ۶۲۹، ۶۴۴
صحیح مسلم: ۱۰۵، ۱۹۳، ۲۰۳، ۲۰۶، ۲۱۵، ۲۳۷، ۲۷۵، ۳۸۲، ۴۰۴، ۴۰۵، ۵۷۲، ۵۸۷، ۶۰۸، ۶۲۷، ۶۵۳

(ط)

طبقات الامم: ۱۸۹

(ف)

فتح القدیر: ۴۹۳
فتوح البلدان بلاذری: ۲۰۹

(ک)

کتاب الاسماء والصفات (بیہقی): ۳۳۲، ۵۷۹
کتاب الاصنام (کلبی): ۱۸۶
کتاب الاغانی: ۲۱۶
کتاب الامثال (میدانی): ۱۹۶
کتاب البیان والتبیین للجاحظ: ۱۹۳
کتاب الحیوان: ۱۹۱
کتاب الرسالہ: ۶۱، ۱۱۵، ۱۲۱
کتاب العہد الجدید: (دیکھیے انجیل)
کشاف: (دیکھیے تفسیر زمخشری)
کلمات طیبات: ۴۳۷
کنز العمال: ۵۶۱

(گ)

گاتھا: ۴۶۳

(ل)

لائف آف محمد (مارگولیتھ): ۲۹۲
لسان العرب: ۱۱۲، ۱۲۳، ۱۲۷

(م)

متی: (دیکھیے انجیل)
مستدرک حاکم: (دیکھیے المستدرک)
مسند ابویعلیٰ: ۵۸۴
مسند احمد بن حنبل: ۳۹۹، ۴۰۶
مسند بزاز: ۴۰۵، ۴۰۶
مصنف عبدالرزاق: ۵۷۹
معارج القدس: ۳
معجم طبرانی (صغیر): ۴۰۶، ۴۳۳، ۵۷۹
مفردات القرآن (امام راغب): ۱۱۲، ۱۲۳
ملل ونحل ابن حزم: ۷۶

(و)

وید: ۲۶۱، ۳۹۶، ۴۲۹

(ہ)

ہندوستان قدیم (آرسی دت): ۱۶۸، ۱۶۹
ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ: ۲۹۳

☆☆☆

مقامات

(الف)

آریہ ورت: (دیکھیے ہندوستان)

احد: ۱۰۷، ۴۷۵، ۴۷۷، ۵۵۱، ۶۳۲

اسپین: ۲۲۲

اسکندریہ: ۴۲۳

اسیریا: ۱۵۴

اعظم گڑھ (دیباچہ): ۱۵

افریقہ: ۱۵۰، ۱۷۷، ۲۲۲، ۲۹۴

آکسفورڈ: ۲۱۹، ۲۵۳، ۳۶۸، ۳۸۸، ۳۸۹، ۴۱۰، ۴۲۶

الجزائر: ۲۲۲

الجیریا: ۲۲۲

الہ آباد: ۳۲۹، ۳۶۶، ۵۸۰

امریکہ: ۵۱۷

انگلستان: ۲۹۳

اوروشلم: ۳۲

ایشیا: ۱۵۵، ۱۷۷، ۲۲۲

ایران: ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۹، ۲۲۱، ۲۲۳، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۵۶، ۲۸۳، ۳۸۶، ۴۲۸، ۴۳۰، ۴۳۷، ۴۳۹، ۴۴۴

(ب)

بابل: ۱۵۴، ۱۵۵، ۲۲۱، ۴۲۸، ۵۲۷

بحرین: ۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵

بدر: ۹۵، ۹۶، ۱۰۶، ۲۷۰

بدی: ۱۹۱

برطانیہ: ۱۶۰

بعلبک: ۱۹۹

بقار: ۱۹۱

بلقاء: ۱۸۴

بمبئی: ۵۴، ۵۲۸، ۶۵۲

بیت المقدس: ۴۵۱

بیروت: ۹، ۷۷، ۱۲۷، ۱۸۴، ۱۸۹، ۲۱۹، ۴۸۵

(پ)

پیرس: ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۶۹

(ٹ)

ٹیونس: ۲۲۲

(ت)

تبوک: ۵۰، ۹۹، ۲۴۹

ترکستان: ۲۲۲، ۴۴۵

تیما: ۲۴۷

(ج)

جاوہ: ۲۲۲

جزائر افریقہ: ۲۲۲

جزائر ہند: ۲۲۲

جواثی: ۲۷۵

(چ)

چین: ۲۲۲، ۴۷۳، ۴۳۹

(ح)

حبشہ: ۱۸۰، ۲۲۲، ۲۵۶، ۲۷۱، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۸۳

حجاز: ۱۲۶، ۱۸۶، ۱۸۸، ۲۲۱، ۲۳۳، ۲۴۷، ۲۵۳، ۲۷۴

جحفہ: ۲۴۱

حدیبیہ: ۱۰۶، ۲۵۶، ۳۲۹، ۳۶۰

حرا (غار): ۴

حضرموت:۱۸۹،۲۱۰
حنین:۲۶۰
حیدرآباد:۳۸، ۹۶، ۱۶۹، ۳۸۱، ۴۷۰، ۶۳۰
حیرہ:۱۸۰، ۲۱۰

(خ)

خراسان:۲۲۲
خیبر:۱۸۰، ۲۲۵، ۲۳۶، ۲۴۷، ۲۶۷، ۲۷۳، ۲۷۶

(د)

دار:۱۸۴
دارالمصنفین شبلی اکیڈمی (دیباچہ):۲۹۸
دجلہ:۱۶۱
دلی:۵۴، ۲۱۳، ۲۲۲، ۲۸۷، ۴۰۴، ۴۸۰
دمشق:۱۹۹، ۴۰۵
دومۃ الجندل:۲۴۸
دیلم:۲۵۶
دیوبند:۶۰، ۲۱۵، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۷۰، ۳۸۴،
۳۸۶، ۴۰۰، ۴۷۵، ۴۹۱، ۵۹۳، ۶۳۲

(ڈ)

ڈینوب:۱۶۱

(ر)

روم:۱۵۵، ۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۷۰، ۲۲۱،
۲۲۳، ۲۲۶، ۲۴۷، ۲۵۳، ۲۵۶، ۲۸۶

(ز)

زنجبار:۲۲۲

(س)

سائپرس:۲۲۲
سسلی:۲۲۲
سماٹرا:۲۲۲
سندھ:۱۶۹، ۴۳۵
سومنات:۴۷
سیستان:۲۲۲

(ش)

شام:۱۶۴، ۱۸۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۴۷، ۲۴۹، ۲۷۳، ۲۷۴،
۳۴۱، ۴۳۰، ۴۳۴، ۵۱۷

(ط)

طائف:۱۸۵، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۳۱، ۲۳۳، ۲۷۰،
۲۸۲
طور (پہاڑ):۴، ۱۳۹

(ع)

عبقر:۱۹۱
عراق:۲۲۱، ۲۴۹، ۴۲۳، ۵۱۷
عرب:(دیباچہ:۲):۶۶، ۶۹، ۷۸، ۸۴، ۱۲۶،
۱۲۹، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۹، ۱۷۶، ۱۷۷،
۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۹، ۱۹۰،
۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۱۳، ۲۱۸،
۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶،
۲۲۷، ۲۲۸، ۲۳۱، ۲۳۴، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۱،
۲۴۳، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۵۰، ۲۵۱،
۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۶، ۲۷۰، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵،
۲۷۸، ۲۸۰، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۹۱، ۲۹۲،
۲۹۳، ۳۰۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۸،
۳۲۹، ۳۳۸، ۳۵۰، ۳۵۸، ۳۶۰، ۳۶۶،
۳۶۷، ۳۶۹، ۳۷۱، ۳۷۲، ۴۰۳، ۴۰۶، ۴۲۸،
۴۳۰، ۴۵۹، ۴۶۵، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۷، ۵۲۹،
۶۰۶، ۶۲۹، ۶۳۰
عرینہ:۲۴۰
عقبہ:۲۸۲
عکل:۲۴۰

عکاظ:۲۵۱
عمان:۲۳۳،۲۷۴،۲۷۵

(غ)

غزنی:۳۷

(ف)

فارس:۱۵۵،۱۵۸،۱۶۱،۱۶۴،۱۶۵،۱۷۰،۱۸۰، ۲۲۱
فدک (باغ):۱۸۰،۲۴۷
فرانس:۱۶۰
فلسطین:۲۵۶

(ق)

قاصرین:۱۹۹
قاہرہ:۱۸۴،۲۸۱
قبا:۳۶۹
قسطنطنیہ:۶۳

(ک)

کابل:۲۲۲
کریٹ:۲۲۲
کانپور:۳،۲۳۸
کعبہ:۱۸۴،۱۸۵،۱۸۶،۲۱۱،۲۱۵،۲۴۶،۲۷۳، ۲۸۱،۳۳۰،۳۳۱،۴۵۱،۴۷۷
کلدانیہ:۱۵۴
کلکتہ:۱۸۹،۲۳۸،۴۸۷
کنعان:۲۲۸
کوفہ:۱۸۰

(گ)

گجرات:۳۷

(ل)

لاہور:۱۶۹

(م)

مآرب:۱۸۰
مدین:۵۱۹
مدینہ:۶۶،۶۷،۹۵،۱۰۵،۱۰۷،۱۲۶،۱۷۵، ۱۷۷،۱۷۸،۱۷۹،۱۸۰،۱۸۴،۱۹۶،۲۰۵،۲۰۶، ۲۰۷،۲۱۲،۲۲۳،۲۳۲،۲۳۳،۲۳۹،۲۴۰،۲۴۱، ۲۴۳،۲۴۴،۲۴۸،۲۵۶،۲۶۶،۲۷۱،۲۷۳، ۲۷۴،۲۷۵،۲۸۴،۲۸۷،۲۸۹،۲۹۲،۳۰۴، ۴۳۸،۴۷۷،۶۲۱
مرادآباد:۴۳۷
مراکش:۲۲۲
مسجد نبوی:۲۶۶،۲۶۷،۲۷۵،۲۸۷،۳۹۱،۴۰۸
مصر:۴۸،۶۰،۶۳،۹۷،۱۰۶،۱۱۲،۱۱۳،۱۱۴،۱۲۳، ۱۵۴،۱۵۹،۱۶۴،۱۷۱،۱۸۶،۱۹۱،۱۹۴،۱۹۶،۱۹۸، ۱۹۹،۲۰۶،۲۱۱،۲۱۴،۲۱۹،۲۲۱،۲۲۲،۲۲۸، ۲۳۸،۲۴۲،۲۴۵،۲۴۶،۲۴۹،۲۶۰،۲۶۸، ۲۷۶،۲۸۲،۲۸۳،۲۹۸،۳۲۱،۳۳۹،۳۶۸، ۳۸۲،۳۸۶،۴۰۳،۴۰۸،۴۲۸،۴۳۲،۴۷۷، ۴۸۷،۴۸۸،۴۹۱،۴۹۳،۵۱۷،۵۲۷،۵۶۱، ۵۶۲،۵۷۵،۵۸۴،۶۱۲،۶۳۰،۶۳۴،۶۴۲
مکہ:۴۰،۷۷،۷۸،۹۳،۹۴،۹۵،۱۸۶،۲۳۱، ۲۳۳،۲۳۴،۲۳۹،۲۴۰،۲۴۳،۲۴۵،۲۴۶، ۲۵۵،۲۵۶،۲۶۰،۲۷۰،۲۷۱،۲۷۳،۲۷۴، ۲۷۵،۲۸۲،۲۸۳،۲۸۶،۲۸۷،۲۸۹،۲۹۰، ۳۰۶،۴۰۳،۴۷۷،۵۱۴
منیٰ:۲۵۱

(ن)

نجد:۲۴۶،۲۷۲،۲۷۴،۲۸۷
نجران:۱۷۳،۲۳۳،۲۷۳

نیس:۱۶۵
نیل:۱۶۱
نینوا:۴۲۸

(و)

وادی القریٰ:۱۸۰،۲۴۷
ویانا:۱۹۴،۲۱۸

(ہ)

ہجر:۲۳۳
ہندوستان:۱۴۷،۱۵۴،۱۵۵،۱۶۷،۱۶۸،۲۲۲،
۲۲۵،۲۲۶،۲۵۳،۳۰۰،۳۳۹،۳۸۶،۳۹۲،
۳۹۳،۴۲۸،۴۲۹،۴۳۰،۴۳۷،۴۳۹،۵۲۷،
۵۵۵،۶۱۲
ہمالہ (پہاڑ):۱۵۰،۵۲۸

(ی)

یثرب:۱۷۹،۲۳۳،۲۷۴
یمامہ:۲۶۶،۲۷۲،۲۷۴،۲۷۵
یمن:۱۷۳،۱۸۰،۱۸۶،۱۸۹،۱۹۰،۱۹۱،۲۰۹،
۲۲۱،۲۳۳،۲۳۸،۲۵۳،۲۵۶،۲۵۹،۲۷۱،۲۷۲،
۲۷۳،۲۷۴،۲۷۵،۳۶۰
یورپ:۱۵۰،۱۵۵،۱۷۷،۲۲۰،۲۲۲،۲۵۰،
۲۵۱،۲۷۴،۲۹۲،۲۹۴،۳۳۹
یونان:۳۱،۱۴۷،۱۵۰،۱۵۴،۱۵۹،۳۰۰،
۳۳۹،۴۲۸

☆☆☆

کتابیات

☆ احسان التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم: شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد الشامی المقدسی مطبع بریل لیڈن ۱۹۵۶ء۔

☆ ادب المفراد: امام محمد بن اسمٰعیل بخاری مطبع معارف نظارت مصر ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء۔

☆ ارض القرآن: مولانا سید سلیمان ندوی، مطبع معارف اعظم گڑھ یوپی، ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۵ء

☆ استیعاب: ابوعمر یوسف بن عبداللہ القرطبی دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۱۸ھ۔

☆ اسد الغابہ: ابوالحسن علی بن عبدالکریم الجزری المعروف باابن الاثیر جمعیۃ المعارف مصر۔

☆ اصابہ: حافظ ابن حجر عسقلانی، مطبع شرفیہ مصر ۱۹۰۷ء۔

☆ البحر المحیط: ابوحیان اندلسی، مطبعۃ السعادۃ ۱۳۲۸ھ۔

☆ البدایہ والنہایہ: ابن کثیر، مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۹۳۳ء۔

☆ الاسلام: موسیو دی کانت ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء۔

☆ الانوار الزاہیہ فی دیوان ابی العتاہیہ: لویس شیخو الیسوعی، المطبعۃ الکاثولیکیہ بیروت ۱۹۱۴ء

☆ التلویح فی کشف حقائق التنقیح والتوضیح فی حل غوامض التنقیح: علامہ سعدالدین تفتازانی، مطبع مکتب صنائع قسطنطنیہ ۱۳۱۰ھ۔

☆ الرسالہ: امام شافعی، مطبعہ علمیہ مصر ۱۳۱۲ھ

☆ العہد الجدید: مطبع ادبیہ ۱۸۸۶ء، مدرسہ آکسفورڈ ۱۸۹۰ء۔

☆ الکلام: علامہ شبلی نعمانی، نامی پریس کانپور ۱۹۰۴ء۔

☆ المعجم الصغیر: ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی مطبع انصاری دہلی، ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء

☆ الموافقات فی اصول الاحکام: امام شاطبی اندلسی، مطبعہ سلفیہ مصر ۱۳۴۱ھ۔

☆ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔

☆ تاریخ اخلاق یورپ: لیکی

☆ تاریخ الرسل والملوک (تاریخ طبری): محمد بن جریر طبری المدنی ۳۱۰ھ/۹۲۲ء

☆ تاریخ ملوک الارض: حمزہ اصفہانی کلکتہ: ۱۸۶۶ء

☆ تاریخ الیہود فی بلاد العرب: ڈاکٹر اسرائیل والفنسون، مطبعۃ الاعتماد مصر۔

☆ تفسیر ابن حبان: اثیر الدین محمد بن یوسف الشہیر بابن حبان، مطبع سعادۃ مصر ۱۳۴۹ھ۔

☆ تفسیر ابن جریر طبری: ابو جعفر محمد بن جریر، مطبع میمنیہ مصر، ۱۳۲۱ ہجری

☆ تفسیر ابن کثیر: حافظ اسمٰعیل قرشیؒ، مطبع مصطفیٰ محمد ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۷ء۔

☆ تفسیر سورہ اخلاص: ابن تیمیہ مطبع حسینیہ مصر ۱۳۲۳ھ۔

☆ تفسیر سورہ قیامہ: مولانا حمید الدین فراہیؒ، دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ (یوپی)۔

☆ تفسیر کشاف: علامہ زمخشری، مطبع لیثی کلکتہ ۱۸۵۶ء۔

☆ تہذیب التہذیب: علامہ ابن حجر عسقلانی، دائرۃ المعارف حیدر آباد ۱۳۲۵ھ۔

☆ توراۃ (الکتاب المقدس): آکسفورڈ ۱۸۹۰ء۔

☆ جامع ترمذی: ابوعیسیٰ محمد الترمذی، کتب خانہ رشیدیہ دیوبند۔

☆ جمہرۃ اللغۃ: محمد بن الحسن بن درید الازدی، دائرۃ المعارف حیدر آباد ۱۳۴۵ھ۔

☆ حجۃ اللہ البالغۃ: شاہ ولی اللہ دہلوی، المطبعۃ الخیریہ مصر ۱۳۲۲ھ۔

☆ دبستان المذاہب: مرزا محمد محسن کشمیری فانی بمبئی ۱۲۷۷ھ

☆ دیوان اعشیٰ: مطبوعہ ویانا ۱۹۲۷ء

☆ دیوان الحماسہ: ابوتمام حبیب بن اوس الطائی، مطبع سعادت مصر ۱۳۲۱ھ/ ۱۹۱۳ء۔

☆ سفرنامہ: ابوزید سیرافی (سلسلۃ التواریخ) الطباعۃ السلطانیہ، پیرس ۱۸۱۱ء۔

☆ سنن ابی داؤد: امام داؤد السجستانی، مطبعہ کستلیہ مصر ۱۲۸۰ھ و مطبع قادری ۱۲۷۲ھ۔

☆ سنن ابن ماجہ: ابوعبداللہ محمد بن جریر بن عبداللہ بن ماجہ قزوینی، مطبع فاروقی دہلی۔

☆ سنن دارمی: ابومحمد عبداللہ دارمیؒ، نظامی پریس کانپور ۱۲۹۳ھ۔

☆ سنن نسائی: ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی، دارالکتاب دیوبند۔

☆ ستیارتھ پرکاش: دیانند سرسوتی، مطبوعہ سیوک اسٹیم پریس لاہور، ۱۹۱۲ء۔

☆ سیرت ابن ہشام: ابومحمد عبدالملک بن ہشام، مطبع میمنیہ، مصر ۱۳۲۴ھ۔

☆ سیرۃ النبی اول: علامہ شبلی نعمانی معارف پریس اعظم گڑھ یوپی، طبع جدید ۱۹۹۶ء۔

☆ شرح التقریر والتحبیر: علامہ ابن امیر الحاج التوفی ۸۷۹ھ، مطبوعہ امیریہ بولاق مصر ۱۳۱۷ھ۔

☆ شرح المعلقات: ابوعبداللہ الحسین الزوزنی، مطبع دارالکتب العربیہ مصر ۱۳۲۷ھ۔

☆ شفاء العلیل: حافظ ابن قیم، مطبعہ حسینیہ مصر ۱۳۲۳ھ۔

☆ صحاح اللغۃ: جوہری۔

☆ صحیح مسلم: امام مسلم بن حجاج نیشاپوری، مطبع میمنیہ مصر ۱۳۲۷ھ۔

☆ طبقات الامم: قاضی صاعد بن احمد اندلسی متوفی ۴۶۲ھ/۱۰۷۹ء، مطبع کیتھولک بیروت ۱۹۱۲ء۔

☆ عقد الفرید: امام شہاب الدین احمد المعروف بابن عبدربہ اندلسی، مصر ۱۳۱۶ھ

☆ غرر اخبار الفرس: پیرس

☆ فتح الباری: ابوالفضل شہاب الدین احمد بن علی حجر عسقلانی مطبعۃ الکبری المیریۃ مصر ۱۳۰۱ھ

☆ فرائد اللغۃ فی الفروق: ہنریکوس، مطبع کاثولیکیہ ۱۸۸۹ء۔

☆ کامل ابن اثیر: مطبع بریل لیڈن ۱۸۶۷ء۔

☆ کتاب الاصنام: ہشام الکلبی مطبعۃ دارالکتب المصریہ قاہرہ ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء۔

☆ کتاب البیان والتبیین: جاحظ، مطبعہ علمیہ مصر ۱۳۱۱ھ۔

☆ کتاب الفہرست: علامہ ابن ندیم، مطبعہ رحمانیہ مصر ۱۳۴۸ھ۔

☆ کتاب المعارف: ابن قتیبہ، المطبعۃ الاسلامیۃ مصر ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء۔

☆ کتاب المغازی: ابن ابی شیبہ، حیدرآباد دکن۔

☆ کلمات شاہ: مرزا مظہر جان جاناں، مکتوب چہارم مطبعۃ العلوم مراد آباد ۱۸۸۶ء۔
☆ کنز العمال: شیخ علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین الہندی، دائرۃ المعارف حیدر آباد ۱۳۱۲ھ۔
☆ لسان العرب
☆ مستدرک حاکم: محمد بن عبداللہ المعروف بالحاکم النیشاپوری، مطبعۃ العلوم ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۸ء مطبع مجتبائی ۱۲۲۸ھ/ ۱۸۱۳ء دائرۃ المعارف حیدر آباد ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء۔
☆ مسند احمد بن حنبل: امام عبداللہ احمد بن محمد بن حنبل، مطبعہ میمنیہ مصر ۱۳۱۳ھ۔
☆ مشکوٰۃ المصابیح: شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی دمشق ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۲۲ء و مطبعہ احمدی دہلی ۱۲۷۱ھ۔
☆ معجم البلدان: شہاب الدین ابوعبداللہ یاقوت الحموی مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء
☆ مفردات القرآن: راغب اصفہانی، مطبع میمنیہ مصر ۱۳۲۴ھ۔
☆ موطا: امام مالک بن انس، مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۳۱ھ مطبع احمدی دہلی ۱۲۶۶ء۔
☆ نیل المرام فی تفسیر آیات الاحکام۔